# افکارِ عالم

فکر اسلامی کی روشنی میں

علمی، ادبی تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

جلد اول

مولانا نظام الدین اسیر ادروی



شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند

# تفصیلات



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (۳۷)

نام کتاب : افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد اول)

تالیف : مولانا اسیر ادروی

سن اشاعت : شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء

صفحات : ۴۱۶

تعداد اشاعت : بارِ اول، گیارہ سو

کمپیوٹر کتابت : محمد عیاض قاسمی، دیوبند

ہدیہ : /=

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فون: 01336-222429

# حرفِ اول

زیرِ نظر کتاب شیخ الہند اکیڈمی سے طبع ہونے والی سینتیسویں کتاب ہے، جو مولانا اسیر ادروی کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ ہے، مولانا اسیر ادروی دور رَس اور تحقیقی نگاہ رکھتے ہیں، ان کا شمار ملک کے اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے، موصوف کی خواہش پر اسے کتابی شکل میں اکیڈمی سے طبع کیا گیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فاضل مؤلف نے کافی محنت کی ہے، اور دشمنانِ اسلام کی جانب سے ازراہِ عصبیت قرآنِ کریم اور احادیث رسول پر کئے گئے اعتراضات کے معقول اور بھرپور جوابات دیئے ہیں، اگر ذرا بھی سنجیدگی اور حقیقت پسندی کے نقطہ نگاہ سے کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو صحیح صورتِ حال بھی معلوم ہو جائے گی، اور قاری مطمئن بھی ہو جائے گا۔

اس سے قبل فاضل مؤلف کی کئی کتابیں اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں، جنہیں علمی و دینی حلقوں میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، مولانا اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ بنارس کے ذی وقار اساتذہ میں ہیں، اور اسی علمی ادارے سے شائع ہونے والے ماہِ نامہ ترجمان الاسلام کے ایڈیٹر بھی ہیں، پیش نظر کتاب دراصل انہی ادبی اصلاحی اور تحقیقی مقالوں کا حقیقت افروز مجموعہ ہے جو ترجمان الاسلام اور دوسرے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، اور جنہیں علمی دنیا میں پسند کیا گیا ہے، موصوف کی شخصیت علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے ہندو پاک وغیرہ ممالک کے علمی حلقوں میں متعارف ہے، لوگ ان کی مضامین بڑے شوق سے پڑھتے ہیں، اور داد و تحسین سے نوازتے ہیں، مجھے اکیڈمی سے موصوف کی کتابوں کی اشاعت سے خوشی ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھتے ہوئے مزید علمی و دینی خدمات کا موقع عطا فرمائے۔

(حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب)
مہتمم دار العلوم دیوبند

# پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کا صد ہزار بار شکر ہے کہ مجلس شوریٰ کے اربابِ حل وعقد نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کی نگرانی میں شیخ الہند اکیڈمی سے اپنے نیک دل بزرگوں کی خلوص کے ساتھ لکھی ہوئی کتابوں کی طباعت کا جو اہم اور مفید ترین انتظام فرمایا تھا، وہ جاری ہے، اور انشاء اللہ جاری رہے گا، اس سلسلہ میں اب تک اپنے اکابر کی **۳۶** کتابیں شائع کی جا چکی ہیں، جن سے اہل علم مستفید ہو رہے ہیں، پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک نہایت مفید کڑی ہے، توقع ہے کہ اس کو خواص وعوام میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

یہ کتاب مولانا اسیر ادروی کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا جامع مجموعہ ہے، اس مجموعہ کا ہر مضمون اپنی جگہ بفضلہٖ اہم ہے، جو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور جس میں معاندین اسلام کے اعتراضات کے معقول اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں، کتاب کا ہر مضمون اپنی افادیت کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے، تمام مضامین مدلل اور محقق ہیں، اسلوبِ تحریر اور لب ولہجہ کے حسن نے ان کو اور بھی زیادہ مؤثر بنا دیا ہے، فاضل مؤلف کے قلم اور تحقیقی مزاج سے پڑھے لکھے سبھی لوگ واقف ہیں، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس اکیڈمی سے موصوف کی کئی کتابیں طبع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جو ہندو پاک اور بنگلہ دیش وغیرہ ممالک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں، انشاء اللہ اس کتاب کو بھی پسند کیا جائے گا، دعا ہے حق تعالیٰ موصوف کو صحت وعافیت کے ساتھ دیر تک زندہ سلامت رکھے، اور انہیں دینی وعلمی خدمات کا مزید موقع بہم پہنچائے، آمین۔ (ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد)

(مولانا) بدرالدین اجمل علی القاسمی
نگراں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

# پیش لفظ

مولانا اسیر ادروی اردو حلقہ کا ایک مشہور نام ہے، وہ ڈھائی درجن کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی کتابیں اردو حلقہ کی مقبول ترین کتابیں اور ان کے بار بار ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ جامعہ اسلامیہ بنارس کے معیاری رسالہ ترجمان الاسلام کے مدیر رہے ہیں۔

ان کی تحریر میں دلکشی ہے، جاذبیت ہے۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ایڈیٹر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کی ایک کتاب پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا تھا:

''حق تعالیٰ نے موصوف کو گوناگوں خوبیوں اور فضل وکمال سے نوازا ہے، وہ پختہ کار صحافی اور کہنہ مشق ادیب وصاحب قلم ہیں، ان کے اسلوب میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ دلکشی ورعنائی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، اس لئے ان کی تحریریں قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہیں اور بسا اوقات مسحور کردیتی ہیں''۔

یہی میرے دل کی بھی آواز ہے، کسی موضوع پر ان کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو ان میں کھو جاتا ہوں۔

یہ میری دلی خواہش تھی کہ مولانا موصوف کے کچھ مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرکے زندہ وجاوید بنادیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ ترجمان الاسلام کے بعض اہم علمی وتحقیقی اور ادبی شہ پارے اس مجموعے میں پیش کئے جارہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ مولانا موصوف کا قلم تادیر رواں دواں رہے اور اس کی افادیت کا دائرہ بڑھتا رہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔

(مولانا) ابوالقاسم نعمانی (جامعہ اسلامیہ بنارس)

# ترتیب

# حرفِ چند

اسلام اور اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے والے یورپ کے دانشگاہوں کے یورپین دانشور بھی رہے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نام نہاد مسلمان بھی، یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اور آج بھی ہو رہا ہے۔ یہ اسلام کے ایک زندہ مذہب ہونے کی علامت ہے۔ اہل اسلام ان اعتراضات سے کبھی پریشان خاطر نہیں ہوئے، کیونکہ اسلام ایک خالص علمی اور عملی مذہب ہے۔ اسلام کے پاس علوم کا خزانہ ہے۔ اور پوری سچائی سے اور پورے اخلاص سے ہر دریدہ دہن کا منہ بند کر دیا۔

ایسے کچھ ناخوشگوار واقعات بیسویں صدی میں بھی پیش آئے، ان کے مختصر اور تفصیلی جوابات دئے گئے۔ زیر نظر مقالات کے مجموعہ میں بھی کچھ اہم ترین اعتراضات کے جوابات علم و تحقیق کی روشنی میں دئے گئے ہیں۔

صحافتی زندگی میں شعر و ادب کے موضوع پر اکثر گفتگو آئی، اس مجموعہ میں بھی کئی مضامین خالص ادب سے متعلق ہیں اور دلچسپ ہیں۔ بعض اہم شخصیتیں جو علمی اور مذہبی دنیا میں نام آور ہیں ان شخصیتوں کا بھی تفصیلی تعارف کرایا گیا۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اسیر ادروی
یکم جنوری ۲۰۰۷ء

ایک علمی دستاویز

# تاریخ تدوین حدیث اور مستشرقین

آج زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، اور پوری دنیا سمٹ کر ایک شہر کی طرح ہوگئی ہے، دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی انقلاب آتا ہے، کہیں اقتدار کا کوئی فلک بوس محل گرتا ہے تو اس کی دھمک پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے، کسی خطۂ ارضی میں اقتصادی، معاشی، سماجی، نظریاتی بے چینیاں کروٹیں لیتی ہیں، آگ اور بارود کے دھویں میں نئے مستقبل کے سورج کی کرنیں نمودار ہوتی ہیں تو اس کی جھلک یا اس کا پرتو ہر چہار جانب نظر آنے لگتا ہے، اسی طرح فکری ونظری انقلاب بھی جب کہیں رونما ہوتا ہے اور تحقیق وتنقید کے نام پر ماضی کے مسلمہ نظریہ یا افکار پر جو دو انکار کی ضرب پڑتی ہے تو پوری دنیا میں اس کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور دل ودماغ پر اس کے مثبت ومنفی اثرات ہر جگہ مرتب ہوتے ہیں، نقطۂ نگاہ، زاویۂ فکر اور نظریاتی طور پر ذہن وفکر کی دنیا میں دو طبقے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک جدید انقلاب کی حمایت یا نظری وفکری نتائج کی تائید کرتا ہے، اور دوسرا شدت سے اس کی مخالفت کرتا ہے، یہ شب وروز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جس طرح ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں نشر کرنے والے کی آواز ہوا کی لہروں پر دوڑتی ہے اور ہزاروں میل دور تک چند لمحوں میں پہنچ جاتی ہے اور ہر شخص اس سے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ کچھ متاثر ہوتا ہے، بالکل یہی حال علمی دنیا میں جدید تحقیقات واکتشافات کی برقی رَو کا بھی ہوتا ہے، وہ بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ پوری علمی دنیا میں پہنچ جاتی ہے اور ہر ذہن کو متاثر کرتی ہے اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے بہت بڑا اور اہم ذہنی وفکری انقلاب پیدا ہوجاتا ہے، اس کی ایک بہت واضح مثال مصر وشام اور ہندوستان وپاکستان میں فتنۂ انکارِ حدیث ہے جو یورپ کی یونیورسٹیوں کی صدائے بازگشت ہے۔

## یورپ اور مشرقی علوم وفنون

یورپ کی ہر بڑی یونیورسٹی میں مشرقی علوم وفنون بالخصوص اسلامیات کا ایک شعبہ رہتا ہے۔ اس شعبہ میں وہی لوگ رکھے جاتے ہیں جو مشرقی علوم وفنون پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے یا اسلامیات کی کسی شاخ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علمی دنیا میں اپنی علمی حیثیت تسلیم کرا چکے ہیں۔ مشرقی علوم وفنون کے یہی ماہرین علمی دنیا میں مستشرقین کے نام سے مشہور ومعروف ہیں، یہی اہلِ علم یورپ کی یونیورسیٹیوں میں طلبہ کی تحقیق اور ریسرچ کے موضوع منتخب کرتے ہیں اور ان کے مقالے کا ابتدائی خاکہ مرتب کرتے ہیں۔

چوں کہ انھوں نے اسلامیات کے موضوع کو اپنے قومی، نسلی اور مذہبی تعصّبات اور اپنے ذہنی تحفظات کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے ان کے ذہن وفکر کی چابک دستیوں نے بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں تراش رکھی ہیں، اس لئے وہ مشرقی علوم وفنون بالخصوص اسلامیات کے اصول وضوابط ان کے بنیادی مآخذ اور کتابوں سے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہیں اس لئے اپنی نگرانی میں جن طلبہ کی وہ علمی رہنمائی کرتے ہیں ان کو اپنے ذہن وفکر کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کو حقیقت اور واقعیت کی شکل دیدینے پر مجبور کرتے ہیں اور جب تک زیر تربیت مقالہ میں ان کی حسب منشاء کام نہیں ہوتا اس وقت تک وہ طالب علم کو سند دینے سے کتراتے ہیں اس لئے مجبور ہو کر ان کو اپنے مقالے میں ترمیم اور حذف واضافہ سے کام لینا پڑتا ہے اور علمی دیانت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

## اسلامیات پر ضرب کاری

اس صورت حال سے مشرقی علوم وفنون میں سب سے زیادہ واسطہ اسلامیات کو پڑتا ہے۔ آج سے پوری ایک صدی قبل مستشرقین نے اسلامیات کو نشانہ بنا کر تنقید

وتشکیک کے کئی زہریلے تیر چلائے اور انہوں نے اپنی دانست میں اسلام کو کاری ضرب لگائی ہے کیوں کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ عالم اسلام کی مذہبی ودینی فضا میں تموّج پیدا ہوا، جس طرح تالاب کی ساکن سطح پر کوئی پتھر پھینک کر پیدا ہونے والی لہروں کا تماشہ دیکھتا ہے، مستشرقین بھی اسلامی دنیا میں اس تموج کا تماشہ دیکھنے میں مصروف رہے۔ انہوں نے تمام ذخیرۂ حدیث کو ناقابل اعتماد ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کر کے ملّت اسلامیہ پر بزعم خویش کاری ضرب لگائی ہے۔

فتنہ انکار حدیث مستشرقین ہی کی علمی تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر وجود میں آیا ہے اور مسلم ملکوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام کا دستور صرف قرآن ہے، احادیث کے نام سے جو انبار جمع کر دیا گیا ہے اس نے اسلام کی صحیح شکل وصورت کو بگاڑ دیا ہے، احادیث کا پورا ذخیر نعوذ باللہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں، اس سارے ذخیرے کو دریا بُرد کر دینا چاہیے، بعض بعض ملکوں میں کچھ مدعیان علم اس شیطانی جال میں پھنس گئے اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ ساری حدیثیں ناقابل اعتبار ہیں اور انہوں نے اپنی لچھے دار تحریروں کے ذریعہ اپنے اس خیال کو عوام میں پھیلانا شروع کیا اور بہت سی کتابیں اس سے متعلق لکھیں اور شائع کیں۔

## مصر کے منکرین حدیث

انکار حدیث کا یہ فتنہ سب سے پہلے مصر میں پہونچا اور ڈاکٹر ''توفیق صدقی'' نے رشید رضا مصری کے رسالہ ''المنار'' میں ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا جس میں انہوں نے گولڈزیہر اور شاخت کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا شکار ہو کر لکھا کہ اسلام صرف قرآن ہے، احادیث کی ہم کو قطعاً ضرورت نہیں۔

رسالہ کے مدیر، رشید رضا نے ''توفیق صدقی'' کے مقالہ پر جو ادارتی نوٹ لکھا اس میں انہوں نے توفیق صدقی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی تائید میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع کیا تھا اس لئے صحابہ کرام نے حدیثوں

کو قلم بند نہیں کیا، اور نہ اکابر صحابہ کرام نے اس دور میں حدیثوں کو جمع کرنے کی طرف کوئی توجہ کی، خلفائے راشدین نے بھی اپنے دور خلافت میں اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ لکھنے والوں اور بیان کرنے والوں کو سرزنش کرتے رہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی موجودگی میں احادیث کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بعد مصر کے ترقی پسند مصنف احمد امین کا سورج علمی اُفق پر طلوع ہوتا ہے۔ انہوں نے احادیث کے ناقابل اعتماد ہونے کا اپنی کتابوں میں کئی جگہ اظہار کیا ہے، ان کی کتابوں میں ''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' مشہور ہیں۔ اس کے بعد اسمٰعیل ادہم کا نام آتا ہے جس نے ''تاریخ سنت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے غیر مبہم لفظوں میں دعویٰ کیا ہے کہ بخاری و مسلم میں جتنی حدیثیں ہیں ان میں سے ایک بھی ثابت نہیں ہے، سب کی سب مشکوک ہیں بلکہ زیادہ تر موضوع معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اس مورچہ پر ابوریہّ آیا، اس نے اپنے پیش رؤوں توفیق صدقی اسمٰعیل ادہم ہی کے ترکش سے تیر مستعار لے کر چلائے ہیں اس نے سب سے بڑا حملہ حدیث پر ''اضواء علی السنة المحمّدیه'' کے ذریعہ کیا، اور ذخیرۂ حدیث کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کے لئے اس نے کتاب میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔

## ہندو پاک کے منکرین حدیث

ہندوستان میں جب انگریزوں کا نیّرِ اقبال طلوع ہوا تو انہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم اور دیرپا بنانے کے لئے کئی حربے اختیار کئے۔ انہیں حربوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کیا جائے۔ اس مقصد کو لے کر انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کئی نمایاں افراد سیاست کے بجائے مذہبی قیادت کے لاؤلشکر کے ساتھ ملت اسلامیہ کے دوست نما دشمن بن کر وجود میں آئے۔ انہوں نے حدیثوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ جس حدیث

کو چاہا موضوع کہہ دیا، جس حدیث کو چاہا جھوٹی کہہ دیا، ان کی تلواروں کے وار سے نہ بخاری بچے نہ امام مسلم، ...... بلکہ محدثین کی پوری جماعت کو عملاً جسد ملّت میں ناسور ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، سر سید احمد خان ان کے ساتھی مولوی چراغ علی اور غلام احمد قادیانی انگریزی حکومت ہی کے ساختہ پرداختہ تھے، اس کے بعد احمد الدین امرتسری پھر عبداللہ چکڑالوی میدان میں آئے اور پورا ایک فرقہ ہی اہلِ قرآن کے نام سے بنا ڈالا اور اس خود ساختہ شریعت کا سب سے بلند بانگ پیغمبر غلام احمد پرویز بن کر آیا۔ اور پھر حدیث کے خلاف ایک مستقل محاذ جنگ کھول دیا گیا۔ اُردو میں بہت سی کتابیں اور رسالے اس مقصد سے شائع کرتے رہے اور ہر امکانی جدو جہد صرف کر دی کہ حدیثوں کو خزف ریزوں کا انبار ثابت کر دیں۔

آج سے نصف صدی بیشتر یہ فتنہ شباب پر تھا اور تقسیم ہند سے پہلے تک کہیں نہ کہیں اس فتنہ کو ہوا دینے والے افراد موجود تھے لیکن جس طرح برسات گزر جانے کے بعد لاکھوں کروڑوں کیڑے مکوڑے جو روشنیوں پر جمگھٹ لگا کر اس کو مدہم کر دینا چاہتے ہیں موسم گذرتے ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں، اسی طرح یہ فتنہ بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ لیکن اس فتنہ نے حدیثوں کی طرف سے ذہن وفکر میں تشکیک کا زہر بھر دیا تھا اس کا اثر آج بھی محسوس کیا جا رہا ہے اور کئی ایک مدعیانِ علم جو اپنے کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا پیمبر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو مسحور کر رکھا ہے انہوں نے بخاری ومسلم کی صحیح ترین حدیثوں کے انکار میں جس جرأت وجسارت اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ نتیجہ ہے اسی فتنۂ انکار حدیث کا جس کو دفن ہوئے مدت ہوئی، جسے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے ۱۸۹۰ء میں یورپ کی یونیورسیٹیوں کے کیمپس سے اٹھایا گیا تھا۔

## سیلاب کا سرچشمہ

حدیثوں کو خزف ریزوں کا انبار کہنے کی جرأت کرنے والوں نے یہ جرأت

وجسارت کہاں سے حاصل کی؟ کیا خود ان کے مطالعہ نے ان کو یہ راہ دکھائی؟ کیا ان کے دل ودماغ کی پرواز وہاں تک از خود ہوگئی؟ کہ اس بلندی پر جا کر یہ دیکھ لیا کہ احادیث کا سارا ذخیرہ نا قابلِ اعتبار ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہے، نہ انہوں نے اپنے دماغ سے سوچا ہے اور نہ ان کے طائرِ فکر کی پرواز وہاں تک تھی، یہ تو کٹھ پتلی تھے جس کا ناچ ان ملکوں میں ہو رہا تھا اس کا تار کسی دوسرے ہاتھ میں تھا۔ ان کی حیثیت اس جھاگ کی تھی جسے سیلاب کا تیز رَو پانی خس وخاشاک کی تمام آلائشوں کے ساتھ ساحل پر لگا دیتا ہے، اس سیلاب کا سرچشمہ مصر اور ہندو پاک میں نہیں یورپ کی یونیورسٹیوں کا کیمپس تھا۔ آپ جب اس فتنہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت از خود آشکارا ہو جائے گی۔

## مشہور مستشرق گولڈزیہر کا کارنامہ

آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے ۱۸۹۰ء میں اگناس گولڈزیہر (۱) نے اپنا تحقیقی

---

۱ ”گولڈزیہر، جرمنی زبان میں اس کا پورا نام اگناس گولڈزیہر ہے، یہ مشہور یہودی مستشرق ہے، ۱۸۵۰ء میں ہنگری میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم کا زیادہ زمانہ بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی اور برلن میں گذرا، ۱۸۷۳ء میں وہ شام چلا گیا اور دمشق کی مشہور علمی شخصیت اور مخطوطات کے ماہر شیخ طاہر جزائری کی خدمت میں رہ کر مطالعہ میں مصروف رہا، اور ان سے علمی استفادہ کیا، کچھ زمانہ اس نے فلسطین کی علمی مجلسوں میں گذرا پھر وہاں سے مصر چلا گیا اور علماء ازہر سے عملی استفادہ کیا۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے جب وطن ہنگری واپس ہوا تو ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا، جہاں وہ کسی زمانہ میں تعلیم حاصل کر چکا تھا، یونیورسٹی میں استاذ ہونے کے بعد اس نے پوری زندگی بوڈاپسٹ ہی میں گذار دی اور وہیں ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ گولڈزیہر بہت سی کتابوں کا مصنف نے ہے، اس کی تصنیفات جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہیں، اس کا موضوع اسلامیات میں اسلامی فقہ اور عربی ادب ہے اس کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے، پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ نے فرانسیسی زبان میں اس کی زندگی اور اس کے کارناموں پر ایک کتاب شائع کی ہے اس کی اہم ترین کتاب جو عربی میں منتقل کی گئی ہے ”العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام“ کے نام سے ہے اس کتاب میں اس نے احادیث کو نا قابل اعتماد ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مستشرقین میں سب سے پہلا شخص یہی ہے جس نے احادیث کو علماءِ اسلام کا کارنامہ بتایا ہے اور کہا ہے کہ رسول کی ذات سے اس کو کوئی نسبت نہیں ہے، بعد کے مستشرقین سب کے سب اسی کے دسترخوان کے ریزہ چین ہیں۔

(الاعلام، خیرالدین زرکلی، جلد اول ،ص ۸۴، ناشر دارالعلوم بیروت، طبع پنجم)

مقالہ جرمن زبان میں (MUHAMMAD ANISCHE STUDIEN) کے عنوان سے لکھا اور شائع کیا اور پھر انگریزی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر کے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

اس مقالہ میں اس نے اپنے وسیع مطالعہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے پاس جتنا ذخیرۂ حدیث ہے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کلام رسول ہیں یا رسول کی زندگی کے سچّے اور صحیح حالات و واقعات ہیں، کیوں کہ اس زمانے میں لکھنے کا رواج زیادہ نہیں تھا اور بہت ہی کم لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے، پھر مسلمانوں کے پیغمبر نے خود بھی اپنے ساتھیوں کو حدیثوں کے لکھنے سے منع کیا تھا، یہی وجہ ہے کو رسول کی وفات کے بعد ایک صدی سے زائد مدت گذر گئی اور حدیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا اور جو بات سو سال تک قید تحریر میں نہ لائی جائے اس میں ہر طرح کا تغیر و تبدل ہوسکتا ہے، ایسی صورت حال میں یہ کیسے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سو سال کے بعد رسول کی جو بات نقل کی جارہی ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اسلام کی تاریخ ہمارے سامنے کوئی ایسا مجموعۂ حدیث پیش نہیں کرتی ہے جو رسول کے زمانہ میں مرتب کیا گیا ہو۔ رسول کے بعد صحابہ کے دور میں بھی کسی صحابی نے اپنے رسول کی احادیث کا کوئی مجموعہ نہیں لکھا جو براہ راست رسول کو دیکھنے والے اور ان کی باتوں کو اپنے کانوں سے سننے والے تھے، انہوں نے جب رسول کے اقوال و افعال کو قلم بند نہیں کیا تو جب صفحۂ ارض سے ایک ایک صحابی اٹھ گیا اور روئے زمین پر اپنے رسول کو دیکھنے والا اور ان کی باتوں کو سننے والا کوئی نہیں رہ گیا تو تیسری اور چوتھی نسل کس طرح اقوال اور افعال رسول کو پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ قلم بند کرسکتی ہے اور پھر اس پر یہ دعویٰ کہ اس کا حرف؟ حرف صحیح ہے، عقل میں آنے والی بات نہیں، اس لئے کہ یہ کہنے کی قطعاً گنجائش ہے کہ حدیثیں بعد میں لکھی گئیں اور جو بات اتنے طویل عرصے تک قلم بند نہ کی جائے اس کی صحت کا قطعیت کے ساتھ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے پورا ذخیرۂ حدیث جو

مسلمانوں کے پاس ہے نا قابل اعتماد ہے اور ہر حدیث میں یہ احتمال موجود ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ کلامِ رسول ہے یا نہیں؟ ان حالات میں ایک مشکوک اور مشتبہ چیز کو دلیل اور حجت بنانا بالکل غیر منطقی بات ہے، عقل کسی طرح احادیث کے موجود ذخیرے کو کلامِ رسول قطعیت کے ساتھ ماننے کے لئے تیار نہیں، یہی وہ خیالات ہیں جن کو گولڈ زیہر نے اپنی کتاب میں پورے زورِ قلم کے ساتھ لکھا ہے۔

## ایک نئی آسمانی کتاب

گولڈ زیہر کی اس کتاب کی اشاعت سے اسلام دشمن طبقہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے حلقوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہوگئی کہ بعد کے دور کے سارے مستشرقین کے نزدیک اس کی یہ کتاب ''انجیل مقدس'' کی حیثیت اختیار کر گئی، اور اس کو اسلام مخالف طاقتوں نے آسمانی کتاب کا درجہ دیدیا اور اس پر اس یقین و اعتماد کے ساتھ ایمان لائے کہ اس میں کسی غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں، اور اس کے دلائل نا قابل شکست ہیں اور پوری اسلامی دنیا اس کی تردید سے قاصر رہ جائے گی۔

بعد کے تمام مستشرقین کا یہ کتاب ماخذ بن گئی۔ بلا استثناء ہر ایک نے احادیث کے خلاف بکتے ہوئے اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے بلکہ گولڈ زیہر کی تائید میں صرف مزید دلائل فراہم کرنا ان کا کام رہ گیا ہے۔

## پروفیسر کا کارنامہ

گولڈ زیہر کی کتاب کے شائع ہونے کے تقریباً ۶۰ سال بعد مشہور اور متشدد یہودی مستشرق پروفیسر شاخت کی علمی سرگرمیاں شروع ہوئیں، اس نے بھی اپنے پیش رو گولڈ زیہر کی طرح اسلامیات کی ایک شاخ ''احادیث فقہیہ'' کو اپنا موضوع سخن بنایا، اور پورے دس سال اس نے اس موضوع پر مطالعہ کرنے میں صرف کئے اور دس سال کی شبانہ روز محنت کا حاصل اس نے۔ THE BRIGINS, OF-

-MOHAMMADAN JURISPRUDENCE- کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔اس کتاب میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں بالخصوص فقہیات کی جتنی روایتیں اور حدیثیں ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء جھوٹی اور بعد کے علماء کی مخترعات ہیں، یعنی گولڈزیہر نے احادیث کی صحت میں شک وشبہ کا اظہار کیا تھا، شاخت نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ پورے یقین واعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں ایک بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔

گولڈزیہر اور پروفیسر شاخت کی یہی دونوں کتابیں مستشرقین کے لئے وحی آسمانی بن گئی ہیں اور آنکھ بند کرکے ان کے مندرجات پر اعتماد کرکے اسلامیات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے، جیسا کہ ماضی قریب کے کئی مشہور مستشرقین کے یہاں اس کا کُھلا اعتراف پایا جاتا ہے۔ دونوں کتابوں میں فرق صرف یہ ہے کہ گولڈزیہر نے ذہن وفکر میں شک وشبہ کا کانٹا بویا ہے اور حدیث پر یقین واعتماد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے مقابلہ میں شاخت سختی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ساری حدیثیں دوسری صدی اور تیسری صدی کے علماء کے اقوال ہیں اور غلط طور پر ان کو اپنے رسول کی طرف منسوب کردیا ہے۔

## مستشرقین کے دعویٰ کا تجزیہ

چوں کہ یہی دونوں مستشرقین بعد کے دور میں پیدا ہونے والے مستشرقین کے باوا آدم بنے ہوئے ہیں۔ انھیں کی کتابیں حدیث کے موضوع پر گفتگو کرنے میں بنیادی ماخذ اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور تمام معترفین پروفیسر گب[1]،

---

[1] گب کا پورا نام سر ہملٹن اے۔ آر گب ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں پروفیسر تھے۔ کچھ دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی اسی شعبہ سے وابستہ رہے ان کی کتاب ''محمڈن ازم'' کے نام سے شائع ہوئی جو اس وقت میرے سامنے ہے، یہ ناول سائز کے ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے نیو امریکن لائبریری نے شائع کیا ہے۔ (ٹائٹل پیج محمڈن ازم)

الفریڈم گیوم[۱] مار گولیتھ[۲] سب اسی خرمن کے خوشہ چین ہیں، اس لئے اگر ان کے دعویٰ کا تجزیہ کر کے اس کے ہر جزء کو نا قابل تردید دلائل سے غلط ثابت کر دیا جائے کہ ان کے اعتراضات کا محل جھوٹ، اور فریب، مغالطہ اور علمی بد دیانیتوں کی خام اینٹوں سے تیار کیا گیا ہے اور صداقت و دیانت کے سارے تقاضوں کو بیدردی کے ساتھ پامال کیا گیا ہے اور تاریخی شواہد کی روشنی میں تحقیق وتفتیش کے آہنی ہاتھوں سے اس کے بنیادی پتھروں کو اپنی جگہ سے کھینچ لیا جائے تو اعتراضات کے یہ فلک بوس محل آنِ واحد میں زمین بوس ہو جائیں گے۔

جب ہم ان کے دعووں کا تجزیہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کا سب سے اہم اور بنیادی اعتراض صرف یہ ہے کہ قرن اول میں حدیث بالکل نہیں لکھی گئی، کسی نے ایک حرف بھی نہیں لکھا صرف حافظہ پر اعتماد کیا گیا اور ساری حدیثیں رسول کے دوسو سال بعد لکھی گئیں۔ اسی لئے حدیثیں نا قابل اعتبار ہیں کیوں کہ اتنے طویل عرصے تک کوئی حافظہ اتنے بڑے ذخیرۂ حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے یہ تجزیہ اور مشاہدہ کے

---

۱۔ الفریڈ گیوم۔ یہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور مشرقی وافریقی مطالعہ اسکول کے صدر تھے، پرنسٹن کی یونیورسٹی نیوجرسی میں شعبۂ عربی کے نگراں پروفیسر بھی رہے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں دینیات اور مشرقی زبانوں کے مطالعہ کے بعد انہوں نے خصوصیت کے ساتھ عربی کا مطالعہ کیا، پھر علمی زندگی سے ان کو نکال کر پادری بنا دیا گیا، ان کی مشہور کتاب اسلامیات کے سلسلہ میں ''اسلامی قانونِ وراثت'' ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران انھیں بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں نگراں پروفیسر کا عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور انھوں نے قبول کر لیا اور ایک عرصہ تک وہ بیروت یونیورسٹی سے متعلق رہے، یہاں ان کے حلقہ احباب میں مسلمان بھی شامل تھے، دمشق کی عرب اکاڈمی اور بغداد کی شاہی اکاڈمی نے ان کو اپنا ممبر منتخب کیا اور استنبول کی یونیورسٹی نے عیسائیت اور اسلامی دینیات کے موضوع پر اپنے یہاں انھیں غیر ملکی لکچرر منتخب کیا، ان کی ایک کتاب ''اسلام'' میرے سامنے ہے جو ناول سائز کے ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے پنگوئن بکس ادارہ نے شائع کیا ہے۔ یہ حالات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

۲۔ مار گولیتھ۔ کا پورا نام وافید سموئیل مار گولیتھ ہے۔ یہ عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا شمار ملک کے بڑے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ دمشق کی ''المجمع العلمی العربی'' اور برطانیہ کی ''المجمع القولی'' اور برلن کے مستشرقین کی تنظیم کے رکن ہیں ان کی ولادت ووفات دونوں لندن میں ہوئی، آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۹ء میں اسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، عربی شاعری پر ایک تصنیف کے علاوہ کئی عربی کتابوں کی تحقیق وتعلیق کی ہے (الاعلام زرکلی، ج ۲، ص ۳۲۶، ۳۳۰۔

قطعاً خلاف ہے۔

دعوے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو اصل دعویٰ تو نہیں لیکن اس کو مستحکم کرنے اور سطحی ذہن وفکر والوں کی عقلوں کو اپیل کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس جو احادیث رسول ہیں ان کی تعداد سات لاکھ ہے اس تعداد کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ سالہ دور نبوت میں ان کے رسول کے پاس سوائے بولنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا اور وہ شب وروز صرف حدیثیں ہی بیان کرتے تھے تبھی تو اتنی بڑی تعداد میں حدیثیں جمع ہوگئیں، عقل انسانی اس کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کرتی ہے۔ اپنے دعویٰ پر ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دوسری اور تیسری صدی میں حدیث کے نام پر بے انتہاء جھوٹی باتوں کو بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ حدیث ہے، یہ کلامِ رسول ہے۔ امام بخاری کے زمانہ میں تو جھوٹی حدیثوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ وہ ڈیڑھ سو حدیثوں کو جمع کرتے تھے تو اُن کو ان میں صرف ایک حدیث صحیح ملتی تھی باقی ساری حدیثیں غلط طور پر رسول کی طرف منسوب کردی گئی تھیں، اسی لئے امام بخاری اور مسلم کی روایتیں بھی جھوٹی اور موضوع ہونے کا احتمال ہی نہیں رکھتیں بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ دونوں حدیثوں کے مجموعے بھی جھوٹی سچی حدیثوں کے مجموعے ہیں معلوم نہیں ان میں کون حدیث صحیح ہے اور کون جھوٹی؟ صحیح اور موضوع حدیثوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا دشوار ہے، معترضین کے اعتراضات کا خلاصہ یہی ہے۔

## تیزاب کی بھری ہوئی بوتل

اب تک میں نے مستشرقین اور دشمنانِ اسلام کی تیز وتند اور تلخ ترین باتوں کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کی ہے جو آپ کے جذبۂ ایمانی کے لئے ناقابل برداشت اذیت رہی ہوگی، گویا یہ تیزاب کی بھری ہوئی بوتل ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ بھی ایمان ویقین کی انتہائی حساس اور نازک جلد پر پڑجائے تو یقیناً چھالے

پڑ جائیں، مگر اس کو صحیح شکل وصورت میں پیش کرنا ہماری مجبوری تھی۔ اس بحث کو اس کی پوری زہرناکی اور سمّیت کے ساتھ اگر پیش نہ کیا جاتا تو غلط فہمی پیدا کی جاسکتی تھی کہ حریف کی باتوں کو ہلکا کر کے بیان کیا گیا ہے، جو علمی دیانت کے خلاف ہے بس اسی مجبوری کی وجہ سے ہم نے قلم کو ایمان ویقین کے فولادی ہاتھوں میں دے دیا کہ وہ تیزاب کی اس بوتل کو کھول دے اور پوری طرح کھول دے تا کہ اسے گندی نالی میں بہایا جاسکے۔

## حدیث کس کو کہتے ہیں؟

بظاہر مستشرقین کا دعویٰ ان لوگوں کے لئے جو براہِ راست علمِ حدیث سے واقف نہیں اور اسلام کو انگریزی کتابوں سے سمجھا ہے اور دین کے اصل ماخذوں تک ان کے طائرِ فکر کی پرواز نہیں، اپیل کرنے والا ہے، لیکن جو لوگ اس سمندر میں اتر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سمندر کی بالائی سطح پر تموّج اور لہروں کا سلسلہ نظر آتا ہے وہ صرف مغالطہ اور فریب کی تیز وتند ہواؤں کے نتیجہ میں ہے اور پورا سمندر اپنی جگہ ساکن ہے، اس تموّج اور عارضی لہروں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔

مستشرقین نے سب سے پہلا دھوکہ حدیث کے مفہوم کو غلط بتا کر دیا ہے جو امتِ مسلمہ کے نزدیک بلا اختلاف تسلیم شدہ مفہوم کے خلاف ہے، ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ سنت یا حدیث ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر پوری مسلم سوسائٹی متفق ہوگئی ہے، پروفیسر شاخت نے صرف اقوالِ رسول کو حدیث کہا ہے، جب کہ دونوں باتیں بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ حدیث یا سنت کی تعریف جو پورے عالم اسلام میں کی جاتی ہے یہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ تعریف اصول حدیث کی تمام کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک حدیث یا سنت ان تمام امور کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں چاہے وہ اقوال رسول ہوں یا افعالِ رسول یا ایسے کاموں کا بیان جو رسولؐ کی موجودگی میں صحابہ کرام نے کیا ہو اور رسول

نے اس کی تائید کی ہو یا کم از کم اس سے منع نہیں کیا، اسی طرح رسولؐ کے اخلاق وشمائل یا خلقی صفات کا بیان رسول کی ذات سے متعلق کوئی بھی بیان جس کا تعلق بعثت سے پہلے زمانہ سے ہو یا بعثت کے بعد کے زمانہ سے۔ ان تمام امور کے بیان کو مسلمانوں میں حدیث کہا جاتا ہے۔

یعنی اسلام میں حدیث اور سنت کا مفہوم اس مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو مستشرقین بیان کرتے ہیں۔ شاخت نے صرف قولِ رسولؐ کو حدیث بتا کر تقریباً ۷۵ فی صد حدیثوں کو خارج کر دیا جب کہ دوسرے مستشرقین نے اس کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیا جو مسلمانوں کے حاشیہ خیال سے بھی باہر ہے۔ علمی دیانت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حدیث کی وہی تعریف کی جاتی جو اہلِ اسلام کرتے ہیں اور اسی مفہوم کو اپنے دعویٰ کی بنیاد بنانا چاہئے تھا لیکن انھوں نے قصداً صحیح مفہوم سے صرف نظر کر کے اپنے ذہن سے ایک اصطلاح گھڑ لی اور اسی فرضی مفہوم پر اپنے اعتراضات کا شیش محل کھڑا کر دیا۔

## حدیثوں کی کثرت باعثِ حیرت نہیں

اب ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ اسلام کے نزدیک حدیث کی جو تعریف بیان کی جاتی ہے اس کی روشنی میں مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیں تاکہ سچائی کھل کر سامنے آجائے۔

سب سے پہلے ہم اس اعتراض کو لیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں سات لاکھ حدیثیں ہیں اور بطور طنز واستہزاء یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رسولؐ کے پاس سوائے بولنے کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ حالاں کہ آپؐ تمام انسانوں کی طرح ضروریاتِ زندگی میں مصروف رہتے تھے، ایسی صورت میں لاکھوں حدیثوں کا انبار جمع نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ غلط طور پر رسول کی طرف اپنی باتوں کو منسوب کر دیا گیا ہو۔

ہم اس وقت سات لاکھ کی تعداد پر کوئی بحث نہیں کرتے کہ یہ تعداد صحیح ہے یا نہیں؟ البتہ اس کی تہہ میں جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کثرتِ حدیث کو دیکھ

کر اس کے جعلی اور مصنوعی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے، ہم سر دست صرف اسی پہلو پر گفتگو کریں گے، اصل بات یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ایک غلط دعویٰ کیا کہ حدیث صرف قول رسول کا نام ہے، حدیث کی یہ تعریف کر کے دانستہ طور پر دنیا کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی کیونکہ حدیث کی وہ یہ تعریف نہیں کرتے تو کثرتِ حدیث پر ان کا اعتراض ہلکا ہوتا ہے، ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں حدیث صرف اقوالِ رسول ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے، آپؐ نے ان سے منع نہیں فرمایا، یا آپؐ کی زندگی کے سارے واقعات وحادثات آپؐ کے مصائب، تبلیغی جدوجہد کی ساری کوششوں اور اس سلسلہ میں آپؐ پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر بھی احادیث میں شمار ہوتا ہے، اس کے آگے بڑھ کر آپؐ کی شکل وصورت، خدوخال، اخلاق وعادات ذہن ومزاج اور آپؐ کے جملہ اوصاف کا ذکر بھی حدیث کی تعریف میں آتا ہے۔ صرف قولِ رسولؐ ہی حدیث نہیں، حدیث کا لفظ آج چودہ سو برسوں سے بلا اختلاف اسی معنیٰ میں استعمال ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے حدیثوں کی کثرت پر اظہار حیرت کرنے سے پہلے اس کے دائرے کی وسعت کا اندازہ کر لینا مستشرقین کے لئے ضروری تھا کیوں کہ دیانت داری سے کام لیا جاتا تو ان کا اعتراض بے وزن ہوا جا رہا تھا۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جن حدیثوں میں اقوالِ رسول کو بیان کیا گیا ہے ان سے کئی گنا زیادہ ان حدیثوں کی تعداد ہے جن میں اقوالِ رسول کا کوئی ذکر ہی نہیں، بلکہ ان حدیثوں میں صورت واقعہ کا بیان ہے، کسی حادثہ کا ذکر ہے، کسی حالت کسی کیفیت کا بیان ہے، یعنی قولی حدیثوں کے مقابلہ میں غیر قولی حدیثوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، چند مثالوں سے بات واضح ہو جائے گی، آیئے اس نقطۂ نگاہ سے ہم حدیثوں کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

ہم سب سے پہلے شمائل نبوی کی حدیثوں کو لیتے ہیں جو حدیث کی اکثر کتابوں میں بَابُ صِفَةِ النَّبِیِّؐ کے عنوان سے ذکر کی جاتی ہیں۔ ان حدیثوں میں رسولُ اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال، روئے مبارک کی آب وتاب، چمک دمک، آپؐ کا رنگ، آپؐ کی آنکھیں، آپؐ کی بینی مبارک، دندان مبارک کا ذکر ہے، آپؐ کے موئے مبارک کہاں تھے، آپؐ کی ہتھیلیاں، قدم مبارک تلوئے، اعضا و جوڑ، سینے پر بالوں کی ایک لمی لیکر، مونڈھے پر مہر نبوّت، مہر نبوّت کی کیفیت، آپؐ کے تبسّم کا انداز، آپؐ کے بیٹھنے اور چلنے کی کیفیت، آپؐ کے قد وقامت کا بیان ہے، آپؐ کی پنڈلیاں کیسی تھیں، آپؐ کی شرم وحیا کا کیا عالم تھا؟ آپؐ کا کپڑا، آپؐ کے جوتے کیسے تھے، چادر مبارک کیسی تھی، کتنے بال سفید تھے، آپؐ نے کون سا خضاب استعمال فرمایا، بالوں کو آپؐ کس چیز سے دھوتے تھے، آنکھوں میں سُرمہ کس طرح لگاتے تھے، قدرتی طور پر آپؐ کی آنکھیں سُرمگیں تھیں یا نہیں، چلتے ہوئے آپؐ زمین پر قدم کیسے رکھتے تھے، غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکڑوں اوصاف کا بہت سے صحابہ نے اپنے اپنے ذوق ومزاج اور تأثر کے مطابق بیان کیا ہے، یہ تمام بیانات حدیث کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں کہیں کلام رسول نہیں آتا ہے[1]۔

کسی کے اوصاف کوئی شخص بیان کرتا ہے تو ہمیشہ غائبانہ یہ بیان ہوتا ہے صاحب اوصاف کی موجودگی میں نہیں، ان روایتوں میں حضورؐ کے اوصاف بیان کئے جارہے ہیں وہ حضورؐ کی عدم موجودگی میں بیان کئے جارہے ہیں، پھر ایسی صورت حال میں صاحب اوصاف کے بولنے اور اس کے کلام کا کیا سوال ہے؟ حالاں کہ یہ تمام بیانات حدیث کے ذیل میں آتے ہیں۔ حضور ﷺ کو لاکھوں آدمیوں نے دیکھا، زیارت کی، اسلام قبول کیا، انھوں نے دوسروں سے اپنے اسلام لانے کا اور حضور کے اخلاق اور گفتگو سے متأثر ہونے کا ذکر کیا اس کی تفصیل بتائی، یہ سب باتیں حدیث کہی جاتی ہیں جب کہ ان میں رسول کے قول کا نہ کوئی موقعہ ومحل ہے اور نہ ضرورت۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے شمائل ترمذی، جس میں میرے شمار کے مطابق چار سو سے کچھ کم روایتیں ہیں، ان میں سے پندرہ بیس روایتوں میں حضورؐ کا ایک جملہ یا دو جملے ہیں اور کسی روایت میں قولِ رسول نہیں حالانکہ سب پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بَابُ صِفَةِ النَّبِی کے عنوان سے ایک مستقل باب ہوتا ہے جس میں اسی طرح کی روایتیں آتی ہیں۔

حضورؐ کی زندگی حالات ومصائب کے مختلف نشیب وفراز سے گذری ہے، آپؐ کے خلاف مشرکین کی طرف سے سازشیں ہوتیں۔ نماز میں آپؐ کو ستایا جاتا، سجدہ کی حالت میں آپؐ پر جانوروں کی اُوجھ ڈال دی جاتی[۱]۔ گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا جاتا، آپ کے قتل کے لئے خفیہ کمیٹیاں ہوتیں، آپ کے قتل پر انعام کا لالچ دیا جاتا کمزور مسلمانوں کو ستایا جاتا، ان کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا، مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جاتا، شعب ابی طالب میں تین سال تک اذیت ناک زندگی گذارنی پڑتی ہے آپ کے دست مبارک سے سیکڑوں معجزات کا ظہور ہوا ان تمام باتوں کا بیان روایتوں میں آتا ہے، واقعات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، فرداً فرداً ضعفاء مسلمین کی اذیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے یہ تمام باتیں روایتوں میں مذکور ہیں ان تمام کو علماء اسلام حدیث میں شمار کرتے ہیں جب کہ ان میں سے کچھ ہی روایتیں ایسی ہیں جن میں کلامِ رسول کے دو چار جملے ہیں بقیہ سب بیان واقعہ ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر جو واقعات پیش آئے اس سلسلہ میں مختلف ابواب میں بہت سی روایتیں ہیں، کسی راوی نے عمرہ کے لئے جانے والوں کی تعداد بتائی، کسی نے مقام حدیبیہ میں مشرکین مکہ کی طرف سے روکاوٹ کا ذکر کیا، کسی نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ بھیجنے اور مشرکین مکہ سے گفتگو کے واقعہ کو بیان کیا۔ کسی نے حضرت عثمان غنیؓ کے شہید ہونے کی افواہ کا ذکر کیا اور اس سلسلہ میں بیعت شجرہ کی تفصیل بتائی، کسی نے مشرکین مکہ کے نمائندوں کے آنے کا ذکر کیا ان کے نام بتائے ان کے طرز کلام اور صلحنامہ کی تحریر کے وقت ''رسول اللہ'' کے لفظ پر جرح کا ذکر کیا، حضرت علیؓ کو اس لفظ کے مٹانے کا حکم دیئے جانے اور بعد میں حضور کے خود مٹانے کا ذکر کیا، کسی نے بیعت رضوان کے وقت حضورؐ کا اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیکر ان کی طرف سے بیعت لینے کا ذکر کیا، کسی راوی نے اسی۸۰ مشرکین کا ذکر کیا جو مسلح ہوکر جبل تنعیم سے خفیہ طور پر آرہے تھے کہ غفلت پاکر اسلامی لشکر پر حملہ کردیں اور بعد میں ان کی گرفتاری اور پھر بلا شرط

[۱] مسلم شریف ج ۲، ص ۱۰۸ باب اشتداد عضب اللہ اور بابُ مالقی النبیؐ من اذی المشرکین۔

ان کی رہائی کو بیان کیا، کسی راوی نے حدیبیہ میں پانی کی قلّت اور حضورؐ کے تیر دینے اور اسے کنویں میں ڈالنے اور پھر کنویں میں پانی کی کثرت کا ذکر کیا، کسی نے دب کر صلح کئے جانے پر حضرت عمرؓ کے جوش و جذبہ کا بیان کیا، کسی نے صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آپؐ پر اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُّبِیْنًا کے نازل ہونے کا ذکر کیا، کسی نے صلحنامہ لکھے جانے کے دوران حضرت ابوجندل کا ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے آنے اور حضورؐ کے ان کے واپس کرنے کا تذکرہ کیا۔

عرضیکہ صرف ایک واقعہ سے متعلق بے شمار حدیثیں کتابوں میں ہیں ان میں سوائے چند روایتوں کے کسی میں کلامِ رسول نہیں نہ اس کا موقعہ ہے نہ بیانِ واقعہ میں اُس کی ضرورت۔ لیکن اس سب روایتوں کو ہم اپنی اصطلاح کے مطابق حدیث کہتے ہیں اس سفر میں ایک مہینہ سے زیادہ وقت لگا ہوگا اس مدت میں ہونے والے واقعہ سے متعلق روایتیں ہیں جن میں زیادہ تر وہی روایتیں ہیں جن میں صحابی واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ حضور کا کلام کسی کسی روایت میں ایک دو جملوں میں ہے حالاں کہ یہ سب کی سب حدیثیں کہی جاتی ہیں اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضور ایک مہینہ تک مسلسل بولتے ہی رہے۔ کتنا سفیہانہ یہ خیال ہے؟

ایک بات اور بھی ذہن میں رکھیں کہ چودہ سو صحابہ کرام اپنے وطن سے ایک مہینہ کے کٹھن سفر پر نکلے ہیں، خانہ کعبہ کے طواف کا ارادہ ہی نہیں دل میں اس کی تڑپ اور تمنا رکھتے ہیں اور عین موقعہ پر ان کی امیدوں اور تمناؤں پر پانی پھر جاتا ہے اور طاقت کے ذریعہ روک دیئے جاتے ہیں، بے بسی کے ساتھ ناکامی کا صدمہ لے کر واپس ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ واپسی کے بعد بہت دنوں تک انھوں نے اپنی زندگی کے اس افسوسناک واقعہ کو یاد رکھا ہوگا اور دوسروں سے بیان کیا ہوگا، کیونکہ یہ ایک بالکل فطری تقاضا ہے کہ ایسے اہم واقعہ کا اکثر مواقع پر ذکر آئے۔ اگر بالفرض ان تمام آدمیوں نے اپنی اپنی زبان سے دوسروں کو یہ واقعہ سنایا اور حضورؐ کی باتوں کا ذکر کیا تو یہ سب کی سب حدیث کی تعریف میں آجاتا ہے اور ان میں کہیں رسول کے بولنے اور کلام کرنے کا

کوئی سوال نہیں، ایسی صورت میں حدیثوں کی کثرت پر اظہار حیرت کیوں ہے؟
ایک مثال اور لے لیجئے، فتح مکہ کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں ہیں اور واقعہ کے ایک ایک جزئیہ کو بیان کرتی ہیں۔ لیکن ان میں قولی حدیثیں کتنی ہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، کسی راوی نے مکہ پر چڑھائی کے اسباب کو بیان کیا اور مشرکین مکہ کی عہد شکنی کا ذکر کیا اور مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ کے ایک آدمی کے قتل میں تعاون دینے کا تذکرہ کیا، کسی نے لشکر اسلام کی تعداد بتائی، کسی نے اسلامی فوج کے جھنڈوں کا ذکر کیا، کسی نے حضورؐ کی اونٹنی اور آپؐ کے ردیف کا نام بتایا، کسی نے مکہ میں داخلہ کا ذکر کیا، کس نے حضور کے اعلان کا ذکر کیا کہ اگر کوئی فلاں فلاں جگہ چلا جائے تو اس کو امان ہے، کسی نے عام مشرکین کی معافی کو بیان کیا، کسی نے ان مشرکین کے نام بتائے جن کو کہیں بھی مل جائیں تو قتل کا حکم دیا گیا تھا، کسی نے حضرت عثمانؓ کا ایک مشرک کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے اس کے لئے سفارش کرنے کا ذکر کیا اور حضور کے چہرہ پھیر لینے اور اس مشرک کو قتل نہ کرنے پر تنبیہ کرنے کو بیان کیا، کسی نے حضرت عکرمہ اور دوسرے بڑے مشرکین مکہ کے بھاگ جانے کا ذکر کیا اور ان کی بیویوں کا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش اور جان بخشی کی درخواست کا ذکر کیا، کسی نے مشرکین کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی بیویوں کو ان کے نکاح میں بلا تجدید نکاح باقی رکھے جانے کا تذکرہ کیا، کسی نے فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کے قیام کی مدت اور مشرکین کے آنے اور اسلام قبول کرنے کو بیان کیا، کسی نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے اسلام لانے کا ذکر کیا، کسی راوی نے اس مشرک کا ذکر کیا جو حضورؐ کے فرمان کے مطابق گردن زدنی تھا اور خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا، کسی نے اس گفتگو کو بیان کیا جو مشرکین سے ہوئی سوال و جواب کے بعد عام معافی کا اعلان کیا گیا۔
غرضیکہ اس سلسلہ میں مختصر اور طویل بہت سی روایتیں ہیں ہر صحابی نے جو اس موقع پر موجود تھا مستقبل میں موقعہ و محل کے لحاظ سے اس واقعہ کے جس جزئیہ کے بیان کی ضرورت ہوئی اس کو دوسروں سے بیان کیا ہے، ان بیانات سے اسلام کے قوانین

اور اصول وضوابط اور شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں، مسائل کا علم ہوتا ہے اور کسی مسئلہ پر بطور حجت ودلیل ان روایتوں کو پیش کیا جاتا ہے جو کلامِ رسول پر مشتمل نہیں بلکہ افعال رسول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان تمام روایتوں میں نہ حضورؐ کو بولنے کی ضرورت ہے نہ کلام کی مصروفیت، ان تمام روایتوں کی تعداد کو دیکھ کر کوئی احمق ہی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے رسول فتح مکہ کے وقت مسلسل کئی ہفتوں تک بولتے رہے، یہ کیسی نادانی کی باتیں ہیں، یہ کوئی دقیق مسئلہ نہیں کہ اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے، ہر عامی اور ان پڑھ آدمی اس سچائی کو سمجھ سکتا ہے۔ اب آیئے ایک دو مثال احکام کی روایتوں کی بھی دیکھ لی جائیں اس سلسلہ میں دو مختصر مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ابوداؤد صحاح ستہ کی ایک مشہور کتاب ہے، اس میں "باب صفة وضوء النبی" سے لے کر "بابُ توقیت مسح الخفین" تک ایک سرسری جائزہ لیجئے، اس میں ۴۹ حدیثیں آئی ہیں ان میں صرف دو حدیثیں ایسی ہیں جن میں حضور کا ایک یا دو جملے ہیں ساری حدیثوں میں بیان واقعہ ہے، اسی طرح کتاب الصلوٰۃ میں بابُ وَقتِ الصَّلوٰۃِ النّبی سے لے کر بابُ کنس المسجد تک ۵۸ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جن میں بارہ روایتوں میں ایک جملہ یا دو جملے یا اس سے کچھ زائد جملے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے جاتے ہیں باقی روایتوں میں قول رسول نہیں صرف بیان واقعہ ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کے ذخیرہ میں قولی حدیثوں کا تناسب کیا ہے[1]۔

## ان مثالوں سے کیا ثابت ہوتا ہے

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئیں ان سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس طرح کی تمام روایتوں کا شمار مسلمانوں کے نزدیک حدیث ہے تو سات لاکھ تو کیا چودہ لاکھ حدیثیں بھی ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی ضرورت نہیں، اور جو اظہار حیرت کرے تو سمجھ لو کہ یا

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ابوداؤد مطبوعہ رشیدیہ جلد ا، ص ۱۴ تا ۲۰۔ وابوداؤد ج ا، ص ۵۸ تا ۶۴

تو دیوانہ ہے، یا قدرت نے اس کی سمجھ بوجھ کو سلب کرلیا ہے۔

ان مثالوں سے دو باتیں مستشرقین کے علی الرغم بہت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں کہ اس طرح کی روایتیں صحابہ کرام اگر زندگی بھر میں کبھی نہ کہتے تو بھی وہ ان کے ذہن سے نہیں نکل سکتی تھیں، کیوں کہ ہر شخص کو اپنا تجربہ اور مشاہدہ تا زندگی یاد رہتا ہے آپ میں کوئی شخص ایسا نہیں کہ اس کو اپنے بچپن کے اہم ترین واقعات یاد نہ ہوں اور ساٹھ ستر سال کی عمر ہونے کے بعد اس کی تفصیلات آپ نہ بیان کرسکیں۔ دوسری یہ حقیقت صاف ہوگئی کہ اس میں حضورؐ کے مسلسل بولنے کا جو طنز کیا جاتا ہے اس کا کوئی موقعہ نہیں، ایک معزز شخصیت کو ہزاروں آدمی دیکھتے ہیں اس کی بات کو سنتے ہیں ہر شخص اپنی اپنی جگہ دوسروں سے اپنے تجربات بیان کرسکتا ہے، ان بیانات کو اس شخصیت کے فضل وکمال کے لئے سند اور دلیل بنایا جاسکتا ہے، حدیثوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

وہ صحابہ کرام جو زندگی کے بیشتر لمحات میں آپؐ کے ساتھ رہے، مدینہ کی زندگی میں ہمہ وقت شرف معیت حاصل تھا، اسفار وغزوات میں فخر ہمرکابی حاصل تھا، رسول کے سارے اقوال وافعال ان کی نگاہوں کے سامنے تھے سارے واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے وجود میں آئے، صحابہ کرام نے آپؐ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ رکوع کیسے کرتے ہیں، قومہ میں کتنی دیر ٹھہرتے ہیں، سجدہ کیسے کرتے ہیں اور کتنی دیر تک کرتے ہیں، آپؐ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ کس ترتیب سے آپؐ وضو کرتے ہیں، ایک عضو کو کتنی بار دھوتے ہیں، آپؐ کو امامت کرتے ہوئے دیکھا، تہجد پڑھتے ہوئے پایا، آپؐ نے لشکر کی کمان فرمائی مشرکین سے صلحنامہ ان لوگوں کے سامنے مرتب ہوا، علاقے انھیں کی موجودگی میں فتح ہوئے۔ مالِ غنیمت ان کی موجودگی میں تقسیم ہوا۔ غرضیکہ سارا کاروبار زندگی رسول کا صحابہ کی آنکھوں میں تھا، حافظہ میں محفوظ تھا، صفحہ دل پر مرتسم تھا اس لئے کہ سارے واقعات چشم دید تھے تو ان کو یاد کرنے اور کتاب کی طرح رٹنے کی ضرورت ہی نہیں تھی صحابہ کرام رسول کی کتاب زندگی کی از

خود مکمل تفسیر بن چکے تھے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اور افعال و اعمال کے نقطۂ نگاہ سے بھی، جو لوگ سفر کرتے ہیں ملکوں میں سیاحت کرتے ہیں۔ برسوں وطن سے دور سفر میں گذارتے ہیں اور سالوں بعد جب اپنے وطن لوٹتے ہیں تو سارے واقعات دوسروں سے مجلسوں میں بیان کرتے ہیں اخبارات و رسائل میں لکھتے ہیں، چونکہ سارے واقعات خود ان پر گزرے ہیں اس لئے پوری تفصیلات کے ساتھ دوسروں کو سنا دیتے ہیں اس میں غلطی کا احتمال نہیں رہتا، صحابہ کرام تو حضور کی محبت میں دیوانے تھے، حضور کی اک اک ادا کی یاد کو اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تصور کرتے تھے وہ بھلا کیسے بھول سکتے تھے ان کو ایک ایک واقعہ کی تفصیل یاد تھی، صفحۂ ذہن پر نقش تھی جب کوئی ان سے حضورؐ کے متعلق کچھ دریافت کرتا تھا تو وہ پورے وثوق کے ساتھ گذشتہ واقعات و حالات کو بیان کر دیتے تھے اس بیان واقعہ میں کہیں کہیں ایک دو جملے حضورؐ کے آجاتے ہیں اس کو وہ لفظ بہ لفظ سنا دیتے ہیں، یہ فطرت انسانی ہے کہ جب کوئی شخص عظیم ترین شخصیت سے ملتا ہے تو اس کی ہر ادا اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور اگر اس کو اس عظیم شخصیت سے شرف ہمکلامی حاصل ہو گیا تو اس کی ہر بات اس کے دل پر نقش کالحجر ہو جاتی ہے، صحابہ کرام کی نگاہوں میں حضور کا مقام و مرتبہ جو تھا اس سے پوری دنیا واقف ہے تاریخ اسلام کا ہر صفحہ یہ داستان مفصل سناتا ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے کئی خاص مواقع پر چند جملے نکلے تو اس کو ان کا ذہن کیسے فراموش کر سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قولی حدیثوں کے مقابلہ میں بیان واقعہ کی روایتیں کئی گناہ زیادہ ہیں اس لئے یہ سوال ہی غلط ہے کہ حدیثوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے محفوظ رہی؟ اس کو خلاف عقل کہنا خود اپنی عقل کا ماتم کرنا ہے۔

بیان واقعہ کی یہ ساری روایتیں مسلمانوں کے یہاں حدیث کہی جاتی ہیں ان سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں اور کسی مسئلہ میں بطور حجت بیان واقعہ کی روایت کو پیش کیا جاتا ہے اور پوری امت کا فیصلہ ہے ’’اَلصَّحَابۃ کلّھُم عُدول‘‘ جب بیان

کرنے والا سچا ہے تو جو کچھ اس نے بیان کیا یقیناً صحیح ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا بھی صحیح اور درست ہے۔

ان چند مثالوں سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ہمارے ذخیرۂ حدیث میں قولی حدیثوں کی تعداد دوسری حدیثوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں اور اقوالِ رسول جن حدیثوں میں آئے ہیں وہ چند جملوں پر بالعموم مشتمل ہیں اس میں استثناء بھی ہے لیکن مستثنیات کی تعداد بہت کم ہے مثلاً حدیثِ شفاعت وغیرہ اس میں واقعہ کا تسلسل اور سوال و جواب کچھ اتنا یکساں ہے کہ ذرا توجہ سے ذہن اس کو محفوظ کرسکتا ہے۔ بعض روایتیں بہت لمبی ہیں لیکن وہ محل حیرت نہیں مثلاً کعب بن مالک کی روایت جو غزوۂ تبوک سے تخلف کے واقعہ کو پیش کرتی ہے وہ ٹائپ میں چھپی ہوئی بخاری کے چار صفحوں سے زائد میں ہے لیکن پوری حدیث میں قول رسول چند جملوں پر مشتمل ہے اور بقیہ پوری حدیث میں بیان واقعہ ہے اور خود صاحب واقعہ بیان کررہا ہے، اسی طرح واقعہ افک کی روایت بخاری کی طویل ترین روایتوں میں شمار ہوتی ہے، اس میں ایک واقعہ ایک دو موقعوں پر رسول کے چند کلمات ہیں بقیہ بیان واقعہ ہے، اور ہر شخص اپنا تجربہ اور مشاہدہ زندگی بھر یاد رکھتا ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے ان حالات میں یہ کہنا کہ اتنی حدیثوں کو کوئی حافظہ محفوظ نہیں رکھ سکتا، انسانی فطرت سے ناواقفی کی دلیل ہے اور ''پروفیسر شاخت'' کا سات لاکھ حدیثوں کی تعداد بتا کر دعویٰ کرنا کہ مسلمانوں کے رسول سوائے بات کرنے اور بولنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں کرتے تھے، کتنا غلط اور جھوٹا دعویٰ ہے۔

## علمی دیانت کے بجائے فریب

میری اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ''پروفیسر شاخت'' کا ذخیرۂ احادیث پر اظہار حیرت کرنا اور اس کو خلاف عقل ہونے کا دعویٰ کرنا اور مذاق اڑانا مہمل، غلط اور انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات اور حقیقتِ واقعہ کے کتنا خلاف ہے۔

اس نے اپنے دعویٰ کی بنیاد حدیث کے خودساختہ مفہوم پر رکھی اور حدیث کو قول رسول تک محدود کردیا جو مسلمانوں کی اصطلاح کے بالکل خلاف ہے، ایک جھوٹ بول کر اور اپنے قاری کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کر کے اس نے اعتراضات کا ایک طومار باندھ دیا، اگر اسلام پر اعتراض کرنا ہے تو علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ امّتِ مسلمہ کی مصطلحات کا پہلے غائر مطالعہ کرلیا جائے اس کے بعد اعتراض کی جسارت کرنی چاہئے، یہ تو سراسر علمی بددیانتی اور تحقیق کے نام پر فریب دہی کا واقعہ ہے، تمام اسلامی دنیا حدیث کی تعریف یہ کرتی ہے:

**ما اثر عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قول اوفعل اوتقریر اوصفةٍ خلقیة اوخلقیة اوسیرة سواء کان قبل البعثة ام بعدھا**[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول اور آپ کا عمل نقل کیا گیا ہو یا آپ نے لوگوں کے کسی فعل پر اپنی رضا ظاہر کی ہو یا آپ کی خَلقی اوصاف یا آپ کے اخلاق وعادات وخصائل یا حالات زندگی چاہے قبل بعثت کے ہوں یا بعثت کے بعد کے۔

اس تعریف سے حدیث کے دائرے کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، قول رسول حدیث کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ شاخت نے اس تعریف سے صرفِ نظر کرکے صرف اقوالِ رسول کو حدیث کہا اور اعتراض کرنا ہوا تو شمار میں ان تمام حدیثوں کو شامل کرلیا جس میں قول رسول کے بجائے بیان واقعہ ہے اور پھر ساری حدیثوں کو قول رسول مان کر ان کی تعداد سات لاکھ بتا کر یہ طنز کیا کہ مسلمانوں کے رسول ۲۳ سال تک مسلسل بولتے ہی رہے ہوں گے، عملی دنیا میں یہ کتنا بڑا فریب اور دھوکا ہے اور بدباطن افراد مستشرقین کی تحقیق پر ایمان لاکر اپنا دین وایمان تباہ کرلیتے ہیں۔

## احادیث کی سندیں جعلی ہیں

اب آیئے! دونوں مستشرقین کے اعتراض کے اس پہلو کو لیتے ہیں جو وہ کہتے

[1] توجیھہ النظر ص۳، السنة ومکانتھا ص۵۱، بحوالہ دراسات حدیث النبوی.

ہیں کہ حدیث علماء اسلام کی وضع کردہ ہیں، دوسری اور تیسری صدی میں ان کو مرتب کر کے غلط طور پر اس کو رسولؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

حدیث کی کتابوں میں ہر روایت کے شروع میں سند ہوتی ہے، بغیر سند کوئی روایت معتبر نہیں ہوتی ہے حدیث کا جامع کہتا ہے: **حَدَّثَنا فلان عن فلان عن فلان عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم** ............

جامعؑ کتاب کہتا ہے کہ مجھ سے میرے شیخ نے بیان کیا کہ انھوں نے فلاں سے سنا ان کے اوپر کے شیخ کہتے ہیں میں نے اپنے شیخ سے سنا وہ شیخ کہتے ہیں کہ میں نے فلاں صحابی سے سنا، صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ............اس کے بعد حضورؐ کی بات صحابی نقل کرتے ہیں اس کو محدثین کی اصطلاح میں سند کہا جاتا ہے۔

''گولڈ زیہر'' اور ''پروفیسر شاخت'' دونوں کہتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے کسی نے کسی سے نہیں سنا، سندیں فرضی ہیں اور مصنوعی طور پر ان جملوں کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں جو علماء مابعد کے طبع زاد ہیں، پوری دنیا میں اپنی علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے عالم گیر شہرت رکھنے والے محققین اس طرح کا سفیہانہ اعتراض کرتے ہیں اور ضدی بچوں کی طرح اپنی بچکانہ ضد پر جمے رہتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے، آخر یہ محققین اسی سرزمین پر رہتے ہیں یا کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں؟ ان کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے نظام اور قوانین واصول شہادت سے کوئی واقفیت ہے یا نہیں؟ ایک محدث جس کی دیانت داری اور صداقت کی دنیا قسمیں کھاتی ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں محدث نے بیان کیا یہ محدث بھی اپنے زہد وتقویٰ اور دین ودیانت کے لئے مشہور ہے وہ محدث کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں تابعی نے بیان کیا اور دنیا جانتی ہے کہ اس تابعی نے صحابی سے ملاقات کی ہے، پھر تابعی کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں صحابی نے بیان کیا اور صحابہ کی صداقت وراست بازی دوست دشمن سب کو تسلیم ہے، وہ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ فرماتے تھے کہ یہ محققین کہتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے ہیں، کیوں جھوٹ ہے؟ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، جب کہ دنیا کا سارا

نظام اسی اصول شہادت پر قائم ہے اگر اصولِ شہادت کو تسلیم نہیں کرتے ہو تو تم کو اپنا صحیح النسب ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ایک جج کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، گواہ شہادت دیتے ہیں کہ ہم نے اس کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے، جج ان شہادتوں پر یقین کر لیتا ہے اور وہ ملزم کو پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ سنا دیتا ہے یعنی چند آدمیوں کے بیان پر ایک انسان کو دنیا کی سب سے بڑی سزا دینے میں اس کو ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور اس کو دنیا میں جینے کا جو حق حاصل تھا چھین لیتا ہے۔ جج نے اپنے فیصلہ سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک انسان کی جان گواہ کی صداقت کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی، اس کی جان لی جاسکتی ہے لیکن گواہ کو جھوٹا نہیں کہا جائے گا، اپنے فیصلہ سے گواہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جج نے گواہ کی صداقت کو پرکھنے کے لئے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا ہے؟ بلکہ سچ کہا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ اپنی زندگی میں جھوٹ نہیں بولتا ہے؟ اور کبھی جھوٹ نہیں بولا؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ کے اخلاق اچھے ہیں، سماج میں بدنام آدمی نہیں ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ یہ کاروبار میں بددیانتی، جعل سازی اور فریب دہی نہیں کرتا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بہو بیٹی کی عصمت نہیں لوٹی؟ یا زندگی میں کبھی شراب نہیں پی؟ منشیات کا استعمال نہیں کرتا، کبھی کسی عورت کا اس نے اغوا نہیں کیا؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ نے بغیر کسی لالچ کے گواہی دی ہے؟ اور اس کو مدعیان قصاص کی طرف سے گواہی کا معاوضہ نہیں دیا گیا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ ایماندار، دیانت دار، انصاف پسند، نیک نام اور سچا ہے؟ ظاہر ہے کہ عدالت کے جج کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں اور نہ جج اپنے فیصلے میں اس کی ضرورت سمجھتا ہے، وہ صرف گواہ کے بیان کو دیکھتا ہے اور چند جرحوں کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے جب کہ ہر ہر قدم پر یہ احتمال موجود ہے کہ گواہ جھوٹ بول سکتا ہے، کرایہ کا گواہ ہوسکتا ہے، گواہی میں اس کی دلی عداوت کو دخل ہے اور کلی طور پر گواہ قابل اعتماد نہیں ہے اس کے باوجود صرف اس کے بیان پر ایک شخص کی

انتہائی قیمتی جان لے لیتا ہے اور اس سے دنیا میں جینے کا حق لے لیتا ہے۔

اس کے برخلاف ہمارا قانون شہادت یہ ہے کہ اگر گواہ فاسق وفاجر ہے، چھوٹے چھوٹے گناہوں پر اصرار کرتا ہے یا مدعی کا ممنون احسان ہے، بازاروں میں کھاتا پیتا ہے، فاسقوں جیسا لباس پہنتا ہے، داڑھی منڈاتا ہے، شراب پیتا ہے یا کوئی نشہ استعمال کرتا ہے، یا کبھی زنا کا مرتکب ہوا تھا یا کسی پاک دامن عورت پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی ہے ایسے تمام لوگوں کی شہادت مردود مانی جاتی ہے، ایک چاند کی رویت کی معمولی سی شہادت میں بھی مسلمان ان تمام اصول شہادت کی پابندی کرتا ہے، اس طرح کے تمام افراد کی گواہیاں ہمارے قانونِ شہادت میں ناقابل قبول ہیں۔

حدیثوں کی روایت کرنے والے راویوں کے لئے یہ قانونِ شہادت اور بھی سخت ہوجاتا ہے اور تاحدامکان بشری اس کی صداقت ودیانت داری کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔ دیانت وصداقت کی پرکھ کے لئے ہمارے یہاں جرح وتعدیل کی اتنی کھری کسوٹی ہے کہ آج تک دنیا میں کسی کی صداقت ودیانت کو پرکھنے کے لئے ایسی کڑی کسوٹی وجود میں نہیں آئی، اگر اس کسوٹی پر کسی ملک، کسی قوم اور کسی مذہب کی تاریخ پرکھی جائے تو اس کی صداقت کو ثابت کرنا دشوار ہوجائے۔

حدیثوں کے بیان میں جتنے راویوں کے نام آتے ہیں ان تمام لوگوں کو اسی کسوٹی پر کسا جاتا ہے اور جب یہ کسوٹی بتاتی ہے کہ یہ کھرا سونا ہے تب اس کی روایت کی قیمت متعین کی جاتی ہے اور اس کی بات کا اعتبار کیا جاتا ہے، ورنہ بڑے سے بڑا محقق ہو یا نامور عالم، مشہور دانش ور ہو یا مقبول ترین عابد وزاہد مانا جاتا ہو، دنیاوی عُہدوں میں سے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہو، جب حدیث کی سند میں اس کا نام آجائے گا تو تفتیش شروع ہوجائے گی، جرح وتعدیل کی کسوٹی پر اس شخص کی پوری زندگی کو پیش کیا جائے گا، اس کی ظاہری عزت وشہرت اور منصب کی عظمت اس جانچ اور پرکھ پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی ہے، اگر روایت کی صحت کے لئے جتنی شرطیں ہیں اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط کی بھی اس میں کمی ہے تو اس کی روایت اس کے

منہ پر ماردی جائے گی۔

مشہور اخباری راوی مجالد بن سعید ہمدانی کے شہر کوفہ میں مشہور محدث خالد الطحان سفر کرتے ہوئے پہنچے اور اس سے ملاقات کی اور جب وہ اپنے وطن واپس تشریف لائے تو ان کے وطن کے علماء نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کوفہ گئے اور مجالد بن سعید سے کوئی روایت نہیں لی؟ انھوں نے اس کی وجہ صرف یہ بتائی ''**لانہ کان طویل اللحیۃ**[۱]'' میں اس کے پاس گیا تھا لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ لمبی داڑھی دیکھ کر واپس چلا آیا اور اس سے کوئی روایت نہیں لی، مسلمانوں کے شعار داڑھی کی ایک حد ہے اس سے کہیں زیادہ لمبی داڑھی بدگمانی پیدا کرتی ہے کہ اس نے داڑھی کو سنت سمجھ کر شاید نہیں رکھا ہے، بس اتنی سی خامی کی وجہ سے اس کی روایت کا اس محدث کے نزدیک اعتبار ختم ہوگیا۔ خالد الطحان نے خود کوئی اور دوسری وجہ نہیں بتائی البتہ دوسرے علماء جرح وتعدیل نے اس راوی پر کڑی سے کڑی جرحیں کی ہیں، تفصیل اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(میزان الاعتدال ج ۳، ص ۴۳۱ وتہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۱)

آپ جامع صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری صحاح کی کتابیں پڑھتے ہیں تو یقین کیجیے کہ محض اُن کے سلسلۂ سند کو دیکھ کر آنکھ بند کر کے پوری امت نے ان کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ بخاری یا دوسرے ائمہ حدیث اپنی حدیث کی سند میں جتنے نام لیتے ہیں، ہم ہر ایک کو فرداً فرداً جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، راوی کی پیدائش سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات کو جان لینے کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ اس راوی کے معاصر علماء اور متدین حضرات اور فن اسماء الرجال کے ائمہ حضرات اس راوی کے بارے میں کیا خیال رکھتے تھے، اس کا سلسلہ نسب کیا ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے، اپنے اوپر کے راوی سے اس کی ملاقات یا سماع حاصل ہے یا نہیں، یہ ناموں میں اُلٹ پھیر تو نہیں کرتا ہے، دیانت داری اور تقویٰ

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۱ میزان الاعتدال ج ۳، ص ۴۳۰

کے لحاظ سے کس درجہ کا ہے، اس کے شیوخ حدیث کون کون ہیں؟ حافظہ کیسا ہے، بڑھاپے میں اس کا حافظہ کمزور تو نہیں ہو گیا تھا؟ اس کے عقائد مسلمانوں کے سواد اعظم کے خلاف تو نہیں ہیں؟ کسی گمراہ فرقہ کا داعی تو نہیں ہے؟ غیر مذہب کے اہل علم کے پاس اس کی نشست وبرخاست تو نہیں ہے، عام معاشرتی زندگی میں اس کی صداقت ودیانت پر بھروسہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟ غرضیکہ راوی کے بارے میں وہ تمام حالات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے اس کا سچا اور ثقہ ہونا ثابت ہوتا ہو، سند میں جتنے راویوں کے نام آئے ہیں فرداً فرداً ہر ایک نام کے بارے میں یہی کرید اور تلاش وجستجو اور تجسس کا عمل ہوتا ہے، جب اتنی چھان بین، تفتیش وتحقیق اور کُرید کرلی جاتی ہے اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ثقہ اور قابل اعتماد اور سچا ہے تب اس کی روایت کو قبول کیا جاتا ہے، اگر اسکی زندگی کے کسی پہلو پر دینی نقطۂ نگاہ سے حرف آتا ہے یا اس کی صداقت ودیانت مشتبہ ہے یا دین کے معاملہ میں وہ سچا اور مخلص نہیں ہے تو بلا رُو رعایت اس کو پایۂ اعتبار سے ساقط کردیا جاتا ہے اور اس کی روایت کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں نہ بادشاہانِ وقت کی پروا کی گئی اور نہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کا رعب داب اور جاہ وجلال ان کی کوتاہیوں کو واشگاف کرنے سے روک سکا، نہ ظاہری زہد وتقویٰ کی شاندار مسندوں پر متمکن افراد کے ظاہری زہد وتقویٰ سے متأثر ہو کر ان کی خامیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال کر ان کی روایتوں کو قبول کر لیا گیا، علم حدیث میں اس کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب اتنی کڑی کسوٹی پر آدمی کھرا سونا ثابت ہو سکا اور وہ کہتا ہے کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا تو ہم اس کا اعتبار کیوں نہیں کریں گے اور اس سے اُوپر کا راوی کہتا ہے کہ ہم نے فلاں سے سنا اور وہ بھی اتنا ہی کھرا سونا ہے تو اس پر اعتبار نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ جب کہ تم بدکردار سے بدکردار کی بات کو سچ مان کر عدالت میں گواہی لے کر ایک انسان کی انتہائی قیمتی جان لے سکتے ہو، پھر حدیث کے معاملہ میں تمہارا رویہ اس کے برعکس کیوں ہے؟

## احتیاط کا بلند تر معیار

اگر حدیث کے مجموعوں میں کوئی روایت ایسی آتی ہے جس میں روایت کرنے والے کسی بھی راوی کے نام سے اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کے ماہرین واقف نہیں ہیں، اس راوی کے حالات زندگی روشنی میں نہیں ہیں اور اس کی شخصیت کا واضح تعارف نہیں پایا جاتا ہے تو پوری روایت اس راوی کی وجہ سے قابل اعتماد نہیں رہ جاتی اور کسی مسئلہ میں اس روایت کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جاسکتا ایسے راوی کو محدثین کی اصطلاح میں مجہول راوی کہا جاتا ہے اور مجہول راوی کی کوئی روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ احادیث کے پورے ذخیرے میں جتنے راویوں کے نام آئے ہیں ان کی پوری اور مکمل فہرست ان کے حالات زندگی ان کے دین ودیانت وثوق واعتماد، ان کے شیوخ حدیث کا ذکر، ان کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کی رائیں وہ سب مسلمانوں کے پاس محفوظ ہیں، راویوں کے حالات پر مشتمل کتابوں کو فن اسماء الرجال سے تعبیر کیا جاتا ہے، معتمد اور معتبر حدیث کے مجموعوں میں جو مسلمانوں کے نزدیک قابل حجت ہیں ایسی تمام حدیثوں اور روایتوں میں آنے والے سارے ناموں کا ہمیں تفصیلی علم حاصل ہے اور کوئی گمنام راوی مستند احادیث میں دخل ہی نہیں پاسکتا۔

## اگر حدیثیں صحیح نہیں تو دنیا کی کوئی تاریخ صحیح نہیں

جب صورت حال یہ ہے تو کتنی دیدہ دلیری اور بے حیائی کی بات ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ حدیثیں دوسری اور تیسری صدی میں لکھی گئیں اور سندوں میں فرضی نام رکھ کر ان کا سلسلہ رسول کی ذات تک پہنچادیا گیا ہے، اگر اتنے سچے، دیانت دار اور کھرے انسانوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتا تو اس کو پوری دنیا کی تاریخ کی کتابوں کو دریا بُرد کردینا چاہئے کیوں کہ ان کے مرتب کرنے والوں کی دیانت وراستبازی اور ان کی نجی زندگی سے ہمیں کوئی واقفیت نہیں، تاریخ کی کتابوں کو لکھنے

والے کس قماش کے تھے، اپنی عملی زندگی میں کتنے فریبی، بدکردار، خوشامد پسند، حکومت کے تنخواہ دار، وظیفہ خوار، اور غلام رہے ہوں ایسا کوئی شخص کوئی تاریخ مرتب کرتا ہے تو آنکھ بند کر کے ساری دنیا کیوں اعتبار کر لیتی ہے؟ جب کہ تاریخ کے بیان کرنے میں قدم قدم پر جھوٹ کا احتمال موجود ہے اور رطب و یابس واقعات کے جمع کرنے کے شکوک وشبہات موجود ہیں، ایک مؤرخ گھر میں بیٹھ کر صدیوں کی تاریخ مرتب کر لیتا ہے اور پہلے کی لکھی ہوئی چند کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب مکمل کر لیتا ہے اس کو کیا معلوم کہ جن کتابوں کو اس نے سامنے رکھا ہے اس کے مصنّفین نے چشم دید حالات لکھے ہیں یا افواہوں کو قلم بند کیا ہے، اور پھر اس کے لکھنے میں اس کا کوئی مفاد تو وابستہ نہیں، کسی کی خوشامد کے زیر اثر وہ کتاب تو نہیں مرتب کر رہا ہے پھر مصنف اپنے مآخذ ومصادر جو بتاتا ہے اس کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے کا کیا ثبوت ہے، کیا اس سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد ثبوت ہے جو محدثین اپنے مآخذ کے متعلق بتاتے ہیں، اپنے شیخ کا نام بتاتے ہیں ان سے حدیث سننے کو بیان کرتے ہیں ان کے حالات بتاتے ہیں ان کے شاگردوں کے نام بتاتے ہیں ان کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی شہادتیں پیش کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے یہ حدیث سنی، اسی طرح ہر راوی اپنے شیخ کے بارے میں ساری تفصیلات جانتا ہے۔ اس احتیاط اور دیانت داری کے باوجود کہ اس سے زیادہ سچائی کا ثبوت ممکن نہیں پچاسوں ہزار فرشتہ صفت انسانوں کو تم جھوٹا کہتے ہو؟ یہ دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا عجوبہ ہے، اس کو علمی تحقیق کے نام پر ہٹ دھرمی، تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

انسانیت کا سارا اجتماعی نظام انھیں اصولوں پر چلتا ہے، ایک دوسرے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی بات پر اعتماد کرنا ضروری ہوتا ہے، پھر محدثین نے کیا جرم کیا ہے کہ ان کی سچائی اور صداقت و دیانت پر یقین نہیں کیا جاتا؟ ظاہر ہے کہ یہ علمی تحقیق کے نام پر اسلام کے صاف شفاف دامن پر داغ لگانے کی کوشش ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں، اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے آگے سدِّ

سکندری کھڑی کرنی ہے، یہودیت، صیہونیت، عیسائیت اور الحاد کے جراثیم دماغوں میں موجود ہیں جو صحیح فکر اور اخلاص و دیانت داری سے نام نہاد مفکرین کو محروم کرتے جا رہے ہیں۔ اب ان میں انصاف پسندی، راست بازی، صداقت و دیانت کے جوہر کا فقدان ہو چکا ہے، ورنہ صورت حال اتنی واضح ہے کہ محدثین نے روایتوں کے بیان کا جو بے لچک اصول مقرر کر رکھا ہے اور جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں اور جن صفات سے متصف ہونا راوی کے لئے لازمی قرار دیا ہے ان حالات میں تا حد امکان بشری جھوٹ اور غلط بیانی کے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں، اس کے باوجود کوئی ان کو سچا نہیں مانتا تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ خود جھوٹا ہے اور اس کے دل میں کھوٹ ہے۔

## مستشرقین کا سب سے بڑا اعتراض

احادیث کو نا قابل اعتماد ثابت کرنے کے لئے انھوں نے سب سے زیادہ زور اس بات کو ثابت کرنے پر لگایا ہے کہ رسول نے حدیث کو لکھنے سے خود منع فرمایا ہے اور یہ حکم تاکیدی تھا، اس لئے صحابہ نے حدیث لکھنا چھوڑ دیا اور جس نے پہلے سے لکھ رکھا تھا اس نے بھی اس کو مٹا دیا یہی وجہ ہے کہ اس دور کا کوئی مجموعۂ حدیث دریافت نہیں ہوا۔

دوسرے یہ کہ عربوں میں یوں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج برائے نام تھا، لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے چند افراد تھے جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اس لئے بھی حدیث کے مجموعے تیار نہیں ہوئے اور رسول کی طرف سے ممانعت اور حوصلہ شکنی کی وجہ سے احادیث کی حفاظت کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں کی گئی اور شاید اس کی کوئی مذہبی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر رسول بھی لوگوں کو لکھنے پر آمادہ کرتے اور صحابہ خود بھی سنی ہوئی حدیثوں کو قلمبند کر لیتے، جیسا کہ پابندی کے ساتھ قرآن کریم لکھنے کا اہتمام تھا، اور نزول وحی کے بعد فوراً کسی کاتب کو بلوا کر لکھ لیا جاتا تھا، چونکہ حدیثوں کا دین سے کوئی تعلق اس طرح کا نہیں تھا جو قرآن سے تھا اس لئے

اس کی حفاظت کا بندوبست نہیں کیا گیا۔

## حقیقت کیا ہے؟

ہم اس پہلو پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ مستشرقین کے اسی فریب اور پروپگنڈے نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو گمراہ کیا اور وہ بھی مستشرقین کی آواز میں آواز ملا کر بولنے لگے اور پورا ایک گمراہ فرقہ ملت اسلامیہ میں پیدا ہو گیا اور مستشرقین کا یہی مقصد بھی تھا۔

انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر احادیث کو نا قابل اعتبار ثابت کر دیا جاتا ہے تو مسلمانوں کا دین ایک معمہ بن جائے گا، ان کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، ان کی شکل وصورت بگڑ جائے گی، اسلامی معاشرہ اور عائلی زندگی جو اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، کیوں کہ ان تمام احکام کا قرآن میں بیان مجمل ہے، احادیث ان کے صحیح خدوخال کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور جب حدیثیں نا قابل اعتبار ہو جائیں گی تو نہ نماز کی کوئی متعینہ شکل رہ جائے گی اور نہ زکوٰۃ کا مستحکم مالی نظام، نہ روزہ نہ حج وعمرہ کے اصول وقواعد باقی رہ جائیں گے، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان بدبخت وبدنصیب مسلمانوں کی عقل پر ماتم کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں جنھوں نے چند یہودیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنا دین اور اپنی دنیا دونوں تباہ کر لی، ان کو سب سے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے تھی کہ آخر یہ مستشرقین جو کچھ کہتے ہیں اس میں سچائی ہے یا نہیں، حقیقت کیا ہے؟ اپنے گھر کا جائزہ لینا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کہہ دیا کہ ایک صدی تک احادیث نہیں لکھی گئیں اور ان کو آنکھ بند کر کے مان لیا، اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا، احادیث پر غائرانہ نظر ڈالی ہوتی، مسلم محققین نے تدوین حدیث کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی کہ مستشرقین کا یہ دوسرا سب سے بڑا جھوٹ اور سب

سے بڑا افریب ہے جو احادیث کی عظمت واہمیت کو کم کرنے کے لئے علمی دنیا کو دیا گیا ہے، پوری اسلامی تاریخ اس جھوٹ اس فریب کے خلاف اوراس کی پھیلائی ہوئی غلط بیانی کی تکذیب کرنے اوراس کے خلاف شہادت دینے کے لئے موجود ہے، بشرطیکہ آنکھوں میں روشنی ہواور سینوں میں دل ہو جس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔

## مطلع عرب پر علم کا سورج طلوع ہو گیا

عرب میں لکھنے کا رواج ایّام جاہلیت میں یقیناً کم تھا کیوں کہ ان کی زندگی میں اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی ،لیکن جب عرب کی افق پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو عربوں کی زندگی جو جہالت کی تاریکیوں میں گم تھی یک بیک نئے سورج کی روشنی میں نہا گئی ،عربوں کی زندگی میں جو ہمہ جہتی انقلاب آیا، اسلام نے ان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے اثرات ڈالے،انھیں اثرات میں یہ لکھنے پڑھنے کا رواج بھی ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں لکھنے پڑھنے والوں کی جو کمی تھی ہجرت کے بعد مدنی زندگی کا آغاز ہوتے ہی اس میں انقلاب عظیم برپا ہو گیا کیوں کہ سب سے پہلی وحی نے عَلَّمَ بِالْقَلَمْ کی طرف اُن کی توجہ کو منعطف کردیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے کے رواج کو آگے بڑھایا، کیوں کہ اب شب وروز معاہدوں کی نوبت آرہی ہے اور دستاویزوں کے لکھنے کی ضرورت پیش آرہی ہے، حکم ناموں اور احکام وقوانین کے نفاذ کے لئے ہدایت ناموں کا لکھنا ضروری ہو گیا تھا، اس لئے لکھنے پڑھنے کی سمت پوری سرگرمی سے قدم بڑھایا گیا، ان عہد ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں عیسائیوں اور مشرکین عرب اور قبائل عرب کے سرداروں کے درمیان ہوئے اور پھر مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان تحریروں کا تبادلہ ہونے لگا، دعوتی خطوط جاری کئے گئے جواب تک کی دریافت کے مطابق کچھ کم وبیش ان کی تعداد ڈھائی سو تک پہنچ جاتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) نے لکھا ہے، پھر مسلمانوں کی کتاب قرآن کا نزول مجبور کررہا تھا کہ جلد از جلد

ہر مسلمان لکھنا پڑھنا سیکھ لے، کیوں کہ کتابت وحی کی ضرورت تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کاتبانِ وحی کی مجموعی تعداد بعض اسلامی مؤرخین کی تصریح کے مطابق ۴۲ ہو جاتی ہے، کچھ مؤرخین ۲۶ ناموں کو دریافت کر سکے، میں نے اپنے طور پر جستجو کی تو مجھے ۱۹ ناموں کی فہرست ملی جن کی کتابت وحی کی صراحت موجود ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے بڑی تیزی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی طرف قدم بڑھائے اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ بھی ہے جب جنگ بدر میں ستر ۷۰ مشرکین گرفتار ہوئے تو ان کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور تاوانِ جنگ لے کر چھوڑ بھی دیا گیا لیکن ان میں متعدد افراد ایسے تھے جو زر فدیہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کو حکم دیا گیا کہ ان میں جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں وہ مسلمانوں کو ایک مقررہ مدت تک لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو ان کو رہا کر دیا جائے گا، چنانچہ اس پر عمل[1] ہوا، یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔

مدینہ پہنچ کر یہودیوں کی مختلف آبادیوں سے متعدد معاہدے ہوئے اور دستاویزیں لکھی گئیں، یہودیوں کی کاروباری زبان سریانی تھی اس لئے اظہار خیال کے لئے تحریروں میں وہ یہی زبان استعمال کرتے تھے، عربی قصداً نہیں لکھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت سے فرمایا کہ سُریانی زبان سیکھ لو مجھے یہودیوں پر اعتماد نہیں ہے تاکہ ان سے خط وکتابت میں آسانی ہو، چنانچہ انھوں نے پندرہ دنوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ سُریانی تحریروں کو پورے اعتماد سے پڑھ کر سمجھ لیتے اور سُریانی زبان میں اس کا جواب بھی لکھ دیتے تھے[2]۔ مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج ہو چلا تھا یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمانوں میں علمی ذوق وشوق اب بہت بڑھ چکا تھا، کیوں کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں تعلیم کے معاملہ میں سب سے آخر میں عورتوں کا نمبر آتا ہے اور آج بھی نوے فی صد عورتیں اَن

---

[1] مسند احمد بن حنبل مطبوعہ دار صادر بیروت، ج ۱، ص ۲۴۷

[2] مشکوٰۃ، ص ۳۹۹، طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۱۱۵، ترمذی، ج ۲، ص ۹۶۔

پڑھ ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس اُمّی قوم نے جب تعلیم کی طرف توجہ کی تو ان کی سرگرمیوں میں عورتیں بھی شریک ہوگئیں جیسا کہ ایک روایت میں شفاء بنت عبداللہ سے اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کتابت سیکھنے کی صراحت موجود ہے۔ (ابوداؤد، ج ۲، ص ۵۴۲) بحرین، عمان اور یمن کے عاملوں کو صدقات وزکوٰۃ وغیرہ کے قوانین واصول لکھ کر دیئے جاتے تھے اور دوسرے حکم نامے اور ہدایت نامے جاری[۱] ہوتے رہتے تھے، حضرت علیؓ کی نیام میں بھی اس طرح کی کچھ دستاویزی تحریریں رہتی تھیں[۲]۔

## کتابت سے کیوں اور کس کو منع کیا گیا؟

اب پورے مدینہ میں تعلیم وتعلّم پورے شباب پر آچکا تھا اب نہ کاتبوں کا فقدان تھا اور نہ تحریر کے وقت کاتب کی تلاش کے لئے تگ ودو کرنے کی ضرورت تھی کیوں کہ لکھنے کا فن عام ہو چکا تھا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حدیث کی کوئی دینی اہمیت تھی تو لوگوں نے کیوں نہیں لکھا؟ بلکہ اُلٹے ان کو منع کیا گیا، مستشرقین نے اس بحث میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے لیکن فن حدیث سے نابلد ہونے کی وجہ سے حکم ممانعت کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے یا تجاہل عارفانہ کر گئے، یقیناً ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ جس نے قرآن کے سوا لکھا ہو اس کو مٹا دے[۳] لیکن اسی کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت بھی ملا لیجئے تو ممانعت کی نوعیت معلوم ہو جائے گی، جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ میں حضورؐ کے سامنے حدیثوں کو لکھ لیا کرتا تھا تو کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہر بات لکھنے کی نہیں ہوتی، حضور کبھی برہمی کی حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی غضب کے حال میں، تو میں نے حضورؐ سے لوگوں کی اس بات کو کہا تو آپؐ نے اپنے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ یاد رکھو ہر حال

---

۱، ۲ مشکوٰۃ ص: ۳۰۰، کتاب القصاص وابوداؤد، ج: ۱، ص: ۲۱۸، باب فی زکوٰۃ السائمۃ ص: ۲۱۹۔

۳ ابوداؤد، ج ۱، ص ۵۱۳، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔

میں اس سے حق بات ہی نکلتی ہے ناحق بات کسی حالت میں میری زبان سے نہیں نکل سکتی[1]۔ ایک طرف غیر قرآن لکھنے کی ممانعت اور جو لکھا جاچکا اس کو مٹادینے کا حکم اور دوسری طرف حضورؐ کے سامنے حدیثوں کو لکھنے کا اعتراف اور حضور کی جانب سے اس کی تائید اور حوصلہ افزائی، بظاہر تم کو اس میں تضاد نظر آتا ہے لیکن جو لوگ فن حدیث کے رمز شناس اور مزاج داں ہیں وہ ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں پاتے ہیں کیوں کہ ایسے تمام مواقع پر جمع تطبیق کے اصول سے کام لیا جاتا ہے اور اسی اصول کی روشنی میں حدیث کا مصداق ومحمل پورے اعتماد کے ساتھ متعین ہوتا ہے دونوں حکم اپنی جگہ باقی ہے، اور دونوں پر عمل ہوا، غیر قرآن لکھنے کی ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے کہ جو لوگ قرآن لکھتے ہیں وہ قرآن کے ساتھ کوئی دوسری بات ہرگز نہ لکھیں چاہے وہ قرآن کی تفسیر وتشریح یا کسی لفظ کی وضاحت سے متعلق ہو یا کوئی اور وظیفہ یا دعا، کیوں کہ جو لوگ آئندہ کلام الٰہی کے مزاج داں نہیں ہوں گے وہ غیر قرآن کو قرآن میں مدغم کردیں گے، کلامِ الٰہی میں تحریف ہوجائے گی، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے لئے جو مصحف لکھوا رہی تھیں تو کاتب سے فرمایا کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالْوُسْطٰى جب لکھو تو لفظ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کے بعد لفظ ''صلوۃ العصر'' لکھنا[2] ظاہر ہے کہ صلوٰۃ العصر کا لفظ قرآن میں نہیں ہے اگر یہ باقی رہ جاتا تو لوگ اس کو قرآن کا ایک لفظ سمجھ لیتے، اسی طرح ابی بن کعب نے اپنے ذاتی مصحف پر یاد کرنے کے لئے دعاء قنوت لکھ رکھی تھی، ایک مستشرق کو یہ روایت مل گئی تو اس نے دعویٰ کردیا کہ قرآن میں دو سورتیں نہیں لکھی گئیں جب کہ ابی بن کعب کے مصحف میں درج تھیں؟ یہ غلط فہمی صرف اس لئے ہوئی کہ جس کاغذ پر قرآن لکھا تھا اسی کاغذ پر ایک سمت یہ دعا بھی لکھ رکھی تھی، اگر قرآن کو غیر قرآن سے اتنی تاکید کے ساتھ الگ نہ رکھا جاتا تو مستقبل میں سخت اختلافات پیدا ہوجاتے، بعض قرأۃ شاذہ ہیں ایک دو لفظوں کا وجود اسی صورت

---

[1] ابوداؤد، ج:۱، ص:۵۱۳، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔

[2] ابوداؤد، مطبوعہ رشیدیہ دہلی، ج۱، باب الصلوٰۃ الوسطیٰ، ص۵۹۔

حال کا نتیجہ ہے اسی لئے جمہور امت میں قرأۃ شاذہ کا اعتبار نہیں کیا گیا[۱] کتابت کی ممانعت انھیں خاص حضرات اور خاص حالات میں تھی اور اجازت جو دی گئی وہ عام لوگوں کے لئے تھی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام میں کچھ حضرات حدیثیں لکھ لیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لکھنے کا بھی علم تھا اور کبھی ان کو منع نہیں فرمایا بلکہ بعض صحابہ سے آپ نے خود فرمایا کہ لکھ لیا کرو، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک انصاری کا ذکر ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کی کہ مجھے حدیثیں یاد نہیں رہتی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ لکھ لیا کرو[۲] بہت سے حکم نامے اور صدقات وزکوٰۃ کے قوانین ان کو باقاعدہ لکھ کر دیئے جاتے تھے اور جن عاملوں کو یہ کتاب الصّدقات دی جاتی تھیں وہ ان کو محفوظ رکھتے تھے اور اسی کے مطابق زکوٰۃ کی وصولی کرتے تھے[۳] اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو بلا استثناء حدیثوں کو لکھنے سے روک دیا تھا، یہ علمی دنیا کو دھوکا اور فریب دینا ہے، سچائی کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لوگ اپنی یادداشتوں میں حدیثیں لکھتے رہتے تھے، بہت سے صحابہ کرام کے پاس بہت سی حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں، تاریخوں میں تلاش وجستجو کے بعد ان کے تذکرے ملتے ہیں، مزید تلاش وجستجو جاری رکھی جائے تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے، چند صحیفوں کی نشاندہی اجمالی طور پر آپ کے اطمینان کے لئے کی جاتی ہے۔

## عہد صحابہ کے مجموعہائے حدیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مجموعہ حدیث **الصحیفة الصّادقه** (بخاری، ج ۲، ص ۲۲، کتاب العلم، باب کتابت العلم) صحیفۂ[۴] علی ابن ابی طالب

[۱] روح المعانی علامہ محمود آلوسی مطبوعہ مصطفائیہ دیوبند۔ [۲] ترمذی، ج ۲، ص ۱۰۶۔
[۳] ابوداؤد، ج ۱، ص ۱۹-۲۱۸، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ السائمۃ۔
[۴] ابوداؤد، ج ۱، ص ۲۷۸۔

رضی اللہ عنہ کتاب الصدقہ[۱] جس میں زکوٰۃ، صدقات اور عشر وغیرہ کی حدیثیں تھیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کے پاس موجود تھی جیسا کہ متعدد روایتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے، خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالکؓ کے متعدد صحیفے[۲]، صحیفۂ[۳] عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ، صحیفۂ[۴] عبداللہ بن عباس صحیفۂ[۵] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، صحیفۂ[۶] جابر بن عبداللہؓ، صحیفۂ[۷] سمرۃ بن جندبؓ، صحیفۂ[۸] سعد بن عبادہؓ، اور ابوہریرۃ[۹] رضی اللہ عنہ کے صحیفوں کا ذکر روایتوں اور تاریخوں میں ملتا ہے۔

ان میں سے بعض مجموعے ضخیم ترین تھے، اس کا اندازہ ابوہریرہ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کا سننے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں صرف عبداللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں کیوں کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیتے تھے اور میں اس وقت نہیں لکھتا[۱۰] تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی روایتیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے زیادہ تھیں، اس کی روشنی میں جب ہم حدیثوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو حضرت ابوہریرہ کی پانچ ہزار تین سو چونسٹھ روایتیں ملتی ہیں، یا اس سے کچھ کم وبیش، اس لئے ابوہریرہؓ نے جب آخر عمر میں حدیثوں کو لکھا تا کہ ضائع نہ ہو جائیں تو ان کے پاس جو مخطوطہ رہا ہوگا، اس میں یقینی طور پر پانچ ہزار سے زیادہ حدیثیں رہی ہوں گی، اس کی تائید اس اندراج سے بھی ہوتی ہے جو فتح الباری میں ہے کہ عمرو بن امیّہ ضمری نے بیان کیا کہ ابوہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے گئے تو انھوں نے مجھے بہت سے کتابیں دکھائیں اس کے الفاظ ہیں **فارانا کتباً کثیرۃ من حدیث رسول اللہ صلی**

---

۱۔ ابوداؤد، ج ۱، ص ۲۱۹، ۲۱۸۔
۲۔ المستدرک للحاکم، ج ۳، ص ۵۷۳۔
۳۔ الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۳۷۔
۴۔ تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۴۳۳۔
۵۔ جامع بیان العلم وفضلہ علّامہ ابن عبدالبر۔
۶۔ التاریخ الکبیر (بخاری)، ج ۷، ص ۱۷۶۔
۷۔ تہذیب التہذیب، ج ۴، ص ۲۳۶۔
۸۔ کتاب الثقات، ص ۳۹۶، بحوالہ دراسات حدیث بنوی، ج ۱، ص ۱۱۰۔
۹۔ فتح الباری، ج ۱، ص ۲۱۵، مطبوعہ سلفیہ۔
۱۰۔ بخاری، ج ۲، باب کتاب العلم۔

اللہ علیہ وسلم[1]۔ اس لئے ابو ہریرہ کے پاس جو مخطوطہ تھا اس میں پانچ ہزار حدیثیں لکھی ہوئی تھیں تو بقول ابو ہریرہؓ عبداللہ ابن عمرو کی حدیثیں ان سے زیادہ تھیں تو ان کے صحیفے الصحیفۃ الصادقہ میں پانچ ہزار سے زیادہ ہی حدیثیں لکھی رہی ہوں گی اگر دونوں کو برابر بھی نیچے اتر کر مان لیا جائے تو کم از کم دس ہزار حدیثیں ضرور لکھی ہوئی دونوں حضرات کے پاس موجود تھیں اور عبداللہ بن عباسؓ کے مخطوطوں میں لکھی ہوئی حدیثوں کی تعداد کو اس میں شامل کر لیا جائے جس کے متعلق ان کے غلام کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کے صحیفے ایک اونٹ کا پورا بوجھ[2] تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف تین صحابہ کے پاس کتنی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں میں نے آپ کے سامنے گیارہ صحیفوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے صرف تین صحیفوں میں لکھی ہوئی حدیثوں کی تعداد مستشرقین کی اڑائی ہوئی افواہ کی قلعی کھول دینے کے لئے کافی ہیں ابھی آٹھ صحیفوں کی لکھی ہوئی حدیثوں کا میں نے کوئی ذکر نہیں کیا اور ان کے علاوہ ۴۲ صحابہ کے پاس جو لکھی ہوئی حدیثیں تھیں ان کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے انھیں تین مخطوطوں سے اندازہ کر لیجئے۔

قیاس کُن زگلستاں من بہار مرا،

## صحابہ کا مقام ومرتبہ

اس بحث میں اگر مستشرقین نے صحابہ کرام کے مقام ومرتبہ کو پیشِ نظر رکھ لیا ہوتا تو وہ بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتے تھے۔ ان کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اصحاب رسول کا کیا مقام اور درجہ ہے؟ کیوں کہ یہ ایک نبیادی بات ہے، پوری امت مسلمہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ **الصحابۃ کلھم عدول** ہر ہر صحابیٔ رسول سراپا صداقت اور مجسم راست بازی اور دین ودیانت

---

[1] فتح الباری، ج۱، ص۱۴۸۔

[2] تہذیب التہذیب، ج۸، ص۴۳۳۔

کا پیکر ہے اس لئے رسول کے بارے میں جو واقعہ یا بات وہ نقل کرتے ہیں اس میں کسی کے نزدیک شک وشبہ کا احتمال نہیں رہتا ہے کیوں کہ ان کو اپنے رسول کا تہدیدی فرمان یاد ہے **من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار.** جو میری جانب کسی غلط بات کو منسوب کرے گا اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم بنالینا چاہئے۔ اس صورت حال میں کسی صحابی کی زبان سے رسول اللہؐ سے متعلق کوئی غلط بات نکل ہی نہیں سکتی، پھر رسول کی عظمت ومحبت جو ان کے دلوں میں پیوست تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے حالات پڑھو تو حیرت واستعجاب میں ڈوب جانا پڑتا ہے، اس لئے اپنے رسول کی ہر بات، ہر کام، اور ہر واقعہ ان کے دلوں پر نقش ہے جب کوئی شخص ان سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ دریافت کرتا ہے تو اُن کو رسول اللہؐ کا کوئی نہ کوئی واقعہ یاد آجاتا ہے اور وہ توضیح مسئلہ کے سلسلہ میں اس کو بیان کردیتے ہیں اسی کا نام حدیث ہے۔
حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی ذات کو جو مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اس نے پہلی ہی صدی میں جہاں دور دراز علاقوں تک حدیثوں کو پہنچادیا وہیں یہ بھی ہوا کہ تمام صحابہ کی حدیثوں کو اُن سے ملاقات کے لئے آنے والے تابعین نے ان کی زندگی ہی میں سپردِ قرطاس کردیا اور حدیثوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا، میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہے جاتے ہیں، دس سال کی عمر میں آپؐ کی خدمت کے لئے پیش کئے گئے پھر کسی وقت بھی آپ سے جدا نہیں ہوئے، پورے دس سال سفر وحضر میں ساتھ رہے، اندر باہر کا کام کرتے، گھر کی زندگی سے لے کر باہر کی زندگی تک کے واقعات ان کی نگاہوں کے سامنے آئے، حضورؐ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی، حضورؐ کی وفات کے بعد بصرہ چلے آئے اور یہیں ۹۳ھ میں ۱۰۳ سال کی عمر میں وفات[۱] پائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً ۸۳ سال زندہ رہے ان کی

[۱] شذرات الذہب ابن العماد حنبلی، ج۱، ص۱۰۰ و۱۰۱۔

ذات مرجع خلائق بن گئی اور ہزاروں افراد ایک صحابی رسول ہونے کی حیثیت سے ان کی زیارت کے لئے آتے رہے کیوں کہ ان کی وفات کے وقت روئے زمین پر صرف تین صحابہ اور موجود تھے اس لئے پوری دنیائے اسلام سے آپ سے ملنے کے لئے لوگ آتے رہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ زیارت کرنے والوں کے سامنے سوائے ذکر رسولؐ کے اور کیا رہتا ہوگا، معلوم نہیں کتنے زائرین اور ملاقاتیوں کے سامنے انھوں نے حضور کے اقوال وافعال اور واقعات کو نقل کیا ہوگا، کسی بات کے بھولنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں کیوں کہ ساری باتیں آپ کے ذاتی تجربات ومشاہدات سے تعلق رکھتی تھیں اور ہر انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو تا زندگی یاد رکھتا ہے اس کے باوجود مسند انس بن مالکؓ میں ہمارے شمار کے مطابق ان کی صرف دو ہزار ایک سو اڑتیس روایتیں ہیں جن کو ان کے دو سو ایک شاگردوں نے ان سے سنا[1] اور ان کو نقل کیا ہے اور یہ وہ شاگرد ہیں جنھوں نے اپنے شاگردوں سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے اس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ صحابی کے حافظہ میں وہ روایتیں تو ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئیں مگر تابعین کو ان روایتوں کو ایک بار سن لینے کے بعد یاد رکھنا ممکن نہ تھا اس لئے یقیناً ان تمام شاگردوں نے ان کی تمام حدیثوں کو ضرور لکھا ہوگا تبھی بعد کی نسلوں کے سامنے انھوں نے بیان کیا اس طرح صرف حضرت انس کے حدیثوں کے ۲۰۱ مخطوطے تیار ہو گئے ہوں گے اور پوری دنیا میں پھیل گئے ہوں گے۔ خود حضرت انس اپنے بیٹوں اور پوتوں کو حدیثوں کے لکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور خود دوسرے تلامذہ کو بٹھا کر حدیثوں کا املا بھی کراتے تھے جیسا کہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ حسان الانباری کا بیان ہے کہ ہم واسط حجاج کے پاس اس کے ایک عامل کی شکایت لے کر گئے ہمارے ساتھ ایک وفد تھا جب ہم حجاج کے دیوان میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ درمیان میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ حدیثیں لکھ رہے ہیں ہم نے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ خادم رسولؐ حضرت انس بن مالکؓ ہیں میں نے ایک حدیث کی

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۹۸ تا ۲۹۲۔

درخواست کی تو آپ نے فرمایا: **سمعتُ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم یقول مر بالمعروف وانہ عن المُنکر ما استطعت**[۱]۔

۱۔ تاریخ بغدادی، ج۸، ص۲۵۹، مطبوعہ دارالفکر۔

غرضیکہ عہد رسالت سے لے کر پہلی صدی کے اخیر تک جب تک ایک صحابی بھی دنیا میں رہے حدیثوں کے بیان کرنے اوران کے لکھنے کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا اس میں کبھی انقطاع نہیں پایا جاتا، رسول اللہؐ کی مجلس مبارک میں بیٹھ کر بھی لوگ احادیث لکھتے تھے یا آپ سے سن کر جب گھر جاتے تو گھر پر اس کو قلم بند کر کے رکھ لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کا یہی معمول تھا، خود ان کا اپنا بیان ہے **فاما الصادقة فصحیفة کبتتُھا من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم**[۲] یہ صحیفہ کتنا ضخیم تھا خود انھیں کا بیان ہے کہ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے صرف امثال ایک ہزار یاد کئے ہیں[۳]۔ یہ صحیفہ ناپید نہیں ہوگیا آپ کا یہ مخطوطہ آپ کے پوتے شعیب کے پاس رہا اس سے روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں[۴]، عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے **نحن حول رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نکتب**[۵] معلوم ہوا کہ بیک وقت کئی صحابہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے عبداللہ بن عمرو کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے کئی صحابہ سے کہا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے: **من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار** تو ان لوگوں نے کہا بھتیجے ہم حدیثیں لکھ لیتے ہیں[۶]۔ حضورؐ نے ایک نوشتہ حضرت عمرو بن حزم کے ذریعہ یمن بھیجا تھا اس میں فرائض، سنن اور خون بہا کے مسائل تھے[۷] حضورؐ نے ایک اور نوشتہ لکھوا کر اہلِ یمن کے پاس بھیجا تھا، امام شعبیؒ نے اس نوشتہ کی حدیثوں کو بیان کیا ہے (مصحف ابن ابی شیبہ، زکوٰۃ، ص۱۰ تا ۱۲) مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیثیں سن کر صاحبزادے ابوبردہ

۱۔ تاریخ بغدادی، ج۸، ص۲۵۹، مطبوعہ دارالفکر۔ ۲۔ دارمی، ص۶۸۔
۳۔ عمدۃ القاری عینی، ج۱، ص۱۸۔ ۴۔ تہذیب التہذیب، ج۸، ص۵۴، ترجمہ عمرو بن شعیب۔
۵۔ سنن دارمی، ص۶۸۔ ۶۔ طحاوی شریف، ج۲، ص۴۱۷۔
۷۔ المستدرک للحاکم نیساپوری، ج۱، ص۲۹۵ تا ۳۹۷ حاکم نے اس نوشتہ کی ۶۳ حدیثیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔

لکھتے لیتے تھے جب بہت سی حدیثیں لکھ چکے تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان سے فرمایا کہ تم اپنا پورا مجموعہ لے آؤ اور سناؤ انھوں نے لاکر ساری حدیثوں کو سنایا تو اس کے جواب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہاں میں نے ایسی ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے[۱]۔

## حاصلِ گفتگو

صحابہ کرام کو حدیثیں لکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ یہ تو ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات تھے اور تجربات اور مشاہدات کبھی نہیں بھولتے ہیں۔ گفتگو، احکام، مسائل اور واقعات کا موقعہ ومحل سب باتیں ان کے صفحۂ ذہن پر مرتسم تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ضرورت کے وقت ضرور لکھتے تھے اس کا تاریخ کے پاس ناقابل انکار ثبوت ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ یہ حقیقت تو اور بھی ناقابل انکار ہے کہ صحابہ کرام کے حافظہ میں جتنی حدیثیں تھیں اگر ان میں کچھ حضرات نے نہیں لکھیں تو انھوں نے دوسروں کو املا کروادیا یا دوسروں نے صحابہ کی زبان سے سن کر از خود لکھ لیا۔ یہ لکھنے والے سب کے سب تابعین کرام کا گروہ ہے کیوں کہ صحابہ کو تو نہیں البتہ تابعین کو یاد کرنے کی ضرورت تھی اس لئے صحابہ کرام سے ملنے والے جب کوئی حدیث سنتے تو لکھ لیتے تھے۔ اس طرح صحابہ کی زندگی میں ان کی حدیثوں کے بلا مبالغہ ہزاروں احادیث کے مخطوطے تیار ہوگئے اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تابعین ان کو اپنے اپنے وطن لے گئے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کا نغمۂ جانفزا چھیڑ دیا اس طرح ؎ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری، والی شاعرانہ بات حقیقت بن گئی۔

## صحابہ کرام کے مخطوطے تاریخ کے حوالے سے

اب ہم آپ کے سامنے بالترتیب ان تمام مخطوطات کی فہرست تاریخ کے

[۱] مجمع الزوائد، ج۱، ص۱۵۱۔

حوالے سے پیش کرتے ہیں جو صحابہ کرام نے اپنے ہاتھ سے لکھ رکھے تھے یا املا کرایا تھا یا اپنی حدیثوں کو کسی کی مدد سے لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ ہر مخطوط کی شہادت اور نا قابل انکار گواہی کے لئے تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں اگر چشمِ بینا اور گوشِ شنوا تم رکھتے ہو تو وہ شہادتیں تم آج بھی دیکھ سکتے ہو اور سن سکتے ہو[۱]۔

اس گفتگو کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا جاتا ہے ان کے بارے میں وہ روایت تو غلط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے جو حدیثیں لکھی تھیں بعد میں اس کو جلا دیا[۲]۔ البتہ آپ نے اپنے دور خلافت میں حضرت انس بن مالکؓ کو جب بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان کو احادیث نبوی کا ایک نوشتہ دیا تھا جس میں صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے مسائل تھے اس کا سرنامہ تھا **هذه فريضة الصدقة التي فرض رسول[۳] الله على المسلمين** اور اس پر حضورؐ کی مہر ثبت[۴] تھی، حضورؐ نے خود ایک کتاب ''الصدقۃ'' لکھوائی تھی شاید یہ وہی نوشتہ ہو[۵]۔

**ابوبکر ثقفی** رضی اللہ عنہ متوفی ۵۱ھ نے اپنے صاحبزادے کو جو بجستان میں قاضی تھے، قضا سے متعلق بہت سے حدیثیں لکھ کر ارسال کی تھیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں[۶]۔

**ابوشاہ یمنی** صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ خطبہ لکھ کر

---

۱۔ مقالہ کے اس حصہ میں ہم نے مشہور عالم دین اپنے ہم وطن علمی دوست اور حدیثوں کو کمپیوٹرائز کرنے کی وجہ سے عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی مقیم ریاض کے اس مقالہ سے کلی طور پر استفادہ کیا ہے جو انھوں نے انگریزی زبان میں تدوین حدیث کے موضوع پر لکھا تھا جس کی بنیاد پر کیمبرج یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر اف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے اور اس مقالہ پر آپ کو فیصل ایوارڈ دیا گیا ہے پھر اس کا ترجمہ خود ہی عربی میں دراسات في الحديث النبوی کے نام سے ۲ جلدوں میں کیا۔ یہی عربی ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے ہم چاہتے ہیں کہ مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی افادیت کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے اسی جذبے سے ہم نے اس کے مختصر سے حصہ کو اردو میں منتقل کیا ہے، البتہ حوالجات میں ہم نے اپنی لائبریری میں موجود کتابوں ہی کو رکھا ہے دوسرے حوالے اصل کتاب میں دیکھے جائیں۔

۲۔ تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۵۔ ۳۔ صحیح البخاری، ج۱، ص۱۹۴، ۱۹۵۔

۴۔ ابوداؤد، ج۱، ص۸ و ۹، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔ ۵۔ ترمذی شریف، ج:۱، ص۷۹، ابوداؤد، ج:۱، ص۱۵۶۔

۶۔ مسند احمد بن حنبل، مطبوعہ دار صادر بیروت، ج۵، ص۳۶۔

دیا گیا جو حضورؐ نے فتح مکہ کے موقعہ پر دیا تھا، جس کی ابوشاہ یمنی نے حضورؐ سے درخواست کی تھی[۱]۔

**ابورافع** رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے جن کی وفات ۴۰ھ سے کچھ پہلے ہوئی ان کے بارے میں ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرت ابورافع نے مجھے ایک مخطوطہ دیا تھا جس میں نماز سے متعلق حدیثیں ہیں[۲]۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھی ابورافع کا ایک مخطوطہ تھا جس سے وہ اپنے لئے نقل کر رہے تھے[۳]۔

**ابوسعید خدری** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۴ھ جن کی روایت میں کتابت حدیث کی ممانعت ہے لیکن انھوں نے ایک سائل کو جو عبداللہ ابن عباسؓ سے مسئلہ پوچھ کر آیا تھا جواب دیا کہ میں عبداللہ کو احادیث رسول لکھ کر بھیج دوں گا تا کہ مسئلہ کی صحیح صورت حال کو سمجھ کر جواب دیں[۴]۔

**ابوموسیٰ اشعری** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۲ھ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ کتابت حدیث سے منع کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب عبداللہ ابن عباسؓ ان کے پاس بصرہ آئے تو انھوں نے خود حدیثیں لکھ کر ان کو دیں[۵]۔

**حضرت ابوھریرۃ** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۹ھ کے متعلق تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ انھوں نے اپنی روایتوں کی تعداد کو عبداللہ بن عمرو کی روایتوں کی تعداد سے کم ہونے کی وجہ بتائی تھی کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا، اس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے کبھی نہیں لکھا، حالاں کہ یہ بے بنیاد بات ہے وہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ حضورؐ کی مجلس ہی میں یا گھر جاتے ہی لکھ لیتے تھے اور میرا یہ

---

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۲۳۸

۲۔ الکفایہ خطیب بغدادی، ص ۳۳۰، ۳۳۱۔

۳۔ طبقات سعد، ج ۲، ص ۳۷۱۔

۴۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۶۰۔

۵۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۳۹۶۔

معمول نہیں تھا، مجھے اپنے حافظہ پر اعتماد تھا اس لئے میں نہیں لکھتا تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے اپنی حدیثوں کو لکھ لیا تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائیں، اور میرے ساتھ قبر میں نہ چلی جائیں، یہ صرف قیاس آرائی نہیں بلکہ حسن بن عمرو بن اُمیّہ الضمری کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ان کی بیان کی ہوئی ایک حدیث سنائی تو ان کو تھوڑی دیر کے لئے تردد ہوا اور کہا کہ اگر میں نے تمہیں یہ حدیث سنائی ہو تو میرے مخطوطہ میں ضرور ہوگی اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر اندرون خانہ لے گئے تو مخطوطات کا ایک انبار نظر آیا اور ان میں تلاش کر کے جب حدیث مل گئی تو ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہوگا تو میرے یہاں ضرور لکھی ہوئی ہوگی دیکھو وہ حدیث مل گئی۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس پانچ ہزار سے زائد حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں[1]۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے ان مخطوطات سے لوگ نقل لے کر روایت کی بھی اجازت لیتے تھے بشیر بن نہیک نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے ان کی کتاب سے نقل کر کے ان سے روایت کی اجازت مانگی تو انھوں نے مجھے اجازت دی[2]۔ بشیر بن نہیک کے علاوہ دس حضرات کے بارے میں تاریخ ہمیں شہادت دیتی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے مخطوطات سے حدیثیں لکھی ہیں[3]۔

**ابی ابن کعب انصاری** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۹ھ یا ۲۲ھ مشہور کاتب وحی، چوں کہ ان کو تفسیر قرآن سے زیادہ وابستگی تھی اس لئے ان کے پاس تفسیری روایات لکھی ہوئی موجود تھیں، ان کے نسخہ سے ابوالعالیہ رفیع بن مہران نے بڑی تعداد میں تفسیری احادیث قلم بند کی ہیں[4]۔

---

۱ فتح الباری، ج۱،ص ۲۱۵، مطبوعہ سلفیہ، المستدرک للحاکم، ج۳،ص ۵۱۱، جامع بیان العلم، ج۱،ص ۷۴ وغیرہ۔

۲ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱،ص ۹۷۔

۳ تفصیل کے لئے دیکھئے الکفایہ، ص ۲۷۵، تہذیب التہذیب، ج۹،ص ۳۴۲، طبقات ابن سعد، ج۷،ص ۱۵۷، مسند احمد بن حنبل، ج۲،ص ۵۳۱، میزان الاعتدال، ج۳،ص ۸۵، سیر اعلام النبلاء، ج......ص ۴۳۱، دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱،ص ۹۹۔

۴ **التفسیر المفسرون** (ذہبی) ج۱،ص ۵۱۱۔

**اسماء بن عمیس** رضی اللہ تعالیٰ عنہا صحابیہ ہیں جو حضرت جعفر ابن ابی طالب کی بیوی تھیں، حضرت جعفر کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں آئیں، پھر ان کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا تھا، ان کی وفات ۴۰ھ کے قریب ہوئی، ان کے پاس صحیفہ تھا جس میں احادیث رسول لکھی ہوئی تھیں[۱]۔

**اُسید بن حُضیر** رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مروان بن الحکم خلیفہ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی انھوں نے خلیفہ کو احادیث رسول اور خلفاء راشدین کے فیصلے وغیرہ قلم بند کر کے بھیجے تھے[۲]۔

**انس بن مالک انصاری** رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ۹۳ھ میں ہوا ہے آپ کے بارے میں مفصل لکھ چکا ہوں یہاں یہ بتانا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیثوں کو لکھنے والے مقام واسط کے متعدد افراد[۳] تھے، ان کے علاوہ جن لوگوں نے ان سے حدیثیں لکھی ہیں اور تاریخ میں ان کے ناموں کی صراحت ہے ان میں ثمامہ بن عبداللہ ابن انسؓ[۴]، مشہور راوی حدیث حُمید الطّویل[۵]، سلیمان[۶] التیمی، کثیر بن سلیم الراوی[۷] کے اسماء گرامی شامل ہیں ان کے پاس مخطوطات کی شکل میں حضرت انس کی حدیثیں موجود تھیں، ان میں سے بعض مخطوطے آج بھی ترکی وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

**براء بن عازب** رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ۷۲ھ میں ہوئی، طلبہ باقاعدہ ان کی خدمت میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور وہ املاء کراتے تھے[۸]۔

**جابر بن سمرۃ** رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۷۴ھ میں وفات پائی ہے انھوں نے کچھ حدیثیں لکھ کر عامر بن سعد کو بھیجی تھیں[۹]۔

---

۱ تاریخ یعقوبی بحوالہ دراسات، ج ۲، ص ۱۱۴۔ ۲ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۲۲۶۔
۳ تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۲۵۹۔ ۴ الکفایہ (خطیب بغدادی) ص ۳۳۱۔
۵ بحوالہ دراسات النبوی، ج ۱، ص ۱۰۲۔ ۶ تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۵۷۔
۷ تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۵۷۔
۸ العلل، العلوم لابی خیثمہ، سنن دارمی، تقیید العلم وغیرہ، بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۰۴۔
۹ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۸۹۔

**جابر ابن عبد اللہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ۷۸ھ میں ہوا، اپنے دور میں وہ مفتی مدینہ تھے، مسائل میں لوگ آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مناسکِ حج سے متعلق احادیث نبوی کا ایک مجموعہ بھی ان کے پاس[1] تھا۔ حضرت جابرؓ سے سن کر جن لوگوں نے ان کی حدیثوں کو لکھا، اُن میں ابوسفیان[2]، ابوعثمان جعد بن دینار[3]، حسن بصری[4]، سلیمان[5] بن قیس الیشکری، عامر بن شراحیل شعبی[6]، عبداللہ بن عقیل[7]، عطار ابن[8] ابی رباح، قتادہ[9]، مجاہد[10]، مطرف[11]، محمد بن الحنفیہ[12] ابوجعفر محمد[13] بن علی، ابوالزبیر[14] محمد بن مسلم، وہب ابن منبّہ[15] کے نام تاریخوں میں بصراحت موجود ہیں ان تمام لوگوں نے ان کی حدیثوں کو قلم بند کیا۔

**رافع بن خدیج** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۴ھ کے پاس چمڑے اور جھلّیوں پر لکھی ہوئی احادیث تھیں اور بعض موقعوں پر انھوں نے احادیث کے اپنے اس مخطوطے کا حوالہ بھی دیا ہے جیسا کہ مروان کی تقریر کے بعد آپ نے اس کا حوالہ دیا ہے[16]۔ حضرت رافع کی ایک روایت میں ہے کہ ہم کئی آدمیوں نے حضورؐ سے گذارش کی یا رسول اللہ! **انا نسمع منك شيئاً فنكتبها، قال اكتبوا ولا حرج**[17]، اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت رافع کے ساتھ کچھ اور صحابہ بھی حدیثیں قلم بند کرتے تھے۔

**زید بن ثابت** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۵ھ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

۱۔ تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۴۳۔ ۲۔ میزان الاعتدال، ج۲، ص۳۴۲، تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۳۔ التاریخ الصغیر البخاری، بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱، ص۱۰۴۔
۴۔ تہذیب التہذیب، ج۲، ص۲۶۷۔ ۵۔ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۶۔ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔ ۷۔ میزان الاعتدال، ج۲، ص۴۸۴۔
۸۔ مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص۲۲۶۔ ۹۔ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۱۰۔ طبقات ابن سعد بحوالہ دراسات، ج۱، ص۱۰۶۔ ۱۱۔ الکفایہ خطیب بغدادی، ص۳۵۴۔
۱۲۔ میزان الاعتدال، ج۲، ص۴۸۴۔ ۱۳۔ حوالہ مذکور۔
۱۴۔ تہذیب التہذیب، ج۹، ص۴۴۲۔ ۱۵۔ تہذیب التہذیب، ج۱، ص۲۱۶۔
۱۶۔ مسند احمد ابن حنبل، ج۴، ص۱۴۱۔ ۱۷۔ مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی، ج۱، ص۱۵۱۔

کے میر منشی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ انھیں کو جمع قرآن کرنے والوں کی جماعت کا سربراہ بنایا تھا، حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ سُریانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لو انھوں نے دو ہفتہ میں سریانی سیکھ لی، چوں کہ یہ کاتب وحی تھے اس لئے کتابت حدیث میں اختیاط کرتے تھے، خلیفہ مروان بن الحکم نے ان سے حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اور انتظام یہ کیا کہ پردے کے پیچھے کاتبوں کو بٹھادیا، حضرت زید حدیثیں بیان فرماتے اور کاتب لکھتے جاتے تھے[۱]، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی بار اصرار کیا تو انھوں نے فرائض اور علم المیراث پر احادیث کا ایک مجموعہ لکھ کر دیا تھا[۲]، ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ علم الفرائض میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو زید ابن ثابتؓ نے لکھی ہے اور اس کے راوی قبیصہ ہیں[۳]، زید ابن ثابت سے جن لوگوں نے حدیثوں کو سن کر لکھا ان میں مشہور راوی حدیث ابو قلابہ کا نام بھی شامل[۴] ہے، حضرت زید بذات خود بہت کم حدیثیں لکھتے تھے، لیکن دوسروں کو املا کراتے تھے وہ حدیثیں بیان کرتے اور لوگ اس کو لکھتے جاتے تھے، کثیر ابن افلح کا بیان ہے کہ ہم لوگ زید کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور احادیث رسول لکھتے تھے[۵]۔

**سبیعہ اسلمیہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہا صحابیہ ہیں اور حضرت سعد بن خولہ کی بیوی ہیں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کی ہیں، بعض تابعین کو اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر دی ہیں اور تابعین نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیثیں لکھی ہیں۔ عامر کا بیان ہے کہ حضرت سبیعہ نے عبداللہ بن عتبہ کو احادیث لکھ کر دی[۶] ہیں۔ امام زہری کا بیان ہے کہ عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے مجھ سے بیان فرمایا

---

۱۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۳۱۳، طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۱۱۷۔

۲۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۳۱۲، سُنن دار قطنی، ج ۴، ص ۹۳۔

۳۔ کتاب العلل، ج ۱، ص ۲۳۶۔

۴۔ کامل ابن عدی، ج ۱، ص ۲۰۸، بحوالہ دراسات۔

۵۔ تقیید العلم، ص ۱۰۲، بحوالہ دراسات۔

۶۔ الکفایہ خطیب بغدادی، ص ۳۳۷۔

کہ والد نے عمر بن عبداللہ بن ارقم سے کہا کہ حضرت سبیعہؓ بنت الحارث الاسلمیہ کی حدیثیں لکھ کر بھیج دو چنانچہ لکھ کر بھیج دیں[1]، مسروق کو بھی حضرت سبیعہؓ نے حدیثیں لکھ کر دی ہیں[2]۔

**سعد بن عبادة** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۵ھ انھوں نے احادیث رسول کو قلم بند کیا تھا آپ کا مخطوطہ خاندان کے بعض افراد کے پاس مدتوں رہا، آپ کی نسل میں وہ منتقل ہوتا رہا ان کی چوتھی پشت یعنی حضرت سعد کے پوتے کے لڑکے اسمٰعیل نے اپنے دادا کی اس کتاب سے روایتیں بیان کی ہیں[3]۔

**سمرة بن جندب** رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی وفات ۵۹ھ میں ہوئی مشہور صحابی رسول ہیں انھوں نے کتابی شکل میں احادیث جمع کر رکھی تھیں اور مسئلہ قضاء سے متعلق بہت سی احادیث کا ایک مجموعہ لکھ کر انھوں نے اپنے صاحبزادے کو ارسال فرمایا تھا، مشہور تابعی ابن سیرین کا بیان ہے **في رسالة سمرة بن جندب علم كثير**[4] حضرت حسن بصری کے پاس اس کا ایک بڑا نسخہ تھا اس نسخہ سے انھوں نے بہت سی روایتیں بیان کی ہیں اگرچہ حسن بصری کو سمرۃ بن جندب سے سماع حاصل نہیں ہے اس لئے محدثین کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یہ روایتیں اسی مخطوطہ سے ہیں۔ حسن بصری کے کئی شاگردوں نے اس نسخہ کو ان کے سامنے پڑھ کر اس کی روایت کی اجازت لی ہے اور شاگردوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، طبرانی نے تو المعجم الکبیر میں وہ پورا نسخہ ہی نقل کر دیا ہے[5]۔ یہ نسخہ حضرت سمرہ کے صاحبزادے حضرت سلمان بن سمرہ کے پاس رہا، ابوداؤد اور سنن دارقطنی میں اس کا ذکر ہے۔

**سهل بن سعد الساعدی** انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۹۱ھ ان

---

۱ جامع صحیح بخاری کتاب المغازی، کتاب الطلاق وغیرہ میں ان کی حدیثیں مذکور ہیں۔

۲ سُنن ابن ماجہ کتاب الطلاق میں ان کی روایت موجود ہے۔

۳ مسند احمد بن حنبل، ج۵، ص ۲۸۵، تعجیل المنفعۃ، ص ۳۶ و ۳۱۴۔

۴ تہذیب التہذیب، ج۴، ص ۲۳۶، الاستیعاب، ج۱، ص ۶۳۔

۵ طبقات ابن سعد، ج۷، ص ۱۱۵، سنن نسائی، ج۱، ص ۲۰۵۔

کی حدیثوں کو ان کے شاگرد ابوحازم بن دینار نے جمع کیا ہے اور ابوحازم کے صاحبزادے نے اس کی روایت کی ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کی روایتوں کو خود ان کے صاحبزادے عباس بن سہل اور مشہور محدث ابن شہاب زہری بھی روایت کرتے ہیں[1]۔

**شداد بن اوس بن ثابت** الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۸ھ مسائل دینیہ پر آپ کی نگاہ بہت وسیع تھی اور فقیہ کہے جاتے تھے ان کے بارے میں تاریخوں میں یہ تشریح پائی جاتی ہے کہ وہ نوجوانوں کو اپنے سامنے بٹھا کر حدیثیں املا کرایا کرتے تھے[2]۔

**شمغون الازوی** الانصاری ابوریحانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وفات رسول کے بعد آپ دمشق میں رہنے لگے تھے، ان کا مسلمانوں میں بڑا اعزاز واکرام تھا، ان کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا جو انھوں نے لکھ رکھا تھا[3]۔

اُم المومنین **حضرت عائشہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی ان کے علم وفضل کا پوری اُمتِ اسلامیہ اعتراف کرتی ہے، صحابہ کے دور میں دینی امور اور مسائل میں ان کی رائے قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی۔ مسائل کے سلسلہ میں اکابر صحابہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ہر مسئلہ سے متعلق ان کے پاس کوئی نہ کوئی حدیث ضرور مل جاتی تھی۔ روایت حدیث کے ساتھ درایت میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا، احادیث کے ذخیرے میں چند صحابہ کو کثرتِ روایات کی جو خصوصیت حاصل ہے انھیں میں حضرت عائشہؓ کا بھی شمار ہے۔ مسند میں ان کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ملتی ہے[4]، یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کتابت جانتی تھیں یا نہیں لیکن یہ حقیقت تو ناقابل تردید دلائل سے ثابت ہے کہ آپ احادیث رسول کا املاء کراتی

---

۱؎ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۵۲ وجلد ۶، ص۳۳۳، الہدی الساری (ابن حجر) ص۱۸۵۔

۲؎ سیر اعلام النبلاء، ج۲ص۳۳۱ وص۳۳۲۔

۳؎ الاصابہ (ابن حجر) ج۲، ص۱۵۷۔

۴؎ سیر اعلام النبلاء، ج۲، ص۱۰۱۔

تھیں اور مسائل کے سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کرنے والوں کو احادیث لکھ کر ارسال کی جاتی تھیں اسلامی ملکوں سے اہل علم آپ سے حدیثیں سننے کے لئے اور سن کر لکھنے کے لئے برابر آتے رہتے تھے اس لئے ان کی زندگی ہی میں ان کی املاء کرائی ہوئی حدیثیں جن کے پاس تھیں ان میں ان کے کاتب سالم بن امیہ[1] التیمی کا نام سر فہرست ہے، عمر[2] بن عبداللہ کو بھی عبداللہ ابن ابی اوفی نے ان کی احادیث لکھ کر دی تھیں، ان کے علاوہ عروہ بن الزبیر[3]، معاویہ[4] ابن سفیان کے پاس لکھی ہوئی ان کی حدیثیں موجود تھیں۔

**عبداللّٰہ بن زبیر** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۳ھ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کو قاضی مقرر کیا تھا، اور ان کو کچھ حدیثیں لکھ کر دی تھیں[5]۔

**عبداللّٰہ ابن عباس** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۶۸ھ کی ذات کثرت روایت کے لئے مشہور ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ احادیث رسولؐ کے دیوانے اور عاشق صادق تھے نوجوانی کی عمر تھی، تلاشِ حدیث میں مشقتیں اٹھاتے تھے اور ہمت نہیں ہارتے تھے ان کا معمول تھا کہ مدینہ کی گلیوں میں چلے جاتے اور جن سے ملنا ہوتا ان کو آواز دیکر باہر زمین پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتے گرد وغبار سے اٹ جاتے گھر والے گھر سے نکل کر جب دیکھتے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں تو بہت شرمندہ ہوتے، حضرت ان سے صرف یہ کہتے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے آپ مجھے سنا دیجئے، وہ سنتے اور لکھ لیتے اور واپس آجاتے، اسی طرح ان کا روزانہ گشت جاری رہتا اور ہر حدیث کو سن کر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسرے صحابہ سے بھی اس کی تصدیق کرتے تب اس پر مکمل اعتماد کرتے[6] خود بھی احادیث لکھتے تھے اور کتابت کے لئے ملازم بھی رکھتے تھے اور اس

---

۱ فتح الباری، ج ۶، ص ۳۴۔
۲ الکفایہ، ص ۳۳۶، بخاری شریف کتاب الجہاد۔
۳ الکفایہ، ص ۲۰۵۔
۴ مسند حمیدی، ج ۱، ص ۱۲۹، مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۸۷۔
۵ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۴۔
۶ سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۲۳۰۔

سے احادیث نقل کراتے تھے[۱] ان سے دور دراز کے لوگ حدیثیں سننے کے لئے آتے اور اپنے تلامذہ کو احادیث املا بھی کراتے تھے[۲]۔

جن لوگوں کو انھوں نے حدیثیں املا کرائیں یا خود اپنے قلم سے لکھ کر دی ہیں ان میں متعدد نام تاریخوں میں ملتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے پاس عبداللہ بن عباس کی حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں، ان میں کچھ ممتاز حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔ ابن ابی مُلیکہ، الحکم بن مقسم[۳]، ان کی چند روایتوں کے علاوہ سب عبداللہ بن عباس کے املا کرائے ہوئے مخطوطہ سے ہیں[۴]۔

سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ میں عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں بیٹھ کر تختیوں پر حدیثیں لکھا کرتا تھا[۵] حضرت عکرمہ کے پاس عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایتوں کا مجموعہ تھا[۶]، عمرو بن دینار کے پاس بھی ابن عباس کی املا کرائی ہوئی حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا، خود ان کا بیان ہے کہ میں ابن عباس کی مجلس میں کھڑے ہو کر احادیث لکھا کرتا تھا[۷] ابن عباس کی روایتوں اور ان کی املا کرائی ہوئی حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ حضرت کُریب کے پاس تھا، تاریخ کی شہادت ہے کہ وہ کتابیں ایک اونٹ کا بوجھ تھیں، عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے علی ابن عبداللہ کو معلوم ہوا کہ والد کی املاء کرائی ہوئی حدیثوں کا مخطوطہ کُریب کے پاس ہے تو انھوں نے اس کا مطالبہ کیا تو کریب نے ان کو لکھا کہ آپ کو بھیج دوں گا[۸]۔ حضرت مجاہد کے پاس ابنِ عباسؓ کی تفسیری روایتوں کا مجموعہ تھا، ابن ابی مُلیکہ کا بیان ہے کہ میں نے خود مجاہد کو ابن عباس کے پاس لکھتے ہوئے دیکھا ہے، ابن عباس املاء کرا رہے تھے اور مجاہد لکھ رہے تھے[۹]۔

**عبداللہ ابن عمر** رضی اللہ تعالیٰ عنہما متوفی ۷۴ھ علم و عمل کے جامع

---

۱ الاصابہ، ج۲، ص۳۳۲۔ ۲ مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص۲۲۴ و ۲۴۸ و ۲۹۴۔

۳ مقدمہ مسلم شریف، ص۱۳، مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص۲۴۳۔ ۴ فتح المغیث، ج۲، ص۱۳۸۔

۵ کتاب العلل، ج۱، ص۵۰۔ ۶ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱، ص۱۱۸۔

۷ حوالہ مذکور۔ ۸ طبقات ابن سعد، ج۵، ص۲۱۶۔

۹ التفسیر والمفسرون، ج۱، ص۱۰۴۔

تھے، اکابر فقہائے مدینہ میں شمار کئے جاتے تھے، کثیر روایتوں والے صحابہ کرام میں آپ کا بھی شمار ہے، وہ اپنے خطوط اور مراسلات میں عام طور پر حدیثیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے خود آپ کا اپنا کوئی صحیفہ نہیں تھا اور نہ کوئی مخطوطہ رکھتے تھے البتہ ان سے حدیثیں سن کر متعدد حضرات نے ان کی روایتیں لکھی ہیں۔ سعید بن جُبیر کا بیان ہے کہ میں ابن عمر اور ابن عباس دونوں کی مجلس میں جایا کرتا تھا ان کی حدیثیں اپنے کجاوے کی لکڑی پر لکھ لیتا تھا اور جب منزل پر پہنچتا تو اس کو نقل کر لیتا تھا[۱]، جمیل بن زید الطائی نے ابن عمر کو دیکھا ہے مگر ان کی زندگی میں ان کی حدیثیں نہیں لکھ سکے۔ اس ارادے سے جب وہ مدینہ گئے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا تو مدینہ کے اہل علم سے پوچھ پوچھ کر ابن عمر کی حدیثیں لکھیں[۲]، عبدالعزیز بن مروان[۳]، عبدالملک بن مروان[۴]، اور عبیداللہ بن عمر[۵] کے پاس ان کی کچھ حدیثیں لکھی ہوئی تھیں، البتہ حضرت نافع کے پاس عبداللہ ابن عمر کی حدیثوں پر مشتمل ایک کتاب تھی[۶]۔

**عبداللّٰہ ابن عمرو بن العاص** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۶۳ھ ان کے پاس حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ایک مرتبہ متعدد صحابہ کی موجودگی میں انھوں نے عرض کیا کہ حضورؐ کی طرف کسی بھی غلط بات کا انتساب کتنا خطرناک ہے، حضورؐ کے ارشاد سے ہی آپ حضرات کو معلوم ہے تو حدیثوں کو بیان کرنے کا کام کتنا نازک ہے پھر آپ لوگ حدیثوں کے بیان کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں تو ان تمام حضرات نے فرمایا کہ ہم لوگ حدیثوں کو لکھ کر صحیح صحیح محفوظ کر لیتے ہیں[۷]، یہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور حضورؐ کو ان کے لکھنے کا حال معلوم تھا[۸]، ان کے حدیث کے مخطوطوں سے بھری ہوئی صندوقیں تھیں۔ اکثر موقعوں پر اپنے مخطوطے نکال کر لوگوں کو حدیثیں سناتے تھے[۹]، آپ اپنے تلامذہ کو سامنے بٹھا کر حدیثیں املا کراتے تھے[۱۰] ان کی

---

۱۔ تقیید العلم، ص ۱۰۳، بحوالہ دراسات۔
۲۔ التاریخ الکبیر (بخاری) ج ۲، ص ۲۱۵۔
۳۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۱۵۲۔
۴۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۲۰۔
۵۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۴۵۔
۶۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۲۱۔
۷۔ مجمع الزوائد ج ۱، ص ۱۵۱۔
۸۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۵۸، سنن دارمی، ج ۱، ص ۲۶۔
۹۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۱۷۶۔
۱۰۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۱۶۲۔

املاء کرائی ہوئی حدیثیں متعدد افراد کے پاس مخطوطوں میں موجود تھیں، ان میں سمرہ[۱] اورشعیب کے نام ہیں۔شعیب حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پوتے ہیں، ان کے پاس اپنے دادا کے ہاتھ کا لکھا ہوا حدیثوں کا مخطوطہ تھا، ان کی ساری روایتیں جو حدیث کی کتابوں میں ہیں اسی مخطوطہ[۲] سے ہیں ان دونوں حضرات کے علاوہ شفیع[۳] ابن ماتع ۔عبدالرحمٰن بن سلمہ[۴] الجمحی ،عبداللہ[۵] رباح الانصاری، عامل عبداللہ بن[۶] عمرو بن العاصؓ کے پاس بھی ان کے املاء کرائی ہوئی حدیثیں موجود تھیں۔

**عبداللہ بن مسعود** الھذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۳۲ھ فقہائے صحابہ میں شامل تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو بہت سی خصوصیات حاصل تھیں، بعض آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کی پیش کی ہوئی تحریروں کو مٹادیا ہے، اس کی وجہ صرف غیر معتبر اور نا قابل اعتماد تحریروں سے احتراز تھا، کیوں کہ خود ان کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں موجود تھیں، انھوں نے اپنے لکھنے کا ذکر کیا ہے، ان کے صاحبزادے کے پاس حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا وہ لوگوں کے سامنے اس کو پیش کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ میرے والد کی لکھی ہوئی ہے[۷]۔

**عتبان بن مالک** انصاریؓ ۶۰ھ سے قبل آپ کا انتقال ہوا، آپ نے خود حدیثیں تو نہیں لکھیں، البتہ مشہور صحابی رسول حضرت انس بن مالکؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ عتبان بن مالک کی حدیثیں لکھ لو، اور انہوں نے لکھا[۸]۔

**علی بن ابی طالب** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۰ھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے بہت سی دستاویزیں لکھوائی ہیں، صلحنامہ حدیبیہ آپ ہی کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا، حضورؐ نے اپنے سامنے بٹھا کر ایک چمڑے پر کچھ مسائل لکھوائے

---

۱ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۹۹۔

۲ ترمذی، ج۲، ص۱۴۰، میزان الاعتدال، ج۲، ص۲۶۴، تہذیب التہذیب ترجمہ عمرو بن شعیب۔

۳ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱، ص۱۲۵۔

۴ حوالہ مذکور۔　۵ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۹۲۔　۶ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۸۳۔

۷ کتاب العلل، ج۱، ص۳۲۲، جامع بیان العلم، ج۱، ص۷۲، بحوالہ دراسات۔

۸ مسلم شریف، ج۱، کتاب الایمان ص:۵۴۔

تھے، ان کے پاس حضور کا ایک صحیفہ تھا جس میں بہت سے احکام تھے[۳]، آپ کے پاس ''کتاب الصدقہ'' بھی تھی، بوقت ضرورت اس کی حدیثیں آپ بیان بھی کرتے تھے[۴]۔

آپ دوسرے صحابہ کو حدیثوں کے لکھنے کی جانب توجہ دلایا کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسروں کو آپ حدیثیں املا بھی کراتے تھے[۳]، ان کے چھوٹے چھوٹے صحیفے بہت سے حضرات کے پاس تھے، تاریخوں میں سات آٹھ نام مجھے صراحت سے ملے ہیں، پھر ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کے مجموعے بھی تیار کئے گئے، محدثین ان فیصلوں اور فتووں کو روایت بھی کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی حدیثیں جن لوگوں کے پاس تھیں اور مخطوطہ رکھتے تھے ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں، یہ حضرات انھیں مخطوطوں ہی سے روایت کراتے ہیں، براہ راست حضرت علیؓ سے ان کی روایتیں نہیں ہیں۔ حارث اعور[۴]، حجر بن عدی بن جبلہ[۵]، حسن[۶] بن علی ابن ابی طالب، خلاس بن الہجری[۷]، عامر شعبی[۸]، عبداللہ بن عباس[۹]، عطاء بن ابی رباح[۱۰]، اور مجاہد[۱۱]۔ ان تمام حضرات کے بارے میں تصریح ملتی ہے ''انما ھی من کتاب''.

**حضرت عمر بن الخطاب** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۲۳ھ کا نام دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا عشق دیوانگی کی حد کو پہنچا ہوا تھا، انتہائی صائب الرائے، ان کی بہت سی روایتوں کو مرضیٔ الٰہی اور منشاء قدرت کی تائید حاصل ہوئی اور اس کو بطور فخر جذبہ احسان مندی کے ساتھ بیان بھی کرتے تھے، ان کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے لوکان بعدی نبیٌ لکانَ عُمر عام طور سے یہ مشہور ہے کہ آپ حدیث کو لکھنا تو در کنار اس کے بیان کرنے کے بھی سخت

---

۱۔ المستدرک للحاکم نیشاپوری، ج ۲، ص ۱۴۱، مسند احمد بن حنبل میں متعدد روایتوں کے ذیل میں اس کا ذکر آیا ہے۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۴۱۔

۳۔ طبقات ابن سعد، ج ۶، ص ۱۱۶۔

۴۔ حوالہ مذکور۔

۵۔ حوالہ مذکور، ص ۱۵۴۔

۶۔ کتاب العلل، ج ۱، ص ۱۰۴۔

۷۔ میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۶۵۸، تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۱۷۶۔

۸۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۳۰۔

۹۔ مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۳۔

۱۰۔ بحوالہ دراسات، ج ۱، ص ۱۳۱۔

۱۱۔ دراسات، ج ۱، ص ۱۳۱۔

مخالف تھے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سے حدیث کے مخطوطے کو جلوادیا بلکہ تمام اسلامی ممالک میں حکم بھیج دیا کہ اس طرح کی تمام کتابوں کو تلاش کر کے جلا دیا جائے اور جب لوگوں کو حدیث بیان کرتے ہوئے سنتے تھے تو برہم ہو جاتے تھے، کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو حدیث بیان کرنے پر ڈانٹ چکے تھے، کثرتِ روایت پر ان کو دُرّہ لگایا تھا، بعض لوگوں کو حدیث بیان کرنے پر قید کر دیا تھا، اس طرح اکثر روایتیں یا تو جھوٹی ہیں یا ان میں کوئی نہ کوئی سقم ہے، کوئی روایت منقطع ہے تو کوئی ضعیف اور ساقط الاعتبار اور بعض مجہول راویوں کے سہارے روایت چلی ہے جو روایت صحیح ہے اُسے میں خود آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جاہ وجلال بھی نظر آتا ہے اور رعب داب بھی، اسی کے ساتھ حدیث بیان کرنے پر اظہار برہمی بھی پایا جاتا ہے اور سزا کی دھمکی بھی، میں اس روایت کو ابوداؤد سے پوری نقل کرتا ہوں آپ خود بھی اس کے الفاظ پر غور کریں۔

روایت یہ ہے:

**عن ابی سعید الخدری، قال، کنت جالساً فی مجلس من مجالسِ الانصار فجاء ابوموسٰی فزعاً، فقلناله، ما افزعك؟ قال، امرنی عمر أن اٰتیه، فاتیتُه، فاستاذنت ثلاثاً، قلم یوذن لی، فرجعتُ، فقال، ما منعك أن تاتینی؟ فقلتُ، قد جئت فاستاذنت وثلاثاً فلم یوذن لی، وقد قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، اذا استاذن احدکم ثلاثاً فلم یوذن لهٗ فلیرجع، قال، لتاتینی علی هذا بالبینة، قال، فقال ابوسعید لا یقوم معك الاّ اصغر القوم قال، فقام ابوسعید معه فشهد له[1].**

ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ میں انصار کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابوموسیٰ اشعریؓ بہت گھبرائے ہوئے آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا پریشانی ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے مجھے بلایا تھا، ان کے گھر گیا تو دروازے پر پہنچ کر تین مرتبہ آواز

[1] ابوداؤد شریف، ج۲، ص۷۰۴، مطبوعہ رشیدہ دہلی۔

دی مگر اجازت نہیں ملی تو میں واپس چلا آیا، حضرت عمر نے دوبارہ بلوایا اور پوچھا کہ آپ کیوں نہیں آئے؟ تو میں نے کہا کہ آیا تھا تین مرتبہ اجازت طلب کی جب کوئی آواز نہیں آئی تو واپس چلا گیا، کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے تین مرتبہ استیذ ان کے بعد کوئی جواب نہ ملے تو لوٹ جاؤ، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس بیان پر گواہ لاؤ، (ورنہ سمجھ لو) ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ ان گواہوں مین سب سے کم عمر میں ہوں اس لئے میں ہی چلوں گا انھوں نے جا کر ابوموسیٰ اشعریؓ کی تائید کی اور فرمایا کہ حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا ہے، ابوموسیٰ نے صحیح کہا ہے۔

اس روایت کے بعد ایک اور روایت ہے جو حضرت عمرؓ کے دلی منشاء کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے سخت رویہ کی علت کو بتاتی ہے، یہ روایت خود ابوموسیٰ اشعریؓ کی ہے:

**فقال لابی مُوسیٰ انّی لم اتّهمُك ولكنّ الحديث عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم شديد**[1] .

ابوموسیٰ! میں تم پر کوئی الزام نہیں لگاتا، بات صرف یہ ہے کہ حضورؐ کی حدیثوں کا معاملہ بڑا ہی اہم ہے (یعنی بڑی احتیاط سے بیان کرنا چاہئے)

حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ حدیثوں کو بیان کرنے میں جری نہ ہو جائیں کیوں کہ مستقبل میں بد باطن افراد اس کے ذریعہ فتنہ برپا کر سکتے ہیں، یہ احتیاط تمام صحابہ میں از خود موجود تھی، اور امیر المومنین کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کی ذمہ داری اور زیادہ تھی اس لئے وہ زیادہ سختی کا معاملہ کرتے تھے، ان کی یہ منشاء ہرگز نہیں تھی کہ حدیثیں نہ بیان کی جائیں اور نہ لکھی جائیں، انھوں نے جن کتابوں کو جلایا ہے وہ اسرئیلی خرافات اور یہودیوں کے نوشتے اور تحریریں تھیں، کیوں کہ ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ یہ واقعہ خود پیش آچکا تھا کہ کہیں سے وہ ایک تحریر لائے اور حضورؐ کو سنانے لگے، وہ سناتے جاتے تھے اور حضورؐ کا چہرہ مبارک غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے سرخ ہوا جا رہا تھا، حضرت عمرؓ کی جب نگاہ اٹھی تو سہم کر رہ[2] گئے اور فوراً جا کر اس تحریر کو جلا دیا، یہ

[1] ابوداؤد، ج ٢، ص ٧٠٤۔ [2] مسند دارمی، مطبوعہ کان پور، ص ٦٢۔

بات ان کو یاد تھی، اس لئے یہودیوں کی لغویات اور روایات سے لوگوں کو نفرت دلانے کے لئے اس طرح کی ساری تحریروں کو جلوا دیتے تھے، اور کبھی کبھی سزا کی دھمکی بھی دیتے تھے، یہ معاملہ اسی طرح کی تحریروں اور نوشتوں کے ساتھ تھا کہیں سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے صحابئ رسولؐ سے کوئی نوشتہ لے کر جلایا ہو، **ذلك بهتان عظيم**.

حضرت عمرؓ اپنے حکم ناموں میں بالعموم احادیث لکھا کرتے تھے جیسا کہ عتبہ[1] بن فرقد کو آذربیجان جو خط لکھا ہے یا ابو عبیدہ[2] بن الجراح کے جواب میں جو تحریر بھیجی ہے اور اسی طرح دوسرے عاملوں کو جو ہدایات ارسال فرمائی تھیں ان میں حدیثوں کے حوالے دیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک ''کتابُ الصدقة'' رکھی تھی جس میں زکوٰۃ، صدقات وغیرہ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں[3]۔

**عمرو بن حزم** انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۰ھ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کا عامل بنا کر بھیجا تھا اور دستور العمل کے طور پر ان کو ایک تحریر لکھوا کر دی تھی، جس میں طہارت، نماز، مال غنیمت، صدقات، خراج، دیات وغیرہ کے احکام تھے، عطاء بن ابی رباح نے اس کتاب کو پڑھا ہے، انھوں نے حضورؐ کے بعض مکتوبات کو بھی ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے[4]۔

**فاطمة الزهراء** رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں ان کی وصیت تھی[5]۔

**فاطمه بن قيس** رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضورؐ کی بعض حدیثوں کو حضرت امّ سلمہؓ کو املا کرایا تھا[6]۔

---

١ـ مسند احمد بن حنبل، ج ا، ص ٢٦۔

٢ـ مسند احمد بن حنبل، ج ا، ص ٢٨ و ٤٦، سیر اعلام النبلاء، ج ٣، ص ٣٤٠۔

٣ـ التاریخ الکبیر (بخاری) ج ا، ص ٢١٨۔

٤ـ الاصابة (ابن حجر) ٥٨١٠، الاستعاب ١٩٠٧۔

٥ـ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ٢٨٢۔

٦ـ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ٤١٣۔

**محمّد بن مسلمة** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۶ھ ان کے انتقال کے بعد ان کی تلوار کے نیام سے ایک صحیفہ نکلا جس میں حضور کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں[۱]۔

**معاذ بن جبل** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۸ھ جب ان کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک نوشتہ دیا گیا تھا جس میں زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کے احکامات تھے[۲]۔

**معاویہ ابن ابی سفیان** رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ احادیث لکھوا کر منگائی تھیں، خود آپ بھی لوگوں کو ادعیہ ماثورہ کی تعلیم دیتے رہتے تھے[۳]، عبدالرحمٰن بن شبل کو اپنے ہاتھ سے کچھ حدیثیں لکھ کر دی تھیں[۴]۔

**مغیرہ ابن شعبہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں ارشادات نبویؐ درج تھے[۵] مروان بن الحکم کو بھی کئی تحریروں میں آپ نے احادیث رسول لکھ کر ارسال فرمائی تھیں[۶]، مغیرہ ابن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اپنی تحریروں میں احادیث لکھ کر بھیجی تھیں[۷]۔

**ام المؤمنین حضرت میمونہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت الحارث الہلالیہ متوفی ۵۱ھ کی حدیثوں کو ان کے غلام عطاء بن یسار نے لکھا تھا[۸]۔

**نعمان بن بشیر** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۶۵ھ کی احادیث قیس[۹] بن الہیثم، ضحاک بن قیس[۱۰]، یزید بن النعمان[۱۱] کے پاس تھیں کچھ انھیں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تھیں یا منشی سے لکھوا کر دی تھیں، کچھ حدیثیں لکھوا کر قتادہ کو بھی بھیجی گئی تھیں[۱۲]۔

**واثلہ بن الاسقع** رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۸۳ھ آپ اپنے تلامذہ کو

---

۱ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱،ص۱۴۰۔
۲ الاصابہ، ج۳،ص۴۳۴۔
۳ دراسات، ج۱،ص۴۰۔
۴ دراسات فی الحدیث النبوی، ج،ص۱۴۰۔
۵ بخاری کتاب الاذان، ج۱،ص۱۵۵۔
۶ مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۹۴۔
۷ بخاری کی متعدد روایات میں اس کا ذکر آیا ہے، مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۲۴۵، ۲۴۹، ۲۵۰۔
۸ مسند احمد بن حنبل، ج۶،ص۳۳۳۔
۹ مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۲۷۷۔
۱۰ دراسات، ج۱،ص۱۴۲۔
۱۱ مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۲۷۳۔
۱۲ مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۲۷۶۔

سامنے بٹھا کر احادیث کا املا کراتے تھے، معروف الخیاط کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت واثلہؓ کو طلبہ کی ایک جماعت کو املاء کراتے ہوئے دیکھا ہے[۱]۔

## عہدِ صحابہ کی سرگرمیاں

جستہ جستہ تاریخوں میں جن صحابہ کرام کے لکھنے کا اتفاقاً تذکرہ آ گیا ہے اور ہزاروں صفحات پلٹنے کے بعد جو ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ پتھر کی لکیریں ہیں، ان حقائق کی روشنی میں مستشرقین کا وہ اعتراض کہ عہد صحابہ میں حدیثیں لکھی گئیں اور ہر مستشرق نے اپنی کتاب میں اس دعوئے پر پورا زور صرف کیا ہے، پاور ہوا ہو جاتا ہے، اتنی بڑی تعداد میں اتنی مضبوط مستند اور نا قابل انکار شہادتوں کے بعد بھی اگر کوئی اپنے اعتراض کو دہراتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ علمی دیانت کے تقاضوں کو سمجھنے سے بھی محروم ہے یا اس کے دل کا کھوٹ یہ باتیں کہنے کے لئے مجبور کرتا ہے جس میں صداقت کا دور دور کہیں پتہ نہیں۔

آپ کو اس دور کی علمی تاریخ کو اس دور کے ماحول، حالات، جذبات، دینی سرگرمیوں اور اصحاب رسول کی دین کے سلسلے میں انتھک جدوجہد کو پیش نظر رکھ کر مطالعہ کرنا چاہئے، تبھی آپ سچائیوں کو پا سکیں گے اور حقائق تک آپ کی رسائی ہو سکے گی۔

جن صحابہ کی پوری زندگی دین کی اشاعت کے لئے وقف تھی، دین کی تبلیغ کا جو پودا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے لگایا تھا اس کی آبیاری کو صحابہ نے اپنی زندگی کا واحد مشن بنا رکھا تھا، اور وہ اپنے خون کے سینچے ہوئے ہزاروں نقوش تاریخ کے صفحات پر چھوڑ گئے ہیں تو کیا ان کے بارے میں کاغذ، قلم اور روشنائی سے اس کی آبیاری میں کسی کوتاہی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، جب کہ دین کی اشاعت کا سب سے موثر ذریعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تھی، آپ کے اخلاق و عادات کا بیان تھا، آپ کے احکام و فرامین کی اشاعت تھی، آپ کی زندگی کے ایک

---

۱۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۲۵۹۔

ایک پہلو کی تصویر کشی تھی، اُسوۂ رسول کو دنیا کے سامنے پیش کر کے دوسروں کے دلوں میں ایمان کی روشنی پہنچائی جاسکتی تھی، اس نکتہ سے صحابہ کرام خوب واقف تھے، اس لیے شب وروز کا ہر ہر لمحہ میں کسی نہ کسی بہانے ذکر رسول ضروری تھا، حضورؐ کے اسفارِ غزوات وجہاد، آپ کے اوامر ونواہی کا ذکر، آپ کی عبادت وریاضت، آپ کے اخلاق کریمانہ کی عکاسی یہی سب پہلو سب سے زیادہ موثر تھے اس لئے احادیث رسول ازخود درمیان میں آجاتی تھیں، چوں کہ رسول اللہؐ کی پوری زندگی ان کی نگاہوں کے سامنے گذری تھی، اس لئے ۲۳ رسالہ نبوت کے زمامہ کا ایک ایک واقعہ صفحۂ ذہن پر مرتسم تھا، ان کا بیان ان حضرات کا سب سے دل کش، محبوب، پسندیدہ، سکون بخش مشغل تھا، جہاں ضرورت پڑی زبان سے زبانِ رسولؐ کو بیان کردیا اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی تحریر سے کام لیا، یہی بیانات حدیث ہیں، اس لئے صحابہ کے پورے دور میں صرف مدینہ ہی نہیں مکہ مکرمہ، بصرہ، کوفہ، مصر، شام، دمشق، حمص وغیرہ، شہروں میں جہاں جہاں صحابہ کرام اقامت پذیر ہوگئے وہاں وہاں حدیث کے مدرسے کھل گئے اور حدیث کا فیضان عام ہوتا چلا گیا، اسلامی ممالک کے اندر صحابہ ہی میں قَالَ قَالَ رَسُولِ اللّٰہ صَلّی اللّٰہ علیہ وسلم کا نغمۂ ایمان افروز ہر طرف گونج رہا تھا، اس مقدس ذکر سے اسلامی شہروں کی فضا معمور تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی صدی میں نوے سال باقی تھے، اسی دور میں تابعین پیدا ہوئے جن کو بعد میں صحابہ کرام کے علوم کی اشاعت کا فریضہ انجام دینا تھا، جب وہ دین وایمان کی پاکیزہ فضا میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تو ہر طرف، ہر جگہ حتی کہ اپنے گھر میں اپنے ماں باپ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والہانہ انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے سنا وہ اَن دیکھے محبوب کے دیوانے ہوگئے، حضورؐ کی زیارت نہ ہونے کی حسرت لے کر ہر صحابی کے پاس پہنچے، ان کی زیارت کرنا، ان کی زبان سے حضورؐ کا ذکر جانفزا سننا ان کے شب وروز کا مشغلہ بن گیا۔ اب زمانہ کچھ اور آگے بڑھ چکا تھا، اسباب ووسائل ازخود پیدا ہوچکے تھے اس لئے تابعین اپنے

ساتھ قلم، کاغذ اور تختیاں لے کر سفر کرنے لگے۔ جو کچھ صحابہ سے سنتے وہ سب کچھ لکھ لیتے، اس طرح پوری اسلامی دنیا میں اہلِ علم کے علمی قافلے رواں دواں تھے لوگ جتھے بنا کر صحابہ کے پاس جاتے اور ان سے حدیثیں لکھتے، اس طرح تمام صحابہ سے احادیث کا عطر کشید کر کے ساری دنیا کی علمی فضاؤں میں اس کی خوشبو کو پھیلا دینے کا فخر و امتیاز انھیں تابعین کبار کو حاصل ہے، **فجزاھم اللّٰہ خیر الجزاء.**

## تابعین کبار کے عہد میں

میں نے اب تک عہد رسالت اور خالص عہد صحابہ میں جن حضرات نے احادیث قلمبند کر کے رکھی تھیں ان کا تذکرہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ بہت سے نوشتے اور مخطوطے اور یادداشتیں ہوں گی جن کا ذکر تاریخوں میں نہیں آسکا ہوگا یا اگر آیا ہے تو وہاں تک رہوار جستجو کے قدم نہیں پہنچے ہوں گے، یہ اتفاقاً تاریخوں میں روایتوں میں کہیں کہیں کسی کی تحریروں اور نوشتوں کا ذکر آگیا ہے اور ان کی تلاش کر کے جمع کیا گیا ہے ورنہ عقل کہتی ہے کہ صحابہ کرام جو عشق رسول میں دیوانے تھے جن کے ایک اشارے پر پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے، سمندروں میں گھوڑے دوڑانے والے، دشمنوں کے دہکتے ہوئے ماحول میں چھلانگ لگا دینے والے، ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، شوہر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر موت کے منہ میں چلے جانے کو اپنی سعادت سمجھنے والے صحابہؓ کرام کیا حضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہی حضورؐ کی صحبتوں کی برکات وانعامات زندگی کے جوش وخروش اور جذبات کی ہنگامہ آرائیوں سے ایک دم بے تعلق ہو جائیں گے؟ انسانی فطرت سے جو لوگ واقف ہیں اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ یقینی طور پر ہر ہر صحابی اپنی زندگی کی آخری سانس تک حضورؐ کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے رہا ہوگا، تنہائیوں میں حضورؐ کو یاد کر کے ان آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے رہے ہوں گے، اٹھتے بیٹھتے حضورؐ کا تصور آنکھوں میں سمایا رہا ہوگا۔

## جذبات صحابہ کے وارثوں کی ایک مثال

ایک مخلص اور سچا مسلمان حج کر کے آتا ہے تو ایک سال تک مکہ و مدینہ کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں تھکتا، جہاں بیٹھتا ہے، جس مجلس میں رہتا ہے، جس سے ملتا ہے ہر حال میں خانہ کعبہ کی جلالت شان اور گنبد خضریٰ کے ایمان افروز اور ورح نواز نظاروں کے تذکرے ہی میں اس کو سکون قلب ملتا ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ میں ہمہ وقت مدینہ کی گلیوں، راستوں، پہاڑوں اور اس کی زیارت گاہوں کا ہی تذکرہ کرتا رہوں۔ سوتے جاگتے مکہ مدینہ کا ہی خواب دیکھتا رہتا ہے۔ آپ سنتے سنتے تھک جائیں گے لیکن وہ بیان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا، یہ روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جب کہ آج ہمارا ایمانی جذبہ بہت کمزور پڑ چکا ہے، مکہ مدینہ کی ساری فضائیں بدل چکی ہیں، لیکن اس فضا میں چند دنوں رہ کر جو والہانہ عقیدت و وابستگی اس تصور کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہیں، یہیں کی پاکیزہ فضاؤں میں حضورؐ کے تنفس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، مدینہ کا ذرہ ذرہ اس کو بے تاب کر دیتا ہے کہ آؤ اپنی عقیدت کی پیشانیوں کو ان پر رکھ دو، ہر پتھر کہتا ہے کہ آگے بڑھو اور مجھ کو چوم لو، وہاں کے نخلستان کھجوروں کے درخت، مسجد نبوی کا گوشہ گوشہ، حجرۂ پاک کی جالیوں کا ایک ایک روزن اشاروں سے کہتا ہے باادب، ہوشیار، یہ بارگاہِ عالیشان ہے۔ یہاں قدموں سے نہیں سر کے بل چلا جاتا ہے، اس کی راہوں میں دیدۂ و دل بچھائے جاتے ہیں، کہیں ان خاک ذروں پر تمہارے قدم نہ پڑ جائیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمِ مبارک کو بوسہ دے کر عظمت و احترام کا بلند درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تصورات، جذبات اور والہانہ وابستگی زائر کے دل و دماغ کو مسحور کر لیتی ہے۔ پھر وہ دل میں مدینہ کی گلیوں کی یادوں کو بسا کر بوجھل قدموں سے اپنے وطن واپس لوٹتا ہے تو پوری زندگی کے لئے مدینہ کی یاد اس کا سب سے عظیم اور سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے۔

## صحابہ کا بلند ترین مقامِ عشق

جنھوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتوں سے فیض اٹھایا تھا ان کی وارفتگی و دیوانگی کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، دل ہی نہیں عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ صحابہ کرام ساری زندگی حضور کے ذکر پاک کو اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھتے رہے ہوں گے کیوں کہ حضور کی ذات سے جس کام اور بات کی نسبت ہو جاتی ہے مسلمانوں کے نزدیک سند کا درجہ رکھتی ہے، حجت اور دلیل شرعی ہوتی ہے اس سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں انھیں کی روشنی میں زندگی کی راہیں متعین ہوتی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا جاتا ہے۔

## حضور کا ہر قول و فعل یکساں حجت ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبان سے ارشاد فرما دینا، یا صحابہ کی موجودگی میں کسی کام کا کرنا تو بہت بڑی سند اور حجت تو ہے ہی آپ کا صرف مسکرا دینا بھی سو دلیلوں سے بڑی دلیل بن سکتا ہے، ایک مثال لیجئے، عبداللہ ابن مغفل رضی اللہ عنہ ایک جنگ میں چربی کی ایک تھیلی پا جاتے ہیں اس کو اٹھا کر کرُتے میں چھپا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور دل میں یہ سوچتے ہیں کہ اس میں کسی کو حصہ نہیں دوں گا، اسی حالت میں ان کی نگاہ اٹھ جاتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ شہنشاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے مسکرا رہے ہیں[1]۔ روایت یہیں ختم ہو جاتی ہے، عبداللہ ابن مغفلؓ کی بے ساختہ حرکتوں کو دیکھ کر حضورؐ کا صرف مسکرا دینا دلیل شرعی بن گئی کہ مال غنیمت میں کھانے پینے کی چیز چربی، شہد، انگور وغیرہ مل جائے تو مسلمان فوجیوں کو استعمال میں لانا جائز ہے یہ مال غنیمت میں خیانت اور ''غلول'' میں شامل نہیں جس کے لئے روایتوں میں بڑی بڑی وعیدیں آئی ہوئی ہیں حتی کہ سوئی دھاگا بھی مالِ غنیمت میں سے کسی نے لے لیا تو قیامت میں اس سے مواخذہ ہوگا۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف، ج ۲، ص ۳۴۹، ابوداؤد، ج ۲، ص ۳۶۹، کتاب الجہاد باب فی اباحۃ الطعام فی ارض العدو۔

## حضور کی ذات سے متعلق ہر واقعہ ناقابلِ فراموش تھا

ان حالات میں صحابہ کرام معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ ایسی صورت حال میں حدیثوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی، حدیثوں کے موجودہ ذخیرہ کو خلاف عقل تصور کرنا یہ ذہن وفکر اور عقل کی نارسائی ہے، تاریخ کا مطالعہ حالات اور ماحول کے تناظر میں کرنا چاہئے ورنہ بہت سے حقائق تمہاری نگاہوں سے مستور رہ جائیں گے، جیسا کہ کچھ لوگ حدیثوں کی کثرت دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

## تاریخ ہر قوم کا تاریخی ورثہ ہے

بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ نویسی نام ہے صرف فتوحات اور جنگ آرائی کا، آپ ہندوستان کی تاریخ اٹھا کر پڑھئے دس دس بارہ بارہ ضخیم جلدوں میں آپ کو ہندوستان کی تاریخ ملے گی، ابتداء سے انتہا تک آپ سوائے لڑائیوں، فوج کشیوں اور قتل وخونریزی اور غارت گری کے واقعات کے آپ کو اور کیا ملے گا، ایک طالع آزما تلوار ہاتھ میں لے کر اٹھتا ہے اور ملتان سے آسام تک فتح کر ڈالتا ہے، اب اس ملک کی پوری تاریخ اسی ایک شخص کے گرد گردش کرتی رہ جائے گی، صرف اسی کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں جگہ پائیں گے، کتاب کا ہر عنوان ہر باب کسی جنگ کی داستان ہوگا، تباہیوں کی کہانی سناتا ہوا نظر آئے گا، گویا وہ ملک ایک بڑا مذبح ہے جہاں صرف ایک ہی کام ہوتا ہے کہ انسان انسان کو ذبح کرتا رہتا ہے، اور کوئی دوسرا کام نہیں، کیوں کہ پوری تاریخ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صرف بابر، ہمایوں، اکبر، شاہجہاں، جہانگیر اورنگ زیب رہتے تھے، جب کہ دوسرے کروڑوں افراد اس ملک میں بستے تھے ان کی کہانی آپ کو کوئی تاریخ نہیں سناتی اور جس کی ذات، جس کا اقتدار، جس کی حکومت نے لاکھوں انسانوں کو اپنی خواہشات

کے بت پر بھینٹ چڑھایا اس کی ذات تاریخ کا محور بن گئی۔

لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو ملکوں اور شہروں کو فتح کرنے والے نہیں بلکہ دلوں کی دنیا کو فتح کرنے والے ہیں اور ایسے انسانوں کے دلوں کو فتح کرنے والے ہیں جن کے سینوں میں گوشت اور خون سے بنا ہوا نرم نازک دل نہیں تھا بلکہ ان کے سینوں میں دل بجائے سنگ خارا کا ٹکڑا رکھ دیا گیا تھا، درندہ صفت اتنے تھے کہ اپنے جگر گوشوں کو جب ناپسند کرتے تو کسی کھائی میں اس طرح پھینک دیتے جیسے کوئی غلاظت پھینکتا ہے۔ جھگڑالو اور خصومت پسند، سخت دل اور انسانیت کے اتنے بڑے دشمن کہ ایک اونٹنی کسی کے کھیت میں پڑ جائے تو اس قصہ کو لے کر چالیس سال تک لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اور ہزاروں آدمی اس آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایسے شقی القلب انسانوں کو رام کرنا، ان کے دلوں کو فتح کرنا عقل وخرد کی دنیا میں ناممکنات میں سے تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلوں کو فتح کیا کہ پوری انسانیت کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے پھر ایسے محسنِ انسانیت کو اس دور کا انسان کیسے فراموش کرسکتا تھا اس لئے لاکھوں صحابہ کرام نے اپنی زندگی بھر حضورؐ کے واقعات، بیانات، ہدایات، احکام کو ہو بہو یاد رکھا اور دوسروں سے بیان کیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، یہی بیان تو حدیث ہے، اپنے محبوب رہنما کی ہر بات کو اس اندیشہ سے کہ ذہن سے نہ نکل جائے اپنی زندگی میں لکھ لیا تو اس کو تسلیم کرنے کے لئے آپ کا دل کیوں تیار نہیں ہوتا؟ چودہ سو سال بعد دو چار یہودیوں نے آپ کو یہ سبق پڑھا دیا کہ حدیثیں دو سو سال بعد لکھی گئی ہیں اس لئے سب جھوٹی ہیں یہ سن کر آپ کے دل میں کانٹا چبھنے لگا۔

## صحابہ کی ساری حدیثیں قلم بند ہو چکی تھیں

صحاح ستہ کی کتابوں کو دیکھ کر احمقوں نے سمجھ لیا کہ حدیث کا وجود اس صدی میں ہوا، حدیثوں کو لکھنے کا آغاز تو عہد رسالت ہی میں ہو چکا تھا اور عہد صحابہ میں ساری

حدیثیں کلی طور پر لکھی جا چکی تھیں، صحابہ کرام نے خود لکھ لیا اگر خود نہیں لکھا تو دوسروں کو املا کرادیا۔ اگر یہ بھی نہیں ہوا تو انہوں نے زبانی یاد کیا اور تابعین کرام نے ان کو قلم بند کرلیا اس طرح ساری کتابیں جو بعد میں کتابی شکل میں مرتب ہوکر دنیا میں پھیلیں عہد صحابہ میں مکمل طور پر لکھی جا چکی تھیں جیسا کہ میں نے صرف حضرت انس بن مالکؓ کی مثال دی تھی کہ ان کے دوسوایک شاگردوں نے ان کی حدیثیں ان کی زندگی ہی میں لکھ لی تھیں، اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، اور حضرت عائشہؓ کی بیان کردہ ہزاروں ہزار حدیثیں ان حضرات کی زندگی میں قید تحریر میں آ چکی تھیں اور کئی سو حضرات نے ان کو قلم بند کیا تھا، حدیثوں کے لکھنے کا عہد رسالت سے جو سلسلہ شروع ہوا تو اخیر تک پورا سلسلہ مربوط ہے اور اس میں کوئی کڑی ٹوٹی نہیں ہے کیونکہ پہلی صدی کی آخری دہائی میں بھی چند صحابہ روئے زمین پر موجود تھے، آخری صحابی ۱۰۰ھ میں اس دار فانی سے رحلت فرماتے ہیں اس لئے پہلی صدی مکمل طور پر صحابہ کی صدی ہے، براہ راست حضورؐ سے حدیث سننے والوں کی صدی ہے اور اس صدی میں تابعین نے صحابہ سے قلم کاغذ لے کر ملاقاتیں کی ہیں اور ہر صحابی کی حدیثیں قلم بند کرڈالی ہیں اس کے بعد دوسری صدی کا آغاز تابعین و تبع تابعین کا مشترکہ دور آتا ہے اور کتابت حدیث کا سلسلہ اب دراز سے دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

## پہلی صدی کا ایک سرسری جائزہ

میں نے پہلی صدی کو صحابہ کی صدی کہا ہے اس لئے کہ آخری صحابی کا ۱۰۰ھ میں انتقال ہوا ہے، پہلی صدی کے ربع آخر یعنی ۷۵ھ میں ۲۵ صحابہ کرام موجود تھے اب صرف وہی صحابہ کرام باقی رہ گئے تھے جن کی عمریں دراز تھیں ۸۰ھ میں صحابہ کی جماعت ختم ہوچکی تھی ۸۱ھ میں صرف ۱۸ صحابہ تھے جن میں سات آٹھ شام کے مختلف شہروں میں تھے اور بقیہ دوسرے اسلامی ممالک کے دوسرے شہروں میں انفرادی طور پر تھے اور ۹۰ھ جب آتا ہے تو پہلی صدی کی آخری دہائی میں صرف چھ صحابہ کرام

روئے زمین پر رہ جاتے ہیں[1]۔

اس طرح پہلی صدی کے آخری ۲۵ سال خالص صحابہ کی مدت میں شامل نہیں کئے جا سکتے بلکہ اکابر تابعین اور صحابہ کرام کا مشترکہ دور کہا جا سکتا ہے اس لئے پہلی صدی کی علمی سرگرمیوں میں تابعین کا بہت اہم کردار ہے اس لئے صحابہ کی کتابتِ حدیث کے بعد اکابر تابعین کی جدو جہد کا جائزہ لے کر پہلی صدی کی کتابت حدیث کی سرگرمیوں کا مطالعہ مکمل ہوسکتا ہے۔ تابعین کرام ہی علوم صحابہ کے اولین امین ہیں، پہلی صدی کی پہلی دہائی کو خارج کر دیا جاتا ہے کہ حضور اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں تو نوے سال بچتے ہیں، خلافت راشدہ کے دور میں جتنے لوگ پیدا ہوئے وہ پہلی صدی کے اختتام تک عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے اس لئے ہمارے جائزہ میں سوائے چند تابعین کے اکثر کا انتقال پہلی ہی صدی میں ہو چکا ہے، اس لئے اکابر تابعین کا دور پہلی صدی کے اختتام پر ختم ہو جاتا ہے اس لئے ان کی ساری علمی سرگرمیاں پہلی صدی ہجری کی سرگرمیاں ہیں اور اس وقت کی ہیں جب علم سینوں اور دماغوں میں بھی موجود تھا اور زبانوں پر بھی تازہ تھا اس لئے تابعین نے علم حدیث کی حفاظت اور اس کو صحیفوں میں محفوظ کرنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے وہ بلا استثناء سب کا سب پہلی صدی کا علمی کارنامہ ہے، پہلی صدی کے تمام ہونے سے قبل ہی انھوں نے صحابہ کے علوم کو کاغذوں اور صحیفوں کے حوالے کر دیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۶۵ سالوں میں احادیث کا ذخیرہ لکھ کر محفوظ کیا جا چکا تھا، چوں کہ ابھی پریس کی ایجاد کو صدیوں کا انتظار تھا اس لئے باضابطہ مرتب کتابیں وجود میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بعد میں ہوا، اگر ہم خلافت راشدہ کے بعد ۴۰ھ سے صحابہ کی علمی سرگرمیوں میں ان کے تلامذہ تابعین کو بھی شریک مان لیں اور ان کو ماننا ضروری بھی ہے تو پہلی صدی کے آخری ۶۰ سال صحابہ اور تابعین کی مشترکہ جدو جہد اور مشترکہ علمی سرگرمیوں کا دور کہا

---

[1] شذرات الذہب (ابن العماد الحنبلی) کی جلد اول کے تفصیلی مطالعہ اور فہرست سازی کے بعد یہ معلومات سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

جائے گا، اب ہم اکابر تابعین کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کی حدیثیں لکھیں۔

## اکابر تابعین اور کتابتِ حدیث

اس جائزہ میں بالعموم ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلی صدی میں مصروفِ عمل تھے اگرچہ کچھ کا انتقال دوسری صدی کے آغاز میں ہوا ہے۔

**ابان بن عثمان** عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ولادت ہوئی ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا، انہوں نے سب سے پہلے کتاب المغازی مرتب کی بعد کے لوگ اس کو پڑھتے اور پڑھاتے تھے[1]۔

**ابراہیم نخعی** متوفی ۹۶ھ اپنے حافظہ پر مکمل اعتماد ہونے کی وجہ سے وہ خود تو حدیثیں نہیں لکھتے تھے لیکن اپنے شاگرد رشید حضرت قتادہ کو اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر دی تھیں[2]۔ ابراہیم نخعی اپنے تلامذہ کو بٹھا کر احادیث کا املا کراتے تھے[3]۔

**ابو سلمہ بن عبدالرحمن** خلافت عثانی میں پیدا ہوئے، وہ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر اہل علم کو دیتے تھے[4]۔

**ابو قلابہ** متوفی ۱۰۳ھ جلیل القدر محدث تھے بہت سے صحابہ سے انہوں نے حدیثیں لکھیں تھیں[5]۔ احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ لکھا ہوا ان کے پاس جمع تھا کہ وہ کتابیں ایک اونٹ کا پورا بوجھ تھیں، مرتے وقت وصیت کی تھی کہ یہ ساری کتابیں مشہور محدث ایوب سختیانی کے حوالے کر دی جائیں خود ایوب سختیانی کا بیان ہے کہ میں نے حمال کو تیرہ چودہ درہم مزدوری دی تھی، تمام مخطوطے ایک اونٹ پر بار کر کے میرے پاس لائے گئے تھے[6]۔

**ابو الزناد** ابن شہاب زہری کے ساتھ صحابہ کی خدمت میں جاتے تھے تو

---

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۹۷ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶
۲۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۹
۳۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۹۰، ۲۳۲
۴۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۱۸
۵۔ الکفایہ ص ۳۵۱
۶۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۸

اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ قلم لے کر جاتے تھے، صحابہ سے جتنی حدیثیں سنتے تھے سب لکھ لیتے تھے[۱]۔

**ابو الملیح بن اسامہ** متوفی ۸۹ھ وہ صحابہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پابندی کے ساتھ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے[۲]۔

**ام الدرداء** متوفی ۹۳ھ تابعیہ ہیں وہ اہلِ علم سے تختیاں لے کر اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر ان کو واپس کر دیتی تھیں[۳]۔

**جابر ابن زید** متوفی ۹۳ھ ان کے تلامذہ ان کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور وہ املاء کراتے تھے[۴]۔

**حارث بن عبد اللہ** متوفی ۶۵ھ ان کے پاس احادیث کے بہت سے مخطوطے تھے جو بعد کے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے اور اس سے روایتیں کی گئیں[۵]۔

**حبار بن جزئی السلمی** متوفی ۱۰۰ھ انہوں نے متعدد صحابہ کرام سے ملاقات کر کے ان سے حدیثیں لکھی تھیں[۶]۔

**حمران بن ابان مولیٰ عثمان بن عفان**رضی اللہ عنہ متوفی ۷۵ھ حضرت ابوبکر صدیق سے شرف ملاقات حاصل ہے صحابہ کی حدیثیں جمع کی تھیں اور جب وہ اپنی ساری کتابیں لے کر بصرہ گئے ہیں تو ان سے بہت سے لوگون نے حدیثیں لکھیں[۷]۔

**حسن بصری** سے ان کی حدیثیں لکھنے والے لکھ کر ان سے روایت کرنے کی اجازت حاصل کرتے اور وہ اجازت دیدیتے تھے[۸]۔

**حمید الطویل** نے بھی حسن بصری کی بہت سی حدیثوں کو لکھ کر اپنے پاس رکھا تھا[۹]۔

---

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج اص ۱۰۳
۲۔ دراسات فی الحدیث النبوی ج اص ۱۴۵
۳۔ حوالہ مذکور۔
۴۔ طبقات ابن سعد ج ۷ص ۱۲۱
۵۔ طبقات ابن سعد ج ۶ص ۱۱۶
۶۔ دراسات ج اص ۱۴۶
۷۔ ثقات ابن حبان ج اص ۱۷۱
۸۔ ترمذی ج ۲ص ۲۳۹
۹۔ تہذیب التہذیب ج ۳ص ۳۹

**خالد بن معدان ابن ابی کریب الکلاعی** متوفی ۱۰۳ھ انہوں نے ستر صحابہ سے ملاقاتیں کیں تھیں، ان کے پاس صحابہ سے سنی ہوئی حدیثوں کے صحیفے تھے اور ان کو جزدانوں میں باندھ کر بڑی حفاظت سے رکھتے تھے[۱]۔

**ذکوان ابو صالح السمّان** متوفی ۱۰۱ھ حضرت ابو ہریرہ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، انہوں نے ابو ہریرہؓ کی حدیثیں لکھ لی تھیں[۲] اور ان سے دوسروں نے ہزاروں حدیثیں لکھیں[۳]۔

**ابو العالیہ الریاخی رفیع بن مہران بصری** متوفی ۹۰ھ کاتبِ وحی اُبی بن کعب سے قرآن پڑھا وہ لوگوں کو احادیث لکھنے کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے خود انہوں نے ایک تفسیر لکھی تھی، اپنے پاس کی حدیثوں کا املاء کراتے تھے، ابواب فقہیہ کے طرز پر ان کے یہاں احادیث مرتب لکھی ہوئی تھیں[۴]۔

**رجاء بن حیوۃ** احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ لکھا ہوا اپنے پاس رکھتے تھے[۵]۔

**سالم بن ابی الجعد** متوفی ۱۰۰ھ کبار تابعین میں شمار ہے صحابہ سے سن کر پابندی سے وہ حدیثیں لکھ لیتے تھے[۶]، ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ وہ صحابہ سے سن کر تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے[۷]۔

**سعید بن جبیر** متوفی ۶۵ھ مشاہیر صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں، انھوں نے تفسیر قرآن لکھی تھی ان کے تلامذہ نے اس تفسیر کی نقلیں لیں، ان تلامذہ میں ضحاک، عبدالملک بن مروان، عزرہ، عطاء بن دینار ہُذنی اور قتادہ شامل ہیں[۸]۔

**سعید بن فیروز ابوالبختری** متوفی ۸۳ھ ان کے پاس فدک اور اموال بنی نضیر سے متعلق بہت سی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں[۹]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۵　　۲ دراسات ج ۱ ص ۱۴۷
۳ حوالہ مذکور　　۴ کتاب العلل ۱۷۶ بحوالہ دراسات
۵ سنن دارمی ص ۶۹　　۶ طبقات بن سعد ج: ۶، ص: ۳۰۳　　۷ ترمذی ج: ۲، ص: ۲۳۸
۸ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۱۰، ۱۸۶، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۰، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۹۸، ج ۴ ص ۳۷
۹ دراسات ج ۱ ص ۱۴۹۔

**سلیمان بن قیس الیشکری** متوفی ۸۰ھ وہ ہمیشہ پابندی سے حدیثیں لکھتے تھے[۱]۔

**سلیمان بن یسار** خلافت عثمانی میں ولادت ہوئی اور ۱۰۴ھ کے قریب وفات پائی ان کے پاس حدیثوں کا مخطوطہ تھا[۲]۔

**شراحیل بن شرحبیل** متوفی ۶۰ھ دمشق میں سکونت تھی، لوگ ان کے پاس آتے تھے اور ان سے حدیثیں لکھتے تھے[۳]۔

**شفیق بن سملة الاسد وابووائل** متوفی ۸۱ھ یہ حدیثوں کا املا کراتے تھے، ان سے حدیثیں لکھنے والوں میں سعید بن مسروق الثوری بھی ہیں جن کے ذریعہ احادیث کا یہ ذخیرہ مشہور محدث سفیان ثوری تک پہنچا جو کتابوں کی شکل میں تھا[۴]۔

**شہر بن حوشب الاشعری** متوفی ۱۰۰ھ وہ بول کر اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھواتے تھے[۵]۔

**صالح بن کیستان** امام زہری کے ساتھ صحابہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے حدیثیں لکھتے تھے[۶]۔

**ضحاک بن مزاحم** متوفی ۱۰۵ھ آپ کی تفسیر قرآن ہے اور مناسک حج کے مسائل پر مشتمل حدیثوں کا مجموعہ بھی تھا[۷]، حسین بن عقیل کے پاس یہ رسالہ موجود تھا۔

**طاؤس بن کیسان** متوفی ۱۰۰ھ ان کے پاس ایک کتاب تھی جس میں احادیث رسول لکھی ہوئی تھیں وہ اپنے تلامذہ اور دوسرے اہل علم کو حدیثیں املا کراتے تھے[۸]، مشہور محدث لیث ابن ابی سلیم بڑی بڑی تختیاں لے کر طاؤس کی خدمت میں جاتے اور حدیثیں لکھتے تھے[۹]۔

---

۱ تقیید العلم ص ۱۰۸ بحوالہ دراسات۔ ۲ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹۔
۳ کتاب الثقات ص ۳۳۱۔ ۴ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰۔
۵ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۵۹۔ ۶ کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۸۔
۷ الفہرست ابن ندیم ج ۴ ص ۳۴ کتاب العلل ج ۱ ص ۴۳۔
۸ سنن دار قطنی ج ۲ ص ۹۰ ۹ تاریخ ابن ابی خیثمہ ج ۳ ص ۵۸ بحوالہ دراسات۔

**عامر بن شراحیل شعبی همدانی** متوفی ۱۰۳ھ مشہور محدث اور تابعی ہیں کوفہ کے قاضی تھے، خود ان کے اپنے قوی حافظہ پر پورا اعتماد تھا، بعض احادیث ان کے حافظہ سے نکل گئیں تو نہ لکھنے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے اس لئے اپنے تلامذہ کو برابر تاکید کرتے رہتے تھے کہ جو لکھایا جارہا ہے پوری پابندی سے لکھ لو، وہ مستقل طور پر اپنی حدیثوں کا املاء کراتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں ان میں کتابُ الجراحات، کتابُ الفرائض، کتابُ الطلاق، کتابُ المغازی، اور احادیث فقہیہ کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے[1]۔

**عامر بن عبداللّٰہ بن مسعود الھذلی** مشہور صحابی رسولؐ ابن مسعودؓ کے صاحبزادے ہیں ۸۱ھ میں وفات پائی انھوں نے بہت سی حدیثیں قلمبند کر کے مشہور محدث یحییٰ بن ابی کثیر کو ارسال کی تھیں[2]۔

**عبدالرحمٰن بن عائذ الازوی** متوفی ۸۰ھ جلیل القدر تابعی ہیں کچھ لوگوں نے تو ان کو صحابی بھی کہا ہے، انھوں نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا لوگوں نے ان کی کتابوں کو ترازو پر تول کر آپس میں تقسیم کیا تھا[3]۔

**عبدالرحمٰن بن عبداللّٰہ بن مسعودؓ** یہ صحابی رسولؐ ابن مسعودؓ کے دوسرے صاحبزادے ۷۹ھ میں انتقال کیا ان کے لڑکے معن نے اپنے والد کے مخطوطہ کو اہلِ علم کے سامنے پیش کیا[4]۔

**عبدالرحمٰن بن غنم** متوفی ۷۸ھ میں انتقال ہوا، فقہائے شام میں آپ کا شمار ہے ان کی احادیث کو میسرہ نے اپنی کتاب میں جمع کیا ہے[5]۔

**ابوعثمان الھندی** کا انتقال ۹۵ھ میں ہوا، عہد جاہلیت میں ولادت ہوئی حضور کے عہد مبارک میں اسلام قبول کیا مگر شرف صحبت حاصل نہ ہوسکا، ان کے املا سے ان کی حدیثوں کو مشہور محدث سلیمان التیمی نے جمع کیا اور لکھا[6]۔

---

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۳۰، ۲۳۲۔ ۲؎ المعجم الکبیر طبرانی ج ۵ ص ۹۷۔

۳؎ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۰۴، تاریخ الفسوی ج ۲ ص ۱۱۸ بحوالہ دراسات۔

۴؎ بحوالہ دراسات ج ۱ ص ۱۵۴۔ ۵؎ حوالہ مذکور۔ ۶؎ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۱۰۔

**عبداللّٰہ ابن رباح** انصاری متوفی ۹۰ھ انھوں نے اپنی حدیثیں عبدالملک[1] بن حبیب الازدی اور ابوعمران[2] الجونی کو املاء کرائیں۔

**عبداللّٰہ بن ابی قتادۃ** الانصاری متوفی ۹۹ھ ان کی حدیثوں کو یحییٰ نے قلمبند کر کے ہشام کے پاس ارسال کی تھیں[3]۔

**ابوھاشم عبداللّٰہ بن محمد بن علی** متوفی ۹۹ھ انھوں نے خود احادیث کو قلم بند کیا تھا اور حدیثوں کے کئی مجموعے ان کے پاس تھے، انتقال کے وقت انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری یہ ساری کتابیں محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے پاس بھیج دی جائیں[4]۔

**عبداللّٰہ بن ھُرمز** متوفی ۱۰۰ھ انھوں نے خاص طور پر حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کو قلم بند کیا تھا[5]۔

**عبیداللّٰہ بن ابی رافع** کا انتقال ۸۰ھ کے قریب ہوا، یہ حضرت علیؓ کے کاتب تھے حضرت معاویہ اور حضرت علی کے درمیان ہونے والی جنگوں پر کتاب لکھی تھی[6]۔

**عبیدہ بن عمرو السلمانی** عہد رسالت میں ایمان لائے لیکن شرف صحبت حاصل نہیں ہوا، عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مخصوص تلامذہ میں تھے انکے پاس احادیث کے بہت سے مخطوطے تھے اور اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے تھے[7]۔

**عروہ بن الزبیر بن العوام** متوفی ۹۳ھ ان کا شمار مدینہ منورہ کے اجلّہ علماء میں تھا، انھوں نے امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو ان

---

[1] تہذیب التہذیب ج:۶،ص ۳۸۹۔
[2] مسند احمد بن حنبل ج۲ص ۱۹۲۔
[3] مسند احمد بن حنبل ج۵ص ۳۱۰۔
[4] طبقات ابن سعد ج:۵،ص:۲۴۱،تہذیب التہذیب ج:۶،ص:۱۶۔
[5] مسند احمد بن حنبل ج۲ص ۵۳۱۔
[6] تہذیب التہذیب ج۷ص ۱۰،۱۱،المعجم الکبیر (طبرانی) ج ا صفحات ۱۰۹،۲۱۵،۲۲۷۔
[7] طبقات ابن سعد ج۶ ص ۶۳،تہذیب التہذیب ج ۷ص ۸۴۔

کی زندگی میں ہی قلم بند کرلیا تھا، حضرت عائشہؓ کو بھی ان کے لکھنے کی خبر تھی، ایک دن انھوں نے عروہ سے بلا کر پوچھا کہ تم میری حدیثوں کو لکھتے ہو؟ تو انھوں نے کہا، ہاں لکھتا ہوں تو اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے کہا **لا باس بذلك**[۱] حضرت عروہؒ اپنی تمام اولاد کو بھی ابواب فقہیہ کی ترتیب پر حدیث پڑھاتے تھے، اور دوسرے شاگردوں کو سامنے بٹھا کر حدیثوں کا املاء کراتے تھے، لکھ لینے کے بعد دوبارہ ان کو سنتے تھے انھوں نے بہت سی تالیفات بھی مرتب کی تھیں جیسے **السیرۃ النبویہ** اس کے اجزاء حدیث کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں[۲]۔

**عطاء بن ابی رباح** وہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ حدیثوں کا املاء کراتے تھے[۳]۔

**عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ** متوفی ۱۰۵ھ ابن عباس کے ممتاز شاگردوں میں ہیں ابن عباس کے علوم کی ان کے پاس بہت سے کتابیں موجود تھیں[۴]۔ عکرمہ کی کتابوں سے نقل لینے والوں میں ایوب[۵] سختیانی، جابر ابن زید[۶]، حسین بن قیس سلمہ[۷] بن وہرام، عثمان بن غیاث کے نام ملتے ہیں۔

**عمر بن عبدالعزیز** امیر المومنین جنھوں نے سب سے پہلے علماء کو احادیث جمع کرنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی، انھوں نے خود حدیثیں لکھی ہیں[۸]۔

**عمرۃ بنت عبدالرحمٰن** حضرت عائشہ کی پروردہ ہیں ۹۸ھ میں انتقال کیا، اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو خاص طور پر حکم دیا تھا کہ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن سے مل کر ان کی حدیثوں کو قلم بند کرلیا جائے[۹]، اس کے علاوہ انھوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کرائے تھے[۱۰]۔

**قاسم بن محمّد بن ابی بکر الصدیق** متوفی ۱۰۵ھ جن لوگوں کو انھوں نے حدیثیں املا کرائی ہیں ان میں طلحہ بن عبدالملک الایلی[۱۱] اور ابوبکر بن محمد بن

---

۱۔ الکفایہ ص ۲۰۵۔
۲۔ المعجم الکبیر، مسند احمد بن حنبل، فتوح البلدان وغیرہ۔
۳۔ سنن دارمی ص ۶۹۔
۴۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۵۔
۵۔ دراسات ج ۱ ص ۱۶۱۔
۶۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۹۳۔
۷۔ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۳۔
۸۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۴۷۔
۹۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۷۶۔
۱۰۔ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۵۳۔
۱۱۔ صحیح بخاری فتح الباری ج ۱ ص ۱۰۴ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۵۳ سنن دارمی ص ۱۰۸۔

حزم[۱] کے بھی نام ہیں۔

**كثير بن مرة الحضرمی** کا انتقال ۷۵ھ کے قریب ہوا ہے، اکابر صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے جن اہل علم کو حدیثیں لکھ کر ارسال کرنے کا حکم بھیجا تھا ان میں ان کا بھی نام ہے اور انھوں نے صحابہ سے سنی ہوئی حدیثوں کو لکھ کر رکھا تھا ان کو نقل کر کے بھیج دیا[۲]۔

**مجاهد بن جبر المكی** کی وفات ۱۰۲ھ میں ہوئی، مشہور مفسر قرآن ہیں، عبداللہ بن عباس کی تفسیری روایتوں کے جامع ہیں وہ ابن عباس کی خدمت میں تختیاں اور قلم لے کر حاضر ہوتے تھے اور جو سنتے تھے اس کو لکھتے جاتے تھے[۳] مجاہد کی تفسیر میں ایک کتاب بھی ہے[۴] مجاہد کی روایتوں کو جن حضرات نے لکھا ہے ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ ابن ابی نجیح[۵]، ابن جریج[۶]، سفیان بن عیینہ[۷]، الحکم بن عتیبہ، قاسم بن ابی بزہ[۸]، لیث بن ابی سلیم[۹]، مجاہد کے مخطوطے سے یہ حضرات نقل کرتے تھے۔

**ابن الحنفية محمد بن علی ابن ابی طالب** متوفی ۸۳ھ

احمد بن مہدی کا بیان ہے کہ عبدالاعلیٰ کی ابن الحنفیہ سے روایتیں ان کی کتاب سے ہیں[۱۰]۔

**محمج بن كبشه** انصاری متوفی ۱۰۰ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے، اہلِ علم ان سے فتاویٰ لکھتے تھے[۱۱]۔

**معاذه بنت عبدالله العدديه** کی وفات ۸۳ھ میں ہوئی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کی ہے ان کی حدیثیں یزید الشک ابوقلابہ اور قتادہ کے پاس لکھی ہوئی تھیں[۱۲]۔

---

۱۔ دراسات ج ۱ ص ۱۶۳۔
۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۳۹۔
۳۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۵۷۔
۴۔ تفسیر طبری بحوالہ دراسات۔
۵۔ فہرست ابن ندیم ص: ۳۳۔
۶۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۵۴۔
۷۔ حوالہ مذکور۔
۸۔ کتاب الثقات ص ۵۸۵ بحوالہ دراسات۔
۹۔ بحوالہ دراسات ج: ۱ ص: ۱۶۵۔
۱۰۔ بحوالہ دراسات۔
۱۱۔ تعجیل المنفعۃ ص ۳۷۵۔
۱۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۲، الکفایہ ص ۲۲۹۔

**مغیث ابن سمی الاوزاعی** کی وفات ۸۰ھ کے قریب ہوئی، ابن معین نے لکھا ہے کہ ان کے پاس حدیثوں کا ایک مخطوطہ تھا[۱]۔

**مقسم بن بحیرہ** کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا ان کے پاس حدیثوں کا ایک مخطوطہ تھا جس سے الحکم اور عثمان المشاہد نے نقل کیا[۲]۔

**معطور الحبشی** ابوسلام شامی تابعی ہیں ان کی وفات ۱۰۰ھ میں ہوئی ان کی لکھی ہوئی حدیثیں تھیں اس کتاب سے وہ اپنے تلامذہ کو املاء کراتے تھے[۳]۔

**ہند بنت الحارث الفراسیہ** ۱۰۰ھ میں انتقال کیا، امہات المومنین سے روایت کرتی ہیں ان کی حدیثوں کو امام زہری نے لکھا ہے[۴]۔

**ھشام بن عروہ** کی بیان کردہ حدیثوں کو بہت سے لوگوں نے لکھا تھا وہ اپنے مخطوطے لے کر آتے اور ان کو سنا کر اجازت لیتے اور وہ اجازت دیتے تھے[۵]۔

**یحییٰ ابن جزار العرنی** آپ کی وفات ۸۰ھ میں ہوئی اکابر صحابہ سے روایت کی ہے ان کی حدیثوں کو کتابوں میں لکھنے والوں میں حکم بن عتیبہ بھی ہیں، حسن بن عمارہ کا بیان ہے کہ الحکم نے یحییٰ کی احادیث پر مشتمل کتاب مجھے دی اور میں نے اس کو حفظ کیا[۶]۔

**امام ابن شہاب زہری** کا انتقال تو ۱۲۴ھ میں ہوا لیکن صحابہ سے حدیثیں انھوں نے سب کی سب پہلی صدی کے آخر میں سنی ہیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے اول من دوّن الحدیث، انھوں نے احادیث کے اتنے مخطوطے لکھے کہ ان کو منتقل کرنے کے لئے کئی اونٹوں پر بار کیا گیا[۷]۔

## حجت تمام ہو چکی

میں نے آپ کے سامنے پہلی صدی ہجری میں حدیثوں کے لکھنے سے متعلق

---

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۵۵۔
۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۳۴۔
۳۔ تاریخ ابن ابی خیثمہ ج ۳ ص ۵۸ بحوالہ دراسات۔
۴۔ بخاری کتاب الاذان ۱۵۷۔
۵۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۳۹۔
۶۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۰۵، ۳۰۶۔
۷۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶۔

شہادتیں پیش کی ہیں جو اس بات کو آئینہ کر دیتی ہیں کہ پہلی صدی ہجری رخصت ہونے کے لئے جب رخت سفر باندھتی ہے تو جہاں وہ ایک ایک صحابی کو اپنا رفیق سفر بنا لیتی ہے وہیں حدیث کی ساری امانتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو سپرد کی تھیں صحابہ کرام مکمل طور پر آنے والی نسلوں کو سپرد کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے اور حدیث کا سارا سرمایہ کلی طور پر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ مستقبل کے حوالے کیا جا چکا تھا، میری پیش کردہ شہادتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ پادر ہوا ہو جاتا ہے کہ پہلی صدی میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں۔ اب یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صداقت ودیانت ورانسانیت وشرافت کے سارے تقاضوں سے محروم ہے کیوں کہ ان شہادتوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے احادیث کے اتنے مخطوطے تیار ہو چکے تھے کہ ان کا شمار کرنا بھی مورخین کے لئے ممکن نہیں رہ گیا ہے اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ ان اکابر امت کے پاس حدیثوں کا ذخیرہ پہنچا جنھوں نے ان کو کتابی شکل میں ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو آج ہمارے سامنے ہے۔

**فجزاهم الله خير الجزاء**

# ایک قدیم ترین مجموعۂ حدیث کا تعارف

**کتابُ السّنن، مؤلفه امام الحافظ المتقن الثبت سعید بن منصور بن شعبه الخراسانی المکی متوفی ۲۲۷ ھ**

سعید بن منصور کی کتاب السنن کا مخطوطہ بارہ صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا، پہلی بار یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں علمی دنیا کے سامنے آئی، اس کتاب کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے تمام مجموعوں بالخصوص صحاح ستہ سے بہت پہلی کی تصنیف ہے۔

اس کتاب کی دریافت سے مستشرقین کا وہ اعتراض پادر ہوا ہوجاتا ہے جو وہ کیا کرتے تھے کہ صحاح ستہ کو مؤلفین نے اپنے اقول لکھ کر ان کے ساتھ فرضی سندیں جوڑ دی ہیں، کتاب السنن کے مخطوطہ نے یہ دریافت کردیا کہ صحاح ستہ کے مؤلفین نے جو روایتیں بیان کی ہیں اور اپنی سندوں میں جو نام لیئے ہیں وہ سب حقیقی ہیں اور ان سے پہلے کے محدثین اور اہل علم نے انھیں سندوں سے وہی روایتیں بیان کی ہیں۔
کتاب السنن کے مؤلف اور جامع اپنے دور کے مشہور محدث سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی ثم مکی ہیں۔

## سعید بن منصور

سعید بن منصور کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ **الامام الحافظ، شیخ الحرم سعید بن منصور ابوعثمان الخراسانی المروزی ثم البلخی ثم المکی المجاور مؤلف کتاب السنن،** ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم اور محدثین کے نزدیک ان کا کیا مقام ومرتبہ تھا انھوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر

رکھی تھی، ان کی علمی زندگی کا زمانہ دوسری صدی ہجری کا نصف آخر ہے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے حدیثوں کے سماع میں صرف کیا۔

## علمی اَسفار

ان کی ولادت خراسان کے ایک مقام جوز جان میں ہوئی، بچپن کا زمانہ بلخ میں گذرا وہیں سے تعلیم کا آغاز بھی ہوا اور پھر سن شعور کے بعد دور دراز کے مختلف علاقوں میں جا کر اس دور کے مشہور محدثین سے حدیثوں سماع کیا اور پوری پابندی اور احتیاط کے ساتھ جمع کرتے رہے، علم حدیث حاصل کرنے کے سلسلے میں انھوں نے بہت سے اسلامی شہروں کا سفر کیا ہے، خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام، جزیرہ کے تو مسلسل سفر کئے اور ہر جگہ سے وہاں کے مشہور محدثین سے استفادہ کیا اور ان کو قلمبند کرتے رہے۔

## شیوخ حدیث

ان کے شیوخ حدیث کی فہرست بہت طویل ہے، علامہ ذہبی نے ۱۳۱ شیوخ حدیث کے نام لکھے ہیں، ابوالحجاج یوسف المزّی المتوفی ۷۴۲ھ نے ۷۴ محدثین کے اسماء گرامی کی نشاندہی کی ہے جن سے سعید بن منصور نے حدیثوں کا سماع کیا ہے جن سے بہت ہی ممتاز اور مشہور محدثین کے نام ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

امام دارالہجرۃ مالک بن انس صاحب مؤطا، لیث بن سعد، فلیح بن سلیمان، ابوعوانۃ الوضاح، حماد بن زید، ابوالاحوص، فضیل بن عیاض، سفیان بن عیینہ، ابومعشر السندی، سوید بن ابی ثور، ہُشیم، حزم بن ابی حزم، مہدی بن میمون، حدیج بن میمون، عبداللہ بن جعفر المدینی، جریر بن عبدالحمید، معتمر بن سلیمان، ابن ابی ذئب، عبداللہ بن المبارک، اور اسمٰعیل بن علیہ وغیرہ۔

## تلامذہ

ان سے روایت کرنے والے ان کے تلامذہ کی فہرست بہت ہی پرشکوہ ہے اس

فہرست میں امت اسلامیہ کے جلیل القدر محدثین اور ائمہ فن کے اسماء گرامی شامل ہیں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان سے روایت کرنے والے ۲۳ محدثین کے نام لکھے ہیں اور یوسف المزی نے ۴۵ محدثین کے نام شمار کرائے ہیں اس فہرست کے ممتاز ترین ناموں میں سے چند درج ذیل ہیں۔

امام احمد بن حنبل صاحب المسند ، امام ابوداؤد السجستانی صاحب السنن، امام مسلم القشیری صاحب الجامع الصغیر، امام ابومحمد الدارمی، محمد بن یحییٰ الذہلی، بشیر بن موسیٰ، ابوزرعۃ الدمشقی، ابوحاتم الرازی، علی بن عبدالعزیز البغوی، ابن سحاق التستری، احمد بن نجدۃ بن العربان الہروی۔ یہی احمد بن نجدۃ سعید بن منصور سے ان کی کتاب السنن کے راوی ہیں، ان کے علاوہ ایک دوسرے محدیث محمد بن علی بن زید الصائغ بھی سعید بن منصور سے ان کی کتاب السنن کی روایت کرنے والے ہیں اور آج علمی دنیا کے سامنے کتاب کا جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ انہیں موخر الذکر راوی کی روایت سے ہے۔

## ائمہ فن رجال کی رائیں

سعید بن منصور کی شخصیت، فن اسماء الرجال کے اماموں اور محدثین کی نگاہوں میں ممتاز ترین شخصیت تھی، جس نے بھی ان کا ذکر کیا ہے بڑی عظمت کے ساتھ کیا ہے خود ان کے معاصرین نے ان کے بارے میں بلند کلمات استعمال کئے ہیں، میں بہت ہی اختصار کے ساتھ سعید بن منصور کے معاصرین سے لے کر بعد کے دور تک کے تذکرہ نویسوں کی رائیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جن سے محدثین کے درمیان ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشہور مؤرخ ابن السعد الکاتب صاحب الطبقات الکبریٰ متوفی ۲۳۰ھ ان کے معاصرین میں ہیں کیونکہ ان کے تین سال پہلے سعید بن منصور کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی ہے، انہوں نے اپنی مشہور عالم کتاب ''طبقات بن سعد'' میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''سعید بن منصور کی کنیت ابو عثمان ہے ان کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی[۱]''

امام بخاری صاحب الجامع الصحیح نے ان کا زمانہ پایا ہے کیونکہ سعید بن منصور کی وفات کے ۲۹ سال بعد امام بخاری کا ۲۵۶ھ میں انتقال ہوا ہے، انھوں نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں ان کے متعلق لکھا ہے۔

''سعید بن منصور نے مکہ مکرمہ میں ۲۲۹ھ کے آس پاس وفات پائی ان کی کنیت ابو عثمان ہے، مکہ میں سکونت اختیار کرلی تھی حدیث کا سماع ان کو عبداللہ ابن ایاد، حجر بن الحارث سے حاصل ہے[۲]''

امام بخاری نے جب ''التاریخ الکبیر'' کی تلخیص کر کے ''التاریخ الصغیر'' مرتب کی تو اس میں سعید بن منصور کی وفات ۲۲۷ھ ہی تحریر کی ہے یہی تمام مستند مورخین نے بھی لکھی ہے، بخاری نے ان کے بارے میں ''الثبت'' کا لفظ استعمال کیا ہے یہ دونوں بیانات اس لئے اہمیت رکھتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات سعید بن منصور کے معاصر اور ہم زمانہ ہیں اس لئے ہم اسماء الرجال کی دوسری مشہور اور مستند کتابوں سے کچھ دوسری تفصیلات بھی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے پیش کرتے ہیں۔

امام بخاری کے بعد ابو حاتم رازی متوفی ۲۷۷ھ محدث رے کا زمانہ آتا ہے انھوں نے بذات خود سعید بن منصور سے حدیث کا سماع کیا ہے اس لئے ان کو ذاتی واقفیت ہے ان کے صاحبزادے ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ کے نام مشہور ہیں۔ وہ سعید بن منصور کے بارے میں اپنے والد ابو حاتم رازی کی روایت بیان کرتے ہیں۔

''سعید بن منصور کی کنیت ابو عثمان ہے، مکہ میں قیام تھا اور وہیں انتقال فرمایا ہے، میرے والد (ابو حاتم رازی) اور ابو زرعہ محدث دونوں کی روایت ہے کہ ہم سے عبدالرحمٰن نے بیان کیا، انھوں نے حرب ابن اسمٰعیل سے سنا انھوں نے مجھ سے کہا کہ امام ابن حنبل جب سعید بن منصور کا ذکر آتا تھا تو ان کی بڑی

۱؎ طبقات بن سعد ابن سعد الکاتب متوفی ۲۳۰ھ ج ۵ ص ۵۰۲

۲؎ التاریخ الکبیر امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ ج ۲ / ۱ ص ۲۷۴ نمبر شمار ۱۷۲۲۔

تعریفیں کرتے تھے، انھیں دونوں کی روایت ہے کہ محمد بن عبداللہ بن نمیر سے
سعید بن منصور کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ثقہ ہیں،
عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ میرے والد نے بھی ان کو ثقہ کہا ہے[1]''

ابن ابی حاتم کے بعد ابن الجوزی کا زمانہ آتا ہے ان کا سال وفات ۵۹۷ھ ہے
ان کی کتاب ''المنتظم'' جو اب تک پندرہ جلدوں میں چھپ چکی ہے بقیہ جلدیں زیر
طباعت ہیں، ابن الجوزی نے ان شاگردوں کی نشاندھی کی ہے، مثلاً۔

(۱) شمار نمبر ۱۹۱ عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن لاحق البزار نے سعید بن منصور
سے سماع کیا۔

(۲) شمار نمبر ۲۱۶ جعفر ابن محمد بن القعقاع ابو محمد البغوی سُرّ من رای میں رہتے
تھے اور سعید بن منصور سے سنی ہوئی روایتوں کو بیان کرتے تھے۔

(۳) شمار نمبر ۲۴۲ محمد بن خلیفہ بن صدقہ ابو جعفر المعروف بہ عنبر ویرعاقولی کے
باشندے تھے انہوں نے سعید بن منصور سے روایت کی ہے۔

اس کے بعد ابوالحجاج یوسف المزیؒ کا دور آتا ہے جن کا سال وفات ۷۴۲ھ
ہے انہوں نے اپنی ضخیم ترین اور مشہور ترین کتاب تہذیب الکمال میں سعید بن منصور کا
مفصل ذکر کیا ہے جس کا نمبر شمار ۲۳۶۱ ہے انہوں نے سعید بن منصور کے ان شیوخ
حدیث میں سے ۴۷ کے نام لکھے ہیں جن سے سعید بن منصور نے حدیثوں کا سماع کیا
ہے اور ان کی روایتیں اپنے مجموعۂ حدیث میں لائے ہیں اور پھر اس کے بعد سعید بن
منصور سے روایت کرنے والوں میں ۴۵ مشہور تلامذہ کے اسماء گرامی لکھے ہیں جن میں
سے بہت سے عالم اسلام کے نامور محدثین میں سے ہیں اور آج تک علمی دنیا ان کے
احسانات سے سبکدوش نہیں ہوسکی ہے اور نہ ہوسکتی ہے[2]۔

علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ میں سعید بن منصور کا ذکر کرتے

---

[1] کتاب الجرح والتعدیل (ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ ج ۲ ص ۶۸ (قسم اول)

[2] تہذیب الکمال ابوالحجاج یوسف المزی متوفی ۷۴۲ھ ج ۱۱ ص ۷۷ تا ص ۸۲ شمار نمبر ۲۳۶۱۔

ہوئے لکھا ہے۔

"سعید بن منصور بن شعبہ الحافظ الامام الحجۃ ابوعثمان المروزی ثم الطالقانی ثم البلخی المجاور بمکۃ "کتاب السنن" کے مولف ہیں ان کو امام مالک، فلیح بن بن سلیمان، لیث بن سعد، عبداللہ بن ابا د، ابومعشر السندی، ابوعوانۃ الوضاح اور ان کے طبقہ سے سماع حاصل ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابوبکر الاثرم، امام مسلم القشیری، امام ابوداؤد، بشر بن موسیٰ، ابوشعیب الحرانی، محمد بن علی الصائغ کے علاوہ اور دوسرے بہت سے لوگ[۱]"

علامہ ذہبی نے سعید بن منصور کی عظمت وجلالت علمی کے سلسلہ میں اکابر محدثین اور ائمہ اسماء الرجال اور ائمہ جرح وتعدیل کے بہت سے اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

سلمہ بن شعیب کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل کے سامنے سعید بن منصور کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ان کی بڑی تعریف کی اور ان کی عظیم علمی خدمات کا ذکر کیا مشہور محدث ابوحاتم رازی نے بیان کیا کہ: "هو ثقة من المتقنين الاثبات ممن جمع و صنف[۲]"

حرب الکرمانی سعید بن منصور سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں ان کا بیان ہے کہ سعید بن منصور نے ہم لوگوں کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں[۳]۔

مشہور مؤرخ اسلام اور محدث ومفسر حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں سعید بن منصور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سعید بن منصور مشہور کتاب السنن کے مصنف ہیں، ان کے فضل وکمال میں کچھ ہی لوگ ان کے دور میں ان کے شریک وسہیم ہیں ان کی وفات مکہ مکرمہ

---

۱۔ تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷۔
۲۔ تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷۔
۳۔ البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ ج ۱۰ ص ۲۹۹۔

میں ۲۲۷ھ میں ہوئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے قدماء کی کتابوں میں سعید بن منصور سے متعلق جتنی تفصیلات ہیں ان کو سمیٹ لیا ہے اور ان کا تذکرہ بہت ہی مفصل لکھا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے نام ونسب اور سکونت کا ذکر کرنے کے بعد ان کے شیوخ حدیث اور سعید بن منصور سے روایت کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ان محدثین وعلماء فن اسماء الرجال کے اقوال نقل کئے ہیں جنھوں نے سعید بن منصور کی عظمت وجلالت علمی کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا ہے، اسی سلسلہ میں سعید بن منصور کی اس خصوصیت بیان روایت میں احتیاط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اگر اپنے مجموعہ حدیث کی کسی روایت میں ایک لفظ بھی مشکوک ہو گیا تو پھر وہ اس روایت کو ہمیشہ کیلئے ترک کر دیتے تھے اور اس کو کبھی بیان نہیں کرتے تھے[1]۔

ابن حبان متوفی ۳۵۴ھ صاحب کتاب الثقات اور ابن العماد الحنبلی متوفی ۱۰۸۹ھ صاحب شذرات الذہب نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں سعید بن منصور کا ذکر بڑی عظمت واہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

## وفات

زندگی کے آخری ایام آپ نے ہر طرف سے قطع تعلق کرے کے مکہ مکرمہ میں بسر کئے، یہیں انہوں نے اپنی کتاب السنن کو مرتب کیا، ان سے کتاب السنن کے سماع کرنے والے یہیں آتے رہے، اس کے بعد پھر کبھی مکہ مکرمہ سے باہر نہیں گئے۔ اسی مقدس سرزمین اور مقدس مشغلہ میں رہتے ہوئے ۲۲۷ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، عام مؤرخین کے یہاں یہی سال وفات ہے، صرف امام بخاری نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں ان کا سال وفات ۲۲۹ھ لکھا ہے، لیکن قطعیت کے ساتھ نہیں لکھا ہے اور شک وشبہ کا اظہار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے التاریخ الصغیر لکھی تو اس

[1] تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی ج۴ ص۸۹، ۹۰۔

میں انہوں نے ان کا سال وفات ۲۲۷ھ ہی لکھا ہے جو عام مؤرخین لکھتے رہے ہیں[۱]۔

## کتاب السنن مستند کتاب ہے

یہ کتاب دنیا میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق وتحشیہ کے بعد مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی جب کہ یہ کتاب دوسری صدی کے آخر یا تیسری صدی کے آغاز میں تصنیف کی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضمانت ہے کہ جس مخطوطہ کی بنیاد پر یہ کتاب شائع کی گئی ہے وہ مشہور محدث سعید بن منصور کی کتاب ہے اس لئے اس کتاب کو مستند ہونے کے لئے سند کی ضرورت ہے اور یہ ناقابل تردید دلائل سے ثابت کر دیا جائے کہ یہ کتاب جس مخطوطہ سے نقل کر کے شائع کی گئی ہے وہ درحقیقت وہی روایات ہیں جن کو اس کے جامع سعید بن منصور نے اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کیا ہے اور پھر ان کے تلامذہ نے یکے بعد دیگرے آنے والی نسلوں کے سامنے ان روایتوں کو بیان کیا ہے، اگر یہ سلسلۂ سند قابل اعتماد اور ثقہ راویوں کے ذریعہ کاتب مخطوطہ تک پہنچتا ہے تو یقینی طور پر اس مخطوطہ کو سعید بن منصور کی کتاب تسلیم کیا جا سکتا ہے چونکہ سعید بن منصور مشہور محدث ہیں، اسماء الرجال اور تذکرہ کی تمام کتابوں میں ان کا مفصل ذکر موجود ہے اس لئے ان کی روایتوں کو درجہ اعتبار حاصل ہو جائے گا۔

ہم اسی نقطۂ نگاہ سے اس مخطوطہ کے سلسلہ سند پر نظر ڈالتے ہیں، اسماء الرجال کی

---

[۱] سعید بن منصور کے تفصیلی حالات کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھی جائیں۔ سیر اعلام النبلاء (علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ) ج ۱۰ ص ۵۸۶ تا ۵۹۰۔ تہذیب التہذیب الکمال (ابوالحجاج یوسف المزی متوفی ۷۴۲ھ) ج ۱۱ ص ۷۷ تا ۸۲۔ تذکرۃ الحفاظ (علامہ ذہبی) ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷، طبقات ابن سعد (ابن سعد الکاتب متوفی ۲۳۰ھ) ج ۵ ص ۵۰۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت پہلا ایڈیشن، التاریخ الکبیر (امام بخاری) القسم الاول من الجزء الثانی مطبوعہ حیدرآباد ص ۵۱۶۔ کتاب الجرح والتعدیل (ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ) ج ۴ ص ۶۸۔ البدایہ والنہایہ (حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ) ج ۱۰ ص ۲۹۹۔ شذرات الذہب (ابن العماد الحنبلی متوفی ۱۰۸۹ھ) ج ۲ ص ۶۲۔ میزان الاعتدال (علامہ ذہبی) ج ۲ ص ۱۵۹۔ تہذیب التہذیب (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ) ج ۴ ص ۸۹، ۹۰۔ العبر (علامہ ذہبی) مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء ج ۱ ص ۳۱۴۔

متعدد مستند کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب السنن کی سعید بن منصور سے روایت کرنے والے دو محدث ہیں، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں نے صراحتاً یہ نام لکھے ہیں ایک احمد بن نجدۃ بن العربان ہیں اور دوسرے راوی محمد بن علی بن زید الصائغ ہیں چونکہ بعد کا سلسلہ سند مؤخر الذکر راوی سے چلتا ہے اس لئے ہم اسمار الرجال کی کتابوں سے ان کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

## رجال سند

مطبوعہ کتاب السنن کے آغاز میں جو سند مذکور ہے وہ اس طرح ہے:

**اخبرنا الشيخ الحافظ ابوالبركات عبدالوهاب بن المبارك بن احمد، ابن الانماطى، قال، انبانا الثقة ابوطاهر احمد بن الحسن الباقلانى الكرخى، قال انبانا ابوعلى الحسن بن احمد بن ابراهيم بن الحسن بن محمد بن شاذان قراءة عليه وانا اسمع، فقال اخبرنا ابو محمد دعلج السجستانى قال، اخبرنا محمد بن على بن زيد الصائغ، قال، حدثنا سعيد بن منصور، قال، باب الحث علىٰ تعليم الفرائض ...... الىٰ آخره.**

اس سلسلہ سند میں سعید بن منصور سے روایت کرنے والے محمد بن علی بن زید الصائغ ہیں ان کا سعید بن منصور سے روایت کرنا ثابت ہے جیسا کہ علامہ ذہبی اور حافظ بن حجر عسقلانی دونوں کے یہاں یہ صراحت ملتی ہے دونوں کے الفاظ یہ ہیں:

**محمد بن على بن زيد الصائغ واحمد بن نجدة بن العربان وهما راويا كتاب السنن عنه[1].**

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ابن زید الصائغ مؤلف کتاب سعید بن منصور سے اس کتاب کے روای ہیں اس لئے اب یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ ابن الصائغ کون ہیں؟ اور ان کا علمی مقام و مرتبہ کیا ہے اور اہلِ علم میں ان کی روایتون کا کیا درجہ ہے،

---

[1] سیر اعلام النبلاء (ذہبی) ج ۱۰ ص ۵۸۹، تہذیب التہذیب (حافظ ابن حجر عسقلانی) ج ۴ ص ۸۹۔

اس پر مختصر طور سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

محمد بن علی بن زید الصائغ اپنے دور کے محدث تھے، مکہ میں سکونت تھی، حجاز کے متعدد محدثین نے ان سے روایت کی ہے، ان روایت کرنے والوں میں امام طبرانی اور دعلج کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان دونوں نے ان سے روایتیں لی ہیں، مشہور محدث امام طحاوی نے بھی ان سے روایت کی ہے ان کا پورا نام ابوعبداللہ بن محمد بن علی بن زید الصائغ المکی ہے ان کو محدث مکہ کہا جاتا تھا، ذی قعدہ ۲۹۱ھ میں وفات پائی، بعض مؤرخین نے ان کا سال وفات ۲۹۰ھ بھی لکھا ہے[1]، انھوں نے براہ راست مؤلف کتاب سعید بن منصور سے اس کتاب کی روایت کی ہے پھر ان سے روایت کرنے والے دعلج بن احمد بن دعلج ہیں۔

ان کو پورا نام ونسب دعلج بن احمد بن دعلج المعدل ابومحمد وابواسحاق السجستانی ہے۔ حدیث کے سماع کے لئے مختلف مقامات کے سفر کئے پہلے وہ خراسان گئے پھر رے، حلوان، بغداد، بصرہ، اور مکہ مکرمہ کے علمی اسفار کئے اور وہاں کے محدثین کے حلقوں میں بیٹھ کر ان سے حدیثوں کا سماع کیا، معاشی اعتبار سے بہت خوشحال اور فارغ البال تھے، حسن سلوک اور خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے، علم حدیث حاصل کرنے والوں کی مدد کے لئے جائدادیں وقف کر رکھی تھیں، آخر دور میں مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ان کے شیوخ حدیث میں عثمان بن سعید الدارمی، حسن بن سفیان الفسوی، ابن البراء، محمد بن ابراہیم البوشنجی، عبداللہ بن احمد بن حنبل، محمد بن ربح البزار، محمد بن علی بن زید الصائغ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

خود دعلج سے روایت کرنے والوں میں ابن حیویہ، امام دارقطنی، ابن رزقویہ ابوالقاسم علی بن بشران، عبدالملک بن بشران وغیرہ کے نام اسماء الرجال کی کتابوں میں ملتے ہیں، دعلج ائمہ اسماء الرجال کے نزدیک، ثقہ، ثبت، مامون ہیں، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ہم نے اپنے شیوخ حدیث میں ان سے ''اثبت'' نہیں دیکھا، آپ کی

[1] سیر اعلام النبلاء (علامہ ذہبی) چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۶ء ج ۱۳ ص ۴۲۸، ۴۲۹۔

وفات مکہ مکرمہ میں ۳۵۱ھ میں ہوئی[1]۔

مذکورہ بالا دعلج سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے حسن بن احمد بن ابراہیم ہیں پورا نام الحسن بن احمد بن ابراہیم ابن الحسن بن محمد ابن شاذان البزار ہے آپ کی ولادت ۳۳۹ھ میں ہوئی انہوں نے جن شیوخ حدیث سے روایتوں کا سماع کیا ہے ان میں عثمان بن احمد الدقاق، النجاد، الخلدی کے اسماء گرامی شامل ہیں، ابن الجوزی نے ان کو ثقہ صدوق لکھا ہے، ذہبی نے ان کا بیان لکھا ہے کہ ایک دن ایک نوجوان آیا اس نے کہا کہ شیخ محترم! میں نے رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ نے فرمایا کہ اپنی بات ابوعلی ابن شاذان سے پوچھ لو، اور جب ان سے ملاقات کرو تو ان کو میری طرف سے سلام کہہ دینا، یہ کہہ کر نوجوان چلا گیا اور ابوعلی پر گریہ طاری ہوگیا، روتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ میرا کوئی ایسا اچھا عمل نہیں ہے کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلام پانے کا مستحق سمجھا جاؤں سوائے اس کے کہ میں قرأت حدیث میں شب وروز حدیث میں مشغول رہتا ہوں اور جب جب ذکر پاک آتا ہے تو بار بار آپ پر درود پڑھتا رہتا ہوں۔

اس واقعہ کے بعد وہ زیادہ دنوں تک دنیا میں نہیں رہے دو یا تین مہینے کے بعد سفر آخرت کے لئے رخت سفر باندھ لیا ان کا سال وفات ۴۲۶ھ ہے[2]۔

انھوں نے سعید بن منصور کی کتاب السنن کی روایت دعلج سے کی ہے اور ابن شاذان البزاز سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے احمد بن الحسن الباقلانی ہیں۔

علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے **"الشیخ الامام المحدیث الحجة ابوطاهر احمد بن الحسن بن احمد بن الحسن ابن خدادا د الکرجی الباقلانی البغدادی"** ذہبی نے ان کو ثقہ صالح لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ زہد وتقویٰ میں مشہور تھے ان کو حدیث کا سماع ابوعلی شاذان،

---

[1] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) چوتھا ایڈیشن ج۱۶ ص۳۰.

[2] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) ج ۱۷ص ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷۔

ابوالقاسم بن بشران، اور ابوبکر البرقانی سے حاصل ہے اور ان سے روایت کرنے والے عبدالوہاب وغیرہ ہیں۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ ہمارے شیخ عبدالوہاب فرمایا کرتے تھے کہ امام باقلانی جمعہ کو پورے دن مصروف عبادت رہتے تھے، اصحاب حدیث اور اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے ''من السبت الی الخمیس'' تعلیم وتدریس سنیچر سے جمعرات تک بس، جمعہ کا دن میرا اپنے خاص دن ہے، نماز وتلاوت کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتے تھے اور جامع مسجد میں بھی جمعہ کے دن حدیث کی قرأت نہیں کرتے تھے، بغداد میں سکونت تھی جب نظام الملک بغداد آیا تو اس نے چاہا کہ بغداد کے تمام محدثین سے حدیث کا سماع کرے اس لئے اس نے تمام محدثین کے ساتھ امام باقلانی کو بھی بلایا کہ ان کے محل پر آکر حدیث کی قرأت کریں، مگر وہ نہیں گئے، بہت اصرار کیا مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے، یہاں تک کہ ۴۸۹ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے[1]۔

امام باقلانی سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے عبدالوہاب بن المبارک ہیں، یہ امام ابن الجوزی کے شیخ اور استاذ ہیں ان کا ذکر علامہ ذہبی نے ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔

''الشیخ الامام الحافظ المفید الثقة المسند بقیة السلف ابوالبرکات عبدالوهاب بن المبارك بن احمد بن الحسن بن بندار البغدادی الانماطی''

ان کو جن شیوخ سے حدیث کا سماع حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں، ابومحمد الصریفینی، ابوالحسن بن النقود، ابوالقاسم ابن البسری، ابونصر الزینبی وغیرہم ان کے علاوہ دوسرے شیوخ حدیث سے بھی ان کو سماع حاصل ہے، بہت ہی متقی، صاحب زہدوورع تھے، اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتے تھے، ابن الجوزی ان کے بارے میں صحیح السماع، ثقة ثبت کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کا

---

[1] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) ج ۱۹ ص ۱۴۴۔

بیان ہے کہ میں ان کے سامنے حدیث کی قرأت کرتا تھا تو وہ روتے جاتے تھے، مجھے ان کے بیان سے زیادہ ان کے رونے سے علمی فائدہ پہنچا میں نے ان سے اتنا استفادہ کیا کہ اس کے مقابلے میں دوسروں سے کچھ حاصل نہیں کیا میں ان کی خدمت میں ان دنوں حاضر ہوا جب وہ انتہائی لاغر ہو چکے تھے ان کی وفات ۱۱/محرم ۵۳۸ھ میں ہوئی[۱]۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس مخطوطہ کا کاتب کون ہے؟ اور قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں تفصیل پیش ہے، کتاب السنن کے مخطوطہ کے کاتب محمد بن احمد بن علی الخطیب الدمشقی ہیں جنھوں نے ربیع الاول ۷۲۵ھ میں اس کی کتابت سے فراغت حاصل کی انہوں نے جس مخطوطہ سے اسے نقل کیا ہے وہ انہیں مذکورہ بالا عبدالوہاب ابن المبارک کی روایت سے ہے کاتب نے ان کی مکمل سند کو ابتداء میں نقل کر دیا ہے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

اگرچہ عبدالوہاب ابن المبارک اور کاتب مخطوطہ کے زمانہ میں ۱۸۷ سال کا فرق ہے لیکن کاتب کے سامنے جو مخطوطہ ہے وہ عبدالوہاب کا مستند مخطوطہ ہے اس لئے اس پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اب اسی مخطوطہ کی بنیاد پر کتاب السنن کی طباعت ہوئی جو آج علمی دنیا کے سامنے ہے۔

## طرزِ تصنیف

کتاب السنن دنیا میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں محدیث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق وتعلیق وتحشیہ کے بعد مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے دو جلدوں میں شائع کی گئی، اس کی کل روایتوں کی تعداد ۲۹۲۸ ہے، اس کا طرز تحریر صحاح ستہ سے قدرے مختلف ہے اگرچہ اس کی ترتیب ابواب فقہیہ کے طرز پر ہے، چونکہ کتاب السنن کا مخطوطہ نامکمل دریافت ہوا ہے، اس لئے کتاب الطہارۃ کتاب الصلوٰۃ وغیرہ کے ابواب نہیں ہیں اہل علم نے مسائل ومباحث کو مدنظر رکھ کر شائع کردہ ایڈیشن کو تیسری

---

[۱] سیر اعلام النبلاء (ذہبی) ج۲۰ص ۱۳۴، ۱۳۵۔

جلد قرار دیا ہے اور اسی کو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے۔

اس کا پہلا حصہ علم الفرائض اور کتاب الوصایا سے شروع ہوتا ہے ان ابواب کی روایتوں کا سلسلہ ۱۲۰ صفحات تک چلا گیا ہے، احادیث کے مجموعوں میں علم الفرائض اور کتاب الوصایا سے متعلق اتنا بڑا ذخیرہ کسی کتاب میں یکجا نہیں ہے، فرائض کے باب کی ابتداء میں خارجہ بن زید بن ثابت کی روایت میں کہا گیا ہے کہ علم الفرائض پر سب سے مفصل کلام زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا ہے پھر ان کی بیان کردہ تفصیلات کو مسلسل دس صفحوں میں بیان کیا گیا ہے اس باب پر تقسیم وراثت کی سیکڑوں شکلیں بیان کی گئی ہیں اور صورت میں کس کا کتنا حصہ ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے، کتاب الفرائض میں سوائے چند مرفوع روایتوں کے بقیہ پورے باب میں صرف صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء کے اقوال و آثار، فتاویٰ، بیانات، توضیحات اور مقدمات کے فیصلے ہیں اور ہر بات کو مولف نے پوری سند کے ساتھ بیان کیا ہے اس لئے یہ تفصیلات بطور حجت کہیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر پہلی صدی ہجری کے آخر تکہ روزمرہ کی زندگی میں تقسیم وراثت کی جتنی صورتیں سامنے آئیں ان میں خلیفہ وقت، قاضی، یا جس فقیہ کے سامنے صورت حال پیش کر کے شرعی حکم معلوم کرنا چاہا انھوں نے اس صورت خاص میں شریعت کا فیصلہ بتادیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کے واقعات اور فیصلے زیادہ ہیں ان کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عثمان بن عفانؓ، زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ کے فیصلے اور فتاوے کثرت سے ہیں تابعین میں حسن بصری، مسروق بن الاجدع، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، مجاہد، اور قاضی شریح کے فیصلے، فتاوے، اقوال وآرا ہیں، ان آثار سے اس دور کے مسائل روزمرہ کی زندگی کے حوادث وحالات اور معاشرہ کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، فقہ کی کتابوں میں امکانی اور فرضی صورتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام بیان

کیئے گئے ہیں ان روایتوں میں حقیقی واقعات کے وجود میں آنے پر شریعت کا حکم بیان کیا گیا ہے، کچھ ایسے مسائل بھی پیش آجاتے تھے کہ اس کی نظیر عہد رسالت میں نہیں تھی اس لئے ان مسائل میں بھی شریعت کا حکم متعین کرنا ضروری تھا، صحابہ کرام اور فقہاء نے ان تمام مسائل میں شریعت کا حکم متعین کیا کیونکہ نظیر کی عدم موجودگی میں وہ اجتہاد سے کام لیتے تھے جس کا دروازہ شریعت میں کھلا ہوا ہے۔

تقسیم وراثت میں ایک بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ سامنے آیا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ ایک ''خنثیٰ مشکل'' وراثت کا دعویدار ہوا، فقہاء کے یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کو لڑکے کا حصہ دیا جائے یا لڑکی کا؟ دونوں کے حصے میں بہت بڑا فرق ہے، اس کا تعین کیسے ہو؟ ابوزیاد کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تھا اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکے، اہل علم سے مشورے کیئے، مگران کے پاس بھی اس کا کوئی حل نہیں تھا، ایک اہل علم سے مشورے کیئے، مگران کے پاس بھی اس کا کوئی حل نہیں تھا، ایک اہل علم نے کہا کہ مسئلہ کا حل جابر بن زید کے پاس ہوسکتا ہے، اتفاق سے وہ ان دنوں جیل میں تھے، ان کو جیل سے رہا کیا گیا اور ان کو مجلس میں بلاکر ان کے سامنے صورت حال پیش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ مخنث کو ایک دیوار کے متصل کھڑا کردو اور اس سے پیشاب کرنے کے لئے کہا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا پیشاب دیوار پر گرتا ہے تو اس کو لڑکا تسلیم کیا جائے اور لڑکے کا حصہ دیا جائے گا، اور اگر اس کا پیشاب اس کی رانوں پر گرتا ہے تو اس کو لڑکی مان کر لڑکی کا حصہ دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ان مسائل کی جن کی نظیر پہلے دور میں نہیں ملتی، غرضیکہ بعد کے دور میں فرائض سے متعلق بہت سی شکلیں اور صورتیں سامنے آئیں اگر بہ نظر غائر ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بہت سی صورتوں کا ہو بہو جواب مل جائے گا، فرائض اور وصیت کی روایات کتاب کے ایک تہائی حصہ میں ۱۲۰ اصفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ان ابواب کی روایتوں کی تعداد ۶۸۴ ہے۔

## کتاب النکاح و کتاب الطلاق

اس کے بعد کتاب النکاح اور پھر کتاب الطلاق آتی ہے ان دونوں ابواب میں بھی مرفوع روایتوں کی تعداد بہ نسبت آثار و اقوال صحابہ و تابعین کے بہت کم ہے، صحابہ کرام اور تابعین، تبع تابعین اور فقہاء کے فتاوے، اقوال و آثار اور فیصلے زیادہ ہیں مسلم معاشرہ میں جو واقعات ظہور پذیر ہوتے تھے اگر اس میں حکم شرعی معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تو فریقین یا کوئی ایک فریق خلیفہ، قاضی، یا کسی فقیہ کے پاس جاتا اور صورت حال پیش کر کے شرعی حکم معلوم کرتا تھا تو اس کو شرعی فیصلہ بتا دیا جاتا تھا اس طرح سیکڑوں اور ہزاروں واقعات ان روایتوں کے ذریعہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں اور ان کے بارے میں شرعی احکام کا علم ہو جاتا ہے، نکاح و طلاق کی بے شمار شکلیں اور صورتیں پیدا ہوئیں بعض بہت پیچیدہ شکلیں بھی سامنے آئیں جن کی نظیر عہد رسالت میں موجود نہیں تھی مگر فقہائے صحابہ و تابعین کی دوربین نگاہوں نے ان کا شرعی حل تلاش کر لیا۔ روایتوں کا جائزہ لینے سے اس دور کی تہذیب، سماجی حالات اور مسلم معاشرہ میں روز مرّہ کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں اور اس دور میں ظہور پذیر ہونے والے بہت سے واقعات ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، کتاب النکاح اور کتاب الطلاق میں جن صحابہ، تابعین، قاضیوں اور فقیہون کے اقوال و آثار، فتاوے اور فیصلے آئے ہیں ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ، عمر بن الخطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ، عثمان بن عفانؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوالدرداءؓ، ابوایوب انصاریؓ، ابوہریرہؓ، محمد بن مسلمہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کے نام بار بار آتے ہیں، ان کے علاوہ بعض بعض جگہ کچھ دوسرے صحابہ کے بھی اقوال ہیں۔ تابعین میں جن حضرات کے نام بہ کثرت آئے ہیں ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیا ہیں۔

طاؤس بن کیسان، عامر بن شراحیل شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن سعید، یزید بن

میسرہ، ابوقلابہ، جابر بن سعید، ابومسلم الخولانی، مکحول، قاضی شریح، حسن بصری، عطاء بن ابی رباح، سعید بن مسیّب، عکرمہ، علقمہ، مجاہد وغیرہ۔

نکاح وطلاق کی سیکڑوں صورتیں ایسی سامنے آئیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح حکم نہیں تھا، ان میں غور وفکر اور اس اجتہاد کی ضرورت تھی جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر توصیف فرمائی تھی، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا جا رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر تمہارے سامنے لوگوں کے مقدمات ومعاملات آئیں تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ جواب دیا کہ قرآن سے، حضورؐ نے فرمایا اگر قرآن میں نہ ملا تو پھر کیا کرو گے؟ تو جواب دیا سنت رسولؐ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا، پھر حضورؐ نے سوال فرمایا کہ اگر در پیش صورت حال کا جواب قرآن اور حدیث دونوں میں نہیں ملا تب تم کیا کرو گے؟ اس کے جواب میں معاذ بن جبلؓ نے فرمایا۔

اجتهد برائی ولا الو. میں انتہائی غور وفکر سے کام لوں گا اور منشاء شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا حضورؐ کے الفاظ ہیں۔

الحمد للّٰه الذی وفق رسول رسول اللّٰه لما یرضیٰ به رسول اللّٰه[1]

خدا کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے خدا کا رسول خوش ہوتا ہے۔

کتاب السنن کی روایات وآثار سے اجتہاد کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے حدود وشرائط کیا ہیں؟ صحابہ وتابعین کے سیکڑوں اقوال وآثار ان کی نشاندہی کرتے ہیں، نکاح وطلاق کی ایسی ایسی صورتیں سامنے آئیں کہ عقل چکرا جاتی ہے لیکن شریعت کے مزاج داں اہل علم نے ان مسائل کا حل پیش کیا اور آج وہ فیصلے اور حل ہمارے لئے دلیل وحجت ہیں اور پوری ملت اسلامیہ کا ان پر

[1] مشکوٰۃ باب العمل فی القضاء ص ۳۲۴.

عمل ہے کیونکہ وہ سب کے سب حدیث وقرآن کی منشا کے مطابق ہیں اور امت اسلامیہ کے سامنے ایک ایسی روشن اور صاف شاہراہ آجاتی ہے جس پر چلنے میں کوئی خطرہ نہیں رہتا۔

کتاب النکاح کے صفحات ۱۳۴ روایتوں کی تعداد ۵۶۸ ہے کتاب الطلاق کے صفحات ۱۲۷ اقوال وآثار اور روایتوں کی تعداد ۱۲۴۷ ہے، مطبوعہ کتاب السنن کی دوسری جلد کے آغاز میں کتاب الطلاق ہی کی روایتیں ہیں جو ۱۲۲ صفحات تک چلی گئی ہیں اس کے بعد کتاب الجہاد شروع ہوتی ہے اور اسی پر کتاب تمام ہوجاتی ہے، اس کے صفحات ۲۵۵ ہیں اور روایتوں کی تعداد ۶۷۹ ہے اس طرح پوری کتاب میں روایتوں کی تعداد ۲۹۷۸ ہوجاتی ہے، اس میں سب سے زیادہ طلاق سے متعلق روایتیں ہیں اس کی روایتوں کی تعداد دوسرے ابواب کی روایتوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں۔

## کتاب الجہاد

کتاب الجہاد کے ابتدائی ابواب میں بہ نسبت دوسرے ابواب کے مرفوع روایتوں کی تعداد قدرے زیادہ ہے، اسی کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت کے واقعات وحوادث، قوانین واحکام فیصلے اور فتاوے، اصول وضوابط زیادہ ہیں کیونکہ عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور بہت سے ایسے حالات پیش آئے جو عہد رسالت اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ڈھائی سالہ دور خلافت میں نہیں پیش آئے ان حالات میں شریعت کی منشا کے مطابق اصول وضوابط بنانے کی ضرورت تھی، حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور صحابہ کرام کی بصیرت دونوں نے مل کر ایسی بہت سی صورتوں میں فیصلے کئے جن کی نظیر پہلے موجود نہیں تھی ان مسائل سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ اسلامی تمدن کے تقاضے اور ضرورت تھی۔

اسلامی دعوت کو لے کر عساکر اسلامیہ مختلف ملکوں میں پھیل گئیں تو مجاہدین برسوں اپنے اہل وعیال سے دور رہنے لگے جب کہ انسان کے کچھ طبعی وفطری تقاضے

بھی ہوتے ہیں جن سے چشم پوشی ممکن نہیں تھی حضرت عمرؓ نے اس پہلو پر بھی نظر ڈالی اوراس کا ضابطہ مقرر کردیا۔ **باب الغازی یطیل غیبة من اهله** میں کئی روایتیں اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں، میں یہاں بطور مثال صرف دو روایتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ معاشرہ کی ضرورت اور حالات کی مجبوریوں میں قوانین کی ضرورت کا اندازہ ہوسکے۔

ایک روایت ہے، حضرت عمر فاروقؓ رات کے وقت مدینہ کی گلیوں میں گشت کررہے تھے ان کے ساتھ عبداللہ بن ارقم بھی تھے، انھوں نے کچھ دور پر تاریکی میں ایک سایہ سا دیکھا تو عبداللہ سے کہا کہ جا کر دیکھو کہ یہاں تنہا اندھیرے میں کون کھڑا ہے اور کیوں کھڑا ہے، عبداللہ گئے، دیکھا کہ ایک عورت تن تنہا کھڑی ہے، عبداللہ نے جا کر پوچھا تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اس نے بڑے غصہ میں کہا کہ تم اور تمہارے ساتھی جو وہاں ہیں کیوں کھڑے ہیں؟ عورت جانتی تھی کہ جو تھوڑی دوری پر کھڑے ہیں وہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ ہیں جن کے نام سے بڑے بڑے دل گردے والوں کے جسم پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے، لیکن عورت نے اس کی کوئی پروانہیں کی، اوراس نے بہت ہی گرم لب ولہجہ میں کہا کہ عمر فاروقؓ کو کیا حق ہے کہ میرے شوہر کو ایک سال سے جہاد پر بھیج رکھا ہے؟ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہی نہیں ہے، عبداللہ نے واپس آکر حضرت عمرؓ کو پوری بات بتادی دوسرے دن انھوں نے محاذ پر حکم بھیج کر اس کے شوہر کو واپس بلالیا۔

اس کے بعد ایک روایت میں جو واقعہ ہے اس نے حضرت عمرؓ کو مجبور کردیا کہ مجاہدین کے لئے ڈیوٹی اور رخصت کے لئے کچھ اصول بنائیں اور کچھ ہدایات جاری کردیں جن کی پابندی ہر مجاہد کے لئے ضروری ہو، یہ روایت اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہے، روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حسب معمول شب میں گشت پر تھے گلیوں میں گھوم پھر کر پہرہ دے رہے تھے، جب ایک گھر کے سامنے پہنچے تو اس گھر سے آواز آرہی تھی کوئی عورت یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

تَطَاوَلَ هٰذَا اللَّيۡلُ وَاسۡوَدَّ جَانِبُهٗ وَطَالَ عَلَیَّ الۡاَخَلِيۡلَ اُلَاعِبُهٗ
فَوَاللّٰهِ لَوۡلَا خَشۡيَةُ اللّٰهِ وَحۡدَهٗ لَحُرِّكَ مِنۡ هٰذَا السَّرِيۡرِ جَوَانِبُهٗ

حضرت عمر اس وقت تو واپس چلے آئے اور صبح کو اس گھر اور اس کے رہنے والوں کے بارے میں تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا شوہر ایک سال سے جہاد میں ہے، آپ نے عورتوں کے ذریعہ معلومات حاصل کیں کہ عورت زیادہ سے زیادہ کتنے عرصہ تک بغیر شوہر کے گذار سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ٦ ماہ ہے، آپ نے تمام عساکر اسلامیہ میں یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی مجاہد مسلسل ٦ ماہ سے زیادہ ڈیوٹی پر نہ رہے، اس کو رخصت لے کر اپنے اہل وعیال میں آنا ضروری ہے،

میں نے بطور مثال ان دو روایتوں کو آپ کے سامنے پیش کیا جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کتاب الجہاد کے بیشتر ابواب میں اسی طرح کے حالات ومسائل پیش آئے ہیں جن کے لئے اصول وضوابط بنانے کی ضرورت تھی، حضرت عمر نے اپنے دس سالہ عہد خلافت میں جو کارنامے انجام دیئے اور جن مسائل کو حل کیا جو قانون وضوابط بنائے ان روایتوں میں ان کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

کتاب الجہاد کے آخر میں **باب جامع الشهادة** ہے اس میں متفرق اور مختلف حوادث وواقعات جو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان کا ذکر آیا ہے اور ان واقعات وحوادث سے متعلق روایتیں ہیں، جیسے خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کا محاصرہ، صحابہ کے خیالات وجذبات تعاون کی پیشکش وغیرہ، باغیوں نے گھر میں گھس کر شہید کر دیا اس واقعہ کی تفصیلات پر مشتمل متعدد روایتیں ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں واقع حروب الروۃ کی روایتیں، غزوہ احزاب، غزوہ احد وغیرہ سے متعلق روایتیں اس باب میں ہیں، غرضیکہ اس عنوان کے تحت ایسی روایتیں جمع کی گئی ہیں جو مولف کے نزدیک کسی خاص عنوان کے تحت نہیں آسکتی تھیں، دوسری جلد کی سب سے آخری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کا واقعہ ہے اور مدینہ میں داخلہ کی تفصیلات ہیں اور اسی روایت پر کتاب تمام ہو جاتی ہے۔

# مصنف عبدالرزاق کی کتابُ الجامع کا قضیہ
# دلائل وشواہد کی روشنی میں

محدث کبیر حافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ کی مشہور عالم کتاب ''**المصنف**'' جس میں اکیس ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں ۱۹۷۲ء میں پہلی بار محدث جلیل ابوالمآثر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوئی تو پوری علمی دنیا میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا، قدر ومنزلت کے ہاتھوں سے لی گئی، عقیدت وشوق کی نگاہوں سے پڑھی گئی، روایتوں کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ امت کی نگاہوں سے اوجھل تھا جب مولانا اعظمی کی سالہا سال اور شبانہ روز کی جاں سوزی اور جدوجہد کے بعد منظر عام پر آیا تو عالم اسلام ہی نہیں یورپ کے علمی حلقوں میں بھی حیرت واستعجاب کے ہاتھوں لیا گیا، ہر علمی مجلس میں اس کا تذکرہ، علم حدیث کی ہر مقدس محفل میں اس کا ذکر خیر چل پڑا اور مولانا مرحوم کی علمی شہرت کو جیسے شہپر جبریل مل گیا اور پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام انتہائی عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہوگئی۔

## اعتراض کا ایک پہلو

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی علمی تحقیق کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، گفتگو کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل سکتا ہے اور کچھ ذہنوں میں شک وارتیاب کی گنجائش نکل سکتی ہے، ''المصنف'' کی اشاعت کے بعد بھی ایک ایسا پہلو نکل آیا اور اس پر گفتگو چل پڑی، المصنف کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کا ایک مکتوب ایک رسالہ میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

''مصنف'' کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے اور اس کے

آ ڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو انتباہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے"

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب عرصہ دراز سے فرانس میں مقیم ہیں اور حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے کے فرد فرید ہیں اور مخلصانہ علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور آج عالم اسلام میں مخطوطات و آثار کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں اور ساری دنیا میں مخطوطات کی تلاش و جستجو میں سفر کرتے رہتے ہیں، مخطوطات کے بارے میں ان کی رائے دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور دلائل میں وزن ہوتا ہے اس لئے آسانی کے ساتھ رد نہیں کیا جاسکتا، مکتوبات نبوی کی دریافت اور ان کی تحقیق کے سلسلہ میں وہ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور یورپ کے محققین سے علمی و تحقیقی جنگ لڑتے رہتے ہیں اور فتح وظفر کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، فرانسیسی، انگریزی، عربی اور اردو میں اس موضوع پر ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں وہ ایک خاص موضوع ''کتابتِ مدینہ'' پر لکچر کے لئے بلائے جاتے ہیں۔

## مولانا اعظمی کا جواب

جب ڈاکٹر صاحب موصوف کا ''مصنف'' کے بارے میں یہ مکتوب شائع ہوا اور مولانا اعظمی کی نگاہوں سے گذرا تو مولانا نے اس کے جواب میں ایک مختصر مضمون لکھا جس میں ڈاکٹر حمید اللہ کے موقف کی تردید فرمائی جب کہ ان کی مکتوب میں اپنے شک وشبہ کے دلائل وشواہد پیش نہیں کئے گئے تھے، صرف ایک دعویٰ تھا دعوی کی بنیاد کیا تھی اس کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا تھا اس لئے مولانا موصوف کا جواب اس اظہار شک پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوسکا اور مولانا موصوف ڈاکٹر صاحب کو مطمئن نہ کرسکے مولانا مرحوم نے اپنے مختصر مضمون میں کتاب الجامع جو مصنف عبدالرزاق کی دسویں جلد کے صفحہ ۳۱۲ حدیث نمبر ۱۹۴۱۹ سے شروع ہوکر صفحہ ۴۶۸ پر ختم ہوتی ہے پھر گیارہویں جلد میں حدیث نمبر ۱۹۷۳۱ سے شروع ہوکر صفحہ ۴۷۱

حدیث نمبر ۲۱۰۳۳ پر تمام ہوتی ہے اور مصنف عبدالرزاق کی تقریباً ڈیڑھ جلدوں میں ایک ہزار چھ سو چودہ حدیثوں کا مجموعہ ہے اس کو ڈاکٹر صاحب نے معمر کی کتاب الجامع قرار دیا تھا، مولانا اعظمی نے اس حصہ کو مصنف ہی کا ایک حصہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ مولانا موصوف نے اپنے مضمون میں اپنے موقف پر درج ذیل دلائل وشواہد پیش کئے تھے۔

۱- مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو مصنف عبدالرزاق کا ہی ایک حصہ قرار دینے پر پہلی دلیل کے طور پر شیخ محمد سعید سنبل کی کتاب الاوائل کا حوالہ دیا ہے اور ان کی یہ عبارت نقل کی **وبالسند المتقدم الی الامام الحجة عبدالرزاق الصنعانی اخبرنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللّٰہ عنه قال، کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الی انصاف اُذنیه، وھو اُخر مصنفه.**

یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں شامل کتاب الجامع کی آخری روایت ہے اور شیخ سعید سنبل نے اس کو مصنف کی آخری حدیث لکھا ہے یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب الجامع مصنف ہی ایک جزء ہے اسی لئے انھوں نے یہ عبارت لکھی **وھو اٰخر مصنفه.**

۲- دوسری دلیل میں آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب بستان المحدثین کے ایک اندراج کو پیش کیا ہے، شاہ صاحب کی عبارت یہ ہے۔

''طرفہ این است کہ مصنف خود را ختم کردہ است بشمائل، وشمائل را ختم بر ذکر موئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کردہ می گوید **حدثنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه، قال، کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الیٰ انصاف اذنیه.**

شاہ صاحب نے بھی کتاب الجامع کی اس آخری حدیث کو مصنف کی آخری حدیث قرار دیا ہے یعنی انہوں نے بھی کتاب الجامع کو مصنف ہی کا جزء تصور کیا۔

۳- مولانا نے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ مصنف کے آخری حصہ میں شامل کتاب الجامع اگر معمر بن راشد کی ہوتی تو اس میں وہ روایتیں نہ ہوتیں جنھیں عبدالرزاق

نے اپنے دوسرے شیوخ سے لیا ہے اس داخلی شہادت کے سلسلہ میں مولانا نے مصنف کی دسویں جلد کی سات روایتیں اور گیارہویں جلد کی ۲۸ روایتیں پیش کی ہیں، ان روایتوں کو عبدالرزاق نے معمر کے بجائے اپنے دوسرے شیوخ حدیث سے لیا ہے اگر یہ حصہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو ۳۵ روایتوں کے اس میں شامل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی نہیں ہے بلکہ مصنف ہی کا ایک جزء ہے اس لئے مصنف کے ساتھ کتاب الجامع کے شائع ہونے پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالرزاق کی کوئی کتاب الجامع ہے؟ تاکہ اس کو عبدالرزاق کی کتاب الجامع تسلیم کرلیا جائے؟ اس سلسلہ میں مولانا اعظمی نے کشف الظنون کا حوالہ دیا ہے اور تحریر فرمایا کہ اس میں عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ مصر کے نوادسید اور شیخ ناصر الدین البانی کے حوالے سے مولانا نے بتایا کہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے اور نوادسید کی یہ تصریح بھی نقل کی ہے کہ اس مخطوطے پر ۵۸۵ھ کا ایک سماع درج ہے اس کے علاوہ اور دوسرے سماعات کا بھی اندارج ہے۔

## کیا جواب اطمینان بخش ہیں

مولانا اعظمی کا مضمون انھیں دلائل وشواہد پر مشتمل تھا لیکن کیا یہ جوابات ایک محقق عالم کے لئے تسلی بخش ہیں اور وہ مطمئن ہوجائے گا؟ مجھے اس میں شک ہے کیونکہ مولانا اعظمی نے اپنے ثبوت میں جن دو بزرگوں کے نام لئے ہیں یعنی شیخ سعید بن سنبل اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہا اللہ ان دونوں کا مقام ومرتبہ عظمت واحترام اپنی جگہ مسلم ہے علم حدیث کی خدمات اوراس کی نشر واشاعت میں ان کی جدو جہد سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا شمار متاخرین میں ہے، مخطوطات ابھی عام نہیں تھے اور ہر عالم کی رسائی وہاں تک مشکل

بھی تھی اس لئے ایسے تحقیق طلب مسئلہ میں ان کی رائے میں وہ وزن نہیں ہوگا جو ایک محقق اور مخطوطات کے ذخیروں سے واقف شخص کے لئے اطمینان بخش ہو، دوسری بات یہ کہ ان دونوں حضرات نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیق نہیں فرمائی کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی ہے یا عبدالرزاق کی؟ بس اتنا ہوا کہ مصنف عبدالرزاق کے متداول نسخوں میں ضمیمہ کے طور پر کتاب الجامع لکھی ہوئی ملی اس لئے انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ بھی مصنف ہی کا ایک حصہ ہوگا، اس لئے انھوں نے حوالے میں مصنف عبدالرزاق کا نام لے لیا، اور کتاب الجامع کو ذیلی عنوان کے طور پر تسلیم کرلیا کسی نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ عبدالرزاق کی ایک کتاب الجامع ہے جو مصنف کے آخر میں لکھی ہوئی ہے۔ اور معمر بن راشد کی یہ کتاب الجامع نہیں ہے، اس لئے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش اب بھی باقی رہ جاتی ہے اور یہ کوئی قطعی ثبوت نہیں بن رہا ہے کہ مصنف کے آخر میں عبدالرزاق کے استاد معمر بن راشد کی کتاب الجامع نہیں ہے بلکہ خود عبدالرزاق کی اپنی کتاب الجامع ہے۔

تیسری داخلی شبہات میں ۳۵ روایتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر یہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو اس میں یہ روایتیں کیوں ہیں؟ جب کہ عبدالرزاق نے ان روایتوں کو دوسرے شیوخ حدیث سے لیا ہے، یہ داخلی شہادت شک وشبہات سے خالی نہیں ہے ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاد معمر کی کتاب الجامع کو اپنی کتاب مصنف کا ضمیمہ بنایا تو جس باب سے متعلق ان کو اپنے دوسرے شیوخ سے جو روایتیں ملیں ان کو اس موقعہ پر لکھ دیا ہوگا، تاکہ مسئلہ زیر بحث پر اور روشنی پڑ جائے یہی وجہ ہے کہ ان روایتوں کی تعداد بہت محدود ہے کیونکہ کتاب الجامع میں ایک ہزار چھ سو چودہ روایتیں ہیں اس کے مقابلے میں دوسرے شیوخ کی روایتیں صرف ۳۵ ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاذ کی کتاب میں بہت زیادہ اضافہ پسند نہیں کیا ہوگا اس لئے گنتی کی چند روایتوں پر اکتفا کیا، اس لئے مولانا اعظمی کے ان دلائل وشواہد کے باوجود بحث اب بھی تشنہ رہ گئی۔

## ڈاکٹر حمید اللہ کا جوابی مضمون

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بحث کو اٹھایا تھا کہ مصنف کے آخر میں جامع معمر شائع ہوگئی ہے جب کہ وہ ایک مستقل کتاب ہے اور دوسرے کی ہے اسے المصنف کے ساتھ نہیں شائع ہونا چاہئے تھا اور اگر شائع کرنا تھا تو وہاں یہ وضاحت ضروری تھی کہ بطور ضمیمہ معمر کی کتاب الجامع مصنف کے عام مخطوطوں میں ملتی ہے اس لئے ہم بھی مصنف کے آخر میں اس کو شائع کررہے ہیں، اسی اعتراض کے پیش نظر مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف قرار دینے کی سلسلے میں اپنے مضمون میں دلائل دیئے تھے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے، مولانا اعظمی کے اس مضمون کے بعد انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنے شک وشبہ یا دعویٰ کے وجوہ واسباب پر روشنی ڈالی اور پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اپنے نقطۂ نگاہ کا پھر اعادہ کیا کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد ہی کی ہے مصنف عبدالرزاق کا جزء اور حصہ نہیں ہے انھوں نے کئی ٹھوس اور مضبوط دلیلیں دی ہیں، وہ مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

۱- جامع معمر بن راشد کے ترکی میں دو مخطوطے ہیں جس پر نام بھی صرف جامع معمر بن راشد ہے اور جن میں مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے ہیں، جلد میں اور کوئی چیز نہیں ان میں ایک جو بہت ہی قدیم ہے ۲۶۴ھ کا لکھا ہوا ہے وہ انقرہ میں ہے، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں ہے ان کا ایڈیشن ایک ترکی رفیق نے اشاعت کے لئے تیار کیا ہے، انھیں مصنف عبدالرزاق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں نے جامع معمر کے ان دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ ہو بہو ایک ہی چیز ہیں، فرق ہے تو وہی جو عام طور پر ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے، مکرر عرض کرتا ہوں کہ ان دونوں مخطوطوں پر جامع معمر درج ہے جامع عبدالرزاق نہیں۔

☆☆☆

۲-مولانا اعظمی نے دو محدثین کی وضاحت کا ذکر فرمایا تھا اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تحریر کیا کہ مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں کتاب الجامع کتاب کے آخر میں موجود ہے اگر ایسا ہی ایک نسخہ سعید سنبل یا حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کی نظر سے گذرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ہی ہوسکتا ہے اگر کسی نے ان کو توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی، موجودہ صورت حال سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

۳-مولانا اعظمی نے جو داخلی شہادت پیش کی تھی وہ بھی ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے نزدیک کوئی خاص وزن نہیں رکھتی ان کا کہنا ہے کہ اگر جامع معمر میں جو مصنف کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے لی ہیں تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (یعنی ۹ ½ جلدوں تک) ان میں کثرت سے حدیثیں عبدالرزاق عن معمر کی سند سے ملتی ہیں اس سے وہ جامع معمر کا جزء نہیں بن جاتیں۔ سیرت ابن ہشام میں دیکھئے ابن ہشام نے کچھ چیزیں حذف کردی ہیں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھائی بھی ہیں سیرت ابن اسحاق مطبوعہ مراکش سے اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے، ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کردی جائے، ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کی طرف مخطوطے میں منسوب ہوگئی ہے، ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

۴-مولانا اعظمی نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا تھا اور دلیل میں کشف الظنون کا حوالہ دیا تھا اور ثبوت میں مصر کے نوادسید کے اس مخطوطے کو دیکھنے کو بیان کیا تھا، اس دلیل نے بھی ڈاکٹر صاحب کو متاثر نہیں کیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

"دمشق کے مخطوطے کو مصر کے نوادسید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ وہ انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے ناواقف تھے، ترکی کے فواد سزگین اشاعت کے لئے جامع معمر کو پار کرنے کے بعد دمشق گئے اور وہاں کے مخطوطے کو دیکھا پھر رباط جا کر وہاں کے بھی مخطوطے کو دیکھا، وہ اپنی جرمن کتاب ''تاریخ تالیفاتِ عربی'' میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر جلد۴ صفحہ ۱۳۱۱ اور صفحہ ۳۰۶ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

۵- ڈاکٹر صاحب نے مزید ثبوت اور شہادت کے طور پر آخری بات یہ لکھی ہے کہ میری دانست میں پرکھنے کا بہتر معیار یہ ہے کہ داخلی شہادت پر جائیں، معمر بہت قدیم مؤلف ہیں ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیثوں کے مجموعوں میں کوئی تبویب مطلق نہیں ہوتی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں لیکن جو زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھے، ان کے شاگرد عبدالرزاق تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ، عیدین، زکوٰۃ، صیام، عقیقہ وغیرہ کی حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے چلے جاتے ہیں یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں۔ کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل الگ ہے اور بتویب نسبۃً ابتدائی حالت میں ہے، مصنف میں کتاب الاشربۃ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر یعنی جامع معمر میں نہ ہوتیں اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال مصنف میں حضرت عمر کی وصیت کا ہے جو مصنف میں ہے اور جامع معمر میں بھی ہے، اور یہ بعض دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے، ایسی اور چیزیں ملتی ہیں جو اندرونی شہادت ہیں۔

## کیا یہ شواہد قول فیصل ہیں؟

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا اعظمی کی ہر دلیل کو بڑے

ٹھوس اور وزن دار دلائل کے ساتھ رد کر دیا اور انھون نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں جامع معمر کے مخطوطے موجود ہیں اور وہ ہو بہو وہی ہیں جن مصنف میں بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے، اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی اور اس کو مصنف کا ہی ایک حصہ مان کر اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب نے جامع معمر کا قدیم ترین نسخہ دریافت کر کے ایک بہت ہی بڑا اہم ثبوت فراہم کر دیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جامع معمر کا یہ مخطوط ۳۶۴ھ میں لکھا گیا ہے یعنی حضرت معمر کی وفات کے دوسو گیارہ سال بعد اس لئے قدرتی طور پر یہ خیال آتا ہے کہ اس مخطوطہ کی سند کیا ہے؟ کیا یہ معمر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے؟ اگر نہیں، تو معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور شک وشبہ کا دروازہ کھل جاتا ہے کیونکہ یہ مخطوطہ المصنف کے مرتب عبدالرزاق متوفی ۲۱۱ھ کے ۱۵۳ سال بعد لکھا گیا کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ذہین عالم نے مصنف ہی سے اس کتاب الجامع کو نقل کر لیا ہو اور چونکہ تمام روایتیں حضرت معمر سے ہیں اس لئے اس کو جامع معمر لکھ دیا ہو، ایسی مثالیں موجود ہیں، جیسے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں سہل انگار پی ایچ ڈی کرنے والے ہوتے ہیں عرب ممالک میں بھی ایسے سہل انگار دکتورا کرنے والے بھی ہو رہے ہیں انھوں نے مصنف کی کتاب المغازی نقل کر کے اس کا نام مغازی زہری رکھ دیا اور ڈگری حاصل کر لی، اس لئے ایسی دلیل کی ضرورت ہے جس سے ثابت ہو جائے کہ یہ جامع معمر مصنف سے براہِ راست نقل نہیں کی گئی، اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب یہ بھی تصریح کر دیتے کہ دوسرے شیوخ حدیث سے جو ۳۵ روایتیں مصنف کی کتاب الجامع میں ہیں وہ اس مخطوطے میں نہیں ہیں اس لئے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ یہ مخطوطہ مصنف سے نہیں نقل کیا گیا ہے، پھر بھی یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ نقل کرنے میں کاتب نے بالقصد ان روایتوں کو چھوڑ دیا اور صرف حضرت معمر ہی کی روایتیں لی ہوں میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ امام عبدالرزاق کی وفات کے تقریباً ۱۶۰ سال گذر جانے پر مصنف کے بہت سے مخطوطے تیار ہو گئے اور

پوری دنیا میں پھیل گئے اور ڈیڑھ صدی بعد یہ مخطوطہ لکھا گیا تو ذہن میں اس خیال کا آنا فطری ہے کہ متداول نسخوں سے کسی نے یہ جامع معمر تیار کردی ہے اگر اس مخطوطے پر سند ہوتی، سماعات کا اندارج ہوتا اور یہ بتادیا جاتا کہ معمر کے کس شاگرد کی روایت پر یہ مشتمل ہے اور اس روای سے کاتب تک جتنے واسطے پڑتے ہیں اس کا ترتیب وار اندارج ہوتا تو شک وارتیاب کے دروازے بند ہوجاتے۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا اعظمی کی دوسری دلیل کو کوئی اہمیت نہیں دی جس میں کہا گیا ہے تھا کہ شیخ سنبل اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے کتاب الجامع کو مصنف کا جزء مانا ہے، ڈاکٹر صاحب کی دلیل میں وزن ہے کیونکہ ایسے اہم اور تحقیق طلب مسئلہ میں جب تک تحقیق وتفتیش کا حق ادا نہ کرلیا جائے علمی دنیا میں وہ دعویٰ قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اگر ان محدثین کے سامنے یہ مسئلہ اسی اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا اور وہ دلائل وشواہد کی روشنی میں فیصلے کرتے تو یقیناً علمی دنیا میں اس رائے کو قدر ومنزلت حاصل ہوتی موجودہ صورت میں کسی محقق کے لئے ان علماء کا صرف نام لے لینا کافی نہیں ہے۔

مولانا اعظمی کی تیسری دلیل میں بھی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی وزن نہیں انھوں نے متعدد مثالیں دیکر اپنے موقف کو صحیح ثابت کردیا ہے۔ اور اپنے دعوے کو مضبوط بنادیا ہے۔

چوتھی دلیل کے طور پر مولانا اعظمی نے مصر کے نوادسید کے بارے میں لکھا تھا کہ انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے مخطوطے کو دیکھا ہے اور مخطوطے کا سال کتابت بھی بتادیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس داستان کے اگلے حصہ کو بیان کرکے حیرت زدہ کردیا اس آخری حصہ کا مولانا اعظمی کو علم نہیں تھا ڈاکٹر صاحب نے انھیں مصر کے سید فواد اور ترکی کے فواد اور سزگین کی تصریحات کو پیش کرکے اس مشاہداتی شہادت کی قدر ومنزلت کو ختم کردیا، جواب اور جواب الجواب کی بعد بھی مسئلہ اپنی جگہ پر رہا اور کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا۔

☆☆☆

# قول فیصل

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کئے تو مولانا اعظمی نے ضرورت محسوس کی کہ اپنی تحقیق کو تفصیلی طور پر اہل علم کے سامنے پیش کردیں اس لئے ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں مدلل واصولی بحث کے بعد آپ نے متنازع فیہ مسئلہ پر تحقیق وتفتیش کی روشنی میں کچھ دوسرے دلائل اور کچھ نئی شہادتیں تحریر فرمائیں۔آپ نے ایسے مخطوطات کا پتہ چلایا جو جامع عبدالرزاق کے نام سے پائے جاتے ہیں اوران پر سماع کی تصریح راوی کے نام کی وضاحت بھی ہے مولانا اعظمی نے جس مخطوطے کو دریافت فرمایا ہے اس کے مستند اور قابل اعتماد ہونے کی شہادتیں بھی پیش کی ہیں آپ نے تحریر فرمایا کہ عبدالرزاق سے اس کی روایت کرنے والے الحافظ الحجۃ محمد بن منصور الرمادی ہیں اور یہ نسخہ اہل علم میں معروف ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کا سماع کیا اوراس کو مخطوطہ پر تحریر بھی کردیا ہے اس کے دو حصے مولانا کی نگاہ سے گذرے ہیں اس کے جزء اول کے کاتب االامام الحافظ المفید ابوالفتح نصر بن ابی الفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ ہیں اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

”الجزء الاول من كتاب الجامع عن عبدالرزاق بن همام ابی بكر الصنعانی“ اور یہ بھی اس مخطوطہ پر تحریر ہے کہ یہ مخطوطہ ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور ابوعلی اسماعیل بن محمد بن صالح الصفار کی عبدالرزاق سے روایت کے مطابق ہے۔پھر عبدالرزاق کے ان شاگردوں سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ان کے نام بھی اس پر درج ہیں اور کاتب نسخہ تک کی سند محفوظ ہے، اس کتاب الجامع کا دوسرا جزء مشہور محدث ابوالمحاسن القرشی کے قلم سے ہے اس کی بھی سند پیش کی ہے، یہ ایک بڑی شہادت ہے۔مولانا اعظمی نے اپنے اس مضمون میں پانچ ناقابل تردید دلائل وشواہد پیش کئے ہیں وہ بالترتیب درج ذیل ہیں۔

۱- جامع عبدالرزاق کا نسخہ جو ابوالفتح نصر بن ابی الفرج الحصری متوفی ۶۱۹ء کا مخطوطہ ہے اور پورا ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے ان کے ثقہ وضابط ہونے پر ائمہ رجال کا

تقریباً اتفاق ہے ان کا سماع ابن النقطہ ، ابن النجار ابن الدیثی اور ذہبی سے ثابت ہے اور خود اپنے قلم سے اپنے سماع کے اندراجات بھی کردیئے ہیں یہ ساری تفصیل اس مخطوطہ کے سرورق پر موجود ہے اور یہ بھی وضاحت ہے کہ اس کتاب الجامع کا ان کو خزیفہ سے سماع حاصل ہے۔

۲- انھوں نے اس مخطوطہ پر لکھا ہے کہ جامع عبدالرزاق کو جزءاول کو میں نے مشہور امام وحافظ حدیث ابوالمحاسن القرشی کے مخطوطے سے نقل کیا ہے اور ابوالمحاسن کے بارے میں ابن الدیثی ابن الحصری اور ذہبی کی صراحت ہے کہ وہ ثقہ ہیں، حافظ حدیث ہیں، روایتوں کا سماع اور کتابت ان کا ہر شک وشبہہ سے بالا ہے ائمہ رجال نے یہ بھی غیر مبہم لفظوں میں لکھا ہے کہ وہ صحیح النقل ہیں۔ علامہ ذہبی نے **"الصالح الحافظ محدث بغداد"** کے شاندار لفظوں سے ابوالمحاسن کا تذکرہ کیا ہے، ابوالمحاسن کے مخطوطے پر یہ عبارت ہے۔

"جامع عبدالرزاق کا یہ وہ جزء ہے جس کا سماع پوری ایک جماعت کو حاصل ہے" مولانا اعظمی نے ان مشہور محدثین کے نام شمار کرائے ہیں جن کو اس مخطوطے کا سماع حاصل ہے اور مخطوطہ کے سرورق پر ان کے نام بھی ثبت ہیں ان محدثین میں عبدالوہاب ابن الصابونی متوفی ۵۵۶ھ، عبدالواحد بن حسین بن عبدالواحد البارزی متوفی ۵۶۲ھ، سماع کرنے والی جماعت میں شامل ہیں۔

۳- جامع عبدالرزاق کے اس جزء کی قرأت مشہور محدث ثابت الکیلی نے شیخ حسین بن طلحہ کے سامنے کیا اور ان سے رجب ۴۹۲ھ میں روایت کی اجازت حاصل کی اور اس کو نصر بن ابی الفرج الحصری نے اپنے قلم سے لکھا ہے، مزید توثیق کے لئے نصر الحصری نے مشہور محدث ابن الاخضر کے مخطوطے سے بھی نقل کیا ہے اور ابن الاخضر کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے **ثقةً، ثابتاً، ماموناً فی السماع، واسع الروایة،** کے الفاظ کہے ہیں، اور یہ ابن الدیثی، ابن النجار، ضیاء المقدسی اور برزالی جیسے ائمہ فن کے شیخ اور استاذ ہیں، اس توضیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشہور

محدثین میں امام نصر بن ابی الفرج، حافظ ابوالمحاسن القرشی، حافظ ثابت الکیلی، امام ابن الاخضر اور مسندۃ العراق فخر النساء شہدۃ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے علی بن طلحہ سے عبدالرزاق کی کاب الجامع کا سماع کیا ہے اور ہر ایک کو پورا یقین ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے اور جامع معمر نہیں ہے۔

۴- اسی طرح ایک اور محدث حافظ الحدیث عمر بن الحاجب متوفی ۶۳۰ھ کو بھی یقین کامل تھا کہ یہ مخطوطہ جس کو نصر بن ابوالفرج نے نقل کیا ہے عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے، جامع معمر بن راشد نہیں، اسی یقین کے ساتھ اس مخطوطہ کو حاصل کیا اور اس کو وقف کیا اور خود اپنے قلم سے اس پر یہ تحریر کیا۔

''میں نے اس کا مقابلہ ابن الانماطی کے مخطوطے سے کیا ہے یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے جو ''باب حب المال'' پر ختم ہوتا ہے اس کا سماع شیخۃ صالحہ شہدۃ بنت ابی الفرج الابری سے مجھے حاصل ہوا۔ شہدۃ نے ابوعبداللہ الحسین بن طلحہ سے سنا انھوں نے اس کا سماع ابوالحسین بن بشران سے کیا، انھوں نے ابواسماعیل الصفار سے انھوں نے ابوبکر الرمادی سے اور رمادی نے امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی سے سماع کیا''

مولانا اعظمی نے مخطوطہ کی پوری سند نقل کر کے مخطوطہ کی قدر و قیمت ہی کو واضح نہیں کر دیا بلکہ آپ نے کسی کے لئے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

۵- محدثہ شہدۃ بنت ابوالفرج کے سامنے ابوعبداللہ محمد بن الحسن بن ابی المضاء نے قرأت کی سماع کرنے والوں میں ابوالفتح نصر بن ابی الفرج ابن الحصری۔ ابوالفضائل عبداللہ بن سلامۃ بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزادے ابوالحسن علی اور دوسرے لوگ ہیں یہ قرأت وسماع ۵۷۱ھ میں ہوا اور مخطوطہ پر اس کا اندارج موجود ہے۔ عمر بن الحاجب کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے اس کے علاوہ ایک مخطوطہ محدث دمشق ابوالمواہب کا بھی دیکھا ہے جو یہی عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ہے۔

مولانا کی اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ الامام الحافظ ابوالمواہب متوفی

۵۸۶ھ محدث دمشق اور الحافظ البارع مفید الشام تقی الدین ابن الانماطی المتوفی ۶۱۹ھ محدث شام اور مسند الدیار المصریہ العلامہ علی بن ہبۃ اللہ المصری المتوفی ۶۴۹ھ اور ان کے والد ابو الفضائل ہبۃ اللہ یہ تمام جلیل القدر علماء و محدثین کو یقین کامل ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے جو مصنف کے آخر میں ہے جامع معمر نہیں۔

۶-مولانا اعظمی نے مزید شہادت یہ تحریر فرمائی ہے کہ امام نصر بن ابو الفرج کے مخطوطہ پر الامام الحافظ عبدالغنی المقدسی المتوفی ۶۰۰ھ محدث الاسلام کے ہاتھ کی تحریر ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے جو محدثۂ وقت حضرۃ شہدۃ کے سامنے پڑھا گیا، سیدہ شہدہ کو حسین بن طلحہ الفعال سے سماع حاصل ہے انھوں نے امام عبدالرزاق الصنعانی سے سماع کیا ہے اور اجازت حاصل کی ہے ان میں ابوالفتح اور ان کے صاحبزادے اور ابوالفضائل ہبۃ اللہ بن سلامہ بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزدے ابوالحسن علی اور ان کے ملازم فرج الحلبی شامل ہیں اور ان کو سماع حاصل ہے اور یہ سماع جمادی الاولیٰ ۵۷۱ھ میں ہوا، ذہبی نے عبدالمغنی مقدسی کو محدث الاسلام لکھا ہے اور وہ کتاب الجامع کو جامع عبدالرزاق سمجھتے اور لکھتے ہیں جامع معمر نہیں۔

۷-اسی جزء کو عبدالقادر الرمادی نے سیدہ شہدۃ کے سامنے پڑھا اور ان سے اجازت حاصل کی یہ ۵۶۶ھ کا واقعہ ہے ان کو بھی اس کے جامع عبدالرزاق ہونے میں کوئی اشتباہ اور شک نہیں ہے۔ مولانا نے مزید تفصیلات دی ہیں جن سے یقین واعتماد میں اضافہ ہوتا ہے آپ نے بتایا کہ نصر بن ابی الفرج کو جامع عبدالرزاق سے غایت شغف تھا اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے دوسروں کو پڑھنے کے لئے دیتے تھے اہل علم بڑے محدثین کے سامنے پڑھ کر ان سے اجازت لیتے تھے اور یہ اہل علم اس مخطوطہ پر اپنے سماعات کو درج بھی کردیتے تھے، یہ مخطوطہ ۵۵۸ھ میں حزیفہ بن سعد کے سامنے پڑھا گیا اور انہوں نے اجازت دی ۵۵۹ھ میں عبدالواحد البارزی کے سامنے پڑھا گیا پھر سیدہ شہدۃ کے سامنے ۵۷۱ھ میں پڑھا گیا یہ تمام سماعات اس مخطوطہ پر موجود

ہیں۔ ابن ابی الفرج اتنے فیاض تھے کہ اپنا نسخہ علماء حدیث کو عاریتاً دیتے اور ان کو اجازت دے دیتے کہ وہ اپنا سماع مخطوطہ پر لکھ سکتے ہیں، ایک زمانے تک یہ مخطوطہ ان کے پاس رہا اور لوگوں کو عاریتاً دیتے رہے یہاں تک کہ حافظ الحدیث عمرو بن الحاجب الامینی کو یہ نسخہ مل گیا انھوں نے اپنی لائبریری میں اس کو داخل کر کے ہمیشہ کے لئے وقف کر دیا لیکن اس مخطوطے کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ کچھ اور آگے جاتی ہے، حافظ الحدیث احمد بن محمود الجوہری المتوفی ۶۴۳ھ اس کو مصر لے جاتے ہیں اور اس کو مشہور عالم علی ہبۃ اللہ المعروف بہ ابن الجمیزی کے گھر لے گئے جوہری نے قرأت کی ۶۲۴ھ کا ان کا سماع اس مخطوطہ پر درج ہے۔

جوہری کے الفاظ ہیں:

"قرأت هذا الجزء الاول من جامع عبدالرزاق على الشيخ على بن هبة الله المعروف بابن الجميزى".

جوہری نے صرف جزء اول کو پڑھ کر اس کی اجازت لی تھی اب ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس کے بقیہ اجزاء کیسے حاصل ہوں اس کی تفتیش و جستجو میں لگ گئے آخر ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ بھی حاصل کر لیا، ان کو اپنے ہاتھوں سے نقل کیا اور جزء اول کے ساتھ جوڑ کر کتاب کو مکمل کر دیا، پھر یہ مکمل نسخہ لے کر آپ شام گئے اور مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھ کر ان سے اجازت لی اور اپنے قلم سے نصر ابن ابی الفرج کے نسخہ کے آخری ورق پر اپنے سماع و اجازت کو لکھ دیا ان کے الفاظ ہیں:

**قرأت جميع هذا الجزء الاول وما بعده من الاجزاء الاربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبدالرزاق بن همام الصنعانى على الحرة الاصلية ام الفضل كريمة ابنة عبدالوهاب** میں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے چاروں جزوں کو محدثۂ شام سیدہ ام الفضل کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھا (اس طرح انھوں نے ایک مستند محدثہ وقت سے سماع و اجازت حاصل کی)

اپنے سماع واجازت کی توضیح کے بعد علامہ جوہری نے محدثہ شام ام الفضل حضرۃ کریمہ بنت عبدالوہاب کی سند بھی تحریر کردی کہ ان کوکس محدث سے اجازت حاصل ہے اوران لوگوں کے بھی اسماء تحریر کردئے کہ ان کوکس محدث سے اجازت حاصل ہے اوران لوگوں کے بھی اسماء تحریر کردئے جنھوں نے سیدہ کریمہ سے ان چاروں اجزا کو پڑھ کرسند واجازت حاصل کی، یہ ۶۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

۸-مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مخطوطہ کا ذکر کیا ہے جو بہت صاف خوشخط لکھا ہوا ہے اس کے لکھنے والے حافظ ابن حجر عسقلانی کے ممتاز شاگرد اور جلیل القدر محدث تقی الدین قلقشندی ہیں آپ نے لکھا ہے کہ میں نے خود اس مخطوطہ کو دیکھا ہے اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے۔

”الجزء الاول من كتاب الجامع تاليف الامام عبدالرزاق بن همام الصنعانى“

اس مخطوطہ پر سند بھی لکھی ہوئی ہے، یہ مخطوطہ عبدالرزاق کے دوشاگرد ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور اسماعیل الصفار کی روایت کے مطابق ہے، قلقشندی نے اپنے استاذ حافظ ابن حجر عسقلانی سے پڑھ کر اس مخطوطہ کی اجازت حاصل کی، انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس مخطوطہ کو دوسرے لوگوں نے بھی پڑھ کر ان سے سند واجازت لی ہے ان لوگوں کے اسماء گرامی مخطوطہ پر ثبت کردیئے ہیں یہ سماع واجازت کا واقعہ ۸۴۳ھ کا ہے۔

۹-مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری شہادت یہ پیش کی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مصنف کے آخر میں شائع ہونے والی کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف مانا ہے۔انھوں نے اپنی مشہور عالم کتاب فتح الباری ج ا ص ۸۹ پر لکھا ہے کہ:

> ”بخاری نے باب انشاء الاسلام من الاسلام میں حضرت عمار کی ایک موقوف روایت نقل کی ہے۔معمر نے اپنی کتاب الجامع میں بھی موقوف ہی نقل کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت معمر سے اس روایت کو نقل کیا ہے“

حافظ ابن حجر عسقلانی نے عبدالرزاق کی روایت کے سلسلہ میں مصنف کا نام لیا ہے، اور یہ روایت مصنف کی کتاب الجامع کے آخر میں ہے یعنی ابن حجر نے اس کتاب الجامع کو بھی مصنف ہی کا ایک حصہ مانا ہے ورنہ صرف معمر کی کتاب الجامع کا حوالہ کافی تھا، عبدالرزاق کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

## داستان تمام ہوگئی

میں نے اب تک آپ کو وہ روداد سنائی ہے جو مصنف عبدالرزاق میں کتاب الجامع کے شامل ہونے سے متعلق تھی، اس مسئلہ کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اٹھایا تھا، ڈاکٹر صاحب کی علمی عظمت مسلم ہے انکی تحقیق و تفتیش کی قدر و قیمت سے پورا عالم اسلام ہی واقف نہیں ہے بلکہ یورپ کی دانشگاہوں میں بھی ان کا نام ادب واحترام سے لیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب انتہائی مخلص، بےلوث، بےغرض، متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ ان کا مقصد نہ اعتراض کرنا تھا اور نہ اپنی ہمہ دانی کا اظہار مقصود تھا، انھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کی روشنی میں یہ سمجھا کہ یہ مصنف کے آخر میں جو کتاب الجامع شائع ہوگئی وہ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے مصنف عبدالرزاق کا حصہ نہیں ہے ان کا یہ خیال یقین میں اس وقت بدل گیا جب انقرہ اور استانبول میں انھوں نے جامع معمر کے نام سے دو مخطوطے دیکھے، اور مصنف کی کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو دونوں میں بہت کم فرق نظر آیا اس لئے ان کو یقین ہوگیا کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی، انھوں نے زیادہ تحقیق نہیں فرمائی اگر انھوں نے مزید تحقیق و جستجو سے کام لیا ہوتا تو مصنف میں اس کو شامل نہ کرتے اور مصنف گیارہ جلدوں کے بجائے ۹ ½ جلدوں میں تمام ہو جاتی۔

مولانا اعظمی نور اللہ مرقدہ اگر چہ اپنے خام سفالہ پوش مکان کے نیم تاریک خلوت کدہ میں رہتے تھے اور ان کو وہ وسائل میسر نہ تھے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو حاصل ہیں مگر وہ ایسا دل و دماغ رکھتے تھے جس کو ''جام جہاں نما'' کہا جا سکتا ہے، تحقیق و تفتیش کی کوتاہی کا یہ الزام کچھ ہلکا نہیں تھا، اس سے یہ تأثر پیدا ہوسکتا ہے کہ کام سرسری

کیا گیا ہے اور تحقیق کا حق پورا پورا ادانہیں کیا گیا ہے، اس لئے آپ نے پہلے تو ایک ہلکا پھلکا مضمون اس شک وشبہہ کے جواب میں قلمبند کر دیا، لیکن جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے اعتراض اور شک وارتیاب کی وجوہ واسباب کو تفصیل سے بیان کیا اوراس کو رسالے میں شائع کردایا تب مولانا مرحوم نے ایک مفصل مضمون عربی زبان میں تحریر فرمایا اوراس میں دلائل وبراہین کا انبار لگا دیا جس کی روداد میں نے آپ کو سنائی۔

ڈاکٹر صاحب کا اعتراض صرف دو مخطوطوں کی بنیاد پر تھا جوان کو اتفاقاً مل گئے تھے انھیں کا ذکر انھوں نے بڑی شدومد سے فرمایا تھا لیکن مخطوطہ چوتھی صدی کا تھا اس لئے اس کی سند کی ضرورت تھی، کاتب کون ہے؟ کس مخطوطے سے نقل کیا گیا؟ معمر بن راشد کے کس شاگرد نے اس مخطوطہ کی روایت کی، کن لوگوں کو مخطوطے کا سماع حاصل ہے اور کس ترتیب سے یہ روایتیں موجودہ مخطوطے کے کاتب تک پہنچیں؟ اور کاتب مخطوطہ سے لے کر معمر بن راشد تک کی سند کیا ہے؟ ان تمام اہم اور ضروری پہلوؤں کو ڈاکٹر صاحب نے نظر انداز کر دیا جب کہ ان مخطوطوں کو بطور دلیل پیش کرنے کے لئے یہ توضیحات ضروری تھیں، ان کے بغیر مخطوطے کی کوئی قدر و قیمت نہیں بنتی ہے، اس کے برخلاف مولانا مرحوم نے اپنے ثبوت میں جتنے مخطوطات کو پیش کیا ہے ہر ایک کی سند عبدالرزاق تک پہنچائی ہے اوران مستند محدثین کا نام بنام ذکر کیا جن کو مخطوطے کا سماع حاصل تھا، جن لوگوں نے شیخ کے سامنے مخطوطے کی قرأت کی، وہ تلامذہ جو اس قرأت کے وقت موجود تھے جن کو شیخ نے اجازت دی اس کو مفصل بیان کر کے دریافت کردہ مخطوطہ کی قدر و قیمت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، مولانا کی یہ دلیل قول فیصل اور اس بحث کے لئے حرف آخر بن گئی، اس تفصیلی بیان کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پھر دوسرا کوئی مضمون نہیں لکھا یا تو وہ مطمئن ہو گئے یا اس بحث کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھا اور خاموش ہو گئے۔

میرے نزدیک تو یہ بحث بے نتیجہ تھی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو مخطوطے دیکھے بقول ان کے ہو بہو وہی تھے جو مصنف کے آخر میں شائع شدہ کتاب الجامع میں ہے

دو جگہ لکھے جانے سے روایتوں کی صحت وصداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ان کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے تھا کہ یہ عبدالرزاق کی روایت ہے اس لئے مصنف میں ہونا ہی چاہئے تھا میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خود عبدالرزاق کا بیان ہے۔

قال عبدالرزاق کتبت عن معمر عشرة الاف حديث. میں نے حضرت معمر بن راشد کی دس ہزار روایتوں کو قلمبند کیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ا ص ۱۹۰)

کتاب الجامع میں کل ۱۶۱۴ روایتیں ہیں جب کہ پوری مصنف میں ۲۱۰۳۳ روایتیں ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عبدالرزاق نے معمر کی ساری روایتوں کو مصنف میں لیا ہوگا تو کتاب الجامع کے علاوہ بقیہ جلدوں میں معمر کی ۸۳۸۶ روایتیں ہوں گی اور جس روایت کو جس باب سے متعلق سمجھا وہاں ان کو درج کر دیا اور ڈیڑھ ہزار یہ متفرق روایتیں مصنف کے آخر میں آ گئیں تو اس پر اعتراض کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ ساڑھے آٹھ ہزار روایتوں پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟

ہوسکتا ہے کہ مصنف کی ترتیب کے وقت عبدالرزاق نے بھی متفرقات کے طور پر اپنی کتاب الجامع کو مرتب کر کے مصنف میں شامل کر دیا ہو۔ڈاکٹر صاحب مصنف کا کوئی ایسا مخطوطہ پیش نہیں کر سکے جو کتاب الجامع سے خالی ہو اس لئے معلوم ہوا کہ عبدالرزاق کے زمانہ سے ہی یہ کتاب الجامع مصنف کا جزء رہی ہے اور وہی ابو یعقوب اسحاق ابن ابراہیم الدیری اس کتاب الجامع کے بھی عبدالرزاق سے راوی ہیں جن کی روایت سے پوری مصنف مرتب ہوئی ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کو یہ اعتراض امام عبدالرزاق پر کرنا چاہئے مولانا اعظمی پر نہیں، مولانا کے دلائل وشواہد کی روشنی میں ان کے موقف کو ہر اہل علم ہر محقق صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی عظمت کا راز اسی طرح کے عظیم الشان علمی وتحقیقی کارناموں میں پوشیدہ ہے جن سے عام اہل علم کو واقفیت نہیں، اسی طرح کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام

عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہے، ہم تلامذہ کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کے فیوض وبرکات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے، مگر ان کی شفقتوں اور عنایتوں کے قربان جایئے کہ جاتے جاتے بھی ہمارا سر فخر سے اونچا کر گئے اور ہمیں یہ موقعہ دے گئے کہ ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں:

**اولئك ابائی فجئنی بمثلهم**
**إذا جمعتنا یا جریر المجامع**

# تاریخ طبری سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

اہل علم میں اب تک یہ بات مسلم رہی ہے کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری دونوں کے مصنف ایک ہیں مگر بعض حضرات نے بغیر تحقیق یہ کہہ دیا ہے کہ دونوں کے مصنف دو ہیں۔ اس مضمون میں اسی تاریخی غلطی کی تردید کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کی مشہور شخصیت علامہ ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری علمی دنیا میں زندۂ جاوید اور عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں ایک قرآن پاک کی ضخیم تفسیر جو ''جامع البیان عن تاویل القرآن'' کے نام سے مشہور ہے، دوسرا زندۂ جاوید کارنامہ اسلامی تاریخ کی قدیم ترین اور مبسوط کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' ہے جو ساری علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ابن جریر طبری کے فضل وکمال کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جس کے راوی مشہور مصنف ومؤرخ خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) ہیں، وہ طبری کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں:

**ان الطبری قال لاصحابه أتنشطون لتفسیر القرآن قالو اکم یکون قدره؟ قال ثلاثون الف ورقة، فقالوا هذا مما یفنی الاعمار قبل تمامه، فاختصره فی نحو ثلاثة آلاف ورقة، ثم قال أتنشطون لتاریخ العالم من اٰدم الیٰ وقتنا هذا؟ قالو کم یکون قدره؟ فذکر نحوا مما ذکره فی التفسیر فاجابوا مثل ذٰلك، فقال اناللّٰه ماتت الهمم فاختصره فی نحو مما اختصر التفسیر[۱] .**

طبری نے اپنے تلامذہ سے پوچھا، تفسیر سے دلچسپی رکھتے ہو؟ اس پر لوگوں نے دریافت کیا وہ کتنی ضخیم ہوگی؟ طبری نے کہا ۳۰ ہزار اوراق میں آئیگی لوگوں نے کہا کہ

[۱] تاریخ بغداد، خطیب بغدادی جلد۲ ص ۱۶۳

تفسیر پوری بھی نہیں ہوگی اور ہماری عمریں ختم ہو جائینگی یہ سن کر آپ نے اس کو صرف ۳ ہزار صفحات میں لکھا، پھر فرمایا کہ تاریخ اسلام سے دلچسپی ہے؟ جو آدم سے ہمارے دور تک کی ہو؟ لوگوں نے کہا، کتنے اوراق میں آئے گی اس پر انھوں نے وہی بات کہی جو تفسیر کے بارے میں کہی تھی، لوگوں نے بھی وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے، طبری نے کہا انا للہ، ہمتیں پست ہو گئیں، پھر تفسیر کی طرح تاریخ کو بھی مختصر کر دیا۔

علمی دنیا میں یہ دونوں کتابیں قبولیتِ عامہ کے ہاتھوں لی گئی اور شوق وعقیدت کی نگاہوں سے پڑھی گئیں، اکابر علماء امت نے شاندار لفظوں میں دونوں کو خراج تحسین پیش کیا، ان کی تفسیر کے متعلق ابو حامد الاسفرائنی کے یہ الفاظ مشہور ہیں۔

**لوسافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر ابن جریر لم یکن ذلك کثیرا[1].**

اگر چین جیسے دور دراز ملک کا سفر کوئی صرف ابن جریر کی تفسیر حاصل کرنے کے لئے کرے تو یہ سفر کوئی لمبا سفر نہیں ہے۔

مشہور محدث ابن خزیمہ نے تفسیر طبری کو دیکھ کر فرمایا:

**قد نظرت فیه من اوله الیٰ اخره ما اعلم علی ادیم الارض اعلم من محمد بن جریر الطبری[2].**

میں نے تفسیر از ابتدا تا انتہا دیکھی میرے علم میں اس وقت محمد ابن جریر طبری سے بڑا کوئی عالم روئے زمین پر نہیں ہے۔

تاریخ کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ تصنیف کے کچھ ہی برسوں بعد مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے، اس کتاب کو شاہی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی اور بعد کے مورخین میں تمام مشاہیر اصحاب تاریخ ابن مسکونہ، ابن اثیر، حافظ ابن کثیر وغیرہ نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا، ان کتابوں کے بار بار ایڈیشن شائع ہوئے، عصر حاضر میں ان کی تفسیر خوبصورت ٹائپ میں ۳۰ جلدوں میں شائع ہو کر ساری دنیا میں

---

[1] مقدمہ ناشر تاریخ الامم والملوک ص ۴۔ [2] مقدمہ ناشر تاریخ الامم والملوک ص ۴۔

پھیل گئی ہے، ان کی تاریخ کا قدیم ایڈیشن لینڈن سے شائع ہوا تھا، ماضی قریب میں مصر سے ۱۳ جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور عام طور سے لائبریریوں میں پائی جاتی ہے، ان کے علاوہ ان کی ۱۵ کتابوں کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

عصر حاضر میں تاریخ طبری اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اسلامی دنیا سے گزر کر یورپین مصنّفین اور مستشرقین کی تحقیق اور مطالعہ اور ان کے حوالجات نے اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، تدوین حدیث کی تاریخ کے سلسلہ میں مستشرقین کے اعتراضات کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب بنتی ہے اور وہ اسی کے حوالے دیتے ہیں۔

علمی دنیا میں ابن جریر طبری کی تفسیر و تاریخ کی طرف رجوع عام بحث و تمحیص، حوالے اور شہادتیں ان کے وزن اور قدر و منزلت کے اعتراف کی علامت ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب کتاب اور مصنف دونوں سے خوب واقفیت ہو۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علمی دنیا کو کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے میں بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ تفسیر اور تاریخ ایک مصنف کی نہیں، بلکہ دونوں کتابیں دو مصنفوں کی ہیں۔

یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہوئی؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کا سراغ ہمیں علامہ ذہبی کی کتاب سے ابن جریر طبری کے ترجمے میں سلیمانی[1] کی جرح سے ملتا ہے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

**محمد بن جرير بن يزيد الطبرى الامام الجليل المفسر ابو جعفر صاحب التصانيف الباهره مات سنة عشر وثلثمائه اقذع احمد بن على السليمانى الحافظ فقال كان يضع للروافض، هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المتعمدين فلعل**

---

[1] سلیمانی، ابوالفضل احمد بن علی بن عمرو السلیمانی الحافظ البیکندی المتوفی ۴۰۴ھ بیکند، کتاب الانساب للسمعانی ج ۷ ص ۱۹۸۔

السلیمانی رادا الأتی[1].

محمد ابن جریر بن یزید طبری جلیل القدر امام ومفسر ہیں کنیت ابوجعفر ہے عظیم الشان کتابوں کے مصنف ہیں، جن کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے۔ احمد بن علی سلیمانی نے ان کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ رافضیوں کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے، یہ ان پر غلط اور بے بنیاد الزام ہے ابن جریر تو قابل اعتماد ائمہ اسلام میں سے ہیں، ہوسکتا ہے سلیمانی نے یہ بات اس ابن جریر طبری کے متعلق کہی ہو جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اس کے بعد علامہ ذہبی نے محمد بن جریر بن رستم ابوجعفر الطبری کا ترجمہ لکھا ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے صاف طور پر لکھ دیا ہے۔

رافضی، له تواليف منها كتاب الرواة عن اهل البيت رماه بالرفض عبدالعزيز الكتانی[2].

رافضی ہے، اس کی کئی کتابیں ہیں، ایک کتاب الرواۃ عن اہل البیت ہے عبدالعزیز کتانی نے اس پر رافضی ہونے کا الزام لگایا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے دونوں طبری کے ترجموں میں علامہ ذہبی کی پوری عبارت نقل کردی ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ان پر رافضیت کا الزام غلطی سے لگایا گیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

انما ضرّة بالاشتراك فی اسمهٖ واسم ابيه ونسبتهٖ وكنيتهٖ ومعاصرته وكثرة تصانيفه[3].

ان کو نقصان اس رافضی کے، والد کے نام، نسب، کنیت میں اشتراک ہم عصری اور تصانیف کی کثرت کی وجہ سے پہنچا۔

ابن جریر رافضی کے ترجمے میں حافظ ابن حجر نے ابن جریر بن یزید طبری پر

---

۱ میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۴۹۸۔ ۲ حوالہ مذکور ص ۴۹۹۔
۳ لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰۔

رافضیت کے الزام کی وجہ یہ بتائی کہ یہ بات مشہور کردی گئی کہ وہ وضو میں پاؤں کے مسح کے قائل ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں، حافظ ابن حجر کے الفاظ ہیں۔

**لعل ماحکی عن محمد بن جریر الطبری ن الاکتفاء فی الوضوء یمسع الرجلین، انما ھو ھٰذا للرافضی فانه ھو من مذھبھم**[1]۔

شاید یہ بات ہوئی کہ لوگ کہنے لگے کہ وہ وضو میں پاؤں کو دھونے کے بجائے مسح کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات ابن جریر رافضی کی ہے کیونکہ رافضیوں کا یہی مذہب ہے۔

مشہور محدث ومفسر حافظ ابن کثیر نے مزید معلومات فراہم کی ہیں، انھوں نے اپنی تاریخ میں[2] ہمیں تفصیل سے بتایا ہے کہ رافضی طبری کی بعض کتابیں ان کے نام سے مشہور ہوگئیں جس کی وجہ سے ان کی ذات کو نشانہ بنایا گیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ علامہ طبری کے علم وفضل اور عظمت وشہرت کے سب سے بڑے دشمن ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری تھے، وہ علامہ طبری پر نکتہ چینیاں کرتے رہتے تھے اور ان پر رافضیت کا الزام عائد کرتے تھے اور بہت سی بے بنیاد باتیں ان کی جانب منسوب کر کے عوام میں ان کی مقبولیت کو داغدار بتاتے رہتے تھے انھیں کی وجہ سے بغداد کے حنابلہ طبری کے دشمن ہو گئے، اور ان کو عام قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

ان کی جانب غلط باتوں کے منسوب کئے جانے کے سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے جس میں ''غدیر خم'' کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ایک اور کتاب ہے جس میں حدیث منطق الطیر کے طرق جمع کئے گئے ہیں یہ دونوں طبری رافضی کی کتابیں ہیں جو ان کے زمانہ میں عوام ان کی جانب منسوب کر کے ان کو متہم کرنے لگے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ایک غلط بات اور ان کی جانب منسوب کی گئی کہ وہ وضو میں پاؤں کے دھونے کے بجائے مسح کے قائل ہیں جو شیعوں کا مذہب ہے، ان تمام تفصیلات کے بعد حافظ ابن کثیر خلاصۂ بحث کے طور پر تحریر فرماتے ہیں۔

**فمن العلماء من یزعم ان ابن جریر اثنان احدھا شیعی والیه**

[1] لسان المیزان جلد۵ص۱۰۰۔ [2] البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد ۱۱ص۱۴۵، ۱۴۶۔

**ینسب ذلك وینزهون ابا جعفر هذا عن هذه الصفات**[1]۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ ابن جریر دو ہیں ان میں ایک شیعہ ہے۔ اسی کی جانب یہ سب باتیں منسوب ہیں اور ان کی طرف سے صفائی دیتے ہیں اور ان صفات سے ان کو بری قرار دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ابن جریر طبری کو بدنام کرنے کے لئے رافضی طبری کی کتابیں ان کی جانب منسوب کر کے عوام کو ان کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا، خود ان کی کسی تصنیف کو رافضی طبری کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا گیا، کیونکہ اس سے مخالفین کا کوئی فائدہ نہیں تھا، یہ تو آج کل کی بات ہے کہ ان کی تاریخ کو رافضی طبری کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اسی سازش کے ذیل میں رافضی طبری کی تصانیف کا ذکر بھی آ گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی کتاب، ''کتاب الرواۃ عن اہل البیت'' کا ذکر کیا ہے[2] اور حافظ ابن کثیر نے اس کی کتاب ''احادیث غدیر خم'' اور حدیث منطق الطیر کے نام لئے ہیں[3]۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام کتابیں خاص اس کے مسلک سے متعلق تھیں، اس نے کوئی ''تاریخ الامم والملوک'' جیسی کتاب نہیں لکھی ہے، ورنہ متقدمین سے کوئی نہ کوئی اس کا ذکر ضرور کرتا، ہم دیکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری کے دور سے لے کر آج تک کسی مصنف نے نہیں لکھا کہ اس کی فن تاریخ میں بھی کوئی کتاب ہے، اس لئے تاریخ طبری کو رافضی طبری کی طرف منسوب کرنا ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اب یہ بات اپنی جگہ ناقابل انکار ہوگئی ہے کہ ابن جریر طبری دو ہیں ایک صحیح العقیدہ دوسرا غالی رافضی ہے، اتفاق سے دونوں صاحب تصانیف ہیں اور تاریخ طبری کا طرزِ تحریر ایسا ہے کہ سرسری مطالعہ کرنے والوں کو اس سے شیعیت کی بو آتی ہے، بس

---

۱؎ حوالہ مذکور ج ۱۱ ص ۱۴۷۔ ۲؎ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۹۹۔

۳؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۵۔

اسی بات نے ایک خلاف حقیقت اور بے بنیاد دعویٰ کرنے پر مجبور کردیا، ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس کتاب کا تحقیقی جائزہ لے کر مستند روایات سے موازنہ کر کے ردوقبول، اور جمع وتطبیق سے کام لیا جاتا اور طرزِ تحریر کی وضاحت کردی جاتی، سہل الحصول طریقہ یہ سمجھا گیا کہ کتاب ہی کو ابن جریر رافضی کی طرف منسوب کردیا جائے خس کم جہاں پاک۔

اس کے برعکس ابن جریر ابن یزید الطبری کی تمام کتابوں کی فہرست متعدد کتابوں میں پائی جاتی ہے قدیم وجدید کسی تذکرے میں ادنیٰ سا شبہہ کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ تاریخ الامم والملوک ابن جریر رافضی کی ہے اور تفسیر ابن جریر طبری سنّی کی ہے، اس سلسلہ میں اتنی شہادتیں ہیں کہ کسی کے لئے شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، چند شہادتیں پیش ہیں۔

۱- علوم وفنون کے تعارف کے مسئلہ میں سب سے قدیم تصنیف ابن ندیم کی ''الفہرست'' ہے، ابن ندیم ابن جریر طبری سے قریب العہد بھی ہیں کیونکہ طبری کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے اور ابن ندیم کا سال وفات ۳۷۵ھ ہے یعنی طبری سے صرف ۶۵ سال بعد کے ہیں اگر انھوں نے یہ تصنیف اپنے دورِ شباب میں لکھی ہے تو طبری کے انتقال کو زیادہ سے زیادہ ۳۰، ۴۰ سال کا زمانہ گذرا ہوگا، انھوں نے اپنی کتاب میں ایک مستقل عنوان ہی ''الطبری واصحابہ'' قائم کیا ہے، ان کے حالاتِ زندگی اور سال وفات کو ابوالفرج المعانی بن زکریا النہروانی کی روایت سے لیا ہے جو بغداد کے قاضی تھے جہاں طبری کی علمی وتصنیفی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا ہے، ان کے بچپن میں جب ان کی عمر ۷ سال کی تھی تو طبری کا اسی بغداد میں انتقال ہوا تھا، ان کو ابن جریر سے وہ عقیدت تھی کہ وہ اپنے کو ان کی طرف منسوب کر کے جریری لکھا کرتے تھے[1]، انھوں نے طبری کا سال وفات ۳۱۰ھ بتایا ہے جس پر سارے مورخین کا اتفاق ہے۔

اس کے بعد ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خود مجھ سے ابواسحاق ابن محمد ابن اسحاق

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے الاعلام للزرکلی ج ۷ ص ۲۶۰، البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۲۸۔

نے بتایا کہ مجھ سے ایک ثقہ آدمی نے بتایا جس نے مصر میں طبری سے ملاقات کی تھی اوران کی مجلسوں میں شریک ہوا تھا کہ میں طبری کے خط کو پہچانتا ہوں اور میں نے ان کے بہت سے مخطوطے اور طبری کے قلم سے لکھی ہوئی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں، ان کتابوں کو شمار کراتے ہوئے اس نے تفسیر و تاریخ کی متعلق کہا کہ:

**کتاب التایخ ویضاف الیه القطعان وآخر ما املٰی منه الٰی سنة ۳۰۲ وههنا قطع وقد اختصر هٰذا الکتاب وحذف اسانیده جماعة، منهم رجل یعرف بمحمد بن سلیمان الهاشمی کتاب التفسیر اختصره جماعت منهم[1].**

ان کی تاریخ کی کتاب کے دو حصے بتائے جاتے ہیں، انھوں نے اب تک ۳۰۲ھ تک کے حالات املا کرائے ہیں ہمارے یہاں اس کا ایک حصہ ہے بعض لوگوں نے اس کی تلخیص کی اور اس کی سندوں کو حذف کر دیا ہے، تلخیص کرنے والے محمد بن سلیمان ہاشمی ہیں۔ تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ اس سے بہتر اب تک لکھی نہیں گئی، کچھ لوگوں نے اس کی تلخیص کی ہے۔

ابن ندیم نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری پندرہ کتابوں کو بھی شمار کرایا ہے، تفسیر طبری اور تاریخ طبری جو ہمارے ہاتھوں میں ہے ان دونوں کا مصنف اسی صحیح العقیدہ ابن جریر طبری کو بتاتے ہیں جن کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے۔

۲- ابن ندیم کے بعد خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کا زمانہ آتا ہے انھوں نے اپنی مشہور عالم کتاب تاریخ بغداد میں طبری کا سات صفحات میں مفصل ذکر کیا ہے، ان کے علمی مقام و مرتبہ، فضل و کمال، ان کے اسفار و دیگر حالات، وفات، تجہیز و تکفین، جنازہ پڑھنے والوں کے اژدحام تک کو پوری تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کا انتقال اتوار کے دن ۲۸ر شوال ۳۱۰ھ کو نماز مغرب کے وقت ہوا، حنابلہ کے تشدد اور مخالفت کی وجہ سے ان کو عام قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکا بلکہ ان کے گھر

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۳۲۶، ۳۲۷۔

میں جو''رُحبہ یعقوب'' میں واقع تھا دفن کیا گیا، پھر خطیب نے بڑے ہی پر شکوہ الفاظ میں ان کے فضل وکمال اوران کی بے مثال تصانیف کوخراج تحسین پیش کیا ہے۔انھوں نے طبری کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ وتفسیر کے بارے میں تحریر فرمایا۔

......وله الکتاب المشهور فی "تاریخ االامم والملوك" وکتاب فی التفسیر ولم یصنف احد مثله[۱].

انھیں کی مشہور کتاب تاریخ الامم والملوک ہےاور تفسیر میں ایسی کتاب لکھی ہے کہ کسی نے اب تک ویسی کتاب نہیں لکھی ہے۔

ان جملوں سے جہاں دونوں کتابوں کے مصنف ایک ہونے کی شہادت ملتی ہے وہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کے زمانے تک طبری کی تاریخ کی شہرت بام عروج پر پہنچ چکی تھی، یہ شہرت خود بتاتی ہے کہ اس کے مصنف کے بارے میں کسی کو کوئی احتمال نہیں تھا۔

۳- انساب کے موضوع پر سب سے ضخیم اور مبسوط کتاب کے مصنف امام ابوسعید عبدالکریم بن محمد بن منصور تمیمی سمعانی (متوفی ۵۶۲ ھ)''طبری'' کے ذیل میں ان کی دونوں کتابوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری من ساکنی بغداد، استوطنها الیٰ حین وفاته وکان احد ائمة الاسلام یحکم بقوله ویرجع الیٰ رایه لمعرفته وفضله......له الکتاب المشهور فی تاریخ الامم والملوك وکتاب فی التفسیر لم یصنف احد مثله ...... توفی عشیته یوم السبت ودفن یوم الاحد بالغداة فی داره لاربع بقین من شوال سنة عشر وثلاث مائة[۲].

ابوجعفر بن محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری بغداد کے رہنے والے

---

۱؎ تاریخ بغداد خطیب بغدادی ج۲ص۱۶۲ تا ۱۶۸، ۵۸۹۔

۲؎ کتاب الانساب للسمعانی ج۹ص ۴۱، ۴۲۔

تھے انھوں نے اس کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا، اور تا دم آخر بغداد ہی میں رہے ائمہ اسلام کے ایک فرد فرزند تھے ان کا قول فیصل مانا جاتا تھا اور ان کی رائے کی طرف ان کی معرفت اور علم وفضل کی وجہ سے رجوع کیا جاتا تھا، تاریخ میں ان کی مشہور کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' ہے اور تفسیر میں ان کی ایک بے مثال کتاب ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی وفات ۲۶/ شوال المکرّم ۳۱۰ھ میں شنبہ کے دن ہوئی اور دوسرے دن یکشنبہ کی صبح کو اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کئے گئے۔

۴- فن جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کے امام علامہ ذہبی اپنی کتاب کے ۶/ صفحات میں ابن جریر طبری کے حالات لکھتے ہیں اور ان کے فضل وکمال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اس موقعہ پر وہ خطیب بغدادی کے بیان کو سند مان کر نقل فرماتے ہیں تفسیر وتاریخ کے سلسلہ میں طبری نے ابتداءً جس صفحات کا ذکر کیا تھا اور طلبہ کی کم ہمتی کی وجہ سے دونوں کتابوں کے مختصر کرنے کے واقعہ کو ذہبی نے بھی مفصل لکھا ہے، پھر طبری کے مشہور شاگرد فرغانی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

**قال الفرغانی ثم له التفسیر والتاریخ وکتاب القراءات وکتاب العدد والتنزیل وکتاب اختلاف العلماء وکتاب تاریخ الرجال وکتاب لطیف القول فی الفقه وکتاب التبصیر فی الاصول کتاب تهذیب الآثار[1] ......**

فرغانی کہتے ہیں کہ ان کی تفسیر اور تاریخ اور کتاب القراءات اور کتاب العدد والتنزیل، کتاب اختلاف العلماء، کتاب تاریخ الرجال فقہ میں لطیف القول اور اصول میں کتاب التبصیر یہ کتابیں مکمل ہوگئیں اور کتاب تہذیب الآثار نامکمل وغیرہ۔

علامہ ذہبی، ابن ندیم اور خطیب بغدادی نے طبری کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے اس کی تائید کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ان کی تفسیر اور تاریخ کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں۔

**فی الکتاب الکبیر المشهور فی تاریخ الامم وله کتاب التفسیر**

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۱۱۔

**الذی لم یصنف مثلہ[۱].**

ان کی عظیم کتاب تاریخ امم میں مشہور ہے اور ان کی تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ اس جیسی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔

۵۔ تاج الدین السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) نے اپنی کتاب میں ابن جریر طبری کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، ان کی پیدائش، تاریخ وفات تفسیر و تاریخ کی ضخامت کا واقعہ، تصانیف کی فہرست یہ سب کچھ انھوں نے خطیب بغدادی سے ہو بہو لے لیا ہے اور حقیقتِ مسلمہ کے طور پر ان تمام باتوں کو نقل کرتے چلے گئے ہیں، تصانیف طبری کا شمار کراتے ہوئے انھوں نے لکھا۔

**ومن تصانیفه کتاب التفسیر والتاریخ[۲]......**

ان کی تصانیف میں کتاب التفسیر اور کتاب التاریخ وغیرہ ہیں۔

۱- حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) نے اپنی تاریخ میں ابن جریر کا نسب نامہ سال پیدائش، حلیہ، وفات اور تصنیفات وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے دوسری بعض حقیقتوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے، وہ اپنی گفتگو کا آغاز یہاں سے کرتے ہیں۔

**محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الامام ابو جعفر الطبری کان مولده فی سنة اربع وعشرین ومأتین وکان اسمر اللون ملیح الوجه، مدید القامة، فصیح اللسان.**

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب امام ابوجعفر طبری، ان کی پیدائش ۲۲۴ھ میں ہوئی، وہ گندم گوں، ملیح چہرے والے دراز قامت اور فصیح اللسان تھے۔

**روی الکثیر عن الجم الغفیر رجل الی الآفاق فی طلب الحدیث وصنف التاریخ الحافل وله التفسیر الکامل الذی لا یوجد له نظیر وغیرهما من المصنفات[۳].**

---

۱۔ حوالہ سابق۔

۲۔ طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۳۵ تا ۱۴۰۔

۳۔ البدایه والنهایه لابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۴۵۔

انھوں نے ایک جم غفیر سے روایتیں کی ہیں اور طلب حدیث میں دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے، انھوں نے ایک جامع تاریخ اور ایک مکمل تفسیر لکھی ہے جس کی نظیر نہیں۔ان کے علاوہ بھی ان کی تصنیفات ہیں۔

پھر اس کے بعد طبری کی دوسری تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، آخر میں ان کا سال وفات تاریخ وقت اور خصوصیت تحریر فرماتے ہیں۔

**قد كانت وفاته وقت المغرب عشيه يوم الاحد ليومين بقيا من شوال من سنة عشرو ثلثمائة وقد جاوز الثمانين بخمس سنين او ست سنين وفي شعر راسه ولحيته سواد كثير ودفن في داره[1].**

ان کی وفات اتوار کے دن مغرب کے وقت ہوئی، اور تاریخ ۲۸ر شوال ۳۱۰ھ تھی، ان کی عمر پچاسی یا چھیاسی سال ہوگئی تھی ان کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی سے زیادہ سیاہی تھی، اپنے مکان ہی میں دفن کیے گئے۔

اتنی جزئی تفصیلات اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا ذکر کرنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابن کثیر کو ابن جریر طبری کی شخصیت متعین کرنے میں کوئی دھوکا نہیں ہوسکتا تھا، وہ صحیح العقیدہ طبری اور رافضی طبری دونوں کی الگ الگ شخصیتوں کو خوب پہچانتے ہیں اور پھر پوری تفصیل سے ان واقعات کو بیان کرتے ہیں، جو دونوں طبری میں نام اور کنیت میں اشتراک کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے، پھر پورے وثوق کے ساتھ صحیح العقیدہ کی کتابوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

**عالما بايام الناس واخبارهم وله الكتاب المشهور في تاريخ الامم والملوك، وكتاب في التفسير لم يصنف احد مثله وكتاب سماه تهذيب الآثار لم ارسواه في معناه الا انه لم يتمه[2]......**

ایام الناس اور تاریخ عالم کے خوب جاننے والے تھے، تاریخ میں ان کی مشہور کتاب تاریخ الامم والملوک ہے اور تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ کسی نے اس جیسی تفسیر

---

[1] حوالہ مذکور ص ۱۴۶۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۵.

نہیں لکھی، ایک کتاب تہذیب الآثار کے نام سے لکھنی شروع کی تھی، یہ کتاب اپنے موضوع پر بے مثل ہوتی مگر افسوس کہ وہ مکمل نہ کر سکے۔

۷- طاش کبریٰ زادہ (متوفی ۹۶۲ھ) کی کتاب علوم وفنون کی تاریخ وتعارف میں مشہور ومستند کتاب ہے، انھوں نے بھی اپنی کتاب میں ابن جریر طبری کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور پورے جزم ویقین کے ساتھ لکھتے ہیں:

**ومن التواریخ، تاریخ الطبری وھو ابوحعفر محمد بن جریر الطبری وقبل یزید بن کثیر بن غالب صاحب التفسیر الکبیر والتاریخ الشہیر[1]......**

فن تاریخ میں طبری کی تاریخ ہے، ان کا پورا نام محمد بن جریرالطبر ی ہے، اوپر کے نسب میں یزید بن کثیر بن غالب ہے، جن کی عظیم الشان تفسیر اور مشہور تاریخ کی کتاب ہے۔

طاش کبریٰ زادہ نے تاریخ طبری کے ذکر کے ساتھ پورا نام ونسب شاید اسی لئے لکھ دیا ہے کہ صرف محمد ابن جریر طبری لکھنے سے طبری رافضی کے نام میں اشتراک کی وجہ سے دھوکا ہوسکتا ہے، اس لئے دادا کا نام بھی لکھ دیا ہے کیونکہ رافضی طبری کے دادا کا نام رستم ہے، اوران کے دادا کا نام یزید، یہیں سے دونوں میں امتیاز ہوتا ہے، اس لئے شخصیت متعین کرنے کے لئے پورا نسب نامہ بیان کردیا، اور تاریخ وتفسیر دونوں کوانھیں کی جانب منسوب کیا۔

۸- ابن عماد حنبلی (متوفی ۱۰۸۹ھ) جوشذارت الذہب کے مصنف ہیں، یہ کتاب پہلے چھپی تھی مگر کمیاب ہوگئی تھی۔ ماضی قریب میں دارالمسیر ہ بیروت سے خوبصورت اور روشن ٹائپ میں چھپ گئی ہے، انھوں نے اس کتاب میں ۳۱۰ھ کے حالات میں لکھا ہے۔

**فیھا الحبرالبحر الامام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، صاحب التفسیر والتاریخ والمصنفات الکثیرة[2].**

---

[1] مفتاح السعادۃ: ج۱ ص۲۵۲، ۲۵۳ "عنوان التواریخ" کے ذیل میں سب سے پہلے تاریخ طبری کا ذکر کرتے ہیں۔
[2] شذرات الذہب ج۲ص۲۶۰۔

اسی سال عظیم المرتبت امام ابوجعفر محمد ابن جریر طبری نے جو تفسیر و تاریخ اور دوسری بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انتقال فرمایا۔

۹- حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) کی ''کشف الظنون عن اسامی الکتب الفنون'' مشہور و معروف ہے، کتابوں کے نام اور ان کے مصنّفین کے سلسلہ میں علمی حلقوں میں ایک قابل اعتماد اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور سے لائبریریوں میں پائی جاتی ہے، حاجی خلیفہ اپنی کتاب میں تواریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

**تاریخ الطبری هو الامام ابوجعفر محمد بن جریر المتوفی سنة عشر وثلثمائة وهو من التواریخ المشهورة الجامعة لاخبار العالم ابتداءً من اول الخلیفة وانتهیٰ الیٰ سنة تسع وثلثمائة، وسماه تاریخ الامم والملوك[۱].**

تاریخ طبری اس کے مصنف ابوجعفر محمد ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، وہ تاریخ کی مشہور کتابوں میں سے ہے اور اخبار عالم کی جامع ہے، حضرت آدم سے لیکر ۳۰۹ھ کے حالات پر مشتمل ہے، طبری نے اپنی تاریخ کا نام تاریخ الامم والملوک رکھا ہے۔

یعنی تاریخ طبری اسی ابن جریر طبری کی تصنیف ہے، جس کا سال وفات ۳۱۰ھ ہے، پھر تفسیر کے باب میں وہ رقمطراز ہیں:

**''تفسیر ابن جریر'' هو ابوجعفر محمد الطبری المتوفی سنة عشر وثلثمائة وقال السیوطی فی الاتقان وکتابه اجل التفاسیر واعظمها ...... نقله بعض المتاخرین الی الفارسیة لمنصور ابن نوح السامانی[۲].**

''تفسیر ابن جریر'' اس کے مصنف ابوجعفر محمد طبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، اس تفسیر کے بارے میں سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے، یہ تفسیروں میں سب سے عظیم اور جلیل القدر تفسیر ہے، متاخرین میں سے کسی نے منصور بن نوح سامانی کے لئے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

---

۱؎ کشف الظنون (جدید ایڈیشن) ج۱ ص۲۹۷۔ ۲؎ حوالہ مذکور ج۱ ص۴۷۳۔

۱۰- سب سے اہم اور بڑی شہادت کہ تفسیر و تاریخ دونوں کا مصنف ایک ہے، خود تاریخ طبری ہی سے ملتی ہے، مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں القول فی خلق آدم کے تحت لکھا ہے۔

**وقيل اقوال كثيرة فى ذالك قد حكينا منها جملا فى كتابنا المسمى جامع البيان عن تاويل اى القرآن فكرهنا اطالة الكتاب بذكر ذالك فى هذا الموضع**[1] .

اس سلسلہ میں بہت سے اقوال ہیں، ان میں سے بہت سے ہم نے اپنی کتاب جامع البیان عن تاویل ای القرآن میں نقل کر دیئے ہیں، طوالت کے خیال سے ان کا یہاں نقل کرنا ہم نے پسند نہیں کیا ہے۔

مذکورہ بالا قول کی حقیقت وصداقت معلوم کرنے کے لئے میں نے تفسیر طبری دیکھی تو یقین ہو گیا کہ مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں جن اقوال کو اپنی تفسیر میں ذکر کرنے کا حوالہ دیا ہے، حقیقتاً وہ اقوال تفسیر میں موجود ہیں، یہ سارے اقوال قرآن کی آیت **قالوا أتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء** کے ذیل میں پورے سات صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں[2]۔

یقین میں مزید اضافہ اس وقت اور بھی ہوا جب میں نے دیکھا کہ تاریخ میں اس موقع پر جو بعض الفاظ استعمال کئے ہیں، ٹھیک وہی الفاظ تفسیر میں بھی موجود ہیں۔

تاریخ میں اس موقع پر ایک جملہ ہے۔ **يقول اعلم مالا تعلمون من الظواء ابليس على التكبير** تفسیر میں اسی لفظ "الظواء" کو اس موقع پر استعمال کرتے ہیں، تفسیر کے الفاظ میں **اظهر لهم من ابليس ما كان منطويا عليه من الكبر**، "**الظواء**" کے مستقات کو تفسیر میں کئی بار استعمال کیا ہے شاید واقعہ کی ترجمانی کے لئے وہ اس لفظ کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اس لئے تفسیر و تاریخ دونوں میں اس

---

[1] تاريخ الامم والملوك مطبوعه دار الفكر بيروت ج ا ص ۴۵.

[2] تفسير جامع البيان مطبوعه مطبع ميمنيه مصر ج ا ص ۱۵۴ تا ۱۶۲.

موقعہ پر یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

تاریخ میں ایک عبارت ہے **فخلق اللّٰہ آدم من طین لازب و اللازب اللزج الطیب من حمأ مسنون منتن انما کان حمأ مسنونا بعد التواب قال فخلق منہ آدم بیدہ**[1].

بالکل یہی عبارت تفسیر میں ہے، ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہے[2]۔

خلق اللّٰہ من طین لازب کے ذیل میں اپنے شیخ ابوکُریب کی جس روایت کو اپنی تاریخ میں لکھا ہے[3]، ٹھیک وہی روایت انھیں سے اپنی تفسیر میں بھی لکھی ہے[4]۔ تخلیق آدم کے لئے مٹی لینے کے لئے فرشتوں کو بھیجنے کا ذکر اپنی تاریخ میں اپنے شیخ موسیٰ بن ہارون کی روایت سے بیان کرتے ہیں[5]۔

انھیں کی وہی روایت ان کی تفسیر میں بھی موجود ہے، علم آدم الاسماء کلھا کی تفسیر میں اگر پہلی روایت ان کے شیخ ابوکُریب کی ہے اور وہی روایت ہے، پھر ان کے شیخ محمد بن عمرو کی روایت تاریخ میں ہے وہی روایت محمد بن عمرو کی ان کی تفسیر میں بھی ہے، درمیان میں تین چار روایتیں تفسیر میں زیادہ ضرور ہیں لیکن ترتیب قائم ہے۔ پھر تاریخ میں ابن وکیع کی روایت ہے، وہی روایت اسی ترتیب سے تفسیر میں بھی ہے، تاریخ میں پھر ان کے شیخ بشر بن معاذ کی روایت ہے، تفسیر میں بھی وہی روایت ہے، پھر قاسم بن حسن کی جو روایت ہے دونوں کتابوں میں ہے، اس طرح دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کرنے پر روایتوں کی ترتیب تاریخ میں وہی بنتی ہے جو تفسیر میں ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب طبری نے تاریخ لکھنی شروع کی تو تفسیر سامنے رکھ لی اور جس روایت کو تاریخ کے لئے مناسب سمجھتے ہیں، لے لیتے ہیں اور باقی روایت کو چھوڑتے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر و تاریخ دونوں روایتوں میں ایک مخصوص ترتیب پائی جاتی ہے۔

---

۱؎ تاریخ الامم والملوک ج۱ ص ۴۵۔
۲؎ جامع البیان ج۱ ص ۱۵۵۔
۳؎ تاریخ الامم والملوک ج۱ ص ۴۵۔
۴؎ جامع البیان ج۱ ص ۱۵۵۔
۵؎ تاریخ، ج۱ ص ۴۵۔

طبری نے اپنی تاریخ میں صرف ''خلق آدم'' کے عنوان کے تحت اپنے شیوخ میں سے ابوکریب، ابن حمید، موسیٰ بن ہارون، احمد بن اسحاق الاہوازی، یعقوب بن ابراہیم، علی بن الحسن، محمد بن عمرو، وکیع، ابن وکیع، حسن بن یحییٰ، بشر بن معاذ، قاسم بن الحسین، یونس عبدالاعلیٰ اور بعض دوسرے شیوخ کی روایتیں درج کتاب کی ہیں، انھیں شیوخ سے وہی روایتیں اسی ترتیب سے وہ اپنی تفسیر میں پہلے لکھ چکے ہیں، گہرائی سے جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی تفسیر ان کی تاریخ سے یقیناً پہلے لکھی گئی ہے، چونکہ تفسیر کے مقابلہ میں تاریخ میں روایتوں کا اختصار مدنظر تھا اور تفسیر میں روایتوں سے انتخاب کیا ہے، حیرتناک یکسانیت واشتراک یہ ہے کہ تاریخ میں جس ترتیب سے ان مشائخ کی روایتوں کو لکھتے ہیں ٹھیک وہی ترتیب ہے جو تفسیر میں ہے جب کہ بیچ میں کئی کئی صفحے دوسری تفصیلات پیش کرتے جاتے ہیں، مگر تاریخ میں تفسیر سے انتخاب روایات اپنی ترتیب کے ساتھ ہے[۱]۔

دو مصنف کی دو کتابوں میں یہ اشتراک، یکسانیت اور ترتیب مضامین کیا ممکن ہے؟ اگر بالفرض ایسی کوئی مثال مل جائے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ اپنی کتاب بعد میں لکھنے اور مرتب کرنے والا شخص مصنف نہیں کچھ اور ہے، اس کا ہاتھ تو نہیں کاٹا جاسکتا، لیکن اس کے قلم کو ذلّت ورسوائی کی سزا ضرور دی جائے گی۔

طبری کی تفسیر وتاریخ میں مضامین، روایتوں اور عبادتوں میں اشتراک ویکسانیت اور ترتیب اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں اپنی تفسیر کا جو اس موقع پر حوالہ دیا ہے وہ اپنے اندر پوری صداقت لئے ہوئے ہے، مصنّفین کی اپنی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں، ہر ایک کے کچھ مخصوص الفاظ، جملے، مضامین اور اپنا مخصوص طرزِ تحریر اور انداز بیان ہوتا ہے، اور وہ ان سے اپنی ہر تصنیف میں کام لیتے ہیں، اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کے بعد کوئی دوسری کتاب لکھتا ہے اور اس میں اس کی پہلی کتاب میں درج کسی خاص بحث کا موقع آجاتا ہے تو بالعموم وہی انداز

[۱] دیکھئے تاریخ الامم والملوک ج۱ ص۴۵ تا ۵۲ اور تفسیر جامع البیان (مطبع میمنیہ) ص۱۵۵ تا ۱۶۴۔

بیان، وہی عبارتیں بلا تکلف زیرِ تصنیف کتاب میں استعمال کرتا ہے، اور یہ کوئی عیب نہیں ہے، طبری نے بھی پہلے تفسیر لکھی اور جب تاریخ لکھنی شروع کی تو جو باتیں تفسیر میں تفصیل سے لکھ چکے تھے ضرورت پڑنے پر اس کی تلخیص کر کے اس بحث کو اپنی تاریخ میں شامل کر لیا، یہی سب سے بڑا ثبوت ہے کہ تفسیر و تاریخ دونوں ایک ہی مصنف کی کتابیں ہیں۔

میری اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ تفسیر طبری اور تاریخ طبری جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہیں، ان دونوں کے مصنف امام ابو جعفر محمد بن یزید بن جریر بن یزید الطبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، مذکورہ بالا شہادتوں کے بعد یہ گنجائش نہیں رہتی ہے کہ کوئی یہ کہے کہ تفسیر طبری تو ضرور ان کی ہے، لیکن تاریخ طبری رافضی طبری کی ہے۔

میں نے علامہ طبری کے معاصرین سے لے کر گیارہویں صدی تک کے اربابِ تحقیق و تصنیف کی شہادتیں آپ کے سامنے پیش کردی ہیں، ان شہادتوں کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کریں کہ تفسیر طبری اور تاریخ طبری کے بارے میں ایک مصنف کی تصنیف ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے، کیا یہ غلط دعویٰ ہوسکتا ہے؟ مجھے کسی تصنیف، کسی تذکرہ میں یہ شائبہ بھی نہیں ملا کہ تفسیر و تاریخ کو کسی دوسری شخصیت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، یہ تو ضرور ہوا کہ طبری کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانے کی نیت سے رافضی کی بعض ہفوات ان کی جانب منسوب کر کے ان کے خلاف محاذ بنانے کی ان کے زمانے میں کوشش کی گئی، لیکن پوری تاریخ سے معمولی سی شہادت نہیں ملی کہ ان کی کتابوں کو کسی نے رافضی طبری کی طرف منسوب کیا ہو، ان حالات میں یہ دعویٰ کس طرح قابل قبول ہوسکتا ہے کہ تاریخِ طبری، رافضی طبری کی ہے اور تفسیر طبری کی ہے، اس تقسیم کی پوری تاریخ میں کہیں بھی گنجائش نظر نہیں آتی۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس تقسیم سے کیا نقصان ہے؟ بظاہر نقصان کے بجائے فائدہ ہے، اگر تاریخ کو شیعی طبری کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے، تو سیکڑوں وہ روایتیں جو اس کتاب میں ہیں، جن سے صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگی بدمنظر بن جاتی ہے، ان

سے نجات حاصل ہو جائے گی اور کہد یا جائے گا کہ یہ تاریخ ہمارے لئے قابل حجت نہیں ہے، کیونکہ اس کا مصنف غالی رافضی ہے، لیکن یہ دعویٰ کچھ آسان نہیں ہے۔

چونکہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہوگا، اس لئے علمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، آج دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے، قدیم سے قدیم تر مخطوطے تحقیق وتفتیش کے دیوانے حاصل کر چکے ہیں، اور بظاہر ناممکن الحصول قدیم ترین مخطوطے جن سے اہل علم مایوس ہو چکے تھے برابر دستیاب ہوتے جارہے ہیں۔ جن مصنّفین کی تصنیفات کو ناممکن الحصول سمجھ کر ہم مطمئن ہو چکے تھے آج ان کے مخطوطے دریافت ہو گئے ہیں اسی طرح تاریخ طبری کے بہت سے مخطوطے علمی دینا نے حاصل کر کے اس کی تحقیق کی ہے، اور ناقابل شکست دلائل سے اس کتاب کا مصنف اسی شخصیت کو قرار دیا گیا ہے جس کی تصنیف ماننے سے انکار ہے آج بہت سی علمی بحثوں میں طبری کی یہ تاریخ مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، مستشرقین کا ایک پورا گروہ جو اپنی تحقیق دوسعت مطالعہ کی بنا پر طبری کی اس تاریخ کے مقام ومرتبہ سے خوب واقف ہے، وہ آپ کے دعویٰ بلا دلیل کو کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرے گا، اور اگر علمی بنیاد پر آپ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہیں گے اور ثبوت وشہادت کی تلاش میں نکلیں گے تو تلاش وجستجو کے قدم اس خارزار روادی میں لہولہان ہو جائیں گے اور ہر ہر قدم پر آپ کو آپ کے دعویٰ کے خلاف ہی ثبوت اور شہادت ملتی چلی جائے گی۔

اس تقسیم سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ یہ کتاب ناقابل اعتبار ہو جائے گی اور اسی کتاب پر بعد میں لکھی جانے والی بہت سی اسلامی تاریخوں کا دارومدار ہے، اس لئے وہ تمام کتابیں اور تاریخیں بھی ناقابل اعتماد اور ناقابل حجت بن جائیں گی، جن میں تاریخ سے طبری سے استفادہ کیا گیا ہے، اس طرح اسلامی تاریخ کا پورا سرمایہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہو جائے گا، اس لئے یہ تقسیم کسی بھی حال میں اور کسی بھی حیثیت سے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

رہ گئیں تاریخ طبری کی وہ روایات جن سے صحابہ کرام کی شخصیتوں پر حرف آتا

ہے تو ایسی روایتوں کی علمی بنیاد پر تردید ہونی چاہئے، ہمارے ہاتھوں میں فن اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کی کسوٹی موجود ہے، اگر تاریخ طبری کی کوئی بھی روایت اس کسوٹی پر کھری ثابت نہیں ہوتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کا ہم کو حق حاصل ہے، خود طبری کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ہم نے روایتوں کی صحت وصداقت کو جانچنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو رطب و یابس روایتیں ہم تک پہنچیں ہم نے ان کو اسی طرح انھیں راویوں کی زبانی نقل کر دیا ہے، اب یہ قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ جواہرات کو پرکھ کر الگ کرلے اور خزف ریزوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دے، چونکہ اس بحث کو ہم نے اپنی کتاب ''تاریخ طبری کا ایک تحقیقی جائزہ'' میں مفصل لکھ دیا ہے، اس لئے سلسلۂ کلام یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

# ڈی اولیری کی کتاب ''**فلسفۂ اسلام**'' پر ایک نظر

پاکستان میں چھپی ہوئی ایک کتاب ''فلسفۂ اسلام'' میرے ایک دوست سفر پاکستان سے واپسی میں بطور خاص لائے تھے انھوں نے مجھے مطالعہ کے لئے دی اور اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت کا اظہار کیا، کتاب کا مصنف ایک مستشرق ڈی اولیری لیکچرار رامی وسریانی، برسٹل یونیورسٹی ہے، کتاب کا اردو ترجمہ احسان احمد بی اے (علیگ) نے کیا ہے جو سررشتہ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے رکن تھے، نفیس اکیڈمی کراچی نے اس کو شائع کیا ہے، میرے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو نومبر ۱۹۸۰ء کا مطبوعہ ہے، کتاب کے ناشر چودھری محمد اقبال سلیم نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے پیش لفظ لکھا ہے:

> ''یہ حیدر آباد دکن جامعہ عثمانیہ میں داخل نصاب رہی اور علم وتحقیق کی کسوٹی پر بارہا کسی گئی اور کتاب کو ہر اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی علمی وتحقیقاتی مرکز قرار دیا گیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب اُردو یا انگریزی میں ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے، یہ کتاب ایسا علمی خزانہ ہے جس میں

قیمتی معلومات کے جواہر بھرے ہوئے ہیں''۔

اس بلند بانگ دعوے اور شاندار تعارف نے خاص طور پر مطالعہ کے لئے مہمیز کیا اور ان جواہرات کی تلاش میں کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا گیا جو بقول ناشر کتاب میں بھرے ہوئے ہیں، میں انھیں جواہرات سے کچھ آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں تا کہ آپ بھی ان جواہر کو ایمان ہی نہیں علم وتحقیق، اسلامی تعلیمات وروایات، قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر خود دیکھیں کہ کیا واقعتاً یہ جواہرات ہیں یا خرف ریزے؟ یہ آب حیات ہے یا زہر کا پیالہ؟ یہ سدا بہار پھولوں کا گلدستہ ہے یا کانٹوں کا انبار؟ پوری کتاب پر تبصرہ تو سر دست ممکن نہیں اس لئے مصنف کے کچھ دعووں پر اپنی گفتگو محدود رکھنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ یہی دعوے اس کی پوری کتاب کی روح ہیں، اور اسی سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ مصنف کا مقصد کسی علمی تحقیق کو پیش کرنا ہے یا صرف اسلام دشمنی نے اس کو اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا ہے؟ اور وہی انداز فکر اختیار کیا ہے جو عام طور پر مستشرقین کے یہاں پایا جاتا ہے؟ کتاب کے مطالعہ کے بعد میں نے دل کے پورے درد وکرب کے ساتھ سوچا کہ اگر ایسی ہی کتابیں ہماری یونیورسٹیوں میں اسلام کے تعارف کے لئے پڑھائی جاتی رہیں تو پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے ایمان کا خدا ہی حافظ ہے۔

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا　　کارِ طفلاں تمام خواہد شد

کتاب کا دوسرا باب جہاں سے شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے ''عربی دور'' یہیں سے اس نے خالص اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ''اسلامی دور'' کے بجائے ''عربی دور'' کا لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کسی مذہب کی تشکیل یا اشاعت ہی نہیں تھی، بلکہ اس دور میں عرب کے اندر ایک نئی طاقت اُبھر رہی تھی جس نے حیرہ اور غسان میں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں، اس کامیابی سے عربوں نے سمجھ لیا کہ ایرانی سلطنت اور شاید رومی بھی باوجود اپنی شان وشوکت کے قابل شکست ہیں، اور اگر کوئی

پُرعزم کوشش کی جائے تو دونوں کی دولت آسانی کے ساتھ عربوں کے ہتھے چڑھ سکتی ہے[۱]، بس اسی جذبے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میدانِ عمل میں آئے تھے، مذہب کی تشکیل کا خیال تو مدینہ جانے کے بعد یہودیوں کی مذہبی زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور مجبوراً ایک مذہب کی داغ بیل ڈالی[۲]، ڈی اولیری اپنی کتاب کے دوسرے باب کا آغاز اس جملہ سے کرتا ہے۔

''اسلام اپنی ابتدائی شکل میں کلیتہً ایک عربی مذہب تھا[۳]''

اس کے بعد مصنف اپنے قارئین کو بتاتا ہے کہ:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تبلیغ کا دنیاوی پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم انھیں حجاز کے قبائل کو برادرانہ اتحاد میں مربوط کرنے کی کوشش کرنے، لوٹ مار کرنے کے دستور کو محدود کرنے، اور ایک منظّم جماعت بنانے میں مصروف پاتے ہیں[۴]''

ڈی اولیری نے چند صفحوں کے بعد بتایا ہے کہ عرب خانہ بدوش قوم تھی، ان کو صرف لوٹ مار سے دلچسپی تھی، اس لئے بدوی قبائل میں کبھی منظّم حکومت نہیں ہوسکتی تھی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مدینہ چلے جانے کے بعد بھی مکہ کے لوگ ان کی ماتحتی میں نہیں آنا چاہتے تھے وہ تو انھوں نے مدینہ میں اپنا ایک ''جنگجو دستہ'' بنالیا تھا، اور مکہ پر طاقت کے زور سے قبضہ کرلیا تھا اور مکہ والوں کی طاقت توڑ دی تھی اس لئے مجبوراً وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہو گئے تھے وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے[۵]، اس کے بعد بنو امیہ کے بارے میں لکھتا ہے:

''ان خالص دنیا دار عربوں کا سرگروہ قبیلہ قریش کے بنو اُمیہ تھے، چونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قریشی تھے اور اسلام کی عظمت سے قریش کی عظمت ہوتی تھی، اس کی وجہ سے وہ ایک قسم کے امراء کا طبقہ بن گئے تھے، اگرچہ اس طرح بنو اُمیہ اپنے شخصی غرور کو مطمئن کرسکتے تھے جو ایک نیم متمدن جماعت کی

۱۔ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۶۴۔
۲۔ فلسفۂ اسلام ص ۶۹۔
۳۔ حوالہ مذکور ص ۶۸۔
۴۔ حوالہ مذکور ص ۷۹۔
۵۔ حوالہ مذکور ص ۷۲۔

نفسیات میں ہمیشہ ایک طاقتور عامل ہوتا ہے، اور دوسرے قبائل پر بہت کچھ قابو حاصل کر چکے تھے، لیکن اس نے اسلام کے پہلے کے قبائل کے رشک وحسد ہی کو دوام بخشا، کیونکہ قریش کے تفوق کے باعث ان کے اکثر حریف سخت مخالف تھے، حقیقی عرب جماعت مذہب کی طرف سے زیادہ بے پرواہ تھی اور اب تک ہے[۱]"

مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"بلاشبہ عرب مفتوح عجمیوں کو حلقہ بگوش اسلام ہو جانے پر بھی بھائی تسلیم کرنے پر مائل نہ تھے، ان کے نزدیک بیرونی ممالک کی فتح کے معنی صرف بڑی بڑی جائدادوں، بے شمار دولت، اور غیر محدود قوت حاصل ہونے کے تھے[۲]"

اس سے آگے چل کر لکھتا ہے:

"بنو اُمیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے مال گذاری میں کمی واقع ہوتی تھی[۳]"

ڈی اولیری کے نزدیک اسلام کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے، مختلف مذاہب سے مختلف احکام اخذ کر کے اپنا لیا ہے، اسلامی فقہ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ ساری کی ساری رُومن لاء سے لی گئی ہے، عربوں نے اس کی دفعات کو جس طرح سے شام اور مصر میں رائج پایا ان کو قبول کر لیا، جہاں تک قانونی دیوانی کی حقیقی ضروریات کا تعلق ہے اس کا بڑا ماخذ رومی قانون تھا، اور احادیث کا بڑا حصہ ان ضروریات پر مشتمل ہے[۴]، بنو امیہ کے دور میں فقہاء قانون کی کوتاہی کو اپنی رائے سے پورا کر دیتے تھے، جس کے معنی تھے کہ حق وانصاف کا تصفیہ کرتے ہوئے ایسے شخص کی رائے سے کام لیا جا رہا ہے جو رومی قانون کی تربیت پا چکا ہے[۵]۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی غار حرا میں

---

۱ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۷۸، ۷۹۔
۲ حوالہ مذکور ص ۷۹۔
۳ حوالہ مذکور ص ۸۰۔
۴ حوالہ مذکور ص ۸۸۔
۵ حوالہ سابق۔

اس وقت نازل ہوئی جب وہ راہبانہ زندگی گذار رہے تھے، یہ عیسائیوں کی رہبانیت سے اثر پذیری کا ثمرہ تھا[۵]، اسلامی تصوف کے متعلق اس کا خیال ہے کہ یونانی اثرات کا نتیجہ ہے[۶]۔

## صرف دعویٰ ہی دعویٰ

میں نے ڈی اولیری کی کتاب ''فلسفۂ اسلام'' سے یہ چند اقتباسات صرف اس لئے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں تاکہ آپ مصنف کے طریقۂ فکر کو سمجھ سکیں اور اس کے دل میں جو چور بیٹھا ہوا ہے اس کی نشاندہی ہو جائے اور اس کے دل میں اسلام کے خلاف جو جذبات کا سمندر موجیں مار رہا ہے، اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

جو شخص یہ تہیہ کرلے کہ حریف کے ہر کام اور اس کی ہر بات کی مذمت کرنی ہے تو وہ تمام حقائق سے صرف نظر کرکے ہر طرح کی رطب و یابس باتیں بلا جھجک کہہ سکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب نہایت سادگی کے ساتھ اس طرح لکھتا ہے جیسے وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ سب مسلمہ حقائق ہیں، ان میں اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں، اس کو اپنے بیان کے لئے نہ ثبوت وشہادت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے نہ شواہد ودلائل کی حاجت، نہ کسی مؤرخ کا وہ حوالہ پیش کرتا ہے، نہ اسلامی تعلیمات وروایات اور اسلامی تاریخ سے اپنے دعویٰ کے لئے دلیل فراہم کرتا ہے۔ پوری کتاب میں دوچار مقامات پر اپنے ہم مشرب مستشرقین کے خیالات نقل کرتا ہے بقیہ سارا بیان اس کا یکطرفہ بیان ہے اور بلا دلیل ہے، اس کی حیثیت فرضی الزامات کی ایک فہرست جیسی ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود یونیورسٹیوں کے اہل علم وتحقیق آنکھ بند کرکے ایسی تمام کتابوں کو وحی الٰہی کی طرح صحیح، درست اور ناقابل انکار سمجھتے اور مانتے ہیں جس کا مصنف یورپ کی کسی یونیورسٹی کا اسکالر ہو۔ بس اتنی ہی سند ان کے لئے کافی ہے، لیکن علماء اسلام اور اسلامی علوم کے ماہرین ان مباحث کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ خود اسلام کا ان اتہامات

---

[۵] حوالہ مذکور ص ۲۰۱۔ [۶] فلسفہ اسلام ڈی اولیری ص ۱۹۶۔

سے کوئی واسطہ ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی تشریحات اس کے بارے میں کیا ہیں؟ اور اسلامی تاریخ کیا کہتی ہے؟ ان باتوں سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے ہم ان الزامات واتہامات پر اسلامی روایات وتعلیمات اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تا کہ صداقت اور اصل حقیقت واضح اور روشن ہو جائے۔

## تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

اسلام پر اعتراض کرنے کا حق یقیناً ان لوگوں کو حاصل ہے جو حضور اکرم ﷺ کی رسالت اور آپ کی تعلیمات پر ایمان نہیں رکھتے، اتنی شرط ضرور ہے کہ علمی دیانتداری اور ضمیر کی آواز سے صرف نظر کر کے یہ اعتراض نہیں ہونا چاہئے، اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کا پہلا فرض ہے کہ وہ قرآن کا مطالعہ کریں احادیث کے ذخیروں سے واقف ہو جائیں، مسلمان ان دونوں چیزوں پر اس طرح ایمان رکھتا ہے جیسے دوپہر میں چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کے وجود پر یقین رکھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بلا استثناء دنیا میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے اور آج بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں ان میں سے کسی کی تعلیمات اتنے قابل اعتماد ذرائع اور مستند رسائل سے موجودہ نسل تک نہیں پہنچیں جتنے قابل وثوق اور مستند ذرائع سے قرآن اور احادیث آج کے زمانہ تک پہنچی ہیں، عہد رسالت کا پورا زمانہ اس طرح دنیا کے سامنے واضح اور روشن ہے جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

اسلام کی ان دونوں بنیادی دستور کی کتابوں اور ان کے ایک ایک لفظ کی صداقت کو تا حد امکان بشری ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ سلسلہ سند آج تک موجود ومحفوظ ہے اور اس کے ہر ہر فرد کو ہم اس طرح جانتے پہچانتے ہیں جس طرح ایک آدمی اپنے خاندان کے افراد کو جانتا پہچانتا ہے، ان کی دیانتداری، راستبازی، تقوی وپرہیزگاری، گفتگو کاروبار اور معاملات میں صداقت ودیانت کی ہر طرح جانچ پڑتال کر لینے کے

بعد ہی ان کی روایتوں کو درجہ استناد دیا گیا ہے۔

اس لئے جب اسلام آپ کی آنکھوں کا کانٹا بن جائے تو جھنجلانے کے بجائے علمی تحقیق، دیانتداری اور اپنے ضمیر کی نگرانی میں ان دونوں چیزوں کا مطالعہ کریں اور اسلامی تاریخ سے صورت حال معلوم کرلیں، پھر اعتراض کریں، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، بڑے سے بڑا مستشرق بلند سے بلند تر دعویٰ کر لیتا ہے لیکن جب اس کی بنیاد تلاش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری عمارت ہوا میں کھڑی کردی گئی ہے اور ان کے نام ونہاد تحقیقی مقالے میں صرف ہوائی قلعے بنائے گئے ہیں، اب تک مغربی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا مطالعہ کرنے والوں نے یہی کیا ہے اور جب اسلامی دانشوروں نے ان کے اعتراضات پر تحلیل وتجزیہ کا عمل جراحی کیا تو معلوم ہوا کہ اسلامیات کے ناقص علم نے ان کو اس بے وزن اعتراض کا راستہ دکھایا ہے، ڈی اولیری کی کتاب میں صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے ثبوت وشہادت کا دور دور تک پتہ نہیں، مگر وہ خوش قسمت ہے کہ یورپ میں پیدا ہوا اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسر اس کی صداقت پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اور آج بھی اس کی طرف سے صفائی دینے کے لئے تیار ہیں۔

## کیا اسلام صرف عرب کے لئے تھا؟

ڈی اولیری نے سب سے پہلا دعویٰ بلا دلیل یہ کیا ہے کہ اسلام صرف عرب کے لئے تھا، اتفاقاً وہ عرب کے باہر پھیل گیا، اگر اس کا یہ الزام صرف اس لئے ہے کہ ابتدا میں مسلمان ہونے والے آپ کے دوست، آپ کی بیوی، آپ کے خاندان اور قبیلے کے لوگ تھے، آپ نے صفا کی چوٹی سے صرف قریش اور مکہ ہی کے لوگوں کو خطاب کیا یا آپ ایک بار طائف تشریف لے گئے اور آخر میں مدینہ میں تبلیغ جاری رکھی پھر اس کے بعد آپ دنیا سے تشریف لے گئے، اور تبلیغ کے سلسلہ میں ایک بار بھی آپ مدینہ سے باہر نہیں گئے، اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عرب میں محدود

سرگرمیوں کو دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ کے مد نظر صرف عرب تھا تو اس کی کوتاہ نظری اور آپ کی دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں کا مطالعہ گہرا نہیں ہے یہ تو ایک تجرباتی اور مشاہداتی مسئلہ ہے، دنیا میں انقلابات کی تاریخ پر اگر اس کی نگاہ ہوتی تو وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا۔

ہر انقلاب، ہر بڑی تحریک، ہر بڑا منصوبہ آغاز کار میں اپنے گردو پیش ہی کی آب و ہوا میں نشو ونما پاتا ہے اور بتدریج اس کا دائرہ اثر وسعت اختیار کرتا ہے اور ایک عظیم طاقت بن کر عملی اسٹیج پر آتا ہے، اس کی ایک معمولی اور چھوٹی سی دنیاوی سیاست کی مثال کارل مارکس کی ہے، وہ اپنے خیالات کی وجہ سے روس سے جلاوطن کیا جاتا ہے اور لندن کی ایک کوٹھری میں گمنامی کی زندگی بسر کرتا ہے وہیں اپنی مشہور عالم کتاب ''کیپیٹل'' لکھتا ہے جس میں اس نے مستقبل کے انقلاب کی تصویر کشی کی ہے پھر اس کو اینگلز کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے، پھر ایک اور جاں نثار لینن پیدا ہوا جو بعد میں عملی سوشلزم کا پیغمبر بنا، اس نے پرجوش نوجوانوں کی تنظیم کی اور مارکس کے نظریہ کی اشاعت کرتا رہا اس طرح کمیونزم پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا اس نے عقیدہ کی پختگی پیدا کر کے نوجوانوں کے سینوں میں جوش عمل کی آتش سیّال بھر دی، جس کے نتیجہ میں جگہ جگہ بغاوتوں کا آغاز ہوا، پھر زار روس کے خلاف بڑے پیمانے پر پیش قدمی کا آغاز کر دیا گیا، سمرقند و بخارا پر کمیونسٹوں کی یلغار کو ''جوشا کیونٹز'' کی کتاب ''ڈان آف سمرقند'' میں پڑھو، دیکھو کہ کس طرح اپنے نظریہ پر پختہ یقین رکھنے والوں نے روس میں انقلاب برپا کر دیا اور اکتوبر ۱۹۱۷ء میں زار روس کے محل پر کمیونسٹوں کا سرخ پرچم لہرانے لگا۔

اس پوری داستان سے تم سمجھ سکتے ہو کہ کسی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہر مدبر رہنما اپنے گردو پیش سے طاقت حاصل کرتا ہے، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ تو دنیاوی سیاست کے کرشمے ہیں، نبی و رسول کا درجہ و مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ مگر اس اعتراض سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول بھی انسان ہوتا ہے کبھی فرشتوں کو

نبی و رسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا گیا، جب نبی اسباب وعلل کی اس دنیا میں آتا ہے تو انھیں وسائل و ذرائع سے کام لیتا ہے جو دنیائے انسانیت کے لئے قدرتی طور پر مہیا کئے گئے ہیں، بس فرق یہ ہے کہ صداقت و راستبازی دینِ حق کے لئے خلوص و للّٰہیت کا خون اس کی حدوجہد کی شریانوں میں دوڑتا ہے، نبی کے وسائل و ذرائع بھی نیک وصالح مقدس و پاکیزہ اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی اسباب وعلل کی دنیا میں تشریف لائے تھے، آپ نے دعوت وتبلیغ کا آغاز اپنے گرد و پیش ہی سے کیا، پھر بتدریج دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا۔

## حضور ﷺ کی رسالت ساری دنیا کے لئے تھی

چونکہ آپ وحی الٰہی کے مطابق دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اس لئے وحی الٰہی نے جن حدود میں تبلیغ کا حکم دیا اس دائرے میں اس وقت تک اپنے فرض انجام دیتے رہے جب تک دوسرا حکم نہیں آیا سب سے پہلے حکم الٰہی آیا اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ[1]۔ تو آپ نے اپنے عزیز واقارب کو دعوت ایمان دی، پھر خداوند قدوس کی طرف سے وحی آئی، هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ وَمُصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا[2]۔ آپ کے دائرہ کار کو بڑھا کر پورے مکہ اور اطراف مکہ تک وسیع کر دیا گیا، اس کے بعد تیسرا حکم آیا وَلِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَائُهُمْ[3]۔ اب آپ کے دائرہ کار میں پورا عرب شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ ایک طویل عرصہ سے عرب میں کوئی نبی یا رسول نہیں آیا تھا، اس کے بعد وحی الٰہی نے روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری سپرد کی اور کہا گیا وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ[4]۔ ساری دنیا کے لئے آپ رحمت بنا دیئے گئے اور رحمۃ للعالمینی کا تاج زرنگار فرق نبوت پر رکھ دیا

---

[1] القران، سورہ شعراء ایت ۲۱۴۔
[2] القران، سورہ انعام رکوع ۱۶ ایت ۹۲۔
[3] القران، سورہ یٰسٓ ایت ۶۔
[4] القران، سورہ اعراف ایت ۱۵۸۔

گیا۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ اور اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا کہ آپ دنیا والوں سے کہہ دیں کہ میں تم سب کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں، وحی الٰہی کے الفاظ ہیں قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا[1] .

ان تصریحات قرآنی کے بعد ڈی اولیری کو ایک بے بنیاد دعویٰ کرنے کی جسارت کیسے ہوئی؟ یہ ایک حیرتناک امر ہے مزید ستم یہ کہ اس نے اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں دی۔

قرآن کی ان تصریحات کے بعد پھر کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی کچھ تاریخی شواہد پیش کئے جارہے ہیں تاکہ جو لوگ فہم وفراست کے بجائے حقائق کو ہاتھوں سے ٹٹول کر تسلیم کرتے ہیں ان کے لئے بھی گفتگو کی گنجائش نہ رہ جائے۔

صلح حدیبیہ ٦ ھ کے بعد ۴ ½ سال کی مدت میں آپ نے بڑے وسیع پیمانے پر اپنی دعوت کو عرب کے باہر عام کرنے پر پوری توجہ فرمائی، ایک زمانہ مجبوریوں کا وہ تھا کہ چند اوباش آپ کو نماز میں بھی ستانے سے باز نہیں آتے تھے ایک وقت یہ آیا جب آپ اس دور کی دو بڑی حکومتوں کے سربراہوں قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دینے لگے۔

## دعوتِ اسلام کے لئے عالمی جدوجہد

قرآن نے بتدریج آپ کے دائرہ کار کی وسعت کا ذکر کیا ہے، حضور اکرم ﷺ کا دائرہ عمل بھی انھیں حکموں کی روشنی میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور جب ٦ ھ میں مشرکین مکہ سے حدیبیہ کے مقام پر دس سالوں کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوا اس کے بعد اطمینان کی سانس لینے کا موقع ملا، اس صلح نامہ کی ترتیب کے بعد آپ نے اسلام کی دعوت کو عرب سے باہر پھیلانے اور دائرہ کار کو وسیع کرنے پر خصوصی توجہ فرمائی اور عملی سرگرمیوں کا آغاز فرمادیا۔ اسی سال شہنشاہ دو عالم کے لئے سرکاری کاموں کے واسطے بڑے اہتمام سے مہر بنوائی گئی تاکہ دنیا کے بادشاہوں کے پاس شہنشاہ دو عالم کا حکم

[1] القران، سورہ اعراف آیت ۱۵۸.

نامہ سرکاری مہر کے ساتھ روانہ کیا جائے آپ نے سیکڑوں خطوط لکھوائے اور صحابہ کے ذریعہ اندورن عرب اور بیرون عرب کے حکمرانوں، قبائلی سرداروں، علاقے کے چودھریوں، پادریوں اور گورنروں کو پروانے بھیجے، ان خطوط میں نرم لب ولہجہ میں بھی ان کو اوران کے ملک کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی گئی[۱]۔ احادیث کے ذخیرے میں ایسے بہت سے خطوط کا ذکر ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف وجوانب اورعرب کے باہر کے حکمرانوں کوارسال فرمائے۔

اور بعض خطوط کے مضامین بھی نقل کیئے گئے ہیں[۲]۔ اور قاصد کا بھی نام ہے[۳]۔ اور بعض خطوط جب مکتوب الیہ تک پہنچے اوراس کا جوردعمل ہوااس کا بھی ذکر ہے، قیصر کا ان لوگوں کا تلاش کرانا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی طور پر واقف ہوں جیسے ابوسفیان سے حضورؐ کے بارے میں قیصر کے سوالات[۴]، اسی طرح شاہ ایران کسریٰ کا مکتوب نبویؐ کو پڑھ کر چاک کرنا[۵] اور حضورؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجنا اور حضورؐ کا اس کے حکم میں بددعا اوراس کے الفاظ بھی روایتوں میں موجود ہیں[۶]، دعوتی خطوط کے ملنے پر کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا حکومت ایران کے گورنر منذر ابن ساریٰ کا ایمان قبول کرنا[۷]، بحرین کے ایک علاقہ ہجر کے متشدد مجوسی حاکم کا جو حکومت ایران کی طرف سے تھا حضرت علاء حضرمی کے ہاتھ مسلمان ہونا، شام کی ایک ریاست کے حاکم فروہ کا ایمان لانا اور نذرعقیدت کے طور پر حضورؐ کی خدمت میں ہدیہ وتحفہ بھیجنا تاریخوں میں مذکور ہے[۸]۔

اگر حضورؐ کے پیش نظر صرف عربوں کی اصلاح ہوتی تو حبش، روم، شام، بحرین،

---

۱؎ مقوقس کے نام خط میں **فان تولیت فعلیك اثم القیط** اور قیصر کے نام خط میں **ان تولّیت فعلیك اثم الادیسیین** کے الفاظ ہیں مشکوٰۃ ص ۳۴۱، بخاری ومسلم دونوں میں یہ روایت ہے۔

۲؎ حوالہ مذکور۔

۳؎ بخاری شریف ج ۱ ص ۴، مشکوٰۃ ص ۳۴۱۔

۴؎ بخاری ج ۱ ص ۴۔

۵؎ البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۸۔

۶؎ البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۲۶۹۔

۷؎ فتوح البلدان ص ۷۹ الکامل (ابن اثیر) ج ۲ ص ۷۵۔

۸؎ سیرت ابن ہشام الاسلام فروہ وذکر وفودہ۔

مصر اور ایران کے حکمرانوں اور سربراہوں کو خطوط لکھنے اور دعوت اسلام دینے کی کیا ضرورت تھی، حالانکہ تاریخ ہمارے سامنے تقریباً ڈھائی سو خطوط لکھنے اور ارسال کرنے کی شہادت دیتی ہے جو آپ نے مختلف قبائل شیوخ صوبہ جاتی افسران اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے ہیں اور بعض خطوط سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٦ ھ سے بھی پہلے لکھے گئے ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ حبش اصحم کے نام جو خط ہے اس میں یہ الفاظ ملتے ہیں **قد بعثت اليكم ابن عمي ومعه نفر من المسلمين فاذا جائك فاقرهم دوع التجير**[1]۔ یہ خط اس وقت لکھا گیا جب مظلوم مسلمانوں کا ایک گروہ جعفر ابن ابی طالب کی ہمراہی میں حبشہ ہجرت کر رہا تھا۔

یہ واقعہ صلح حدیبیہ سے بہت پہلے کا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عرب سے باہر دعوت و تبلیغ کا کام آپ شروع کر چکے تھے۔

## دعوتی خطوط کی ناقابل انکار شہادتیں

اگر حضورؐ صرف عربوں کے لئے مبعوث ہوئے ہوتے تو یہ خطوط عرب کے باہر کے لوگوں کو کیوں تحریر فرماتے، ظاہر ہے کہ آپ کی بعثت چونکہ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے تھی اس لئے جب حالات نے اجازت دی آپ نے پہلی فرصت میں اسلام کی دعوت کو عرب کے باہر پہنچایا اور سیکڑوں خطوط لکھے، قاصد بھیجے، ان خطوط اور خطوط لے جانے والوں کا ذکر روایتوں میں مذکور ہے، عصر جدید کے محققین نے ان خطوط میں سے کئی ایک کی اصل کو دریافت بھی کیا ہے اور ماہرین اثریات نے اس کی جھلی یا چمڑا جس پر یہ تحریر ہے اور اس کی روشنائی وغیرہ کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ یہ وہی خط ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب الیہ کو بھیجا تھا، یہ خط اصلی ہے، نقل نہیں، اور غیر مسلم محققین نے اعتراف کیا کہ اگر ان خطوط کو عہد رسالت میں لکھے جانے کا مسلمان دعویٰ کرتے ہیں تو وہ تحقیق کی کسوٹی پر صحیح اور ناقابل انکار معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۸۳ خط کا مضمون ابن کثیر کے علاوہ طبری، ابن القیم اور قسطلانی نے بھی نقل کیا ہے، اس خط پر تفصیلی گفتگو کے لئے دیکھئے ''ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کی کتاب حضور اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ص ۱۰۶ تا ۱۰۸''۔

نے جو عرصہ دراز سے فرانس میں علمی کام کرتے ہیں ان دریافت شدہ خطوط کی چھان بین کی ہے اور ان خطوط کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''میں ۱۹۳۹ء میں آکسفورڈ ''کتبات مدینہ'' کے موضوع پر لیکچر دینے گیا تو مارگیولیث نے بتایا کہ اسکاٹ لینڈ کے مستشرق ڈی، ایم ڈنلاپ ساکن برائڈ (اسکاٹ لینڈ) کا بیان ہے کہ نجاشی کا یہ خط فلسطین کے ایک پادری کے پاس سے حال ہی میں خریدا گیا ہے، پھر اسی مستشرق سے میری خط و کتابت ہوئی اور اس نے خط کی فوٹو کاپی مجھے بھیجی، یہ خط وہی ہے جسے مشہور مؤرخ طبری، ابن قیم، قسطلانی اور قلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے[۱]۔''

ڈاکٹر حمید اللہ کا بیان ہے کہ ڈی، ایم، ڈنلاپ نے مجھے لکھا ہے کہ یہ خط ایک جھلی پر لکھا ہوا ہے جو کوئی ۱۹، انچ چوڑی اور ۱۳$\frac{1}{2}$ انچ لمبی ہے، حروف مدور ہیں اور بڑے ہونے کے باعث پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، سیاہی جو استعمال کی گئی ہے وہ خاکی (براؤن) ہے خط کا مضمون ۱۷ سطروں میں ہے جس کے آخر میں ایک گول مُہر کا نشان ہے جس کا قُطر ایک انچ ہے، پھر ڈنلاپ نے اسی ترتیب سے خط نقل کیا ہے جس ترتیب سے مکتوب نبویؐ میں ہے ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے اصلی ہونے پر ناقابل تردید دلائل و شواہد پیش کئے ہیں اور یہ مضمون اور خط پر تحقیق و تبصرہ اُردو ہی نہیں انگریزی اور فرانسیسی زبان کے رسالوں میں شائع ہو چکا ہے جس کی تردید کسی محقق نے نہیں کی[۲]۔

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف عرب کے لئے تھی تو شاہ حبش کو یہ خط لکھنے اور اس کو دعوت ایمان دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ شہادت تو صرف ان لوگوں کے لئے پیش کی جارہی ہے جن کے دلوں کی درستی سلب ہو چکی ہے اور مادی آنکھوں سے دیکھ کر ہی کسی صداقت کو تسلیم کر سکتے ہیں ورنہ یہ خط تو روایتوں اور تاریخ کی کتابوں

---

[۱] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، (ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس) ص ۱۰۸۔
[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر حمید اللہ کی مذکورہ کتاب۔

میں موجود ہے اور ساری علمی دنیا اس سے واقف ہے، اگر ان خطوط میں سے ایک کا بھی آج وجود نہ ہوتا تب بھی اس صداقت پر حرف نہیں آ سکتا کہ حضورؐ نے اپنی وفات سے کئی سال قبل دعوتی خطوط لکھوا کر بیرون عرب کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دی تھی۔

## دوسرا مشاہداتی ثبوت

ایک دوسرا مشاہداتی ثبوت مقوقس کے نام لکھے جانے والے حضورؐ کے مکتوب گرامی کی اصل کی دریافت ہے، مقوقس مصر کا صوبیدار اور صدر پادری تھا، اس مکتوب نبویؐ کی بازیافت فرانسیسی مستشرق موسیواے، ٹی این بارتل می نے کی ہے، اس خط پر ایک مفصل مضمون ''موسیو نے نو'' نے فرانسیسی زبان کے ایک رسالہ میں لکھا تھا، یہ وہ خط ہے جو حضورؐ نے مقوقس کے نام لکھا تھا اس کو فرانسیسی مستشرق نے مصر میں اخمیم کے قریب ایک راہب خانے میں پایا تھا، اس کی حفاظت میں کتنی احتیاط کی گئی تھی اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں، جب پوری احتیاط کے ساتھ وہ جھلی یا کھال جو ایک دوسرے موٹے چمڑے میں چپکائی ہوئی تھی کھولا گیا تو اس میں ٹھیک وہی خط موجود ہے، جو عیسائی حکمرانوں اور خود مقوقس کو لکھا گیا تھا جس کا مضمون روایتوں اور تاریخوں میں موجود ہے، اگر چہ اس کے اصلی ہونے پر بعض یہودیوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے لیکن وہ صرف قیاسی اور سطحی ہیں اور اس کا مدلل جواب دیا گیا ہے دریافت شدہ خط کے الفاظ درج ذیل ہیں:

**بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، من محمد عبد اللّٰہ ورسولہٖ الیٰ المقوقس عظیم القبط، سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ، اما بعد، فانی ادعوك بدعایة الاسلام، فاسلم، تسلم، یوتك اللّٰہ اجرك مرتین، فان تولیت، فعلیك اثم القبط، یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم الا تعبدوا الا اللّٰہ ولا تشرك بہ شیئا ولا تتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللّٰہ، فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون[1].**

---

[1] ''رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی'' ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۳۶، ۱۳۷ خط کے آخر میں اسی طرح کی مہر ہے جو بخاری میں مذکور ہے کان نقش الخاتم ثلثة اسطر ج ۲ ص ۸۷۳۔

یہ عبارت فرانسیسی مستشرق نے خود اس دریافت شدہ جعلی کے خط سے نقل کی ہے، ٹھیک یہی عبارت تاریخوں[۱] اور روایتوں میں بھی پڑھ لیجئے جو چودہ سو برسوں سے ساری دنیا میں پڑھی جا رہی ہیں۔

## ایک شبہ کا ازالہ

مقوقس کے نام دریافت شدہ مذکورہ خط کا مضمون دو تین خطوں میں اور بھی ملتا ہے بالخصوص قیصر کے نام جو خط ہے اس کے بھی الفاظ یہی ہیں پس فرق یہ ہے کہ مقوقس کے نام خط میں **عليك اثم القبط** ہے اور قیصر کے خط میں **عليك اثم الاريسيين** کا جملہ ہے باقی ابتدا سے انتہاء تک ایک ہی عبارت ہے[۲]۔ اتفاق سے دریافت شدہ خطوط میں تحریر بھی ایک ہی کاتب کے قلم سے ہے، جس کی وجہ سے کچھ یہودی مستشرقین کو یہ موقعہ ملا کہ ان خطوط کو جعلی ثابت کریں لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ عیسائیوں کے سربرآوردہ اور ممتاز افراد کو جو خطوط لکھے گئے چونکہ مخاطبین سب ایک ہی ذہن وفکر کے ہیں، سب کا مذہب بھی ایک ہی ہے، اور سب کو دین عیسوی کو چھوڑ کر اسلام کی دعوت دینی ہے اس لئے قدرتی طور پر ہر ایک مضمون ایک ہی ہونا چاہئے تھا اس لئے اگر عیسائیوں کے نام لکھے گئے خطوط میں ایک ہی مضمون ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے یہ اس کی جعلی ہونے کی دلیل کیسے بن گئی؟ کیونکہ ہر ایک سے وہی بات کہنی تھی جو خط میں مذکور ہے اور یہ بھی شک وشبہہ کی بات نہیں کہ تمام خطوں کی تحریر یکساں ہے، ہوسکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے نام متعدد خطوط ایک ہی کاتب سے لکھوائے ہوں، یہ تو روزمرہ کا تجربہ ہے آج بھی تمام دفاتر میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس دور میں نہ کاغذ تھا اور نہ پریس، نہ

---

۱۔ مشکوٰۃ ص۳۴۰، ۳۴۱ بخاری جلد۱ ص۵، مسلم جلد۲ ص۹۷۔

۲۔ البدایہ والنہایہ ج۴ ص۲۷۲، زرقانی ج۳ ص۳۴۷۔

سا ئیکلواسٹائل کا وجود تھا نہ فوٹو اسٹیٹ کی سہولت، اس لئے ایک مضمون دے کر کاتب سے کہہ دیا گیا کہ اس کی اتنی کاپیاں تیار کر دو نام کی جگہ چھوڑ دینا، آج ہم سب روزمرہ یہی کرتے ہیں اس لئے اگر کئی خطوں کی تحریر ایک سی ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

دریافت شدہ نجاشی، مقوقس اور منذر بن ساویٰ کے خطوط پر جو مہر ہے وہ ٹھیک وہی ہے جس کی تفصیل حدیثوں میں مذکور ہے۔ بخاری میں جو روایت ہے اس کے الفاظ ہیں **كان نقش الخاتم ثلثة اسطر محمد سطر، ورسول سطر و الله سطر**[1].

یعنی لفظ محمد اس کے اوپر کی سطر میں لفظ رسول اور اس کے اوپر کی سطر میں لفظ اللہ منقوش تھا دریافت شدہ خط پر وہی مہر ہے، اگر خط جعلی ہوتا تو مہر کی قلم سے نقل نہیں ہو سکتی تھی، اس طرح محقق علماء اور ماہرین اثریات نے دلائل سے دریافت شدہ تینوں خطوط کے اصل ہونے کو ثابت کیا ہے۔

## سرکار رسالت مآب کا ایک اور خط

تیسرا خط امتداد زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گیا تھا اس کی دریافت ابھی دمشق میں ہوئی ایک فرانسیسی مستشرق نے مسلمانوں کے بھیس میں جا کر کسی گھرانے سے حاصل کیا ہے، یہ خط منذر بن ساویٰ کے نام ہے جو حکومت ایران کی جانب سے بحرین کا گورنر تھا اس خط کے اصل ہونے پر نا قابل تردید دلائل وشواہد پیش کئے گئے ہیں یہ خط بھی جھلی پر لکھا ہوا ہے اور ٹھیک وہی عبارت ہے جو تاریخوں اور روایتوں میں پائی جاتی ہے[2]، ماہرین اثریات نے جھلی اور روشنائی وغیرہ کی قدامت کو تسلیم کیا ہے۔

## ڈھائی سو مکاتیب نبویؐ

اسی طرح عرب سے باہر قیصر روم کے ساتھ ایران کے بادشاہ کسریٰ کے نام بھی

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۷۸، کتاب اللباس باب الخاتم، بخاری جلد ۲ ص ۸۷۳۔

[2] فتوح البلدان (بلادری) ایڈیشن ۱۹۸۷ء ص ۱۰۸۔

آپ کا خط روایتوں میں بہ تصریح موجود ہے اور خط لے جانے والے صحابی کا نام بھی وہیں مذکور ہے، مغرور کسریٰ نے خط چاک کر کے اس کی بے حرمتی کی تو اس پر آپ نے بددعا فرمائی[۱]۔

کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر باذام کو حکم بھیجا کہ دو مضبوط اور طاقتور آدمیوں کو مدینہ بھیج کر اس شخص کو گرفتار کرو جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور گرفتاری کے بعد میرے پاس بھیج دو، باذام نے دو آدمیوں کو مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مدینہ سے واپس جا کر باذام سے صورت حال بیان کی تو اس کے دل نے کہا کہ وہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، خود بھی مسلمان ہو گیا اور ایران کے جتنے لوگ سرکاری دفاتر میں کام یا یمن میں تجارت کرتے تھے سب کے سب مسلمان ہو گئے[۲]۔

اب تک ان خطوط کا ذکر ہوا جن کے مضامین روایتوں میں موجود ہیں، ان کے علاوہ بہت زیادہ خطوط وہ ہیں جن کی تفصیل نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں کہاں بھیجے گئے، مشہور ماہر مخطوطات واثریات ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی تحقیق وتفتیش کے بعد ان کی تخمینی تعداد ڈھائی سو بتائی ہے، یہ تمام خطوط آپ کی وفات سے چار پانچ سال پہلے لکھے گئے ہیں جب کہ ابھی عرب کا بیشتر علاقہ نخل اسلام کی چھاؤں میں نہیں آیا تھا اور جس وقت بیرون عرب خطوط لکھے جا رہے تھے عرب میں مسلمانوں کی تعداد بہت مختصر تھی، کیونکہ ٦ ھ میں جب آپ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں میں یہ خبر عام ہوئی تو ہر مسلمان حضورؐ کی معیت میں مکہ جا کر عمرہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کے باوجود صرف ۱۴ سو صحابہ کرام آپ کے ساتھ اس سفر میں تھے[۳]۔ اسی سے ٦ ھ میں عرب میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ ابھی بہت بڑے پیمانے پر دعوت وتبلیغ کا کام خود عرب میں باقی تھا اس کے باوجود آپ نے عرب کے باہر تک

---

۱ مشکوٰۃ ص ۳۴۱، بخاری جلد ۲ ص ۶۷۳، کتاب الجہاد باب کتاب النبی الٰی قیصر وکسریٰ، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۹

۲ البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۹، ۲۷۰۔

۳ مشکوٰۃ ص ۲۵۰، کتاب الجہاد باب قسمۃ الغنائم، بعض روایتوں میں ۱۵ سو کی تعداد مذکور ہے۔ دیکھئے ابوداؤد جلد ثانی ص ۳۷۵، کتاب الجہاد باب فی اسہم لہ سہم۔

دعوت و تبلیغ کے دائرے کو وسیع فرمادیا، صرف اس لئے کہ وحی الٰہی نے آپ کو مطلع کردیا تھا کہ سابقہ انبیاء کے برخلاف آپ سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی بنائے گئے ہیں، خود آپ کا ارشاد ہے۔

**كان النبي يبعث الیٰ قومه خاصة وبعثت الى الناس كافة**[1].

انبیاء سابقین صرف اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے اور میں سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

## عربوں کی اصلاح پر خصوصی توجہ کی وجہ

یہ حقیقت ہے کہ آپ نے پورے جزیرۂ عرب کو اسلام کے دامن میں سمیٹ لینے کی جدوجہد فرمائی تاکہ مستقبل میں اس کو اسلام کا مضبوط مرکز بنایا جاسکے اس لئے سرزمین عرب میں سوائے توحید پرستوں کے کسی کو سکونت کی اجازت نہیں دی، اور آپ نے صحابہ کرام کو وصیت فرمائی **اخرجوا اليهود والنصاریٰ من جزيرة العرب.** یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا۔

اسی کے ساتھ مشرکین کو بھی نکال دینے کا حکم فرمایا جو اپنے خبث باطنی کی وجہ سے کسی حال میں ایمان نہیں لا سکتے تھے، ان کے علاوہ عام مشرکین کا حال یہ تھا کہ وہ جس تیزی کے ساتھ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اس سے یہ یقین بڑھتا جارہا تھا کہ چند برسوں میں پورے عرب میں سوائے توحید پرستوں کے بت پرستوں میں سے کوئی باقی نہیں رہ جائے گا، قرآن میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے **ورأيت الناس يدخلون فی دين الله افواجا.** حجۃ الوداع ۱۰ھ کے موقعہ پر یہ خیال حقیقت بن کر سامنے آگیا، آپ نے اپنے مشہور خطبہ میں یہ جملہ بھی کہا تھا۔

**الا، ان الشيطان قد اَيِسَ ان يعبد فی بلدكم هذا**[2].

---

[1] بخاری شریف جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب جعلت لی الارض مسحد او طهورا ص ۶۲۔

[2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۹۸، ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

سن لو، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے شہر میں اس کی پرستش ہو۔

ان حالات میں یہودیوں اور نصرانیوں کا جو درحقیقت مشرکوں کے حکم میں آچکے تھے باقی رکھنا ایک رسول کے لئے کیسے ممکن تھا جس کی شریعت دوسری تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے، چونکہ فطرت اور ان کے مخصوص ذہن ومزاج کی وجہ سے ان کا ایمان قبول کرنا ناممکن تھا اس لئے سفر آخرت سے پہلے آپ نے صحابہ کرام کو وصیت فرمائی کہ ان دونوں قوموں کو سرزمین توحید سے باہر کر دینا تمہارا فرض ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں پورے عرب کا مسلمان ہونا ضروری تھا اس لئے ان پر پوری توانائیاں صرف کی جارہی تھیں، جس اسلام کو مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے آخری کناروں تک پہنچنا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے جوش عمل اور قوت کارکردگی سے بھرپور جماعت کی ضرورت ہے جس پر مستقبل میں اشاعتِ اسلام کی ذمہ داری آنے والی ہے اس لئے آپ نے ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کا مکمل نمونہ اور ایمان کی زندہ، متحرک اور چلتی پھرتی تصویر بن جائیں تاکہ ان کے اخلاق واعمال بلکہ صرف ان کی صورتوں کو دیکھ کر دوسروں کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہو جائے۔

تاریخ کی شہادت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں ایسی جماعت پیدا کر دی جس نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر دیا۔ اور فیضان نبوت کو روئے زمین کے کناروں تک پہنچا دیا۔ یہ اسی مقدس وبابرکت جماعت کی مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ دنیا کا کوئی قابل ذکر ملک ایسا نہیں جہاں **لا الٰہ الا اللّٰہ** کے ساتھ **محمّد رسول اللّٰہ** کی شہادت دینے والے موجود نہ ہوں۔

## ایک اور شہادت

میری اس تفصیلی گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی عالمی ذمہ داریوں سے ہر دور میں آگاہ تھے اور اسی نقطہ نگاہ سے دعوت وتبلیغ بھی فرمائی، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۲۳ سالہ دور نبوت میں آپ عرب سے باہر کبھی تشریف نہیں لے گئے اور روئے زمین پر بسنے والے سارے انسانوں تک بھی ابھی آپ کا پیغام نہیں پہنچا تھا، البتہ اس کی داغ بیل ڈال دی گئی تھی۔

جس طرح ایک مدبر سیاستداں مستقبل کا خاکہ بناتا ہے، کام کا نقشہ مرتب کرتا ہے، طریقہ کار کی تعیین کرتا ہے اور مخلص وجاں نثار اور قائد کے نظریہ پر مستحکم یقین رکھنے والی جماعت بنا کر اس کو راہ کے نشیب وفراز سمجھاتا ہے اور ہدایات دیتا ہے تاکہ آئندہ اس خاکہ میں اس کی منشاء کے مطابق رنگ بھر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی اصول پر اپنی امت کی ترتیب فرمائی اور پورے جزیرۂ عرب میں اسلامی زندگی کو اتنا مستحکم بنادیا کہ وہ شکست وریخت کا شکار نہ ہوسکے اور اس کو اتنا جوش عمل، عظمت کردار اور قوت کارکردگی سے بھردیا کہ وہ مستقبل کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لائق ہوگئی، تب آپ نے اپنی تربیت کردہ جماعت کو جمع کرکے ایک عام وصیت فرمائی، جس کی روایتوں اور تاریخوں میں خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ خطبہ حج کا رکن نہیں تھا، آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد حج کے اس اجتماع میں میں شریک نہ ہوسکوں گا اس لئے آپ نے پوری امت کو آخری وصیت فرمائی اور ایک لاکھ ۲۴ ہزار کے مجمع کو خطاب فرماتے ہوئے کہا: **لَعَلّی لا اراکم بعد عامی هذا**[1] شاید اس سال کے بعد میں تمہیں یہاں نہ دیکھ سکوں، اسی جملہ کی وجہ سے محدثین نے اُسے وصیت عامہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے آپ نے صرف ایک چھوٹے سے جملہ میں ان کے فرض کو بتادیا **فیبلغ الشاهد الغائب** جو لوگ میری باتیں سن رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ میری باتیں میرا پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو لوگ یہاں موجود نہیں ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۵ ص۱۸۴، بخاری ج۱ ص۲۳۴، کتاب المناسک باب الخطبہ ایام منیٰ، مسلم شریف کتاب الحج باب حجة النبی دلائل النبوۃ (بیہقی) تاریخ یعقوبی ۲ ص۱۲۳ المستدرک للحاکم ص۱۹۳، ابوداؤد کتاب الحج باب صفة حج النبی وغیرہ۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عرب اپنی جہالت اور وحشت و بربریت کے باوجود انتہائی مغرور تھا اپنی زبان، اپنی نسل، اپنے نسب میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا اور مستقبل میں اشاعت اسلام کی ذمہ داری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سپرد کرنے والے ہیں، اس لئے عربوں کے فخر وغرور کو توڑ کر ان کو اس لائق بنانا ضروری تھا کہ وہ اس فریضہ کو منشاء رسول کے مطابق پورا کر سکیں، نسل ونسب کا انتہا پسندانہ غرور عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور اب ان کو عرب سے باہر اشاعتِ اسلام کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جانا ہے اس لئے اسلامی دستور ان کو ذہن نشین کرا دیا گیا، آپ نے فرمایا:

**ایھا الناس! لا، ان ربکم واحد وان اباکم واحد لا، لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ**[1].

لوگو! خوب غور سے سن لو، تمہارا رب ایک ہے اور بلاشبہ تمہارا باپ ایک ہے غور سے سنو، کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

یہ الفاظ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ اسلام صرف عرب ہی کے لئے نہیں ہے یہ حبش کے کالوں میں بھی پہنچے گا اور یورپ کے گوروں میں بھی، مصر کے قبطیوں، افریقہ کے بربروں اور ایشیا اور ترکستان کے سرخ رنگ والوں تک اس کا پہنچنا ضروری ہے جب سوا لاکھ مخلص جاں نثار عربوں کی جماعت کلی طور پر تربیت پا چکی تو آپ نے اس کو حکم دیا **ولیبلغ الشاھد الغائب**[2]. میرا پیغام ان لوگوں کو پہنچانا جو یہاں نہیں ہیں یعنی میرا پیغام ہواؤں میں اڑ کر سمندروں میں تیر کر پہاڑوں کو عبور کر کے دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا اب تمہاری ذمہ داری ہے، تاریخ غیر مبہم لفظوں میں گواہی دیتی ہے

---

[1] تاریخ یعقوبی مطبوعہ دارصادر ج۲ ص۱۰۹، مسند احمد بن حنبل.

[2] بخاری ج۱ ص۲۳۴، کتاب المناسك باب الخطبة ایام منیٰ.

کہ صحابہ کرام نے منشاء رسول کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا اور اسلام کے پیغام کو وہاں تک پہنچایا جہاں تک اس دور میں طائرِ فکر بھی اڑ کر نہیں پہنچتا تھا، ان تمام حقائق کے باوجود ڈی اولیری کا یہ دعویٰ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف عربوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، کتنا سطحی و کتنا لچر کتنا لغو اور بے بنیاد ہے۔

## اسلامی فقہ رومن لا سے ماخوذ ہے

ڈی اولیری نے اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کے مذہب کی انفرادیت وعظمت اس کی امتیازی خصوصیات اور اس کے تقدس وطہارت کو داغدار بنانے کے لئے یہ الزام لگایا ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی فقہ رومن لاء کا چربہ ہے، مسلمانوں کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے، دوسرے ملکوں کو جب فتح کیا تو وہاں کے نافذ العمل دستور، طور طریق اور رسم ورواج کو اپنا لیا بالخصوص شام کی فتح کے بعد عیسائیوں کے دیوانی وفوجداری قوانین کو اپنا کر اس کو اسلامی فقہ کا نام دے دیا ہے، لیکن اپنے اس دعویٰ پر بھی اس نے کوئی دلیل نہیں دی ہے جیسا کہ پوری کتاب میں اس نے کیا ہے۔

یہ الزام واتہام کچھ نیا نہیں ہے، اس سے پہلے مسٹر شیلڈن ایموز ( SHELDN AMAS) نے جو لندن یونیورسٹی میں لکچرار تھے اسلام پر یہی الزام لگایا ہے اور اس کو ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کیا ہے[1]، ڈی اولیری کا بیان اسی کی صدائے بازگشت ہے، اس لئے ہمیں اس کو پڑھ کر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

## حقیقت کیا ہے؟

انسان سماج کے چوکھٹے سے باہر نہیں جاسکتا، سماج کے مسائل سے دوچار ہونا ناگریز ہے، آغاز تمدن کی تاریخ ہی سماجی مسائل کی پیدائش کی تاریخ ہے، انسانوں کے ذہن ومزاج طبعی جذبات ومیلانات میں اختلاف ہونا ضروری ہے انھیں اسباب کی

[1] شیلڈن ایموز انیسویں صدی کی آخری دہائی ۱۸۹۳ء میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں لیکچرار تھے انھوں نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔

وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے رہے ہیں یہ آغاز آفرینش سے ہے ہابیل قابیل کا واقعہ اس کی سب سے بڑی شہادت ہے[۱]۔ مسائل جب پیدا ہوئے تو ہر دور میں ان کو حل کرنے کی کوششوں کا بھی سلسلہ جاری رہا، ثالث، حکم، پنچائت، قبائلی دستور، برادرانہ رسم ورواج کئی صورتیں تھی جن کے ذریعہ سماجی معاملات کا فیصلہ کیا جاتا تھا جب تمدن آگے بڑھا، مدنیت ترقی کی راہوں میں گامزن ہوئی تو باقاعدہ ضابطہ وقانون، دستور اور اصول مرتب کئے گئے اس لئے فوجداری اور دیوانی وغیرہ کے قوانین ہمیشہ سے موجود رہے ہیں بس فرق یہ تھا کہ ابتداءً وہ بہت سادہ شکل میں تھے، بعد میں ان کو سائنٹفک اصولوں کے تحت مدون کیا گیا۔

ہمیں اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی تأمل نہیں کہ عہد رسالت میں روم وایران کا تمدن بڑی حد تک ترقی پذیر تھا، حکومت کے قوانین ایک حد تک نافذ العمل تھے، اگرچہ شہنشاہیت (امپریلزم) ہونے کی وجہ سے بادشاہ کا ہر حکم قانون بن جاتا تھا اس کے علاوہ ان قانونی حکومتوں کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کی ذات قانون سے بالاتر تصور کی جاتی تھی جسکی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں چوری، ڈکیتی، قتل، آبروریزی، فریب دھوکہ دہی، غصب، خیانت، بددیانتی وغیرہ ہر سماج میں مذموم، قابل سزا جرم تھے۔ ہر سماج اس کا انسداد اور مجرم کو سزا دینے کے اپنے اصول رکھتا تھا اور اس کے مطابق معاملات کا تصفیہ کیا جاتا تھا اور جب تمدن ذرا آگے بڑھا تو ان رواجوں کو قانونی شکل دے دی اور ان کے مطابق دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل کئے جانے لگے۔

جرائم کا وجود ہر دور میں رہا، ان کے انسداد کی کوشش کرنے والے اور مجرم کو سزا دینے والے بھی ہر زمانہ میں رہے اس لئے بہت سے جرموں کی سزا دور دور کے قانون میں اگر ایک ہے تو اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بعد کا قانون پہلے قانون ہی کی وجہ سے وجود میں آیا، اسی طرح انسانی حقوق میں غصب اور حق تلفی سے کمزور

---

۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۱، الآیۃ سورہ مائدہ، آیت ۲۸۔

افراد کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر زمانہ میں دستور بنائے گئے اس لئے اگر دونوں زمانوں میں ایک ہی طرح سے ان مسائل کو حل کیا گیا تو اس کے معنی نہیں کہ پہلا قانون دیکھ کر بعد کا قانون بنایا گیا بلکہ زیادہ تر ایسا ہوا کہ بعد کے قانون سازوں کو پہلے کے قانون کی خبر تک نہیں ہوتی تھی اتفاق سے انہوں نے جو قانون وضع کیا وہ ٹھیک وہی ہے جو پہلے کسی ملک یا حکومت میں نافذ تھا تو اس کو توارد کہا جاسکتا ہے سرقہ سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسلمانوں کے دیوانی اور فوجداری قوانین کا حال ہے، اگر اسلام کے کچھ قوانین رومن لاء کے مطابق ہیں تو اس کی وجہ سے یہ طعنہ نہیں دیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے پاس فقہ کے نام سے قوانین کا جو مجموعہ ہے وہ سب کا سب رومن لاء سے ماخوذ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے متعلق ہزاروں مسائل ہیں جن کا حل اسلامی فقہ میں کیا گیا ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے، اور ہزاروں صفحات میں یہ قوانین پھیلے ہوئے ہیں تو کیا تم یہ کہو گے کہ یہ بھی رومن لاء سے ماخوذ ہیں؟ یہ موشگافیاں، دقیقہ رسی، باریک بینی جو ان قوانین کی تشکیل میں کارفرما ہے کیا اس سے یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ جو لوگ ہزاروں مذہبی قوانین اتنی دقتِ نظر اور دماغ سوزی سے بنا سکتے ہیں دیوانی اور فوجداری کے قوانین کی تشکیل کے وقت ان کی ذہانت وفطانت ان کی ذکاوت ونکتہ رسی اور دقت نظری ناکام ہو جائے گی؟

## اسلامی دستور وقوانین کا ماخذ

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے ماخذ دو ہیں قرآن اور حدیث، ان دونوں سے بے نیاز ہو کر اگر کوئی قانون بنایا جائے گا تو وہ اسلامی عدالت میں قابلِ قبول نہیں ہوگا، جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل ہیں سب کی اصل قرآن اور احادیث سے ثابت ہے بالکل اسی طرح دیوانی اور فوجداری قوانین کے

لئے سب سے پہلے قرآن وحدیث میں اس کی اصل تلاش کرنا ضروری ہے جب اصل دریافت ہو جاتی ہے تو اس کی روشنی میں کوئی قانون وضع کیا جات ہے، خرید وفروخت کاروبار تجارت، وراثت ووصیت، نکاح وطلاق، خلع، ہبہ ونفقہ، حق شفعہ، وکالت اور حق ملکیت، قبضۂ غاصبانہ غرضیکہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے سارے مسائل کے لئے جو اسلامی قوانین ہیں ان کی اصل پہلے قرآن وحدیث میں تلاش کرنے کے بعد اس پر تفریعات کی جاتی ہیں اور اس کی جزئیات مرتب کی جاتی ہیں اگر کوئی بھی تفریع اصول حدیث سے مزاحم ہوتی ہے تو وہ قانون کی شکل اختیار ہی نہیں کرسکتی، اس لئے مسلمانوں نے انسانی سماج کے مسائل کے حل کے لئے کسی دوسرے ملک کے قانون کو کبھی بھی کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ دوسروں کے قوانین سے استفادہ کیا جائے، مجتہدین اور ائمہ فقہ نے انتہائی باریک بینی سے قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں بہت سے اصول مرتب کئے، انھیں اصولوں کی روشنی میں قوانین بنائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے قابل ذکر چار مکتبہ فکر ہیں ان کے امام ابوحنیفہ، امام مالک، احمد بن حنبل اور امام شافعی ہیں جو اسلامی فقہ یا دوسرے لفظوں میں اسلامی قوانین کو مرتب کرنے والے ہیں۔ ان میں سے نہ کسی نے رومن لاء پڑھا، نہ دیکھا نہ اس نیت سے ان علاقوں میں گئے جہاں رومن لاء نافذ تھا اس لئے ان حضرات کی واقفیت رومن لاء سے صفر کے برابر ہے، لیکن اس کے باوجود تنہا امام ابوحنیفہ نے جتنا بڑا ذخیرہ فقہ کا جمع کیا ہے ڈی اولیری اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، انھوں نے جو فقہ اکیڈمی قائم کی اس نے اتنا عظیم الشان مجموعہ قوانین مرتب کیا کہ آج دنیا میں حنفی قوانین کو بالادستی حاصل ہے اور سب سے زیادہ انھیں کے قوانین پر عمل کرنے والے مسلمان ہیں، ان کی اکیڈمی کا ایک رکن بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی رومن لاء کی کوئی کتاب پڑھی ہو اور نہ عملی طور پر کبھی اس کے نفاذ کا مشاہدہ کیا ہو، استنباط مسائل اور استخراج نتائج میں امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے درمیان

بہت سے مسائل میں اختلاف رائے بھی ہوتا تھا جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس اختلاف کی جب آپ تلاش کریں گے تو اس میں رومن لاء کا تذکرہ کہیں نہیں آئے گا، کسی حدیث یا روایت سے استخراج واستنباط کے سلسلہ میں نقطۂ نگاہ کا فرق نظر آئے گا، ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے، اگر ڈی اولیری ماہر قانون تھا اور اس کا مطالعہ رومن لاء اور اسلامی قانون کا مکمل تھا تو تقابلی مطالعہ اور دونوں میں موازنہ کر کے ثابت کرتا تو اس کا دعویٰ قدرے قابل سماعت ہوتا، پھر بھی یہ امکان باقی رہ جاتا کہ قرآن وحدیث سے جو قانون اخذ کیا گیا اس سے پہلے رومیوں کے یہاں بھی اتفاق سے یہی قانون تھا اس وقت صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ رومن لاء بھی اس مسئلہ خاص میں حدیث وقرآن کے قانون کے مطابق ہے، اور بس۔

اسلامی فقہ کی ترتیب کا زمانہ بھی وہ ہے جب مسلمانوں کا نیر اقبال عروج پر تھا اور اپنی پوری تابانی کے ساتھ دنیا کے سروں پر چمک رہا تھا جس کو دیکھ کر دوسروں کی آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں، اس لئے مسلمانوں کو اپنی عظمت کا احساس تھا اور یہ احساس برتری جائز طور پر تھا، اس لئے قرآن وحدیث کے سامنے کسی قانون کی عظمت واہمیت کا ان کے دلوں میں خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا غیر مسلموں کے طور طریق، رسم ورواج اور دستور وقانون کو وہ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس لئے اس سے استفادہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔؟

## عربوں نے تراجم کے ذریعہ دوسروں کے علوم وفنون کو اپنالیا

رومن لاء سے اسلامی فقہ ماخوذ ہونے کا دعویٰ کرنے والے ڈی اولیری اور شیلڈن ایموز اور بعض دوسرے مستشرقین اپنے دعویٰ کی دلیل میں کہتے ہیں کہ عہد رسالت اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسلام کے پاس بہت مختصر اور سادہ قوانین تھے جہاں جو دستور دیکھا اس میں تھوڑا بہت تغیر کر کے اس کو اپنا قانون بنالیا، سب

سے زیادہ استفادہ دوسری زبانوں کے علوم کو عربی میں منتقل کر کے مسلمانوں نے کیا ہے، مسلمانوں کی حکومت جب مستحکم ہوگئی تو انھوں نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو عربی میں منتقل کرنے کی ایک مہم چلائی اور سیکڑوں کتابیں یونان، مصر، روم اور شام وغیرہ سے منگا کر ترجمہ کرڈالیں، ان تراجم نے ان کو قانون سازی کا مسالہ بھی فراہم کیا اور اس کی مدد سے اسلامی فقہ کا اتنا بڑا تاج محل کھڑا کردیا، اس سے پہلے ان قوانین کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔

یہ بہت بڑا فریب اور جھوٹ ہے، علمی خیانت اور تحقیق ومطالعہ میں بددیانتی کا مظاہرہ ہے، تاریخ کا ہر طالب اس دعویٰ کی سچائی سے قطعی انکار کردے گا، دنیا جانتی ہے اور تاریخ کی تمام کتابیں اس کی شاہد عدل ہیں کہ ترجمہ کا کام اور دوسروں کے علوم وفنون کو عربی میں منتقل کرنے کا کام عہد عباسیہ میں ہارون رشید (متوفی ۱۹۳ھ) نے شروع کیا اس نے بیت الحکمۃ کے نام سے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔

جس میں طب، علاج معالجہ، جڑی بوٹیوں کی کتابیں، منطق فلسفہ اور مختلف زبانوں کی کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ کرایا، اس کے عہد میں کسی بھی قانون کی کوئی کتاب ترجمہ نہیں کی گئی، ہم ان تمام ترجمہ کرنے والوں سے بھی واقف ہیں اور جتنی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں ان کی نام بنام فہرست بھی ہماری تاریخوں میں موجود ہے۔

ہارون رشید سے بھی بڑے پیمانے پر تراجم کا کام مامون (متوفی ۲۱۸ھ) نے شروع کرایا، اس نے نسطوری، یعقوبی، صابی، مجوسی، رومی اور براہمہ ہر مذہب کے عالموں کو جمع کر کے یونانی، فارسی، سریانی، سنسکرت، نبطی، لاطینی زبانوں کی کتابیں ترجمہ کرائیں اور کوئی شبہہ نہیں کہ مترجم کتابوں کی فہرست سیکڑوں میں ہے، ان تمام کتابوں کی بھی مفصل فہرست ہماری تاریخوں میں محفوظ ہے اس میں فلسفہ، طب، ہندسہ، ہیئت، نجوم، کیمیا، صنعت وحرفت، تاریخ، ناول اور قصے کہانیوں کی کتابیں اور بعض سوانح عمریاں ہیں، لیکن اس دور میں بھی قانون کی کسی کتاب کا بھی عربی میں ترجمہ نہیں کیا گیا، بلکہ ان ترجموں سے برسہا برس پہلے اسلامی فقہ مرتب ہوکر سارے

اسلامی ممالک میں پھیل چکی تھی اور عدالتوں میں اسی کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور جب دارالترجمہ قائم ہوا اس وقت اسلامی فقہ کے مرتبین اپنا کام مکمل کر کے سفر آخرت پر جا چکے تھے امام ابوحنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ، امام مالکؒ متوفی ۱۷۹ھ، امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ، اور امام احمد بن حنبلؒ متوفی ۲۴۱ھ میں سے صرف امام احمد بن حنبل اس دنیا میں تھے اور حکومت کے جیل خانے میں ان پر کوڑے برسائے جا رہے تھے، ان کی فقہ دوسری صدی کے آخر میں مرتب ہو چکی تھی، ان تمام حقائق کے باوجود اگر کوئی مدعی قانون کی کسی ایک بھی کتاب کا نام لے سکتا ہے تو اس کو پیش کرنا چاہئے، یقین کر لیجئے کہ وہ کبھی بھی پیش نہیں کر سکے گا، **حتی یلج الجمل فی سم الخیاط.**

## قرآن میں بہت تھوڑے قوانین ہیں

ڈی اولیری نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے، دلیل کا اس کی کتاب میں دور دور کہیں پتہ نہیں، اس لئے میرا خیال ہے کہ اس نے شیلڈن ایموز کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اس کا اپنا کوئی مطالعہ نہیں ہے، البتہ شیلڈن ایموز ضرور یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے دستور کی کتاب قرآن ہے اور قرآن میں دس بارہ قوانین ہیں اور ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اتنا بڑا دعویٰ کہ وہ رومن لاء اور اسلامی قوانین کے تقابلی مطالعہ کے قابلِ فخر منصب پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کو پتہ نہیں کہ قرآن میں کچھ کم وبیش پانچ سو آیات احکام ہیں[۱]، اگر تم کہو کہ ان میں بیشتر عبادات سے متعلق ہیں تب بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک سو سے زائد اصولی قوانین قرآن میں موجود ہیں، علماء نے آیاتِ احکام کو علحدہ جمع بھی کر دیا ہے ان میں بیشتر اصول ہیں ان کی تفریعات کی جائیں تو ہزاروں دفعات پر مشتمل ہونگی، رومن لاء سے ہم واقف نہیں، اسلامی قوانین تو ہمارے گھر کی چیز ہے۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن مصنفہ حجۃ الاسلام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی متوفی ۳۷۰ھ جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

شیلڈن ایموز نے اس موقعہ پر حدیث کا ذکر قصداً چھوڑ دیا ہے جب کہ قرآن کے بعد اسلامی قوانین کا دوسرا بڑا ماخذ احادیث ہیں احادیث کی حیثیت وحی غیر متلو کی ہے احادیث سے جتنے احکام مستنبط ہوتے ہیں وہ منشاء الٰہی کے مطابق اور واجب العمل قوانین ہیں، دنیا جانتی ہے کہ قرآن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا حکم موجود ہے مگر یہ فرائض کس طرح ادا کئے جائیں اس کی تفصیلات احادیث بتاتی ہیں اس لئے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ مسلمانوں کے قوانین کا ماخذ صرف قرآن نہیں حدیث بھی ہے، قرآن اور حدیث دونوں کے مجموعے سے ائمہ مجتہدین کی ذہانت وفطانت اور فطری ذکاوت نے اسلامی فقہ کے ہزاروں قوانین مستنبط کئے باریک بینی سے غور کروگے اور تلاش کروگے تو ہر قانون کی اصل حدیث اور قرآن میں مل جائے گی۔

اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی فقہ کا رومن لاء سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ یہ سارا ذخیرہ حدیث وقرآن کے اصولوں سے مستنبط کیا گیا ہے، جہاں کہیں کسی اصل کی دریافت سے عقل انسانی قاصر رہ گئی وہاں اجماع اور قیاس سے کام لیا گیا کسی دوسرے مجموعہ قوانین سے استفادہ کا نہ کبھی تصور پیدا ہوا اور نہ ائمہ مجتہدین کو اس کی ضرورت تھی اور سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کچھ ایسے اسلامی قوانین ہیں جو رومن لاء میں پہلے سے موجود تھے اس سے کون انکار کرتا ہے اور نہ انکار کرنے کی کوئی ضرورت ہے، سماج کے مسائل مشترک ہیں، ان مسائل کا حل بھی اگر کہیں کہیں مشترک ہوگیا تو کون سی حیرت کی بات ہے، اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ بعد والا قانون پہلے قانون کا سکنڈ ایڈیشن ہے، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو فہم وفراست کے لحاظ سے مفلوج اور تاریخی حقائق سے نابلد ہے۔

## تبلیغ ودعوت اسلام کا بنیادی پہلو

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے تو حکم الٰہی کے مطابق آپ نے

اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا، آغاز نبوت کی ان سرگرمیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈی اولیری کا لب ولہجہ بڑا ہی دلخراش ہے وہ اسلام کے آغاز کو ایک مقدس مذہب کا آغاز نہیں سمجھتا ہے اور نہ کہتا ہے، یہ تو اس کی فطرت کا تقاضا تھا لیکن انسانیت وشرافت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں کہ اپنے مخالف یا دشمن کے بارے میں بھی کچھ کہو تو انسانیت کو ملحوظ رکھو لفظوں کو زہر آلود تیر نہ بناؤ، ناشائستہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ، لیکن ڈی اولیری نے اخلاقیات کا یہ باب شاید نہیں پڑھا ہے اور اس نے ایک عظیم الشان وعظیم المرتبت مذہب کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو جاہ وجلال اور عظمت واحترام سے بھری ہوئی اپنی ایک عظیم الشان تاریخ لکھتا ہے، جس نے یورپ کے ظلمت کدوں کو علم وتہذیب کی روشنی خیرات دی اور اس وقت اس کو تہذیب وتمدن کا سبق پڑھایا جب وہ تہذیب وتمدن کے لفظ سے بھی نا آشنا تھا اور آج اس کے ماننے والوں وراس کو خدا کا مقدس ترین مذہب ماننے والوں کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے، لیکن انسان کی فطرت غیر اختیاری طور پر بھی اس سے وہی بات کہلاتی ہے جو اس کے خمیر میں سمائی ہوئی ہے۔

وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تبلیغ کا دنیاوی پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم انھیں حجاز کے قبائل کو برادرانہ اتحاد میں مربوط کرنے کی کوشش کرنے، لوٹ مار کے دستور کو محدود کرنے اور ایک منظّم جماعت بنانے میں مصروف پاتے ہیں[1]۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اس کا مقصد خدا پرستی، خدا شناسی، گمراہ انسانیت کو مجدد شرافت کی راہوں پر لانا نہیں تھا، بلکہ دنیاوی پہلوان کی جدوجہد پر غالب تھا، وہ عرب کے قاتل، لٹیرے اور جنگجو بدوؤں کو بھائی بھائی کے نام پر ایک رشتہ میں پروکر ایک طاقتور اور متحدہ جماعت بنانا چاہتے تھے اور اس کی عنان قیادت اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے، تاکہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں

[1] فلسفۂ اسلام (ڈی اولیری) ص ۶۸۔

میں بٹ کر اپنی توانائیوں کو ضائع نہ کریں بلکہ لوٹ مار کا ایک ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا چاہتے تھے، اس لوٹ مار کو بند کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ اس کو محدود کرنا تھا، یعنی نعوذ باللہ لوٹ مار کرنے والے سماج میں خود سپر پاور کی حیثیت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

بدزبانی کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں اگر ہماری تاریخ ہماری روایات سے اس کی شہادت پیش کر دی جاتی تو ہم اس پر غور کرتے اور جواب دیتے، اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات وسرایا پر طنز کرنا ہے تو اس سے پہلے اس کو آپ کی نبوت کی ۱۳ سالہ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے تھا۔

مکہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین اور دعوت اسلام میں ۱۳ سال گذارے، ہر طرح مصیبتیں جھیلیں لیکن اقدام تو دور کی بات ہے مدافعت کا بھی حکم خدا کی طرف سے نہیں تھا، سروں پر قیامت گذرتی رہی مگر اُف کہنے کی بھی اجازت نہیں تھی، حضرت عمار بن یاسر کی والدہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مسلمان ہونے کی جرم میں روح کو کپکپا دینے والی سزا دیکر بیدردی کے ساتھ قتل کرنا، سارے مسلمانوں کو لرزا دینے والا تھا[1] حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مار مار کر بچھا دینا، تپتے ہوئے ریت پر چت لٹا کر ان کے سینہ پر پتھر کی بھاری سل رکھ دینا[2]، حضرت عثمانؓ کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں زہریلا دھواں دینا، حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پورے بدن کو آگ میں دہکائی ہوئی لوہے کی چھڑوں سے داغ دینا[3]، سیکڑوں مسلمانوں کا روز روز کی اذیتوں سے تنگ آ کر چپکے سے مکہ سے نکل کر حبشہ جانے پر مجبور ہونا، ان سارے کربناک اور دل دہلا دینے والے واقعات کے ساتھ ساتھ خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے کیسے مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے؟ خانہ کعبہ میں سجدہ کرتے ہوئے ایک اونٹ کی گندی وزنی اوجھ آپ کے اوپر

---

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۹، اس طرح کے سارے واقعات اسلامی تاریخ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔
۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۷۔ ۳۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۵۹۔

ڈال دی گئی جس کے بوجھ سے آپ اٹھ نہیں سکتے تھے، زخم پر نمک بھی چھڑکا جا رہا تھا، سرداران قریش اس بے بسی کو دیکھ کر ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے، حضرت فاطمہ کا دوڑ کر آنا اور کسی طرح اس وزنی اوجھ کو جسم مبارک سے گرانا بڑا ہی دردناک واقعہ ہے[۱]۔

آخر آخر میں سارے ہم نوا قبائل سے ایک ایک نوجوان کو تلوار لے کر بلانا کہ ایک ساتھ درجنوں تلواریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر پڑیں اور اس کو بوٹی بوٹی کر دیں تو آپ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور جب مکہ سے باہر نکلے تو آپؐ اور آپؐ کے رفیق سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا انعام ایک سو سرخ اونٹ مقرر ہونے کا اعلان کیا گیا اس انعام کے لالچ میں نیزے لے لیکر مشرکین دوڑ پڑے، لیکن آپ مدینہ پہنچ گئے۔

دشمن اگر قوی است　　　نگہبان قوی تر است

لیکن انعام کا اعلان اب بھی باقی تھا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاتل آناً فاناً مکہ کا سب سے بڑا رئیس بن جانے والا تھا، صحابہ کرام مدینہ میں باری مقرر کر کے رات بھر آپ کا پہرہ دیتے تھے۔

ان واقعات میں سے ہر واقعہ ایسا تھا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اس سے پورے عرب میں قبائلی جنگ چھڑ سکتی تھی اور مسلمان مغرور قریشیوں کو ان کی شرارتوں کا مزہ چکھا سکتے تھے، مسلمان اور مسلمانوں کا رسول اتنا بے بس نہیں تھا، تم کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب خانہ کعبہ کے متولی اور قریش کے سب سے زیادہ بااثر آدمی تھے، اطراف و جوانب کے قبائل ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اگر ان کے خاندان کا کوئی فرد ان قبائل سے اپنی مظلومیت کا اظہار کرتا تو بہت سے قبائل اختلاف مذہب کے باوجود اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور اس کے پشت پناہ بن جاتے، خود دیکھو ابوبکر صدیقؓ جب مکہ چھوڑ کر ایک بار جا رہے تھے تو

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۴۴۔

ایک قبیلہ کا سردار راستہ میں ملتا ہے تو کہتا ہے کہ آپ جیسا شریف آدمی مکہ چھوڑ دے یہ نہیں ہوسکتا، میں آپ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں کسی کی مجال نہیں کہ آپ پر انگلی اٹھا سکے[۱]، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر کئی قبیلے مشرکین قریش کے ہم نوا تھے تو کچھ قبیلے شرک پر قائم رہتے ہوئے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے حلیف تھے۔

قریش کے غرور کے محل کے کنگرے گرتے جا رہے تھے، اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ قریش کے مقابلے میں کسی قبیلے کا سردار اپنے کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور موقعہ پڑنے پر قریش کے چودھریوں کو ڈانٹ سکتا تھا قبیلہ یمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال کو مکہ والوں نے چھیڑا تو انھوں نے للکارا کہ اگر تم نے مرے جسم کو ایک انگلی بھی لگا دی تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ گیہوں کے ایک ایک دانے کو ترس جاؤ گے اور بھوکوں مر جاؤ گے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گیہوں لانے کی اجازت نہیں[۲] دی، ثمامہ یمامہ کے رہنے والے اور قبیلہ کے سردار تھے، مکہ میں سارا غلہ یمامہ ہی سے آتا تھا۔

اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدافعت پر آمادہ ہوتے تو کامیاب مدافعت کر سکتے تھے لیکن آپ کو قبیلوں کے سرداروں کی حمایت کی ضرورت نہیں تھی، محض طاقت فراہم کر کے غلبہ حاصل کرنا مقصود نہیں تھا، آپ خدا کے فرستادہ نبی تھے جو حکم الٰہی تھا اس کی پابندی کرتے تھے، اور اس وقت تک جہاد کا حکم نہیں آیا تھا، اس لئے یہ ساری قیامتیں سروں سے گذرتی رہیں لیکن سرداران قبائل سے نہ مدد طلب کی اور نہ فوجی طاقت بنائی، نہ تلوار اٹھائی۔

تاریخ کے ان حقائق کے باوجود ڈی اولیری سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن قدس پر دھبہ ڈالنے کی جسارت کرتا ہے کہ وہ لوٹ مار کو محدود کر کے اقتدار اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے ع

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

---

۱؎ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۹۴، ۹۵ پر مفصل واقعہ درج ہے۔

۲؎ مشکوٰۃ ص ۳۴۴، ۳۴۵ کتاب الجہاد باب حکم الاسراء۔

## عرب مسلمان عجمی مسلمان کو بھائی نہیں سمجھتے تھے

ڈی اولیری کا دماغ مسلمانوں پر صرف فرضی اور بے بنیاد الزامات لگانے میں مصروف ہے جیسے مغلوب الغضب آدمی اپنے مخالف کے بارے میں جھوٹے سے جھوٹے الزامات تراشتا ہے، اس کی کتاب میں ہر جگہ یہی انداز تحریر ملتا ہے، کہیں ثبوت وشہادت نہیں دیتا ہے، دو جملوں میں ایک جھوٹا الزام لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''بلاشبہ عرب مفتوح عجمی کو حلقہ بگوش اسلام ہو جانے پر بھی بھائی تسلیم کرنے پر مائل نہ تھا، اس کے نزدیک بیرون ممالک کی فتح کے معنی صرف بڑی بڑی جائیدادوں، بے شمار دولت اور غیر محدود قوت حاصل ہونے کے تھے، بنوامیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے مال گذاری میں کمی واقع ہوتی تھی[۱]۔

کوئی ثبوت؟ کوئی شہادت؟ مسلمانوں کی کسی جماعت کی طرف سے اس کے عملی اظہار کی مثال؟ ان میں سے کوئی بات نہیں کہتا ہے جیسے مصنف کے پاس الزام واتہام کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اسلام کی پوری تاریخ سونے کے حرفوں سے لکھی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اخوت ومساوات کا سب سے بڑا داعی ہے وہ سارے انسانوں کو ایک باپ کی اولاد سمجھتا ہے، اور ساری دنیا کو وہ اسی اخوت ومساوات کی تعلیم دیتا ہے، حجۃ الوداع کا خطبہ تاریخِ اسلام کا مشہور خطبہ ہے جو درحقیقت رسول اکرم ﷺ کی زندگی کی آخری وصیتیں ہیں جن میں آئندہ کوئی ترمیم کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا: کل کم بنی آدم، وادم من تراب سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں، قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، یہ اسلام کی تعلیم کا بہت روشن باب ہے اور عہد رسالت

---

[۱] فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۸۰۔

میں اخوت و مساوات کا ایسا حیرتناک نظارہ دنیا نے دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گئی۔

## اسلامی مواخات و مساوات

ہجرت کے بعد مکہ سے آنے والے سارے مہاجرین کو انصار کے ساتھ رشتۂ مواخاۃ میں پرو دیا گیا ہر مہاجر کسی انصاری کا بھائی بنا دیا گیا، یہ صرف رسمی بھائی چارہ نہیں تھا بلکہ ان کا سلوک ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تھا جیسا دو حقیقی بھائیوں میں ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میرے گھر میرے کھیت، اور میرے باغ میں آدھے کے تم مالک ہو اور میرے پاس دو بیویاں ہیں میں ان میں سے ایک کو طلاق دیدیتا ہوں تم اس سے نکاح کرلو[1] یعنی انصاری اور مہاجر بھائی بن کر بالکل ایک سطح پر آجائیں، ایسی مثالیں افراد میں شاید مل جائیں لیکن بحیثیت جماعت کے تم کو کہیں نہیں ملیں گی۔

## مکی اور مدنی میں فرق تھا

شاید تم یہ کہو کہ دونوں عربی النسل تھے مرتبہ میں ایک دوسرے کے برابر تھے اگر ایک نے دوسرے کو بھائی بنالیا تو یہ بہت زیادہ حیرتناک بات نہیں ہوئی، شاید تم نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ اعتراض ذہن میں پیدا نہ ہوتا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مکہ بالخصوص قریش کے لوگ مدینہ کے انصار کو اپنا ہم مرتبہ کم ہی سمجھتے تھے، مدینہ کے بعض قبائل میں ان کی رشتہ داریاں ضرور تھیں لیکن عام طور پر انصار کسان تھے اس لئے ان کو قریش کے لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو اپنے سے فروتر اور پست سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ بدر میں ملتا ہے۔

عفرا ایک انصاریہ خاتون ہیں ان کے دونوں لڑکوں نے جنگ بدر میں ابوجہل کو مار کر زمین پر بچھا دیا اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری سنادی حضورؐ نے عبداللہ بن

---

[1] سیرۃ المصطفیٰ جلد اول ص ۴۳۹ بحوالہ عیون الاثر ج ا ص ۲۰۱۔

مسعود کو بھیجا کہ دیکھو ابو جہل کا کیا حال ہے؟ ابن مسعود جب پہنچے تو ابھی وہ زندہ تھا اس کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچا اور کہا کہ تو وہی ابو جہل ہے؟ تو اس نے کہا کہ آج مجھ سے بڑا کوئی آدمی تم نے مارا بھی ہے؟ افسوس کہ مجھے ایک کسان کے لڑکے نے مارا ہے۔

قال، فلو غیرا کار قتلنی[۱] کاش مجھے کسانوں کے علاوہ کسی دوسرے نے مارا ہوتا۔

یعنی اپنے سے کمتر درجہ والے کے ہاتھ سے ابو جہل جیسے مغرور کو مرنا بھی پسند نہیں تھا، نسلی غرور کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں اخوت ومساوات کا جذبہ پیدا کر کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل فرمائی کہ جس میں ماوتو کا امتیاز ختم ہو کر رہ گیا اور دنیا نے وحشت وبربریت کی سنگلاخ زمین پر محبت واخلاص کے ایسے پھول کھلائے جس کی خوشبو بہت دور تک گئی اور یہ خوشبو اسلامی معاشرہ کی فضاؤں میں ہر طرف پھیل گئی۔

عربوں کی نگاہ میں حبشیوں کی کوئی وقعت نہیں تھی کیونکہ وہ حبش کو غلاموں کی منڈی سمجھتے تھے اور مکہ وغیرہ میں بہت سے حبشی غلام غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت بلال حبشیؓ انھیں لوگوں میں سے تھے لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو ایک جلیل القدر صحابی نے کہا کہ آج ہمارا سردار ہم سے جدا ہوگیا، اسی حبش سے نجاشی کا بیٹا جب مدینہ آیا[۲] اور اسلام قبول کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حبشی کی حضرت علیؓ سے مواخاۃ کرائی ایک خاندان بنی ہاشم کا فرد فرید اور ایک حبش کا رہنے والا عربوں کی نگاہ میں حقیر انسان۔

## مسلمانوں نے غلاموں کو آقا بنالیا

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اسلام میں مواخات ومساوات صرف فکری ونظری نہیں بلکہ عملی ہے، ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے، یہ

---

[۱] مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم ص۳۵۲ بخاری ومسلم میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

[۲] نجاشی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خط لکھا ہے اس میں اپنے بیٹے اُریحا بن الاصم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجنے کا ذکر کیا ہے دیکھئے، البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج۳ ص۸۴۔

دستور اسلامی تعلیمات کا گل سرسید ہے، جب نسل اور نسب کے فرق کو مٹا کر سب کو ایک سطح پر کھڑا کردیا تو مسلمانوں نے عملی طور پر اس کو کر کے دینا کے سامنے اس کی ایسی حیرتناک مثالیں پیش کردیں کہ جن کا تصورنہیں کیا جاسکتا تھا، سماج میں پست سے پست تر سطح پر زندگی گذارنے والوں نے جب اسلام قبول کر کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں کمال حاصل کرلیا تو نسل ونسب کے لحاظ سے معزز ترین افراد نے بھی ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا۔

عرب میں غلام کی حیثیت جانوروں سے کسی طرح بلند نہیں تھی، ان کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا، اس خرید وفروخت میں اس کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا تھا، غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہوسکتا تھا، اس کو معمولی معمولی غلطیوں پر بڑی سے بڑی سزائیں دی جاتی تھیں اس طرح عربوں کے سماج میں سب سے پست سطح پر غلاموں کی زندگی تھی، لیکن جب یہی غلام اسلامی تعلیمات سے آراستہ پیراستہ ہوکر مسلم سماج میں آئے تو سارے مسلمانوں نے ان کو بھائی سے بھی بڑا رتبہ دیا بلکہ وہ اب غلام کے بجائے آقا، اور خادم کے بجائے مخدوم بن گئے، مسلم سماج کے معزز ترین افراد ان کے آستانوں پر عقیدتمندانہ حاضری دینے لگے اور یہ آزاد کردہ غلام (جن کو تاریخوں میں اولیٰ کہا گیا) پورے مسلم معاشرہ پر چھا گئے، ساری عزت وعظمت اور سرفرازی ان کے قدموں کی خاک کو آنکھوں سے لگانے لگی، بنوامیہ کے عہد خلافت کی تفصیل کرتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے:

> ''کوئی شہر ایسا نہیں تھا جس میں طالبان علم موالی (آزاد کردہ غلام) کی بھاری تعداد موجود نہ ہو اور بعض شہروں میں تو غلام فقہاء کی تعداد عرب فقہاء سے کہیں زیادہ تھی[1]۔

ایک دوسرے مصنف نے اسلامی شہروں میں اہل علم کا ایک جائزہ لے کر جو تفصیل دی ہے وہ ڈی اولیری جیسے لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے جو

---

[1] الاسلام والحضارۃ الاسلامیہ ج ا ص ۹۴۔

کہتے ہیں کہ مسلمان عجمی مسلمانوں کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے تھے، وہ اپنی مشہور عالم کتاب میں لکھتا ہے کہ:

''زید بن اسلم کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں عطاء بن ابی رباح، یمن میں طاؤس بن کیسان، یمامہ میں یحییٰ بن کثیر، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم نخعی، شام میں مکحول دمشقی اور خراسان میں عطاء الخراسانی فقہ میں مرجع خلائق تھے۔ البتہ مدینہ میں سعید بن المسیب فقہ کے امام کہے جاتے تھے جو قریشی الاصل تھے[۱]۔ (یعنی بقیہ سب غلام تھے)

یہ فہرست تو ان غلاموں کی تھی جو اس وقت ان شہروں میں مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے تھے اور ان کے علم وفضل کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا سب سے بلند مقام تھا، میں تم کو ان غلاموں کی فہرست بھی سنانا چاہتا ہوں جو پوری اسلامی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں اور ساری اسلامی دنیا نے ان غلاموں کے علمی احسانات کا اعتراف کیا ہے۔ حدیث وقرآن کی لافانی خدمات کی وجہ سے ان غلاموں کا مقام ومرتبہ مسلمانوں میں اتنا بلند ہے کہ ان کے ناموں کو زبان پر لاتے ہوئے پورے ادب واحترام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس طویل فہرست میں سے چند نام درج ذیل ہیں اور پوری علمی دنیا ان ناموں سے واقف ہے، صحابہ کرام سے براہ راست علم حاصل کرنے والے غلاموں کے اسماء گرامی یہ ہیں:

عکرمہ، ابورافع، سعید بن جبیر، سلیمان بن یسار، مجاہد بن جُبیر، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، اعمش، ایوب سختیانی، مکحول دمشقی، منصور ابن زاذان، میمون بن مہران، سلمہ بن دینار، عبداللہ بن عون، عمرو بن دینار، سلیمان بن طرخان التیمی، حسن بصری، محمد بن سیرین، ابوالعالیہ الریاحی، عطاء بن یسار، ابوبکر بن عیاش، زید بن اسلم، یزید بن حبیب، ابوالزناد بن ذکوان، ربیعۃ الرای، محمد بن عجلان، محمد بن اسحاق۔

یہ جلیل القدر محدثین احادیث کے راوی اور تابعی ہیں اور سب کے سب موالی

---

۱؎ معجم البلدان ج۳ ص۲۱۲۔

یعنی آزاد کردہ غلام ہیں لیکن اسلامی دنیا کے آقا ہیں۔ اب چند نام تبع تابعین کے پیش کرتا ہوں جو مولیٰ یعنی آزاد کرہ غلام تھے اور ان کا شمار مشہور محدثین میں ہے ان میں زیادہ تعداد ان حضرات کی ہے جو امام بخاری کے شیوخ حدیث ہیں۔

عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عُیینہ، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن معین، لیث بن سعد، عبدالرحمٰن بن مہدی، علی بن مسہر، علی بن المدینی، قتیبہ بن سعد الثقفی، شعبہ ابن الحجاج وغیرہ۔

ان تمام تاریخی صداقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈی اولیری کے اس الزام کو دیکھیں کہ مسلمان نئے مسلمان ہونے والوں کو بھائی کا درجہ نہیں دیتے تھے، اس اعتراض کا کیا وزن رہ جاتا ہے جو قوم اپنے غلاموں کو آقا کا درجہ دے سکتی ہے جو اپنے خادموں، نوکروں چاکروں کو آقائیت و مخدومیت کے پُر وقار منصب پر سرفراز کرسکتی ہے وہ اپنے برابر کے مسلمانوں کو بھائی کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوگی؟ کتنا بڑا جھوٹا الزام ہے؟ کتنی بے بنیاد بات ہے؟ مصنف نے خاص طور پر خلفاء بنواُمیہ کو اس سلسلہ میں موردِ الزام بنایا ہے اس لئے خاص طور پر بنو اُمیہ ہی کے دور خلافت کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

## بنواُمیہ قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے

ڈی اولیری نے خلفاء بنواُمیہ پر خاص طور پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ رعایا اسلام نہ قبول کرے اس سے جزیہ میں کمی ہوتی تھی، اور دولت کی آمد رک جاتی تھی۔

ڈی اولیری نے یہ کہہ کر چاند پر دھول اڑا کر روشنی میں مدھم کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، یہ الزام پڑھ کر تو میں حیرت میں ڈوب گیا جیسے مصنف بنواُمیہ کی ہزراوں صفحات پر پھیلی ہوئی تاریخ کے ایک حرف سے بھی آشنا نہیں ہے اس سلسلہ میں خلافت بنواُمیہ کی اشاعتِ اسلام کی جدوجہد کا ایک سرسری جائزہ ہی پیش کرسکتا ہوں

کیونکہ یہ موضوع تو مستقل ایک کتاب کا موضوع ہے، بنواُمیہ کے ہاتھوں میں جب عنانِ خلافت آئی اس وقت اسلامی حکومت کا رقبہ اور مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی بہت سے ممالک فتح ہوئے مگر اس کی آبادی نے اسلام ابھی قبول نہیں کیا تھا۔

## ہندوستان میں اسلام کی اشاعت

بنواُمیہ کے آغاز خلافت ۴۱ھ سے قبل ہندوستان کے ساحلی علاقوں مالا بار کالی کٹ اور سراندیپ میں کچھ عرب مسلمان بغرض تجارت آباد ہو گئے تھے، ان کے معاملات اور اخلاق سے متأثر ہو کر بعض افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن عام طور پر یہاں کے باشندے اسلام کے نام سے نا آشنا اور یہ سرزمین مسلمانوں کے وجود سے محروم تھی ہندوستان میں اسلام کی عام اشاعت کا آغاز بنواُمیہ کے پہلے خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں ۴۴ھ سے ہوتا ہے آپ نے مہلب بن ابی صفرہ کو کچھ فوج دے کر ہندوستان بھیجا اس نے کابل اور ملتان کے درمیانی علاقہ کو فتح کیا، پھر سنان بن سلمہ نے مکران (سندھ) کو فتح کر کے اس کو مسلمانوں کا ایک مرکزی شہر بنایا۔ لیکن نیز اسلام کی شعاعیں ابھی محدود تھیں، سرزمین ہند کی قسمت کا ستارہ اس وقت چمکا اور اس کی تیز کرنوں نے سرزمین ہند کے بہت بڑے خطے میں انوار کی بارش شروع کی جب سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسم نے ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت (از ۸۶ھ تا ۹۶ھ) میں اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور سندھ کے عیاش اور ظالم راجہ داہر کی حکومت کو تہ وبالا کر دیا اور اپنی زاہدانہ زندگی اور اسلامی اخلاق سے یہاں کے باشندوں کے دلوں کو فتح کر لیا، اس نے یہاں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی اور اس کثرت سے یہاں کی قومیں مسلمان ہوئیں کہ یہ احساس ہونے لگا کہ شاید خوف و دہشت کی وجہ سے وہ اسلام قبول کر رہی ہیں، اس لئے محمد بن قاسم کو ایک دن اعلان کرنا پڑا۔

”جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے

ہماری طرف سے کوئی تعرض نہیں ہوگا، **لا اکراہ فی الدین**، دین میں کوئی زبردستی نہیں‘‘

لیکن اس کے باوجود اتنی کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ آبادی از خود ایک ساتھ مسلمان ہوگئی اور پھر اس تیزی کے ساتھ اسلام ہندوستان میں پھیلا کہ افغانستان وقندھار سے لے کر بنوں، اہواز، سرحد، قلات، ملتان اور پشاور تک مسلم آبادیاں قائم ہوتی چلی گئیں اور جب ۱۳۲ھ میں بنواُمیہ کی خلافت کا چراغ گل ہوا اس وقت یہ پوری پٹی سرزمین ہند پر اسلامی کہکشاں بن چکی تھی اور آج تک ان تمام علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی جدوجہد کا ثمرہ ہے جس کی بنیاد عہد بنواُمیہ میں پڑی تھی اور ان کے نامۂ اعمال میں ہندوستان میں کروڑوں ایمان قبول کرنے والوں کا اجروثواب لکھا گیا، ڈی اولیری کے خاک اڑانے سے صداقت کے سورج کی روشنی مدہم نہیں ہوسکتی۔

## افریقہ اور ترکستان میں اسلام

اب ہم رہوار فکر کو افریقہ اور ترکستان کی طرف موڑتے ہیں، افریقہ میں حضرت معاویہؓ ہی کے زمانہ میں اسلامی فوجیں پہنچیں شمالی افریقہ میں ایک جنگجو قوم بربر آباد تھی لیکن زمینی فتح کے ساتھ دلوں کی فتح کا سلسلہ بھی جاری تھا، تمام بربری قوم حلقہ بگوش اسلام ہوگئی بلکہ رومیوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا، کچھ ہی دنوں بعد وہاں شہر قیردان آباد کرکے اس کو مسلمانوں کا مرکز بنادیا گیا اور پورے شمالی افریقہ میں لاکھوں انسانوں نے نخل اسلام کے سایہ میں آکر سکون کی سانس لی، یزید (جو اپنے جرم سے کہیں زیادہ سب وشتم کا مستحق قرار دیا گیا) کے دور خلافت میں خراسان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی ۶۱ھ میں یزید نے مسلم بن زیاد کو خراسان کا حاکم بنا کر بھیجا اس نے جا کر خوارزم کا محاصرہ کرلیا اور زیر کیا اسی سال سمرقند اور خجندہ میں اسلامی فوجیں پہنچیں اس طرح جب ۱۳۲ھ میں بنواُمیہ کی خلافت ختم ہوئی ہے اس

وقت تک ترکستان کا بہت بڑا علاقہ اسلام کے حلقہ آغوش میں آچکا تھا اور مسلمانوں کی وہاں ایک مستحکم حکومت قائم ہوچکی تھی موجودہ ارس کی ۱۷ ریاستوں میں سے سات ریاستوں میں مسلمانوں کو زار روس کے دور میں بھاری اکثریت حاصل تھی اس کی بنیاد خلافت بنو اُمیہ ہی کے زمانہ میں پڑی تھی، بخارا، سمرقند، خوارزم، تاشقند، کریمیا، ازبکستان وغیرہ میں تاریخ ساز علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو عالم اسلام میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں، امام بخاری جیسے محدث اسی کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔

## اسپین میں اسلام

ولید بن عبدالملک متوفی ۹۶ھ کے عہد خلافت میں مسلمان اسپین تک پہنچ چکے تھے، طارق بن زیاد جو اسلامی تاریخ میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے بنو اُمیہ ہی کے عہد کا الوالعزم سپہ سالار تھا، جو اندلس کے ساحل پر اپنی صرف چھ ہزار فوجوں کو لے کر اُترا تو اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالیں تاکہ کسی فوجی کے ذہن میں وطن لوٹنے کا خیال بھی نہ آئے، فوجیوں نے کہا اگر خدانخواستہ ہم کامیاب نہ ہوئے تو ان کشتیوں سے اپنے وطن تو واپس جاسکتے تھے، اس کے جواب میں طارق نے تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھ کر کہا وطن؟ وطن کیا چیز ہے؟ دنیا کا ہر ملک ہمارا وطن ہے، ''ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست'' اسلامی فوجوں نے سارے اسپین کو کنگھال ڈالا، پورے ملک پر مسلمانوں کا رعب ودبدبہ قائم کردیا، اسپین مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ ترین علاقہ بن گیا اور ۱۳۲ھ میں خلافت بنو اُمیہ کے خاتمہ پر ایک فرد عبدالرحمٰن اندلس میں اپنی ایک مثالی حکومت قائم کرتا ہے اور یورپ کی ناک کے نیچے آٹھ سو سال تک پورے جاہ وجلال کے ساتھ یہ حکومت قائم رہی ہر طرف اسلامی آبادیاں قائم ہوگئیں اور پورے اسپین میں اسلام کی اشاعت اتنے بلند پیمانے پر ہوئی کہ وہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ بن گیا قلعہ الحمراء اور مسجد قرطبہ کے بلند مینار آج بھی اموی خاندان کے جاہ وجلال اور اشاعتِ اسلام کی ایمان افروز داستان سنانے کے لئے موجود ہیں، بنو اُمیہ کے عہد

خلافت میں اسلام کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا؟ تاریخ یہ پوری داستان سنانے کے لئے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے، ڈی اولیری کا یہ کہنا کہ:

''خلفاء بنوامیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی آمدنی میں کمی ہوتی تھی''

کتنا لغو؟ کتنا مہمل؟ اور خلاف حقیقت الزام ہے، میری اس تھوڑی سی تفصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، ان تمام حالات کے لئے عربی میں کئی درجن مستند ترین کتابیں ہیں اگر ان میں سے چند کا بھی مطالعہ کرلیا ہوتا تو اس طرح کے بے بنیاد الزام لگانا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔

بات دراز ہوتی جارہی ہے، مختصر بات یہ ہے کہ ڈی اولیری اور شیلڈن ایموز جیسے نام نہاد محققین اور نقادوں کی اسلامی عقیدوں کی سرزمین میں زہر بونے والی کتابیں اگر اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں اور اسلام کے نام پر پڑھائی جارہی ہیں تو میری بڑے ادب سے درخواست ہے کہ خدارا آپ اسلام پر یہ احسان نہ کریں، کیونکہ پودے کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی دے کر پھر پتیوں اور شاخوں پر برف بھی برسا کر ان میں تازگی اور شادابی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ بات اکبرالہ آبادی کے ایک شعر پر ختم کی جاتی ہے ؎

وہ ہم ساری کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

## تیسری جلد کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں

اس شمارے میں ایک قابل قدر مضمون ''دعوت کا قرآنی اسلوب'' پیش کیا جارہا ہے، مقالہ عالمانہ ہی نہیں محققانہ بھی ہے، ''خادم رسول اللہ'' کے عنوان سے مشہور صحابی رسول حضرت انس بن مالکؓ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلکش انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، شخصیات پر لکھے جانے والے مضامین سے قدرے مختلف انداز کا ہے اس کی

وجہ سے مضمون کی جاذبیت میں اضافہ ہوا ہے، شخصیات کے سلسلے کا ایک دوسرا مضمون عالم اسلام کی مشہور اور لافانی علمی شخصیت حافظ ابن حجر عسقلانی پر ہے ابن حجر اسلامی تاریخ کا اتنا عظیم المرتبت نام ہے کہ اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کا سر اس آستانے پر عقیدت سے خم ہے، ابن حجر ہمالیائی شخصیت کے مالک ہیں، ان کی تصانیف کی فہرست بہت لمبی ہے اور ہر کتاب اپنی مثال آپ ہے ان کی کوئی بھی تصنیف ان کے علمی مقام ومرتبہ سے فروتر نہیں ہے، ابن حجر اور ان کی تصانیف پر ہزاروں صفحات لکھے جائیں تب بھی ان کے علمی کارناموں کا حق ادا نہیں ہوسکتا، ایک مختصر مضمون میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف صرف اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں، مقالہ نگار نے اختصار کے باوجود ان کی عظمت وانفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شمارہ میں ایک خصوصی مضمون ایک مستشرق کی اسلامیات پر ایک کتاب ''فلسفۂ اسلام'' پر تنقید وتبصرہ ہے، مصنف نے اپنی کتاب میں اسلام کے خلاف جوزہر پھیلایا ہے اس کے لئے تریاق فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مستشرقین کی تحقیق وتفتیش اور وسعت مطالعہ کا علمی دنیا پر اتنا رعب چھایا ہوا ہے کہ ان کی ہر رطب ویابس تحریروں کو عالمی شہرت حاصل ہوجاتی ہے، لیکن جب ان کے تحقیقی کارناموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام کے محقق علماء موشگافیوں اور ان کی ذکاوت وفراست اور نکتہ رسی اور باریک بینی کی شاہکار تحریروں کو پورے طور پر سمجھنے کی بھی ان میں صلاحیت نہیں ہے، یا اگر سمجھ جاتے ہیں تو علمی دیانتداروں کا ان کے یہاں قحط پڑ جاتا ہے، زیر نظر مضمون سے بھی اس حقیقت پر کچھ روشنی پڑتی ہے، جوابات اور کتاب کا تجزیاتی جائزہ لینے میں پوری دیانتداری کے ساتھ پوری تحقیق وتفتیش سے کام لیا گیا ہے اور تفصیلی مطالعہ کے بعد جوابات سپرد قلم کئے گئے ہیں، امید ہے کہ علمی حلقوں میں مضمون توجہ سے پڑھا جائے گا۔

# عورت اَور اِسلام

## نسوانی فطرت کا ایک شاہکار

''آبزورآف بزنس اینڈ پالٹیکس ویکلی'' شمارہ ۲۷؍جون تا۳؍جولائی۱۳۹۹۳ء میں ایک ماڈرن مسلم خاتون کی کتاب ''عورت اور اسلام'' ایک تاریخی اور مذہبی مطالعہ پر تبصرہ شائع ہوا ہے، کتاب کی مصنفہ فاطمہ مرنیسی ہیں جو رباط یونیورسٹی مراکش میں سماجیات کی پروفیسر ہیں، وہی تبصرہ ہمارے ایک کرم فرمانے دہلی سے ہمیں مطالعہ کے لئے بھیجا ہے، تبصرہ سے اندازہ ہوا کہ اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام ایک ''عورت دشمن'' مذہب ہے، مسلمان عورت اور مرد میں مساوات کا جو دعویٰ کرتے ہیں وہ ایک کھوکھلا دعویٰ ہے اوراس کے خلاف قرآن اوراحادیث سے متعدد ثبوت پیش کئے گئے جن میں بقول ان کے عورت کا ذکر اہانت سے کیا گیا ہے حتیٰ کہ قرآن میں عورتوں کو مارنے تک کا حکم دیا گیا ہے۔

اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے، تبصرہ نگار نے اپنے علم کے مطابق جن پہلوؤں کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے اہم سمجھا ہے جگہ جگہ سے اس کے اقتباسات دیئے ہیں جن سے مصنفہ کے نقطہ نگاہ کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے اوران کے دل ودماغ میں جو بات جاگزیں ہے اس کا پتہ چلتا ہے، ہم اسی تبصرے کی روشی میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے، ہم تبصرہ نگار سے بھی واقف نہیں اور نہ ہم کوان کے ذہن ومزاج اورافکار وخیالات کا علم ہے اس لئے اندیشہ یہ بھی ہے کہ تبصرہ نگار نے بات کا بتنگڑ بنایا ہو، چونکہ کتاب اسلام دشمن ہے، ہوسکتا ہے تبصرہ نگار کے دل کے گوشے میں بھی چور بیٹھا ہوتو جو بات مصنفہ نے نہیں کہی ہے وہ باتیں بھی زیب داستاں کے لئے بڑھا سکتا ہے

جیسا کہ ہندو فرقہ پرست اور نام نہاد مسلم دانشوروں کی لابی کا دستور ہو چکا ہے اور ہمارے ملک میں شب وروز یہ کام ہورہا ہے، تین طلاق اور ایک طلاق کا مسئلہ کچھ نہیں تھا اور اس کو کیا سے کیا بنادیا گیا، اس لئے کوئی بعید نہیں کہ تبصرہ نگار نے تبصرہ کے پردے میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہو بہرحال یہ اندیشہ ہے کہ:

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ترقی پسند اور روشن خیال خواتین اور نام نہاد مسلم دانشور مغربی تہذیب سے مرعوب ہوکر جس آزاد خیالی اور دونوں صنفوں میں مساوات پر اظہار خیال کررہے ہیں، مسلم معاشرہ اور اسلامی اصول واحکام کو نشانہ بنارہے ہیں، اسی فضا کو پیش نظر رکھ کر اسلام میں عورت کی جو حقیقی تصویر ہے ہم اس کو دکھانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ اس کتاب میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات بھی آجائیں گے۔

## اسلام میں عورت کا درجہ

آج دنیا میں جتنے مذاہب، جتنی قومیں اور جتنی تہذیبیں پائی جاتی ہیں بلا استثناء ان میں سے جس نے عورت کو سوسائٹی میں جو مقام دیا ہے وہ عورت کے لئے قطعی غیر موزوں ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے، اس غلط بخشی کے بتاہ کن اثرات آج دنیا کے سامنے ہیں، اس کے برعکس اسلام نے عورت کو جس بلند اور پاکیزہ مقام پر پہنچایا ہے ٹھیک اس کی فطرت کے مطابق اور اس کی شایان شان ہے، تمدنی زندگی میں اس سے استحکام پیدا ہوا اور عائلی زندگی میں استواری، خاندانی تعلقات میں تقدس وپاکیزگی، خلوص ومحبت کی جلوہ ارزائی ہوئی، اسلام نے عورت کو اسلامی معاشرہ میں ایک ''ملکہ'' یا ایک شہزادی کا وقار اور عظمت عطا کی ہے، شوہر اس کی عزت وحرمت، اس کی عفت وعصمت کا ایک جان سپار اور جانباز محافظ کی حیثیت اختیار کرگیا ہے اگر کوئی غلط نگاہ اس کی طرف ڈالدے تو وہ اس کی آنکھیں نکال لینے کے درپے ہوجائے، اس کی طرف کوئی گستاخ ہاتھ بڑھے تو اس ہاتھ کو قلم کردینے کا اس میں

جذبہ بیدار ہوجاتا ہے، غرضیکہ اسلام نے عورت کو جو حقوق واحترام دیئے ہیں ان کے سائے میں اس کی پور زندگی سکون وطمانینت قلبی کا مظہر بن جاتی ہے اور ہر طرح کی جسمانی وذہنی مشقت سے محفوظ ہوجاتی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق بیوی اپنی رہائش کے لئے تم سے گھر کا مطالبہ کرے گی تم کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑیگا، وہ تم سے خوراک، پوشاک کا مطالبہ کرے گی اور اس معیار کی خوراک وپوشاک جو اس کی سطح کے افراد کے یہاں مروج ہے اس کی فراہمی شوہر کے ذمہ ہے اگر اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہوئی تو وہ قاضی عدالت کے ذریعہ شوہر سے وصول کرسکتی ہے اور اگر شوہر ایک دم نادہند ہے تو وہ دعویٰ دائر کرکے اپنا نکاح فسخ کراسکتی ہے وہ تمہارے طلاق کی محتاج نہیں رہے گی اگر مرد مالدار ہے اور خود معمولی پہنتا ہے تو اس کی حیثیت کے دوسرے لوگوں کی عورتیں اطلس وکمخواب پہنتی ہیں تو مرد کا فرض ہے کہ عورت کے مطالبہ پر اس کو اطلس وکمخواب ہی فراہم کرے وہ خود جو چاہے پہنے، عورت کہہ سکتی ہے کہ میں کھانا نہیں پکاؤں گی، اپنے کچن کا انتظام تم کرو اور نوکرانی رکھو تو مرد کو اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا، بچہ پیدا ہوجائے تو عورت کہہ سکتی ہے کہ اپنے بچے کے دودھ کا انتظام کرو میں اس کو دودھ پلا کر اپنی صحت برباد نہیں کروں گی تو مرد کا فرض ہوگا کہ وہ دایہ کا انتظام کرے حتیٰ کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہیں جس کو ماڈرن عورتیں صاف لفظوں میں بیان نہیں کرتی ہیں جب کہ ساری ترقی پسندی ساری روشن خیالی اور سارے فتنہ کی جڑ یہی ہے اور وہ ''جنسی بھوگ'' کا مسئلہ ہے، اسلام نے اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے، اگر مرد کے اندر عورت کی جنسی بھوک مٹانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو عورت کو اسلام اجازت دیتا ہے کہ قاضی کے یہاں دعویٰ کرکے شوہر سے نجات حاصل کرلے، عورت پر معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں، وہ ایک پائی بھی کما کر لانے کی پابند نہیں بلکہ اگر ذاتی طور پر اس کو دولت حاصل ہے تو شوہر کو اس میں سے ایک پائی بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں کیونکہ یہ عورت کی ذاتی ملکیت ہے اور اگر شوہر وفات پاجائے تو جیسے اس کے خون کے رشتہ دار وراثت پانے کے

حقدار ہیں اسی طرح عورت کا بھی اپنے شوہر کے مال سے حصہ ہے، اسی طرح عورت کو اپنے باپ کی جائداد میں بھی حصہ دار بنایا گیا ہے یہ ساری تفصیلات اسلامی قانون میں مذکور ہیں، تمام فقہ کی کتابیں ان مسائل سے بھری پڑی ہیں اس کی روشنی میں آپ تمام مذاہب کی طرف سے عورت کو حاصل ہونے والی سہولتوں کا جائزہ لیجئے اگر آپ کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور ذہنی تحفظ کے بغیر ہے تو یقیناً آپ اسلامی اصولوں اور احکام کی برتری کا اعتراف کریں گے، اسلام نے عورت کی تخلیقی اور فطری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اس کی زندگی کے لئے جو شاہراہ بنائی ہے اگر وہ اس شاہراہ پر چلتی ہے تو وہ ہر طرح کے ذہنی وفکری جسمانی وروحانی خطرات وحوادثات سے محفوظ ہوگی اور کبھی بھی ذہنی کشمکش کا وہ شکار نہیں ہوگی اور عمر کے کسی بھی حصہ میں کسمپرسی میں گرفتار نہیں ہوگی، کیونکہ یہ ساری سہولتیں قانون فطرت کے مطابق ہیں اور جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ اس کی عزت واحترام کی ضمانت ہے مرد اور عورت کی مساوات کا جو مظاہرہ ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتا ہے وہ عورت کی زندگی کے لئے قطعی غیر فطری اور مصنوعی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج یورپ وامریکہ کے دانشور اپنے معاشرہ کی تباہی وبربادی پر ماتم کناں ہیں اور وہاں کے مدبرین عائلی زندگی میں سکون سے محرومی کا شکوہ کرتے ہیں۔

## جانوروں کے ساتھ ساتھ عورت کا ذکر

مصنفہ نے اپنی کتاب میں متعدد احادیث کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں عورت کا ذکر اہانت آمیز طریقے سے کیا گیا ہے، یہ ان کے کچے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ان کے اندر احادیث کی تفصیلی بحثوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، سماجیات کی پروفیسری اور بات ہے، یہ تو ایک پٹری پر چلتی ہوئی گاڑی کی ایک منزل ہے۔

علم حدیث ایک بحر ناپیدا کنار ہے، محدثین نے پوری پوری زندگی اس میں غواصی کی ہے تب کہیں جاکر حقائق ومعارف کے موتی ان کے ہاتھ آئے ہیں۔ اس سمندر میں اُترنے کے لئے سماجیات کی ایک پروفیسر نے بلاوجہ جل پری بننے کی کوشش

کی ہے، انھوں نے مصلی کے سامنے سے بعض جانوروں اور عورت کے گذر جانے سے نماز فاسد ہونے والی حدیث کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ عورکا ذکر انتہائی اہانت آمیز طریقہ سے کیا گیا ہے اگر حدیث سے استدلال کرنے کی جرأت کر ہی لی تھی تو اسی بات میں حضرت عائشہؓ کی روایت بھی پڑھ لی ہوتی تو ان کو اس غلط فہمی پھیلانے کی جرأت نہ ہوتی۔

مسلمان نماز کے بارے میں کیا تصورات رکھتے ہیں اگر پروفیسر صاحبہ نے یہ بات سمجھ لی ہوتی تو شاید ان کو اس سوال کی جسارت نہ ہوتی اسلامی حکماء نے احکام وقوانین شرعی کے جو اسرار و حکم بیان کئے ہیں اگر ان کا مطالعہ کرلیا ہوتا تو ان کو خود اپنا اعتراض احمقانہ معلوم ہونے لگتا، مسلمان جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں خدائے ذوالجلال کے دربار میں کھڑا ہوں وہ انتہائی خشوع وخضوع سے اور دل کو ہر طرح کے خیالات وافکار سے خالی کر کے اپنے مالک حقیقی کی حمد وثنا کرتا ہے اپنی مغفرت اور آخرت میں کامیابی کی دعا کرتا ہے وہ اپنی ساری توجہ خدا کی عظمت وجلال کی جانب مرکوز رکھنا چاہتا ہے اس میں کسی دوسری جانب خیال وذہن کا منتقل ہونا نہ خود پسند کرتا ہے اور نہ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اس کی نماز میں جو چیز بھی خلل انداز ہوگی اس سے اس کی روح عبادت مجروح ہو جاتی ہے اور اس کی نماز کا کیف غارت ہو جاتا ہے۔

ذہنی انتشار کا باعث دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں ایک ناگوار خاطر اور ناپسندیدہ مکروہ صورت چیز، دوسری بہت ہی عزیز اور پسندیدہ چیز، اس حدیث میں دونوں طرح کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، کتنے اور گدھے کا ذکر ناپسندیدگی کی وجہ سے اور عورت کا ذکر جاذب نظر اور محبوب خاطر ہونے کی حیثیت سے کیا گیا ہے، جس طرح نفرت انگیز چیز کے دیکھنے سے ذہن میں تنفر پیدا ہوتا ہے اور ذہنی خلجان ہوتا ہے اسی طرح عمدہ ترین چیزوں پر نظر پڑنے سے ذہنی خلجان پیدا ہوتا ہے دونوں صورتوں میں نماز کے اس خشوع وخضوع میں خلل پڑتا ہے جو نماز میں مطلوب ہے نمازی کا ذہن اور دل خدا کی

طرف سے ہٹ کر ان چیزوں کی جانب ہو جاتا ہے جو نماز جیسی عبادت میں ناپسندیدہ ہے[۱]، اس حدیث سے عورت کے اعزاز وافتخار میں اضافہ ہوتا ہے، توہین کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ جس طرح جانوروں کے خون کی خرید وفرخت شریعت میں حرام ہے اسی طرح انسانی خون کی خرید وفرخت حرام ہے، حرام جانوروں کا دودھ خریدنا اور بیچنا حرام ہے عورت کے دودھ کی بھی خرید وفروخت حرام ہے، حرام جانوروں کی خباثت کی وجہ سے اور انسانی خون یا دودھ انسانیت کے احترام کی وجہ سے، اس میں انسان کی توہین کا پہلو نکالنا سماجیات کی پروفیسر کے یہاں تو ہوسکتا ہے، علم حدیث اور علم شریعت کے ماہرین کے نزدیک اس کا تصور بھی احمقانہ ہے۔

پھر عورت کے سامنے ہونے سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی تمام جمہورین محدثین کی یہی رائے اور تمام فقہاء کا یہی فتویٰ ہے خود ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت میں ان لوگوں پر طنز کیا گیا ہے جو جانوروں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے نمازی کے سامنے ہونے سے نماز فاسد ہونے کی بات کرتے تھے انھوں نے خود اپنا ذاتی واقعہ بیان کیا کہ میں کمرے میں لیٹی رہتی تھی اور حضورؐ وہیں نماز ادا فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ کی سجدہ گاہ تک میرا پاؤں کبھی پہنچ جاتا تو آپؐ سجدہ کرتے ہوئے میرے پاؤں میں ایک انگلی لگا دیتے تو میں فوراً پاؤں سمیٹ لیتی تب آپؐ اس کے بعد پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔

مصنفہ نے اپنے ناقص مطالعہ یا کسی سے سن کر اس حدیث کا ذکر بطور دلیل اپنے دعویٰ میں پیش کر دیا جب کہ حدیث کے مفہوم تک ان کے ذہن کی رسائی بھی نہیں۔

## یہودیوں جیسا ایک اعتراض

مصنفہ نے بڑے ہی گستاخانہ لب ولہجہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کیا ہے کہ ''یہ کیسا نبی ہے کہ وہ مجمع عام میں جنسی معاملات کا ذکر کرتا ہے'' سنجیدہ علمی گفتگو

[۱] حجة اللّٰه البالغه بحواله حاشيه ابوداؤد ج۱ص۱۰۲، بذل المجهود پہلا ایڈیشن ج۱ص۳۷۲۔

کے بجائے عورتوں کی فطرت کے مطابق جتنا زہریلا طنز انھوں نے کیا ہے وہ کسی غیرتمند مسلمان کے لئے قطعاً ناقابل برداشت ہے مگران کو اپنی نادانی کا احساس نہیں ہوا، مصنفہ نے یہودیوں کے اس گروہ کی تقلید کی جس نے صحابہ کرام پر طنز کیا تھا کہ تمہارے نبی کیسے ہیں کہ پیشاب پاخانہ کی تعلیم دیتے ہیں[1]؟ مصنفہ نے انھیں کا لب ولہجہ چرایا ہے۔

جنسی معاملات کا پاکیزہ لب ولہجہ میں اظہار، اس کی حدود کی نشاندہی جنسی انار کی اور صنفی آوارگی کے جملہ اسباب ودواعی پر روشنی ڈالنا اور جنس کے معاملہ میں واضح اور کھلے لفظوں میں ہدایات دینا ہی انسانیت کے شرف ومجد کو باقی رکھنے اور انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند اور باعظمت بنانے کی صحیح کوشش ہے اور اخلاقی اعتبار سے بیمار معاشرہ کا صحیح علاج ہے، ایک ماہر ڈاکٹر مریض کو واضح ہدایات دیتا ہے، پرہیز اور دواؤں کے صحیح اور بروقت استعمال کا طریقہ بتاتا ہے تاکہ مریض کو شفاء کامل حاصل ہوجائے، ضرورت پڑنے پر انجکشن بھی لگاتا ہے اور کھانے کی بھی دوائیں دیتا ہے اگر نازک مقامات کے آپریشن پر مجبور ہوتا ہے تو پردے کے مقامات کا آپریشن بھی کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر مریض کی زندگی نہیں بچائی جاسکتی، جسم کا وہ حصہ جس کا کھلنا کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا وہ ڈاکٹر کے سامنے بے نقاب کرنا پڑتا ہے لیکن آپ نے ڈاکٹر کو کبھی مطعون نہیں کیا کہ وہ انسانیت کو بے آبرو کرتا ہے بلکہ شفاء کے بعد اس کو اپنا محسن مانتے ہیں، اسی طرح میڈیکل کالجوں میں علم تشریح الاجسام پڑھایا جاتا ہے ان کتابوں میں انسانی جسم کے ہر ہر عضو کی مکمل تشریح ہوتی ہے، اس کی شکل وصورت اس کی قدرتی بناوٹ اس کی ضرورت وافادیت اس کے مضر ومفید پہلوؤں کی کلاس میں وضاحت اور نشاندہی کی جاتی ہے ان کی قلمی تصویر بنا کر طلبہ کو سمجھایا جاتا ہے تاکہ ان مخصوص اعضا کے غلط استعمال سے جو نقصانات پہنچتے ہیں اس کے اسباب کو سمجھا جاسکے اور اس کے علاج پر آئندہ طلبہ کو قدرت حاصل ہو، طب کی تعلیم میں کوئی راز راز

---

[1] ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۳ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

نہیں رہتا مگر کوئی بھی عقلمند آدمی ان پر طنز نہیں کرتا کہ وہ ایسی گندی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن ایک عظیم الشان روحانی معالج نے جو بیمار انسانیت کی مسیحائی کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے پاکیزہ لب ولہجہ میں پوری دنیائے انسانیت کی عظمت وشرافت کی حفاظت کے لئے ہدایات دین، جنسی فعل کے جائز وناجائز، حرام اور مباح حدود کی نشاندھی کی تو مصنفہ کو اس عظیم المرتبت رسول اور خدا کے پیغمبر پر اعتراض کی جسارت ہوگئی؟ آج دنیا میں پچاس فیصدی برائیاں انھیں جنسی معاملات میں غلط روی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور آج ترقی یافتہ یورپین ممالک اسی جنسی معاملہ میں بے راہروی کی وجہ سے ذہنی وفکری عذاب میں مبتلا ہیں۔ شاید آپ کو بھی اس کی خبر ہو اور اگر نہیں ہے تو میں پوری تفصیل سے آپ کو یہ داستان سناؤں گا۔

## بے خبری اور دعوئ ہمہ دانی

پروفیسر صاحبہ کا اسلام کا مطالعہ سطحی اور بہت محدود ہے ان کے سامنے شاید ان کے ذاتی مسائل ہیں، جن میں ناکامی کے بعد انھوں نے اپنا سارا غصہ اسلام پر اُتارا ہے جیسے شوہر سے لڑائی ہونے پر عورتیں اپنے بچے کو دھن کر رکھ دیتی ہیں، ان کے دل ودماغ پر ترقی پسندی آزادا اور معاشرتی زندگی اور بے لگام جنسی زندگی کا جنون چھایا ہوا ہے اگر انھوں نے ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی زندگی پر شائع ہونے والے بے شمار لٹریچر میں سے کچھ بھی مطالعہ کرلیا ہوتا تو ان کا سارا اندیشہ ہرن ہوجاتا اور اسلام پر اعتراض کی جرأت بیجا نہ ہوتی، اسلام نے عورت کو جو عزت دی ہے پاکیزگی وتقدس عطا کیا ہے اس پر ایک ہلکی روشنی پہلے ڈال چکا ہوں میں نے بتایا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت ایک ملکہ اور ایک شہزادی کی ہے اس کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کا رنگ کبھی پھیکا نہیں پڑسکتا، نہ اس کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں نوکری کرنے کی ضرورت ہے نہ کسی کی پرائیوٹ سکریٹری بننے کی حاجت نہ کلرکی اس کی شایان شان ہے نہ افسری، اس لئے کہ گلاب کے پھول کے لئے ہر آب وہوا اور ہر فضا راس

نہیں آتی، نہ وہ ہر جگہ محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ بار بار ہاتھ لگنے سے اس کی تازگی وشادابی برقرار رہ سکتی ہے شاہراہ عام پر گلاب کے پودے لگا کر دیکھو جب اس کی شاخوں پر کوئی مسکراتا ہوا پھول نظر آئے گا تو کسی منچلے راہ گیر، کسی شوخ اور طرحدار نوجوان کا ہاتھ اس کی سمت بڑھے گا اور اس کو شاخ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے بستر کی زینت بنادے گا اگر صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے اور وہ تمام قانونی وشرعی سہولتیں عورت کو حاصل ہوجائیں جو اسلام نے نافذ کی ہیں تو خاندانی زندگی جنت ارضی کا نمونہ بن جائے جس میں عورت عزت ووقار کا تاج پہن کر حکمرانی کرتی رہے۔

## عورت اور مرد کی مساوات

مصنفہ عورت اور مرد کے درمیان مکمل مساوات کی مدعی ہیں اس لئے وہ اسلام پر اعتراض کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ مسلمان عورت اور مرد میں مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ قرآن اور احادیث ان کے دعوی کی تکذیب کرتے ہیں، معلوم نہیں کس مسلمان سے ان کا سابقہ پڑا جس نے اسلام میں عورت اور مرد کی مکمل مساوات کا ذکر ان سے کیا ہے اور انھوں نے کون سی حدیث اور قرآن پڑھا ہے جس میں اس دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے، کوئی واقف کار مسلمان قطعاً یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ عورت اور مرد میں مکمل مساوات ہے، تہذیب جدید سے مرعوب ہوکر یہ دعویٰ کرنا مزید حماقت ہے، جو لوگ مردوزن میں مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں اور عملی طور پر انھوں نے اس کا نفاذ کردیا ہے وہ لوگ درحقیقت فطرت سے جنگ کرتے ہیں اور فطرت سے جنگ کرکے کبھی انسان کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ آج تک کامیاب ہوا ہے۔

قدرت نے دو جنس بنائی ہے دونوں کے جسموں میں نمایاں تفریق رکھی، ذہن وفکر دونوں کو الگ الگ بنائے، دونوں کی فطری رجحانات ومیلانات اور مزاجی خصوصیات الگ الگ رکھیں، دونوں کے چہرے مہرے، ہاتھ پاؤں جسمانی طاقت وقوت، تحمل وتفکر، دور اندیشی ومآل اندیشی، صبر وضبط، جوش وجذبہ، عزم وحوصلہ،

خطرات میں جرأت وہمت، غرضیکہ ہر ہر جسمانی، ذہنی وفکری جذبات اورقوتوں میں اتنا نمایاں فرق رکھا ہے کہ کوئی بھی شخص جس کے پاس عقل اورفہم وفراست ہے مرد اور عورت میں مکمل مساوات کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا، جولوگ مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ مصنوعی طور پرعورت کی سطح کواونچا کرکے اور مرد کواس کی سطح سے نیچا کر کے کہتے ہیں کہ دیکھو ہم نے مساوات کردی، یورپ وامریکہ میں اور بعض دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں عملی طور پر یہ مصنوعی اورخلاف فطرت مساوات نافذ کردی گئی ہے اس کے نتیجے میں وہاں کے معاشرہ میں جوابتری پھیلی، عائلی زندگی پر جوتباہی وبربادی آئی اس کا خمیازہ وہ بھگت رہے ہیں، یورپ کا دانشور طبقہ اس صورت حال سے پریشان ہے اوروہاں کی خاندانی زندگی پر جوکاری زخم لگا ہے اس کے دردوکرب سے کراہ رہی ہے۔

## مردوزن میں مکمل مساوات ممکن نہیں

قدرت نے مرد کومستقیم القامت بنایا ہے اورعورت کو بھی، مرد کو عقل وفہم کی دولت سے نوازا ہے اورعورت کو بھی، ایک دھڑکتا ہوادل مرد کے سینے میں بھی ہے اور عورت کے بھی، دل ودماغ میں جس طرح افکاروخیالات پیدا ہوتے ہیں اوران میں اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت مرد میں بھی ہے اورعورت میں بھی، یہ انسانیت کارشتہ ہے جس میں دونوں برابر ہیں، لیکن اسی قدرت نے مرداورعورت کے جسم میں کچھ ایسی خصوصیات مخفی رکھی ہیں جوایک میں ہیں اوردوسرے میں نہیں ہیں، ایک نوجوان مرد ایک نوجوان عورت کے کسی بھی حصۂ جسم پرصرف ایک انگلی رکھدے تو دونوں کوایک شاک لگ جاتا ہے چند لمحوں میں دونوں کے چہروں پراندرونی جذبات کے تلاطم وتموج سے سرخی اس طرح چھاجائے گی جیسے جسم کا سارا خون چہرے میں اتر آیا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں ایک دوسرے کوقلم دیتے ہوئے ایک دوسرے کی انگلیاں مس ہوجاتی ہیں تو صرف اتنے ہی سے دونوں کے جسموں میں کرنٹ دوڑ جاتا ہے، آخر یہ کیوں ہوتا ہے؟ کیا مصنفہ نے کبھی اس پہلو پرغور نہیں کیا ہے آگ آگ

میں ڈالئے پانی پانی میں ڈالئے کوئی نئی کیفیت نہیں پیدا ہوتی لیکن دہکتے ہوئے انگارے کو پانی میں ڈالئے یا دہکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالئے کیسی چیخ سنائی دیتی ہے، یہ اختلاف طبیعت ومزاج کا فرق ہے اسی طرح دونوں کے جسم کی خصوصیات دو ہیں جیسے بجلی کے دونوں تار ایک نگیٹیو ایک پازیٹیو، ایک ٹھنڈا اور ایک گرم، دونوں تار جب مل جاتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے، بلب روشن ہو جاتے ہیں پنکھے ہوا دینے لگتے ہیں، آپ کا کولر اور ایر کنڈیشنر سکوں بخش فضا بنانے لگتا ہے، آپ کی فریج آپ کے مشروبات کو برف کی چادر اُڑھا دیتی ہے، اگر بجلی کے ان دونوں تاروں کو علیحدہ کر دیجئے اور ایک ہی طرح کے دس تار اس میں جوڑ دیجئے تو کرنٹ نہیں پیدا ہوگا جبکہ بظاہر دونوں تار بالکل ایک جیسے ہیں ان میں تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون تار ٹھنڈا ہے اور کون گرم تار، لیکن دونوں کی خصوصیات الگ الگ ہیں، عورت اور مرد دونوں انسانیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے دو مجسمے ہیں انسانیت دونوں میں قدر مشترک ہے لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو بجلی کے ٹھنڈے اور گرم تار میں فرق ہے۔

عورت اور مرد میں جو لوگ مکمل مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ فریب میں مبتلا ہیں اور قدرت کو اس کی تخلیق کے معاملہ میں چیلنج کرتے ہیں اگر عورت اور مرد میں کچھ چیزیں مشترک ہیں تو کچھ دوسری چیزوں میں ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہے، یہ اختلاف فطری اور تخلیقی طور پر ہے اس لئے عورت اور مرد میں مکمل مساوات کا کوئی سوال ہی نہیں۔

## اسلام، عورت دشمن مذہب ہے

پروفیسر صاحبہ کہتی ہیں کہ ''اسلام ایک عورت مخالف مذہب ہے'' بیویوں کو مارنے پیٹنے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالکل متضاد نظریات رکھتے تھے ایک قرآنی آیت نے جس نے آخری تدبیر کے طور پر مردوں کو بیویوں کو مارنے کا حق عطا کیا، مردوں کے حق میں فائدہ مند ہی ثابت ہوئی۔

ان کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے خدا اور رسول اور عمر سب کو ایک ساتھ نشانہ بنا دیا ''تریا ہٹ'' کا لفظ ہم بھی سنتے آتے تھے آج ہم نے بچشم خود اس کا مشاہدہ کرلیا، اگر انھوں نے قرآن کی پوری آیت سامنے رکھی ہوتی اور انسانی فطرت کا غائر مطالعہ کیا ہوتا تو شاید ان کو اس اعتراض کی جسارت نہ ہوتی، ان کو تو یہ علم ہوا کہ اسلام بیویوں کی اصلاح کی ساری تدابیر کی ناکامی کے بعد مارنے کی اجازت دیتا ہے اور شاید لاکھوں میں کبھی بات اس مرحلے پر پہنچتی ہے لیکن اکثر اخبارات میں جو یہ خبریں آتی ہیں کہ ایک بیوی نے اپنے آشنا کے ذریعہ اپنے شوہر کو قتل کرادیا یہ خبریں ان کی نگاہ سے نہیں گذریں، مردوں کو صرف اجازت دی گئی تو آپ اتنی برہمی کا اظہار کررہی ہیں چاہے عملاً اس کا وجود نہ ہو اور عورت عملاً قتل کرکے دکھا دیتی ہے کہ میری آوارگی کی راہ میں جو حائل ہوگا اس کا یہی انجام ہوگا یہاں آپ کی غیرت کو کیوں نہیں ٹھیس لگتی۔

میاں بیوی کے درمیان جہاں بے مثال محبت ہوتی ہے دونوں میں اختلافات بھی کبھی کبھی ہوجاتا ہے خانگی زندگی کے ناخوشگوار ماحول کو درست کرنے کے لئے قرآن نے تدبیر بتائی ہے تاکہ عائلی زندگی کا شیرازہ نہ ٹوٹے، قرآن کی پوری آیت یہ ہے۔

وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا.

جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو، پھر اگر کہا مانیں تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی[1]۔

اس آیت میں خاندانی نظام کی اصلاح کے لئے تین مرحلے متعین کئے گئے ہیں اگر عائلی نظام کے اصولوں کی خلاف ورزی پائی جائے تو خیر خواہی کے ساتھ نرم لب و لہجہ میں اپنی بیویوں کو سمجھاؤ اور نشیب و فراز کو بتاؤ اگر بیوی عقلمند ہے تو وہ اسی مرحلہ پر صحیح راہ اختیار کرلے گی اور اگر تمہاری بات کارگر نہیں ہوئی تو اظہار ناراضگی کے لئے بیوی کے کمرے میں سونا چھوڑ دو، دوسرے کمرے میں رات گذارو، اگر اس کے پاس عقل

---

[1] ترجمہ شیخ الہند ص ۱۰۸۔

وفراست کی کمی ہوگی تب بھی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ جائے گی اور اپنا رویہ بدل دے گی، اگر دوسرے مرحلہ پر بھی بیوی صحیح راہ پر نہیں آئی اور اپنی فطری ''تریاہٹ'' پر اتر آئے تو تم کو مارنے کی اجازت ہے مگر مار ایسی ہو کہ اس کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے[1]۔ یہ اصلاح کا آخری مرحلہ ہے قرآن نے مزید ہدایت دی کہ اگر وہ تمہاری بات مان جائے تو الزام تراشی کے بہانے مت ڈھونڈو۔ عائلی زندگی کے استحکام کی قرآن نے یہ تدبیر بتائی ہے ہر عقلمند آدمی جس کو انسانی نفسیات سے ذرا بھی واقفیت ہے وہ یہی کہے گا کہ خاندان کی درستگی اور اس کے نظام کو صحیح رکھنے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں ہوسکتی۔

مصنفہ کو اعتراض کرنے سے پہلے اس لائحہ عمل کو سمجھ لینا چاہئے تھا جو اسلام نے عائلی زندگی کے لئے بنایا ہے اور پورے نظامِ عمل کے لئے چوکھٹے میں اس صورت حال کی تصویر کو فٹ کر کے دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ تصویر اپنی موزوں جگہ پر ہے یا نہیں؟ اسلام نے عورت پر معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، پورے خاندان کا سارا بار مرد کے کندھوں پر ہے، ہر قسم کی جسمانی وذہنی مشقتیں اٹھا کر خاندان کے نظام کو پرسکون ڈھنگ سے چلانے کا ذمہ دار مرد کو بنایا گیا ہے اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو خدا کے یہاں باز پرس ہوگی، اس طرح خاندان میں مرد کو ایک سربراہ کی حیثیت حاصل ہوگئی، ہر ایک کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتا ہے، ماں باپ، بیوی بچوں کے لباس، خوراک دوا علاج، تعلیم غرضیکہ سارے اخراجات کی ذمہ داری اس کے سر ہے اسی طرح وہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ خاندان کے کسی فرد کی طرف سے بے نیازی نہ ہو اور کسی سے ایسا فعل صادر نہ ہونے دے جو خاندان کی شیرازہ بندی کو کمزور کرے اور معاشرتی نظام میں رخنہ اندازی ہو اس کو سمجھائے، تنبیہ کرے، اور ضرورت پڑے تو جسمانی سزا بھی دے سکتا ہے جیسے اس کا دس برس کا لڑکا نماز نہیں پڑھتا ہے تو اس کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے اگر وہ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے یہ کرتا ہے تو

[1] ترجمہ شیخ الہند فوائد عثمانی حاشیہ ۵۔

معیوب کیسے ہوگیا؟ دنیا کا پورا نظام اسی اصول پر چلتا ہے، یہ کون سی عقلمندی کی بات ہے کہ مرد حاکم بھی بنایا جائے اور ساری ذمہ داریاں بھی اس کو دی جائیں اور پھر اس کو اختیارات بھی حاصل نہ ہوں ایسا نظام عمل تو ایک منٹ میں درہم برہم ہوسکتا ہے، قانون فطرت یہی ہے جو اسلام نے بتایا ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی، جو حاکم ہو وہ اپنے اختیارات سے کام لے اور نظام زندگی میں خلل نہ آنے دے اگر یہ اختیارات مرد کو دیئے گئے ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے اس میں عورت کے ساتھ دشمنی، اس کی اہانت اور اس کی تحقیر کا کون سا پہلو ہے، بیٹا چاہے جتنے بڑے منصب پر فائز ہوجائے لیکن باپ کے سامنے اس کی حیثیت خادم ہی کی رہے گی اس سے اس کی عظمت میں کمی نہ ہوگی اور نہ اس میں اس کی توہین کا کوئی پہلو ہے بلکہ دنیا بیٹے کی شرافت اور عظمت کی قائل ہوجائے گی، جرم کی سزا ہر شخص بھگتتا ہے اگر عورت سے جرم کا صدور نہیں ہوا اور اس کو سزا دی گئی تو یقیناً یہ جابرانہ طریقہ ہوسکتا ہے بس اتنی بات پر اور غلط فہمی کی بنیاد پر یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اسلام عورت دشمن مذہب ہے۔

اس اصولی گفتگو کے بعد میں آپ کی ذات سے متعلق ایک بات پوچھتا ہوں اور بہت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر سوچ کر جواب دیں گی، آپ نے مسلسل ایک گھنٹہ کی مشقت کے بعد اپنے آپ کو یونیورسٹی جانے کے لئے تیار کیا اپنے آئینہ کے سامنے سے اُٹھ کر باہر آئیں تو آپ کا چار سالہ بچہ اپنا کھیل چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور آپ کی صاف شفاف ساری پکڑلی اور اس کی پانچوں انگلیوں کی کالک آپ کے کپڑے پر لگ گئی، آپ کی نظر اس پر پڑی تو آپ کا خون کھول گیا اور بچے کے پھول سے رخسار پر ایک طمانچہ آپ نے جڑ دیا کہ کمبخت نے میری ایک گھنٹہ کی محنت اکارت کر دی لڑکا بلک بلک کر رونے لگا، سوال یہ ہے کہ بچے کو مارنے کا اختیار آپ کو کہاں سے حاصل ہوگیا؟ کیا آپ کے دل میں اس کی کوئی محبت نہیں ہے؟ میرے خیال میں ان باتوں کا جواب آپ نفی میں دیں گی، کیونکہ وہ آپ کا اکلوتا بچہ ہے، خوبصورت ہے، اس کی ہر شوخی وشرارت آپ کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے، اس کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں کو

ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے، وہ آپ کی امیدوں کا چراغ ہے، اس کو ذرا سی حرارت ہوجاتی ہے تو آپ بےچین ہوجاتی ہیں، اس کے لئے رات رات بھر آپ جاگتی ہیں اگر بیمار پڑ جائے تو اپنی ساری تنخواہ اس پر خرچ کر کے بھی اس کو صحت مل جائے تو اس کے خرچ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتیں، ان تمام جذباتی رشتوں کے باوجود آپ نے اس کو مارا، اس کی معصومیت پر آپ کا دل نہیں پسیجا، اس کی نادانستگی میں ہونے والی غلطی کو آپ نے معاف نہیں کیا اس مارنے کی وجہ سے آپ کو جلاد اور چنگیز و ہلاکو کہا جا سکتا ہے؟ کیا آپ کو یہ خطاب پسند آئے گا؟ جب کہ بظاہر آپ کا یہ فعل ظالمانہ نظر آتا ہے، آپ یہی کہیں گی کہ میں نے اس کو دشمنی کی وجہ سے نہیں مارا بلکہ غایت محبت کی وجہ سے مارا ہے، اس کو تہذیب وشائستگی سکھانے اور اس کے مستقبل کو سنوارنے کے خیال سے مارا ہے اگر میرے بچے کو کچھ ہوگیا تو میں اس کی حفاظت میں جان لڑادوں گی، آپ کی یہ توجیہہ دل کو لگتی ہے اور صحیح بھی ہے لیکن جس کو آپ نے سزادی ہے اس کو ابھی اپنے بھلے بُرے کی تمیز نہیں ہے وہ غلطی کو سمجھ کر نہیں کرتا اس کے برعکس بیوی غلطی کو غلطی سمجھ کر کرتی ہے اور دانستہ کرتی ہے اس میں اپنے برے بھلے کی تمیز کلی طور پر پائی جاتی ہے، بیوی کا جرم بچے کے جرم سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے، جب ایک معصوم بچے کی سزا کو اپنا جائز حق سمجھتی ہیں جس کا جرم بہت ہلکا ہے تو مرد کو اپنی بیوی کو سزا دینے کی جو اجازت ہے جب کہ اس کا جرم بھی بڑا ہے، اس کو آپ کی عقل کیسے ظالمانہ اور جابرانہ تصور کرتی ہے؟ شریعت کی اس اجازت کی آپ کوئی خوبصورت توجیہہ کیوں نہیں تلاش کرلیتیں جو آپ نے اپنے معصوم بچے کو سزا دینے کے لئے تلاش کرلی ہے۔

قرآن کا ہر حکم حکمتوں پر مبنی ہوتا ہے، عورت فطری طور پر زود رنج ہے، ضد اور ہٹ کا مادہ اس میں ہے جو عاقبت بینی اور مآل اندیشی کی راہ میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتا ہے پھر ایسی صورت میں آپ سے بے پناہ محبت کرنے والا شوہر آپ کو نصیحت کرتا ہے، اظہار ناراضگی کے لئے آپ کے کمرے میں شب گذاری چھوڑ دیتا ہے تو آپ اگر عقل سے کام لے کر اپنی ضد اور ہٹ کو پیروں سے کچل دیں تو خوبصورتی سے بات ختم ہوسکتی

ہے اور آپ کے گھر میں کیف و مسرت کی فضا پیدا ہو جائے، یہی شریعت کا مقصد ہے۔

آپ کے ہاتھ میں زخم ہو گیا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا، ڈاکٹر کہتا ہے کہ زخم میں زہر پھیل گیا ہے کوئی دوا کوئی انجکشن کام نہیں کرسکتا، اگر ہاتھ نہیں کاٹا گیا تو زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا جس کا انجام موت ہوگی آخری علاج کے طور پر ڈاکٹر نے ہاتھ کاٹ کر مریض کی زندگی کو بچالیا، کیا آپ ڈاکٹر کو ظالم و جابر کہیں گی؟ الٹے اس کو آپ اپنا محسن تصور کریں گی کیونکہ اس نے جان بچائی ہے اور آخری علاج کے طور پر ہاتھ کاٹا ہے اس کے لئے کوئی علاج نہیں تھا، قرآن نے بھی آخری علاج کے طور پر ایک ہلکی مار تجویز کی ہے جو فطرت انسانی کے پیش نظر ضروری تھا تو پھر آپ کو اسلام کو عورت دشمن مذہب کہنے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ یاد رکھئے کہ اسی قرآن نے عورت کو شوہر کے لئے ایک محبوب ملکہ کی حیثیت اور مقام دیا ہے قرآن کی آیت ہے:

وَمِنْ اٰيَاتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مُوَدَّةً وَّ رَحْمَةً.

پھر اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو اس کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی۔

قدرت عورت کو اپنی تخلیق کا شاہکار کہتی ہے اس کی ذات سے سکون، چین، محبت و مسرت کی خوشبو پھوٹنے کا ذکر کرتی ہے یہ اعزاز عورت کو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیا یہ صرف اسلام کا صدقہ ہے۔

## اسلام میں عورت بااختیار ہے

اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو اس بات کے مواقع دیئے گئے ہیں کہ اپنے ہونے والے جوڑے کو سمجھ سکیں اور اپنی مرضی سے انتخاب کریں، اسلام میں عورت کے لئے سخت پردے کا حکم ہے اس کے باوجود اگر آپ نکاح کا عزم رکھتے ہیں تو اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ سکتے ہیں، شریعت اس کی اجازت دیتی ہے اسی طرح

عورت کو حق ہے کہ اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں حقیقت حال معلوم کر کے دل مطمئن کر لے اور آزادانہ انتخاب کرے، اگر ناپسند ہے تو اس کو انکار کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے بغیر عورت کی اجازت کے اور اس کی مرضی معلوم کیئے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوسکتا اگر عزیر وا قارب نے بغیر اس کی اجازت و مرضی کے کسی سے نکاج کر دیا تو وہ نکاح نہیں ہوا۔

اس کے مقابلے میں جو قوم یہاں ۸۵ فیصدی کی تعداد میں بستی ہے اس کے یہاں ماں باپ نے جو رشتہ منتخب کرلیا وہ نا قابل تنسیخ ہے لڑکی اس سماج میں اتنی بے وزن اور بے قیمت ہے کہ لڑکی کے باپ کو ہونے والے داماد کو ایک معقول رقم اُلٹے ادا کرنی پڑتی ہے اور شادی ہوجانے کے بعد اگر لڑکی کے لئے شوہر قطعی غیر موزوں اور ناپسندیدہ ہے تو اس سے نجات کے سارے دراز ے بند ہوجاتے ہیں، شوہر شرابی ہے، جواری ہے، بھوکوں مارتا ہو، صبح وشام زود کوب کرتا ہو عورت کو اس عذاب میں گھٹ گھٹ کر جینا ہوگا اس سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں نہ ان کا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے نہ ہندو کوڈ بل اس عورت کی مصیبت دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، عورت سسرال میں دی جانے والی ساری اذیتوں کو جھیلے گی، پاس پڑوس کے لوگوں کی آنکھیں اس کی مظلومیت پر بھر آئیں گی مگر عورت کو نجات حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہوگی، ہم روز اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ بہو کو جلا کر مار ڈالا گیا، جہیز میں فرمائش پوری نہ ہونے پر شوہر اور اس کے گھر والوں کی طرف سے اس نئی نویلی دلہن کو ایسی عبرتناک سزا ملے گی کہ انسانیت تڑپ اٹھے غیر متعلق لوگوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں لڑکیاں اپنے والدین کو اپنی اذیتناک زندگی کی اطلاعیں دیتی ہیں اور صاف لفظوں میں بتاتی ہیں کہ میری جان کو خطرہ ہے، شوہر کے گھر والے شب وروز زہریلے بچھوؤں کی طرح ڈنک مارتے رہتے ہیں لڑکی اور اس کے ماں باپ کو صلواتیں سناتے ہیں، لڑکی کئی کئی وقت فاقے کرتی ہے ان باتوں کا لڑکی کے والدین کو پورا پورا علم ہوتا ہے مگر وہ اپنی لڑکی کی جان بچانے کے لئے کچھ نہیں کرپاتے کیونکہ

ان کے ہاتھوں اور پیروں میں مذہب اور سماج کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، طلاق کا ان کے دھرم میں وجود نہیں اس لئے پھولوں کے پالنے میں پلی ہوئی لڑکی کو اس عبرتناک زندگی اور عذاب سے نجات نہیں دلا سکتے آخر ایک دن ان کو اطلاع مل جاتی ہے کہ ان کی لڑکی کو شوہر اور ساس نندوں نے مٹی کا تیل ڈال کر جلا دیا یا زہر دے کر مار ڈالا، اور عین جوانی میں جو امنگوں اور تمناؤں کے خواب دیکھنے کا زمانہ تھا عبرتناک موت مر جاتی ہے، ابھی گذشتہ سال سرکاری طور پر رپورٹ دی گئی کہ اس سال چار ہزار دلہنیں جلائی گئیں حالانکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ایک طرف اسلامی شریعت میں عورت کا مقام و مرتبہ ہے اور حقوق اختیارات اور اسلامی قوانین کی سہولتیں اس کو حاصل ہیں ایسے درندہ صفت شوہروں سے نجات کیلئے راستے ہیں دوسری طرف نجات کے سارے دروازے بند ہیں، کبھی پروفیسر صاحبہ نے دونوں سماج کی عورتوں کا تقابل کر کے جائزہ لیا کہ اسلام کا فیضان کرم عورتوں پر کتنا ہے؟ اگر اب تک نہیں کیا ہے تو اب سے اس پہلو پر ان کو غور کرنا ضروری ہے۔

## مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

یہ تو موجودہ دور کے حالات ہیں جب ہندوؤں میں تعلیم کا اوسط کافی بڑھ گیا ہے اور مذہب سے وابستگی کمزور پڑ گئی ہے ورنہ ان کا مذہبی قانون تو یہ کہتا ہے کہ اگر شوہر مر جائے تو اس کی چتا پر اس کی جوان خوبصورت اور جذبوں اور امنگوں سے بھری ہوئی دلہن کو رکھ کر زندہ جلا دو اور پھونکدو اس کا اب جینے کا حق ختم ہو گیا، وہ چیخے، تڑپے، چلائے اس پر کسی کو رحم کھانے کی ضرورت نہیں عورت کا ''ستی'' ہو جانا ہی اس کا دھرم ہے اگر ہندو قوم اپنے مذہبی اصولوں پر قائم رہتی تو روزانہ ہزاروں عورتیں شوہروں کی چتاؤں پر زندہ جلائی جاتیں یہ رسم تو مسلمانوں نے ان کی عورتوں پر رحم کھا کر اپنے دور حکمرانی میں قوت بازو سے ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دی۔

اس سماج میں عورتوں کے لئے عذاب کی ایک بھٹی اور بھی ہے اگر عورت کا شوہر

مرجائے اور وہ بیوہ ہوجائے تو اس کی عمر کتنی ہی کم کیوں نہ ہو وہ اب تا زندگی دوسری شادی نہیں کرسکتی، اس کو سماج میں انتہائی منحوس اور برا قدم سمجھا جاتا ہے، شادی بیاہ کی تقریبات میں اس کو شریک ہونے سے روک دیا جاتا ہے کہ اس کا منحوس سایہ دلہن بننے والی لڑکی پر نہ پڑ جائے، اگر بیوہ کی عمر اٹھارہ بیس سال ہے تو اس کی جنسی بھوک فطری ہے وہ بھوک کیسے مٹے؟ اس کا کوئی شریفانہ راستہ نہیں تجویز کیا گیا اس بھوک کی وجہ سے اس کو کیسی کیسی اذیتوں سے گذرنا پڑتا ہے اور کس طرح انگاروں پر لوٹ لوٹ کراس کو راتیں بسر کرنی پڑتی ہیں اس درد وکرب کا اس کے معاشرہ کو کوئی احساس نہیں یا تو عاجز آکر وہ خودکشی کرنے یا کوئی دوسری راہ اختیار کرلے جس میں سوائے ذلت ورسوائی کے اس کے حصہ میں اور کچھ نہیں ہوگا۔

کیا مصنفہ کو عورت کی اس مظلومیت کی خبر ہے؟ یا صرف ان کو اتنا ہی معلوم ہے کہ حدیث میں عورت کا ذکر اہانت سے کیا گیا ہے سماجیات کی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ مختلف ممالک میں عورتوں کی حیثیت اور ہر طرح کے سماج کا تقابلی مطالعہ کرتیں ہر ایک کے حسن وقبح کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر جو سچائی ان کے سامنے آتی پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کردیتیں، تو ان کی رائے کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہوتا، ناقص مطالعہ کے نتیجہ میں چند سطحی باتوں کا سہارا لینا ایک پروفیسر کے لئے قطعی زیبا نہیں یہ صورت حال تو غمازی کرتی ہے کہ ان کا علمی معیار بہت پست ہے ان کا مطالعہ عامیانہ اور سطحی ہے باتوں کی گہرائیوں تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے کیا یہ حیرتناک بات نہیں کہ ہمارے ملک کی ۸۵ فیصدی جس کی تعداد ۷۵ کروڑ سے کم نہیں اتنی بڑی آبادی میں کسی ایک ہندو عورت نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم وجبر کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی، کوئی مضمون نہیں لکھا اور اپنے دھرم کی مذمت کرنے کی ہمت نہیں کی اور ایک مسلمان کہی جانے والی عورت اس بات پر کہ عورت کا ذکر اسلام میں اہانت سے ایک جگہ کیا گیا ہے، جو اس کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس نے پورے اسلامی نظام کو سمجھا نہیں اور اسلام کے خلاف ایک زہر آلود کتاب

لکھنے پر آمادہ ہو جائے۔

## حضرت عمرؓ پر طعن و تشنیع:

عورتوں پر ظلم و جبر کے سلسلہ میں مصنفہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کئی جگہ لیا ہے اور ہر جگہ ان کو ایک ظالم و جابر انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور نسوانی فطرت کے مطابق سخت اور درشت الفاظ استعمال کئے ہیں اور ان کو آتشیں مزاج بتایا ہے، جب بھی وہ کوئی اپنا نقطہ بیان کرتی ہیں تو فوراً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامیات کا مطالعہ یا تو بالکل نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو بہت ہی عامیانہ، سطحی اور سرسری ہے، اگر انھوں نے صرف حضرت عمرؓ کا وہ خطبہ ہی پڑھ لیا ہوتا جو انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد دیا ہے تو حضرت عمرؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو مورد طعن بنانے کی ان کو جرأت نہ ہوتی اس سے ان کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت عمرؓ کی یہ سختی کہاں اور کیوں ہوتی تھی اور کہاں سے وہ فولادی انسان موم سے زیادہ نرم ہو جاتا تھا تو ان کی عظمت کا راز ان پر منکشف ہو جاتا۔

کسی قوم کی اصلاح نہ صرف نرم رویہ سے ہو سکتی ہے اور نہ صرف جبر و زیادتی سے، ہر موقعہ و محل کے لئے ہر مدبر انسان یہ طے کرتا ہے کہ یہاں نرمی کا وقت ہے اور نرم رویہ اختیار کرتا ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہاں سخت اور گرم رویہ کی ضرورت ہے تو اس کا لب و لہجہ گرم ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ کی شخصیت عرب جیسی اجڈ اور سخت مزاج قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں اسی اعتدال کو بروئے کار لانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کی بہت سی رایوں کی تائید وحی الٰہی نے بھی کر دی مثلاً عورتوں کا پردہ کرنا مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانا، غزوۂ بدر کے قیدیوں کے قتل کی رائے دینا[1] وغیرہ۔

باطل سے وہ کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے یہ ان کی فطرت اور مزاج کے خلاف تھا۔ وہ غلط کام اور کسی بھی برائی کے مقابلے میں مرد آہن تھے اور ان کے لب و لہجہ میں

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۸۔

فولاد کی سختی آ جاتی تھی، ایک معزز صحابی نے غلطی سے مکہ کے مشرکوں کو مسلمانوں کے کسی اقدام کی خبر دینے کی کوشش کی تھی اس اطلاع میں ان کی اپنی کوئی مصلحت تھی مگر وقت سے پہلے ان کا خط پکڑ لیا گیا جو انھوں نے مشرکین مکہ کو لکھا تھا وہ اپنی صفائی دینے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے گرم ہو کر کہا:

"دعنی یا رسول اللّٰہ اضرب عنق ھذا المنافق[1]."

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

یہ سختی کا موقعہ تھا مسلمانوں کی فوجی پیش قدمی کا راز دشمن کو معلوم ہو جائے تو مسلمانوں کی شکست یقینی ہو جائے، دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے بہت بڑا جرم تھا اس لئے حضرت عمرؓ کا یہی لب ولہجہ حالات کے مطابق تھا تاکہ آئندہ کسی کو اس طرح جرأت نہ ہو، لیکن یہی حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہو گئے، رات میں مدینہ کی گلیوں میں پہرہ دے رہے ہیں تو سنا کہ ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے آپ نے بلند آواز سے گھر والوں کو متنبہ کیا کہ بچوں کو چپ کراؤ اور آگے بڑھ گئے اور پھر لوٹ کر آئے تو بچے اب بھی رو رہے تھے آپ نے رک کر پوچھا، بچے کیوں رو رہے ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ کئی وقتوں سے بچے بھوکے ہیں وہ بھوک کی شدت سے رو رہے ہیں آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے فوراً بیت المال آئے، آنے کے بعد ہی، کچھ چکنائی، کچھ سالن کا سامان لیا تو آپ کے غلام نے عرض کیا کہ میں پہنچا دوں؟ آپ نے کہا کہ آج تم میرا بوجھ اٹھا لوگے لیکن کل قیامت میں میرا بوجھ کیسے اٹھاؤ گے، سارا سامان میری پیٹھ پر لا دو میں خود لے کر جاؤں گا، چنانچہ سارا سامان لے کر خلیفۂ وقت اس گھر پہنچ گئے عورت سے کہا تم آٹا گوندھو اور خود چولھا پھونکنے لگے جب کھانا تیار ہو گیا بچے شکم سیر ہو کر ہنسنے کھیلنے لگے تب آپ وہاں سے واپس آ کر خدا سے رو رو کر اپنی کوتاہی اور غلطی کی معافی مانگنے لگے۔

ایک شب حسب معمول گشت پر تھے کہ ایک گلی میں کچھ دور پر ایک سایہ سا نظر

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۵۷۷۔

آیا، اپنے ساتھ کے آدمی سے کہا کہ جا کر دیکھو کون کھڑا ہے اور کیوں کھڑا ہے جب انھوں نے جا کر دیکھا تو وہ ایک عورت ہے اس سے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑے تلخ لہجہ میں اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ تمہارے خلیفہ جو وہاں کھڑے ہیں جا کر ان سے پوچھو کہ ان کو کیا حق ہے کہ میرے شوہر کو سال بھر سے محاذ جنگ پر بھیج رکھا ہے، کیا مجھے ان کی ضرورت نہیں، حضرت عمر جیسا جاہ وجلال کا انسان جس کا نام سن کر دنیا کے بادشاہوں کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، انھوں نے گردن جھکا کر بات سنی اور واپس چلے آئے اور دوسرے ہی دن محاذ جنگ پر اطلاع دے کر اس کے شوہر کو مدینہ سے بلالیا[1]، اور کہا کہ تمہارے اوپر تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے۔

اسی طرح ایک شب گشت پر تھے ایک گلی میں ایک گھر سے ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی، آپ نے سنا تو کوئی عورت فراق کے درد و کرب سے بیچین ہو کر اشعار پڑھ رہی تھی، دل تھرا گیا، صبح اس کے گھر کے بارے میں تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر بہت دنوں سے جہاد میں گیا ہوا ہے، آپ نے مختلف ذرائع سے تحقیق کرائی اور یہ پتہ چلایا کہ عورت بغیر شوہر کے کتنے دنوں تک رہ سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چھ ماہ ہے، آپ نے تمام عساکر اسلامیہ میں حکمنامہ بھیج دیا کہ کوئی مجاہد چھ ماہ سے زائد جہاد میں نہیں رہ سکتا اس کو اپنے اہل وعیال میں آنا ضروری ہے۔

یہ بے شمار واقعات میں سے صرف تین واقعات میں نے بطور مثال کے آپ کے سامنے پیش کئے، آپ نے حضرت عمر کی سخت مزاجی کی شکایت کی تھی لیکن ان کی نرم مزاجی کے واقعات آپ کی نگاہوں سے نہیں گذرے یا آپ نے قصداً ان سے چشم پوشی کی؟ حضرت عمرؓ جیسے اولوالعزم اور عظیم المرتبت انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کے جیسا غیور حساس جری مدبر اور سیاست داں اور انسانوں کا مزاج شناس انسان دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گا اس لئے دنیا ان کو یاد کرنے پر مجبور ہے۔

---

[1] کتاب السنن سعید بن منصور متوفی ۲۲۷ھ ج ۲ ص ۱۸۵۔

مصنفہ نے عمرؓ کی سخت دلی کے ثبوت میں کہا تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے ام کلثوم کو نکاح کا پیغام دیا تو ام کلثوم نے جواب میں کہا کہ میں ایسے سخت مزاج انسان سے نکاح نہیں کرسکتی، اس واقعہ سے انھوں نے سمجھ لیا کہ حضرت عمر سخت مزاج تھے، ہر عورت شوہر کے انتخاب میں اپنا ایک خاص تصور رکھتی ہے اس تصور کے خلاف عظیم سے عظیم تر مرد کا پیغام نکاح آئے گا تو اس کو رد کردے گی اور کوئی ایسا عذر کرے گی جو اس کے راز کی پردہ پوشی بھی کرے اور انکار بھی ہوجائے ام کلثوم نے بھی اگر اسی نقطۂ نگاہ سے انکار کیا ہو تو کیا تعجب ہے، اس واقعہ میں تو آپ کے سوچنے کی یہ بات تھی کہ ایک عورت نے حضرت عمر جیسے جاہ وجلال والے انسان کے پیغام کو نہایت شان بے اعتنائی سے رد کردیا اور اس نے گردن جھکا کر سن لیا اور سرِ تسلیم خم کردیا اس واقعہ سے اسلام میں عورت کی عظمت کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ ایک معمولی عورت ایک عظیم انسان مسلمان خلیفہ کو انکار کا دوٹوک جواب دیتی ہے اور عام مرد نہیں بلکہ اسلامی دنیا کا اور اسلامی تاریخ کی عظیم ترین شخصیت جس کے سامنے ہر کس وناکس کو لب کھولنے کی ہمت نہیں ہوسکتی ہے کیا یہاں آپ کو اسلام میں عورت کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا اور اپنے دعوے کو ٹوٹنے چٹخنے کی کوئی آواز نہیں سنائی دیتی ؟ کیا عورت کی اسلام میں یہی اہانت ہے، اسلام آپ کو عورت دشمن مذہب نظر آتا ہے؟ مسلم معاشرہ کے اس واقعہ سے کیا آپ کی آنکھیں کھل سکتی ہیں؟ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ جب آپ نے پڑھ لیا تو آپ کو یقین کرلینا چاہئے تھا کہ میرا دعویٰ غلط تھا اور میری کم علمی کا نتیجہ تھا، تیز وتند جملے استعمال کرنا بہت آسان ہے، حقائق ومعارف کی تلاش میں کوہ کنی بڑا صبر آزما کام ہے اور اسی کی آپ میں کمی ہے۔

## پردے کا حکم عورت پر اسلام کا احسان ہے

اسلام میں عورت کے لئے پردے کا حکم دیا گیا ہے، ترقی پسند روشن خیال اور جدید تعلیم یافتہ خواتین اور نام نہاد مسلم دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو جدید تعلیم

سے آراستہ ہیں ان تمام کوسب سے زیادہ غصہ اسلام کے اسی حکم پر ہے، اسلام کو ایک دقیانوسی، فرسودہ اور زمانہ جہالت کا نمائندہ مذہب تصور کرتے ہیں حالانکہ تجربات ومشاہدات روزمرہ کے واقعات وحقائق ان کے خیالات کی تردید کے لئے صف بہ صف کھڑے ہیں، ترقی یافتہ یورپین ملکوں سے لے کر ایشیاء کے ترقی پذیر ممالک تک میں شائع ہونے والی جرائم کی رپورٹوں کو اگر انھوں نے سنجیدگی سے پڑھا ہوتا تو وہ تھک ہار کر اسلام میں پردے کا حکم کو عورت کی عظمت وشرافت، عفت وعصمت کی حفاظت وبقا کے لئے ایک نعمت تصور کرتے اور ان کو نسوانی دنیا پر اسلام کا ایک عظیم احسان تسلیم کرنا پڑتا، کیونکہ ان رپورٹوں میں جرائم کی جو تفصیل ملتی ہے ان میں پچاس فیصدی جرائم جنسیات سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

زر، زن، زمین کو فساد کی جڑ کہا گیا ہے، لیکن تجربات ومشاہدات کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جرائم صرف ''زن'' سے تعلق رکھتے ہیں، یہ تناسب وہاں کم ہو جاتا ہے جہاں عورت پردے کی پابند ہے، جس طرح ہر جانور اپنے موسم میں جنسی اعتبار سے پاگل ہو جاتا ہے انسان میں بھی یہ حیوانی جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے، عمر کے ایک مخصوص دور میں یہ جذبہ دیوانگی کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے اور جب اس جذبے کا تناؤ بڑھ جاتا ہے تو انسان بھی کچھ دیر کے لئے جنسی درندہ بن جاتا ہے اور وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو ننگ انسانیت ہے۔

آپ خود اپنے ملک میں دیکھ لیں کہ گرلس اسکولوں اور گرلس کالجوں کے باہر انتظامیہ کو پولیس متعین کرنی پڑتی ہے کہ جنسی بھیڑیوں سے لڑکیوں کی حفاظت کی جائے اور وہ محفوظ طور پر اپنے گھروں کو پہنچ جائیں لیکن اس کے باوجود کچھ واقعات ہو ہی جاتے ہیں، لڑکیوں میں بے حجابی کے ساتھ ساتھ ان کے چست اور نیم عریاں لباس نے اور قیامت مچا رکھی ہے، دوپٹہ ان سے کب کا رخصت ہو چکا اگر کہیں کہیں ہے تو گردن میں ٹائی بن کر رہ گیا ہے، ان کا لباس جسم کا تھرمامیٹر بن کر رہ گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ جسم کا درجہ حرارت کیا ہے؟ یہ بے حجابی اور نیم عریانیت آوارہ مزاج

نوجوانوں کو چیلنج کرتی ہے کہ ''آ بیل مجھے مار''

اغوا، قتل، زنا بالجبر جیسے جرائم کی کثرت میں سب سے بڑا دخل عورت کی بے حجابی کا ہے، بجلی کا ٹھنڈا اور گرم تار ہر جگہ ایک ساتھ رہتا ہے کارخانوں میں، فیکٹریوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، ریلوں میں، بسوں میں، کھیل تماشوں میں عورت اور مرد مخلوط رہتے ہیں، دونوں جسموں میں ہر لمحہ کرنٹ دوڑتا رہتا ہے، شاک لگتا رہتا ہے، جب تاب ضبط جواب دیدیتی ہے تو دونوں تار مل جاتے ہیں، بجلی پیدا ہوتی ہے اور پورا نظام عفت وعصمت جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

اسلام نے عورت اور مرد کے اختلاط کو حرام قرار دیا ہے حتی کہ عورتوں کے زیب وزینت کا نظر آنا بھی جرم ہے اسی لئے ان کو حکم دیا گیا۔

قرن فی بیوتکن. تم اپنے گھروں میں رہو۔

لیکن کنیز وخادمہ بن کر نہیں بلکہ گھر کی ملکہ اور شاہزادی کی حیثیت سے، البتہ اس کے حدود حکومت متعین کر دیئے گئے ہیں اس کو اپنی حکومت کی سرحدوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں کیونکہ خطرات راہ میں اس کا انتظار کر رہے ہیں، اسلام ان کو ان خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہے۔

مسلمانوں کا ترقی پسند اور تہذیب جدید کا پرستار طبقہ عفت وعصمت کے اس قلعہ پر حملہ آور ہے اور اس کو ڈائنامیٹ کرنا چاہتا ہے اور اس حصار کو توڑ دینا چاہتا ہے جس میں عورت کی عزت وشرافت محفوظ ہے اور جنسی درندوں کی رسائی جہاں تک نہیں ہوسکتی، ان کے الفاظ وبیانات کتنے ہی دانشورانہ نظر آئیں لیکن حقیقت صرف یہی ہے کہ ان پر ''جنس'' سوار ہے بقول ڈاکٹر اقبال شاعروں کے اعصاب پر عورت سوار تھی لیکن یہ دانشور تو شاعروں کی سطح سے بھی نیچے نظر آتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد میں مساوات ہونی چاہئے لیکن مساوات کا معنی ان کے نزدیک وہ نہیں ہے جو لغت میں ہے بلکہ اس کا مفہوم وہ ہے جو ان کے ''جنس زدہ'' دماغ میں ہے کیونکہ جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے تو ان کے

والدین نے اپنے ہی دیار کے گاؤں میں کسی لڑکی سے شادی کردی تھی لیکن جب وہ تعلیم مکمل کرکے یونیورسٹی میں ریڈر اور پروفیسر ہوگئے تو گاؤں کی فضا میں پلی ہوئی عفت مآب اور پاکدامن بیوی ''اولڈ فیشن'' ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہوں سے گرگئی، انھوں نے یونیورسٹی کے پارکوں میں رنگین پروں کی تتلی تلاش کرلی جو ان کے پہلو بہ پہلو شاہراہ عام پر چل سکے اور ہر فنکشن اور ہر تقریب میں اپنے تام جھام کے ساتھ ساتھ دے سکے، بس اسی کو وہ مساوات کہتے ہیں، کیا گاؤں کی وہ مظلوم لڑکی عورت نہیں تھی؟ آخر وہاں مساوات کا مفہوم کیوں نہیں سمجھ میں آیا؟ وہ اپنے گاؤں میں درد وکرب کی زندگی گذار رہی ہے یا طلاق پاکر سماج میں بے قیمت ہوچکی ہے ظاہر ہے کہ اسلام اس مساوات سے انکار کرتا ہے اور قطعی انکار کرتا ہے۔

## طلاق کا حق

مصنفہ جیسی روشن خیال خواتین اور ترقی پسند تعلیم یافتہ طبقہ جو مرد وزن میں مساوات کا مدعی ہے یہ سبھی طلاق کے مسئلہ کو نشانہ بناتے ہیں، ہندوستان میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اس مسئلہ کو خوب اُچھالتا ہے وہ کہتا ہے کہ طلاق عورت پر ظلم ہے یہ مردوں کی جابریت اور حاکمانہ برتری کا اظہار ہے جو سراسر ظالمانہ ہے، طلاق کے بعد عورت کی زندگی تباہیوں اور بربادیوں کا مرقع بن جاتی ہے، ان کا وہ طبقہ جو اخباروں سے وابستہ ہے یا ذرائع ابلاغ میں عمل دخل رکھتا ہے مسلمان عورت کی مظلومیت پر مگر مچھ کے آنسو بہاتا ہے، یاد رکھئے یہ آنسو مسلمان عورت کی مظلومیت پر نہیں بلکہ وہ اپنے سماج میں عورتوں پر ہونے والے بے پناہ مظالم کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے، مسلمان عورت طلاق کے بعد عدت گذرنے پر دوسری شادی کرلیتی ہے اور مطمئن زندگی گذارتی ہے اور سماج میں اس کی عزت وآبرو اپنی جگہ باقی رہتی ہے، ہندو سماج میں طلاق کا کوئی قانون ہی نہیں اس لئے کسی حال میں زوجین میں تفریق ممکن نہیں گویا جس طرح جانوروں کو فروخت کردیا جاتا ہے شادی بھی اسی طرح کا ایک سودا ہے

آگ کے سات پھیروں کے بعد سودا تمام ہو جاتا ہے اور ایسی گرہ پڑ جاتی ہے کہ اس کا کھلنا ناممکن ہو جاتا ہے اب شوہر اور ساس و نند اس کے اوپر پیٹرول چھڑک کر پھونکدیں یا زہر دیکر مار ڈالیں لیکن لڑکی کے لئے اپنے ظالم و جابر شوہر سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے شوہر مر جائے تو اس کی بیوی کو شوہر کی چتا پر بٹھا کر آگ لگا دو تا کہ تڑپ تڑپ کر اور پھڑک پھڑک کر مر جائے اور آگ میں نہ جھونک سکو تو اس کو زندگی بھر شادی مت کرنے دو چاہے گندگی و غلاظت کی جس خندق میں گر جائے، جن لوگوں کے سماج میں عورتوں کے بارے میں یہ خیالات ہوں وہ مسلمان مطلقہ عورت کی مظلومیت پر آنسو بہائیں اور اسلام اور مسلمانوں پر طنز و تعریض کریں؟ ہمارے گاؤں میں ایک مثل مشہور ہے ''سوپ تو سوپ چھلنی بھی ہنسے جس میں بہتر چھید'' شاید اسی موقعہ کے لئے ہے۔

## طلاق کا حق مردوں کو ہے

مجبوری کی حالت میں اسلام نے رشتۂ ازدواج کو ختم کرنے کی گنجائش رکھی ہے یہ حق تہذیب و تمدن کے ساتھ جڑا ہوا ہے انسانیت جن جذبات کے ساتھ وجود پذیر ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ قانون نکاح میں یہ دفعہ بھی شامل کی جائے، باہمی توافق ناپید ہو جائے اختلاف مزاج و طبعیت مختلف نوع کے ذہنی رجحانات و میلانات ایک دوسرے سے دوری پیدا کر دیں اور تجربے کے بعد نباہ کی کوئی شکل باقی نہ رہے، ازدواجی زندگی دونوں کے لئے مصیبت بن جائے تو اسلام اجازت دیتا ہے کہ زوجین خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں پھر بھی یہ اجازت ناپسندیدگی کے ساتھ ہے کیونکہ اسلام رشتۂ ازدواج میں استحکام چاہتا ہے اسی لئے جب ہر طرح کی افہام و تفہیم کی کوشش کے بعد بھی یہ رشتہ کمزور ہی ہوتا چلا جائے تو مرد کو حق طلاق حاصل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ابغض المباحات عندی الطلاق.

مباح چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ مجھے طلاق ہے۔
یعنی ہر کوشش جو رشتۂ نکاح کو باقی رکھنے کے لئے کی جائے وہ شریعت میں پسندیدہ ہے۔

طلاق کا حق صرف مردوں کو حاصل ہے عورتوں کو نہیں، یہی انسانیت کی صحیح مزاج شناسی ہے اگر اس کے برعکس کر دیا جائے یا دونوں کو یہ حق برابر دیدیا جائے تو یہ شیرازۂ تہذیب وتمدّن تار عنکبوت سے کہیں زیادہ کمزور ہو جائے گا ہر گھر ہر خاندان ہمہ وقت بنتا بگڑتا رہے گا، رشتۂ ازدواج میں استحکام آ ہی نہیں سکتا، اس لئے اسلام نے عورتوں کو حق طلاق نہیں دیا ہے کیونکہ فطری طور پر عورت میں انفعالی کیفیت زیادہ ہے ایک چھوٹی سی بات کا بہت بڑا اثر لیتی ہے وہ جلد مایوسیوں کا شکار ہو جاتی ہے اس میں زود رنجی کے علاوہ مآل اندیشی اور عاقبت بینی کی بھی بڑی حد تک مردوں کے مقابلہ میں کمی ہے اور پہلے ہی مرحلہ میں آخری قدم اٹھا لیتی ہے آپ اخبارات میں برابر پڑھتے ہیں کہ عورت گھریلو معاملات میں اختلاف کی وجہ سے دریا میں چھلانگ لگا کر کنویں میں ڈوب کر، ٹرین سے کٹ کر مر گئی جب کہ مردان حالات میں کبھی خودکشی نہیں کرتا، یہ عورت کی عجلت پسند اور زود رنجی اور اس سے تاثر کا نتیجہ ہے صرف ہندوستان میں آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مردوں کے مقابلہ میں خودکشی کرنے والوں میں عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے بلکہ ۷۵ فیصدی عورتیں ہوتی ہیں۔

اس سچائی کے بعد اگر اس کو طلاق کا حق دیدیا جاتا ہے تو کوئی رشتۂ ازدواج پائیدار نہیں ہو سکتا مرد میں تحمل اور ضبط کا مادہ عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے وہ بہت سی ناخوشگوار باتوں کو جھیل لے جاتا ہے اور جب انتہائی مجبور ہوتا ہے تبھی وہ اپنا حق استعمال کرتا ہے۔

یورپین ممالک میں مرد وزن میں مساوات کے جوش میں عورتوں کی طلاق کا حق دے کر وہاں کے معاشرہ اور عائلی زندگی جو عدم استحکام آیا ہے آج وہ ایک لا علاج مرض بن چکا ہے، اسلام نے دونوں صنفوں کے اس فطری اختلاف کو مدنظر رکھا ہے اور

وہ صرف مرد کو طلاق کا حق دیتا ہے، پھر عورتوں کے لئے بھی علیحدگی کا راستہ بند نہیں رکھا گیا ہے، عورت اگر علحدگی کے لئے مجبور ہے تو اس کو خلع کا حق دیا گیا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی ہے اور شوہر کے مظالم سے نجات حاصل کر سکتی ہے، پھر بہت سے امور ایسے ہیں کہ عورت قاضی شرع کی عدالت میں دعویٰ کر کے نکاح فسخ کرا سکتی ہے، قاضی زوجین میں تفریق کرا دے گا اور بیوی کو شوہر سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

غرضیکہ طلاق اور خلع کا قانون فطرت انسانی کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں طلاق کی بہت ہی کم نوبت آتی ہے اسی لئے طلاق شدہ عورتوں کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا بخلاف یورپ اور امریکہ کے جہاں عورتوں کو طلاق کا حق حاصل ہے وہاں بہت سی عدالتیں صرف طلاق کے مقدمات کی سماعت کرتی ہیں کیونکہ طلاق کے مقدمات دیوانی اور فوجداری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عدالتوں میں آتے ہیں، اس میں عورتوں کی طرف سے دائرہ کردہ مقدمات ۷۵ فیصدی ہوتے ہیں۔

## ترقی یافتہ ملکوں میں طلاق

پروفیسر صاحبہ جن ترقی یافتہ ممالک کی زرق برق عورتوں کی ظاہری زندگی کو دیکھ کر رشک کر رہی ہیں اور انھیں جیسی بن جانے کا جذبہ ان کے سینے میں کروٹیں لے رہا ہے کیونکہ وہاں عورت اور مرد کی مساوات کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے میں انھیں ترقی یافتہ ممالک کی خاندانی تصویر دکھانا چاہتا ہوں کہ وہاں کی عورتوں نے اپنے حق طلاق سے معاشرتی زندگی میں کیسی تباہی و بربادی پھیلائی ہے، اسلام نے ناخوشگوار ازدواجی تعلقات کو ختم کرنے کا جو راستہ تجویز کیا ہے وہ کتنا فطری، کتنا مناسب، کتنا متوازن ہے اور ترقی یافتہ ملکوں نے اسلام کے خلاف جو طریقہ کار اختیار کیا تو ان کا معاشرہ کتنا ابتر، کتنا غیر متوازن اور کتنا ذہنی سکون سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔

آج کل یورپ اور امریکا میں عورتوں کو طلاق حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ثابت کرتا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو پھیکے لگتے ہیں، یہ کتنا آسان

دعویٰ ہے اس کے لئے ثبوت وشہادت کی بھی چنداں ضرورت نہیں صرف عورت کا بیان ہی سب سے بڑا ثبوت ہے وہاں کی عورتیں تنوع پسند ہوگئی ہیں ایک ہی کھانا کھاتے کھاتے طبیعت اُوب جاتی ہے ایسی عورت آسانی کے ساتھ عدالت کو باور کرادیتی ہے کہ شوہر اس کی جنسی بھوک کو حسب خواہش نہیں مٹا پاتا ہے، عدالت عورت کے حق میں فیصلہ کردیتی ہے، مارک ٹوپ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”جون کے مہینے میں پادریوں کی خوب چلتی ہے، وہ خوب شادیاں کراتے ہیں باقی گیارہ مہینے وکیلوں کی چلتی ہے طلاق کے مقدمہ میں[1]“

امریکہ کے ماہر سماجیات ڈاکٹر گوڈ نے امریکہ میں طلاق کے واقعات اور عدالتوں میں دائر طلاق کے مقدمات کا گہرا مطالعہ کرنے کی سات سال کی تحقیق وتفتیش کے بعد ۱۹۵۵ء میں اپنی کتاب شائع کی جس کے اہم نتائج حسب ذیل تھے۔

۱- امریکہ کے ہر چھ افراد میں ایک طلاق کے چکر میں الجھا ہوا ہے، پورے ملک میں تقریباً ایک کروڑ افراد طلاق کے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔

۲- طلاق کی صورت میں ختم ہونے والی یہ تمام شادیاں جلد بازی کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ ۷۰ فیصدی شادیاں ایسی تھیں جن میں دونوں فریق ایک دوسرے کو شادی کے ایک سال قبل سے ہر طرح جانچے اور پرکھے ہوئے تھے[2]۔

واشنگٹن کے محکمہ مردم شماری کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ:

> ۱۹۵۵ء میں امریکہ میں مطلقہ عورتوں کی تعداد ۱۱½ ساڑھے گیارہ لاکھ ہے ان میں سے دو لاکھ ۲۶ ہزار ایسی ہیں جن کی شادیاں ایک سے زائد بار ہوچکی ہیں ان میں سے ¼ کی شادی دوبارہ ہوچکی ہے[3]۔

---

[1] آتم ہتیا اور داسنا کے اپرادھ ”مصنف پری پورنانند ص ۱۷۷، بحوالہ فریب تمدن۔

[2] انگریزی اخبار پانیر ۲۸/جنوری ۱۹۵۶ء بحوالہ فریب تمدن۔

[3] فریب تمدن مرتبہ اکرام اللہ ایم اے لکھنؤ ص ۳۷۵ (نوٹ) ہم نے سارے حوالے اس کتاب میں فریب تمدن سے لئے ہیں جن کو اکرام اللہ ایم اے نے اردو انگریزی اخبارات اور سرکاری رپورٹوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ہر جگہ انھوں نے مکمل حوالہ دیئے ہیں اس لئے کتاب قابل اعتماد ہے۔ اسیر ادروی

یہ تو باضابطہ عدالتوں سے طلاق حاصل کرنے والوں کی تعداد ہے ۱۱ ½ لاکھ عورتوں کے علاوہ بے شمار عورتیں ایسی ہیں جنھوں نے باضابطہ طلاق تو حاصل نہیں کیا ہے لیکن وہ شوہروں سے الگ آزادانہ زندگی گذار رہی ہیں ایک مصنف لکھتا ہے۔

یہ تو باقاعدہ طلاق حاصل کرنے والی عورتوں کے اعداد وشمار ہیں ان کے علاوہ امریکہ میں کسی نہ کسی سبب سے سات لاکھ ۴۶ ہزار شادی شدہ مرد اور ۱۴ لاکھ عورتیں اپنے شوہروں سے الگ رہتی ہیں اور ۹ لاکھ ۴۳ ہزار مردوں کی داشتائیں الگ رہتی ہیں[1]۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے معاشرتی امور کے ڈایریکٹر ہڈسن نے اپریل ۱۹۵۶ء میں امریکہ کے دو ہزار طلبہ اور ان کے خاندانوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی ہے اس میں انھوں نے بتایا کہ:

امریکی گھروں میں طلاق ایک عادت بنتی جارہی ہے، امریکہ میں طلاق کی شرح دنیا کے دوسروں ملکوں سے کہیں زیادہ ہے[2]۔

ایک امریکی ماہر نفسیات نے اس بات پر اپنی تشویش ظاہر کی ہے کہ امریکہ میں طلاق کا شوق سن رسیدہ میاں بیوی میں بھی آگیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

امریکہ میں ہر سال ۴۰ ہزار شادی شدہ جوڑے ایک نئے رفیقِ زندگی کے شوق میں طلاق لے لیتے ہیں، ان میں سے اکثر دادا، دادی ہوتے ہیں، امریکہ میں اب یہ رجحان عام پیدا ہوگیا ہے کہ ایک شوہر ایک ہی بیوی کے ساتھ ساری عمر کیوں گذارے یہ حد درجہ تنوع پسندی کا نتیجہ ہے[3]۔

امریکہ کی اونس کاون سن یونیورسٹی میں شوشیالاجی کے ایک پروفیسر نے امریکہ میں طلاقوں کی بھرمار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

کیلوفورنیا اور نیویارک میں فسخ نکاح ایک روزمرہ کا معمول بن گیا ہے اور جب

---

[1] آتم ہتیا اور رداسنا کے اپرادھ (پری پورنا نند) ص ۱۴۵، فریب تمدن ۳۷۶۔

[2] ہندوستان ٹائمس ۲۵ / اکتوبر ۱۹۶۰ء، فریب تمدن ص ۳۷۶۔

[3] ''صدق''، لکھنؤ مدیر ماجد دریا آبادی ۲۱ / ستمبر ۱۹۶۲ء بحوالہ مذکور۔

عورتیں بے تکلف آپس میں مل بیٹھتی ہیں تو ہر ایک کی زبان پر یہی سوال دوسری سے ہوتا ہے، کہو کب اپنے خصم سے نجات حاصل کروگی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ امریکہ میں ہر پانچ دولہنوں میں ایک دُلہن سُہاگ رات میں حاملہ ملتی ہے اور ہر ۴ اولادتوں میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ایک ولادت ناجائز ہوتی ہے[1]۔

انگلینڈ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے جو امریکہ میں ہے وہاں مستند ذرائع سے جو اعداد وشمار شائع ہوئے ہیں اس میں بتایا گیا ہے کہ:

۱۹۶۰ء میں سالانہ طلاقوں کا تناسب ۴۰ ہزار سے زیادہ ہے یعنی ہر سال اتنی عورتیں اپنے شوہروں سے طلاق حاصل کرلیتی ہیں، لندن پارلیمنٹ نے ایک رائل کمیشن طلاق کے سلسلہ میں مقرر کیا تھا اس کی تقرری کے وقت سرکاری طور پر کمیشن کو یہ معلومات فراہم کردی گئیں کہ برطانیہ کی نابالغ آبادی میں ہر دس منٹ پر ایک شادی ٹوٹتی ہے اور پچھلے سال ۳۰ ہزار طلاقیں واقع ہوئیں اور ۲۰ ہزار احکام تفریق زوجین کے جاری ہوئے[2]۔

ان بڑے ملکوں میں معاشرتی زندگی جتنی غیر مستحکم اور حق طلاق عورت کو حاصل ہونے سے جو صنفی آوارگی پھیلی ہوئی ہے اس کا ایک نظارہ آپ نے دیکھ لیا اب اسی سلسلہ میں یورپ کے بعض دوسرے نسبتاً چھوٹے ترقی یافتہ ملکوں کا بھی ایک منظر دیکھ لیں کہ طلاق کا حق پاکر عورتیں کتنے گھروں اور خاندانوں کا چین اور سکون لوٹ رہی ہیں اور گھریلو زندگی کتنی تباہیوں کا شکار ہے، انھیں ملکوں کی خواتین کی طرح ایشائی ملکوں کی جدید تعلیم یافتہ روشن خیال عورتیں زندگی بسر کرنے کا خواب سوتے جاگتے دیکھتی رہتی ہیں کیا یہ بھی وہی سب کچھ کرنا چاہتی ہیں جو تہذیب جدید کے نام پر یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے؟ یورپ کی کچھ ریاستوں میں طلاق کی جو صورت حال ہے وہ مختصر طور پر آپ کے سامنے پیش ہے۔

---

[1] ''صدق''، لکھنؤ ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۷ء بحوالہ فریب تمدن ص ۳۳۸۔

[2] صدق لکھنؤ ۲۶ر فروری ۱۹۵۴ء فریب تمدن ص ۳۳۸۔

''بلغاریہ کے اخبار (RAB TNICES KESKEDELO) نے لکھا ہے کہ بلغاریہ کی ۸۰ لاکھ آبادی میں طلاقوں کا سالانہ اوسط ۱۶ ہزار ہے سب سے زیادہ طلاقیں تقریباً بدکاری کے سبب سے حاصل کی جاتی ہیں اور سب سے زیادہ طلاقیں شادی کے بعد ایک یا دو سال کے اندر ہوتی ہیں[1]۔

زیکوسلاویہ یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے وہاں ۱۹۶۵ء میں طلاقوں کا سالانہ اوسط ۱۸ ہزار سات سو دو ہے، خاص طور پر شہروں میں ہر تیسری شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے[2]۔

ہنگری میں ۱۹۶۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق وہاں طلاقوں کا سالانہ اوسط بیس ہزار پانچ سو اٹھارہ ہے[3]۔

مغربی جرمنی میں طلاقوں کی کثرت اور ان کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار طلاق کے واقعات کا تجربہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ نوجوانوں میں طلاق بہت زیادہ اور جلد ہونے لگی ہے ہر سال کم از کم سو شادی شدہ جوڑے شادی کے بعد فوراً ہی طلاق کے وکیل کے پاس جاتے ہیں ۱۰ فیصدی نوجوان تو اپنی شادی کا ایک سال بھی پورا نہیں کرتے ۴۰ فیصدی سے زیادہ شادیاں چھ سال کے اندر ٹوٹ جاتی ہیں[4]۔

ہنور کی ریاستی حکومت کی رپورٹ ہے کہ ۷۰ فیصدی سے زیادہ طلاقیں عورتیں حاصل کرتی ہیں بڑی حیرت کی بات ہے کہ ۲۰ سال سے کم عمر کی لڑکیاں کتنی جلدی شادی رشتہ ازدواج کو ختم کر دیتی ہیں[5]۔

یہ ان ترقی یافتہ اور تہذیب جدید سے آراستہ و پیراستہ ممالک کی رپورٹیں ہیں جہاں مرد اور عورت کی مساوات کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے اس لئے مردوں کے ساتھ

---

[1] نادرن انڈیا پتریکا ۳۰؍جولائی ۱۹۶۶ء۔
[2] ''ریڈینس'' ۷؍اگست ۱۹۶۶ء۔
[3] ''اخبار'' پانیر، ۷؍جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ فریب تمدن۔
[4] اسلام اور جنسیات مصنف بدر شکیب ص ۴۷ بحوالہ فریب تمدن۔
[5] فریب تمدن ص ۳۸۷۔

عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا گیا ہے اس غلط بخشی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں عدالتوں کے پاس طلاق کے اتنے مقدمات ہو گئے ہیں کہ اس کے لئے مستقل عدالتیں ہیں جو صرف طلاق کے مقدمات کی سماعت کرتی ہیں، حکومت کو کمیشن اور تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کرنی پڑتی ہیں ملک کے دوسرے اقتصادی معاشی اور انتظامی اور سیاسی اہم مسائل کے ساتھ خود طلاق بھی اس ملک کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے، ہر حکومت اس کو معیوب سمجھتی ہے اس کی تعداد کم کرنے کی تدبیریں سوچتی ہے لیکن جب تیر کمان سے نکل چکا مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی طلاق کا حق قانون نے دے دیا تو اب یہ ایسا عقدۂ لاینحل بن چکا ہے کہ کوئی ناخن گرہ کشا کام نہیں کرتا، اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات سے انکار کیا اور صرف مردوں کو طلاق کا حق دے کر یہ بتا دیا کہ یہی انسانی فطرت کے مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں اکادکا کہیں طلاقیں ہوتی ہیں، یورپ نے عورت کو وہی حق دے کر عائلی زندگی کی تباہی کو خود دعوت دی ہے۔

## طائرِ فکر کی پرواز کہاں تک ہے؟

اب تک مصنفہ کے جواب میں اصولی باتیں کہی گئی ہیں، ان کی پوری گفتگو صرف منفی پہلو لئے ہوئے ہے جو ان کے تخریبی ذہن کی غمازی کرتی ہے اور عورت کی فطرت کے مطابق صرف جلی کٹی سنانے تک محدود ہے، سنجیدہ علمی گفتگو اور تحقیقی مطالعہ کرنے والے ہمیشہ مثبت پہلو کی تلاش کرتے ہیں اعتراض تو بڑے سے بڑے اہل علم پر جاہل سے جاہل تر آدمی بھی کر لیتا ہے، علم و مطالعہ، تحقیق و جستجو کی معراج کمال یہ ہے کہ بات کے مثبت پہلو کو تلاش کر کے اس کے محاسن کو شمار کرایا جائے اور دلائل سے اس کی عظمت واہمیت اور تفوق و برتری کو ثابت کیا جائے، تبصرے کی روشنی میں میں نے یہی سمجھا ہے کہ پوری کتاب صرف اسلام اور اس کے قوانین اور اس کے مسلمات پر اعتراضات کی نیت سے لکھی گئی ہے اور کہیں بھی اس معاشرہ کی طرف اشارہ نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ جس میں عورت کو وہ اعزاز وافتخار حاصل ہے جس کی مصنفہ متمنی ہیں یا جس کا وہ خواب دیکھتی ہیں، دنیا میں ہر طرح کے معاشرے ہیں، ہر طرح کی تہذیبیں ہیں ان میں سے بہت سے معاشرے ایسے ہیں جس کا ہر فرد جدید تعلیم سے آراستہ ہے تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے ایک بڑے حلقہ کے لئے مثالی معاشرہ ہے جیسے انگلستان، امریکہ اور فرانس جہاں تہذیب جدید کا سورج نصف النہار پر ہے، وہاں سو فیصدی تعلیم ہے سائنسی علوم میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، چانداور مریخ پر وہ کمنڈیں ڈال چکے ہیں فضاؤں پر بھی حکمرانی قائم ہو چکی ہے ان کے خلائی اسٹیشنوں پر فتح وظفر مندی اور ان کی سر بلندی کا پرچم لہرا رہا ہے، میڈیکل سائنس کے وہ امام کہے جاتے ہیں، انسانی جسم کی تخلیقی خصوصیات پر ان سے زیادہ واقف روئے زمین پر کوئی ملک نہیں ہے، وہاں عورت اور مرد کو سماج میں برابری کا درجہ دیا جا چکا ہے اور مکمل مساوات کا قانون نافذ ہے، وہاں کی سو فیصدی تعلیم یافتہ عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی پروفیسر صاحبہ کی طرح اپنے معاشرتی قوانین سے کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ ان کے تصور سے کہیں زیادہ بلند ان کو مقام دیدیا گیا ہے ایشیائی ممالک کے لوگ جب یورپ وامریکہ اور فرانس میں تعلیم یا سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں تو وہاں تہذیب جدید کی چمک دمک، آب وتاب اور زرق برق زندگی کی تابانیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اور خود احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حسن وجمال، صحت وجوانی، تعلیم وشائستگی نے وہاں کی ہر عورت کو "ملکہ نور جہاں" بنا دیا ہے کہ اب اس سے زیادہ تفوق وبرتری کا خیال بھی ان کے ذہن وفکر میں نہیں آتا ہے ہندوستان پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والی خواتین ان کی زندگی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں، مجھے یقین ہے کہ کتاب کی مصنفہ پروفیسر فاطمہ مرنیسی بھی انھیں عورتوں میں شامل ہیں جو یورپین جیسی زندگی کا سنہرا خواب دیکھتی ہیں، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ وہاں کے معاشرتی زندگی کی پوری اور اصل تصویر ان کے سامنے پیش کردوں تا کہ

پوری بصیرت کے ساتھ وہ فیصلہ کرسکیں کہ ان ممالک کا معاشرہ عورت کے لئے نعمت وراحت، اعزاز وافتخار، عزت وشرافت کا ذریعہ ہے یا ذلت خواری، بے عزتی وبے آبروئی اور پستی وحقارت کی خندق، وہاں کی عورت اپنے کردار کی روشنی میں فخر آدمیت ہے یا ننگ انسانیت؟

ترقی یافتہ ممالک کے معاشرہ کی جنت ارضی کی سیر کرنے سے پہلے حقائق کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے تبھی اس کی قدر وقیمت کا آپ کو صحیح اندازہ ہوسکے گا، ان ملکوں میں زنا معیوب نہیں، اس لئے کہ کسی لڑکی کا باعصمت اور پاکدامن رہنا مشکل ہوگیا ہے، عفت وعصمت جو عورت کی شخصیت کی سب سے بیش قیمت چیز اور سب سے قیمتی موتی ہوتا ہے ان ملکوں میں اس کی قدر وقیمت خزف ریزوں سے بھی کم ہے، لیکن ترقی یافتہ اور نام نہاد تہذیب یافتہ ان ملکوں کے طرز عمل سے انسانیت کے اس جوہر شرافت کی قیمت کم نہیں ہوسکتی کیونکہ جنسی انارکی اور صنفی آوارگی انسانیت کی بلند سطح سے اتار کر انسان کو حیوانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا دیتی ہے ایک انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اب مصنفہ کو اس سمندر میں اتر کر دیکھنا چاہیئے کہ انکے ہاتھوں میں انکی تمناؤں کے مطابق موتی ہاتھ آتا ہے یا وہ خود لقمۂ نہنگ بن جاتی ہیں۔

## ترقی یافتہ ملکوں میں عورت

جدید تعلیم یافتہ روشن خیال اور ترقی پسند خواتین کی نگاہوں میں انھیں ترقی یافتہ ملکوں کی خواتین کی زندگی ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور ان کے لئے قابل رشک ہے اور یہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ نیم عریاں لباس پہن کر شعر وشباب کا چھلکتا ہوا جام بن کر دعوت نظارہ دینا چاہتی ہیں وہ شب وروز یہی خواب دیکھتی رہتی ہیں اور خود مصنفہ کے دماغ میں بھی یہی خواتین ان کی آئیڈیل خواتین ہیں اس لئے میں ان کی زندگی پر پڑی ہوئی نقاب اٹھا کر ان کی اصلی صورت دکھانا چاہتا ہوں تاکہ ظاہری آب وتاب کو دیکھ کر جو ان کی نگاہیں الجھ کر رہ گئی ہیں وہ اندر کا بھی منظر اچھی طرح دیکھ

لیں اور پھر اس کے بعد فیصلہ کریں کہ ان کو کون سی زندگی اختیار کرنی چاہئے۔

سب سے پہلے ہم امریکہ چلتے ہیں کیونکہ آج دنیا میں یہی واحد ملک سپر پاور بنا ہوا ہے اور تہذیب جدید کا سورج وہاں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، امریکہ کی ڈنور کی عدالت جرائم اطفال کے صدر جج بن لنڈ سے اپنی کتاب (REVOLTOFMODERNUOUIH) میں لکھتے ہیں:

''امریکہ میں ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فیصدی لڑکیاں اسکول چھوڑنے سے قبل خراب ہوچکی ہوتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے کہیں زیادہ ہے، لڑکیاں خود اس چیز کے لئے ان لڑکوں سے اصرار کرتی ہیں جن کے ساتھ وہ تفریحی مشاغل کے لئے جاتی ہیں، اور اس قسم کے ہیجانات کی طلب میں ان کی جسارت و بیباکی لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، اگرچہ زنانہ فطرت ان اقدامات پر فریب کاری کے پردے ڈال دیتی ہے، ہائی اسکول کا لڑکا بمقابلہ ہائی اسکول کی لڑکی کے اظہار جذبات کی شدت میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے، عموماً لڑکی ہی کسی طرح پیش قدمی کرتی ہے اور لڑکا اس کے اشاروں پر ناچتا ہے[1]۔''

ایک دوسری رپورٹ امریکہ کے طلبہ کی کالج اور یونیورسٹی کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے، ان کی اخلاقی حالت کا عالم یہ ہے:

''ہر اتوار کو بالخصوص طالب علموں کو کسی غیر لڑکی کے ساتھ گذارنا طبیعت کی فرحت اور پڑھائی کی تکان کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ اور عمدہ نسخہ سمجھا جاتا ہے، اسے یہاں (DATING) کہتے ہیں کسی بھی لڑکی کو ذرا بھی واقفیت کے ڈیٹنگ کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ ہفتہ کے ختم پر کسی لڑکی کو دعوت دیجاتی ہے جس میں ایک کھانا اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں ایک پکچر کسی سنیما میں اور پھر موٹر میں پہلو بہ پہلو تفریح، بے غیرتی اس حد تک کہ سڑکوں پر چھیڑ چھاڑ بلکہ بوسہ بازی تک کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے[2]۔''

---

[1] بحوالہ فریب تمدن (اکرام اللہ) ایم اے ص ۱۵۸

[2] ''صدق جدید'' لکھنؤ (ماجد دریا آبادی) ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء فریب تمدن ص ۱۶۰۔

پروفیسر سارنس اپنی کتاب LOVE 8 MARRIAGE میں غیر مبہم الفاظ میں اپنے قارئین کو بتاتے ہیں:

''جنسی آزادی'' نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کر دیا ہے شادی سے قبل کسی لڑکی کا باکرہ رہنا اب ممکن ہی نہیں، سوسائٹی میں خود اس چیز کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی، ورنہ پچھلے زمانہ میں ازدواج کے قبل کسی لڑکی کا بگڑنا ذلت وخواری کے مرادف تھا، لیکن آج کل دو چیزوں کی وجہ سے یعنی مانع حمل تدابیر کے پہنچنے میں سہولت حاصل ہونے اور سوسائٹی میں باکرہ پن کی اہمیت باقی نہ رہنے کی وجہ سے لڑکیوں کی بڑی اکثریت کے لئے اپنی مرضی اور سہولت کے لحاظ سے جنسی تجربات سے گذرنے کے مواقع حاصل ہو گئے اور آج سوسائٹی کے ہر طبقہ میں شادی کے قبل لڑکیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں جنسی مہم کی ماہر ہوتی جارہی ہیں[1]۔''

ایک دوسرے مصنف جارج رائیلی اسکاٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ عالم کے کسی دور میں آج سے پہلے معزز گھرانوں کی لڑکیوں کی اتنی کثیر تعداد جنسی خواہشات کی تسکین میں کبھی اتنی پیش پیش نہ تھی یہ صورت حال یورپ اور امریکہ کے ہر شہر میں موجود ہے جہاں لڑکیاں بہر وجوہ مردوں سے ازدواج کے بغیر اختلاط پیدا کرتی ہیں، یہ تمدن جدید کی دراصل فاحشہ ہیں آج کل لڑکیاں اس وقت تک شادی کا خیال بھی نہیں کرتیں جب تک گلچھرے اڑا کر تھک نہیں جاتیں، پہلے زمانہ میں مرد اس مرض میں مبتلا تھے لیکن آج کل ہر لڑکی کی زبان پر اس کا چرچا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ پیدائش اولاد کے کام سے پہلو تہی کر کے تفنن طبع کی خاطر جنسی بے راہروی اختیار کی جائے، دوشیزگی یا بکارت کے قائم رکھنے کو فرسودہ خیالی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جدید لڑکی کا نظریہ تو یہ ہے کہ جب تک جوانی ہے عیش پرستی میں زندگی بسر کی جائے، اسی کی خاطر

[1] اسلام اور جنسیات (بدر شکیب) ص ۸۸، فریب تمدن ص ۱۵۲۔

رقص وسرور کی محفلوں، شب خانوں، رسٹورانوں اور شراب خانوں کی تفریح کی جاتی ہے، بہ الفاظ دیگر جدید عورت اپنے آپ کو ایسے حالات اور ماحول میں پیش کرتی ہے جہاں جنسی میلانات کے اُبھرنے کے مواقع ملتے ہیں اور اس کا ناگریز نتیجہ اختلاط جنسی کی صورت اور اس کی چاٹ میں ظہور پذیر ہوتا ہے[۱]۔''

ایک دوسرے مغربی مورخ ایگن فریڈل اپنی معرکۃ الآرا تاریخی تصنیف (CULRURALFHISRARY QF MODRFN AGE) میں رقمطراز ہیں:

''شوہر یا بیوی کا ایک دوسرے سے وفادار رہنا ایک مضحکہ خیز چیز تصور کی جاتی ہے، جس عورت کے عاشق نہ ہو اس کو نیک چلن نہیں بلکہ گنوار غیر دلچسپ اور بدوضع سمجھا جاتا ہے کہ اس کو اب تک کوئی چاہنے والا نہیں ملا[۲]۔''

اب انگلینڈ کے بارے میں کچھ باتیں، لندن تہذیب جدید کا آئینہ ہے اس آئینہ میں پورے انگلینڈ میں تہذیب جدید نے جو گل کاریاں کی ہیں ان سب کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے اس لئے میں صرف لندن کے بارے میں ایک دو رپورٹوں کا ذکر کروں گا، انگلستان کی ایک مشہور مصنفہ مس مارگانتا لاسکی نے بن بیاہی ماؤں اور ان کے بچوں کی نویں کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''انگلستان میں تقریباً ۷۰ فیصدی لڑکیاں شادی سے قبل ہی اپنے دوستوں سے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں، انگلستان میں ۳۳ فیصدی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو جاتی ہیں[۳]۔''

لندن کے ایک سوشل ورکر نے اپنی مطالعاتی رپورٹ میں صنفی آوارگی اور جنسی انارکی کا ذکر کرتے ہوئے انکشاف کیا:

''اسکول میں آج کل چودہ برس کے لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر مانع حمل اشیاء اپنے اپنے بیگ میں لئے پھرتے ہیں، نہ جانے کب کہاں ضرورت پڑ جائے

---

۱۔ اسلام اور جنسیات (بدر شکیب) ص ۸۹، فریب تمدن ص ۱۵۳۔
۲۔ حوالہ مذکور۔
۳۔ صدق جدید لکھنؤ ۱۶/ دسمبر ۱۹۶۰ء بحوالہ فریب وتمدن ص ۱۸۷۔

اس معاملہ میں وہ اپنے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں[۱]۔''

ایک سیاح نے لندن میں کچھ دن گذارے اور وہاں کے مشہور ہائڈ پارک میں جو حیاسوز نظارے دیکھے اس کی تصویر کشی کرتا ہے:

''یہاں جوانی سڑ گل رہی ہے، ہائڈ پارک میں درختوں کے نیچے لڑکے اور لڑکیاں ہمیشہ بوس وکنار اور دیگر جنسی حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں فحش حرکتیں کرتے رہتے ہیں ٹرینوں اور بسوں اور سنیما ہالوں میں سبھوں کے سامنے فحش حرکتیں کرتے رہتے ہیں یورپ میں کسی اور جگہ برسر عام ایسی فحاشی نظر نہیں آتی حتی کہ پیرس میں بھی نہیں[۲]۔''

فرانس کے مشہور شہر پیرس کو اپنی خصوصیات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے، وہاں کے بہار آفریں ماحول وہاں کی سوسائٹی جاذب قلب ونظر، تہذیب وشائستگی کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے میں فرانس میں صنفی آوارگی سے متعلق صرف ایک مصنف کی تحریر پیش کررہا ہوں جو وہاں کی عورتوں کی زندگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، فرانس کے مشہور ومعروف ماہر عمرانیات بال بیورو اپنی کتاب TOWARDS MOAL BANKRUPTCY میں اپنے ملک میں پھیلے ہوئے اخلاقی انحطاط کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

''نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ فرانس کے قصبات ودیہات تک میں اب نوجوان مرد اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب ہم پاکدامن نہیں ہیں تو ہمیں اپنی بیویوں سے بھی عفت وپاکدامنی کا مطالبہ کرنے اور یہ چاہنے کا کہ وہ ہمیں کنواری ملے کوئی حق نہیں ہے، برگنڈی، بون اور دوسرے علاقوں میں اب یہ عام بات ہے کہ ایک لڑکی شادی سے پہلے کئی دوستیاں کرچکی ہوتی ہے اور شادی کے وقت اسے اپنے منگیتر سے اپنی گذشتہ زندگی کے حالات چھپانے کی

---

۱۔ صدق جدید لکھنؤ (ماجد دریا آبادی) ۶ر جنوری ۱۹۵۶ء بحوالہ فریب تمدن ص ۱۸۲۔

۲۔ صدق جدید لکھنؤ ۲۴ر نومبر ۱۹۶۱ء بحوالہ فریب تمدن ص ۱۸۹۔

کوئی ضرورت نہیں ہوتی لڑکی کے قریب ترین رشتہ داروں میں بھی اس کی بدچلنی پر کسی قسم کی ناپسندیدگی نہیں پائی جاتی وہ اس کی دوستیوں کا ذکر آپس میں اس طرح بے تکلفی سے کرتے ہیں گویا کسی کھیل یا روزگار کا ذکر ہے اور شادی کے وقت دولہا صاحب جو اپنی دلہن کی سابقہ زندگی سے ہی نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور چاہنے والوں تک سے واقف ہوتے ہیں جو اب تک اس کے جسم سے لُطف اٹھاتے رہے ہیں اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو جائے کہ انھیں اپنی دولہن کے ان مشاغل پر کسی درجہ میں بھی کوئی اعتراض ہے۔

سیکڑوں رپورٹوں، یاد داشتوں، اخباری خبروں، سروے ومطالعاتی وتحقیقاتی بیانات میں سے میں نے یہ چند سچائیاں آپ کے سامنے رکھی ہیں، ورنہ اس موضوع پر تو انگریزی اردو میں ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

## حیرتناک بات یہ ہے

یورپ وامریکہ وغیرہ میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کردی گئی ہے اس کا نتیجہ وہی ہے جس کے کچھ مناظر ابھی آپ نے دیکھے ہیں، اسی مساوات کے نتیجے میں عورتوں کو جو آزادی ملی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے انسان کو انسانیت کی باوقار سطح سے اتار کر حیوانیت کی ذلیل ترین سطح پر بٹھا دیا ہے بھلائی برائی کی تمیز اٹھائی جا چکی، ذلت وشرافت کے معنی بدل دیئے ہیں، عفت وعصمت، پاکدامنی اور بدکاری وفحاشی کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، رسوائی بے عزتی اور بے آبروئی کے الفاظ لغت سے کھرچ کر پھینک دیئے ہیں عزت وشرافت کا مفہوم تبدیل کردیا گیا ہے اب اس کے نتائج اتنے ہولناک ہو چکے ہیں کہ وہاں کے مدبرین صورت حال کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی کچھ بعید نہیں کہ کچھ دنوں بعد ان ممالک میں مزدک کے نظریہ اباحیت مطلقہ کا نفاذ ہو جائے ہر عورت ہر مرد کے لئے، عورت بازار کا سودا بن کر رہ گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ حیرتناک بات ہے کہ وہاں کی تہذیب وہاں کے تمدن وہاں کی خواتین کی آزادانہ زندگی کو ہمارے ملک کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والی خواتین اورلڑکیاں پانے کے لئے پاگل ہوئی جارہی ہیں، اور وہاں کی خواتین پر رشک کرتی ہیں، اوراس زندگی کواپنانے کے سنہرے خواب دیکھتی رہتی ہیں، اس سلسلہ میں اپنے خاندان سے بغاوت کرتی ہیں اپنے معاشرے کو ٹھوکر مارتی ہیں اور جب کامیاب نہیں ہوتیں تو سارا غصہ مسلمانوں کے مذہبی قوانین پر اتارتی ہیں، حدیث وقرآن میں کیڑے نکالتی ہیں، خدا ورسول کے بارے میں گستاخانہ کلمات استعمال کرنے کی جرأت وجسارت کرتی ہیں، ایسی ہی خواتین کے لئے میں نے یہ آئینہ ان کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ اس آئینہ میں تہذیب جدید کی اصل تصویر دیکھ سکیں اور خود موازنہ کرلیں کہ اسلام نے عورت کو جو مقام ومرتبہ، اعزاز وافتخار دیا ہے، جو پاکیزہ معاشرہ بنایا ہے اس میں زندگی بہتر ہے یا اس ماحول میں جینا پسند کرتی ہیں جہاں ان کی چادر عفت وعصمت کو چاک کرنے کے لئے جنسی درندے پنجہ کھولے ہوئے ہیں، جس گندگی میں ہاتھ ڈالنا مرے ذہن ومزاج اور افتادطبع کے خلاف تھا بھکی ہوئی خواتین کو صحیح راہ دکھانے کے لئے اس ساری گندگی کو دل پر جبر کرکے مجھے کریدنا پڑا۔

## مصنفہ سے ایک سوال

اب ''عورت اوراسلام'' کی مصنفہ فاطمہ مرنیسی سے میرا سوال ہے کہ میں نے ہندوستان سے لے کر انگلینڈ، فرانس اور امریکہ تک کے معاشرہ کے مناظر آپ کو دکھا دیئے آپ ان میں سے کون سا معاشرہ پسند کرتی ہیں اور کس معاشرہ میں ایک عورت ہوتے ہوئے سکون وراحت، عزت وشرافت اور اعزاز وافتخار کی آپ کو اُمید ہے اور اس کو پسند کرتی ہیں؟ ہندوستان پاکستان اور اسلامی ممالک کے معاشرے میں عورت کو جو عظمت واحترام اور عزت حاصل ہے وہ آپ کے دل کو پسند نہیں تو کیا آپ یورپ وامریکہ کی ان خواتین کی صفوں میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں؟ جن کی پوری

تصویر ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے تو پھر آپ کو اختیار ہے قد تبیّن الرشد من الغی ، رشد وہدایت اور ضلالت وگمراہی دونوں کی راہیں الگ الگ اور صاف صاف واضح ہوگئی ہے۔

اور اگر نہیں تو آخر روئے زمین پر کوئی ملک، کوئی بھی قوم تو ایسی ہوگی جس کا معاشرہ آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوگا اور آپ اس خطہ ارضی کی خواتین کی زندگی کو اپنے لئے پسند کرتی ہوں گی میں نے ہندوستان سے لے کر یورپ وامریکہ تک کے مہذب ترین ملکوں کی خواتین کی پس پردہ زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے اگر آپ تقابلی مطالعہ کی صلاحیت رکھتی ہیں تو اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرہ میں عورت کو جو مقام دیا گیا ہے آپ کو ان میں سے کسی نہ کسی کو منتخب کرنا ہوگا، مگر انسانی مجد وشرف، عزت وحرمت، شرافت وعزت نفس، غیرت وخودداری، سماجی عزت واحترام، نفاست وپاکیزگی اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھ کر انتخاب کرنا ہوگا۔

اور اگر دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں عورت کو صحیح مقام دیا گیا ہو اور ابھی دنیا میں وہ معاشرہ ہی وجود میں نہیں آیا اور اس کے لئے آپ جدوجہد کر رہی ہیں تو یہ دیوانے کا خواب ہے، شیخ چلی کی کہانی ہے، چراغ علاء الدین آپ کو کہیں سے نہیں مل سکتا، کھل جا سم سم بند ہو جا سم سم کا جادو آپ کے خواب کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں کرے گا، یہ دنیا حقائق اور تجربات ومشاہدات کے تسلسل کا نام ہے لیکن جو سچائی ہے وہ ہمیشہ سچائی بن کر رہی، اسلام چودہ سو برسوں سے ساری علمی دنیا کے سامنے چیلنج بنا ہوا موجود ہے، اس کے اصول وقوانین اور حقائق قرآنی کے خلاف بار بار مورچہ بندی کی گئی، لیکن ہر بار مخالف طاقتوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور اس کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ ہمیشہ چمکتا رہا، تہذیب جدید کی بالا دستی نے سو سال سے اسلام کے اصول وقوانین کے خلاف حصار بندی کر رکھی تھی لیکن اس قلعہ کی بھی دیواریں جگہ جگہ سے شکستہ ہو رہی ہیں اور ان کو اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ ہم نے عورت کے معاملہ میں بھی ٹھوکر کھائی، مرد اور عورت کی مساوات ایک بھیانک غلطی تھی جس کا خمیازہ ہم کو

بھگتنا پڑ رہا ہے، میری آپ سے بھی نہایت ادب سے گذارش ہے کہ آپ اسلامی اصول وقوانین اوراس کے بنائے ہوئے پاکیزہ معاشرہ پر صدق دل سے غور کریں، صداقت آپ کے سامنے آ کر رہے گی۔

یورپین ممالک میں عورتوں کی جس زندگی کو آپ رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں یہ فریب نظر ہے وہاں کی خواتین جنسی انارکی کی دلدل میں گردن تک ڈوب چکی ہیں اس لئے وہ ننگ انسانیت بن چکی ہیں۔ان کا ظاہر جتنا صاف وشفاف نظر آتا ہے ان کا باطن اتنا ہی گندا، گھناؤنا اور قابل نفرت ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں عورت اس ذلت بھری اور بے آبروئی کی زندگی میں کبھی گرفتار نہیں ہوئی، عورت کی عفت وعصمت ایک گوہر بے بہا ہے اس کو لُٹا کر عورت نے نہ کبھی عزت پائی ہے اور نہ پاسکتی ہے۔

آپ عورت اور مرد کی مساوات کی بات کرتی ہیں اور الزام لگاتی ہیں کہ اسلام کا دامن اس بیش قیمت اصول سے خالی ہے، یہ مطالعہ کی خامی کا نتیجہ ہے اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ ایک بالکل فطری ہے، اسلام میں دونوں صنفوں کی مزاجی وتخلیقی خصوصیات، طبعی میلانات فطری رجحانات کو پیش نظر رکھ کر ایک خاص طرح کی مساوات قائم کی گئی ہے جو دونوں صنفوں کی شایان شان ہے، دونوں کے حقوق، دونوں کے فرائض، دونوں کے اختیارات وامتیازات کے متعلق قرآن میں بہت واضح احکام ہیں حسن معاشرت کے سلسلہ میں احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے بس سنجیدگی اور صدق دلی کے ساتھ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

''عورت اور مرد'' کے مسئلہ خاص پر گفتگو کرتے ہوئے مذہب کو نظر انداز کرنا سب سے بڑی غلطی ہے، مذہب انسانی معاشرہ کی پاکیزگی وطہارت میں سب سے اہم رول ادا کرتا ہے اس لئے اس مسئلہ پر بحث کرنے والے کو مذہب کی افادیت وضرورت پر پہلے ایمان رکھنا ضروری ہے۔

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم اور بے حجابی ساری بیماریوں کی جڑ ہے، عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماعات بے حجابانہ ایک

دوسرے سے ملنا، اسکولوں میں کالجوں میں، دفتروں میں، ٹرینوں اور بسوں میں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھنا، بجلی کے ایک ایسے تار کو چھونا ہے جس میں ہمہ وقت کرنٹ دوڑتا رہتا ہے اب ترقی یافتہ ممالک بھی تھک ہار کر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں جسکی اسلام نے ہمیشہ دعوت دی ہے۔

میں آخر میں ایک ایسی ہی رپورٹ پیش کر کے اپنا سلسلۂ کلام ختم کردوں گا جس میں یورپ کی جنسی انارکی اور صنفی آوارگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور غائر تحقیق ومطالعہ اور تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اس کے اسباب و وجوہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور حیرتناک بات یہ ہے کہ جس خدا کو یورپ نے دیس نکالا دیا تھا وہ یاد آرہا ہے اور مذہب سے بےتعلقی پر ماتم کیا گیا ہے ع

جب ستایا ہے بتوں نے تو خدا یاد آیا

لندن سے ایک مکتوب نگار نے اپنے اخبار کو لکھا کہ:

''اس ملک میں کم وبیش ہر نوجوان خاتون خوش وقتی کی قائل ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق اس ملک میں ہر آٹھ میں سے ایک دولہن شادی سے پہلے حاملہ ہوتی ہے اور ہر آٹھویں سے ایک بچہ اپنے ماں باپ کی شادی سے پہلے پیدا ہوتا ہے باپ کا صرف اتنا قصور ہوتا ہے کہ اس غریب نے عین وقت پر پھنس کر شادی کر لی، ۲۱ سال سے کم عمر کی دولہنوں میں حاملہ دولہنوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے ان کے مقابلے میں ہر پانچ میں سے ایک شادی سے پہلے حاملہ ہوتی ہے، طلاق کی بھرمار اور شادی شدہ زندگی میں بے راہ روی کے اسباب بظاہر یہ نظر آتے ہیں۔

۱- عورتوں اور مردوں میں غلط قسم کی مساوات۔

۲- مالی لحاظ سے عورتوں کی مردوں کی غلامی سے نجات۔

۳- دفاتر فیکٹریوں کارخانوں، اسٹوروں، ریلوں، بسوں میں مرد اور عورت کا مخلوط کام۔

۴- مذہب سے بتدریج دوری اور بیگانگی (فریب تمدن ص۳۸۲، صدق لکھنؤ ۱۳/ جون ۱۹۵۸ء) میں نے اپنی اور اپنے مذہب اسلام کی بات بتادی یورپ کے دانشوروں کے اعتراف شکست کا اعلان آپ کے سامنے پیش کردیا، کیا یہ حقائق آپ کو صرط مستقیم دکھانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔''

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ.

# مسلمانوں کا مسیحا

سرسید ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کے قلعہ کا ایک ایک کنگرہ گرتا جارہا تھا، قلعہ کی فصیلیں اپنی جگہ سے سرک رہی تھیں اور ایک اجنبی طاقت کی مسلسل یلغاروں سے ٹوٹتی جارہی تھیں پورا ہندوستان ایسٹ اِیڈیا کمپنی کے عقابوں کے آہنی پنجوں میں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا، اس کی قوت پرواز اس سے سلب کی جاچکی تھی، اس کے جسم کا لہو بوند بوند کر کے چوسا جارہا تھا، بس ابھی تک اس کی گردن مروڑی نہیں گئی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام سپاہیوں نے ۱۷۹۶ء میں میسور کے سلطان ٹیپو کو جس دن شکست دی اسی دن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی ایک مضبوط بنیاد پڑگئی، انھوں نے اپنی سوداگری کے زمانہ میں یہ تجربہ کیا تھا کہ ہندوستان میں عام اشیاء کی طرح انسانوں کا ضمیر اور ایمان بھی بکتا ہے اور خریدا جاسکتا ہے، انھوں نے اس کا تجربہ میسور اور بنگال میں کیا اور کامیاب ثابت ہوئے۔

میسور میں میر صادق، میر قاسم، میر غلام علی لنگڑا، میر قمرالدین اور پورنیا مل گئے جنھوں نے حکومت میں ذمہ دارانہ عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی مادر وطن اور اپنے مثالی حکمراں سلطان ٹیپو سے غداری کی، اپنا ایمان اپنا ضمیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے ہاتھوں میں بیچ دیا، دوسری طرف بنگال میں ایک بدنام زمانہ غدار میر جعفر دریافت

ہوا اور اس کو آلۂ کار بنا کر سراج الدولہ کے سینہ میں خنجر بھونک دیا، اس طرح کی غداری اور انگریزوں سے بے لچک وفاداری کو غیرت مند مسلمان کس نگاہ سے دیکھ رہا تھے، اس کی ترجمانی ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں کر دی، جو آج ضرب المثل ہے ؎

جعفر از بنگال وصادق از دکن ۞ ننگِ ایماں، ننگِ دیں، ننگِ وطن

جنوب میں سب سے مضبوط بلکہ آہنی شخصیت نواب حیدر علی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی تھی۔ سلطان ٹیپو نے مسلسل خونریز جنگوں میں انگریزوں کو شکست فاش دی اور ایک بار تو اس نے ساحل سمندر تک ان کو کھدیڑ دیا تھا ان کے افسران نے جہازوں میں پناہ لی تھی، ان کے مشہور جرنلوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا تھا، ان کی طاقت کو جنوب میں اس نے تہس نہس اور پارہ پارہ کر دیا تھا، ان کی فوجوں پر مایوسی طاری تھی۔

جب انگریزوں نے دیکھا کہ سلطان ٹیپو کو میدانِ جنگ میں شکست دینا ممکن نہیں تو انھوں نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھایا کہ ہندوستان میں انسانوں کا ایمان اور ضمیر بھی خریدا جاسکتا ہے اور پھر انھوں نے اسی پہلو پر سرگرمی سے کام شروع کر دیا، میر صادق جو سلطان ٹیپو کا وزیر اعظم تھا اس سے انگریزوں نے سازباز کی، پھر اس کے بہت سے فوجی افسران کو اپنے آقا سے غداری پر آمادہ کر لیا اور پھر میدان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں رہا اور مئی ۱۷۹۹ء میں غداروں کی سازش سے خاص دارالسلطنت میں سلطان ٹیپو بے یار و مددگار رہ گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیڑیوں نے اس کو بیدردی سے قلعہ کے اندر ذبح کر دیا۔

## فتوحات کا سیلاب

سلطان ٹیپو پر فتح حاصل کر کے انگریزوں نے اس آہنی پھاٹک کو توڑ دیا جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کی راہ میں حائل تھا جیسا کہ کمپنی کے مقبوضات کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔

میسور کی فتح کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں مضافات میسور میں کڑپہ، کرنول، بلاری، اننت پور، تنجاور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، دوسرے سال ۱۸۰۱ء میں کرناٹک کے نواب کو جس نے انگریزوں کی مدد سے حکومت پائی تھی نکال کر مدراس بھیج دیا اور خود کرناٹک پر قبضہ کر لیا، اسی سال صوبجات اودھ کمپنی کے قبضہ واختیار میں آ گئے، دوسرے ہی سال ۱۸۰۲ء میں مرہٹی سلطنت جو اب تک نا قابل تسخیر مانی جارہی تھی اس کا انگریزوں نے خاتمہ کر دیا، دربار پونا میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا تھا، اسی سال بڑودہ اور گجرات کو بھی انگریزوں نے اپنے شکنجہ میں لے لیا اور اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں حیدر آباد ایک بے بس کبوتر کی طرح انگریزی باز کے چنگلوں میں پھڑ پھڑانے لگا، نواب حیدر آباد انگریزوں کا باجگذار بن گیا، اسی سال ناگپور پر قبضہ کر کے کمپنی نے انگریز مشیر کار وہاں مسلط کر دیا، یہ سال کمپنی کی فتوحات کا سنہرا سال بن گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سال بندیل کھنڈ، آگرہ، دہلی، جے پور، جودھپور اور گوالیار پر انگریز حکمران ہو گئے، ۱۸۱۳ء میں مراشش پر قبضہ ہوا اور اسی سال نیپال کو اپنے اختیار میں لے کر وہاں ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا ۱۸۱۷ء میں پہاڑی ریاستوں میں شملہ، مسوری، نینی تال، لندھوری بھی انگریزوں کے قبضہ میں آ گئیں، اسی سال ناگپور سے ریزیڈنٹ کو واپس بلا لیا گیا اور براہ راست اس کو اپنے اختیار میں لے لیا گیا، اب انگریزوں کی طاقت نا قابل شکست بن چکی تھی، سمجھوتہ کی پالیسی ترک کر کے اپنی قوت کا بھر پور مظاہر کیا جانے لگا اور جہاں بھی ضرورت سمجھی گئی وہاں کے ریزیڈنٹ کو بلا لیا گیا اور براہ راست اس کو اپنی حکومت کے ماتحت کر لیا ۱۸۱۸ء میں بھی یہی کیا گیا، پونا کے پیشوا کو معزول کر کے ملک پر قبضہ کر لیا گیا اور ۱۸۱۹ء میں حدود ہند کے آخری کنارے پر آسام اور برما پر بھی فتح حاصل کر کے ان مقامات پر اپنے ریزیڈنٹ مقرر کر دیئے گئے اس طرح انگریز باری باری کر کے پورے ملک پر قابض ہو گئے، صرف دہلی کے لال قلعہ میں مغلیہ سلطنت کا آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر بے دست و پا تخت حکومت پر تھا، لال قلعہ میں کئی انگریز

مشیر کار مقرر تھے جن کی مرضی کے بغیر بادشاہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسید پردۂ عدم سے عالم وجود میں آئے، ہر انسان کی نشو ونما کا جو ماحول ہوتا ہے، اس کے گردوپیش جو حالات ہوتے ہیں ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، اس کا ذہن ومزاج اسی طرح افکار وخیالات کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے جو اس کے گردوپیش اور ماحول کا تقاضا ہوتا ہے، اس انقلاب نے ہندوستانی معاشرے کو تہ وبالا کردیا تھا ہر شخص کو بالخصوص مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے ہر فرد کو اپنا مستقبل سخت تاریک نظر آرہا تھا، سرسید بھی انھیں لوگوں میں سے تھے اس لئے وہ اس سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔

## بجھتا ہوا چراغ اور دَمکتا ہوا سُورج

سرسیّد کے والد کو لال قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی اس لئے یہ خاندان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد قلعہ کی تنخواہ بند ہوگئی، تھوڑی سی رقم وظیفہ کے نام سے ملتی تھی، اب سرسید کی عمر ۲۲ سال کی ہوچکی تھی، اس لئے ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی، انھوں نے سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ کی سمت ایک نظر ڈالی جس کا تیل ختم ہوچکا تھا، صرف بتی جل رہی تھی، کوئی بھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی تھا، انھوں نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ سحر کی طرف سے بے نیازی کے ساتھ رُخ پھیرلیا کہ جو چراغ لال قلعہ کی فصیلوں تک کو روشن نہیں کرسکتا وہ مرے گھر کو کیا اُجالا دے سکتا ہے، اس کے بالمقابل ان کے سامنے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقبال کا دمکتا ہوا سورج تھا جس کی تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی اس لئے انھوں نے اسی سورج سے کچھ کرنیں لے کر اپنے گھر کو بقعہ نور بنانے کا فیصلہ کرلیا، اسی دن زندگی کے آخری لمحہ تک ان کا قبلہ مقصود ایک ہی رہا، ان کی جبین نیاز کے لئے ایک ہی سنگ در اور کعبۂ مراد متعین ہوگیا اور پھر پوری زندگی میں کوئی بھی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ انھوں نے دائیں بائیں دیکھا ہو جو سر جس چوکھٹ پر جھک گیا اس سے پوری

زندگی نہیں اٹھایا۔

سرسید کے خالو خلیل اللہ خان دہلی میں صدر امین تھے، ان کے توسط سے سررابرٹ ہملٹن سے تعارف ہوا اور انھیں کی توجہ سے فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں ان کو نائب منشی بنادیا گیا، ان کی صلاحیت اور انگریزی حکومت سے بے لچک وفاداری کا تجربہ کرنے کے بعد ان کے لئے مسٹر ہملٹن نے عہدۂ منصفی کی سفارش کردی اور وہ منظور ہوگئی وہ اسی عہدے پر فتحپور رسیکری، مین پوری آگرہ وغیرہ میں فائز رہے پھر آپ کا بجنور تبادلہ ہوگیا، وہاں دوسال سے زائد رہے اور یہیں سے ان کی زندگی کے اصل کارنامے ظہور میں آئے۔

قیام بجنور ہی کے زمانہ میں غدر ۱۸۵۷ء کا تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، انگریزی حکومت نے اُسے غدر کے مکروہ نام سے ذکر کیا، وطن پرستوں نے اس کو تحریک آزادی کے آغاز اور جہاد حریت کے جوش آفریں لفظوں سے تعبیر کیا، یہ واقعہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ثابت ہوا، جس میں ہندوستان کے باشندوں کو تپا کر یہ جانچا گیا کہ کون کھرا سونا ہے اور کون کھوٹا؟ کیونکہ یہی تاریخ ہندوستان میں ہندوستانیوں یا مسلمانوں کی حکومت کی آخری تاریخ تھی، انگریزی حکومت جو ایک صدی سے ہندوستانیوں کی غلامی کی دستاویز لکھ رہی تھی مئی ۱۸۵۷ء میں اس دستاویز پر آخری مہر لگائی جارہی تھی، اسی واقعہ نے لوگوں کے درمیان حدفاصِل کھینچ دی کہ کون وطن دوست ہے اور کون وطن دشمن؟

## بہادر شاہ ظفر کا آخری انجام

اب تک لال قلعہ میں تخت حکومت پر بہادر شاہ ظفر متمکن تھے، اگرچہ بادشاہت صرف نام کی تھی اختیارات مسلوب تھے، لیکن اب بھی یہ احساس باقی تھا کہ ہندوستان کی بادشاہت ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اس ہنگامہ میں حالات کے دباؤ سے مجبور ہوکر بہادر شاہ ظفر اپنے شاہزادوں کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں پناہ لیتا ہے، لیکن اب انگریز مسلمانوں کی حکومت کے نام ونشان کو یکسر مٹادینے کا تہیہ کرچکا تھا، اس

لئے جنرل ہڈسن اپنے گھوڑ سوار دستے کے ساتھ مقبرہ ہمایوں پہنچا، بہادر شاہ ظفر اور شاہزادوں کو گرفتار کر کے لاتا ہے اور خونی گیٹ پر پہنچ کر شاہزادوں کی گردنیں قلم کرنے کا حکم دیتا ہے، اِدھر شہزادوں کے سروں کو خونی دروازے پر لٹکایا جارہا ہے اُدھر جنرل ہڈسن دور کھڑا اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ لگا رہا ہے، بہادر شاہ ظفر کو شہر بدر کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

## انگریز کلکٹر کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت سر سیّد اپنے ساتھ پولیس کا ایک مسلح دستہ لے کر بجنور کے انگریز کلکٹر کے بنگلے کا پہرہ دے رہے تھے کہ مسلمان اور ہندو جو آمادۂ بغاوت ہیں حملہ آور نہ ہو جائیں اور ایک انگریز کی جان چلی جائے۔ حالی لکھتے ہیں:

”بجنور کے کلکٹر مسٹر شکسپیر اور مسز شکسپیر سے سر سیّد کی بہت رسم و راہ تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شکسپیر بہت گھبرائے، سر سیّد کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش آپ کی کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے میں مضائقہ نہیں[1]۔“

چند سطروں کے بعد حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سر سیّد عملی آدمی تھے جو کہا، اپنے عمل سے سچ کر دکھایا، ان کے الفاظ ہیں:

”وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں بچوں کو ڈھارس بندھواتے تھے، ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی[2]۔“

---

[1] حیات جاوید از حالی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۶، ۷۷۔

[2] حوالہ مذکور ص ۷۷۔

## مسلمانوں کا قتل عام

انگریزوں نے جب دہلی کے باغیوں پر قابو پالیا تو انھوں نے دہلی کی چاندنی چوک میں معزز مسلمانوں رؤسا، اُمراء، جاگیردار، علماء شعراء اور مشائخ کو گرفتار کر کے بلا امتیاز اور بلا ثبوت جرم پھانسیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیا، سر ایڈ روڈ ٹامسن نے اپنی کتاب ''دی آدر سائڈ آف دی ماڈل'' میں درجنوں رونگٹے کھڑا کر دینے والے واقعات لکھے ہیں، وہ معزز مسلمانوں کو عام دستور کے مطابق گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی دیتے تھے اور کبھی کبھی سزا کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے، مذکورہ بالا انگریز نے دل دہلا دینے والے طریقوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، سزا دینے کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ کسی درخت کی شاخ میں رسی کا پھندا باندھ دیا، مسلمان مجرم کو ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے جا کر اس کی گردن میں پھندا ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، مجرم اسی پھندے میں جھول جاتا، زبان منہ سے نکل کر باہر آ جاتی، جان کنی کا وہ دردناک منظر ہوتا کہ وہ مرغ بسمل کی طرح ناچتا اور سکڑ کر انگریزی کا 8 بن جاتا تھا، دوسرا طریقہ خاص خاص اور ممتاز مسلمانوں کو سزا دینے کا یہ اختیار کیا تھا کہ اس مسلمان کو توپ کے منہ پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پھر توپ چلا دی جاتی، اس مسلمان کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں اڑ جاتا اور اس کا خون فضا سے زمین پر اس طرح گرتا جیسے خون کی بارش ہو رہی ہے، یہ ڈرامہ ہزاروں انگریزوں، عورتوں اور بچوں کے سامنے کھیلا جاتا تھا، سزا کے ان ہیبتناک طریقوں کو دیکھ کر اور سن کر پورا ہندوستان ڈرے ہوئے بچے کی طرح سہما ہوا تھا، انگریز اس وقت خون آشام بھیڑیا بن گیا تھا، ان کی درندگی و بہیمیت اور ان کی وحشت و بربریت کا کیا عالم تھا؟ اس کی سیکڑوں مثالوں میں سے صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش ہے۔

''انگریزوں نے کوچہ چیلان دہلی سے چودہ سو مسلمانوں کو گرفتار کیا جس میں مولانا امام بخش صہبائی بھی تھے جو دہلی کے ایک مشہور اور جید عالم اور مشہور

ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے ساتھیوں مین سے تھے مولانا موصوف کے دونو جوان صاحبزادے بھی گرفتاروں میں تھے، ان تمام بے قصور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے بھیڑ بکری کی طرح ہانک کر جمنا پارک لے گئے اور ایک قطار میں کھڑا کر کے سب کو گولی ماردی اور لاشوں کو جمنا پارک میں پھینک دیا[1]۔''

## انگریزوں کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت بجنور میں جہاں سر سیّد تعینات تھے آٹھ دس انگریزوں اور ان کے بیوی بچوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے، حالیؔ ہمیں سر سیّد کے لچک وفاداری کی یہ داستان سناتے ہیں:

''وہ رات جب کہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر حفاظت کے لئے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں بگڑ گئیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لئے مرادآباد سے عنقریب آنے والا تھا نہایت سخت تھی، اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہہ نہ تھا، ایسے نازک وقت میں سر سیّد تنہا اس خودسر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جوان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا بہتر یہی ہے کہ ان کو صحیح وسالم یہاں سے جانے دو......
اور سب انگریزوں کو اسی وقت اس خونخوار مجمع سے نکال کر روڑکی روانہ کردیا[2]۔''

## سر سیّد کا نقطۂ نگاہ

دراصل سر سیّد کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے جداگانہ تھا، وہ انگریزوں کو دوست

---

۱؎ تحریک آزادی اور مسلمان ناشر دارالمؤلفین دیوبند ص ۸۰۔
۲؎ حیات جاوید از حالیؔ مطبوعہ ترقی اُردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۷۔

سمجھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو دشمن اور گردن زدنی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے تھے، انگریزوں کا ہر طرز عمل صحیح اور درست، حق وانصاف کے مطابق تھا اور مسلمانوں کا انگریزوں کے مقابلہ میں ہر عمل لائق مذمت اور قابلِ نفرت تھا، حتی کہ مسلمانوں کے اقتدار اور حکومت کے بجائے انگریزوں کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے رحمت وبرکت تصور کرتے تھے، اس کے لئے وہ قرآن وحدیث کو استعمال کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت اوران سے مکمل وفاداری کا سبق پڑھاتے تھے، انگریزوں سے نفرت ودشمنی اور بغاوت کو مسلمانوں کا ناقابل معافی جرم تصور کرتے تھے، وہ اپنے مقالہ ''امام اور امامت'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''السلطان ظل اللہ فی الارض ...... حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر قید کے آیا ہے، بس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو، خواہ یہودی ہو، خواہ عیسائی ہو، خواہ آتش پرست ہو اس کے ساتھ اس کی رعیت کو اس طرح پیش آنا لازم ہے کہ جس طرح کہ حدیث میں بیان ہوا ہے...... تمام مسلمان ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں[1]۔''

اس لئے ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ پر ان کو کوئی ملال نہیں ہوا، بلکہ ان کو ایک گونہ خوشی تھی، انگریزی غلبہ واقتدار کے لئے ان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ تھا، ان کو بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا تھا، یہ سب کچھ سرسیّد کی عین منشا کے مطابق تھا اس پر ان کو رنج نہیں خوشی تھی خود اُنھیں کے الفاظ ہیں:

''دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا، اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے اس کی قدر ومنزلت گرادی تھی، ہاں، بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار اور اختیار

[1] ''مقالات سرسیّد'' مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء ص ۷۵، ۷۶۔

سے واقف نہ تھے بلاشبہہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اس کو ہندوستان میں بادشاہ اور آنربیل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے، الا خاص دہلی کے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے، باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا[1]۔''

بہادر شاہ کو احمق اور پاگل کہہ کر سر سیّد اس کا مذاق اڑا کر اپنے دلی جذبے کا ثبوت دیتے ہیں، یہ عام ہندوستانیوں کے جذبات ورجحانات کی ترجمانی نہیں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار ہے وہ حقیقتاً اپنے خیالات وجذبات کو عوام کے خیالات وجذبات کے نام سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ایک دوسری جگہ وہ خود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور لکھ دیا کہ:

''دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا، ہم کچھ تعجب نہیں سمجھتے، دلی کے معزول بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ ہندوستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔ دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ مکھی مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کے خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے پر کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں[2]۔''

ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر کے بارے میں جس شخص کے خیالات وجذبات یہ ہوں کیا اس سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی حفاظت کا اس کے دل میں واہمہ بھی گذر سکتا ہے اہانت کے نقطہ نگاہ سے بہادر شاہ ظفر کو مالی خولیائی آدمی تحریر فرماتے ہیں اور سفید فام

[1] ''اسباب بغاوت ہند''، ضمیمہ حیات جاوید ص ۸۰۶۔

[2] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ جاوید از حالی ص ۸۰۸۔

چنگیزوں اور ہلاکوؤں کے جتھ کو ''آنربیل ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے معزز لفظ سے یاد کرتے ہیں، سرسیّد کے دلی جذبات ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔

## مسلمان نمک حرام تھے

غدر ۱۸۵۷ء میں جن مشائخ، علماء، رؤساء، امراء اور عوام خواص نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی اور دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کرنے میں رکاوٹ ڈالی، دست بدست جنگ کی، شہید کئے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، کالے پانی بھیجے گئے، جنھوں نے اسلامی اقتدار کو بچانے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر جہاد کے نام سے تلوار اٹھائی ان سارے مسلمانوں کی سرسیّد بڑے پرجوش لفظوں میں مذمت کرتے ہوئے ان کو نمک حرام تک کہتے ہیں، انھوں نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے تین رسالے شائع کئے تھے، حالؔی نے انھیں رسالوں میں سے ایک رسالہ سے سرسیّد کے یہ جواہر پارے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں، سرسیّد تحریر فرماتے ہیں:

> ''جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی کی اور بدخواہی کی، میں ان کا طرفدار نہیں ہوں، میں اُن سے بہت ناراض ہوں، اور ان کو حد سے زیادہ برا جانتا ہوں، کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہئے تھا...... اس ہنگامہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہئے تھا، پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے خلاف کیا[1]۔''

## وفاداری کا انعام اور صلہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے لاکھوں مسلمانوں کو نان شبینہ کا محتاج بنادیا ہزاروں

[1] حیات جاوید از حالؔی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

رؤسا و امرا کو ہاتھ میں کاسۂ گدائی لینے پر مجبور کر دیا، رئیس زادیاں اور شہزادیاں یا تو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لگانے اور برتن مانجنے کے لئے نوکرانیاں بن گئیں یا در در بھیک مانگنے لگیں گویا مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اسی فضا اور ماحول میں انگریزوں نے سرسیّد کو ان کی وفاداری اور خدمات کا صلہ دینے کا اعلان کیا، انگریزوں کا یہ فیصلہ بجا تھا، ۵۷ء کے ہنگامہ میں جب انگریزوں کو ہندوستان کا ذرہ ذرہ اپنا دشمن نظر آتا تھا، ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس سے ان کو خوف نہ لگا ہوا ہو، ان کو ہندوستان میں اپنی حکومت کا خواب بکھرتا ہوا نظر آرہا تھا، ایسے مایوس کن حالات میں سرسیّد جیسا وفادار و مخلص اور ذہین آدمی انگریزوں کو مل گیا، جس نے ان کے دلوں کو ڈھارس بندھائی اور اپنے دائرہ کار میں انگریزوں کی پوری پوری حفاظت کی، اس کے بھائی مسلمانوں کو انگریزوں نے بھیڑ بکری کی طرح ذبح کیا اور وہ مسکراتا رہا، اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کے پرخچے اڑا دیئے گئے مگر اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا، بلکہ خود بھی مسلمان بادشاہ کو پاگل اور دیوانہ کہہ کر انگریزوں کے طرزِ عمل کو اس نے خراجِ عقیدت پیش کیا، ایسے مخلص اور بے لچک وفاداری کرنے والے انسان کی خدمات کا صلہ نہ دیا جائے؟ یہ کیسے ممکن تھا، انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں کی پیشکش کی لیکن سرسیّد نے بڑی بے نیازی سے ٹھکرا دیا یہ ان کے خلوص کی توہین تھی، ان کی مخلصانہ خدمات صلہ و انعام سے کہیں بلند تھیں، جاگیر قبول کرنے سے انکار سرسیّد کی تدبیر و فراست کی دلیل تھی، وہ انگریزوں سے زیادہ چالاک تھے اور کم از کم اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جن انگریزوں سے سرسیّد کا واسطہ پڑا اور جن انگریز افسران کی ماتحتی میں وہ کام کر رہے تھے ان سب سے کہیں زیادہ ذہین و فطین تھے اس لئے ان کی طرف سے جاگیر کی پیشکش تھی اور سرسیّد کی طرف سے مسلسل انکار، کیونکہ مستقبل کی راہ میں یہ جاگیر سرسیّد کے لئے سب سے بڑی رُکاوٹ بن سکتی تھی، اسی ہندوستان کی سرزمین پر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یہیں کے ہندو مسلمانوں میں ان کو کام کرنا تھا، جاگیر قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ یہاں کے

عوام کی نگاہوں سے گر جاتے اور پھر جا گیر کے بغیر بھی ان کی شاہانہ زندگی گذر سکتی تھی، انھوں نے نقد انعام کو جاگر پر ترجیح دی اور جا گیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن انگریزی حکومت نے بطور اعزاز اور ان کے تقرب کے اظہار کے طور پر ان کو غدر میں انگریزوں کی بھرپور حمایت و مدد کرنے کا انعام اور صلہ دیا، خواجہ الطاف حسین حاؔلی ہمیں بتاتے ہیں:

''گورنمنٹ نے خود ان کی خدمات کی قدر کی اور اُنکے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دوسو روپیہ ماہوار کی پولٹیکل پنشن دونسلوں تک مقرر کی[1]۔''

سرسیّد کو اپنی خدمات کا صلہ اور انعام لینے سے انکار نہیں تھا کیونکہ اس سے ان کی خدمات کا اعتراف ہوتا تھا اور یہ سب سے بڑی بات تھی کہ انگریزی گورنمنٹ سرسیّد کو اپنا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کرے، مگر جا گیر لے کر بدنام ہونا اور عوام میں رسوا ہونا منظور نہیں تھا۔ حاؔلی لکھتے ہیں:

''مسٹر شکسپیر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ من جملہ تعلقہ چاندپور کے ایک معقول جائداد سیّد احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہئے مگر جب انھوں نے سرسیّد سے اس بات میں استمزاج لیا تو انھوں نے اس کے لینے سے انکار کیا انھوں نے سرسیّد سے کہا کہ نقد پنشن بہت کم مقرر ہوگی تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے مگر مجھ کو جائداد لینی منظور نہیں[2]۔''

## طائرِ فکر کی بلند پروازی

غدر ۱۸۵۷ء کے سرسیّد چشم دید گواہ ہی نہیں تھے بلکہ اس دہکتی ہوئی آگ میں کود کر اپنے سرکاری فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے تھے، اس سلسلہ میں کئی بار ان کو اپنی جان داؤ پر لگانی پڑی اور ان کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا، بجنور میں جہاں وہ

---

[1] حیات جاوید از حاؔلی، ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔
[2] حیات جاوید از حاؔلی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔

تعینات تھے کچھ انگریز اوران کے بال بچے جن کی تعداد پندرہ بیس کے قریب رہی ہوگی ان کو محفوظ اور سلامت رکھنے اوران کو بہ حفاظت انگریزوں کی فوجی چھاؤنی روڑکی پہنچانے میں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا وہ سرسیّد جیسا وفادار اور انگریزی حکومت کا مخلص خیر خواہ ہی جھیل سکتا تھا، باغی مسلمانون سے سامنا ہونا اوران کا انگریزوں کے قتل پر بضد ہونا اور سرسیّد کا پوری ہمت وجرأت سے باغیوں کے سردار محمود علی خاں سے گفتگو کر کے اس کو راضی کرنا کہ وہ انگریزوں کو قتل نہ کرے یہ سرسیّد ہی کا دل گردہ تھا، انھوں نے اپنی جرأت سے کام لے کر ان انگریزوں اوران کے بال بچوں کو بغاوت کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے صاف نکال لیا اوران کو روڑکی پہنچا کر اطمینان کی سانس لی جس کی وجہ سے بجنور کا انگریز کلکٹر شیکسپئر خاص طور پر بہت متأثر ہوا اوراس نے اپنی حکومت سے سرسیّد کے لئے بہت بڑے انعام کی سفارش کرنی چاہی لیکن سرسیّد نے سوچا کہ یہ ایک ضلع کا حاکم معمولی انگریز ہے، اس کی خوشی وناخوشی کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتی ہے اس لئے براہِ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کے جلیل القدر ارکان اور ممبران پارلیمنٹ لندن کو اپنی خدمات سے متعارف کرنا زیادہ ضروری ہے، اس لئے جب وہ بجنور سے فرار کر کے بڑی بڑی مصیبتوں سے میرٹھ پہنچے تو انھیں رسالہ ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھنے کا خیال پیدا ہوا اوراسے مرتب کر کے شائع بھی کردیا، اس رسالہ کا خاص مقصد ان معزز مسلمانوں کی مخبری اور نشاندہی کرنی اور سزا دلانی تھی جنھوں نے بہت نمایاں طور پر انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ حالؔی لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو رعایت اور بے کم وکاست لکھے گئے ہیں، جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب وفراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اوراس سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کردیئے ہیں[1]۔''

---

[1] حیات جاوید از حالؔی ص۷۹، ۸۰ دیکھئے۔

اب سرسیّد کا مراد آباد ٹرانسفر ہو گیا، انگریز بغاوت پر قابو پا چکے تھے اور ہندوستانیوں کو کچل کر نیم جاں بنانے کے بعد مطمئن تھے اس لئے سرسیّد کو اب مراد آباد میں قدرے اطمینان نصیب ہوا، اور انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دینے کی تیاری کی اور وہ تھا ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کا مرتب کرنا اور چھپوا کر لندن بھیجنا، یہ رسالہ سرسیّد نے اگر چہ کمال خیر خواہی اور بے لچک انگریزی گورنمنٹ سے وفاداری کے جذبے سے لکھا تھا لیکن ان کے لئے ایک آزمائش اور امتحان بن گیا، لندن میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا اور ارکان پارلیمنٹ میں تقسیم کیا گیا، رسالہ کا ردعمل متضاد ہوا، اشتعال پسند ممبران نے کہا کہ یہ رسالہ ہماری حکومت کو بدنام کرنے والا ہے مصنف سے باز پرس ہونی چاہیے، صاحب تدبر وفراست اور روشن دماغ ارکان پارلیمنٹ کا تأثر اس کے برعکس تھا انھوں نے رسالہ کی قدر و قیمت کو پہچانا اور مصنف کی طرف سے دفاع کیا کہ یہ رسالہ سراسر حکومت کی خیر خواہی کی نیت سے لکھا گیا ہے اور اس پر ہم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے لیکن مشتعل ممبران اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے سرسیّد سے باز پرس کی اور سخت باز پرس کی، رسالہ کی مخالفت میں سب سے گرم بیان وزارت خارجہ کے سکریٹری مسٹر سسلی بیڈن کا تھا، انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:

> ''اس شخص نے بہت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور کوئی معقول جواب نہ دسکے تو سخت سزا دینی چاہیے [1]۔''

اتفاق سے مسٹر سسلی بیڈن ہندوستان آئے، سرسیّد کو اپنی کوٹھی پر بلوا کر بہت ہی گرم لب ولہجہ میں ان سے باز پرس کی اس کا لب ولہجہ اتنا درشت اور سخت تھا کہ سرسیّد کو سوائے صفائی دینے کے اور کوئی راہ فرار نظر نہیں آئی، مسٹر سسلی بیڈن نے کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے یہ رسالہ لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ

---

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۹۴۔

کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے، چونکہ سرسیّد انگریزوں کے لئے انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ حکومت کے خیر خواہ تھے اس لئے اول روز ہی سے نہایت دانشمندانہ اقدامات کئے تھے اس لئے انھوں نے مسٹر سسلی بیڈن کے جواب میں کہا:

''میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے...... میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا، صرف ایک کتاب گورنمنٹ کو بھیجی ہے اور اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔[1]''

غلام ہندوستان کا ایک معمولی ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت کا سرکاری ملازم لندن سے آئے ہوئے وزارت خارجہ کے انگریز سکریٹری کے جواب میں اس سے زیادہ فدویانہ صفائی اور کیا دے سکتا تھا، لیکن سرسیّد چونکہ حکومت کی وفاداری میں سچے تھے اس لئے رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت والی بات ہوئی۔

## سرسیّد کی ذہانت

اس تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں ایک یہ کہ یہ رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' ہندوستان اور یہاں کے عوام کی خیر خواہی اور بھلائی کی نیت سے قطعاً نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا واحد مقصد انگریزوں کی نئی نئی حکومت کے مستقبل میں آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ اگر تم کو ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کرنی ہے تو رسالہ میں درج مشوروں پر عمل کرو، دوسری بات یہ کہ رسالہ بتاتا ہے کہ سرسیّد بہت ذہین بہت بڑے سیاستداں، بہت ہی مدبر اور حکومت وسیادت کا دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے یہ رسالہ لکھ کر انگریزوں کو بتایا کہ تم

[1] حیات جاوید از حالیؔ ص ۹۴، ۹۵۔

طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان پر قبضہ ضرور کر چکے ہولیکن اپنے قبضہ کو برقرار رکھنے اور ہندوستان کو غلامی کے شکنجوں میں جکڑے رکھنے کے لئے تدبیریں مجھ سے سیکھو، سرسیّد بادشاہ نہیں تھے لیکن بادشاہ گرضرور تھے، یہ صرف سرسیّد کا دماغ تھا کہ اس نے انگریزی گورنمنٹ کو ہندوستان میں حکومت کرنے کا ایک ایسا بینادی گُر بتادیا کہ انھوں نے اس پر عمل کر کے محدود تعداد میں رہتے ہوئے اتنی کثیر آبادی والے ملک پر نہایت رعب داب اور شان شوکت سے پوری ایک صدی تک حکومت کی، میں اس کی مثال میں بعض مشوروں کی نشاندہی مناسب سمجھتا ہوں۔

## ہندوستانیوں کولڑاؤاور حکومت کرو

سرسیّد نے اپنے رسالہ میں انگریزوں کو سب سے اہم جو مشورہ دیا وہ یہ تھا کہ ہندو مسلمان میں تفریق پیدا کر دو دونوں کو کبھی ایک محاذ پر جمع مت ہونے دو، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار بنائے رکھو، تمہاری حکومت کامیابی سے چلتی رہے گی، اب تک پورے ہندوستان میں چاہے وہ مغلوں کی فوج ہو یا کسی مسلمان نواب یا کسی ہندوراجہ مہاراجہ کی ہر جگہ بلا استثناء ہندومسلم سپاہیوں کی مشترک فوج رکھی جاتی تھی، ایک ہی دستے میں ہندو سپاہی بھی ہوتے تھے اور مسلمان سپاہی بھی، میرٹھ میں جب بغاوت کا آغاز ہوا، وہاں بھی چھاؤنی میں ہندواور مسلمان کی ملی جلی فوج تھی جو مغلوں کے زمانہ سے چلی آرہی تھی، سرسیّد نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ فوج کی یہ ترتیب تم فوراً ختم کردو، ورنہ تمہاری حکومت کو ہمہ وقت ہندوستان میں خطرہ لاحق رہے گا، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کردو، جب دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ ہوجائیں گی تو ان میں آپسی اختلافات لازمی ہوگا اس لئے اگر مسلمان بغاوت کرتا ہے تو ہندو اس کی مخالفت کرے گا، اور ہندؤں میں بغاوت کے آثار اگر ظاہر ہوں گے تو مسلمان اس کی راہ کا روڑا بن جائے گا، اس لئے پہلے ہی دن سے انگریزوں کو ’’ڈیوائڈ اینڈ رول‘‘ کو اپنا بنیادی عقیدہ بنالینا چاہئے ،سرسیّد لکھتے ہیں:

''یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا، مگر یہ سبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا، ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بہ سبب ایک جا رہنے کے اور لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا، ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی، دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں، اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے، ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہو جاتا تھا، اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمان کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس میں اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی، اور وہی تفرقہ قائم رہتا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا[1]۔''

انگریزی حکومت پر سرسیّد کا یہ اتنا زبردست احسان ہے کہ جب تک انگریز ہندوستان میں رہے اس کا عملی طور پر اعتراف کرتے رہے، اور تاریخ کے ہر دور میں سرسیّد کے اس سنہرے مشورے پر عمل کرتے رہے، جنگ آزادی کے دوران ہندوستان کے محبوب ترین اور قد آور لیڈروں اور رہنماؤں نے انگریزوں کے طلسم کو توڑنا چاہا اور کبھی کبھی کچھ دیر کے لئے کامیاب بھی ہوئے اور ہندو مسلمان ایک پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف جمع ہوئے لیکن حکومت کو سرسیّد کا یہ مشورہ یاد رہا اسی لئے جب خلافت کے زمانہ میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے تو انھوں نے سوامی شردھانند کو جو کانگریس کے لیڈر تھے جیل سے رہا کر کے ''شدھی اور سنگھٹن'' کی تحریک چلوا کر اس اتحاد و اتفاق کو ڈائنامیٹ کر دیا، اس طرح انھوں نے اپنی پوری حکمرانی میں سرسیّد کے

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ص ۸۴۳۔

دیئے ہوئے اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کیا، عہد غلامی کی درازی میں سرسیّد کا زبردست ہاتھ تھا۔

## سرسیّد پر حکومت کا اعتماد بڑھتا چلا گیا

انھیں باتوں کی وجہ سے روز بہ روز سرسیّد کی ذات پر انگریزی گورنمنٹ کا اعتماد بڑھتا چلا گیا، سرسیّد کی صداقت وراستبازی، ان کا اخلاص اوران کے جذبۂ وفاداری نے انگریزوں کے دلوں میں اپنا بلند مقام بنالیا تھا وہ عہدہ کے لحاظ سے منصف تھے جو ڈپٹی کلکٹر کی سطح کا ایک عہدہ ہے جواس دور میں ہمیشہ انگریز کلکٹر کے ماتحت ہوتا تھا اس کا دائرۂ کار بھی ضلع کے ایک مخصوص حصہ تک رہتا تھا جو ایک تحصیل کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ غیر معمولی عہدہ ان کی بلند وبالا شخصیت کے لئے حجاب نہیں بن سکا، ان کی شخصیت کا جوہر جوں جوں نکھرتا گیا انگریزوں کی محفلوں میں ان کا اعزاز بڑھتا چلا گیا، مگر سرسیّد اپنے موجودہ اعزاز وافتخار پر قناعت کرکے نہیں بیٹھ گئے بلکہ ہمہ وقت ایک کے بعد ایک بلند مقام تک پہنچنے کی سعی مسلسل کرتے رہتے تھے، اس کے لئے انھوں نے ہرطرح کی قربانی دینے کا تہیہ کرلیا تھا، چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اس لئے بحیثیت سرکاری ملازم وطن دوستوں کے علی الرغم انگریزی حکومت کے وفادار اور خیرخواہ تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی وفاداری ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہوچکی تھی لیکن سرسیّد کی وفاداری اس سے بھی بلند مقام چاہتی تھی، وہ سوچ رہے تھے کہ ایک فرد کی وفاداری پوری مسلمان قوم کی وفاداری کا بدل نہیں ہوسکتی اور جب تک پوری مسلمان قوم پر یہ رنگ نہ چڑھ جائے اس وقت تک ان کا جذبۂ وفاداری پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور انگریزی حکومت کو ہندوستان میں استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس مقصد کے لئے سرسیّد نے سفرلندن کا عزم مصمم کرلیا، ایک بیٹے کو اسکالر شیپ مل گئی اپنے اور اپنے دوسرے بیٹے اور ایک ذاتی ملازم کے اخراجات سفر کے لئے انھوں نے ازخود انتظام کیا اور پورے جاہ وطمطراق کے ساتھ چار افرد کا یہ قافلہ

لندن کے لئے روانہ ہو گیا، اِس سفر کا مقصد ایسے اسباب و ذرائع کی تلاش تھی جن سے کام لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہو، سر سیّد خود لکھتے ہیں:

"یہ بات میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے۔ بخوبی استحکام و پائیداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دی جائے۔ بس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے ان کو فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں[1]۔"

## لندن میں سر سیّد کا اعزاز

سر سیّد ہندوستان میں جس عہدہ پر تھے آپ اس سے واقف ہیں، اس ضلع سے اُس ضلع میں ان کا ٹرانسفر اسی طرح ہوتا رہتا تھا، جیسے عام ملازمین کا، کبھی بجنور میں کبھی مراد آباد میں، کبھی غازی پور میں کبھی بنارس میں ان کا عہدۂ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے مساوی تھا اس کے باوجود لندن میں جو ان کا اعزاز و اکرام کیا گیا وہ ہندوستان کی ایک عظیم ترین شخصیت کی حیثیت سے ہوا، لارڈ لارنس جو لندن کی معزز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے وہ سر سیّد پر سب سے زیادہ مہربان تھے اور مروت سے پیش آتے تھے، اپنے گھر پر ان کو اکثر ڈنر پر بلاتے تھے اور ہر مہینہ میں ایک بار سر سیّد سے ملنے ان کی قیام گاہ پر آتے تھے، انھوں نے لندن کے اکثر اُمراء اور مشاہیر سے سر سیّد کو ملوایا، لارڈ اسٹینلی جو قسطنطنیہ میں حکومت کے سفیر تھے، وہ جب لندن آتے سر سیّد سے ضرور

---

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

ملتے تھے، سر جان ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سر سیّد کو بوجوہ خصوصیت ہوگئی تھی، ملکہ معظّمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے وہ بھی سر سیّد سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی جو ملکہ معظّمہ کے داماد ہیں، ملایا۔

## اس اعزاز واکرام کا راز کیا تھا؟

انگریز جیسی مغرور قوم ایک غلام ملک کے ایک فرد کا یہ اعزاز واکرام کرے، یہ حیرتناک بات تھی، آخر اس کی تہ میں راز کیا تھا؟ بات یہ ہے کہ سر سیّد کے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کا انگریزی ترجمہ کر کے جب تقسیم کیا گیا تو اولاً بعض جذباتی انگریزوں نے اپنی برہمی کا اظہار کیا لیکن حکومت کے اعلیٰ ارکان نے اس کو قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور جب سنجیدگی کے ساتھ اس رسالہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو اس کی صحیح قدر ومنزلت کا اندازہ ہوا، سر سیّد نے جتنے مشورے انگریزوں کو دیئے تھے اور جس خلوص سے دیئے تھے وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام کے لئے ٹھوس بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے، سر سیّد کی تحریر میں جو بے لچک وفاداری کی روح دوڑ رہی تھی انگریزوں نے اس کو پالیا اس لئے سر سیّد کی قدر ومنزلت میں یک بیک اضافہ ہوگیا اور ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، غلام ہندوستان سے جس کا ذرہ ذرہ انگریزوں کے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا اتنا مخلص اتنا وفادار اتنا زیرک اتنا ذہین وفطین انسان ان کو مل جائے گا ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، جس کو اپنے آقا کی محبت میں مسلمانوں کی حکومت کے تہس نہس ہونے کا ذرا غم نہیں، ہزاروں ہزار مسلمان انگریزوں کی تلوار سے خاک وخون میں تڑپے مگر اس کو کوئی ملال نہیں، اس کے لب حرف شکایت سے آشنا نہیں، وفاداری کا جذبہ اگر اس کے سینے میں موجزن ہے تو وہ صرف انگریزی حکومت کیلئے لندن کے ارباب دانش کے لئے یہ بڑا حیرتناک انکشاف تھا، یہ اعزاز واکرام سر سیّد کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا جس کے وہ

مستحق تھے، سرسیّد نے ان کو بتایا کہ ایک ایسے ملک میں جو ایک مذہبی ملک ہے، مختلف اور متضاد مذہب اور تہذیب و معاشرت کے لوگ رہتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد مذہب رکھتے ہیں ایسے ملک میں حکومت کیسے کی جا سکتی ہے؟ انگریزوں نے اب تک صرف اپنی فوجی قوت پر بھروسہ رکھا تھا مصلحت بینی اور دور اندیشی کا فقدان تھا، سرسیّد نے ان کی نگاہوں کے سامنے ایک روشن شاہرا کھول دی چونکہ ہر مشورہ انھوں نے پورے خلوص پوری دلسوزی اور دل کی گہرائیوں سے مکمل وفاداری کے جذبے سے دیا تھا اس لئے ان میں کہیں جھول نہیں تھا اسی لئے انگریزوں نے سرسیّد کی قدر کی اور ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا، ہر انسان اپنے محسن کی قدر کرتا ہے، انگریزوں نے اپنے طرزِ عمل سے بتا دیا کہ ہم بھی احسان شناس ہیں، احسان فراموش نہیں۔

## سرسیّد کی لندن میں ایک تقریر

لندن میں انجینیر وں کا ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں حکومت کے اہم ذمہ داروں نے شرکت کی تھی سرسیّد کو بھی مدعو کیا گیا تھا، خود لارڈ لارنس نے بہت شاندار لفظوں میں سرسیّد کا تعارف کرایا اور پھر ان سے گذارش کی گئی کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں، سرسیّد بھی اس موقعہ کو ہاتھ سے دینا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تقریر پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔

سرسیّد اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ایک مقام پر انگریزی حکومت کو یہ مشورہ دے چکے تھے کہ ہندوستان میں اگر آپ کو حکومت کرنی ہے تو رعب داب اور شاہانہ جاہ و طمطراق کے ساتھ حکومت کیجئے، ہندوستانیوں کو اپنی رعایا محکوم اور ماتحت تصور کیجئے، اس کے بغیر ہندوستان میں حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی، انھوں نے لکھا تھا:

''اہل ہند کو قدیم عادت تھی کہ اپنے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، بادشاہ کی شان و شوکت اور تجمل و تحشم دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ایک قاعدہ جبلت انسانی میں پڑا ہوا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے، یہ بات جانتا

ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا مالک ہے، ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں[۱]۔''

یہ مشورہ انگریزوں کے لئے بڑا قیمتی مشورہ تھا اور ان کے مغرورانہ مزاج کے عین مطابق تھا رسالہ کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر لندن کا اونچا طبقہ سرسیّد کے ان جذبات وخیالات سے واقف تھا، اس لئے جب انجینیر وں کے جلسہ میں انھوں نے تقریر کی کہ:

''ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں مثلاً تعلیم، ہتھیار، اور عدل وانصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انھیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے جن کو ان سے کام پڑا ہے جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا ہے لیکن وہ چیز جس نے خاص وعام سب کے دل میں انگلش قوم کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینیر ی کے نتائج ہیں جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے، ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب داب اور اس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے[۲]۔''

تو سرسیّد کی اس تقریر پر اتنی زوروں کی تالیاں بجائی گئیں کہ پورا ہال گونج گیا، کیونکہ خود پسند اور مغرور انسانوں سے کہا جائے کہ ان سے دوسرے لوگ بہت ہی مرعوب ہیں تو اس کو بڑی مسرت ہوتی ہے، سرسیّد نے اسی نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی تقریر کا انداز بیان یہی رکھا۔

## جنت کی سیر

سرسیّد جیسے مخلص اور دیانتدار سرکاری ملازم اور عالی دماغ انسان انگریزی حکومت کا سچا خیر خواہ ملکہ معظّمہ کا اتنا معتقد ہو کہ اس کے سر پر خدا کا ہاتھ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ملکہ کی طرف سے شائع کئے جانے والے

---

۱ رسالہ اسباب بغاوت ہند، ضمیمہ حیات جاوید از حالیؒ ص ۸۳۸۔

۲ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۳۔

اشتہار کو الہامی کہتا ہوا ایسے شخص کی اگر پورے جوش اور ولولے سے پذیرائی ہو اور مسرت و خوشی سے مملو ہو کر اگر ان کو یورپین تہذیب وعریانت کے جاذب نظر اور دلکش مناظر بھی دکھا دیئے جائیں تو اس کا جذبۂ وفاداری اپنے معراج کمال پر پہنچ جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے سرسیّد کو مختلف مقامات کی سیر کرائی گئی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹیوں سے ان کو رُوشناس کرایا گیا، شاندار سے شاندار مناظر دکھائے گئے، سرسیّد ان تفریحات اور دلکش مناظر کے دیکھنے کے بعد سیّد مہدی علی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے؟ یا نہیں[1]؟''

سرسیّد نے انگریزوں کی زندگی کو اندر باہر سے خوب تفصیل سے دیکھا اور بہت متاثر ہوئے، ڈیڑھ سو سالوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے بے پناہ دولت حاصل کی تھی، لندن کے بہت سے لُچے لفنگے، آوارہ گرد نوجوان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم بن کر ہندوستان آئے، انھوں نے یہاں سونے کا بہتا ہوا دریا دیکھا، ہیرے جواہرات کے انبار دیکھے، دونوں ہاتھوں سے خوب سمیٹا، وہ لندن میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے، لفاظی نہیں اظہار واقعہ ہے میں بطور مثال صرف ایک اقتباس ایک انگریز مصنف گرے کی تاریخ ہند سے دے رہا ہوں، وہ لکھتا ہے:

''سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ، سامان کو موقع ہی پر تقسیم کرلیا جائے، جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کے لحاظ اور اندازہ لگا کر اسے مال غنیمت سے حصہ دیدیا جائے، اس تقسیم کے لئے ایجنٹ مقرر کر دیئے گئے میجر پرائس لکھتا ہے کہ میں بھی اسی میں تھا، قلعہ کی دولت دیکھ کر آنکھیں پھر گئیں، دیکھا نہیں جاتا تھا کہ نا قابل یقین دولت اور لاتعداد زر و جواہر قلعہ میں کہاں سے آگئے، مختلف قسم کے پارچہ جات

---

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیاء اور لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے، ہماری عقل حیران تھی، فرد حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے، معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے سپاہی اور توپ خانوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر چمپت ہو گئے تھے، شہر میں بھی ہر شخص نے خوب لوٹ مار کی بیسیوں گھروں میں جا کر روپیہ چھین لیا گیا، ڈاکٹر مٹن کے پاس ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پردہ اور کپڑے بیچے جن میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا، بعض اور زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے جوہری بھی قاصر تھے، اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر سے چرائے تھے اور اپنی رجمنٹ کے ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم پر فروخت کر دیئے تھے، تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ تمام جواہرات اور زیورات کو میز پر پھیلا دیا گیا اور ڈھیریاں بنا دی گئی تھیں، پھر ہر ڈھیری کی قیمت ایک جوہری کے ذریعہ سے تخمینہ کرائی گئی، جس کے بعد یہ چیزیں افسروں کو تقسیم کر دی گئیں، سوائے لارڈ ہیرس کے جو کمانڈر انچیف تھا باقی سب افسر میزوں کے گرد بیتابی کے ساتھ جمع ہو گئے، لارڈ صاحب اپنی بڑی پوزیشن کی وجہ سے نہیں آئے مگر انھیں ان کا حصہ خیمہ میں بھیج دیا گیا، لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت ۱۳۵۰۰ پونڈ بتائی جاتی ہے، یہ ہار ایک مندر کی مورتی کے پیٹ سے نکلا تھا، سر ڈیوڈ بیرڈ کو اس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قمیت پچاس ہزار تھی، مگر اس نے اس وقت غصہ میں آ کر اسے پھینک دیا تھا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے ایک سپاہی نے اٹھا کر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، میجروں کو جواہرات تقسیم کرنے کے بعد باقی جواہرات اور قیمتی اشیاء دیگر افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو خالص سونے اور جواہرات کی بنی ہوئی تھی، تخت چار سونے کے شیروں کی

پشت پر قائم تھا اس تخت کے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا دیئے گئے ۱۸۰۰ پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کر دیا گیا، اس تخت کے سامنے دو شیر ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیئے گئے، اس کے ساتھ کچھ اور ہیرے جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کر دیئے گئے، یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا، ہر سپاہی کو جسے پرائیویٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ ضرور مل گئے لیکن انھوں نے پرائیویٹ طور پر کافی روپیہ پیدا کر لیا تھا، کیونکہ میجر پرائس لکھتا ہے کہ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بھیجے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے، بعض سپاہیوں کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک شراب کی بوتل کے لئے کئی کئی سو روپئے کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے دام بیچ ڈالے ان تفصیلات سے جو سرکاری کاغذات کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں سمجھا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصص مثلاً بنگال کے محلات، اودھ کے شاہی خاندانوں، دہلی کے بادشاہ اور پنجاب کے علاقوں، اور سندھ کے امیروں، راجپوتانہ کی ریاستوں اور دیسی راجدھانیوں سے انگریزی افسروں، فوجی حاکموں، گماشتوں، کارندوں اور حتی کہ معمولی سپاہیوں نے جائز اور ناجائز طریقہ سے کس قدر روپیہ اینٹھا ہوگا [1]۔" (تاریخ ہند از گرے)

ہمارے آباء واجداد کی دولت لوٹ کر جب وہ ہندوستان سے لندن پہنچے تو وہ وہاں شاہانہ زندگی بسر کرنے لگے، عیش وعشرت اور رئیسانہ تکلفات سے آراستہ وپیراستہ ان کا معاشرہ بن گیا جو آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، سرسیّد نے ان مناظر کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے درد وغم کے بجائے ان کی آنکھوں میں رشک کی بجلیاں تیرنے لگیں۔

یورپ میں زندگی ہمیشہ اخلاقی بندشوں سے آزاد رہی اور جب ان کے یہاں دولت کی فراوانی ہوئی تو وہ خوب کھل کھیلے جس وجمال قدرتی تھا، پُر تکلف لباسوں نے

[1] تاریخ سلطنت خداداد (میسور) از محمود خاں بنگلوری شائع کردہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۴۷ء ص ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳۔

حسینان فرنگ کو اور چمکا دیا، عیش وعشرت کے پر تکلف سامان اور پاکیزہ تر اسباب معاشرت چمکتے چمچماتے فرنیچر اور لہکتے مہکتے در و بام، اور دعوت نظارہ دیتی ہوئی یورپین ہرنیاں اور تتلیاں، ان تمام رعنائیوں اور شادابیوں نے لندن کو دنیاوی جنت بنا رکھا تھا، سرسیّد ان مناظر کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے، اور جذبات کی رو میں بہ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو نصیحت کرنے لگے کہ وہ یورپین تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت اختیار کریں، تعصب اور دقیانوسیت اپنی زندگی سے باہر نکال کر باہر پھینک دیں، جنت ودوزخ کے فرضی تصورات کو ذہنوں سے جھٹک کر نکال دیں تو دنیا ان کے لئے خود جنت بن سکتی ہے زندگی کا سلیقہ انگریزوں سے سیکھیں، انگریزی حکومت کو السلطان ظل اللہ فی الارض کی نگاہ سے دیکھیں، ان سے نفرت وعداوت، بغض وعناد، دشمنی وبغاوت کر کے نمک حرامی نہ کریں اور ایک وفادار رعایا اور خیر خواہ دولت انگلیشیہ بن کر رہیں اسی میں ان کی بھلائی ہے، اس طرح کی نصیحتوں سے مملو بیانات وہ لندن سے لکھ کر ہندوستانی اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیجتے تھے اور وہ یہاں سے شائع ہوتے تھے جس کی وجہ سے پورے ملک میں سرسیّد کے خلاف غم وغصہ اور اشتعال کی فضا بن گئی، جب ان کے ہم مشرب ہم نواؤں نے ان کو ہندوستان کے حالات اور فضا سے مطلع کیا تو ان کو جوش اور جذبات کی رو یک بیک تھم گئی، انھوں نے محسوس کیا کہ ان سے چوک ہوگئی، ظاہر و باطن کی یکسانیت مستقبل کی راہوں میں سنگ گراں بن جائے گی، اس لئے اندرونی جذبات کو اپنے حدود میں رہنا چاہئے اور ظاہر کا دائرہ کار دوسرا ہونا چاہئے، انھوں نے ۲۲ / مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک تحریر بہ عنوان ''غدار از طرف گنہگار سیّد احمد خاں'' ہندوستان بھیجی اور پھر ایک مضمون بعنوان ''عرضداشت سیّد احمد بخدمت اہل وطن'' اخباروں میں اشاعت کے لئے روانہ کی[1]۔

## نئے جذبات اور نئی اُمنگیں

انگریزی حکومت کے ایک وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت کی

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

خواہی سر سیّد کا فرضی منصبی تھا جس کو وہ نہایت عزم و استقلال سے انتہائی کٹھن اور مشکل حالات میں بھی ادا کرتے رہے، اسی وجہ سے پوری انگریزی حکومت ان کے خلوص اور دیانتداری کی معترف ہوگئی اور ان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ زیر بار رہی، لندن میں ان کی پذیرائی اور اعزاز واحترام نے ان کے جذبہ وفاداری کو آتش سیال بنادیا اور وہ لندن ہی میں بیٹھ کر ہندوستان میں اپنے مشن کو چلانے کا ذہنی خاکہ تیار کرنے لگے تھے، لندن جانے کے بعد ان کو ہر طرح کی سہولتوں کے دراز ے کھلتے ہوئے نظر آنے لگے تھے، انگریزوں نے بھی اپنی غلطی کو محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتے تھے سر سیّد کو اندر باہر سے پرکھنے کے بعد ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی جیسا کہ سر سیّد کے لندن سے رخصت ہونے کے وقت ایک اخبار نے لکھا تھا:

> ''جن انگریزوں سے یہاں ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصیتوں نے ان سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کردیا تھا، بہت عمدہ اثر ہوا، یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایسے لئیق اور واقفکار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سیّد احمد خاں میں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی رہتی[۱]۔''

انگریز سر سیّد کی کن باتوں سے متأثر ہوئے؟ اور اپنے کام کے لئے ان کو موزوں ترین آدمی سمجھا؟ ہندوستان کے بارے میں ان سے کیا خصوصی گفتگو ہوئی کہ ہر ایک ان کی لیاقت کا قائل ہوگیا؟ وہ وہی بات تھی جو بلا استثناء ہر انگریز کے دل میں پیوست تھی کہ ہندوستان میں ہمارے کام کا کوئی آدمی نہیں، بالخصوص مسلمانوں میں ایسا کوئی شخص نہیں جو صحیح معنی میں خلوص دل سے برطانوی حکومت کا وفادار اور خیر خواہ ہو وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ پوری مسلمان قوم اپنا اقتدار چھن جانے کی وجہ سے تلملائی

---

۱ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۶۰۔

ہوئی ہے، ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کا لاوا پک رہا ہے، لیکن سرسیّد سے مل کر ان کی غلط فہمی دور ہوئی، اور پھر سرسیّد جیسا عالی دماغ انسان جو ایک حکومت کا دماغ رکھتا ہے، ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کی جاسکتی ہے، اتنے بڑے ملک کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے ہندوستان کی دو بڑی اور پرجوش قومیں مسلمان اور ہندوؤں کو کس طرح ایک دوسرے سے لڑا کر انگریزی حکومت کو بچایا جاسکتا ہے یہ سب کچھ ان کو سرسیّد سے سیکھنا پڑا، اور انھیں خطوط پر بعد میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو ایک صدی تک چلایا اور کامیاب ہوئے، انھیں احسانات کے اعتراف کے طور پر ملکہ وکٹوریہ کی بارگاہ خاص میں شرف باریابی حاصل ہوا، اور ان کے سمدھی اور داماد کے ہاتھوں سے ان کو تمغہ اور خطاب[۱] دیا گیا۔

## سرسیّد کی لندن سے واپسی

ایک سال پانچ ماہ لندن میں رہ کر جب ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسیّد ہندوستان تشریف لائے تو ان کے سینہ پر ایک چمکتا ہوا ستارہ اعزاز وافتخار کی آب وتاب سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا اور ان کے سر پر جواد الدولہ عارف جنگ آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس کا سنہرا تاج جگمگ جگمگ کر رہا تھا، یہ چمکتا ہوا ستارہ، یہ جگمگاتا ہوا تاج سرسیّد جیسے عالی دماغ شخص پر انگریزی حکومت کا کوئی احسان نہیں تھا، سرسیّد کا حق تھا جو ان کو ملا، کیونکہ جب پورے ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی دوست نہیں تھا وہ اپنے ہم وطن، ہم مذہب مجاہدین آزادی کی صفوں سے نکل کر ان انگریزوں کی صفوں میں شامل ہوگئے جو ان کے آباء واجداد کی آٹھ سو سالہ حکومت کو تہس نہس کر رہے تھے، وہ اپنے وطن اور اپنے ہم مذہب دونوں کی نگاہوں میں معتوب ہوئے لیکن انھوں نے انگریزوں کی رفاقت، ان کی مکمل اور ناقابل شکست اطاعت انقیاد اور بے لچک وفاداری کو ترک نہیں کیا، ان

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۱۵۳، ۱۵۴۔

کی خدمات لارڈ کلایو لارڈ ولزلی، لارڈ لارنس، جنرل ولسن، جنرل مارس اور جنرل ہڈسن کی خدمات سے کسی طرح کم نہ تھیں، انھوں نے حکومت کے دائرہ کوتلوار کی طاقت سے وسیع کیا اور سرسیّد نے اپنی حکمت عملی سے انگریزی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا، انھوں نے ہندوستانیوں کے دل ودماغ سے آزادی کے تصور کو بھی نکال دیا ور بھرپور کوشش کی کہ ہندوستانیوں کے دل ودماغ پر بغاوت وانقلاب کی پرچھائیں بھی نہ پڑیں، سرسیّد کا یہ کارنامہ انگریز فاتحین کے کارناموں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جوایک صدی پوری کی وہ انگریز جنرلوں اور کرنلوں کی شمشیرزنی کی وجہ سے نہیں سرسیّد کے صائب وصحیح مشوروں پرعمل کرکے یہ کامیابی حاصل کی، اس لئے یہ تمغہ اور خطاب سرسیّد پرکوئی احسان نہیں تھا بلکہ سرسیّد کے احسانات سے خود انگریزی حکومت کی گردن جھکی ہوئی تھی، سرسیّد اگرچہ رنگ، نسل اور خاندان کے لحاظ سے انگریز نہیں تھے لیکن دل ودماغ، ذہن وفکر اور جذبات وخیالات کے لحاظ سے انگریزی قوم کے ایک عظیم ترین فرد تھے۔

## مسلمانوں کودرس وفاداری

''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''رسالہ اساب بغاوت ہند'' کی اشاعت اور سفر انگلستان میں حکومت کی طرف سے اعزاز واکرام اور تمغہ خطاب پانے کے بعد سرسیّد کی ذات انگریزی حکومت کے وفاداروں کے لئے منارۂ نور بن گئی۔اب ہندوستان میں ان کی ہر جدوجہد اور سرگرمیاں حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے داروں کی نگاہ میں ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہوگئیں اور اب ان پر کسی کوانگلی اٹھانے کی جرأت نہیں رہ گئی، اس لئے لندن میں بیٹھ کر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے جو تجاویز سوچی تھیں اور جو خاکہ بنایا تھا ہندوستان واپسی کے بعد اس پر پوری سرگرمی سے عمل شروع کردیا، چونکہ سرسیّد انتہائی ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ آہنی عزم وارادہ کے بھی مالک تھے مشکلات کے وقت گھبرا جانا انھوں نے کبھی جانا ہی نہیں، ہر

طرح کی مخالفتوں کے طوفان میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں لگے رہنا اور پائے اثبات میں جنبش نہ ہونا ان کی فطرت تھی، اس لئے وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن میں لگ گئے۔

## سرسیّد پر کامل اعتماد کی ایک مثال

سرسیّد پر انگریزی حکومت کس درجہ اعتماد کرتی تھی اور اس کو کتنا بھروسہ تھا اس کی ایک مثال حالی نے اپنی مشہور کتاب میں پیش کی ہے، آپ یہ داستان انھیں کے لفظوں میں سنئے، وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہورہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسیّد سے ملاقات ہوگئی، دونوں آگرہ جارہے تھے اور سرسیّد کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور رہے، اس افسر نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ انھوں نے کہا ''وہابی مسلمان ہوں'' پھر اس نے سرسیّد کا سارا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کردیا، جب ریل آگرہ پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے، پھر سرسیّد مٹن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے، اتفاق سے وہ افسر انھیں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے، اب کمشنر صاحب نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ ''لو یہ تمہاری اسامی حاضر ہے'' جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے تعجب ہوا اور سب بڑی دیر تک اس بات پر ہنستے رہے[1]۔''

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ ۱۸۶۴ء تک وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی سزا پھانسی اور کالے پانی سے کم نہیں تھی مذکورہ سالوں میں انگریزی حکومت نے مجاہدین

---

[1] حاشیہ از حالی حیات جاوید ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۷۶۔

آزادی پر جو سازش و بغاوت کے تین بڑے مقدمات چلائے ہیں ان کو تاریخ میں ''انبالہ سازش کیس'' یا ''مقدمہ وہابیان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان مقدمات میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء ومشائخ اور مسلمان امراء ورؤسا ماخوذ تھے اور بلا استثناء ان تینوں مقدمات میں تمام ملزموں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا پھر کچھ دنوں جیلوں میں رکھ کر پھانسی کے بجائے ان کو کالے پانی بھیج دیا گیا پھر ان کو وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی[1]۔''

وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اگر حکومت کو شبہہ بھی ہوگیا کہ فلاں شخص نے وہابی مسلمانوں کی مدد کی ہے تو سزا سے نہیں بچ سکتا تھا، چنانچہ تیسرے ''مقدمہ وہابیان'' جو عظیم آباد میں ۱۸۷۰ء میں چلا گیا اس میں حشمت دادخاں اور امیر خان کو صرف اس لئے مجرم قرار دیدیا گیا کہ ان کے یہاں سے وہابی مجاہدین کی ایک ہُنڈی برآمد ہوگئی تھی، یہ کلکتہ کے رؤساء میں شمار ہوتے تھے چمڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا، محض اسی جرم پر جھوٹے گواہوں سے گواہیاں دلوا کر امر خاں کو کالے پانی بھیج دیا گیا اور ان کی کروڑوں کی جائداد بحق سرکار ضبط کرلی گئی، حشمت دادخاں کو دس سال مختلف جیلوں میں رکھنے کے بعد اس حال میں چھوڑا گیا کہ یہ کروڑ پتی آدمی دانے دانے کو محتاج ہوچکا تھا اور اسی غم میں مرگیا۔

وہابی ہونا اس دور میں بغاوت کے جرم سے بھی بڑا جرم مانا جاتا تھا چاہے یہ الزام کتنی ہی بڑی شخصیت پر لگایا جائے بلا ثبوت اس کو پھانسی پر چڑھا دینا انگریزوں کے لیے ضروری تھا۔ سرسیّد سے کہیں بڑی اور عظیم شخصیتیں صرف اس جرم میں ماخوذ ہوئیں، عظیم آباد کے بہت ہی معزز و محترم صاحب علم وفضل رئیس کبیر بڑے جاگیردار مولانا احمد اللہ ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی جیسے لوگ وہابی ہونے کے الزام میں گرفتار کئے گئے اور بغاوت وسازش کا ان پر فرضی مقدمہ چلا کر ضمیر فروش اہلکاروں سے گواہیاں دلوا کر فرد جرم عائد کردی گئی، انگریز جج نے پھانسی کا حکم سنادیا اور کروڑوں کی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ناشر دارالمؤلفین دیوبند۔

جائداد کو بحق سرکار ضبط کرلیا گیا اور عید کے دن ان کو اور ان کے بال بچوں اور پردہ نشین خواتین کو ان کے گھروں سے اس حال میں نکالا گیا کہ گھر سے ایک سوئی بھی لے جانے نہیں دیا گیا اور اس معزز خاندان کو سڑک پر اس طرح چھوڑا گیا کہ صرف ان کے بدن پر جو کپڑے تھے وہی ان کی ساری کائنات تھی اور ان دونوں بزرگوں کو پہلے پھانسی کی سزا سنائی گئی کچھ دنوں جیل میں رکھنے کے بعد پھانسی کی سزا کو بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا اور ان کو ۱۵؍جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی بھیج دیا گیا[۱]۔

## منصوبہ بند پروگرام

لندن سے واپسی کے بعد سرسیّد کے سامنے دو پروگرام تھے، پہلا پروگرام مسلمانوں میں جدید تعلیم اور جدید تہذیب کو مقبول عام بنانا تھا ان کے خیال میں اس سے دو فائدے تھے، ایک تو میڈل کلاس کے مسلمانوں کے لئے باعزت ذریعہ معاش پیدا ہوجائے گا کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ معاشی اعتبار سے وہی پریشان حال تھے نوابوں اور راجاؤں کو تو حکومت نے رام کرلیا تھا، کچھ ریاستوں کے حکمران خاندان کے وظیفے مقرر کردیئے تھے اور کچھ ریاستوں کو ''سب سڈیری سسٹم'' کے اصول پر حکمراں خاندان کو موج مستی کرنے کی سہولتیں دیدی تھیں، اپنی فوج ان ریاستوں میں رکھ کر یا ریزیڈنٹ مقرر کر کے ان نوابوں اور راجاؤں کی شہ رگ کو شکنجہ میں کس لیا تھا مگر وہ اپنی ریاست میں عیش و آرام کی زندگی گذار رہے تھے، رہ گئے عوام تو سرسیّد کو اُن سے نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ ان سے کوئی ہمدری اور نہ کبھی عام مسلمانوں کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی رہی، صرف میڈل کلاس مسلمانوں کا طبقہ ایسا تھا جو ہمیشہ سے ملازمت پیشہ رہا ہے، مغلیہ حکومت کے دور میں تمام دفاتر پر وہ چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سماج میں عزت بھی تھی اور زندگی بھی خوش خرم گذر رہی تھی، مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور انقلاب زمانہ نے ان کے ہاتھوں سے یہ ذریعہ معاش چھین لیا، نئی حکومت کے دفاتر میں اُردو فارسی کا چلن ختم ہونے سے وہ بے سہارا ہوگئے اس

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان''، ص۴۴ تا ۵۳، شائع کردہ دارالمؤلفین دیوبند مؤلفہ اسیرادروی۔

لئے اس طبقہ کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی، اب انگریزی کا رواج تھا بغیر اس کے ملازمت ممکن نہ تھی اس لئے ان کی تعلیم کا بندوبست کرنا سرسیّد نے ضروری سمجھا۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ یہ طبقہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت کا قابل اعتماد اور وفادار عنصر بن جائے گا، اس طرح کی جماعت ہندوستان میں بنانا انگریزی حکومت کے مقاصد میں شامل تھا، بہت پہلے لارڈ میکالے نے ۷؍ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کی حمایت کی تھی اور اپنی رپورٹ میں اپنی اس رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی:

> ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو[۱]۔''

سرسیّد کا مقصد ایسی ہی جماعت کی تشکیل تھی، کیونکہ یہ جماعت انگریزی حکومت کا دست و باز و بن کر اس کو مدد پہنچائے گی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا، لیکن سرسیّد نے اس شراب کو دوآتشہ بنانے کے لئے انگریزی تعلیم کے ساتھ یورپین تہذیب بھی اختیار کرنے پر ضرورت سے زیادہ زور دینا ضروری سمجھا، اس کے لئے اپنے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں یورپین اساتذہ کا اسٹاف لازمی قرار دیا، ان کو ہندوستانی اساتذہ کے مقابلہ میں لمبی لمبی تنخواہیں دیتے، ان کے رہن سہن کے معیار کو شاہانہ رکھنے کی کوشش کرتے، ان کے مقابلہ میں ہندوستانی اساتذہ کو وہ سہولتیں اور تنخواہیں نہیں دیتے تھے، ان کی نگاہ میں شاید ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ حاکم اور محکوم کا فرق نمایاں رہے، مدرسۃ العلوم کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ احساس باقی رہے کہ وہ محکوم قوم کا فرد ہے، اس طرح وہ انگریزی اساتذہ کی معاشرت، تہذیب اور سوسائٹی سے زیادہ متاثر ہوگا، کیونکہ ہر انسان اپنے سے اُوپر والے کے طور طریق کو اختیار کر کے اس کی صف میں شامل ہونے کو ذریعہ فخر سمجھتا ہے، سرسیّد کے سامنے

---

۱ تاریخ التعلیم از میجر باسو، بحوالہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، از طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۷۔

انگریزی تعلیم سے یہی مقصد تھا، اور وہ اس کے لئے پورے طور پر کوشش کرتے رہے۔

ان کا دوسرا پروگرام ہندوستان کے عام مسلمانوں سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کرنا تھا وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان علماء و مشائخ کے اثر واقتدار سے گلو خلاصی حاصل کرلیں اور جب مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی تو آسانی کے ساتھ ان باتوں کو قبول کرلیں گے جن کی سر سیّد تبلیغ کرتے تھے۔

پہلے پروگرام کے تحت علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم کھولا، اور دوسرے پروگرام کی تکمیل کے لئے رسالہ ''تہذیبُ الاخلاق'' جاری کیا، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے کا پروگرام بنایا، انھیں دونوں مقاصد کو لے کر سر سیّد ہندوستان میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتے رہے، لکچر دیتے رہے، مضامین لکھتے رہے اور کچھ رؤسا اور اُمراء کو اپنا ہم نوا بنا کر اس مشن کو پوری قوت سے ۱۸ سال تک مسلسل چلاتے رہے، اور حکومت کو اپنی سرگرمیوں سے ہمیشہ باخبر رکھتے رہے، اگر ہندوستان میں دھیمی سی بھی کوئی آواز سنائی دیتی جس سے انگریزی حکومت کی مخالفت کی جھلک ملتی، اس کے خلاف پورا یک محاذ کھڑا کر دیتے، چنانچہ جب انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کو تین چار برس ہوگئے اور اس میں کچھ ترقی پسند افراد شامل ہوگئے تو حکومت سے بعض مسائل میں مطالبات کی تجویزیں بھی پاس ہونے لگیں اس سے سر سیّد نے یہ سمجھا کہ اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے اور حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات منوانے کی جانب پیش قدمی ہو رہی ہے، سر سیّد جیسے مخلص وفادار کو یہ کیسے برداشت ہوسکتا تھا، انھوں نے کانگریس کے خلاف دھواں دھار تقریریں مختلف مرکزی مقامات میں کیں اور کانگریس کی سرگرمیوں کو بریک لگانے کے لئے ایک انجمن بنا ڈالی۔

## پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اگست ۱۸۸۸ء میں سر سیّد نے ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' اس غرض سے قائم کی

کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقدار کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کی رائیں، خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائیں اور نیز اخبارات کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائیں۔

سرسیّد کا جذبۂ وفاداری اس کو برداشت نہیں کررہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنی مشکلات و مصائب کے حل کے لئے کوئی تجویز پاس کریں یا حکومت سے کوئی مطالبہ کریں وہ ہندوستان کو غلامی کی دلدل سے اُبھرتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اور جو لوگ اس روش کو اختیار کرکے یہاں کے قومی مسائل کو حل کرنے کا جذبہ رکھتے تھے ان کی سرگرمیوں سے اپنی حکومت کو باخبر رکھنا ضروری سمجھتے تھے تاکہ بروقت ان طاقتوں کو کچلنے اور تہس نہس کرنے کے لئے حکومت تیار رہے جب کہ خود کانگریس میں ابھی ایسے ترقی پسند داخل نہیں ہو سکتے تھے جو اس جرأت رندانہ کا اظہار کرتے، لیکن سرسیّد جیسا دور اندیش انسان ہوا کا رخ پہچان گیا کہ آج جس جماعت کی آواز دبی دبی سی ہے کل اس کی آواز میں رعد و برق کی کڑک بھی پیدا ہو سکتی ہے جو ایوان حکومت میں زلزلہ ڈال سکتی ہے اس لئے پیش بندی کے طور پر اس انجمن کے ذریعہ اس کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کردیا اور کانگریس کی مخالفت کو اپنا مشن بنالیا۔

سرسیّد بات کے دھنی تھے اور عملی آدمی تھے جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کو بروئے کار لانے میں پوری جدوجہد کو کام میں لاتے تھے اس لئے جب کانگریس کی مخالفت شروع کی تو کئی سو کی تعداد میں جاگیرداروں کو ایک پلیٹ فارم پر کانگریس کی مخالفت میں کھڑا کردیا اور بالخصوص مسلمانوں میں زبردست پروپیگنڈہ کے ذریعہ کانگریس سے نفرت پیدا کرنے کا کام بھی پوری سرگرمی سے شروع کردیا اور اس کے بہترین نتائج بھی سامنے آگئے، خواجہ الطاف حسین حالی ہمیں بتاتے ہیں:

> ”پیٹریاٹک ایسوسی ایشن“ کے قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی

انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کئے گئے، تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں[۱]۔''

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا ۞ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

آج آزاد ہندوستان میں سرسیّد کی ان سرگرمیوں کی روداد پڑھی جاتی ہے اور ان کی وطن دشمنی اور مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ کرنے اور ان کو ہندوستان کی سرزمین میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ورسوا کرنے کی جد وجہد پر نظر جاتی ہے تو دل غم وغصہ سے کھول جاتا ہے، آج تاریخ کی ان سچائیوں کو پڑھ کر ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں، دل چاہتا ہے کہ کاش کوئی تاریخ صفحات سے ان حقائق کو کھرچ کر پھینک دے ہمارے دامن پر لگے ہوئے اس گھناؤنے داغ کو کوئی دھودے، لیکن مسلمانوں کے مسیحا نے ساری زندگی انگریزوں کی وفاداری کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا تو اس کی پردہ پوشی کے لئے نہ الفاظ کی جادوگری کام آسکتی ہے اور نہ زور بیان اور طاقت لسانی کی چادر سے اس کو چھپایا جاسکتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی ان کی وفات کے چوتھائی صدی بعد قائم ہوئی اور ان کے جذبات وخیالات کی سمیّت سے ایک حد تک محفوظ رہی ورنہ شاید ۱۹۴۲ء کی پرشور تحریک ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والی آگ اور خون کی بارش میں اس کا وجود مٹ گیا ہوتا اور اس کے نام ونشان کو صفحۂ ہستی سے کھرچ کر پھینک دیا ہوتا اور ہم اپنے ایک عظیم قومی سرمایہ سے محروم ہوجاتے۔

سرسیّد کی ساری سرگرمیوں کے پس پشت جو جذبہ کام کررہا تھا، اختصار کے ساتھ میں نے اس کی نشاندہی کردی، میری اس تفصیل سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ سرسیّد کا واحد مقصد ہندوستان میں انگریزی حکومت کو طاقت وقوت پہنچانا اور اس کے استحکام کے لئے جد جہد کرنا تھا، نہ ان کے سامنے ہندوستان کے مفاد تھے، نہ

---

[۱] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۲۵۸، ۲۵۹۔

مسلمانوں کے نہ اسلام کے، ان کو صرف انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا اس مفاد کے لئے وہ اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب سب کو قربان کر سکتے تھے، وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دست و بازو بن کر رہے، بلکہ جو ہاتھ ہندوستانی عوام کو غلامی کے سخت ترین شکنجوں میں کس رہے تھے انھیں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ سرسیّد کا بھی تھا، وہ ہندوستان کے دماغ سے نہیں انگلستان کے دماغ سے سوچتے تھے وہ شکل وصورت، جسم، لباس اور ہیئت کے لحاظ سے ضرور ہندوستانی تھے لیکن غور وفکر، سمجھ، بوجھ، ذہن ومزاج اور دل ودماغ کے لحاظ سے خالص انگریز اور اس کے سوا کچھ نہیں، وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے غیرت وخودداری کو حماقت سمجھتے تھے، وہ ایک غلام اور وفادار نوکر کے دماغ سے سوچتے تھے، وہ اپنے آقا انگریزوں کے قدم رکھنے سے پہلے اپنی پلکوں سے زمین کو صاف کرنے کے قائل تھے، نہ ہندوستان کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت تھی نہ اسلام اور مسلمانوں کی۔

بار بار کے تجربوں کے بعد انگریزی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں نے ہندوستان کی سرگرمیوں کی مخبری کی خدمت ان کو سپرد کی تھی کیونکہ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے اخلاص ووفا کی قسمیں کھائی جانے لگی تھیں، حالی نے حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے درجنوں اعتراف اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں ان میں سے چند آپ بھی ملاحظہ فرمالیں اور دیکھیں کہ یہ لوگ سرسیّد کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو کتنی محبت سے یاد کرتے ہیں اور اپنے کس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، حالی تحریر فرماتے ہیں:

> ''سر جان اسٹریچی نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسیّد کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ''کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں سیّد احمد خاں نے دیا میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ میں جن کے ذریعہ ان کی جاں نثاری کا پورے طور پر اظہار کرسکوں، اگر سیّد احمد خاں نہ ہوتے تو ہماری جانیں نواب

محمود علی خاں کی شکار ہو جاتیں[۱]۔‘‘

’’پال مال گزٹ‘‘ مورخہ ۲۹/ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد کی وفات کے بعد ان کی نسبت جن جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے حالی ہمیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں:

’’سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسیّد احمد خاں کی زندگی پر، وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا، اور جو خدمتیں اس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے[۲]۔‘‘

مسٹر ایچ، جی، کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار ’’ہوم ورڈ میل‘‘ میں سرسیّد کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی:

’’سیّد احمد خاں جس سے میں نے ۱۸۷۸ء میں جب کہ وہ لیجلسٹیو کونسل کا ممبر تھا واقفیت حاصل کی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاص کر مشکل اور خطرے کے وقت میں خواہش کرے گا[۳]۔‘‘

یعنی ہندوستان میں انگریز حکام کو سیّد احمد خان جیسے وفادار اور انگریزی حکومت کے حقیقی خیر خواہ کے مشورے کے بغیر کام کرنا مشکل ہوگا، مشکلات وخطرات کے موقعہ پر اس کی جاں نثاری اور فدا کاری پر پورا اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے، حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو اس سے بہتر سے بہتر تعاون حاصل ہوگا۔

سرسیّد کے رسالہ ’’اسباب بغاوت ہند‘‘ جو ان کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور یقیناً بڑا زبردست کارنامہ ہے لیکن ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کے لئے نہیں، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکومت کے لئے کیونکہ اس کے مندرجات پر عمل کر کے ہی وہ ہندوستان کو غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی ایک مستحکم اور پائیدار حکومت بنا سکے، اسی رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار

۱۔ حیات جاوید از حالی ص ۳۳۰۔
۲۔ حیات جاوید از حالی ص ۲۸۵۔
۳۔ حیات جاوید از حالی ص ۳۲۲۔

''سینٹ جیمس بجٹ'' نے لکھا:

''سیّد احمد خان کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس ملک کے واسطے سراسر مفید ہے وہ اس کے ان خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کردیتی ہے جو اس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں بیان کئے ہیں، یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے[1]۔''

کرنل گریہم نے اس رسالہ کے متعلق اپنی رائے کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں وہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگ سیّد احمد خاں کی ''اسباب بغاوت ہند'' سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہمارے خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفاء میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے فی نفسہ نہایت درجہ مفید ہے۔''

اتنے اہم ترین انگریزوں کی رائے آپ کے سامنے ہے ان پر مزید تبصرہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بس اتنی وضاحت البتہ ضروری ہے کہ تمام ذمہ دار انگریزوں کی رایوں میں ایک قدر مشترک صرف سرسیّد کی انگریزوں سے بے لچک وفاداری ہے، وہ انگریزوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر چلتے تھے، ان کے سامنے صرف انگریزی حکومت کا مفاد تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ تھا سرسیّد کی زندگی کی تصویر کا ایک رُخ، ان کی تصویر کا دوسرا رُخ صرف مسلمانوں کی دیدۂ بینا کے لئے ہے، آیئے تصویر کے اس رخ کو ایک مسلمان کی نگاہ سے بھی دیکھ لیں۔

## تصویر کا دوسرا رُخ

اب تک آپ کے سامنے میں نے سرسیّد کی تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا کہ

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۳۲۵۔

انھوں نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے اور یہاں کے باشندوں کی غلامی کو دیر پا اور مستحکم بنانے میں کیا رول ادا کیا، اس تفصیل سے جو سچائی سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی عوام یا خاص مسلمانوں کے رہنما اور لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ انگریزی حکومت کے نمائندے تھے، ان کو انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا ملک یا مسلمان کا نہیں۔

ان کا مشن دوسرے نمبر پر یہ تھا کہ پوری مسلمان قوم کو انگریزی حکومت کا مکمل وفادار بنا دیں، اس کے لئے انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلسل جد جہد کی، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بحیثیت مجموعی برطانوی حکومت کے مخلص وفادار بن جاتے ہیں تو پھر انگریزی حکومت واقتدار کو تنہا ہندو قوم کبھی ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اس لئے بعض اونچے درجے کے انگریزوں نے سرسیّد کو ''وفادار مسلمان شرفا'' کا نمائندہ کہا ہے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرانے کا سبق انگریزی حکومت کو اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں پہلے ہی پڑھا چکے تھے، وہ ایک ایسا مرکز یا محاذ بنانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی ہم نوا ہوکر انگریزی حکومت کی ثنا خواں ہوجائے اور وہ انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت و برکت تصور کرنے لگے، وہ اپنے مضمون ''امام اور امامت'' میں لکھتے ہیں:

''تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایۂ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے[۱]۔''

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کو جو پچاس ہزار مسلمانوں کے شہید ہونے کے بعد جاری ہوا اس کو الہامی اعلان کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملکہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے[۲]۔

---

۱ مقالات سرسیّد حصہ اول مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۷۷۔

۲ حیات جاوید ص ۱۴۲۔

اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی ساری جد و جہد مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لئے تھی یا انگریزی حکومت سے مرعوب کر کے مسلمانوں میں غلامانہ بے غیرتی و بزدلی، مایوسی، کم ہمتی پیدا کر کے ہر قسم کی جد جہد میں حوصلہ شکنی کے لئے تھی، مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار بنانے کے لئے احادیث وقرآن کو بے تحاشا استعمال کرتے اور معنی ومفہوم کے بیان کرنے میں مجتہد مطلق کی طرح کلام کرتے، اسی سلسلہ میں بہت سے اسلام کے مسائل میں انھوں نے جمہور امت اور مسلمانوں کے سواد اعظم سے اختلاف کر کے خود ساختہ عقائد ونظریات مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کی، اپنے مقصد اور حکومت سے وفاداری کا سبق پڑھانے میں قرآن وحدیث کے مسلسل استعمال کی وجہ سے ان لوگوں کے حلقہ میں جو سرسیّد کے نظریات سے متفق ہو چکے تھے ان کو ایک مذہبی رہنما کی ہی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ وہ ان کو اس سے کہیں بلند وبالا مقام دیتے تھے، جس سال ان کا انتقال ہوا، اسی سال ان کے مقالات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے جسے مولوی امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا، اس مجموعہ کے سرورق پر سرسیّد کا نام اس طرح لکھا گیا:

> ''ملک کے جاں نثار، مسلمانوں کے عملی غمخوار، مصلح وریفارمر، مجتہد ومجدد، پیشوائے ملت، امام وقت، اسلام کے عاشق صادق، قوم پر اپنا تن من دھن قربان کرنے والے، جوادالدولہ، عارف جنگ، آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس، بانی مدرسۃ العلوم علی گڈھ، مرحوم ومغفور علیہ الرحمۃ[1]''

مال کا اسراف ہی ناپسندیدہ نہیں الفاظ کا بے جا اسراف اور بے محل استعمال بھی کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں مگر عقیدت اور غلوئے محبت کا یہ اظہار شاید مرتب کے لئے اپنے اندر کوئی افادیت کا پہلو رکھتا رہا ہو، اس چار سطری نام والقاب کے سلسلہ مں مجھے بس اتنی بات عرض کرنی ہے کہ سرسیّد کے ذہن وقار اور فکر رسالہ کا یہ کمال ہے کہ ۱۸۵۷ء

[1] مقالات سرسیّد حصہ اول، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۹۲۔

کے موقعہ پر پورا اسلامی ہند کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اپنی حکومت واقتدار کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے اپنی ساری قوت وطاقت لگا کر ہارتا ہے اور شکست کے بعد پوری مسلمان قوم دیکھتی ہے کہ جس ظالم وجابر قوم سے ہم نبرد آزما ہیں اسی کی صف میں سرسیّد احمد خاں بھی کھڑے ہیں، اور اسلامی ہند کی ذلت آمیز شکست میں ان کا بھی ہاتھ ہے، اس کے باوجود تحریر وتقریر کے زور پر اسی شخص کو اسلام کا سب سے بڑا فدار کار، اسلام کا عاشق صادق، اور مسلمانوں کا غم خوار اور خدا جانے کیا کیا القاب مسلمان قوم دے ڈالتی ہے، یہ غیرت وخوداری کی موت اور احساس کمتری اور پست ہمتی کی سب سے نچلی اور پست ترین سطح ہے۔

## ہندوستان اور عیسائیت

جب لال قلعہ میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اور بادشاہ کی حدود سلطنت دہلی شہر تک محدود ہوکر رہ گئیں اور ''ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' کی منادی ہونے لگی، ملتان سے برما تک انگریزوں کے اختیار میں آ گیا تو لندن میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کی مہم چلا کر وہاں کی اکثریت کو عیسائی بنایا جائے تاکہ ہماری حکومت کو استحکام حاصل ہو، اسی نقطۂ نگاہ سے لندن میں ایک تربیتی سنٹر کھولا گیا، جہاں اسلام پر اعتراضات کرنے اور علماء اسلام سے مناظرہ کرنے کی پادریوں کو تربیت دیجاتی تھی، جب تربیت یافتہ پادریوں کی تعداد ہزاروں میں ہوگئی تو پادریوں کی یہ ساری فوج ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے بھیج دی گئی اور پورے ملک میں پھیلا دی گئی، حکومت کے عہدہ دار مشنری ذہن ومزاج کے بھیجے جانے لگے، سر ولیم میور جو یوپی کا گورنر تھا خود مشنری تھا، دہلی میں لندن کا اسقف اعظم پادری فنڈر آیا اور دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات کرنے لگا اور انتہائی جارحانہ انداز میں مسلمانوں کو مناظرہ کی دعوت دینے لگا، اسلام کے خلاف اس نے ایک کتاب ''میزان الحق'' لکھی تھی اور اس کو پیش کرکے یہ دعویٰ کرتا تھا کہ یہ کتاب

الہام سے لکھی گئی ہے کوئی مسلمان عالم اس کا جواب نہیں دے سکتا، ہندوستان کے کسی عالم میں اگر جرأت ہوتو اس کا جواب دے یا مجمع عام میں مجھ سے مناظرہ کرکے مذہب عیسوی کو جھوٹا ثابت کردے، یہ وہ دور تھا کہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا رعب داب چھایا ہوا تھا اور کسی کو اس پادری کے جواب میں زبان ہلانے کی جرأت نہیں تھی، گویا پادریوں کی زبان سے ایک جابر وقاہر حکومت بول رہی ہے، اسی طرح ہر بڑے شہر میں پادریوں کا ایک جتھ مصروف جدوجہد تھا، یہ جہاں بھی عوام میں جاتے تھانے سے کہ کر چند پولیس کے جوان اپنے ساتھ لے جاتے تھے اسلئے عوام کیا خواص تک سہمے ہوئے تھے، ہر شخص کو یقین ہو چکا تھا کہ انگریزی حکومت پورے ہندوستان کو ایک نہ ایک دن بجبر واکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی دوران کلکتہ کے لاٹ پادری ای ایڈمنڈ کی کھلی چٹھی ملک میں شائع ہوگئی اور اس نے صاف صاف لکھ دیا کہ:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہئے یا نہیں ...... مذہب عیسائی ہی ایسا مذہب ہے جو خدا کے پاس سے براہِ راست الہام کے ذریعہ سے آنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہی ایسا مذہب ہے جس سے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں جس کا حال اس سے منکشف ہوتا ہے خوشی حاصل ہو سکتی ہے، دنیا کے کسی مذہب سے اس مذہب کو ممتاز کرنے کے لئے اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ انسان کی عقل اور دل سے اپیل کرتا ہے اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جو محض دلیل کے زور سے پھیلا ہے جو قومیں اس مذہب پر اعتقاد رکھتی ہیں سب سے زیادہ غور خوض کرنے والی اور دنیا میں سب سے زیادہ شائستہ ہیں پس بہر کیف اس مذہب کو حق حاصل ہے کہ اس پر غور کیا جائے[1]۔''

یہ صرف ایک گشتی چٹھی نہیں تھی بلکہ یہ اشارہ تھا کہ حکومت کے ذمہ داروں کو اب اس سمت میں ٹھوس اور مضبوط قدم اٹھانا چاہئے، اور جس طرح ممکن ہو پورے ملک کو

[1] ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ، ایڈیشن چھٹی پادری ای ایڈمنڈ ص ۸۴۷، ۸۴۸۔

گرجا گھر میں سجدہ ریز ہونے پر مجبور کردیا جائے، ہندوستان کے عوام اور خواص سب نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔

اس صورت حال سے سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین مسلمان تھے، کہ ان کی حکومت ہاتھ سے جا چکی اب ان کے مذہب پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش ہورہی ہے، یہ تمام حالات سرسیّد کی آنکھوں کے سامنے تھے یہ سارے تماشے دہلی میں ہورہے تھے اور سرسیّد دہلی میں مقیم تھے، لیکن اس قیامت کی گھڑی میں عیسائیت کی طاقت کے ذریعہ تبلیغ پر ان کی زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا، کیوں کہ عیسائیت کی مخالفت انگریزی حکومت کی مخالفت تھی اور سرسیّد کو یہ کسی حال میں منظور نہیں تھا۔

## یتیموں کو جبراً عیسائی بنانا

مرادآباد اور اطراف میں زبردست قحط پڑا بے شمار یتیم ہوگئے، سرکاری انتظام میں محتاج خانہ کھولا گیا، سرکاری طور پر یتیم خانے کا انچارج سرسیّد کو بنایا گیا، سرسیّد نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اس کام کو کیا افسرانِ بالا تک ان کے حسن انتظام کی رپورٹ گئی، یتیموں میں ہندو اور مسلمان دونوں کے بچے تھے، قحط کی مصیبت سے نجات پاکر اپنے اپنے مذہب کے لوگوں میں وہ چلے جائیں گے، ہر سمجھ دار شخص یہی سمجھتا تھا، سرسیّد کا بھی ارداہ جب تک حکومت کی منشا نہیں معلوم تھی، یہی تھا کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جو مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے ان کو ہندوؤں کے سپرد کردیا جائے گا، جب قحط پر قابو پالیا گیا اور حکومت نے محتاج خانہ بند کرنے کا ارادہ کیا تو قدرتی طور پر لاوارث یتیموں کا نظم کرنا ضروری تھا اسی دوران پادریوں نے کلکٹر مرادآباد سے ان یتیموں کا مطالبہ کیا کہ ان کو ہمیں سپرد کردیا جائے، کلکٹر نے اس کے فیصلہ کے لئے کمیٹی بنائی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریز بھی تھے، سرسیّد کو بھی اس کمیٹی کا ایک رکن بنایا گیا یہی کمیٹی یتیموں کی سپردگی کا فیصلہ کرے گی، سرسیّد چونکہ یتیم خانے کے انچارج تھے اس لئے قدرتی طور پر کمیٹی میں ان کی رائے کا

وزن زیادہ تھا، اور انگریز کلکٹر کے بعد سب سے بااثر رکن سرسیّد ہی تھے، انگریز افسران کے چشم وابرو کے اشارہ پر متفقہ طور پر فیصلہ کردیا گیا کہ تمام لاوارث اور یتیم بچے مشنریوں کے سپرد کردیئے جائیں اور ان تمام مسلمانون اور ہندوؤں سے ان بچوں کو واپس لے لیا جائے جن کی سپردگی میں یہ بچے دیئے گئے ہیں ان سے لے کر عیسائیوں کے حوالے کردیئے جائیں، سرسیّد نے اس فیصلہ کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، بلکہ تائید کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھے، البتہ ان سے ان یتیموں کو واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ان کی پرورش میں دیئے گئے تھے، گویا کمیٹی نے یہ اجازت دے دی کہ جو بچے سرسیّد کی ذاتی تحویل میں ہیں وہ ان کے پاس علیٰ حالہٖ رہیں گے لیکن اب سرسیّد کو انگریزی افسران کی منشا معلوم ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے ازخود ان یتیموں کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا، سرسیّد کے مداح سوانح نگار حالی خود ہمیں بتاتے ہیں:

”وہ بچے زاروقطار روتے تھے، اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر سرسیّد نے اپنے جذبۂ وفاداری کے تحت ان کو واپس نہیں لیا[1]۔“

جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ان یتیم بچوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے لئے لے جایا جارہا ہے، اوران سے ان بچوں کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کو زبردستی گھر سے نکال کر عیسائیوں کے مذبح میں بھیج دیا جہاں ان کے دین ومذہب کے قتل کا مکمل بندوبست تھا۔

## عیسائیت سے پنجہ آزمائی

ہندوستان میں عیسائیت بڑے رعب داب اور لاؤ لشکر کے ساتھ آئی تھی، عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بے شمار لٹریچر شائع ہوتے رہتے تھے اور مفت تقسیم کئے جاتے، ہر طرح کے اجتماعات میں پادریوں کی بڑے ہی جارحانہ لب ولہجہ میں

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۰۔

تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ہندوستان کے خطہ خطہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں سے مناظروں کی بھی دھوم دھام تھی ۱۸۵۴ء کے مناظرہ نے تو اس کی شہرت ہندوستان سے یورپ تک پہنچادی جو آگرہ میں پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر وزیر خاں کا بھی زبردست کردار تھا[1]، مناظرہ کا خاص موضوع انجیل کا محرف ہونا تھا، مسلمان مناظرین نے ناقابل تردید دلائل سے سات آٹھ جگہ تحریف کا ثبوت دیا اور خود پادری فنڈر نے مجمع عام میں اس کا اعتراف کرلیا، اور مسلمانوں کی فتح کا شور مچ گیا، مناظرہ میں انگریزی حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار شریک تھے، پادری فنڈر کی اس کھلی شکست پر بہت جز بز ہوئے، پادری فنڈر کو ہندوستان سے راتوں رات فرار کرنا پڑا، یورپ میں اس مناظرہ کا اتنا اثر ہوا کہ پادری فنڈر اپنے عہدے سے معزول کردیا گیا، وہ لندن سے بھاگ کر ترکی گیا، اتفاق امر انھیں دنوں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظّمہ پہنچے ہوئے تھے، ترکی خلیفہ نے جب پادری فنڈر کی لن ترانیاں سنیں تو اس نے تحقیق کرائی کہ ہندوستان میں ہونے والے مناظرہ کی صحیح صورت حال کیا ہے تو مکہ کے گورنر نے خلیفہ کو لکھا کہ ہندوستان میں پادری فنڈر کا جس عالم سے مناظرہ ہوا تھا وہ آج کل مکہ میں ہیں خلیفہ نے گورنر کو حکم بھیجا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب کو فوراً ترکی بھیج دیا جائے۔

پادری فنڈر کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ ترکی سے بھاگا اور پھر پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں مرکھپ گیا کیونکہ پھر اس کے بعد اس کا کہیں نام نہیں سنا گیا، اس مناظرہ نے ہندوستان میں ہوا کا رخ بدل دیا، مسلمان جواب تک حکومت کے ڈر کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے ان میں جرأت بڑھی اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں علماء اسلام نے پادریوں کا تعاقب شروع کردیا اور ان کو گھیر گھیر کر مناظرہ کرنے لگے، اور مجمع عام میں ان کے خلاف تقریریں کرنے لگے اور پادریوں کی ہوا اکھیڑ دی، پادریوں کے حوصلے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "احیاءِ اسلام کی ایک عالمگیر تحریک" مؤلفہ اسیر ادروی ناشر دار المولفین دیوبند۔

پست ہوگئے مسلمانوں نے سانپ کا پھن کچل کر رکھ دیا کہ اس کے ڈسنے کا امکان کم سے کم ہوتا چلا گیا۔

## بائبل کی تفسیر

آگرہ میں جب مناظرہ ہورہا تھا سرسیّد دہلی میں تھے اور سرکاری عہدہ دار تھے، وہ اس مناظرہ سے پوری طرح باخبر تھے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسیّد کو پادریوں کی اس شکست سے کچھ خوشی نہیں ہوئی بلکہ ایک گونہ ان کو رنج اور ملال ہوا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مناظرہ کے بعد ہی انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرلیا، اس کے لئے انھوں نے بڑی محنت کی، کافی سرمایہ لگایا اور مسلمان مناظرین کے اس دعویٰ تحریف کے برخلاف انھوں نے انجیل کو غیر محرف ثابت کرنے لئے پورا زورِ قلم صرف کردیا ہے۔

۱۸۵۴ء کے مناظرہ آگرہ سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک یعنی جب تک عیسائی مشنریوں کا زور تھا اور وہ تبلیغ عیسائیت کے لئے انتھک جدوجہد کرتے رہے علماء اسلام عیسائیت کے باطل اور ناقابل عمل ہونے کے لئے صرف ایک دلیل دیتے رہے کہ تمہارے ہاتھوں میں جو انجیل ہے وہ خدا کا کلام نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل اُتری تھی اس کے اندر کتر بیونت کرکے عیسائیوں نے اس کو ناقابل اعتبار بنادیا ہے، اور ہر جگہ پادریوں کو مناظروں میں اسی تحریف کے موضوع پر ذلت آمیز شکستیں ہوتی چلی گئیں، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا منصور دہلویؒ جو عیسائیوں کے آخری دور میں مناظرہ ومباحثہ کرنے والے بزرگوں میں ہیں ان تمام حضرات نے اسی پہلو سے عیسائی مناظرین کی مناظروں اور مباحثوں میں زبانیں بند کیں اور پادریوں کو مجمع عام میں رسوائیاں اٹھانی پڑیں۔

ان حالات میں سرسیّد کا بائبل کا تفسیر لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کیا وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے؟ کیا اسلام اور مسلمانوں کو بائبل کی تفسیر کی ضرورت تھی؟ جب ان میں سے کوئی بات نہیں تھی تو اس بے موسم کی راگنی کا حاصل کیا

تھا؟ عقل اس کی توجیہ سے قاصر ہے، حالی جو سرسیّد کی اسی طرح مدح کرتے ہیں جیسے عربی کا مشہور شاعر متنبّی اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا، حالی نے بھی سرسیّد کے ہر غلط کام کی تاویل کو اپنا فرض منصبی بنا رکھا ہے، یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے، اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں[1]۔''

دیکھا آپ نے؟ ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت میں ایسی خون ریز جنگ چھڑی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں یا تو اسلام زندہ رہے یا عیسائیت، اس جنگ کے نتیجہ پر ہندوستان میں اسلام کی موت وحیات منحصر ہے اور مسلمان اپنی پوری قوت مدافعت سے کام لے کر اسلام کی زندگی کے لئے موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور عیسائیت کے قاہرانہ وجابرانہ حملوں سے بچانے کی جد وجہد میں مصروف ہیں اور سرسیّد اسلام اور عیسائیت میں مطابقت ثابت کر کے مسلمانوں کی قوت مدافعت کو کمزور کرنے کی جد وجہد کر رہے ہیں، یہ اسلام کی نہیں عیسائیت کی ہمدردی میں کیا جا رہا ہے اور حالؔی اس کو سرسیّد کی اسلامی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، حالؔی کے ہاتھ میں قلم ہے اس کو کون پکڑ سکتا ہے، حالی کا کردار سرسیّد کی سوانح میں بالکل وہی ہے جو آج کل کی عدالتوں میں وکیلوں کا ہوتا ہے، مقدمہ چاہے کتنا ہی جھوٹا اور بے بنیاد ہو اس کو زور بیان اور طاقت لسانی سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عدالت کو دھوکے میں رکھ کر اپنے موافق فیصلہ کرانے کی انتھک جد وجہد کرتے ہیں، حالی بھی سرسیّد کے مقدمہ میں جو ملت اسلامیہ کی عدالت میں پیش ہے ایک ماہر قانون وکیلوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۲۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مشنریوں کے ہزاروں جتن کے باوجود چند ہی غیر مشہور مسلمان عیسائی ہوئے کیونکہ تمام مسلمان بلا استثناء عیسائیت کو باطل اور گمراہ سمجھتے تھے اور اس کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھی ہوئی تھی اور ان کا بے شمار لٹریچر جو ملک میں برابر تقسیم ہوتا رہتا تھا کبھی کوئی پڑھنے اور دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو جتنا جبر کیا جارہا تھا اور مشنریوں کی طرف سے لالچ دیا جارہا تھا ہزاروں اور لاکھوں پست حال مسلمان عیسائی ہوگئے ہوتے، سرسیّد مسلمانوں کے دلوں سے عیسائیت سے اسی نفرت کو دور کرکے ان کو عیسائیت قبول کرنے کے لئے ہموار کرنے اور عیسائیت کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لئے بائبل کی یہ تفسیر لکھ رہے تھے اور خاص طور پر مسلمان مناظرین جو تحریف انجیل کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پادریوں کو میدان مناظرہ میں شکست دے رہے تھے، اس کی تردید کرکے پادریوں کے ہاتھوں میں نیا ہتھیار دے رہے تھے، خود حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سرسیّد کا کیا مقصد تھا:

> ''مسلمان موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے، ان کو بائبل اور اس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہوسکتی ہے[۱]۔''

سرسیّد مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ تلوار چھین لینا چاہتے ہیں کہ جس تلوار سے کام لے کر مسلمانوں نے ہندوستان میں عیسائیت کی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا اور اس کی موت یقینی ہوگئی تھی، وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی نہیں عیسائیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ تفسیر بائبل شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں مسرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی، مشہور مستشرق ڈاکٹر گارسن دی تاسی جو پیرس یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا استاذ تھا اور پُر جوش عیسائی تھا، ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اس کو بڑی

---

[۱] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۱۲۔

دلچسپی تھی وہ ہر سال یونیورسٹی میں اپنے طلبہ کے سامنے ایک لکچر دیتا تھا اس میں اُردو کی مطبوعات کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو کتابیں اُردو میں لکھی جاتی تھیں اُن پر تبصرہ کرتا تھا، جب سر سیّد کی کتاب اس کے پاس پہنچی تو اس نے اس سال کے اپنے اٹھارہویں لکچر میں جو ۷؍ستمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا، کہا:

''اُردو کی بعض دوسری کتابیں جنھیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں، ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائبل کی تفسیر پر لکھی ہے، یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے، میری مراد سیّد احمد خان کی تفسیر بائبل ہے[۱]۔''

ایک مشنری ذہن ومزاج کا عیسائی سر سیّد کی کتاب کو عیسائی کی کتاب تو نہیں نیم عیسائی کی کتاب کہتا ہے، یعنی مشنری لٹریچر تو براہ راست عیسائیت کی دعوت دیتا ہے، سر سیّد کی تفسیر بائبل اس راہ کے کانٹوں کو چن چن کر مسلمانوں کو عیسائیت کی منزل تک پہنچنے میں سہولت پہنچانے والی کتاب ہے، مسلمان تو اس وقت اسلام کی طرف سے مدافعت میں موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں، ان کو عیسائیت کے فضائل ومناقب جاننے کی کیا ضرورت تھی؟ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انگریزی حکومت جو ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لئے خفیہ طور پر پوری طاقت صرف کر رہی تھی، سر سیّد نے بائبل کی یہ تفسیر لکھ کر حکومت کی منشا اور اس مشن میں مدد پہنچانے کے لئے لکھی تھی، اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

## بائبل کی تفسیر لکھنے کا مقصد

بائبل کی تفسیر لکھنے کی منشا سر سیّد نے خود اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو انھوں نے جان میوسن آرنلڈ کو لکھا تھا، انھوں نے اپنی کتاب ''قرآن اینڈ بائبل'' مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں یہ خط نقل کیا ہے، اس میں سر سیّد نے بند لفظوں میں ان کو سمجھایا ہے کہ مسلمان

[۱] خطبات گارسن وتاسی جلد۲ ص ۲۰۱، ۲۰۲، اردو ترجمہ تصحیح ونظر ثانی ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس شائع کردہ پاکستان۔

عیسائیوں کے لٹریچر کو غلط، مہمل اور لغو سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نہیں پڑھتے اور پادریوں کو مسلمانوں میں عیسائیت کو پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس لئے ان کو کامیابی نہیں ملتی ہے، میں نے یہ تفسیر لکھ کر مسلمانوں کے اس ذہن کو بدلنے کی کوشش کی ہے، حالی نے اس خط کا جو اقتباس دیا ہے میں وہی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

''وہ جان میوسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی، خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباء واجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بے کار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے، ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہوا اور دونوں کے دل بُرے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا[1]۔''

سرسیّد کہتے ہیں کہ پادریوں کو اپنے مذہب کے حق ہونے پر دلائل پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس وجہ سے ان کی ساری جدوجہد رائیگاں جارہی ہے اور مسلمان ان کو خاطر میں نہیں لاتے، سرسیّد بائبل کی تفسیر لکھ کر پادریوں کو مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کا طریقہ اور سلیقہ بتاتے ہیں سرسیّد کا جملہ ''کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا'' معنیٰ خیز ہے اور آرنلڈ جیسے مشنری ذہن کے انسان کو بڑا اپیل کرنے والا بھی۔

## تفسیر بائبل آرنلڈ کی نظر میں

جان میوس آرنلڈ نے سرسیّد کی تفسیر بائبل پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ ہے کہ سرسیّد نے

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۶۔

عیسائیوں پر عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے مشنریوں پر اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو رعب داب، جبر اور طاقت کے بل پر عیسائی بنانے والوں پر اور ساری دنیا کے مشنریوں پر یہ کتاب لکھ کر زبردست احسان کیا ہے اور اب عیسائیت کو حق اور اسلام کو باطل اور قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا سرسیّد کی اس کتاب کی وجہ سے آسان ہو گیا ہے[1]۔

حالی نے آرنلڈ کا آخری جملہ ''قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا آسان ہو گیا'' نقل کر کے آرنلڈ کا مذاق اڑایا ہے اور کہا کہ معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے؟ یعنی یہ حقیقت نہیں، یاد رہے کہ حالی ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی تحریروں میں انگریزوں کے اقوال اتنی اہمیت وعقیدت کے ساتھ نقل کرتے ہیں جیسے وہ وحی اور الہام ہو اور اس کو اتنا مستند بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، وہ آنکھ بند کر کے مستشرقین اور علماء یورپ کے اقوال کو بطور سند ہمیشہ نقل کرتے آئے ہیں اگر آپ چاہیں تو مقدمہ شعر وشاعری سے ان کی ایک پوری فہرست نقل کر سکتے ہیں لیکن آرنلڈ جیسا مصنف جب اپنی کتاب ''قرآن اور بائبل'' میں سرسیّد کی کتاب پر اپنا تأثر لکھتا ہے تو وہی حالی آرنلڈ کا مذاق اڑاتے ہیں، اس لئے کہ اس سے سرسیّد پر پڑی ہوئی نقاب سرکتی ہوئی نظر آتی ہے اور ان کی قدر وقیمت گھٹنے لگتی ہے، مگر اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی، سرسیّد کی کتاب پڑھ کر آرنلڈ نے جو تأثر لیا، یقیناً کتاب سے کتاب کے پڑھنے والے وہی تأثر لیں گے جو آرنلڈ نے لیا ہے، آپ آج مستشرقین اور علماء یورپ کو اتنا احمق کیوں سمجھنے لگے ہیں جب کہ کل ان کی ہر بات آپ کے لئے سند تھی۔

## زہر یا تریاق؟

سرسیّد نے بائبل کی تفسیر لکھ کر مسلمانوں کو بغلی گھونسہ مارا ہے، خواجہ حالؔی اسے اسلام کی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، زہر کو تریاق کا نام دینا حالی کے لئے زیبا نہ تھا، شاید یہ ان کی مجبوری تھی، مگر ایک خالی الذہن انسان جو دوستی ودشمنی کے حدود سے باہر

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۹۔

ہے جو سچائی ہے جو حقیقت ہے وہی تسلیم کرے گا، بائبل کی تفسیر لکھ کر سرسیّد نے اپنے محفوظات ذہنی کو آشکارا کر دیا ہے، یہ ہے سرسیّد کا وہ کارنامہ جن کو مجتہد عصر اور مجدد وقت کہا جاتا ہے بلکہ ولی، قطب اور ابدال اور جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، حالؔی بھی سرسیّد کو اسی بلند مقام پر فائز دیکھتے ہیں جیسا کہ اپنی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ہم سرسیّد کے افعال اور اخلاق وعادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ واہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں، بلاشبہ وہ آخر عمر میں بہ سبب فربہی مفرط اور کبر سن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے[1]۔''

حالی کو متضاد باتیں کہنے میں جیسے کوئی جھجک نہیں، ان کے نزدیک نماز روزے کی پابندی نہ ہونے کے باوجود کوئی شخص عام مشائخ اور اہل اللہ سے بلند مقام پر فائز ہوسکتا ہے، معلوم نہیں ان کے پاس وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر سرسیّد کی ولایت وقطبیت کو پرکھتے ہیں اور اس طرح وہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کا مذاق اڑاتے ہیں، سرسیّد صاحب جیسے ولی کامل اور خواجہ حالؔی جیسے معتقد ؎

ہم چنیں مکتب وہمیں مُلا ۞ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

## سر ولیم میور کا جواب

کچھ لوگ میرے اس انکشاف پر سرسیّد کی بعض دوسری تصنیفات کو پیش کریں گے جیسے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب یا خطبات احمد یہ ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام کا درد ان کے سینہ میں نہیں تھا تو وہ یہ کتابیں کیوں لکھتے؟

اس سلسلہ میں مختصر بات یہ ہے کہ میں نے سر ولیم میور کی ''لائف آف محمدؐ'' نہ پڑھی ہے نہ دیکھی ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں اور وہ بھی اُردو زبان میں اس کتاب کے جواب کی ضرورت تھی یا نہیں، سر ولیم میور کی کتاب انگریزی میں ہے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے شاید دو چار نے اس کتاب کو پڑھا ہو،

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۵۲۲۔

ان کی کتاب سے اسلامی ہند کے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے گا اس کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا اور اسلام سے بدگمان ہو کر عیسائیت قبول کرنے کا اندیشہ تو قطعاً نہیں تھا حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا اس لئے مسلمانوں نے اس کے جواب کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور بعد کے زمانہ نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں نے اس فضول کام میں اپنی انر جی ضائع نہیں کی یہ ان کی دانشمندی تھی۔

سر سیّد نے جواب لکھا؟ میں مسلسل کہتا آ رہا ہوں کہ سر سیّد بہت ذہین اور زمانہ کے نبض شناس اور مسلمانوں کی نفسیات سے آگاہ تھے، اب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے عیسائیت کے خلاف اپنی مہم تیز کر دی ہے اور مناظرہ اکبر آباد کے بعد ان کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی توجہ ادھر سے ہٹانے کے لئے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب کی اہمیت بتا کر اس کا جواب لکھنے کا اعلان کرایا، سر سیّد کے اس کام کی مثال ٹھیک اس معالج اور ڈاکٹر کی ہے کہ آدمی کہ شہ رگ کٹ گئی ہے اور اس کے جسم کا خون اتنی روانی سے جاری ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ چکی ہے، اس کا خون روکنے اور علاج کرنے اور اس کی جان بچانے کے زود اثر علاج کے بجائے اس کے ہاتھ میں چبھ جانے والی سوئی کے زخم کے علاج پر پوری توجہ صرف کر رہا ہے اور بہتے ہوئے خون سے صرف نظر کر رہا ہے جو جلد ہی اسے موت کی آغوش میں لے جانے والا ہے، سر سیّد بھی اسی معالج کا کردار ادا کر رہے تھے، وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے اس جبر کو دیکھ رہے تھے جو عیسائیت کے پھیلانے میں حکومت کے عہدیدار اختیار کر رہے تھے، خود ان کی تحریروں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

> ''کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے[1]۔''

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۵۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسیّد نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ حکومت کی شکایت کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے ہندوستان کے ماحول اور فضا میں وہ طریقہ کار مناسب نہیں ہے، کام کی مخالفت نہیں، طریقہ کار کی شکایت تھی، پورا ہندوستان عیسائی ہو جائے اس سے سرسیّد کو کوئی سروکار نہ تھا صرف انداز تبلیغ کی مخالفت کر رہے تھے جس سے ملک میں انتشار اور بے چینی بڑھ رہی تھی، انھوں نے اسی رسالہ میں اپنے اس واقعہ کو بھی لکھ دیا ہے جو یتیموں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے نمونے گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح مفلس اور محتاج کر کرا اپنے مذہب میں لے آئیں گے[1]۔''

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری افسران تبلیغ عیسائیت میں دلچسپی لیتے ہیں اور پادریوں کو مدد پہنچاتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کر رکھا ہے، گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زا جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت روپیہ دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں، بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے ہیں کہ ہماری کوٹھی پر ان کے پادری کا وعظ سنو[2]۔''

پادریوں کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے اسی رسالہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ:

''(پادری صاحبان) غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ گاہ، میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا، بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا چپراسی جانے لگا[3]۔''

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔
[2] حوالہ مذکور۔
[3] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔

کلکتہ کے لاٹ پادری کی چٹھی جس نے پورے ملک میں زلزلہ ڈال دیا تھا سرسیّد اس سے خوب واقف تھے اور جو اس کا ردعمل ہوا اس سے بھی آگاہ تھے، انھوں نے عیسائیت کی چیرہ دستیوں کی صحیح تصویر کشی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہئے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اور ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بے شک یہ سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی؟ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے، ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی، لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جائے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں[1]۔''

ایسے ماحول اور ان حالات میں سرسیّد بائبل کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور اس کی غیر محرف ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ انجیل قرآن

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۷، ۸۱۸۔

وحدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور سر ولیم میور کی انگریزی کتاب کا اردو میں جواب لکھ رہے ہیں، اسلام پر یورپ کے لوگ انگریزی میں پڑھیں اور سر سیّد کی کتاب اردو میں ہندوستان کے لوگ پڑھیں، سر سیّد بحیثیت سرکاری ملازم ہونے کے یہ بھی جانتے تھے کہ جن لوگوں نے اکبر آباد مناظرہ میں یورپ کے مایہ ناز پادری کو مجمع عام میں شکست دی تھی ان سے انتقام لینے کے لئے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے نام وارنٹ جاری کیا گیا، گھوڑ سوار پولیس ان کی گرفتاری کے لئے بھیجی گئی، اور پھر کس طرح اور کتنی مصیبتوں سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ پہنچے؟ یہ بڑی ہی دردناک کہانی ہے، مکہ مکرمہ میں بھی گرفتاری کی کوشش کی گئی مگر خدا نے بچالیا[۱] ان دونوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے پادریوں سے مناظرہ کرکے ان کو ذلت آمیز شکست دی تھی اور حکومت کے منصوبہ کی راہ میں سد سکندری کھڑی کر دی تھی، یہ تھا تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں ہندوستانیوں پر جبر و ستم، حکومت کا ہر عہدہ دار چنگیز و ہلاکو بنا ہوا تھا ایسے حالات میں سر سیّد مسلسل کتابیں لکھ رہے ہیں، رسالے، مضامین اور مقالات تہذیب الاخلاق میں شائع کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو؟

## سر سیّد کی دیگر تصانیف

حالی نہ لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی اور آگرہ میں مشنریوں کے کاروبار پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثہ ہونے لگے اس وقت سر سیّد کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے جوابات لکھے جائیں، سر سیّد اور مشنریوں کا جواب؟ حالی نے لکھا ہے کہ ''تبیین کلام'' اسی مقصد سے لکھی گئی، یہ پڑھ کر انتہائی حیرت ہوئی، اس میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات کے بجائے لوگوں کو خود سر سیّد کے ایمان میں شبہ ہونے لگا جیسا کہ سر سیّد کے نام سیّد مہدی

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ناشر دار المؤلفین دیوبند ص ۱۷۷ و ۱۹۱۔

علی خاں نے غصہ میں بھرے ہوئے خط میں لکھا ہے[1]۔ اس کتاب کا مشنریوں کے جواب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، لکھی بھی تو بائبل کی تفسیر لکھی جس میں عیسائیوں کو عیسائیت کے حق ہونے کو ثابت کرنا آسان ہوگیا، سرسیّد اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں سچے تھے تو تفسیر کے بجائے وہی کتاب لکھ کر مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ دیتے تو شاید ان کا زخم کچھ مندمل ہوجاتا، حالی نے مشنریوں کے جواب کی بات سرسیّد کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے یوں ہی کہہ دی ہے۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

## عیسائیت ناکام ہوگئی

ہندوستان میں عیسائیت جس لاؤ لشکر کے ساتھ آئی تھی اور جس جبر و تشدد سے کام لے کر انگریزوں اور مشنریوں نے مذہبی حیثیت سے بھی ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوا، یہ صرف مسلمانوں کی سخت جانی تھی کہ اپنی ساری مظلومیت کے باوجود انھوں نے عیسائیت کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کی سرزمین سے اس کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کردیا، سرسیّد نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ان کی کوششوں کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا، اور اپنی زندگی ہی میں ان کو اپنی ناکامی کا بار بار تجربہ ہوتا رہا اس مسلسل ناکامی اور شکست نے ان میں جھنجھلاہٹ پیدا کردی اور اس کا غصہ انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھ کر اتارا اور تیرہ صدیوں کے علماء اور مفسرین کے کارناموں پر انگریزی برش سے سیاہی پھیر دینے کی کوشش کی لیکن جب حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، جب ذہن پر ناکامیوں کی مسلسل ضرب پڑتی ہے تو کُند ہوجاتا ہے، اس کی قوت برداشت تو ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن ذہن ٹھس ہوجاتا ہے، اور ذہانت و فطانت اور تدبر و فراست کی بجلی جو اس میں کارفرما رہتی ہے وہ رخصت ہوجاتی ہے، سرسیّد بھی تفسیر قرآن میں اسی کیفیت سے

[1] حیات جاوید از حالی ص ۵۳۳،۵۳۴۔

دو چار رہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تفسیر کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے، کیونکہ جہاں تک وہ اس راہ میں چلے وہ صراط مستقیم سے اتنا منحرف ہو چکے تھے کہ پھر ان کا اسلام کے صراط مستقیم پر لوٹ کر آنا ناممکن ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے راہ کی سختیوں سے چور ہو کر راستے ہی میں رختِ سفر اتار دیا اور سفر آخرت اختیار کر لیا۔

## تفسیر احمدی

یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ اپنی دو ایک نسلوں کے لئے معاش اور اعزاز وافتخار کے وسائل فراہم کر جائے اور خود اپنا دامن زادِ آخرت سے خالی رہ جائے اور وہ بھی اس حال میں کہ ساری دنیا کی لعنت وفضیحت کا سامنا کرنا پڑے، لوگوں میں اس کی عظمت واحترام کے بجائے اس کو قومی دشمن، مذہب مخالف، اور اسلامی تہذیب وتمدن کو ڈائنامیٹ کرنے والا تصور کیا جانے لگے، ایسے حالات میں اس نے اپنی چند روزہ زندگی کے لئے دنیاوی عیش وعشرت کے لئے کچھ "متاع کاسد" حاصل کر لی تو یہ اس کی کامیابی نہیں، ناکامی ہے۔

سر سیّد نے ساری زندگی انگریزی حکومت سے مکمل اور بلا شرط اور بے لچک وفاداری کے ساتھ گذاری اور حکومت کے معتمد علیہ بن گئے، دنیاوی اعتبار سے یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے اگر چہ پوری ہندوستانی قوم کے جذبات انگریزی حکومت اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف رہے، سر سیّد عیسائیت کے فروغ میں تعاون دے کر مسلمانوں کی نگاہوں سے گر گئے اور پھر یورپین تہذیب کی مسلمانوں میں اشاعت کے لئے انھوں نے قرآن کو استعمال کرنا شروع کر دیا تو پوری ملت اسلامیہ کے سینے غم وغصہ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گئے، کیونکہ انھوں نے اپنے تمام خود ساختہ نظریوں کی صداقت ثابت کرنے کے لئے بلا جھجک آیات قرآنی کو استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ بات دیندار مسلمانوں کے حلقے میں ناقابلِ برداشت ہوگئی، اس لئے اس کا ردعمل ہوا اور بہت ہی سخت ردعمل ہوا، ان کے خلاف فتوے مرتب ہوئے اور عرب و ہند کے

مفتیوں نے بڑے سخت لب ولہجہ میں اظہار خیال کیا جیسا کہ حالؔی نے لکھا ہے[1]، چونکہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے میں اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

## تفسیر احمدی کے کچھ نمونے

یہ تفسیر سر سیّد نے ہر طرح کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھی ہے اس لئے جمہور امت اور ملت اسلامیہ کے متفقہ عقائد، نقطۂ نگاہ، جذبات وخیالات اور مستند مفسرین کی تصریحات کے خلاف ہے، سر سیّد نے زیادہ تر اپنی عقل، سوجھ بوجھ، غور وفکر اور من مانی توجیہہ وتاویل پر بھروسہ کیا ہے بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے خود ایک نظریہ بنالیا اور اس کی روشنی میں تفسیر لکھنے لگے اور آیات کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریئے کی تائید میں اس کو پیش کردیا۔

مستند علماء نے ان کی تفسیر کے رد میں مستقل کتابیں لکھی ہیں مولانا محمد علی بچھرایونی جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہمراہ مباحثہ شاہجہانپور میں شریک ہوئے تھے انھوں نے اس کے رد میں ''البرہان'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے مولانا عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر کے ضخیم مقدمہ میں مفصل تبصرہ وتنقید کی ہے، حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ان ہفوات کی ایک مفصل فہرست مرتب کردی ہے میں اسی فہرست کا تھوڑا سا حصہ پیش کرتا ہوں، آپ خود اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کریں، آپ کا ایمان آپ کا ضمیر کیا فیصلہ کرتا ہے، میں نہ مفتی ہوں نہ فتویٰ دینا میرا مشغلہ ہے، آپ کے ایمان اور آپ کے ضمیر کے فیصلے کے لئے بلا اظہار رائے اور بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں، تو دانی حساب کم وبیش را۔

حضرت آدم، ملائکہ اور ابلیس کا قصہ فرضی ہے اور صرف تمثیل ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ (تفسیر احمدی ج۱ ص۵۲ تا ۶۹، مطبوعہ مفید عام آگرہ)

جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں نہ اس کا کوئی وجود خارجی ہے۔ (تفسیر احمدی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۵۴۱ سے ۵۵۷ تک۔

مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ج ا ص ۱۰)

نامۂ اعمال کا لکھنا، کراماً کاتبین کا مقرر ہونا، اعمال کا تولا جانا ایک افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۳ ص ۱۰۲، ج ۶ ص ۴۲)

روزہ رکھنا سب پر فرض نہیں جس کا جی چاہے روزہ رکھے جس کا جی چاہے فدیہ دے کر خود کھائے پیئے چاہے جوان ہو یا بوڑھا۔ (ج ا ص ۲۲۸)

فرشتوں کا کوئی وجود نہیں، جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل نام فرضی ہیں۔ (ج ا ص ۴۶ و ۴۲ ۱۴۲ تا ۱۵۴، ج ۳ ص ۴۷)

شیطان یا ابلیس صرف ایک افسانہ ہے اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ (ج ا ص ۴۷ تا ۵۲)

قیامت میں صور کا پھونکا جانا اس کی کوئی اصلیت نہیں، صور کوئی چیز نہیں۔ (ج ۳ ص ۵۴)

انبیاء کے معجزات کی کوئی حقیقت نہیں، معجزات بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ (ج ا ص ۷۱، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ج ۲ ص ۲۹)

موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریائے نیل میں راستہ بن جانا بے حقیقت ہے۔ (ج ا ص ۷۱ تا ۱۰۰)

موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ا ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)

**رفعنا فوقکم الطور** میں جو پہاڑ کا سر پر اٹھائے جانے کی تفسیر احمقانہ ہے یہ بے بنیاد بات ہے۔ (ج ا ص ۱۱۵)

**فکونوا قردۃ خاسئین،** اصحاب سبت کی صورتوں کا مسخ ہو جانا غلط اور بے حقیقت ہے۔ (ج ا ص ۱۱۷ تا ۱۱۹)

قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا حکم الٰہی نہیں ہے۔ (ج ا ص ۱۸۶ تا ۱۹۴)

شہیدوں کا زندہ رہنا صحیح نہیں ہے۔ (ج ا ص ۱۹۸)

حجر اسود کا بوسہ ثواب کا کام نہیں، حج میں ننگے سر ننگے بدن رہنا لغو ہے۔ (ج ا ص ۲۴۸ تا ۲۵۷)

سود کی بہت سی قسمیں جائز ہیں جب کہ شریعت میں حرام ہیں۔ (ج ا ص ۲۹۸ تا ۳۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے، یہ غلط خیال ہے۔ (ج ۲ ص ۲۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا صحیح نہیں ہے۔ (ج ۲ ص ۲۴)

گردن مروڑی ہوئی چڑیوں کا کھانا حلال ہے۔ (ج ۲ ص ۱۸)

چور کا ہاتھ کاٹنا وحشیانہ سزا ہے اگر قید کا انتظام ہے تو ہاتھ کاٹنا جائز نہیں۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

غیر مسلم کی حکومت میں رہ کر شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا جائز نہیں حکومت کے قانون کے مطابق فیصلہ واجب ہے۔ (ج ۲ ص ۲۰۷)

حشر و نشر کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۲ مطبوعہ انسٹیٹیوٹ پریس علی گڈھ ص ۱۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا کا معجزہ صرف تخیل کا کرشمہ تھا۔ (ج ۳ ص ۲۲۲)

اصحاف کہف کا صدیوں تک غار میں سونا یہ غلط ہے۔ (ج ۶ ص ۱۵)

محشر میں شفاعت اور شفاعت کی اجازت اس کی کوئی حقیقت نہیں[1]۔ (ج ۶ ص ۱۴۰، ۱۴۱)

## قرآن خدا کا کلام نہیں

قرآن جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں سر سیّد اس کو تسلیم نہیں کرتے، سر سیّد کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''جس طرح سونے کی حالت میں تعلقات ظاہری منقطع ہو جاتے ہیں اور جس میں انسان کو انہاک ہے وہی خیالات مجسم صورت میں انسان کو دکھائی دیتے ہیں، وہی حالت انسان پر بیداری میں حالت استغراق اور انہاک میں طاری

[1] امداد الفتاویٰ جلد ششم مرتبہ مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند شائع کردہ مکتبہ دار العلوم کراچی ص ۲۸۷ تا ۲۹۷

ہوتی ہے اور بیداری میں بھی اسی طرح سب چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے جیسے کہ حالت خواب میں دیکھتا ہے وہ بن آواز دینے والے کے سنتا ہے، بغیر کسی موجود فی الخارج کے موجود فی الخارج دیکھتا ہے، بغیر کسی موجود ہونے، کسی بات کہنے والے کے ایک وجود کو متکلم پاتا ہے، چونکہ ذات پاک انبیاء کی بہت زیادہ مقدس اور منہمک فی اللہ اور فی صفات اللہ ہوتی ہے ان کو کامل استغراق فی ذات اللہ اور فی صفات للہ ہوتی ہے اسی استغراق اور انہماک کے سبب کبھی بغیر آواز کرنے والے کے آواز سنتے ہیں اور بغیر کسی موجود کے ایک موجود کو پاتے ہیں جو ان سے اور وہ ان سے کلام کرتے ہیں اسی حالت کے واقعات ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے، مجھ سے بات کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو یاد کر لیتا ہوں[۱]۔"

یعنی نہ کوئی وحی لانے والا ہے نہ کوئی بھیجنے والا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں جو خیالات ہیں حالتِ استغراق میں وہی الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں خارج میں کچھ نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ سارا قرآن اسی طرح مرتب ہوا ہوگا تو پھر اس کو خدا کا کلام کہنا کیسے درست ہوگا۔ حضورؐ کے استغراق وانہماک کی حالت میں جو باتیں زبان مبارک سے نکلیں وہی وحی ہے، وہی قرآن ہے، گویا سرسیّد کے نزدیک نبوت نعوذ باللہ جنون اور پاگل پن کی قسم ہے، اس کے بعد کوئی تبصرہ فضول ہے، ان حقائق کے بعد بھی اگر کوئی شخص سرسیّد کو مسلمانوں کا مسیحا کہتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ شخص پتھر کو بھی خدا مان سکتا ہے۔"

---

۱ تہذیب الاخلاق ج ۲ شمارہ نمبر ۳ دورسوم بحوالہ مقالات سرسیّد از مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

# فکر فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی اردو تفسیر ''تدبیر قرآن'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآنیات سے متعلق فکر فراہی کا یہ عملی ظہور ہے، مولانا اصلاحی نے اپنے استاذ مولانا حمید اللہ فراہی کے نظریات وخیالات کی روشنی میں یہ تفسیر مرتب کی ہے، ان کے تمام علمی افادات وکمالات اور ان کی فکری خصوصیات کو اس تفسیر میں ملحوظ رکھا ہے، مولانا فراہی جو اس مکتبۂ فکر کی ورح رواں ہیں، ان کے درسی افادات نے مولانا اصلاحی کے ذہن وفکر کو کتنی جلا بخشی ہے اس کا پتہ مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے جانے والے ان مضامین سے چلتا ہے جو ایک معیاری رسالہ ''علوم القرآن'' علی گڈھ کے مولانا امین اصلاحی نمبر شائع ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فکر فراہی کیا ہے؟ اس کی خصوصیات وامتیازات کیا ہیں؟ پھر یہ بھی سوال ہے کہ مولانا فراہی کے ذہن کا یہ خودرو پودا ہے یا اس کی جڑیں کسی دوسرے ذہن میں ہیں؟ اور فکر فراہی میں صرف اس کے برگ وبار اور پھول پتیاں ہیں، اس کی تلاش کے لئے ہمیں مولانا فراہی کے حالات زندگی اور علمی وعملی سرگرمیوں کی سرزمین میں چلنا ہوگا۔

مولانا فراہی کی مختلف مقامات پر ملازمت، سرسیّد کے دربار میں باریابی، ان کے حکم سے ایک بڑے انگریز افسر کے جذبات کی ترجمانی وہم نوائی، عرب ملکوں میں اس کی وکالت کرتے ہوئے ہم ان کو پاتے ہیں، پھر مولانا فراہی کا علی گڈھ میں قیام کا زمانہ ہے جب سرسیّد اپنی تفسیر احمدی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دے رہے تھے اور وہ سرسیّد کے ماتحت کام کررہے تھے، اگرچہ بعد کے دور میں انھوں نے سرسیّد کے افکار وخیالات پر اپنی تحریروں میں کہیں کہیں برہمی کا اظہار کیا ہے اور تیز وتند جملے لکھے ہیں لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے اور دلائل وشواہد کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ ان کے ذہن وفکر پر سرسیّد کا جادو چل چکا تھا وہ غیر اختیاری طور پر مسمریزم کے معمول کی طرح اسی راہ پر

چلتے رہے جس پر سرسیّد کے سحر نے ان کو ڈال دیا تھا یہاں تک کہ خود ان کو اپنی اثر پذیری کا احساس تک نہیں تھا، یہ تمام حالات مولانا فراہی کو شکوک وشبہات کے دائرے میں ضرور لاتے ہیں لیکن ان پر یقین کرنا صحیح نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ بدگمانی ہواور ان بعض الظن اثم ہمارے سامنے ہے، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ سرسیّد انتہائی ذہین وفطین انسان تھے اسی کے ساتھ ضبط وتحمل میں ہمالیہ تھے وہ اعتراض اور نکتہ چینی سے کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے، وہ مثبت انداز میں غور وفکر کے قائل تھے، منفی رویہ کو دانشمندی کے خلاف تصور کرتے تھے، وہ اپنی بات مسلسل کہتے رہتے تھے، نکتہ چینی کرنے والوں کے ناک سکوڑنے، ابرو چڑھانے، اوران کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو نہیں دیکھتے تھے اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو بات مسلسل کہی جائے گی وہ اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض بہت ہی ذہین وفطین حضرات غیر محسوس طور پر ان سے متأثر ہوئے جب کہ بظاہر وہ سرسیّد کے مخالف تھے۔

سرسیّد احادیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے اور اپنی تفسیر میں بائبل پر تو اعتماد کر سکتے تھے لیکن روایات حدیث پر اعتماد نہیں کرتے تھے، مولانا فراہی سرسیّد کی بعض باتوں پر تنقید کرتے تھے مگر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، تفسیر قرآن میں احادیث وروایات سے اجتناب واحتراز سرسیّد ہی کے دربار کا عطیہ ہے جب کہ سرسیّد کے رویہ کے پس پردہ وہی انکار حدیث کا جذبہ کارفرما ہے، جاہلی ادب سے استناد، تفسیر بالرائے اور ذاتی ذہانت وفطانت کی مشعل ہاتھ میں لے کر خود ساختہ توجیہ وتاویل کرنا، قدیم مفسرین کا استخفاف، جگہ جگہ بائبل کے حوالے دینا، فہم قرآنی میں صحیح احادیث کو ترک کرکے توریت کو بطور شہادت پیش کرنا یہ ساری باتیں سرسیّد ہی کے دربار سے ان کو حاصل ہوئیں، بہت ممکن ہے فکر فراہی میں احادیث کی استنادی حیثیت بھی مشکوک ہو مگر یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں کیونکہ مولانا فراہی نے بہت کم لکھا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں ملتی اس لئے اس نقطۂ نگاہ کی کوئی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آئی، البتہ ان کے خصوصی شاگرد جو فکر فراہی کے وارث

وامین ہیں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے اگر یہ سب کچھ فکر فراہی کے نقطۂ نگاہ، نظریات وخیالات کے سچے اور صحیح معنی میں وارث ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اصلاحی کی تحریریں فکر فراہی کی آئینہ دار ہیں اور اس آئینہ میں فکر فراہی کی بہت واضح تصویر اپنے تمام خدوخال کے ساتھ نظر آجائے گی، ہم اس نقطۂ نگاہ سے مولانا امین اصلاحی کے مضامین مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ فکر فراہی کی اصلی تصویر آپ کے سامنے آجائے مولانا اصلاحی کا شاندار کارنامہ قرآن کی تفسیر ''تدبر قرآن'' ہے، یہ ان کی پوری زندگی کی علمی سرگرمیوں کا حاصل ہے، اس اردو تفسیر میں انہوں نے فکر فراہی سے سرمونہ ہٹنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کو شک ہے، ان کے مداحوں اور نقادوں نے دونوں پہلوؤں پر زور قلم صرف کیا ہے، ان مضامین میں دونوں طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ان کے نقادوں نے مولانا اصلاحی کے ساتھ تھوڑی سی بے انصافی کی ہے، انہوں نے کہیں بھی دانستہ فکر فراہی سے انحراف نہیں کیا ہے، وہی آیتوں کی تفسیر وتاویل میں احادیث وروایات سے اجتناب واحتراز، وہی درایت کی کارفرمائی اور تفسیر بالرائے کی کوشش، جاہلی ادب عربی کی روشنی میں منشأ قرآنی کو سمجھنے کی جدوجہد، صحیح ترین احادیث وروایات کو نظرانداز کر کے مفہوم قرآنی کو عقل انسانی کے حدود میں لانے اور خدا کے کلام کو انسانی کلام کے اصولوں پر ڈھالنے کی محنت، بائبل کی روایتوں سے تطبیق واستدلال ہر جگہ پائی جاتی ہے، جو بظاہر فکر فراہی کی اصل روح ہے، اس سلسلہ میں مولانا اصلاحی اپنے استاد کے قدم سے قدم ملا کر چلے ہیں اور جہاں افادات فراہی میں ان کو کوئی روشنی نہیں ملی وہاں ذاتی اجتہاد کی مشعل ہاتھ میں لے کر راہ طے کی ہے، ہمارا خیال ہے کہ یہ اجتہاد بھی فکر فراہی کا ہی فیضان کرم ہے، اس لئے مولانا اصلاحی پر فکر فراہی سے انحراف کا الزام کچھ درست نہیں معلوم ہوتا، ہمارے نزدیک ''تدبر قرآن'' فکر فراہی کی مکمل آئینہ دار ہے، بظاہر ہر جگہ فکر فراہی کی تیز روشنی جھما جھم برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تفسیر قرآن کے بعد مولانا اصلاحی نے فن حدیث کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کے بھی دستاویزی ثبوت علمی دنیا کے سامنے موجود ہیں، ان کے شاگردوں نے ان کے درس حدیث کی تقریروں کو کیسٹ سے انہیں کے لفظوں بلکہ انھیں کے لب ولہجہ میں قلمبند کر کے ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

رسالہ علوم القرآن علی گڈھ جو ایک معیاری ششماہی رسالہ ہے اس کے ''مولانا اصلاحی نمبر'' میں اصلاحی کی خدمت حدیث کا ریکارڈ موجود ہے، رسالہ معارف دارالمصنّفین اعظم گڈھ کے مدیر محترم نے ''مبادی تدبر حدیث'' کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کے علمی جواہر کو اس خریطہ سے نکال کر رسالہ معارف کے صفحات پر بکھیر دیا ہے جن کی چمک دمک، آب وتاب ایمان وعقیدہ کی آنکھوں کی روشنی کو سلب کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ان بیش بہا اور قیمتی جواہرات کے سامنے منکرین حدیث کے امام عبداللہ چکڑالوی، غلام احمد پرویز کتاب ''دو اسلام'' کا مصنف، رسالہ طلوع اسلام کے مقالہ نگار پانی بھریں منکرین حدیث کے سرخیل سرسیّد احمد خاں سر پیٹ کر رہ جائیں کہ یہ خزانہ ہمارے ہاتھ کیوں نہیں آیا۔

اس وقت ہمارے سامنے ''مبادی تدبر حدیث'' کا تو کوئی نسخہ نہیں ہے، البتہ علوم القرآن علی گڈھ کا مولانا اصلاحی نمبر اور رسالہ معارف اعظم گڈھ کا وہ شمارہ موجود ہے جس میں مبادی تدبر حدیث کا تعارف کرایا گیا ہے، ہم انھیں دونوں رسالوں کی مدد سے مولانا اصلاحی کی خدمت حدیث کے کچھ نمونے پیش کریں گے۔

مولانا اصلاحی کا مزاج یہ ہے کہ وہ محدثین کرام کا ذکر نہایت حقارت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے گاؤں کے کسی پٹی دار کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں جس سے ان کی اَن بن ہو، وہی سوقیانہ الفاظ اور بازاری لب ولہجہ استعمال کرتے ہیں جو آپسی اختلافات کے وقت ایک دوسرے کے بارے میں اختیار کیا جاتا ہے جب کہ پوری امت اسلامیہ چودہ سو سالوں سے جن کے نام انتہائی عقیدت واحترام سے لیتی ہے،

وہ ان محدثین کرام کو اپنی سطح سے ذرا بھی اونچا مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا دل ان مقدس، ہستیوں کے بغض وعناد سے بھرا ہوا ہے، شاید وہ یہ انداز بیان اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ ان محدثین کے مرتب کردہ احادیث کے مجموعوں کو لغو، خرافات کا مجموعہ اور نا قابل اعتبار ہونے کے لئے فضا تیار کی جائے اور مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے کہ احادیث کی یہ تمام کتابیں ''طلسم ہوشربا'' اور ''فسانہ عجائب'' سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی ہیں، جھوٹ اور خرافات اورلغویات کا انبار ہیں، اس کے چند نمونے آپ خود ملاحظہ فرمائیں، کیسٹ کے ذریعہ مرتب کردہ ان کے درس حدیث کی تقریریں جو ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں اس کے صفحہ ۵۳۳ پر ان کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

> ''اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ میں ابن شہاب زہری موجود ہیں، یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں، وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعوں کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب زہری سے مروی ہیں، مگر اس کے باجود امام بخاری اور امام مالک نے ان کو سر پر بٹھایا ہے، یہ امت کے لئے بہت بڑا حادثہ ہے۔''

(بحوالہ رسالہ معارف اعظم گڈھ شمارہ اپریل ۲۰۰۱ء ص ۳۱۰)

گاؤں کے کسی بڑے آدمی کی اولاد سرکش ہوجاتی ہے اور باپ کچھ نہیں کہتا تو لوگ کہتے ہیں کہ بہت سر چڑھا رکھا ہے اس کا نتیجہ بھگتے گا اور اس کی اولاد بھی بھگتے گی سر چڑھانے والا مغرور بھی ہوتا ہے اور ناعاقبت اندیش بھی، مولانا اصلاحی کے نزدیک امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس صاحب مؤطا، اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری کے مرتب امام بخاری کی بھی وہی حیثیت ہے، یعنی دونوں احمق بھی ہیں اور ناعاقبت اندیش بھی حالانکہ امام مالک کی کتاب مؤطا کی اتنی اہمیت ہے کہ کچھ اکابر علماء اس کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں اس کتاب کے مرتب امام مالک کو مولانا اصلاحی بار بار صلواتیں سناتے ہیں ان کو فریبی اور جعل ساز ثابت کرنے کی ہر ممکن

کوشش کرتے ہیں، مبادی تدبر حدیث میں ان کا ملفوظ گرامی یوں نقل کیا گیا ہے:

''امام مالک چونکہ جرح وتعدیل میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اس لئے بڑے طنطنے سے کہتے ہیں کہ میں ان پر اعتماد کرتا ہوں۔'' (معارف ص ۳۰۸)

ضدی اور مغرور شخص اپنی طاقت کے زعم میں صریح غلط بات برملا کہتا ہے تو اس موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے طنطنے سے کہتا ہے بعض الفاظ اپنی ایک خاص تاثیر رکھتے ہیں اور قبیح مواقع پر استعمال کی وجہ سے اس کی معنویت ذہن میں نفرت وغصہ کی فضا بنا دیتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ پولس ظلم وزیادتی اور دھونس جما کر بے قصور لوگوں سے بھی رشوت لے لیتی ہے۔

مولانا اصلاحی اس طرح کے الفاظ کو بھی استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے بلکہ اپنی انا اور جوش تنقید کا مظاہر کرتے ہیں۔

امام مالک کے بارے میں نہایت دل آزار اور کریہ لفظوں میں کہتے ہیں:

''ایک متنازع فیہ شخصیت کے حق میں اس طرح کا اصرار امام صاحب کی بڑی زیادتی ہے زہری کا تشیع اور مرسل روایت کا ان کے پاس انبار ان کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ امام صاحب ان کے حق میں دھونس سے کام لیں''

مولانا اصلاحی نے ایک جگہ امام مالک کو دغاباز، فریبی اور جعلساز ثابت کرنے کی بھی جرأت دکھائی ہے، مؤطا میں امام مالک بعض روایتون کو راوی کا نام لئے بغیر بلغنی کے لفظ سے بیان کرتے ہیں، ایسی تمام روایتوں کو بلاغات امام مالک کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، مولانا اصلاحی کے الفاظ یہ ہیں:

''یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے اور ان کی اکثر بلاغات وہ ہیں جن کے پیچھے ابن شہاب زہری چھپے ہوئے ہیں، امام مالک ان سے حسن ظن رکھتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ ابن شہاب پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا ہے اس لئے ان کو اپنی بلاغات کے پردے میں چھپا لیتے تھے، یہ ابن شہاب کی شرارت ہے جس کا مقصد حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنا ہے'' (رسالہ معارف ص ۳۹۸)

محدثین کرام کو مولانا اصلاحی زہر فروش بتاتے ہیں یعنی ایسا زہر جو ایمان کو موت کی نیند سلا دے، آج تک محدثین کے بارے میں ایسا سخت جملہ پورے ذخیرہ اسلامیات میں کہیں نہیں ملتا، مولانا اصلاحی ایک موقعہ پر کہتے ہیں:

''گویا امام مالک سندوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بات کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے کہ سندوں میں لپیٹ کر نہ جانے کیا کیا زہر دیا جاتا ہے'' (معارف ص۳۱۲)

اگرچہ اس میں تمام ذخیرۂ حدیث کو زہر کی پڑیا بتا دیا گیا ہے لیکن تمام محدثین کے ساتھ امام مالک، امام بخاری سب اس زد میں آجاتے ہیں، گویا یہ سب زہر فروش ہیں، لیکن زہر چھپا کر بیچتے ہیں۔

مولانا اصلاحی صحیح بخاری کو وہ مقام نہیں دیتے جو پوری امت اسلامیہ نے دے رکھا ہے ان کے نزدیک بخاری میں بھی رطب و یابس بھر ہوا ہے اس کی بہت سی روایتیں جھوٹی اور غلط ہیں قصوں کہانیوں کو بھی حدیث بنا دیا گیا ہے اگرچہ مولانا اصلاحی کے پاس محدثین اور علماء جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق کوئی دلیل نہیں ان کے نزدیک سچائی کی کسوٹی صرف ان کی اپنی عقل ہے ان کا ایک خصوصی شاگرد جو ان کے علوم و فکار کا سب سے بڑا مبلغ ہے اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''صحیح بخاری کی متعدد روایات کے متن کو قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر مولانا نے قابل قبول نہیں گردانا ہے'' (علوم القرآن علی گڈھ مولانا اصلاحی نمبر ص۲۶۴)

مولانا اصلاحی کے اسی شاگرد رشید نے ان کے تفردات کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ بتایا ہے:

''صحیح بخاری کے بالکل آغاز میں لائی گئی ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان مکالمہ پر مبنی روایت بلا وجہ لائی گئی ہے جب یہ حدیث نہیں تو حدیث کے مجموعہ میں یہ کیوں لکھی گئی'' (علوم القرآن ص۲۶۷)

اس نے آگے چل کر مولانا اصلاحی کے نقطۂ نگاہ کے بارے میں ہمیں یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے:

''بخاری شریف کی چار مزید روایتوں کو پیش کر کے مولانا نے ان کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے'' (علوم القرآن ص ۲۶۷)

حدیث کی بے اعتباری ان کے دل میں ایسی جاگزیں معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی روایات کی مسلمہ حقیقتوں کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے اور بلا تامل اس کو ٹھکرا دیتے ہیں اور پوری ملت اسلامیہ کے ذہن ومزاج، ایمان واعتقاد، روایت کی شہرت واہمیت، تمام دنیائے اسلام کی تسلیم شدہ حقیقت کو بیک جنبش قلم رد کر دیتے ہیں اور اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ثابت کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے مولانا اصلاحی کا تلمیذ خاص لکھتا ہے:

''اور غار حرا میں جبریل کی آمد اول کی حدیث کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے وہ سورہ علق کے انتہائی غضب آلود انداز بیان کی روشنی میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسی سورہ ابتدائی مکی دور میں نازل نہیں ہوسکتی تھی، سورہ کی پانچ ابتدائی آیتوں کو باقی سورہ سے الگ کرنے کی کوئی بنیاد بھی نہیں ہے''
(علوم القرآن ص ۲۶۶)

یعنی بخاری ومسلم اور تمام حدیثوں میں غار حرا میں پہلی وحی کی جو روایت ہے وہ جھوٹی ہے پھر اس کی انہوں نے ایک عقلی دلیل دی ہے فن حدیث کے اصولوں کے مطابق دوسری اور کوئی دلیل ان کے پاس نہیں، اس کے بعد اسی شاگرد رشید نے ایک اور اہم انکشاف کیا ہے جو تمام صحیح ترین روایتوں کے خلاف ہے وہ لکھتا ہے:

''مولانا کے نزدیک جبریل کی آمد وحی پہنچانے کے لئے تھی ہی نہیں''
(علوم القرآن ص ۲۶۶)

مولانا اصلاحی نے قیاسی گھوڑے کی لگام ڈھیلی کردی ہے اور وہ سرپٹ دوڑ رہا ہے شاگرد لکھتا ہے:

''مولانا کے نزدیک اقرأ باسم ربک کے الفاظ پا کر کسی راوی نے سورہ علق کی پانچ آیتوں کو پڑھ دیا اور ان کے پہلی وحی ہونے کا عقیدہ قائم ہو گیا''
(علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۷)

یعنی جبریل وحی لے کر نہیں آئے تھے اور نہ پیغام نبوت لے کر آئے تھے نہ آپ اس وقت نبی بنائے گئے بلکہ صرف کشتی لڑنے کے لئے آئے تھے اور کشتی لڑ کر واپس چلے گئے، نعوذ باللہ من ہذہ االخرفات۔ انکار حدیث کے سلسلہ میں مولانا اصلاحی کا ذہن ومزاج سمجھنے کے لئے اتنی مثالیں کافی ہیں، اب صرف ایک مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ پورے مجموعہ حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے اس مقصد کے لئے وہ براہ راست بات نہیں کرتے بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ خود کہنے لگتے ہیں کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار ہے؟ ان کے دلوں میں خود یہ خیال جاگزیں ہوجائے کہ احادیث کا تمام ذخیرہ مجموعہ خرافات ہے۔

حدیث کے مشہور ترین راوی ابن شہاب زہری ہیں حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں کوئی مجموعۂ حدیث ان کی روایتوں سے خالی نہیں، انہیں ابن شہاب زہری کو وہ نشانہ بناتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے ان کے معائب، ان کی فریب کاریاں، جعلسازیاں، دین میں جھوٹی تو ہم پرستیاں بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ رافضیوں کے لئے روایتیں گھڑتے تھے اور اسلامی روایات وتعلیمات میں انہوں نے بہت سی خرافات بھر دی ہیں، مولانا اصلاحی اس سلسلہ میں اپنی سطح سے بہت نیچے اتر آئے ہیں سوقیانہ الفاظ، بازاری لب ولہجہ استعمال کرنے میں بھی کوئی باک نہیں سمجھتے جب کہ اپنے حلقہ میں وہ بہت بڑے عالم دین، حدیث وقرآن کے بہت بڑے واقف کار، حکومت الٰہیہ کے قیام کے مقدس ومطہر قائد اعظم سمجھے جاتے تھے اور اسلامیات کے سلسلہ میں وہ علم وتحقیق کے تخت طاؤس پر متمکن تھے جو ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تھا لیکن جب وہ ابن شہاب زہری کا نام لیتے تھے تو شاید وہ محسوس کرتے تھے کہ میں اپنے گاؤں میں اپنے کھیت کی مینڈ پر بیٹھا ہوا ہوں اور مجھے وہ سب کچھ کہنے کا حق ہے جو مرے گاؤں کا کاشتکار کہتا ہے اور جن الفاظ اور لب ولہجہ کا استعمال کرتا ہے ان سب کا استحقاق مجھے حاصل ہے، اس لئے وہی الفاظ وہی لب ولہجہ ختیار کر لیتے ہیں جو کسی طرح ان کے عالمانہ وقار کے شایان شان نہیں، مولانا

اصلاحی کے شاگرد رشید نے لکھا:

''موطا اور بخاری کی اسناد پر بالعموم مولانا نے بحث نہیں کی، البتہ جن روایتوں کی سند میں محمد بن شہاب زہری یا ان کے شاگردوں کا نام آتا ہے وہاں مولانا بے حد محتاط ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں انھیں اس بات پر ابرام تھا کہ اگر چہ امام مالک اور بخاری دونوں زہری پر اعتماد کیا ہے اور ان سے روایتیں بہ کثرت لی ہیں تاہم یہ ایسے ثقہ راوی نہیں تھے کہ ان کی ہر روایت بے دھڑک ہو کر قبول کر لی جاتی، زہری ادارج کے ماہر تھے، انھوں نے متعدد روایات کو خلط ملط کر کے واقعہ افک کا افسانہ بنا دیا'' (علوم القرآن علی گڈھ مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۳)

مولانا اصلاحی نے امام زہری پر جو الزامات عائد کئے ہیں ان کے شاگرد نے یہ فہرست بھی پیش کر دی ہے وہ لکھتا ہے:

۱- وہ عوامی خرافات کو دین بنا کر روایتوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ (علوم القرآن ص ۲۶۴)

۲- وہ مرسل روایتوں کو موصول کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ (علوم القرآن ص ۲۶۴)

۳- وہ من موجی تھے، یہ بدمعاشی ہے۔ (رسالہ معارف اپریل ۲۰۰۱ء ص ۳۱۳)

۴- وہ شیعیت کے لئے متہم ہی نہیں تھے بلکہ اس کو دین بنانے کے لئے انہوں نے خاصا کام کیا ہے۔ (علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۴)

ابن شہاب زہری پر مولانا اصلاحی جو اس قدر برسے ہیں ان کا اس سے مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرۂ احادیث کی تمام کتابوں کی بنیاد ہلا دی جائے اور مجموعہائے حدیث کے خلاف بے اعتباری کی عام فضا بنا دی جائے، یہ صرف ایک راوی پر جرح نہیں، ہزاروں روایتوں کو مخدوش بنانے کی خفیہ کوشش ہے، میرے علم ومطالعہ کے مطابق صرف امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک ہزار دوسو انتیس مقامات پر امام زہری کے حوالے سے روایت کی ہے اور پوری بخاری میں یہ روایتیں پھیلی ہوئی ہیں

اسی طرح صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں زہری کی بے شمار روایتیں موجود ہیں اگر امام زہری کو جھوٹا بد دین، جعلساز مان لیا جائے تو صحاح ستہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی ہے ان کی صحت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے جب ہزاروں روایتیں نا قابل اعتبار ہو گئیں تو پوری کتاب پر اعتبار کہاں باقی رہا، اس طرح مولانا اصلاحی نے بڑا زبردست وار کیا ہے ان کی تلوار کی زد سے کوئی محدث نہیں بچا، نہ کوئی حدیث کی کتاب محفوظ رہی، ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں منکرین حدیث کا علمی سلسلہ نسب جو سرسیّد خاں تک پہنچتا ہے مولانا اصلاحی کا شجرۂ نسب بھی بیک واسطہ سرسیّد سے جا ملتا ہے، وہی ان کے مورث اعلیٰ ہیں کیوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے انہوں نے ہی یہ فتنہ بویا ہے۔

تدبر قرآن، تدبر حدیث کے بعد مولانا اصلاحی نے تدبر تصوف پر بھی کام کیا ہے اگر چہ ان کی کتاب کا نام یہ نہیں بلکہ ''تزکیۂ نفس'' ہے لیکن بہر حال یہ بھی مولانا اصلاحی کا خصوصی تدبر ہے اس میں بھی انہوں نے پوری اسلامی تاریخ کا قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے ان کے نزدیک جس طرح کی دینی سرگرمیوں کی پابندی اور ایک خاص طرح کا مذہبی نظام بنایا گیا اس کو بعد کے دور میں تصوف کا نام دے دیا گیا ان کا فیصلہ ہے کہ تصوف کا قرآن وحدیث بلکہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہ طریقہ قطعاً غیر اسلامی ہے اس طریقہ میں قرآن وحدیث کا کوئی دخل نہیں بلکہ دوسرے گمراہ مذاہب کی خرافات کا مجموعہ ہے اس طبقہ کے مشہور افراد جاہل تھے جو لوگ تصوف کے قائل تھے ان میں صرف غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کچھ پڑھے لکھے تھے، یہ ان کے الفاظ ہیں علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر میں ان کی کتاب تزکیۂ نفس کا تعارف موجود ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خانقاہ، زاویہ، بیعت وارشاد، تزکیۂ نفس، اولیاء اصفیاء کا جو اسلامی تاریخ میں ایک لمبا سلسلہ ہے یہ سب خرافات اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

مولانا اصلاحی کے علمی کارناموں کی اس تفصیل کو پیش کرنے کا مقصد یہ سمجھنا ہے کہ ان کے مداحوں نے جو بلند بانگ دعوے کئے ہیں ان کو ثریٰ سے اٹھا کر ثریا تک

پہنچادیا ہے اسکی حقیقت کیا ہے؟ کیا انکے ذہن کی زرخیزی کا یہ ثمرہ ہے یا یہی فکرفراہی ہے کیوں کہ مولانا اصلاحی کوفکرفراہی کا ترجمان اور وارث وامین کہا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان کی کتابوں اورتحریروں کے آئینہ میں جوتصویرنظر آرہی ہے کیا وہ فکرفراہی کی اصل تصویر ہے؟ جب کہ ان کی تفسیر تدبرقرآن پر رسالہ تحقیقات اسلامی علی گڈھ جنوری ۲۰۰۱ء میں ایک محقق عالم کا تازہ ترین جائزہ شائع ہوا ہے جو ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے اورکئی درجن آیتوں کی تاویلات پرگرفت کرکے آخر میں مقالہ نگار نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا ہے:

"یہ ایک انتہائی خطرناک بات ہے، اس طرح کی تاویل کو اگر جائز قرار دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں قرآن کا بھی وہی حشر ہوجائے جو اہل مغرب نے بائبل کا کررکھا ہے" (تحقیقات اسلامی ص ۵۰)

"تدبرحدیث" میں مولانا اصلاحی کا جوروپہ ہے وہ منکرین حدیث سے ذرا بھی مختلف نہیں، اگرچہ صراحتاً انھوں نے کہیں نہیں کہا ہے کہ احادیث مجموعۂ خرافات ہے لیکن ان کی عملی سرگرمیوں، ان کے حدیث کے درس اور محدثین پران کی جارحانہ تنقیدوں کا حاصل یہی ہے کہ احادیث اعتبار کے قابل نہیں، اوپر جوتفصیلات پیش کی گئیں ان کی روشنی میں کوئی بھی اہل علم اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک احادیث کی کوئی قدروقیمت نہیں۔

تصوف، ارباب تصوف، اولیاء اصفیاء، ارشادوتلقین، تزکیۂ نفس، بیعت ارشاد ان کے نزدیک شجرممنوعہ ہی نہیں بلکہ اسلام دشمن طریقہ ہے ہمارے بہت محدود مطالعہ میں مولانا فراہی کے قلم سے کہیں یہ خرافات نہیں لکھی ہیں نہ اس طرح کے خیالات کا انھوں نے کبھی اظہار کیا ہے، ہمارے نزدیک مولانا اصلاحی کے ذہن وفکر کی زمین کا خودرو پودا ہے جس میں ہرطرف کانٹے ہی کانٹے ہیں اگر سچی بات یہی ہے تو فکر فراہی سے ہمارا حسن ظن اب بھی قائم ہے کیوں کہ براہ راست مولانا فراہی کی تحریروں کا یہاں کوئی ذکر نہیں اس لئے براہ راست فکرفراہی سے بدگمانی قطعاً جائز نہیں، لیکن

اگر کچھ لوگوں کو اصرار ہے کہ مولانا امین اصلاحی فکر فراہی کے ترجمان، اس کے وارث وامین ہیں ان کی ساری علمی ودینی سرگرمیاں اسی فکر فراہی کی روشنی میں ہیں تو فکر فراہی سے دور کا سلام ہے، اور سو بار سلام ہے۔

آخر میں دل کے پورے درد کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ڈیڑھ سو سالوں سے اسلام کی تصویر بگاڑنے کی کوشش جاری ہے اور اب بات یہاں تک پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی اولاد یورپین یونیورسٹیوں میں جا کر ''قرآن محمد کی تصنیف ہے'' جیسے موضوع پر تحقیق کر کے پی، ایچ، ڈی کرنے لگے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں جا کر احادیث کو مجموعہ خرافات کا دعویٰ کرنے والے مستشرقین کی رہنمائی میں اپنی تھیسیس لکھتے ہیں اور سند حاصل کر کے ہندوستان آتے ہیں اور اہم عہدوں پر فائز ہو کر مسلمان نسل کو ذہنی وفکری ارتداد میں مبتلا کرتے ہیں اور اسلام کی صورت مسخ کرتے ہیں اور اس تجدد پسند، روشن خیال اور مغرب پرست طبقہ کی زد میں اسلام ہے اہل علم اس کی مدافعت میں جو کچھ کر سکتے ہیں، کرتے ہیں لیکن ان کا وار اسلام کے کسی نہ کسی پہلو پر ہوتا رہتا ہے دوسری طرف جو لوگ حدیث وقرآن کے عالم کہے جاتے ہیں، رفتارِ زمانہ پر نظر رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حکومت الٰہیہ قائم ہونے کی بات کرتے ہیں اور اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنے کے مدعی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ اسلام کی ظاہری جسم کے بجائے اندرونی جسم کے آپریشن میں مصروف ہیں اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں دین سے بغاوت اور شک وارتیاب کے جراثیم بھر رہے ہیں، سیدھے سادے مسلمان آخر کس کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھیں خدا ہی سے فریاد ہے۔ ؎

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

# احادیث کا ادبی مقام ومرتبہ

ادب کی چاہے جو تعریف کی جائے، اس کا جو بھی معیار اور جیسی بھی کسوٹی مقرر کی جائے احادیث اس معیار اور کسوٹی پر کھرا سونا ثابت ہوں گی، لیکن میرے نزدیک اس طرز فکر سے احادیث کی ادبی شان کی عظمت اور ادبی شاہکار ہونے کا احساس مدھم ہوجاتا ہے، میرا ایمان مجھے اس خیال سے روکتا ہے، میری والہانہ عقیدت وشیفتگی میرے رہوار فکر کی لگام کھینچ کر یہ کہتی ہے کہ تمہاری سمتِ سفر صحیح نہیں ہے، کلام رسول یا احادیث خود ادب عالیہ کی کسوٹی ہیں اور عربی ادب کا ایسا معیار ہیں کہ جس پر عام انسانوں کے ادبی شاہکاروں کو پرکھنا جانچنا چاہئے دوسرے نمونوں کو سامنے رکھ کر کلام رسول میں ادبی پہلوؤں کو ڈھونڈنا عقل وفکر کی گستاخی اور دلیل کم نظری ہے، کلام رسول دنیائے ادب کا شاہکار ہی نہیں، ادبی دنیا کا معجزہ ہے۔

## احادیث کی شان امتیاز

آج ہمارے سامنے عربی ادب کے جو شاہکار موجود ہیں یا اعلیٰ شاعری کے نمونے ہیں جن میں بزم کی رنگینیوں کو الفاظ کے گل بوٹوں سے سجا کر چمن زار ادب بنادیا گیا ہے یا رزم کی ہنگامہ آرائیوں کو فکر کے اُتار چڑھاؤ اور پُر شوکت الفاظ کی زرہ بکتر پہنا کر معرکۂ کارزار کی عکاسی کی گئی ہے اور ان شاہکاروں میں فکر ونظر کی ساری صلاحیتیں صرف کی گئی ہیں، پھر ادیب وشاعر کے قلم نے ان کو ادبی صحیفوں میں زندۂ جاوید بنانے کا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ تمام ادبی شاہکاریوں ہی وجود میں نہیں آگئے، بلکہ پہلے دل میں خیال پیدا ہوا، پھر ذہن وفکر نے اس کے مختلف پہلوؤں کو سوچا، دماغ نے غور کیا اور قلم نے دست گیری کی تب وہ ادبی شاہکار وجود میں آیا۔

احادیث رسول کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے، یہ وقت، حالات، ماحول اور ضرورت اور دوسرے تقاضوں پر فوری اور زبانی ارشادات ہیں افہام وتفہیم، ارشاد

وتلقین، وعظ ونصیحت اور درپیش مسئلوں کا ان لفظوں میں حل بتایا گیا ہے جن کو ہم آج حدیث کہتے ہیں، نہ قبل از وقت ذہن وفکر نے اس میں کاوش کی ہے، نہ چراغوں کی کو میں بیٹھ کر قلم نے لکھا ہے، نہ ان میں عبارت آرائی کی بالقصد کوشش کی گئی ہے نہ ان میں خوبصورت لفظوں کی تلاش کو دخل ہے، نہ حسن انتخاب کی کرشمہ سازی اس کے باوجود احادیث کے جملے، طرز ادا، الفاظ کی مرصع کاری، انداز بیان، سلاست وروانی، عبارت کی شگفتگی کی وجہ سے عربی ادب کے ایسے جواہرات ہیں جن کے سامنے انسانوں کے شاہکار کارناموں کے موتیوں کی چمک ماند پر جاتی ہے۔

تقریر وتحریر میں جو فرق ہے وہ ہر تعلیم یافتہ سمجھتا ہے، ایک بہترین ادیب جس کی تحریروں پر لوگ سر دھنتے ہیں، ذہن ودماغ پر کیف وسرور نشہ بن کر چھا جاتا ہے اسے سن کر قوت سامعہ کو وجد آ جاتا ہے لیکن وہی ادیب جب اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی زبان لکنت کھانے لگتی ہے، الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے نکلتے ہیں جملے بکھرے بکھرے موتیوں کی طرح سلک گہر کی آب وتاب کھو دیتے ہیں، ربط کلام مجروح ہوتا ہے اور ربط پیدا کرنے کی کوشش ایسی ہوتی ہے جیسے بہت نازک اور باریک تار میں موٹی اور بھدی ویلڈنگ کر دی جائے، عبارت کی شگفتگی وسلاست کا خون ہو جاتا ہے، لیکن وہی ادیب جب قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اس کا قلم زر خالص، کھرے سونے کا مرصع، سبک، متناسب اور دیدہ زیب ہار بناتا ہے کہ اس کی چمک دمک اور اس کی آب وتاب پر عقل وفکر کی نگاہیں پڑتی ہیں تو خیرہ ہو جاتی ہیں، ادیب کے ہاتھ کا بے جان قلم ادیب کے بیدار ذہن سے زیادہ حساس اور اہم کردار ادا کرتا ہے، عبارت آرائی، لفظوں کے انتخاب اور نوک پلک درست کرنے میں موثر رول ادا کرتا ہے، ذہن میں خیالات آتے ہیں لیکن اس کی ترتیب، پیشکش کا انداز اور طرز ادا کیا ہو؟ یہ ادیب کا قلم بتاتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ قلم چلتا چلتا یک بیک رک جاتا ہے، ادیب لاکھ چاہتا ہے کہ قلم آگے بڑھے لیکن قلم اپنی نوک کاغذ پر جمائے اڑیل گھوڑے کی طرح ٹھہر جاتا ہے، قلم جب ادیب کے ذہن میں موجیں مارتے ہوئے خیالات کے لئے ایک

عمدہ اور خوبصورت طرز ادا یا طریقہ انتخاب کر لیتا ہے تو رُکا ہوا قلم یک بیک چل پڑتا ہے، قلم ادیب کی قوت فکریہ کو مرتکز کرتا ہے، اس کے خیالات وافکار کے انبار کو چھانتا پھٹکتا ہے اور اس کے ذہن میں معلومات کا جو خزانہ ہے اس کے آبدار موتیوں کو چھانٹ لیتا ہے اور اس کے قیمتی جواہرات کو منتخب کر لیتا ہے تب کہیں آگے بڑھتا ہے، اس لئے ہر ادبی شاہکار کے وجود میں آنے میں سب سے اہم کردار قلم کا ہوتا ہے زبان کا اس میں کوئی بھی دخل نہیں ہوتا ہے اس کے برعکس احادیث یا کلام رسول موقعہ ومحل، حالات وماحول کے تقاضوں کے زیر اثر زبانی ارشادات اور باتیں ہیں، روز مرّہ کی گفتگو ہے، الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ترتیب، زبان وبیان کی دلکش اور خوبصورت طرز ادا میں ذہن وفکر کی اس کاوش کا قطعی دخل نہیں جو عام ادیبوں کے ادبی شاہکاروں کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے، اس کے باوجود احادیث کا ادبی مقام ومرتبہ تا حد اعجاز بلند ہے جس مقام ومرتبہ تک کسی ادیب کے طائر فکر کی پرواز ممکن نہیں ہے، اہلِ زبان نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

## ادب کا بحرِ ناپیدا کنار

مسلم شریف کی روایت ہے، ضماد ازدی مکہ آئے وہ جھاڑ پھونک کے ماہر تھے، مکہ کے احمقوں سے سنا کہ محمد ﷺ کو جنون ہوگیا ہے انہوں نے سوچا کہ اگر میری ملاقات ان سے ہوجائے تو میں ان کا علاج کروں گا۔ ہوسکتا ہے وہ صحت یاب ہوجائیں وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا:

**یا محمد، انی ارقی من هذا الریح، فهل لك.** آپ کو جو ہوا لگ گئی ہے میں اس کا علاج کرتا ہوں۔

حضور اکرم ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ مکہ کے باہر کا آدمی ہے مکہ کے دشمنوں نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے، خود اس کے ذہن کی یہ پیداوار نہیں ہے اس لئے آپ نے نہ اس کی بات کی تردید فرمائی نہ یہ فرمایا کہ یہ دشمنوں کی سازش ہے اور پروپیگنڈہ

ہے ان ساری باتوں سے قطع نظر کر کے آپ نے فرمایا:

**ان الحمد للّٰہ، نحمدہ ونستعینہ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ.**

ضماد ازدی نے یہ چند مرصع اور رواں دواں جملے سنے، سن کر حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے عرض کیا: حضور! ایک بار اور، حضورؐ نے ایک بار اور ان الفاظ کو دہرا دیا، انھوں نے اصرار کر کے تین بار یہ جملے سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے سنے، پھر ان کا تأثر کیا ہوا؟ سننے کی بس یہی بات ہے، یاد رکھئے کہ ضماد عرب کے مشہور قبیلہ ازدشنورہ کے فرد تھے، عربی زبان وادب اور عربی شاعری سے واقف تھے، بلکہ رمز شناس تھے وہ نہایت حیرت سے عرض کرتے ہیں:

**لقد سمعت قول الکھنۃ وقول السحرۃ وقول اشعراء، ما سمعت مثل کلماتک ھؤلاء، لقد بلغن قاموس البحر.**

میں نے کاہنوں، جادوگروں، اور شاعروں کے کلام سنے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا کلام آپ جیسا نہیں، یہ تو فصاحت وبلاغت کا تھاہ سمندر ہے۔

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ۵۲۵)

ضماد ازدی نے الفاظ کے جادوگروں، عبارت آرائی کے فنکاروں کے ادبی شاہکاروں کو حضور اکرم ﷺ کے چند جملوں کے لعل وگہر کے سامنے ریزے سمجھا، اور اس کا عملی اظہار اس طرح کیا انھوں نے بلا تاخیر حضورؐ سے عرض کیا:

**ھات یدیک، ابایعک علی الاسلام.**

دست مبارک بڑھایئے، مجھے ایمان کی دولت سے نواز دیجئے۔

اہل علم ہمیشہ اور مسلسل ان الفاظ کو اپنے خطبوں میں دہراتے ہیں اس لئے ذہن عبارت کی شگفتگی برجستگی، سلاست، فصاحت وبلاغت، ربط کلام کے سلک گہر کی موزونیت کی طرف نہیں جاتا، لیکن عرب کے گاؤں کا رہنے والا جو عربی زبان وادب کا

جوہری اور رمز شناس اور اس کی قدر و قیمت کا سمجھنے والا تھا اس کا یہ اعتراف کرنا کہ اس کلام کی ادبی شان اس کی فصاحت و بلاغت کا مقام حد اعجاز تک بلند ہے، یہ اعتراف سیکڑوں نقادوں اور ادیبوں کے نقد و تبصرہ سے کہیں زیادہ وزنی اور کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

## جوامع الکلم کا امتیازی وصف

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے خصوصی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اعطیت جوامع الکلم یعنی مجھے جوامع الکلم کی صفت دی گئی، یعنی الفاظ مختصر سے مختصر استعمال کئے جائیں لیکن ان کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ معانی کی ایک پوری کائنات اس میں سما جائے، یعنی ع

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

بعض درختوں کے بیج اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ناخن میں سما جائیں لیکن جب اس سے ایک تناور درخت نکلتا ہے تو اس کے پھیلاؤ کے لئے ایک ایکڑ کی زمین بھی ناکافی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ایک ایکڑ زمین پر چھا جانے والا یہ درخت اسی ننھے سے بیج میں پوشیدہ تھا جو بیج آپ کے ناخن میں سما سکتا تھا حضور ﷺ کی صفت جوامع الکلم کا یہی مفہوم ہے، حضور ﷺ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جملے ہیں ایک ایک جملہ کی تشریح میں محقق علماء نے صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں۔

ادب عالیہ کا بلند ترین معیار یہ ہے کہ الفاظ مختصر ہوں مگر ادیب کے ذہن میں جو معنوی وسعت ہے اس کی کامل ترین ترجمانی کر سکیں۔، وہ ادبی کارنامہ شاہکار اور شہپارہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جو صرف الفاظ کا جنگل ہو اور خود رو جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہو، کہ طائر معنی کا پر پرواز اس میں اُلجھ کر رہ جائے اس کے بازو شل ہو جائیں اور نہ وہ ادبی کارنامہ شاہکار کہا جا سکتا ہے جس مین شہباز فکر خلاؤں میں جا کر گم ہو جائے۔

بہترین ادب لفظ و معنی کے بہترین امتزاج کا نام ہے، اگر ادیب کم سے کم

الفاظ استعمال کرتا ہے اور بات انتہائی موثر انداز میں ادا ہو جاتی ہے تو یہ اس کے ادبی کمال کی بہت بڑی سند ہے، یہ خصوصیت سرکار دو عالم ﷺ کو موہبت الٰہی سے حاصل ہے، جوامع الکلم کی صفت سے متصف ہونا ادب کے ایسے بلند معیار کا دعویٰ کرنا ہے جہاں فکر انسانی کی رسائی ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور ہے، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ادیب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو اہل علم اس کے دعوے کو آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتے، لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے یہ دعویٰ کیا تو دنیائے ادب کا سر اس کے سامنے خم ہو گیا، اور کسی کو اس سے مجال انکار نہیں رہی۔

## الفاظ کا برمحل استعمال

ایک اچھا ادیب لفظوں کا برمحل استعمال کر کے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے اور الفاظ میں نئی جان ڈال دیتا ہے، ہر لفظ کی اپنی ایک معنوی خصوصیت ہوتی ہے الفاظ ایک بکھرا ہوا خزانہ ہے، سونے کے ریزے اپنی جگہ قیمتی ہیں لیکن انھیں ریزوں کو جمع کر کے کسی زہرہ جمال کے کانوں کے آویزے بنا دیئے جائیں تو ان کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جیسے سورج کے سامنے آئینہ رکھ دیا جائے، جس طرح سورج پر نگاہیں جمانا مشکل ہوتا ہے اسی طرح اس چار پیسے کے آئینہ پر اب نگاہوں کا ٹھہرنا دشوار ہو جاتا ہے جس میں سورج کا عکس آ گیا ہے، ادب عالیہ کے خالق کسی ادیب کے فن کا کمال یہی ہے کہ الفاظ کے موتیوں کو ایسی جگہ رکھے کہ فصاحت و بلاغت کے سورج کی سیدھی کرن ان پر پڑنے لگے تاکہ ان کی آب و تاب اور ان کا اپنا حسن نکھر جائے۔

احادیثِ رسول پر جب آپ باریک بینی سے غور کریں گے تو آپ یقین کریں گے کہ یہ لفظ یہیں ہونا چاہئے تھا جہاں ہے، یہی وجہ تھی کہ عرب کے بدو جو اپنی درشت مزاجی کے باوجود لفظوں کے جوہری تھے وہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے چند جملوں کو سن کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے اور ان کی کایا پلٹ جاتی تھی اور کفر کے

اندھیرے سے اسلام کے اُجالے میں آجاتے تھے، دنیا کے بڑے سے بڑے ادیب کے ادبی شہ پاروں میں یہ جوہر نہیں یہ تاثیر کلام نہیں اس لئے کلام رسول کو دوسروں کے ادبی نمونوں کی کسوٹی پر پرکھنا دلیل کم نظری ہے۔

احادیث کے ادبی پہلوؤں پر ذرا اور تفصیل سے غور کریں، ادب عالیہ کے اجزاء ترکیبی میں جہاں الفاظ کا برمحل استعمال، عبارت میں سلاست وروانی، برجستگی و شگفتگی کو دخل ہے وہیں کچھ اور بھی باتیں جو کسی ادبی کارنامے کو شاہکار بناتی ہیں جیسے تشبیہات میں ندرت وجدت، تمثیل کی معنویت وسعت، انسانی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انداز بیان اور لفظوں کا انتخاب کرنا بھی ہے، اگر کسی شاعر یا ادیب کے کلام میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں تو اس کے کمال فن کا اعتراف ناگزیر ہے، مثلاً عمرو بن کلثوم دور جاہلی کا شاعر ہے، اس نے اپنے قبیلہ والوں کی رگوں میں شجاعت وبسالت، غیرت وحمیت کی آتش سیال بھرنے کی اپنے قصیدہ میں جو کوشش کی ہے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہے، وہ اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا

فنجهل فوق جهل الجاهلينا

**ترجمہ**: سن لو، کوئی ہم سے اکھڑپن کی باتیں نہ کرے ورنہ ہم تمام اکھڑپن کرنے والوں سے بڑھ کر اکھڑپن کرنے والے ہیں۔

وہ قبیلہ کی عورتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے: ؎

يقتن جيادنا ويقلن

لستم بعولتنا اذا لم تمنعونا

**ترجمہ**: ہمارے شاندار گھوڑوں کے چارہ پانی کا انتظام کرتی ہیں اور اپنے شوہروں سے صاف کہدیتی ہیں اگر تم نے ہماری پوری حفاظت نہیں کی تو ہم ایسے بزدل لوگوں کو اپنا شوہر نہیں تسلیم کریں گے۔

حد تو یہ ہے کہ اپنے قبیلہ کے دودھ پیتے بچوں کے بارے میں وہ کہتا ہے: ؎

اذا بلغ الفطام لنا صبی
تخرلہ الجبابر ساجدینا

**ترجمہ**: ہمارے قبیلہ کے بچے ابھی اپنی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوڑتے کہ بڑے بڑے سورما اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔

وہ جب اپنا قصیدہ سناتا ہے تو جیسے شیر جھرجھری لے کر کھڑا ہوجاتا ہے اور حملہ کے لئے تیار ہوجاتا ہے ویسے ہی اس کے قبیلے کے جوانوں کے سروں کے بال غیرت وحمیت اور جوش شجاعت کے شدت احساس سے کھڑے ہوجاتے ہیں، عمرو بن کلثوم کے کلام میں یہ تاثیر اس لئے پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے قبیلہ کی نفسیات سے آگاہ تھا، وہ قتل وغارتگری کے دلداہ تھے، وہ خون ریزی اور خون آشامی کے رسیا تھے، یہ ان کا قومی مزاج تھا، ان کی فطرت تھی، بس ان کے جذبات کو ذرا سا بیدار کرنے کی ضرورت تھی، عمرو بن کلثوم نے ان کے فطری جذبات کو جگادیا، شیر کو حملہ کرنے کے لئے بہانہ چاہئے، ایک کنکری پھینک کر دیکھئے بس اتنا ہی اس کے مزاج کو گرم کرنے کے لئے کافی ہے، عمرو بن کلثوم نے اپنے قصیدہ سے یہی کام لیا ہے، لیکن اگر شیر پالتو جانور کی طرح آپ کے سامنے کھڑا ہوجائے اور آپ کے اشاروں پر اٹھنے اور بیٹھنے لگے اور اپنی فطرت کے خلاف کاموں پر مجبور ہوجائے تو یہ اس سے بڑا کمال ہے، سرکار دو عالم ﷺ کی احادیث میں یہ محیر العقول کارنامہ ہم کو نظر آتا ہے، حدیث کے چند جملوں نے کچھ ایسا ہی حیرتناک کرشمہ کر دکھایا ہے۔

## احادیث میں نفسیاتی پہلو

احادیث میں نفسیاتی اظہار اور انسانی فطرت شناسی کا جوہر ہر جگہ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے، یہی وجہ تھی کہ چند لفظوں میں دل ودماغ کی کایا پلٹ جاتی تھی، بظاہر جو کام بہت ہی دشوار نظر آتا تھا وہ اس طرح وجود میں آجاتا تھا جیسے سامعین کی خود یہی خواہش تھی، احادیث یا کلامِ رسول میں یہ تاثیر اس لئے بھی تھی کہ انسانی فطرت کے تاروں کو

لفظوں کی مضراب سے اس طرح چھیڑ دیا جاتا تھا کہ اس سے بہجت و مسرت کے نغمے اُبلنے لگتے تھے، بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ اس قبیلہ ہوازن سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی جنگ میں جو تباہیاں اور بربادیاں دونوں طرف آتی ہیں وہ آئیں، مسلمانوں نے کمال شجاعت کا مظاہرہ کرکے فتح حاصل کرلی، مال غنیمت ہاتھ آیا بہت سے غلام اور کنیزیں مجاہدین کے حصہ میں آئیں، سب کچھ مجاہدین میں تقسیم کرکے ان کو مالک بنادیا گیا اور وہ ان کے مالک ہوگئے اور جائز مالک ہوئے، کچھ ہی دنوں بعد قبیلہ ہوازن میں ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوتا ہے اور پورا قبیلہ دائرہ اسلام میں آجاتا ہے وہ مسلمان ہوکر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ ہمارا مال اور ہمارے آدمی ہمارے حوالے ہوجاتے تو عنایت ہوتی، مگر ان کی درخواست کی منظوری میں دشواری یہ تھی کہ سارا مال اور لونڈیاں اور غلام تقسیم ہوچکے تھے اور مجاہدین اس کے قانونی اور شرعی مالک ہوچکے تھے ان سے واپس لینے کا کوئی حق نہیں تھا اور وہ واپس کرنے پر مجبور بھی نہیں کئے جاسکتے تھے، مسئلہ نازک تھا آپ نے ہوازن والوں سے فرمایا کہ دونوں میں سے کسی ایک کا مطالبہ کرو تو بات کی جائے، قبیلہ ہوازن کے وفد نے کہا نحن نختار سبینا ہم کو ہمارے قیدی دلا دیجئے آپ نے مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا:

**اخوانکم جاؤا تائبین وانی قد رأیت ان اَرُدَّ الیهم سبیهم فمن احب منکم ان یطیب ذالك فلیفعل ومن احب منکم ان یکون علیٰ حظه حتی نعطیه من اول مایفیئ اللّٰه علینا فلیفعل.** (مشکوٰۃ ص۳۴۶)

مسلمان ہوکر تمہارے بھائی آئے ہیں، میرا خیال ہے کہ میں ان کے قیدیوں کو واپس کردوں تم میں سے جو دلی خوشی کے ساتھ منظور کرے وہ بھی رہا کردے اور جو اپنے غصہ پر قائم رہنا چاہتا ہے وہ بھی واپس کردے بیت المال کی پہلی آمدنی سے میں اس کا حصہ ادا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

ابھی ابھی قبیلہ ہوازن سے جنگ ہوئی ہے دونوں ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے تھے، مسلمانوں نے جان لڑا کر فتح حاصل کی تھی پھر ایسے دشمنوں کے لئے سب سے پہلا جملہ جو آپ نے ارشاد فرمایا: **اخوانکم جاءوا تائبین**. تمہارے بھائی مسلمان ہو کر آئے ہیں، گویا عدالت و دشمنی، اور نفرت و غصہ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر برف کی سل رکھ دی گئی، ایک بھائی میں محبت و عداوت دونوں جمع نہیں ہو سکتیں، نفرت سے تپتے ہوئے دلوں پر محبت کی شبنم کی پھوار پڑنے لگی، گرم آب و ہوا میں یک بیک خنکی پیدا ہونے لگی، آپ اس پر بھی نظر رکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان قیدیوں کو واپس کرنے کا حکم نہیں دیا، کیونکہ وہ ان کے جائز مالک تھے مگر پھر بھی شور مچ گیا کہ ہم سارے قیدیوں کو واپس کرتے ہیں، آپ نے فرمایا اس طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ وقتی جوش میں یہ بات کہدی گئی ہو یا اس شور میں ان لوگوں کی آواز دب گئی ہو جو اپنے قیدیون کو واپس نہیں کرنا چاہتے، اس لئے سب لوگ واپس جائیں اور ہر حلقہ کا نمائندہ فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھ کر مجھے مطلع کر دے، کون اس پر بخوشی راضی ہے اور کون نہیں چنانچہ نمائندوں نے ان کے گھروں پر جا کر ہر ایک سے دریافت کیا اور پھر دربار نبوت میں اطلاع دی کہ بلا استثناء ہر شخص برضا وخوشی قیدیوں کو واپس کرنے کے لئے تیار ہے آپ کے چند جملوں نے ان کے ذہن وفکر میں انقلاب پیدا کر دیا، عام حالات میں ایک بھی قیدی کی واپسی دشوار تھی، لیکن ان جملوں کے بعد ایک بھی متنفس ایسا نہیں رہا جس نے اپنی خوشی سے بلکہ پوری بشاشت سے اپنے قیدی کو واپس نہ کر دیا ہو، یہ کلام رسول کی معجز بیانی تھی، انسانی فطرت شناسی کی تاثیر تھی چونکہ لفظوں کا انتخاب، جملوں کی ترتیب، طرز ادا، زبان و بیان عوامی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا تھا، اس لئے بات دلوں میں اُتر گئی، پہلے مال غنیمت کنیز اور غلام پا کر جو دل خوش تھے اب انھیں کو واپس کر کے اس سے زیادہ خوش ہو گئے۔

نفسیات شناسی اور اس سے استفادہ کی ایک اور بھی مثال سے بات اور واضح ہو جائے گی، حضور اکرم ﷺ نے طائف سے واپسی میں مقام جعرانہ میں مال غنیمت تقسیم فرمایا، اس موقعہ پر قریش والوں کو کچھ زیادہ حصہ ملا قریش کے لوگ ابھی جلد ہی

اسلام لائے تھے اور جنگ میں شریک ہوئے تھے، انصار کے نوجوانوں نے یہ دیکھا تو ان کوتھوڑ املال ہوا، انھوں نے آپس میں کہا:

**یغفر اللّٰہ لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعطی قریشا ویدعنا وسیوفنا تقطر من دمائھم.** (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

اللہ حضور کی مغفرت فرمائے کہ وہ قریش والوں کے دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز فرمارہے ہیں حالانکہ ان کا خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔

یہ بات حضور ﷺ تک پہنچ گئی، فوج کا بددل ہونا کسی بھی نظام حکومت کے لئے بڑا خطرناک ہوتا ہے، فوجی دماغ بھی کچھ خاص سانچوں میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے اگر فوج سے بددلی کو رفع نہ کیا جائے تو فوج کی وفاداری متاثر ہوسکتی ہے یہ انتہائی تشویشناک مرحلہ ہوتا ہے، فوجی قوانین بھی کچھ الگ ہوتے ہیں مگر حضور اکرم ﷺ نے نہ کورٹ مارشل کیا نہ ان پر کوئی فرد جرم عائد کیا، آپ نے انصار کے معزز افراد سے فرمایا کہ سارے انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرو اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو، جب سب لوگ آگئے تو آپؐ نے صرف دو تین جملے ارشاد فرمائے، پہلے تو قریش کو کچھ زیادہ دینے کی وجہ بتادی پھر انصار سے فرمایا:

**اما ترضون ان یذھب الناس بالاموال وترجعون الیٰ رحالکم برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم.** (مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

حضور اکرم ﷺ کو انصار کی والہانہ شیفتگی اور دیوانہ وار محبت کا یقین تھا اور مخلصانہ عقیدت ومحبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کے لئے انسان ساری کائنات کو تج سکتا ہے، حضورؐ نے اسی نفسیاتی پہلو کو چند جملوں میں اختیار فرمایا پھر ان جملوں کی تاثیر کیا ہوئی؟ جو دل شکایتوں سے بھرا ہوا تھا وہ مسرتوں کی آماجگاہ بن گیا اور سب نے بیک زبان کہا: **بلیٰ یا رسول اللّٰہ قد رضینا.**

فطرت شناسی کے جوہر کے ساتھ منتخب لفظوں کے استعمال اور طرز ادا کی جدّت نے دل ودماغ کی دنیا بدل دی، کسی ادیب کے اندر اگر یہ صلاحیت ہے تو یقیناً اس کو

بڑا ادیب کہا جاسکتا ہے اس کا ادب مثالی ادب تسلیم کیا جائے گا۔

میں احادیث کے ادبی پہلوؤں کی طرف صرف اجمالی اشارات کرتا چلا آرہا ہوں اگر ان کی تفصیل کی جائے اور اس کی مثالیں پیش کی جائیں تو یہ مضمون یا مقالہ نہیں، کتاب بن جائے، احادیث میں ان گنت دعائیں منقول ہیں، حضور اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر خطبے دیئے ہیں، موقع ومحل اور حالات کے پیش نظر صحابہ کرام کو خطاب فرمایا ہے، لوگوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں اور ہدایتیں دی ہیں، حجۃ الوداع کے موقع پر جو شاندار خطبہ دیا ہے اگرچہ تاریخ میں مکمل خطبہ نہیں ملتا ہے لیکن جستہ جستہ جو اس کے ٹکڑے مختلف روایتوں میں پائے جاتے ہیں وہ اتنے معنی خیز ''جوامع الکلم'' کے شاہکار، شستہ، شگفتہ، سلیس، لفظوں کے بے مثال انتخاب، انداز بیان اور فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسے جواہر پارے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ دمکتے ہوئے سورج کو تراش کر اس سے چمکتے ہوئے ستارے بنائے گئے ہیں، چمن زار ادب کے شگفتہ پھولوں کے چھوٹے چھوٹے دلکش جاذب نظر گلدستے بنائے گئے ہیں، ان کی معنوی وسعت کا یہ عالم ہے کہ وہ اسلامی قوانین اور اصولوں کی لچکدار دفعات بن گئے ہیں، ان سے بہت سے شرعی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

اگر الفاظ ومعنی کے بہترین امتزاج کا نام ادب عالیہ ہے تو یہ تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں کہ احادیث رسول اس ادب عالیہ کا سب سے بہتر، سب سے شاندار نمونہ ہیں اور احادیث کا ادبی مقام ومرتبہ اتنا بلند ہے کہ جس طرح قرآن اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے معجزہ ہے اور ساری علمی دنیا کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے اسی طرح احادیث رسول بھی عربی زبان وادب کا ایک معجزہ ہیں، یہی میری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ ہے اور یہی میرا ایمان ہے۔

# ''جہانِ دیدہ'' پر ایک نظر

(''ادب میں سفر ناموں کی اہمیت'' کے موضوع پر رابطہ ادب اسلامی کے ایک ہونے والے سیمینار کے لئے لکھا گیا)

میرے نزدیک ایک بہترین سفر نامہ کسی بھی زبان وادب کا اہم ترین عنصر نہیں ہے بلکہ اس کا براہ راست تعلق تاریخ سے بھی ہے اور جغرافیہ سے بھی، قوموں کی تہذیب اور تمدن کی تاریخ بھی اس کے دائرہ کار میں آتی ہے اور ان کے عروج وزوال کی داستانیں بھی، اگرچہ سفر نامہ میں براہِ راست یہ باتیں نہیں آتی ہیں لیکن سفر نامہ کی روشنی میں ان کی جھلک ضرور ہوتی ہے جیسے ہیڈ لائٹ تو صرف سامنے کے منظر پر پڑتی ہے لیکن اس کے دائیں بائیں بھی کچھ دھندلے مناظر نظر آنے لگتے ہیں، سفر نامہ چونکہ تجربات ومشاہدات کے اظہار سے عبارت ہے اس لئے وہ ہمارے سامنے ایک ایسی روشنی فراہم کرتا ہے جس میں ماضی کے کھنڈرات اور ویرانے بھی نظر آتے ہیں اور حال کے جگمگاتے ہوئے تمدنی جلوے بھی، غرضیکہ پیش منظر میں تو مشاہدات کی جلوہ آرائیاں ہوتی ہیں اور پس منظر میں ماضی کی ہلکی اور دھندلی روشنی ہوتی ہے جیسے چودھویں رات کے پورے چاند پر بادل آجانے کے بعد دھندلی دھندلی روشنی ہوتی ہے اور بادل کے ہٹتے ہی سونے کی یہ طشت اپنی سنہری روشنی کا جادو بکھیر دیتی ہے اگر سفر نامہ میں یہ کیفیت پیدا ہوجائے تو اس کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے اور میں اس سفر نامہ کو ایک کامیاب سفر نامہ تصور کرتا ہوں کیونکہ وہ ادب کا بھی ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

سفر نامہ ایک ایسا جام جہاں نما ہوتا ہے جس میں مختلف انواع مناظر دکھائی دیتے ہیں جن کو دیکھ کر قاری کبھی بہجت وسرور کی پھلواروں میں نہا جاتا ہے اور کبھی اس کے جذبات وتصورات کے آبگینے کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ ایک چھپٹ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اداس ہوکر رہ جاتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ سفر نامے کے مسافر کی قوت مشاہدہ

طاقتور ہو اور زبان و بیان پر اس کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو، اس کے ہاتھ میں ایک صداقت شعار اور راست گو قلم ہو جو ذہنی تحفظات کے بغیر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

میں آج آپ کو اسی طرح کے ایک سفر نامہ سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جو تازہ ترین سفر ناموں کی فہرست میں آتا ہے جس میں ماضی کی بے پناہ سچائیاں بھی ہیں اور حال کی ٹھوس اور بے لچک صداقتیں بھی، وہ سفر نامہ ''جہانِ دیدہ'' کے نام سے طبع ہو کر ہند و پاک کے علمی حلقوں تک پہنچ چکا ہے اس کے مصنف علمی و دینی حلقوں کی معروف شخصیت مولانا تقی عثمانی ہیں جن کی اسلامی علوم میں بصیرت اور درجہ کمال کی سند میں ان کی صرف دو تصانیف ''تکملہ فتح الملہم'' اور علوم القرآن جیسی معرکۃ الآرا کتابوں کو پیش کر دینا کافی ہے وہ پاکستان میں اسلامی عدالت کے جسٹس بھی ہیں اور دار العلوم کراچی کے شیخ الحدیث بھی۔

''جہانِ دیدہ'' متعدد سفر ناموں کا مجموعہ ہے، انھوں نے وادی دجلہ و فرات کی بھی سیر کی ہے اور الجزائر کی سنگلاخ پہاڑیوں سے بھی گذرے ہیں، انہوں نے ابوالہول اور اہرام کی سرزمین بھی دیکھی ہے اور مرکز خلافت استنبول اور قسطنطنیہ کی بھی زیارت کی ہے انہوں نے امریکہ کی عالمی شہرت کی مالک نیاگرا آبشار کے حسین نظارے بھی دیکھے ہیں، اور پیرس کے شیشۂ جلی کی طرح دیکھتے ہوئے شانز الیزے بازار کی آب و تاب سے بھی آنکھیں چار کی ہیں انہوں نے ماوزے تنگ اور چو این لائی کے سرخ انقلاب کی سرزمین بھی دیکھی ہے اور بیجنگ کے مشہور چوک ''تھیان آن من'' کا پُر شکوہ منظر بھی دیکھا ہے اور مشہور دیوار چین کے سائے میں بھی گذرے ہیں۔

وہ جہاں سے بھی گذرے ہیں حال کی روشنی کے ساتھ ماضی کے اُجالے بھی ان کے ہم کاب رہے کہیں بھی انہوں نے طائرانہ نظر نہیں ڈالی ہے، وہ بیک وقت ''بصارت و بصیرت'' دونوں کیمرے ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں اس لئے ان کی بنائی ہوئی ہر تصویر داخلی و خارجی دونوں لحاظ سے مکمل ہے، ان کی تصویریں جاذب نظر بھی ہیں اور

عبرت کا مرقع بھی، ان کو زبان و بیان پر حاکمانہ دسترس حاصل ہے، اردو تو خیر ان کے گھر کی زبان ہے عربی اور انگریزی پر بھی اہل زبان کی طرح ان کو قدرت حاصل ہے، ان خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا سفر نامہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ہر منظر کی داخلی و خارجی دونوں طرح کی تصویریں پیش کرنے میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے۔

سفر نامہ کے مرتب مولانا عثمانی خالص ایک مذہبی عالم ہونے کی باوجود اپنے ہاتھوں میں ایک بہار آفریں قلم رکھتے ہیں ان کے قلم نے ایسے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں جن کی شیفتگی و شادابی، رعنائی وزیبائی، دل ونظر اور شعر وادب دعوت نظارہ دیتی ہے۔

سفر نامہ کے مسافر کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ کوئی بھی ایسا منظر دیکھتے جو اس پر کوئی نئی کیفیت پیدا کرے، اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو جائے تو اس کو ایسے لفظوں میں بیان کردے کہ قاری کے سامنے اس کی وہی خوبصورت تصویر آجائے، جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے ''جہانِ دیدہ'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری فکر ونظر کو قدم قدم پر ایسے حسین وجمیل مرقع ملتے چلے جاتے ہیں جیسے وہ حسین منظر خود ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں ایک دو مثالوں سے وضاحت کرتا ہوں۔

مولانا عثمانی مصر کے سفر پر گئے ہوئے ہیں دریائے نیل جس میں کبھی فرعون غرق ہوا تھا وہ آج بھی اس سرزمین پر بل کھاتا ہوا رواں دواں ہے آپ کا قیام اس ہوٹل میں تھا جو دریائے نیل کے ساحل پر تھا، رات کا وقت ہے، وہ ساحل نیل پر کھڑے ہوئے ہیں، ان کا بیان ہے:

> ''میں ہوٹل سے اتر کر چہل قدمی کے لئے دریائے نیل کے کنارے چلا گیا موسم بڑا خوشگوار تھا دریا کے دونوں طرف بنی ہوئی عمارتوں کی رنگ برنگ روشنیاں نیل کے پانی میں منعکس ہو کر ایسے ایسے رنگ پیدا کر رہی تھیں جن کے لئے انسانی لغت میں الگ نام وضع نہیں کئے، دریا پر بنے ہوئے پل پر کاروں کی مخالف سمتوں سے دوڑتی ہوئی روشنیوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے نیل کے دونوں کنارے سونے کی گیندیں ایک دوسرے کی طرف پھینک رہے ہوں''

ایک دوسرا منظر دیکھئے، مولانا عثمانی الجزائر کے سفر پر ہیں وراس کے مشہور شہر بجایہ میں ان کا قیام ہے، ان کا ہوٹل بحیرۂ روم کے بالکل کنارے واقع ہے، بجایہ کی چھوٹی سی بندرگاہ جس ساحل پر ہے وہاں سے یہ ساحل جنوب مغرب کی طرف ایک ہلالی نیم دائرہ بناتا ہوا چلا گیا ہے پھر جنوب کی طرف مڑ کر سیدھا ہو گیا ہے اس ساحل کے ساتھ ایک ساحلی سڑک حد نظر تک چلی گئی ہے جس کے مغرب میں سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ہے اور مشرق میں بحیرۂ روم پوری آب و تاب کے ساتھ بہ رہا ہے ان کا ہوٹل اسی سڑک پر واقع ہے اس کے کمروں کی کھڑکیاں سمندر کے کنارے کھلتی ہیں، کمرے کی اندرونی فضا ہر وقت موجوں کے ترنم سے معمور رہتی ہیں، ان کھڑکیوں سے انھوں نے سمندر کا جو نظارہ دیکھا تو ان کا تصور ان کو کہاں سے کہاں لے گیا، حال کی روشنی میں ماضی کی تابناک کرنوں کا نظارہ کتنا دلکش ہے اور کتنا عبرتناک؟ بس دیکھنے کی یہی بات ہے وہ لکھتے ہیں:

"''فندق الحمادیین'' (ہوٹل) اسی ساحلی سڑک پر واقع ہے، میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے مشرقی دروازے سے جو ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا ہے، بحیرۂ روم کا حسین منظر سامنے تھا، حد نظر تک بحیرۂ روم کے نیلگوں پانی میں موجیں کروٹیں لیتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، خیال آیا کہ یہاں سے بالکل سامنے انھیں موجوں کے اس پار اُندلس کا ساحل پھیلا ہوا ہے اور اسی سمندر نے صدیوں اندلس کے مسلمانوں کو مشرقی ممالک سے ملانے کا فریضہ انجام دیا ہے اور یہیں برسوں ان فاتحین کی تک و تاز جاری رہی ہے جس کے نعرہائے تکبیر کی گونج سے اس فضا کا ہر ذرہ معمور ہے اس تصور کے ساتھ یہ اشعار یاد آ گئے۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن کے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اندلس کا دور عروج، اسلامی حکومت کا قیام، ان کا شاندار تمدن اس کی بے مثال تہذیب جس نے پورے یورپ کو ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا وہ ساری تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مسافر عراق کے سفر میں ہے اور مدینۃ السلام بغداد میں مقیم ہے، یہ وہی بغداد ہے جو کئی صدیوں تک مسلمانوں کے جاہ وجلال کا واحد نمائندہ رہا، وہاں کا شاندار تمدن وہاں کے علمی وفنی کارنامے ساری دنیا کو مرعوب کئے ہوئے تھے، مسلمانوں کے دور عروج کی کوئی تاریخ بغداد کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی، یہ وہی بغداد ہے جہاں بڑے بڑے حوادث آئے، فتنۂ تاتار کی ہولناک تاریخ اس سے جڑی ہوئی ہے، بغداد کے ذکر کے ساتھ دجلہ کا ذکر بھی ناگریز ہوجاتا ہے، مسافر ساحل دجلہ پر واقع ایک ہوٹل میں مقیم ہے وہ حال کے دلکش نظاروں میں اپنے شاندار ماضی کے تابناک رخوں کو فراموش نہیں کرسکا، حال کے مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے پس منظر میں ماضی کی بھی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے اس منظر کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے، مولانا عثمانی رقم طراز ہیں:

"کچھ دیر ہوٹل میں آرام کرنے کے بعد رات کو ہم دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے، موسم میں خوشگوار خنکی تھی اور دجلہ پوری آب وتاب کے ساتھ بہ رہا تھا، ہم لوگ دیر تک دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے، دریا کے دونوں کناروں پر بنی ہوئی شاندار عمارتوں کی روشنیاں پانی میں منعکس ہوکر عجیب وغریب رنگ پیدا کررہی تھیں، یہ وہی دجلہ تھا جو تاتاری حملے کے دوران کبھی خون مسلم سے سرخ ہوا، اور کبھی کتابوں کی روشنائی سے سیاہ، اس نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی کتنی داستانیں لکھی ہیں، تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنی لہروں میں

چھپائے آج بھی اسی آب وتاب سے بہ رہا ہے لیکن اس دریا کے کنارے مسلمانوں نے جو تابناک تہذیب دنیا کو عطا کی تھی اس کا تصور کرنے کے لئے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں اور دماغ پر زور ڈال کر یہ کہنا پڑتا ہے۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

سرسری مطالعہ کے بعد میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں ورنہ ''جہانِ دیدہ'' میں جگہ جگہ اس طرح کے ادبی شہپارے ہیں، جب مولانا عثمانی کے سامنے جگمگاتا ہوا کوئی منظر آتا تو ظاہری حسن و جمال اور رعنائی وزیبائی کا اظہار بڑی باریک بینی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کی عکاسی اتنے خوبصورت الفاظ میں کرتے ہیں جیسے شعر وادب کی روح اس میں حلول کرجاتی ہے، چھ سوصفحات کے اس سفرنامہ میں جگہ جگہ ایسا شگفتہ اندازتحریر ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے دل ودماغ کی وسعتوں میں موسم بہار کی عطر بیز ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ مولانا عثمانی ہر جگہ خارجی فضا کے ساتھ باطنی فضا کا بھی تصور پیشِ نظر رکھتے ہیں اور یہ باطنی یا روحانی فضا جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی مگر وہ سفرنامہ میں جان ڈال دیتی ہے مثلاً وہ منظر دیکھئے جب مسافر مدینہ منورہ سے بذریعہ کار خیبر جارہا ہے، ظاہر ہے کہ مدینہ طیبہ اور اس کے قرب وجوار کی زمین کا ذرہ ذرہ آفتاب نبوت سے اکتساب نور کر چکا ہے، اس دیار کے پہاڑ، راستوں کے سنگریزے، درخت اور جھاڑیاں وادیاں اور کھائیاں غرضیکہ پوری فضا سرکار رسالتمآب ﷺ کے پسینہ کی خوشبو سے معطر رہ چکی ہے اس دیار کا سفر کرتے ہوئے ہر ہر قدم پر اگر یہ تصور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ مسافر کے دل ودماغ پر چھا جائے تو اس کے سفر کی لذتوں کا کون اندازہ کرسکتا ہے، اس کا ایک منظر آپ بھی دیکھیں، مولانا عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''مدینہ طیبہ سے نکلنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف دور تک پتھریلے ٹیلے نظر آتے ہیں، یہی وہ راستہ ہے جہاں سے صحرانشینان عرب کے قافلے شام کا

رخ کیا کرتے تھے، خود سرکار دو عالم ﷺ کم از کم چار مرتبہ اسی راستے سے گذرے ہوں گے دو مرتبہ بعثت سے پہلے سفر شام کے لئے ایک مرتبہ خیبر پر حملے کے لئے اور ایک مرتبہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ان سنگلاخ ٹیلوں نے تاریخ انسانیت کی مقدس ہستیوں کا جلوہ جہاں آرا دیکھا ہوگا، انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی ہوگی، تصور کی نگاہیں ان پہاڑیوں اور وادیوں میں انسانیت کے نجات دہندوں کے قافلوں اور ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کو اترتے چڑھتے دیکھتی رہیں اور ان تصورات نے اس سفر میں سیاحت سے زیادہ عقیدت ومحبت اور تقدس کا رنگ پیدا کر دیا''

اسی طرح تبوک جاتے ہوئے بھی جس طرح ان کی مادی آنکھیں چاروں سمت میں حال کے نظاروں سے بہرہ اندوز ہو رہی ہیں اسی طرح انھوں نے اپنے تصور کی آنکھیں بھی وا کر رکھی ہیں جو قدم قدم پر خلاؤں میں اس فضا کو تلاش کرتی پھر رہی ہیں، جو کبھی یہاں کی سرزمین کو اپنے انوار وبرکات سے مستفید کر رہی تھیں، تبوک کے نام سے تاریخ اسلام کی ابجد پڑھنے والا بھی واقف ہے، غزوۂ تبوک اپنی پوری ایک تاریخ رکھتا ہے اس کو جیش العسرۃ بھی کہا جاتا ہے، مئی جون کی چنچلاتی دھوپ میں جب ریگستان کا ذرہ ذرہ آگ اُگل رہا تھا سرکار دو عالم ﷺ اپنے ۳۰ ہزار جاں نثاروں کو لے کر اسی تپتے ہوئے صحرا سے گذرے تھے مسافر جب تبوک کی راہ پر آتا ہے تو اس کے تصورات وخیالات پر لگا کر اس فضا میں اڑ جاتے ہیں جس کو گذرے ہوئے چودہ سو برس سے زائد گذر چکے ہیں لیکن ''جہانِ دیدہ'' کے مسافر کی چشم تصور اتنی طاقتور ہے کہ ان تمام گذرے ہوئے مناظر کو سمیٹ لیتی ہے، مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا یہ سفر سردی کے خوشگوار موسم میں ہو رہا ہے سفر کے لئے ایک دم نئی ایرکنڈیشنڈ کار میسر ہے، بحمد اللہ زاد سفر وافر ہے، شاندار پختہ سڑک ہے ۱۳۰ اور ۱۵۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار دوڑ رہی ہے، پھر بھی کبھی

کہیں ہلکا سا بھی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ اطمینان خاطر میسر ہے کہ انشاء اللہ شام تک تبوک پہنچ جائیں گے۔

لیکن یوں ہی لق ودق اور دل الٹ دینے والا صحرا تھا، سنبلہ کی قیامت خیز گرمی تھی جس میں آسمان آگ برساتا اور زمین شعلے اگلتی ہے نہ سڑک تھی نہ کاریں نہ گرمی سے بچنے کا کوئی انتظام، ایسی گرمی کے عالم میں سرکار دوعالم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے غزوۂ تبوک کے موقعے پر متواتر دو ہفتے سے زیادہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ اس وحشتناک صحرا کو قطع فرمایا تھا، جہاں دور دور تک کسی جھاڑی کی کوئی پتی نظر نہیں آتی، اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تو اس غزوے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے لشکر نکل جانے کے بعد تن تنہا پیدل روانہ ہوگئے، اللّٰہ اکبر۔ آج ان حضرات کا عزم، حوصلے اور تن فراموشی کے تصور ہی سے پسینہ آتا ہے‘‘

مسافر کو اگر اپنے مقامات سفر کی تاریخی حیثیت معلوم ہے تو وہاں کے تہذیبی وتمدنی حالات کی تصویر کشی بہتر طور پر کر سکے گا، اس کی تصویر کے خدوخال واضح بھی ہوں گے اور اس میں دلکشی و جاذبیت بھی ہوگی وہ جدید وقدیم دونوں ادوار کے مناظر کو بیک وقت پیش کر کے سفر نامہ کی افادیت میں بیش بہا اضافہ کرسکتا ہے، مولانا عثمانی ترکی کے سفر میں ہیں جو لوگ ترکی کی ماضی قریب کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں تقریباً دس سالوں تک خلافت تحریک جو ایک زلزلہ خیز تحریک بن کر رہی اس کا براہ راست تعلق ترکی ہی کی سرزمین سے تھا، ہندوستان کا بچہ بچہ اس تحریک سے واقف تھا اس دور میں ترکی کی خلافت ایک عالمی مسئلہ بن چکی تھی ہندوستان نے اس خلافت کو بچانے کے سلسلے میں بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں، لیکن مصطفیٰ کمال نے قبائے خلافت کو خود اپنے ہاتھوں تار تار کر کے دنیا کے مسلمانوں کا خون کر دیا، ترکی کی سرزمین میں جب خود خلافت کو دفن کر دیا گیا تو خلافتِ تحریک از خود مرگئی، کہاں ترکی خلافت کی تائید اس جذبے سے کی جارہی تھی کہ ترکی کی سرزمین

سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوگی، اس کے برعکس مصطفیٰ کمال نے اسی سرزمین کو اسلامی شعائر کا قبرستان بنا دیا اور یورپین یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے زمام اقتدار ہاتھوں میں لے کر اسلامی زندگی کا گلا گھونٹ دیا، مولانا عثمانی جب ترکی پہنچے تو ان کے ذہن میں ترکی کی تاریخ کی پوری فلم چلنے لگی، انہوں نے ترکی کے ایک دینی مدرسہ کو دیکھا تو ان کا طائرِ فکر ماضی کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا، وہ لکھتے ہیں:

''صرف استنبول شہر میں اس قسم کے چھوٹے بڑے ۲۱۰ مدارس ہیں اور پورے ترکی میں پانچ ہزار، ان پانچ ہزار مدارس میں رجسٹرڈ طلبہ کی تعداد چھ لاکھ ہے، صرف استنبول کے مدارس کے دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد چھ ہزار ہے، اس طرح یہ مدارس نئی نسل کو قرآن کریم اور ابتدائی دینیات سے روشناس کرانے کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ تمام مدارس سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے ان پر انسپکٹر مقرر ہیں۔

میں یہ مدرسہ دیکھتا اور اس کی تفصیلات سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی ترکی ہے جہاں کبھی کمال اتاترک نے قرآن کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا؟ جہاں عربی زبان تو کجا قرآن کریم کی تعلیم اور عربی زبان کی اذان تک ممنوع قرار دیدی گئی تھی، کمال اتاترک نے ''ہیٹ دار'' کے دوران کہا تھا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ اس قوم کو ہیٹ پہنا کر اس کا دماغ تبدیل کر دے گا، لیکن آج اس قوم کی نئی نسل کے چھ لاکھ بچے عربی ٹوپیاں پہنے ہوئے اپنے سینوں میں قرآن محفوظ کر رہے ہیں اس کی تعریف میں عربی ترانے گا رہے ہیں اور انھوں نے اپنا پورا وجود اس مقدس کتاب کے لئے وقف کر رکھا ہے''

مولانا عثمانی اُردن گئے، اور اس کے دارالسلطنت عمان کی سیر کی اور اردن کے مشہور علاقہ اغوار کی بھی سیاحت کی، پھر وہیں سے وہ ''بحر مردار'' تک گئے س کی جو تفصیلات انھوں نے بیان کی ہیں ان سے بالکل ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ''جہاں دیدہ'' کی یہی خصوصیت سب سے اہم ہے کہ وہ حال کے مناظر کو سرسری طور

پر دیکھ کر یا ان پر طائرانہ نظر ڈال کر گذر نہیں جاتے بلکہ وہ ٹھہرتے ہیں اور رُک کر غور کرتے ہیں پیش نظر کے ساتھ پس منظر پر بھی پوری نظر رکھتے ہیں یہ ان کا عالمانہ اور محققانہ ذہن ومزاج ہے، حقیقت رسی ان کا مزاج بن چکی ہے، اس لئے وہ ''بحر مردار'' سے بھی سرسری نہیں گذر گئے ۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم یہیں کہیں آباد تھی، قرآن نے ان کی قوم پر عذاب آنے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور اس کی کیفیت بتاتے ہوئے کہا ہے **جعلنا عالیھا سافلھا** کی آیت پر مفسرین نے بڑی تفصیلی گفتگو اپنی اپنی کتابوں میں کی ہے، مولانا عثمانی جب اس مقام پر پہنچے ہیں تو سب سے پہلے اس مقام سے آپ کو روشناس کراتے ہیں اور اس کی جغرافیائی تشریح کرتے ہیں اور تفسیری روایات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں ایک نئی معنویت پیدا کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں:

> ''یہ چھوٹا سا سمندر ۵۰ میل لمبا اور گیارہ میل چوڑا ہے اس کی سطح کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے زیادہ سے زیادہ گہرائی ۱۳۰۰ فٹ ہے اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں، اپنے طول وعرض کے لحاظ سے اس کو ایک جھیل کہنا زیادہ موزوں ہوگا لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزا عام سمندروں سے زیادہ ہیں اس لئے اس کو بحر یا بحیرہ کہا جاتا ہے''

مولانا عثمانی نے دوسرا انکشاف یہ کیا ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے ہے اور یہاں سے قریب ترین بحر روم کی خلیج عقبہ ہے، بحر میت کی سطح اس کی سطح سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے اس طرح انھوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ کرۂ زمین کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے، انھوں نے محققین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہاں حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے کوئی سمندر نہیں تھا، ان حقائق کے اظہار کے بعد انھوں نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے:

> ''دنیا بھر میں سمندر کی سطح سے اتنا نیچا علاقہ کوئی نہیں ہے، مجھے جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ذہن فوراً قرآن کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں

اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی بستیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: **جعلنا عالیها سافلها.** ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو زمین کا پست علاقہ بنا دیا، عام طور پر اس آیت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ بستی اُلٹی گئی تو چھتیں زمین بوس ہو گئیں لیکن قرآن کریم کا یہ معجزانہ بیان شاید اس طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ صرف بستی کی عمارتیں ہی پست نہیں ہوئیں، بلکہ ان بستیوں کا پورا علاقہ روئے زمین کا پست ترین علاقہ بنا دیا گیا، چنانچہ بحر میت کے شمال اور مشرق کی جانب کے علاقے تو ہم نے بھی دیکھے ہیں کہ وہاں میلوں دور سے زمین کی سطح بتدریج پست ہوتی چلی گئی ہے زمین کا جو حصہ سطح سمندر کے مساوی ہے وہاں علامت کے طور پر بورڈ لگا دیا گیا ہے کہ اس کے بعد ہر تھوڑے فاصلے پر سطح کی پستی کی مقدار بتانے کے لئے جگہ جگہ بورڈ لگے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ پست ترین سطح بحر میت پہنچ کر آئی''

مولانا عثمانی نے چین کی بھی سیاحت کی ہے اور اس کے دور افتادہ مقامات تک آپ پہنچے ہیں، بیکنگ کے عظیم الشان چوک سے لے کر دیوار چین تک کے مناظر دیکھتے ہیں، خاص طور پر چین کا وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کا بہت تفصیلی دورہ کیا ہے، کمیونزم اور سرخ انقلاب کی جبر وتشدد نے جو صورتِ حال وہاں پیدا کی اگرچہ اس کی تفصیل تو نہیں دی ہے، لیکن انہوں نے اپنا ایک مشاہدہ جو بیان کیا ہے وہ سرخ انقلاب کی ایک ایسی عبرتناک تصویر پیش کرتا ہے جو کئی صفحات پر بھاری ہے، اس کے تذکرے میں زبان وادب کی چاشنی بھی ہے اور نفسیات کی نکتہ رسی بھی، وہ چین کے صوبہ چھینگ ہائی کے دارالحکومت شننگ گئے، پھر وہاں سے اس صوبے کی مشہور مسلم اکثریت والے ضلع سالار کاؤنٹی پہنچے جہاں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ ہزار ہے اور ۹۴ مسجدیں ہیں، یہ وہ علاقہ جہاں اب تک کوئی غیر چینی نہیں پہنچا ہے، وہاں کی ایک مسجد میں مولانا عثمانی کے پہنچنے پر استقبالیہ دیا گیا اس کے بعد کا واقعہ ''جہانِ دیدہ'' کے لفظوں میں سنئے:

''جب امام صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس بات پر پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چینی مسلمانوں کو حج پر جانے کے انتظامات کئے، تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے، نہ جانے یہ دور افتادہ مسلمان کب سے اپنے سینوں میں حج بیت اللہ کی آرزو چھپائے بیٹھے تھے اور نہ جانے کتنے لوگ یہ آرزو دل میں لئے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے، اب اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حج کا راستہ کھولا ہے تو ان کے سینے مسرت وتشکر کے جذبات سے معمور ہیں اور اس نعمت پر شکر ادا کرتے نہیں تھکتے، یہ حضرات زبان کے اختلاف کی بنا پر الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں لیکن ان کے اخلاص ومحبت سے لبریز چہرے دل کی داستان سنانے کے لئے کافی تھے اور ان کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسوان کے اخلاص کی وہ پونجی تھی جو اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے سامنے نچھاور کر رہے تھے، ان کے ان آنسوؤں میں ماضی کے صبر آزما حالات کی جوروح فرسا داستانیں پوشیدہ تھیں ان کے تصور ہی سے دل منہ کو آتا ہے''

مولانا عثمانی نے امریکہ کے سفر میں اس کے مشہور شہروں نیویارک، واشنگٹن اور چارلسٹن وغیرہ میں قیام کیا اور وہاں کے مناظر دیکھے، اور وہاں کے معاشرہ کو بنظر غائر دیکھا، پرکھا اور سمجھا، وہاں کی تہذیب وہاں کی تمدنی سہولیات، مجلسی اخلاق وعادات کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں امریکیوں کی فرض شناسی، احساس ذمہ داری، اصول وضوابط کی پابندی قانون کا احترام، سرکاری دفتروں میں شہریوں کی ضرورتوں کی فوری تکمیل، بہت دھیمی آواز میں بات کرنا، اجنبیوں کی مدد کرنا اپنی اخلاقی اور منصبی ذمہ داری سمجھتے ہیں، صبح سے شام تک جس انہماک کے ساتھ وہ اپنی دفتری ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں ان کی تعریف کرتے ہوئے مولانا عثمانی نہیں تھکتے وہ بتاتے ہیں کہ وہاں رشوت نام کی لعنت نہیں کام چوری سے ان کو کوئی واسطہ نہیں اشیاءِ خورد ونوش میں ملاوٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا معاملات عام طور پر صفائی اور

سچائی کے ساتھ انجام دیئے جاتے ہیں، دھوکہ یا فریب کا کوئی خطرہ نہیں، شور وشغب سے پرہیز ان کی فطرت، ہلکی آواز میں بات کرنا ان کی تہذیب ہے۔

غرضیکہ ہمارے ملک میں جو اخلاقی بیماریاں عام ہیں وہ امریکہ میں ناپید اور عنقاء ہیں، ان کی زندگی اصول پرستی اور باقاعدگی کا بہترین نمونہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس اعتبار سے امریکہ قابل رشک ہے یہ ان کی زندگی کا روشن پہلو ہے لیکن ان کی زندگی کا ایک اور رخ بھی ہے یہ رخ بھی ظاہر اور روشن ہے ''جہانِ دیدہ'' زندگی کے اس رخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے، وہ اپنے مشاہدات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک ان کے جنسی طرز عمل کا تعلق ہے اس کے مناظر دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ وہی قوم جس کی شرافت واخلاق کے مظاہرے ہم دوسرے شعبوں میں دیکھ کر آئے ہیں صرف تفریح گاہوں پر ہی نہیں بارونق سڑکوں اور پرہجوم بازاروں میں، ٹرینوں اور بسوں میں، پبلک مقامات پر برسر عام بوس وکنار اور جنسی التذاذ ایک عام بات ہے، جس کے پانچ سات مناظر دن بھر میں خواہی نخواہی نظر آہی جاتے ہیں، عورتوں کے لئے عریانی عیب تو کیا ہوتی شاید مایۂ افتخار سمجھی جاتی ہے، کپڑے نام کی جو چند تہمتیں ہوتی ہیں ستر پوشی کے نقطۂ نگاہ سے ان کا بھی کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا اور خاص خاص مواقع پر بالکل برہنگی میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، جگہ جگہ ''مادر زاد رقاصائیں'' کے بورڈ فخر سے لگے نظر آتے ہیں، قحبہ خانوں کے اشتہارات ''مجالس حسن'' کے نام سے سر بازار تقسیم ہوتے ہیں، نیویارک کے بازاروں سے گذرتے ہوئے ایک شخص نے ایک اشتہار ہم جیسوں کے ہاتھ میں تھما دیا، جس میں چند برہنہ تصویروں کے ساتھ جلی حروف میں لکھا تھا ''ہمارے جسموں سے کھیلئے'' اشتہار میں جو کچھ لکھا تھا اسے ایک شریف آدمی کو پڑھنا بھی مشکل ہے، غرض یہ کہ جنسی طرز عمل کے لحاظ سے یہ قومیں بلا مبالغہ کتے اور بلیوں تک پہنچ گئی ہیں''

''جہانِ دیدہ'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں واقعات ومشاہدات کا سرسری بیان نہیں ہے کہ اس منظر کی شادابی اور رعنائی کو عمومی تعریفی جملوں میں ادا کردیا جائے بلکہ اس منظر کے تمام اجزاء ترکیبی کی ایسی تفصیلات بھی بیان کردی گئی ہیں کہ اس منظر کی خوبیوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، اور قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ خود اس منظر کے سامنے کھڑا ہے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

امریکہ کی نیاگرا آبشار کا حسین منظر عالمی شہرت رکھتا ہے، جس نے بھی اس قدرتی آبشار کو قریب سے دیکھا ہے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے، میں نے ان بیانات سے صرف اتنا ہی سمجھا ہے کہ وہ بڑا حیرتناک قدرتی آبشار ہے اس کی فضا بڑی رومانٹک ہے، لیکن یہ آبشار کیا ہے، اس کی اہمیت وخصوصیت کیا ہے اس کی شہرت کا راز کیا ہے؟ جب کہ دنیا کے دوسرے مقامات پر بھی قدرتی آبشار پائے جاتے ہیں، ''جہانِ دیدہ'' ان تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا ہے۔

مصنف نے اس آبشار کا اتنا تفصیلی مشاہدہ کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ گیا، نیاگرا کے نظارہ کی تفصیل میں تماشا بینی کا انداز نہیں بلکہ جیسے ایک ماہر ارضیات وجغرافیہ اور سائنسداں کی تحقیق اور حقیقت بینی کا انداز ہے، مولانا عثمانی اپنے مشاہدات تحریر فرماتے ہیں:

''نیاگرا مستقل ایک شہر ہے اور اسی کے کنارہ وہ شہرۂ آفاق آبشار واقع ہے جو اپنے قدرتی حسن کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کرشمۂ قدرت کی شہرت تو بچپن سے سنی ہوئی تھی لیکن اس کا دلکش منظر جسے دیکھ کر انسان بیساختہ **فتبارك الله احسن الخالقين** پکار اٹھتا ہے پہلی بار نظر نواز ہوا۔

نیاگرا دراصل ایک دریا ہے جو امریکہ کی چار جھیلوں سے مرکب ہے جس کے طاس کا مجموعی رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے جس مقام پر دریا نے دنیا کے مشہور ترین آبشار کی شکل اختیار کی ہے وہاں اس دریا کے راستہ میں ایک

نہایت گہرا اور طویل وعریض نالہ حائل ہو گیا ہے اور جب یہ دریا ایک وسیع رقبہ میں زور شور سے بہتا ہوا اس نالے کے کنارے پہنچتا ہے تو اس کے پانی کا زبردست ریلا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نالے میں گرتا ہے، اس طرح پورے کا پورا دریا ایک آبشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس نالے کا مغربی سرا کنیڈا میں ہے اور اس کی شکل گھوڑے کی نعل کی سی ہے اسی لئے اس کو ''نعلی آبشار'' بھی کہا جاتا ہے دریا کے بیشتر حصہ یہیں سے نالہ میں گرتا ہے جو دوسری طرف یہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر نالے کا جنوبی کنارا امریکہ میں ہے اور پانی کا باقی ماندہ حصہ چکر کاٹ کر اس کنارے سے نیچے گرتا ہے جسے امریکی آبشار کہا جاتا ہے، کنیڈا کا نعلی آبشار ہلالی نصف دائرہ کی شکل میں ہے اس نصف دائرے کا قطر دو ہزار چھ سو فٹ ہے اور نالے کی سطح سے اس کی اونچائی ۱۶۲ فٹ ہے گویا یہاں سے دریا کا بیشتر پانی نصف دائرے کی شکل میں ۵۰ میٹر سے زائد کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے جس کا شور دور سے سنائی دیتا ہے اس کی اڑتی ہوئی چھینٹیں نالے کی نچلی سطح سے بلند ہو کر دریا کی اصل سطح سے بھی اونچی چلی جاتی ہیں اور ان چھینٹوں کی وجہ سے ہر وقت آبشار کے سامنے ایک سفید بادل حرکت کرتا نظر آتا ہے، کہا جاتا ہے یہاں سے پانی ۶ کروڑ گیلن فی منٹ کے حساب سے گرتا ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ پانی کا یہ زبردست سیلاب اس جگہ کروڑوں سال سے اسی زور وشور سے کے ساتھ گر رہا ہے لیکن قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ نالے کا وہ کنارہ جہاں سے یہ لاکھوں ٹن پانی اس خوفناک دباؤ کے ساتھ گرتا ہے اور لاکھوں صدیوں سے اس کا صرف چند فٹ حصہ اب تک گھس کر جھڑ سکا ہے، پانی جوں کا توں قائم ہے **فتبارك الله احسن الخالقين**''

مولانا عثمانی نے نیاگرا آبشار کا نظارہ صرف زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہیلی کاپٹر سے اُڑ کر اس آبشار کو آسمان کی بلندی سے بھی دیکھا ہے جہاں

سے دریا کے بہاؤ اور آبشار کی تشکیل اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو بچشم خود مشاہدہ کیا ہے لیکن اس ناپ تول اور پیمائش اور حساب کتاب کی تفصیل میں آبشار کی رومانی فضا تحلیل ہو کر رہ گئی جس کی عکاسی تمام سیاح اپنے سفرناموں میں کرتے ہیں لذت پسند طبیعتیں جس حسن منظر کو لذت لے لے کر بیان کرتی ہیں اس سارے فسانے میں اس کا کوئی ذکر نہیں جن کو پڑھ کر قاری نادیدہ اس کا عاشق ہو جاتا ہے اور تخیل کے پر لگا کر وہاں پہنچ جانے کی کوشش کرتا ہے ''جہانِ دیدہ'' کا مسافر ایک ثقہ عالم ہے اس لئے صاف لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا صرف اشارہ ہی کر سکتا تھا اس لئے چند سطروں میں ہمیں بتا دیا کہ اس آبشار کی سیاحت میں دلکشی اور جاذبیت کا راز کیا ہے مولانا عثمانی کہتے ہیں:

> ''آبشار کی شمال میں نیاگرا کی تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لئے بڑے حسین پارک، رہائش گاہیں، ریستوران اور تفریحات کے بہت سے مراکز ہیں، اسی وجہ سے اس جگہ کو دنیا کی حسین ترین تفریح گاہ قرار دیا جاتا ہے جہاں لوگ کئی کئی ہفتے گذارتے ہیں لیکن اس وقت موسم سرد تھا اس لئے بہت کم سیاح آئے ہوئے تھے، اس بنا پر ہم جیسے لوگ یہاں اطمینان سے کچھ وقت گذار سکے ورنہ ہجوم کے زمانہ میں تو یہاں جو طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے اس کی موجودگی میں یہاں زیادہ ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے''

مولانا عثمانی نے فرانس کی بھی سیاحت کی ہے مگر یہ سیاحت سرسری طور پر تھی مگر فرانس کا دھڑکتا ہوا دل پیرس دیکھنا نہیں بھولے اور ہم کو اس کی ایک جھلک دکھائی ہے لیکن یہ جھلک دھوپ چھاؤں کی طرح نہیں بلکہ پیرس کی اندورنی تصویر تجریدی آرٹ کی شکل میں بتائی ہے کہ جب ان لکیروں کی معنویت پر غور کیا جائے تو ان آڑی ترچھی لکیروں میں جو اصل تصویر پوشیدہ ہے نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے، پیرس کا انھوں نے ایک منظر دکھایا ہے مگر پورے پیرس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے انھوں نے اس شہر کے سب سے حسین بازار میں جا کر اس کی دلکشی و دل ربائی کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے، وہ

تحریر کرتے ہیں:

''پیرس اپنے حسن و جمال اور رعنائی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا سرسبز، شاداب اور قدرتی حسن سے مالا مال شہر ہے، اس کی عمارتوں میں قدامت وجدت کا امتزاج پایا جاتا ہے، نہایت مہنگا شہر ہونے کے باوجود اب بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے، یہاں کا مرکزی علاقہ شانزالیزے دنیا کے حسین ترین بازاروں میں شمار ہوتا ہے، جو اپنی وسعت، صفائی ستھرائی عمارتوں کی روایتی خوبصورتی اور دلکش درختوں کی دورویہ قطاروں کے لحاظ سے واقعتاً یہ ایک منفرد علاقہ ہے جسے چہل قدمی کے لئے بھی موزوں سمجھا جاتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ایسے مقامات فسق و فجور کے بھی سب سے بڑے مرکز ہوتے ہیں اور ان کی ظلمت ہم جیسے کوردل بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے''

ان چند جملوں میں انھوں نے پیرس کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی وزیبائی کے اظہار کے ساتھ اس کے اندرون میں جو ظلمت ہی ظلمت ہے اس کی طرف بھی اشارے کردیئے ہیں جو لفظوں اور جملوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر حقیقت پا جانے کا ذہن رکھتے ہیں وہ ان الفاظ سے پیرس کے ظاہر و باطن دونوں کو بیک نظر دیکھ سکتے ہیں۔

انھوں نے جس منظر کی عکاسی کی ہے خود اس منظر کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور کہیں بھی طائرانہ نظر نہیں ڈالی ہے ان تمام مناظر کی عکاسی کے وقت ان کے ہاتھوں میں ایک ادیب عظیم کا قلم رہتا ہے جو لفظوں کے برمحل استعمال اور جملوں کی تراش وخراش سے خوب واقف ہوتا ہے، شانزالیزے بازار سے ذرا دوری پر دنیا کا مشہور ترین ٹاور بھی ہے صرف اس کا ذکر کر کے نہیں گذر گئے ہیں بلکہ اس کی ساخت سے لے کر اس کے خالق تک کا ہم سے تعارف کرادیا ہے اسی کے ساتھ اس تاریخ سے بھی ہم کو روشناس کرادیا ہے جس سے اس مشہور ٹاور کا تعلق ہے، پہلے وہ ہمارے سامنے اس کا پورا منظر پیش کرتے ہیں اور پھر ایک ایک چیز پر انگلیاں رکھ رکھ اس کی حقیقت

بتاتے ہیں، وہ شانزالیزے بازار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتاتے ہیں:

''شانزالیزے کی سڑک اس چوک پر ختم ہوتی ہے جس کے سامنے فرانس کی پارلیمنٹ کی شاندار عمارت ہے، اس چوک میں انقلاب فرانس کے وقت بادشاہ کو پھانسی دی گئی تھی، چوک کے دائیں جانب مشہور زمانہ ''ایفل ٹاور'' واقع ہے جو ۱۹۳۰ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی بعد میں جب نیویارک میں اس سے اونچی عمارتیں بن گئیں تو اس کی یہ حیثیت ختم ہوگئی لیکن اپنی خوبصورتی اور تکنک کے اعتبار سے اب بھی اس کا شمار دنیا کی حسین ترین تعمیرات میں ہوتا ہے اور آج بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے ۹۸۴ فٹ بلند یہ ٹاور تمام تر لوہے کا بنا ہوا ہے''

چونکہ مولانا عثمانی کا ذہن ومزاج تحقیقی ہے اس لئے ان کی نگاہ جستجو حقائق کی تلاش میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے دوران سیاحت جب کوئی نئی بات سنی کوئی اصطلاح اور کوئی نیا لفظ آیا یا لفظ تو مشہور ہے مگر اس کی معنویت پر عقیدت وارادت کے تہ بہ تہ پردے پڑ گئے ہیں یا عوام الناس کی زبانوں پر وہ لفظ چڑھا ہوا ہے تو ان کی نگاہِ نکتہ رس اس کی تہ میں جا کر اس کی حقیقت کو تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے، میں اس کی یہاں صرف دو مثالیں ذکر کروں گا۔

مولانا عثمانی اردن کے دارالحکومت عمان میں ہیں اور ایک ہوٹل میں مقیم ہیں وہ عمان کے مشہور مقامات کو دیکھنا چاہتے ہیں، جب وہ ہوٹل سے نکلے تو سب سے پہلے ان کو یہ بتایا گیا کہ یہاں ایک قدیم ترین اسٹیڈیم ہے جس کی تعمیر عہد رسالت سے بھی پہلے کی ہے یہ رومیوں کے دور کی تعمیر ہے، مولانا عثمانی لکھتے ہیں:

''ہوٹل کے بالکل برابر ایک قدیم اسٹیڈیم بنا ہوا ہے، قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اگر چہ یہ عہد رسالت سے بھی پرانی عمارت کا کھنڈر ہے جو ٹھیک اسی طرز پر بنی ہوئی ہے جیسے آج کل کھیلوں کے اسٹیڈیم بنائے جاتے ہیں، ملک افضل نے بتایا کہ یہ رومی عہد کا بنا ہوا اسٹیڈیم ہے جو اس وقت کے مشہور اولمپک

کھیلوں کیلئے استعمال ہوتا تھا، اسٹیڈیم بنانے کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا ہے۔

در حقیقت ''اسٹیڈیم'' ایک یونانی لفظ کی لاطینی ترمیم ہے لاطینی زبان میں ''اسٹیڈ'' (STADE) ایک مسافت کا پیمانہ تھا جو تقریباً ۶۰۶ قدم کے برابر ہوتی تھی، اس دور میں پیدل دوڑ کے لئے جو میدان بنایا جاتا تھا وہ ایک ''اسٹیڈ'' کی مسافت کا ہوتا تھا اس لئے اس کا نام اسٹیڈیم رکھا گیا شروع میں یہ نام صرف دوڑ کے میدان کے لئے استعمال ہوا لیکن اس دور میں چونکہ دوسرے کھیلوں کے بھی مقابلے ہوتے تھے اس لئے بعد میں توسعاً ہر قسم کے کھیلوں کا اسٹیڈیم کہا جانے لگا''

مولانا عثمانی عراق کے دورے پر ہیں انھوں نے بغداد میں چند دن گذارنے کے بعد کوفہ، بصرہ وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے اس مشہور جگہ پہنچے جسے اسلامی تاریخ میں میدان کربلا کہا جاتا ہے جو اب میدان کے بجائے ایک ترقی یافتہ شہر ہے اور ساری تمدنی سہولیات وہاں دستیاب ہیں یہاں بھی ان کا تحقیقی ذہن مصروف کار رہا انھوں نے ''جہانِ دیدہ'' میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا:

''تقریباً ظہر کے وقت ہم کربلا شہر میں داخل ہوئے اب یہ شہر خاصا بارونق اور شاید کوفہ اور نجف دونوں کے مقابلے میں زیادہ آباد ہے جس وقت حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حادثہ شہادت پیش آیا اس وقت یہ لق ودق صحرا تھا اس پورے علاقہ کو زمانہ قدیم میں ''طف'' کہتے تھے اور یہاں کا صحرا جس میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے کربلا کے نام سے مشہور تھا اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال مشہور ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ ''کربلة'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاؤں کے تلوے کی نرمی کے ہیں، یہ زمین چونکہ نرم تھی اس لئے اس کا نام کربلا رکھ دیا گیا، ''کربلا'' عربی زبان میں گندم صاف کرنے کو کہتے ہیں اس لئے بعض حضرات کا کہنا کہ اس سرزمین میں چونکہ روڑے پتھر نہیں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس زمین کو باقاعدہ

صاف کیا گیا ہے اس لئے اس کو کربلا کہتے ہیں، اس کے برعکس بعض حضرات کا
خیال ہے کہ یہ لفظ ''کربل'' سے نکلا ہے، یہ ایک قسم کی گھاس کا نام ہے جو
اس صحرا میں بکثرت پائی جاتی تھی اس لئے اس کا نام کربلا مشہور ہو گیا''

حاصل کلام یہ کہ ''جہانِ دیدہ'' دور جدید کا ایک ایسا سفرنامہ ہے جو ابتدا سے انتہا تک قاری کے دل ودماغ کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے، اس سفرنامے میں اسلامی ممالک کا ذکر زیادہ ہے ان ممالک کا تعلق چونکہ اسلام کے عہد زریں سے ہے اس لئے انبیاء کے تذکرے آتے ہیں ان کے مقامات تبلیغ اور ان کی سرگرمیوں کی سرزمین کا ذکر آتا ہے، چونکہ ان ممالک کو صحابہ کرام نے فتح کیا ہے بہتوں کے مزارات بھی انھیں علاقوں میں ہیں ان کے اولوالعزم کارناموں ان کی جد جہد کے میدانوں اور صحراؤں کا بھی ذکر آتا ہے، ان مقدس ہستیوں کے ذکر سے قاری کے دل ودماغ میں جو ایک مقدس اور نورانی فضا بنتی ہے وہ اپنے تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ بڑی دلکش ہوتی ہے اور قاری ان صفحات کو پڑھتے ہوئے ان نورانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے کیونکہ اس کا دل ان مقدس ہستیوں کی بے پناہ عقیدت ومحبت سے لبریز ہے ''جہانِ دیدہ'' میں اس نورانی فضا کی تابندگی ورخشندگی کو ہر جگہ باقی رکھا گیا ہے، لیکن ان تمام صداقتوں کے اظہار کے لئے ہمارے مذہبی مدارس کی زبان یا لب ولہجہ اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ لفظوں کے انتخاب جملوں کے دروبست، ترتیب وسلیقہ، زبان وبیان اور پیشکش کے انداز میں شعروادب کی ایسی لطیف چاشنی ہے جس کو قاری محسوس تو کرتا ہے لیکن لفظوں میں اس کا بیان نہیں کرسکتا، یہ ''جہانِ دیدہ'' کی ایسی خصوصیت ہے جو اس کو عصر حاضر کے سفرناموں میں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

# کلیم عاجز کی شاعری پر ایک نظر

کلیم عاجز کو کچھ بہت زیادہ لوگ نہیں جانتے، کیوں کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں اگر چہ انہوں نے ہندوستان کے کچھ بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنا کلام سنایا ہے اور داد وتحسین سے نوازے گئے مگر عوامی سطح کے مشاعروں سے وہ ہمیشہ گریزاں رہے، شہرت اور نام ونمود سے لا پرواہی اور بے نیازی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اپنا کلام رسالوں میں شائع کرنے کے لئے بھی نہیں بھیجتے ہیں، کسی نے ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے شائع کر دیا تو یہ دوسری بات ہے، ایسے ایک حد تک غیر مشہور شاعر کے بارے میں جب میں نے فراق جیسے مغرور، خود پسند شاعر کا تبصرہ کلیم کی شاعری پر پڑھا تو حیرت زدہ ہو کر رہ گیا، کسی شاعر کے کلام کو خاطر میں نہ لانے والا کلیم پر کیوں رشک کرنے لگا، ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنے لگا دل نے کہا کلیم میں ضرور کوئی ایسا جوہر ہے جس کی قدر و قیمت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں، فراق یقیناً بڑے شاعر اور جوہری ہیں ان کی بات میں وزن ہے اور اس کی اہمیت ہے، فراق لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز کا کلام خود ان کے منھ سے سننے کے مواقع ملتے رہے، اب تک لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سن کر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدرشناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے، لیکن جب میں نے کلیم عاجز صاحب کا کلام سنا تو شاعر اور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا اور ہم آہنگی، محبت اور نا قابل برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہو گئے، اور ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم عاجز صاحب پر غصہ آنے لگا کہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں، ان کے اس جرم اور قصور کے لئے میں انہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا، اتنی ڈھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ لب ولہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے

اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا میں ان کا نام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا"

خود میں نے نہ کلیم عاجز کو دیکھا ہے نہ ان کی زبان سے کبھی ان کا کلام سنا ہے، البتہ ان کا کلام پڑھا ہے اور جب پڑھتا ہوں تو دل پر ایک ایسی کیفیت چھا جاتی ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے گلاب، بیلے، جوہی، چمبیلی کے پھولوں سے جب خوشبو دبے پاؤں چل کر قوت شامہ اور دل و دماغ پر چھا جاتی ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے اور کیسا محسوس ہوتا قوت شامہ اور دل و دماغ کن کیفیات میں ڈوب جاتے ہیں ان کو لفظوں میں کیسے سمجھایا جا سکتا ہے، بڑا سے بڑا ادیب بھی ان کیفیات کو لفظوں میں قید کرنے سے عاجز ہے، کچھ یہی حال کلیم عاجز کی شاعری کا ہے انداز بیان بہت سیدھا سادہ، الفاظ عام فہم اور آسان مگر جب کلیم عاجز ان لفظوں کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں تو وہ سحر بن جاتے ہیں، جادو کے بول ہو جاتے ہیں، دل و دماغ کی دنیا میں ایسا ارتعاش و اضطراب پیدا ہو جاتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہے۔

کلیم عاجز انداز بیان کی سادگی کے ساتھ تلخ ترین حقائق کو ایسا خوبصورت ریشمی لباس پہنا دیتے ہیں کہ سطحی نظر دھوکا کھا جاتی ہے، قاری سمجھتا ہے کہ شاعر رنگین مزاج رُومان پرست اور طرحدار ہے، حسن و شباب کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہے، لیکن لذت آفرینی اور جواں دلوں کو گدگدا دینے والی اس کیفیت کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تو ریشمی لباس میں ایسا پیکر نگاہوں کے سامنے آتا ہے جو زخموں سے چور ہے اور درد و کرب کا مجسمہ ہے، یہی کلیم عاجز کی جادوگری ہے، شاید ان کی یہ کوشش ارادی ہے، کیوں کہ وہ خود کہتے ہیں

لگے ہے پھولؔ سننے میں ہر اک شعر
سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے

ان کی شوخ لب و لہجہ والی ایک غزل ہے، سطحی نظر اس کو کچھ کا کچھ سمجھتی ہے لیکن

بات وہ نہیں جو عام اور سطحی نظر کا قاری سمجھتا ہے اس غزل کے دو شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

یہ رنگ اشکوں کا لال لال ہے پیارے ۞ بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے
وہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ۞ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

ایک مشاعرے میں وہ یہ غزل پڑھ رہے تھے، اس شعر پر جوش مسرت میں ایک نوجوان نے بلند آواز سے کہا کلیم صاحب! یہ ستائیسواں سال ہے، اس شعر کو جنسیات سے جوڑنے کی غلطی کیوں ہوئی؟ اس شعر کا شوخ انداز بیان ہے جس سے سطحی نظر دھوکا کھا گئی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبوب سامنے ہے، پیار اور محبت کا ماحول ہے، بار بار پیارے کا لفظ استعمال کر کے بے تکلفی کا اظہار کیا جا رہا ہے، اور جرأت اتنی بڑھی کہ پوچھنے لگے، ''ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے'' کتنا شوخ کتنا جاندار شعر ہے، کتنے لذت انگیز جذبات کو ہوا دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے، الفاظ عام فہم، انداز بیان سادہ اور روز مرہ ہونے والی گفتگو کا ہے، کوئی بھی زندہ دل قاری ان شعروں کو پڑھتے ہوئے دل میں گدگدی ضرور محسوس کرے گا، لیکن بات وہ نہیں جو بظاہر معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ کلیم عاجز کی زندگی کے اس انتہائی کربناک المیہ کی ترجمانی ہے جس نے ان کو شاعر درد اور مصور بنا دیا، آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کے دل کا یہ زخم بالکل تازہ اور ہرا ہے اس المیہ نے ان کی زندگی کے دھارے کو ہی بدل دیا اس شعر میں اسی المیہ کا ذکر ہے انھوں نے اس شعر میں درد و کرب کی وہ داستان سنائی ہے جو دلوں کو چھلنی کر دے وہ المیہ یہ ہے، وطن کی آزادی سے چند ماہ پہلے کلکتہ، نوا کھالی کے خوں ریز فسادات کے بعد بہار کو بلوائیوں اور قاتلوں نے اپنا نشانہ بنایا کلیم عاجز کے والد کی وفات ہو چکی تھی صرف ان کی والدہ تھیں اور ایک چھوٹی بہن، دونوں سے کلیم کو بے پناہ محبت تھی وہ ضلع پٹنہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھیں جو کلیم کا وطن تھا خوشحال زمینداروں کا گاؤں تھا کلیم اور ان کا چھوٹا بھائی نسیم پٹنہ شہر میں زیر تعلیم تھے اور والدہ اور چھوٹی بہن دونوں کلیم سے ملنے پٹنہ آئی تھیں چند دنوں بعد ہی گاؤں جانے کو تیار

ہوئیں تو کلیم نے ان کو پٹنہ جنکشن پر ٹرین میں سوار کرادیا، کلیم پلیٹ فارم پر کھڑے ٹرین چھوٹنے کا انتظار کرتے رہے ان کی والدہ کھڑکی پر سر رکھ کر سسک سسک کر رو پڑیں اور مسلسل روتی رہیں، چھوٹی بہن نے ایک بار ماں کو اور ایک بار بھیا کلیم کا چہرا دیکھا اور بلک کر رو پڑی، ماں اور بہن کے رونے کی کوئی وجہ نہ تھی وہ عید منانے گاؤں جارہی تھیں کلیم کو پٹنہ میں عید منانی تھی یہ طے تھا، پھر رونے کی کیا وجہ؟ کلیم حیرت زدہ کھڑے رہے ان کا دل ہر قسم کے احساسات سے خالی تھا، لیکن ان کو چند دنوں بعد سمجھ میں آیا کہ ماں اور بہن کے دلوں پر مستقبل میں پیش آنے والے المناک حادثہ کی پرچھائیاں پڑ گئیں اور انہوں نے قبل از وقت یہ سمجھ لیا کہ یہ آخری ملاقات ہے ماں بیٹے کو اور بہن اپنے پیارے بھیا کو آخری بار دیکھ رہی ہیں پھر اس زندگی میں دوبارہ ملاقات ممکن نہیں، کلیم کا دل ان احساسات سے خالی تھا چند دنوں بعد بقرعید تھی، ٹھیک تہوار کے دن دس ہزار مسلح بلوائیوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو گھیر لیا اور ۳ بجے دن میں اس آبادی کے ایک ایک فرد کو ذبح کر کے پھینک دیا کلیم کی ماں اور ان کی پیاری بہن کی لاشیں ایک کنویں سے ملیں، کلیم تیسرے دن پولیس کے ایک دستہ کے ساتھ اپنے گاؤں پہنچے، ماں بہن کی زخموں سے چور لاشیں دیکھیں، پورا گاؤں ویران ہو چکا تھا ہر طرف خون کے چکتے زمین پر پڑے ہوئے، اپنے گھر کے صحن میں جا کر بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر ان کو خبر نہیں کہ کیا ہوا اس حادثے نے ان کو پاگل بنادیا لبوں پر مہر سکوت لگ گئی روتے روتے آنکھوں کے آنسو سوکھ گئے تعلیم چھوٹ گئی، معاشی حالت تباہ ہوگئی تن بدن کا ہوش نہ رہا انیس بیس سال کی عمر کے اس نوجوان کی حالت کو دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، کلیم کے سارے عزیز و اقارب اسی گاؤں میں تھے ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا اب کلیم اور ان کا چھوٹا بھائی اس دنیا میں تنہا رہ گئے ان کی دنیا تباہ ہوگئی، چھ برسوں کا زمانہ انتہائی درد و کرب میں گزرا، اس المیہ کے چند مہینوں بعد ہندوستان آزاد ہوگیا، دونوں واقعات ایک ہی سال کے ہیں اس لئے کلیم نے کہا:

یہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ❁ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

یہ المیہ کلیم کے لئے زندگی بھر کا روگ ہوگیا، ان کی ہر غزل اسی سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے حتیٰ کہ نعت پاک بھی لکھتے ہیں تو اس المیہ کو فراموش نہیں کر پاتے ایک نعت میں صبا کو مخاطب کر کے کہا

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اجالے میں
لٹا ہے تیرے غلاموں کا قافلہ کہیو

اس المیہ نے ان کے ذہن کے سانچوں کو بدل کر رکھ دیا اب جو بات بھی ان کی زبان سے نکلتی ہے وہ اسی درد وکرب کے سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے دکھ درد کی کسک ہر جگہ محسوس ہوگی ان کا پیرایۂ بیان ضرور شوخ ہے لیکن یہ ان کی شرافت، وضعداری اور صبر وتحمل کا کمال ہے کہ وہ اپنی دکھ بھری کہانی بھی ہنس ہنس کر سناتے ہیں۔

چھ برس بعد جب ان کی زبان کھلی اور ۱۹۵۲ء میں اپنی سب سے پہلی غزل پٹنہ کے مشاعرے میں سنائی درد وکرب کی کہانی اور اس پر کلیم عاجز کا پرسوز ماتم، خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا، غزل کا لب ولہجہ دھیما ضرور ہے لیکن درد کی کسک بڑی جان لیوا ہے، یہ ذہن میں رہے کہ یہ غزل اس وقت پڑھی جا رہی ہے جب گلستان وطن میں آزادی کی بہار آچکی تھی، سارا چمن غنچوں اور پھولوں سے مہک اٹھا تھا، ہر شاخ پھولوں سے لدی ہوئی ہے، ہوا کے نرم جھونکوں سے پھول شاخوں پر مست شرابی کی طرح جھوم رہے ہیں ہر طرف بہجت وسرور کا سماں ہے لیکن اس بہار پر کس کی اجارہ داری تھی، یہ سارے پھول کس کے بستروں کی زینت تھے یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں، اور آدھی صدی کے بعد بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ پھول کس کے لئے اور کانٹے کس کے دامن میں ہیں اسی ماحول میں کلیم اپنی غزل سنا رہے ہیں۔

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا ❁ تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
گو ستم نے تیرے ہر اک طرح مجھے ناامید بنا دیا ❁ یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دکھا دیا
کوئی بزم ہو، کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے ❁ جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں ❁ ترے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا

یہ خراب جس کے لئے ہوا اسی بے وفا نے بھلا دیا ۞ یہ غریب عاجز بے وطن یہ غبار خاطر انجمن

کلیم کا غمناک ترنم، گلے کا سوز، آواز کا درد اور ہر شعر کے اندر چھپی ہوئی سوز غم کی حرارت نے دلوں کو ہلکی آنچ دے کر آنکھوں سے آنسو جاری کر دیئے اور بزم مشاعرہ ماتم کدہ بن گئی۔

کلم عاجز کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں عروس غزل دہرے لباس میں آتی ہے اوپر کا لباس خالص ریشمی، رنگ بہت شوخ اور چمکیلا ہوتا ہے جیسے بنارسی زری کی سنہری چادر جس پر سونے کے تاروں سے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں لیکن جب یہ حسین چادر علیٰحدہ کر دی جاتی ہے تو اندر کا لباس لہولہان، خون کے بڑے بڑے دھبے اور کہیں رستے ہوئے زخموں سے چپکا ہوا نظر آتا ہے جیسے پورا جسم زخموں سے چور ہے، یہ کربناک منظر دیکھ کر ہر آنکھ نم ہو جاتی ہے، دل دھڑکنا بھول جاتا ہے اور آنکھیں سیلاب اشک بہانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، بطور مثال صرف ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں غزل جو تصوراتی منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ ایسا ہے جو جذبات میں آگ لگا دیتا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ کوئی الھڑ پیکر حسن وشباب نشۂ جوانی میں مستانہ وار اپنے حسن وشباب کی قیامت خیزیوں کی نمائش کر رہا ہے اور دعوت نظارہ دے رہا ہے، الفاظ یہی کہتے ہیں کہ، انداز بیان کی شوخی اسی کی غمازی کرتی ہے، لیکن کلیم عاجز کا ہرگز یہ مقصد نہیں، ان کا محبوب آزاد ہندوستان ہے اور اس کے ظالم وجابر حکمراں جو انصاف وقانون کو پیروں سے روندرہے ہیں ظلم وستم ان کا شعار بن چکا ہے نفرت کا زہر پورے وطن میں پھیلا کر ایک طبقہ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے دشمنان امن وانصاف ملک کی دولت کو بے محابا لٹاتے ہیں، اور خود لوٹتے ہیں کروڑوں اور اربوں کے کھیلے کرتے ہیں اپنوں کو پہنچان کر نوازتے ہیں بے قصور انسانوں کی راہوں میں کانٹے بوتے ہیں کلیم انہیں کو ''پیارے'' ''دوست'' ''محبوب'' ''جاناں'' کے روایتی لفظوں سے یاد کرتے ہیں ان کی پوری شاعری میں کہیں بھی اردو شاعری کے محبوب کا گزر نہیں، نہ کہیں اس کی پرچھائیں نظر آئیں گی، انہیں انسانیت دشمن رویوں

کواستعاروں کی زبان میں پیش کرتے ہیں اس تفصیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ایک شوخ غزل کے اشعار دیکھئے

روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو ۞ اس ناز سے انداز سے تم ہائے چلو ہو
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو ۞ رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
پینا نہیں آتا ہے تو چھلکائے چلو ہو ۞ مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
تم کیا ہو؟ تمہیں سب سے کہلوائے چلو ہو ۞ ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
زلفوں سے زیادہ تم ہی بل کھائے چلو ہو ۞ زلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے
تم ہو کہ کلیم اپنی غزل گائے چلو ہو ۞ وہ شوخ ستم گر تو ستم ڈھائے چلے ہے

کلیم عاجز اپنا گھر بار لٹا کر ماں اور بہن کی شہادت کے کربناک منظر کو دیکھ کر دل پر غموں کا پہاڑ اٹھا کر بے وطن ہوئے لیکن فطری وقار، ذاتی شرافت، وضعداری، شائستگی، ان کے خمیر میں شامل ہے اور ہمیشہ ملحوظ رہی اپنے دشمن کے لئے بھی اپنی خاندانی شرافت وتہذیب کو فراموش نہیں کیا غیرت وخودداری ان کے خمیر میں شامل ہے وہ اسلام کے نام لیوا ہیں اس سرزمین پر بسنے والے عام مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مظلومیت وبے چارگی کی تمام قیامتوں سے گذرنے کے باوجود کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے وہ اپنے آباواجداد اور اپنے اسلاف کے اخلاق اور اسلامی تہذیب کے وارث وامین ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہماری قومی تاریخ عزت واقتدار کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے لیکن آج اقتدار کی کرسیوں پر وہ لوگ متمکن ہیں جو آداب حکومت سے ناواقف یک بیک پستی سے بلندی پر آ گئے ان کا لب ولہجہ غیرت وحمیت کو ٹھیس لگانے والا اور ہتک آمیز ہوتا ہے اس وقت جب ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو کبھی کبھی عام مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کچھ کہتے ہیں لیکن وہ انتہائی سنجیدگی اور نرم لب ولہجہ میں دشمن جانی کو دوست کہنا نہیں بھولتے، ارباب حکومت کو صرف باخبر کرتے ہیں کلیم عاجز کہتے ہیں:

ہم بھی اے دوست! کا ہد ار ہیں اپنے گھر کے ۞ اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اونچا کر کے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی جو ناقابل فراموش قربانیاں ہیں جن کے صدقہ میں آج ان کو تخت وتاج کی سرخ روئی نصیب ہوئی ان کا دور دور تک ذکر نہیں، کیوں کہ شریف انسان احسان کر کے جتلاتا نہیں، اپنی تمام قربانیوں کے باوجود اس کا صلہ نہیں مانگا، اور نہ اقتدار میں حصہ داری کا دعویٰ کیا بلکہ وطن کے لئے خود کو تباہ کر کے دوسروں کو سربلند کر دیا

ایک چلو بھی نہ اپنے لئے باقی رکھا ❁ غیر کو بخش دیئے ساغر و مینا بھر کے
ہم کو با ایں ہمہ پہنچان رہی ہے دنیا ❁ تاج گواوروں کے سر پر ہیں ہمارے سر کے
تم نے دیکھی ہی نہیں ہمت مردان وفا ❁ زندگی ہے تو دکھا دیں گے کسی دن مر کے
تم تو مصروف چراغاں تھے تمہیں کیا معلوم ❁ اس دیوالی میں دیئے بجھ گئے کتنے گھر کے
کیا کہیں پاس محبت انہیں اٹھنے دیتا ❁ یہ نہ سمجھو کہ بھکاری ہیں تمہارے در کے

کلیم کی ذہنی ساخت اور ان کے لب ولہجہ کی غمنا کی کی ایک مثال عربی تاریخ میں ملتی ہے عرب کی ایک شاعرہ خنساء کو اپنے بھائی مالک سے بے پناہ محبت تھی اتفاق سے مالک کی وفات ہوگئی، خنساء کے دل پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا دن رات کلیجہ توڑ توڑ کر روتی رہتی پھر اس نے اپنے بھائی کی موت پر ایک دردناک مرثیہ لکھا، یہ مرثیہ اس کی زندگی کا ایک عنصر بن گیا، کہیں بھی جاتی یہ مرثیہ پڑھتی، خود بھی روتی اور دوسروں کو رلاتی، اس نے اپنے درد وغم کی انتہاء بتاتے ہوئے اپنے مرثیہ میں لکھا ہے کہ جب میں کہیں بھی کسی کی قبر دیکھ لیتی ہوں تو سمجھتی ہوں کہ یہ میرے بھائی مالک کی قبر ہے اور بے اختیار رو پڑتی ہوں ہر طرف اس کو مالک کی وفات کا غم بکھرا ہوا نظر آتا کائنات کی ہر چیز میں اس کو اپنے درد وغم کی تصویر نظر آجاتی تھی اور اس کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں، زندگی بھر وہ صرف مرثیہ ہی لکھتی رہی، یہ اس کا وظیفۂ زندگی بن گیا، کچھ ایسا ہی حال کلیم عاجز کا بھی ہوگیا، ابتداءً تو ان کا المیہ ذاتی المیہ بنا رہا لیکن پھر دل کی یہ کیفیت ہوئی کہ اپنے گرد وپیش جن حالات وواقعات کو دیکھتے تو ان پر اپنے غم کی پرچھائیاں پڑتی نظر آتیں اور اس کا غمناک پہلو نگاہوں کے سامنے آجاتا ان حالات وواقعات

کے بیان میں بھی وہی غمناک لب ولہجہ پیدا ہو جاتا جو کبھی ان کو ذاتی المیہ کے ذکر کے وقت ہوتا تھا، مرور ایام ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے لیکن برسوں پہلے جو چوٹ لگی تھی جب پروائی ہوا چلتی ہے تو وہ چوٹ اُبھر آتی ہے، اسی طرح کلیم عاجز کا زخم مندمل ہو گیا مگر وقت اور حالات کی جب پروائی چلتی ہے تو دل میں ایک میٹھا میٹھا درد ضرور جاگ جاتا ہے، چونکہ ان کے المیہ کا وطن کی آزادی سے گہرا تعلق ہے، ان کی غم کی کہانی اور آزادی دونوں ایک ہی سال کی پیداوار ہیں بلکہ یہ حالات ہی آزادی کا پیش خیمہ تھے اور انھیں میں کلیم عاجز کا ذاتی المیہ بھی شامل ہے اس لئے جب وہ آزاد ہندوستان کے حالات وواقعات کو دیکھتے ہیں نئے حکمرانوں کا طرز عمل، ہزاروں فسادات، قتل وغارتگری لوٹ کھسوٹ کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تو ان کا دل درد سے بھر آتا ہے ان کے دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے اور دل کے پورے درد کے ساتھ ان حالات پر تنقید کرتے ہیں، اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہیں، اپنوں کی مظلومیت دیکھ کر تلملا جاتے ہیں تو شکایت بھی کرتے ہیں لیکن ان کی وضعداری کا یہ عالم ہے کہ اپنے لب ولہجہ میں کہیں تلخی نہیں آنے دیتے جب کہ اس طرح کے حالات میں جو انسان کی زندگی کو تاراج کر دیں کوئی بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھتا، وحشت وبربریت اور جبر وتشدد کا مظاہرہ کہ آدمی کو وطن سے بے وطن کر دے عزیز واقارب کو بیدردی سے قتل کر دیا جائے انسان میں غصہ، نفرت، انتقام کا جذبہ سخت اور درشت الفاظ کا استعمال بالکل فطری ہے لیکن کلیم عاجز کی پوری شاعری میں ہم کو کہیں جوش انتقام کے جذبات، نفرت وغصہ کا مظاہرہ نظر نہیں آتا، ہر جگہ اپنے قاتل کو پیار سے مخاطب کرتے ہیں، دوست کہتے ہیں، پیارے کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں، عجیب دل گردے کے آدمی ہیں، یہ ان کی طبعی شرافت ہے اگر کوئی کمینہ فطرت دشنام طرازی اور بدزبانی کرتا ہے تو ایک شریف اور وضعدار انسان خود وہ لب ولہجہ اختیار نہیں کر سکتا، گندے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا آزاد ہندوستان کے نئے نئے حکمراں آداب حکومت سے ناآشنا ان کا لب ولہجہ بسا اوقات اہانت آمیز اور رعونت بھرا ہوتا، کون ان کا مخاطب

ہے، وہ اپنے سماج میں کس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کی ان کو کوئی تمیز نہیں تھی ان کا انداز خطاب بسا اوقات غیرت وخودداری، فطری شرافت ووضعداری کا کلیجہ چھلنی کرنے والا ہوتا جو کسی کے لئے بھی ناقابل برداشت ہوسکتا تھا لیکن کلیم عاجز کو جب اس طرح کے اہانت آمیز رویہ سے سابقہ پڑتا تو ان کی فطری شرافت غصہ کا مظاہرہ کرنے میں حائل ہوجاتی ہے، اس کو جاہل بدتہذیب ظالم نہیں کہتے الٹے اس کو بڑی محبت سے دوست کہتے ہیں اور بہت نرم لہجہ میں صرف اتنا کہتے ہیں:

ہم بھی اے دوست! کُھدار ہیں اپنے گھر کے

آج تم اقتدار کی کرسی پر قابض ہو کل اس کرسی اقتدار کے ہم مالک تھے اس لئے تم کو اپنا لب ولہجہ اور رویہ بدلنا چاہئے، یہی وضعداری کلیم عاجز کی پوری شاعری میں نظر آتی ہے یہ بات تصنع سے نہیں آسکتی جب تک وہ خود انسان کی فطرت نہ ہو، دنیا تو اس فلسفہ زندگی پر یقین رکھتی ہے۔

کلوخ انداز را پاداش سنگ ست

مگر کلیم عاجز گالیاں سن کر بھی پھول برساتے ہیں کیوں کہ کائنات کے سب سے عظیم ومحترم رسول کا طرز عمل یہی تھا۔

کلیم عاجز کے اس شاعرانہ رویہ کو سمجھنے کے لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی کچھ مثالیں بھی بیش کردوں ان مثالوں پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ یقین کرلیں کہ کلیم عاجز کا محبوب اردو شاعری کا فرضی محبوب نہیں ہے ان کا محبوب اور مخاطب آزاد ہندوستان اور اس کے حکمراں ہیں بالخصوص وہ لوگ ہیں جنہوں نے فرقہ ورایت کا زہر پھیلا کر اس سرزمین میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کررکھی ہے، انہیں کو ''دوست'' یا ''پیارے'' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں کلیم عاجز کہتے ہیں:

کیا دن ترے ستم کے گذارے نہ جائیں گے ❁ بازی وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے

ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے ❁ دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے

تم تو بیدرد ہو بیتابیٔ غم کیا جانو ۞ اہل دل پر جو گذرتے ہیں ستم کیا جانو
شمع کیوں جلتی ہے سرتا بقدم کیا جانو ۞ ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ غم کیا جانو
تم سے ناحق ہے مجھے چشم وفا کی امید ۞ تم بھلا شیوۂ ارباب کرم کیا جانو

۞

رہے تو دونوں چمن میں مگر بہم نہ رہے ۞ خزاں میں تم نہ رہے تو فصل گل میں ہم نہ رہے

۞

میں محبت نہ چھپاؤں، تو عداوت نہ چھپا ۞ نہ یہی راز میں اب ہے نہ وہی راز میں ہے
پہلے سب کچھ مرے خلوتکدۂ شوق میں تھا ۞ اب تو جو کچھ ہے تری انجمن ناز میں ہے

۞

وہ تو بے درد ہے ایسا کہ بتائے نہ بنے ۞ دل وہ کمبخت کہ بے اس سے لگائے نہ بنے
کیا ستم ہے کہ وہ ظالم بھی ہے محبوب بھی ہے ۞ یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے

۞

زخم دل کا وہ نظارہ ہے کہ جی جانے ہے ۞ اتنا احسان تمہارا ہے کہ جی جانے ہے
مہرباں حال پہ ہیں آپ ہمارے جب سے ۞ تب سے وہ حال ہمارا ہے کہ جی جانے ہے

آزاد ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوئے، ہزاروں بے گناہ انسان مارے گئے، گھروں میں آگ لگا کر پھونک دیا گیا، پوری پوری آبادی کو لوٹ کر کنگال بنا دیا گیا، خواتین کی عصمت دری کی گئی لیکن آج تک وہ قاتل، لٹیرے، آتشزنی کرنے والے، عفت وعصمت کے لٹیرے نہ کہیں گرفتار کئے گئے نہ ان پر مقدمات چلے اور نہ سزا ملی، انصاف اور قانون کہاں چلا گیا، انصاف اور قانون دونوں مفلوج ہو کر اس لئے رہ گئے کہ مجرم سب اپنے تھے تباہ و برباد اور قتل ہونے والے غیر تھے اس لئے کوئی مجرم نہ رہا، لاقانونیت اور بے انصافی کی دنیا کی تاریخ میں یہ بدترین مثال ہے۔

کلیم عاجز نے دہلی کے ایک مشاعرہ میں پرائم منسٹر کی موجودگی میں ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر تو بیت الغزل تھا، کلیم عاجز نے پڑھا:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پر کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اتنا خوبصورت، تیکھا، دلوں میں پیوست ہونے والا طنز کلیم عاجز ہی کر سکتے ہیں، اس غزل کے چند اشعار اور بھی سماعت فرمالیں تو بات اور واضح ہو جائے گی، کلیم عاجز کہتے ہیں:

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو ۞ وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام ۞ پاس آ کے ملو، دور سے کیا بات کرو ہو

اگلے شعر میں بھرپور طنز ہے وہ تیر کے بہتر نشتروں میں بلاتکلف شمار کیا جا سکتا ہے:

ہم کو جو ملا ہے وہ تمہیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلادیں تمہیں؟ کیا بات کرو ہو

ظالم کے ظلم کو احسان کہنا بڑے ظرف کی بات ہے لیکن کلیم اپنے ذہن کے سانچے سے مجبور ہیں اس سانچے سے جو بات ڈھل کر نکلتی ہے نہ اس میں تلخی ہوگی نہ کڑواہٹ، نہایت کڑوی کسیلی حقیقت ہوگی لیکن کلیم عاجز کا لب ولہجہ شیریں اور شہد سے زیادہ میٹھا، البتہ اس طنز کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سے ذہانت ضروری ہے کلیم عاجز کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمالیں:

خدا کا شکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی ۞ ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیگی بے التفاتی چشم ساقی کی ۞ یہ شیشے، یہ سبو، یہ جام تو کم یاد آئیں گے

کلیم عاجز جانتے ہیں کہ پورے ملک میں فرقہ پرستی کا زہر پھیل چکا ہے، کوئی پاگل جنونی فرقہ پرست کوئی زہریلا بیان دے دیتا ہے فضا میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے، افواہوں میں ایک طبقہ خوف وہراس میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی بابری مسجد کبھی کشمیر کا مسئلہ کبھی دہشت گردی کا الزام، کبھی دینی مدارس کے خلاف قانون سازی کی دھمکی سینوں میں کانٹوں کی طرح چبھ جاتی ہے اسی ماحول میں زندگی گذرتی ہے اسی ماحول کو دیکھ کر کلیم عاجز کہتے ہیں:

تمہاری طرح زلفوں میں شکن والے نہیں ہیں ہم ۞ کہیں گے بات سیدھی، پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم
گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں بسر کی ہے ۞ ہیں اہل ناز، لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم

زندگی میں ہر طرح کے مرحلے آتے ہیں کبھی کبھی تو صبر وضبط کی طاقت جواب دے جاتی ہے لیکن کلیم عاجز کے لب ولہجہ کی نرمی ہر حال میں قائم رہتی ہے محبوب ستم شعار کو ہمدردانہ مشورہ دیتے ہیں ظلم وستم کے انجام سے ڈراتے ہیں اپنا رویہ بدلنے پر اصرار کرتے ہیں مگر بول میٹھے ہی رہتے ہیں کتنی دلسوزی سے کہتے ہیں:

جدا جب تک تری زلفوں کے پیچ وخم نہیں ہوں گے ۞ ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے
اگر بڑھتا رہا یونہی یہ سودائے ستم گاری ۞ تمہی رسوا سر بازار ہوگے ہم نہیں ہوں گے

میں کہاں تک مثالیں پیش کروں کلیم عاجز کی پوری شاعری اسی محور پر گردش کرتی ہے کیوں کہ خود انہیں نے اپنا مسلک، اپنا ذہن ومزاج انسان دوستی، انسانیت نوازی بتایا ہے، دوست دشمن کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھڑی کرتے کیوں کہ وہ جس قوم وملت کے فرد ہیں اس کی تعلیم ہی انسان دوستی باہمی رواداری ہے انھوں نے ایک شعر میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

پھر اس صورت حال میں ان کے لب ولہجہ میں سختی اور درشتی کیسے آسکتی ہے، ان کی پوری شاعری کو اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا انداز بیان غمناک اور درد سے بھرا ہوا ہے، لب ولہجہ کی غمنا کی، طریقۂ اظہار میں بلا کا سوز وگداز ہے جیسے کوئی بہت ستم رسیدہ شخص تھرتھراتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی روداد غم بیان کررہا ہے جو پتھر دل انسانوں کو بھی برف کی طرح پگھلا دے، پوری پوری غزل کبھی اسی سوز وگداز اور درد وکرب کی فضا میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور مسلسل غزل کی شکل اختیار کرگئی اور بیشتر غزلوں میں جب ان کو اپنا قصۂ غم یاد آگیا وہیں رقت قلب اپنا

کام کر گئی اور ان کا لب ولہجہ غمناک ہو گیا، اور سننے والوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ان کی یہ غزل دیکھئے:

مری شاعری میں نہ رقص جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ ونالہ ودرد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کی رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں
یہ میری زباں پہ غزل نہیں میں سنا رہا ہوں کہانیاں
کہ کسی کے عہد شباب پر مٹی کیسی کیسی جوانیاں
کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں میرے سوز دل کر حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں میرے آنسوؤں کی روانیاں

آزاد ہندوستان کے نئے حکمرانوں کی لاقانونیت بے انصافی ان کی عصبیت بھرے طرز عمل کی وجہ سے اس سرزمین پر بسنے والے ایک طبقہ کو کن کن قیامتوں سے گذرنا پڑ رہا ہے؟ کلیم عاجز کہتے ہیں:

ابھی اس کو اس کی خبر نہیں کہ قدم کہاں ہے نظر کہاں
ابھی مصلحت کا گذر کہاں کہ نئی نئی ہیں جوانیاں

ان کے لب ولہجہ کی غمناکی، اور ان کے اندرونی سوز وگداز کی ایک مثال اور بھی دیکھ لیجئے:

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوز دل کو ہوا نہ دے
یہی بس دعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے
یہ جو زخم دل کو پکائے ہم، لئے پھر رہے ہیں چھپائے غم
کوئی ناشناس مزاج غم، کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

کلیم عاجز بہر حال ایک خود دار اور غیرت مند آدمی ہیں گردن کٹ سکتی ہے جھک نہیں سکتی اس لئے اپنے سارے درد وکرب کے باوجود کرسی اقتدار پر بیٹھ کر

لفاظیاں کررہے ہو وہ برسوں ہمارے قدموں کے نیچے رہی ہے۔

تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدتوں میں رہا وہیں
میں گدائے راہ گذر نہیں، مجھے دور ہی سے صدا نہ دے

☆☆☆☆☆

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

مثالیں تو بہت سی ہیں، ان کا ایک شعر ان کے رویہ شاعری کو سمجھنے کے لئے کافی ہے جس میں خوبصورت الفاظ وانداز بیان کے ریشمی پردوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا ہے وہی شعر درحقیقت ان کی شاعری کا بہترین تعارف ہے، وہ کہتے ہیں:

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ٹپکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

کلیم عاجز کی ایک خصوصیت طنز بھی ہے آزاد ہندوستان کے قانون وانصاف سے نابلد حکمرانوں کے طرز عمل پر ان کی تنقید اور طنز بہت معنی خیز اور جاندار ہیں مگر یہاں بھی وہ اپنی وضعداری وشرافت اور لب ولہجہ کی نرمی کو فراموش نہیں کرتے، طنز کے لئے اتنا خوبصورت اور دلکش انداز بیان اختیار کرتے ہیں جیسے وہ پھول برسا رہے ہیں، لیکن پھول کی پنکھڑیوں سے وہ نیزوں کی انی کا کام لے رہے ہیں یہ انداز بیان ان کی درمیانی دور کی شاعری سے لے کر اب تک قائم ہے، مثلاً

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ ۞ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

☆☆☆☆

جو کچھ مجھے تکلیف ہے جو کچھ مجھے غم ہے ۞ سب آپ کی بخشش ہے عنایت ہے کرم ہے

☆☆☆☆

شکریہ ہے کہ میں احسان فراموش نہیں ۞ عمر بھر آپ کا بخشا ہوا غم یاد رہا

☆☆☆☆

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں ۞ چلنا ذرا آیا ہے، تو اترائے چلو ہو

☆☆☆☆

مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ ۞ پینا نہیں آتا ہے تو چھلکائے چلو ہو

☆☆☆☆

میں تری بلا سے اجڑ گیا، ترا حوصلہ تو نکل گیا
یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ یہ عید بھی ترے گھر ہوئی

☆☆☆☆

وہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ۞ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

کبھی کبھی کلیم عاجز مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں وہ اتنے شکستہ دل نظر آنے لگتے ہیں جیسے ان کے دل میں امید کی کوئی کرن نہیں، آزاد ہندوستان کی ترقیوں کے افسانے سنتے ہیں دوسری طرف اپنے جیسے لوگوں کی پژمردگی، افسردگی اور دل شکستگی، درد وکرب کی شکار زندگی، معصوم اور بے گناہ کے قتل کے واقعات، غیرت وخودداری کے پاکیزہ جذبات پر ہتھوڑے برسانے والے سانحے، زہر بونے والے لیڈروں کے بیانات پڑھتے اور سنتے ہیں تو ان کا دل چھلنی ہوجاتا ہے، دل میں کوئی امنگ باقی نہیں رہ جاتی ان کی افسردگی اور دل شکستگی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے ان اشعار کو پڑھئے اور ان کے شیشۂ دل کے چٹخنے اور چور چور ہوجانے کا اندازہ کیجئے:

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف تا بہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی
یہی بے کسی تھی تمام شب، اسی بے کسی میں سحر ہوئی
نہ کبھی چمن میں گذر ہوا، نہ کبھی گلوں میں بسر ہوئی
یہ پکار سارے چمن میں تھی، وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا، تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

کلیم عاجز کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ صلاحیتوں سے محروم، ادب و تہذیب سے نا آشنا، نہ گفتگو کا سلیقہ، نہ آداب حکمرانی سے واقف مگر وقت نے ان کو اقتدار کی اونچی کرسیوں پر بٹھا دیا ہے تو وہ شب و روز موج و مستی میں مصروف نظر آتے ہیں، دولت و حکومت کا نشہ، اقتدار کا غرور، سامان عیش و عشرت کی فراوانی نے ان کی ہر شب کو شب برأت اور ہر روز کو روز عید بنا دیا ہے، اور ہمہ وقت جشن مسرت برپا ہے، دوسری طرف اسی سرزمین میں بسر کرنے والے کچھ لوگ فرقہ واریت کی دہکائی ہوئی آگ میں جھلس رہے ہیں اور موت و زیست کے دوراہے پر بے یار و مددگار کھڑے ہیں ان کے مکانات دھواں اگل رہے ہیں ان کی اقتصادی و معاشی حالت کو درست کرنے کی کسی کو فکر نہیں، کلیم عاجز کہتے ہیں:

میخانے پر جب دیکھو، تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھروں میں آگ لگی ہے ان کے گھر برسات نہیں

شاید آپ کے علم میں ہو کہ موسم برشگال کی مرطوب ہوائیں جب چلتی ہیں تو شرابیوں کو نشہ کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے، جب ساون کے بادلوں کے فوارے کھل جاتے ہیں تو شراب کا نشہ شباب پر آ جاتا ہے، کلیم عاجز کتنے درد سے کہتے ہیں کہ یہ برسات جو ارباب اقتدار کو موج و مستی فراہم کرتی ہے وہی برسات اگر اس آبادی کی طرف مڑ جائے جہاں سماج دشمن عناصر نے آگ لگا رکھی ہے تو ان کے گھروں کی آگ بجھ سکتی ہے، موج و مستی تو بہت دور کی بات ہے ان کے سروں پر گھر کی چھت تو سلامت رہ جائے، کلیم کے یہاں ایسی مثالیں اور بھی ہیں لیکن کچھ زیادہ نہیں، کیوں کہ وہ رجائی شاعر ہیں قنوطیت پسند نہیں۔

یہ کلیم عاجز کی شاعری کا ایک سرسری اور اجمالی جائزہ ہے، کلیم ادیبوں اور شاعروں کی ہم نشینی اور ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر شاعر نہیں بنے بلکہ ان کو حالات اور ستمہائے روزگار نے از خود شاعر بنا دیا، اتفاقاً یہ حالات اس وقت پیدا ہوئے جب گلستاں وطن میں موسم خزاں کے آخری جھونکے چل رہے تھے، جو بہار کی آمد آمد کا

اعلان کرر ہے تھے، کلیم کی نو جوانی اور اسکولی تعلیم کا دور تھا کہ خزاں کے ان جھکڑوں میں آگ برسنے لگی، ان کا گاؤں، ان کے عزیز واقارب، پورا خاندان چہیتی ماں اور پیاری ننھی منی بہن سب اس آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے، ان کی پوری دنیا اجڑ گئی، وہ دنیا میں تنہا رہ گئے، چھ برس سکتے کے عالم میں گذر گئے پھر کلیم شاعر بن گئے، کربناک اور درد بھرے بول ان کی زبان سے نکلنے لگے جو غزل کی شکل اختیار کر گئے قدرت نے گلے میں سوز اور آواز میں درد بھر دیا تھا اس لئے جب وہ اپنی غزلیں سناتے تو خود روتے اور دوسروں کو بھی رونے پر مجبور کر دیتے، پھر آہستہ آہستہ یہ زخم مندمل ہوا تو آزاد ہندوستان میں پوری ملت اسلامیہ حکومت کے قہر وغضب کا شکار ہو گئی، اب کلیم کا ذاتی غم اجتماعی غم کی شکل اختیار کر گیا، اس لئے آزادی کے پورے دور کی ان کی شاعری تاریخ بن گئی جس میں واقعات کا تسلسل تو نہیں تھا، لیکن کیفیات کا تسلسل ضرور ہے، آج تک وہ تاریخ لکھ رہے ہیں، ان کی شاعری کامیڈی کبھی نہ بن سکی صرف ٹریجڈی ہو کر رہ گئی۔

کلیم کی شاعری کا دوسرا موضوع نعت رسول ہے، یہ آواز بھی ان کے دل کی آواز ہے ان کی بعض بعض نعتوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

زخم کھائے ہوئے سرتا بقدم آئے ہیں ❁ ہانپتے کانپتے یا شاہ اُمم آئے ہیں
سرنگوں آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں ❁ آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں
کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں ❁ شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

ان کی نعتوں میں بڑا سوز ہے پڑھئے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے ہیں نعتوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے، اگر کبھی موقعہ ہوا تو اس موضوع پر بھی گفتگو ہو گی۔

## آخری بات

کلیم عاجز کی شاعری روایتی شاعری سے قدرے مختلف ہے اس میں دلکشی اور

تاثر ہے، دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے دل ودماغ اس کے مضمرات اور اس کی زیریں سطح کی لہروں میں کھو جاتا ہے، الفاظ عام فہم، انداز بیان سیدھا سادہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست قاری کے جذبات تصورات اور ذہنی افکار پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے کمرے میں لگا ہوا ہیٹر کمرے کی فضا کو گرم کردیتا ہے، کلیم عاجز کی یہ تاثیر ہی ان کی مقبولیت کی بنیاد ہے، یہی وجہ ہے کہ شعر وادب کے معیار اور فنی نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں اور کوتاہیاں در آئی ہیں ان کی طرف نگاہ نہیں جاتی، یا کم جاتی ہے، کیوں کہ ان کی شاعری وقت کا راگ ہے، بھیرویں کی آواز سنتے ہی آدمی کھو جاتا ہے اس کے بول پر تحقیق وتنقید کی چھری چلانے کا کس کو ہوش رہتا ہے، ہمارے وطن کا ماحول فریاد وفغاں کی اس منزل پر آچکا ہے جہاں اس کے علاوہ کسی دوسرے نغمے پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

کلیم عاجز کی شاعری میں متروکات کا استعمال اتنی کثرت سے ہے کہ ان کی نشاندہی کی ضرورت نہیں انہوں نے دانستہ طور پر بالقصد میر کا انداز اپنانے کی کوشش کی ہے انہیں کا شعر ہے۔

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے ۞ کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

میر کے یہاں اس دور کے بہت سے الفاظ بالخصوص افعال کا تلفظ پایا جانا فطری ہے اب وہ سب کے سب متروک ہیں اور ان کا استعمال ناپسندیدہ قرار دیا جا چکا ہے لیکن میر کی غزلوں کی نشتریت نے ان لفظوں اور لب ولہجہ میں جادو کا اثر پیدا کردیا ہے اور جب اسی تلفظ میں میر کے اشعار پڑھے جاتے ہیں تو دلوں پر چرکہ لگاتے ہیں تاثیر کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے اگر ان کی جگہ فصیح الفاظ رکھ دیئے جائیں تو ان کی نشتریت فنا ہوجاتی ہے اور وہ اشعار ایک دم پھیکے اور بدمزہ ہوجاتے ہیں۔

دور جدید کے کئی شعرا نے میر کے انداز اور لب ولہجہ میں دو چار غزلیں لکھی ہیں لیکن ان لفظوں کا مخصوص تلفظ صرف انہیں غزلوں تک محدود رکھا ہے کہیں دوسری جگہ ان کا استعمال نہیں کیا ہے کیوں کہ بہرحال وہ غیر فصیح اور متروک ہوچکے ہیں، کلیم عاجز کے یہاں ان الفاظ کا استعمال کچھ زیادہ ہے میر کے مخصوص انداز اور لب ولہجہ والی

غزلوں میں تو یہ ناگوار نہیں گذرتا کیوں کہ یہ میر کی تقلید میں دانستہ طور پر لکھی گئی ہیں، لیکن ان الفاظ کا فصیح زبان میں لکھی جانے والی غزلوں میں طبیعت پر گراں گذرتا ہے اتفاق سے کلیم عاجز کی وہی غزلیں زیادہ مقبول ہوئیں جو میر کے لب ولہجہ میں ہیں مثلاً:

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ ❁ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں ❁ چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو
اندھیری شب میں نہیں صبح کے اجالے میں ❁ لٹا ہے تیرے غلاموں کا قافلہ کہیو

ان غزلوں میں قافیہ اور ردیف دونوں میر کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن انھیں الفاظ کا استعمال فصیح اردو میں لکھی جانے والی غزلوں میں قابل قبول نہیں ہوسکتا ہے جیسے کے میر کے دور میں ''کسی'' کی جگہ ''کسو'' کا استعمال تھا اگر آج کے دور میں کوئی استعمال کرے گا تو یقیناً نا قابل قبول اور ناپسندیدہ ہوگا، مثلاً:

کیا دوسروں کے چاکِ وقبا ورفو کی بات ❁ اپنے سوا نہ کیجئیو عاجز کسو کی بات

چونکہ یہ غزل میر کے تتبع میں نہیں ہے یہ لفظ گراں گذرتا ہے، ایسی بہت سی مثالوں میں سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں جو دور جدید کے معیاری شعر وادب کی زبان میں ہیں مگر انھیں غزلوں میں متروک الفاظ بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں جو کبھی میر کے زمانے میں مروج تھے لیکن آج وہ قطعاً متروک اور غیر فصیح مانے جاچکے ہیں اگر کوئی شخص شعر وادب کی مجلسوں میں یا عام گفتگو میں استعمال کرے تو تضحیک کا نشانہ بن جائے صرف چند اشعار پیش ہیں جب کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔

ادا ہمیں نے سکھائی نظر ہمیں نے دی ❁ ہمیں سے آنکھ ''چراؤ ہو'' بار دیکھو تو
دل ہی میں ہے ہرے بھرے پھولوں کا اک چمن ❁ ''جاؤ ہو'' ڈھونڈنے کو کہاں رنگ وبو کی بات
اک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے ❁ اس سے آگے کیا ''پوچھو ہو'' آگے کہا نہ جائے
ہر ایک ظرف برابر نہیں ہے اے بلبل ❁ جو آگ سینے میں ''رکھوں ہوں میں'' نہ تو رکھیو

کلیم عاجز کے مجموعہ کلام کا نام ''وہ شاعری کا سبب ہوا'' ہے اس کے سفر نامہ کا

شعر ہے۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل ''سناؤں ہوں'' اس لئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

ترقی پذیر زبانوں میں جدید الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں اور قدیم الفاظ اپنی جگہ چھوڑ جاتے ہیں خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں اہل زبان ان الفاظ کا استعمال ترک کردیتے ہیں اور غیر فصیح مانے جاتے ہیں، جیسے قدیم لباس بدل جاتے ہیں اگر کوئی آج سے پانچ سو برس پہلے استعمال ہونے والا لباس پہن کر نکلے تو پہننے والا تماشا بن جائے گا، کوئی شخص اس کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے گا بالکل یہی حال الفاظ کا ہے اگر میرؔ کے دور کے الفاظ آج کوئی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرے تو ہر شخص اس کا مذاق اڑائے گا، اس لئے بہتر یہی ہے کہ جن الفاظ کو اہل زبان وادب متفقہ طور پر خارج کرچکے ہیں ان کا استعمال ترک کردیا جائے۔

# تہذیب جدید کے کلیسا میں اکبؔر کی اذان

(''اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ'' کے عنوان سے ہونے والے ایک سیمنار کے لئے لکھا گیا)

خدا کے فضل سے اسلامی ہند پر کبھی بھی ایسا وقت نہیں آیا کہ کسی بھی ذہنی وفکری انقلاب کے وقت اسلام پس منظر میں چلا گیا ہو اور حق وصداقت کا سورج تہ بہ تہ کالی گھٹاؤں میں اس طرح روپوش ہوگیا ہو کہ اس کو دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں، اور نگاہوں میں یاس وناامیدی کے گہرے سائے لہرانے لگیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ کئی بار باطل اور اسلام دشمن کالی گھٹائیں طوفان بن کر آئیں لیکن شدت مقاومت کی تند وتیز ہواؤں نے ان کا رخ پھیر دیا۔

اِسلامی ہند کی تاریخ میں ہمیں دو حادثے ایسے ضرور نظر آتے ہیں کہ جب نیر اسلام پر کالے بادل جھوم کر آئے اور اس پر چھا گئے، اس کی کرنیں براہ راست زمین پر پڑتی ہوئی نظر نہیں آتی تھیں لیکن اس وقت بھی ایک ملگجا اُجالا ہر سمت پھیلا ہوا تھا مگر ہر منظر دھندلا گیا جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، ایک موقعہ تو وہ ہے جب مغل اعظم اکبؔر نے ''دین الٰہی'' کو حکومت کی سطح پر فروغ دینے کی کوشش کی مگر مجدد الف ثانی اور ان کے حلقہ بگوشوں نے تاریکیوں کا سینہ چیر کر دکھا دیا کہ سورج ہمارے سروں پر موجود ہے اور پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے کچھ بادل جہانگیر کے دور میں صاف ہوئے اور شاہجہاں کے زمانہ میں تو ساری گھٹائیں منتشر ہوگئیں اور اورنگ زیب کے عہد میں تو ایک لُکۂ ابر بھی آسمان پر نہیں رہ گیا۔

دوسرا واقعہ جو اسلامی ہند کی تاریخ بتاتی ہے وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے عروج واقتدار کے خاتمہ کے فوراً بعد کا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی دیمک کی طرح مسلمانوں کی عظمت واقتدار کے پرچم کو کھاتی رہی اور ۱۸۵۷ھ میں جب مسلمانوں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ پرچم ہی زمین بوس ہوگیا اور اب

اسباب وعلل کی دنیا میں اس کے دوبارہ سر بلند ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے پھر عیسائیت کی تبلیغ نے مایوسیوں کے اندھیروں کو اور گہرا کر دیا سارے دینی سر چشمے خشک ہوتے نظر آنے لگے اسلامی مدارس اپنا وجود کھو چکے ساری خانقاہیں ویران اور خرابے میں تبدیل ہو گئیں اسلامی راہوں کے مشعل بردار ایک ایک کر کے گرفتار کئے جا رہے تھے اور پھانسی کے تختے پر چڑھائے جا رہے تھے یا کالے پانی بھیجے جا رہے تھے۔

ان تمام نامساعد حالات کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام کا وجود مٹ گیا یا اس کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں یا اسلام پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا، خدا کے فضل و کرم سے ہندوستان پر ایسا وقت کبھی نہیں آیا جیسا کہ اکتوبر ۱۹۱۷ھ کے بعد سرزمین روس میں اشتراکی حکومت کی وجہ سے سمرقند و بخارا اور ازبکستان و تاشقند وغیرہ پر آیا۔

اس لئے اسلامی ہند میں ہمیں کوئی ایسا دور نظر نہیں آتا کہ اس دور کی جدوجہد کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لفظ سے تعبیر کریں، ہاں یہ ضرور ہے کہ باطل قوتوں نے اسلام کی راہ میں پہاڑ کھڑے کئے، سمندر حائل کرنے کی کوشش کی آگ اور خون کے دریا بہائے لیکن تاریخ کے ان خطرناک موڑوں پر اسلام کے جیالوں نے کبھی ہار نہیں مانی، پہاڑوں کو عبور کر گئے، سمندروں میں گھوڑے دوڑا دیئے، آگ اور خون کے دریا کو پایاب بنا لیا اور مخالف طاقتوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ع

یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

خدا نے ان کو سرخ رو رکھا، کامیابی اور ظفر مندی نے آگے بڑھ کر ان کے قدم چوم لئے فتح ونصرت نے ان کے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔

اسلامی تہذیب پر جدید تہذیب کی یلغار بھی اسلامی ہند کے لئے ایک ایسا ہی تاریخی حادثہ تھا، علماءِ اسلام اور زعماءِ ملت اس حملہ کو روکنے کے لئے کفن بردوش میدان عمل میں آئے اور صف بندی کی اور اس محاذ پر اس وقت تک ڈٹے رہے جب تک اس طوفان کا رخ انھوں نے نہیں موڑ دیا، انھیں صفوں میں ایک محاذ پر ہم کو اکبر الٰہ

آبادی بھی نظر آتے ہیں اور پورے محاذ کو تن تنہا سنبھالے ہوئے ہیں، طنز وتعریض کے تیر ان کی کمان سے اُڑ کر حریف کی صفوں میں پہنچتے ہیں تو ان کی صفیں تو نہیں ٹوٹتی ہیں لیکن ان میں ابتری اور ایک ہلچل ضرور مچ جاتی ہے، اکبر کا سب سے کارگر ہتھیار ان کی شاعری تھی انھوں نے اپنی شاعری سے وہ کام لیا جو کبھی میدان جنگ میں تیر و کمان سے لیا جاتا تھا۔

یہ وہ دور ہے جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس سرزمین سے اسلام کو مٹا دینے کا پلان بنایا تھا، باقاعدہ لندن پارلیمنٹ میں تجویز پاس کر کے ہندوستان میں پورے ساز وسامان کے ساتھ تبلیغ عیسائیت کی ایک طاقتور تحریک چلائی تھی اور مدبرین برطانیہ کا یہاں کے بارے میں فیصلہ تھا کہ تعلیمی ادارے کھول کر تعلیم کی راہ سے ایک ایسی قوم تیار کی جائے جو شکل وصورت کے لحاظ سے ہندوستانی ہو مگر ذہن ومزاج جذبات وخیالات کے اعتبار سے انگریز، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء سے ان کا مقصد محض فروغ تعلیم نہیں بلکہ اس ملک میں ایک ایسا ذہنی وفکری انقلاب برپا کرنا تھا کہ مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کی وجہ سے یہاں کی سرزمین پر اسلامی تہذیب کی جو گہری چھاپ نظر آتی ہے اس کو صفحۂ وجود سے کھرچ کر پھینک دیا جائے، ایک طرف پادریوں کی فوج مذہب کے نام پر عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھی، اور تمام سرکاری ملازموں کو پادریوں کے لکچر سننے پر مجبور کیا جارہا تھا، تو دوسری طرف تعلیمی ادارے قائم کر کے انگریزی تعلیم کے نام پر یورپین تہذیب سے مرعوب کیا جارہا تھا، اور خاص طور سے مسلمانوں کے لئے علی گڈھ میں سرسیّد نے جو مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا اس میں یورپین اساتذہ کو رکھ کر جدید تہذیب کی اشاعت اور فروغ میں ہر امکانی کوشش کی جارہی تھی، سرسیّد اپنے متعدد لکچروں میں برملا جدید تہذیب کی برتری اور اس کے فضائل ومناقب کو طلبہ کے سامنے بیان کرتے رہے اور اس سلسلہ میں بسا اوقات اسلامی تہذیب کا استہزا اور اس کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے رہے، ہر قوم اپنی مخصوص تہذیب سے پہچانی جاتی ہے اگر اس کی تہذیب مٹ جائے تو وہ قوم از خود

صفحۂ ہستی سے ایک دن مٹ جائے گی، سر سیّد کی تعلیمی مہم کے وقت اسلامی ہند اسی خطرناک موڑ پر تھا اکبؔر اسلامی تہذیب پر جدید تہذیب کی اس یلغار کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اور اس فتنے کی شدت کو محسوس کرتے تھے ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اس تحریک کا آخر میں جو انجام ہوگا وہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ جدید تعلیم کے منکر نہیں تھے لیکن نئی نسل کو جس نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی سر سیّد کوشش کر رہے تھے اس کو غلط اور ارتداد کا پیش خیمہ سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ سر سیّد اگر اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کی سرزمین سے اسلامی تہذیب وثقافت ہی نہیں مٹ جائے گی بلکہ خود اسلام کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا، مسلمان نام کی ایک قوم ضرور رہ جائے گی لیکن اس کے جسم سے اسلام کی روح نکل جائے گی، سر سیّد کی تحریک بظاہر تعلیمی تحریک ہے لیکن وہ اسلام دشمن رجحانات کے سائے میں چلائی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی سرزمین ایک دن اسلام کا قبرستان بن جائے گی۔

اکبؔر جدید وقدیم دونوں سے خوب واقف تھے وہ پرانی قدروں کی عظمت کے دیوانے تھے اور جدید تہذیب کو اس کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، انھوں نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور جدید تہذیب کی یلغار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا، وہ صوفی منش اور سیدھے سادے تصوف کے دلدادہ بزرگ تھے اس لئے ان کے الفاظ انگاروں کے بجائے طنز ومزاح کے لباس حریر میں دنیا کے سامنے آئے، اکبؔر کی شاعری صرف تفریح طبع اور احباب کی مجلس گرمانے کے لئے نہیں تھی، ان کا ایک ایک لفظ تہذیب جدید کی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج ہے، اظہار بیزاری ہے، اسلامی قدروں کی پامالی کا ماتم ہے، ان کی آواز صدا بہ صحرا بھی نہیں تھی، ان کی آواز غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر رؤساء امراء کی قلعہ نما حویلیوں اور محلوں تک پہنچتی تھی، اس دور میں اکبؔر کہہ سکتے تھے۔

اِذَا قُلْتُهٗ لم یمتنع عن وصولہٖ ۞ جِدَارٌ مُعَلًّی او خِبَاءٌ مُطَنَّبٗ

اخبارات ورسائل اکبر سے تقاضے کر کر کے نظمیں لکھواتے اور بڑے اہتمام سے ان کو شائع کرتے تھے پھر وہ اخبار ورسائل ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے عوام وخواص کی مجلسوں میں ان پر تبصرے کئے جاتے بحث ومباحثہ ہوتا اس طرح ان کی نظمیں ایک بڑے حلقہ کو متاثر کرتی تھیں خصوصیت کے ساتھ البشیر ، ید بیضا، رسالہ زمانہ کانپور، رسالہ مخزن لاہور، اودھ پنچ لکھنؤ، رسالہ پیامِ یار لکھنؤ وغیرہ میں اکثر شائع ہوتیں۔ اکبر اس وقت تک ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہو چکے تھے یہی وجہ ہے کہ ایک نظم جو نواب حیدر آباد کی فیاضی سے متعلق تھی اور سرسیّد کے مفید مطلب تھی تو انھوں نے اپنے رسالہ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں بھی شائع کی، اسی سے اکبر کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اکبر (ولادت ۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء) سرسیّد (ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء) سے ۲۹ سال عمر میں چھوٹے تھے لیکن جب سرسیّد نے علی گڈھ میں ۱۸۷۵ء میں کالج کھولا اس وقت اکبر ۳۰ سال کے ہو چکے تھے اس لئے علی گڈھ میں ہونے والی سرگرمیوں سے وہ عقل وشعور کی ساتھ واقف تھے اور جب علی گڈھ کی تحریک شباب پر آئی تو وہ ججی کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور سرسیّد کی وفات ۱۸۹۸ء کے بعد ۲۴ سال تک زندہ رہے اس لئے وہ سرسیّد کی عملی سرگرمیوں کے ابتدا سے انتہاء تک کے عینی شاہد تھے اور سرسیّد کے بعد اس تحریک سے وابستہ افراد نے جب سرسیّد کے مشن کو آگے بڑھایا اور اس پورے دور میں مسلمانوں کی جو نئی نسل تہذیب جدید سے آراستہ پیراستہ ہو کر نکلی اس کے جذبات خیالات، امنگوں اور ترنگوں کو بھی خوب دیکھا بھالا اور پرکھا اس لئے ان کی پوری شاعری تجربات ومشاہدات کی ترجمانی ہے جو دیکھا جو سنا جو محسوس کیا اور جیسا محسوس کیا اپنے مخصوص رنگ میں پیش کر دیا، یہ تو ایک حقیقت ہے کہ اکبر اپنی تمام زندگی میں سرسیّد کی حمایت نہ کر سکے اور ان کی سرگرمیوں سے ہمیشہ بیزار رہے ان کا تأثر تو یہ تھا۔

زلف نے پرتوِ دیں نام کو رہنے نہ دیا ❁ آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

یعنی تہذیب جدید نے اسلامی تہذیب کو شکست دیدی اور ایک مخصوص طبقہ کو اسلامی اقدار وثقافت سے بیزار کر کے تہذیب جدید کے سانچے میں ڈھال دیا، مسلمانوں کا متوسط طبقہ جو اس نئی روشنی میں نہا چکا تھا اس کی اندر اور باہر کی زندگی پر نئی تہذیب کی اتنی گہری چھاپ پڑ چکی تھی کہ اس کو کسی رخ سے اسلام کی نمائندہ شخصیت سمجھنا مشکل ہو چکا تھا۔

سر سیّد کا مطمح نظر صرف انگریزی حکومت کی نوکری تھی، ان کی ساری جدو جہد کی یہی معراج تھی اس کو مختلف انداز سے بیان کرتے تھے وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ مسلمانوں کی عزت رفتہ اسی طرح واپس ہوسکتی ہے وہ ملک میں باوقار اور شان وشوکت کی زندگی گذار سکتے ہیں لیکن اکبرؔ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح مسلمان صرف انگریزی اقتدار کو استحکام تو دے سکتا ہے لیکن خود عزت وقار کا مالک بن جائے ناممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ سڑک پر بیٹھ کر جو موچی گھوڑوں کی سُم میں نعل ٹھونکتا ہے وہ شہسوار کیسے ہوسکتا ہے اس کی نعل بندی سے صاحب کے گھوڑے کی رفتار تو ضرور شاندار ہوسکتی ہے لیکن یہ تو موچی کا موچی ہی رہے گا اکبرؔ کہتے ہیں

مسلمانوں کی خوشحالی کی بے شک دُھن ہے سیّد کو ❁ مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے
درستی تخت وعزت کی کہاں اب کیل کانٹوں سے ❁ توقع شہسواری کی نہ رکھو نعل بندوں سے

## نقطۂ اختلاف

اکبرؔ کی شاعری صرف شاعری نہیں تھی بلکہ نعرۂ جہاد تھی، ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم اور جدید تہذیب کے بہانے مسلمانوں کی رگوں میں الحاد کا انجکشن دیا جا رہا ہے وہ کہتے تھے کہ سر سیّد جدید تہذیب کے دیوانے ہیں اور مسلمانوں کو اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں جب کہ مسلمان تو انگریز ہونے سے رہے البتہ وہ مسلمان نہیں رہ جائیں گے سر سیّد سے اکبرؔ کا نقطۂ اختلاف صرف یہی ہے کہ وہ سر سیّد کی جدو جہد کو ملت اسلامیہ کی بدنصیبی تصور کرتے تھے وہ برملا اس کی مخالفت کرتے تھے، لیکن ان کے

اختلاف کرنے میں کہیں تلخی نہیں تھی، ان کے الفاظ اوران کے لب ولہجہ پھول کی طرح نرم ونازک ہے وہ پتھر چلانا جانتے ہی نہیں، وہ اپنے درد کا اظہار بھی ہنستے ہوئے کرتے ہیں اوراپنی داستانِ غم مسکراتے ہوئے سناتے ہیں، ان کے الفاظ اوران کے اپنے کچھ مخصوص الفاظ اوراستعارے مثلاً: ''مس'' یا ''میم'' سے گوشت پوست کی کوئی عورت نہیں بلکہ اس سے ہرجگہ ان کی مراد تہذیب جدید ہے، سرسیّد کے لئے پیر، مرشد، یا پیر طریقت کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسلامی ثقافت کی ترجمانی وہ لفظ ''شیخ'' یا ''واعظ'' سے کرتے ہیں، ان الفاظ کواستعمال کرتے ہوئے ان کے سامنے مفہوم کی ایک وسیع دنیا ہوتی ہے، وہ اپنی ایک نظم میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے یہ چاہے کہ وہ مسلمان بھی رہے اور جدید تہذیب کی برکتوں سے بھی فیضیاب ہوتو ایسا ناممکن ہے ''برق کلیسا'' کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے وہ اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہ یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ تہذیب جدید اسلام کی نفی کرتی ہے جب مسلمان اپنی شاندار روایات جاہ وجلال سے بھری ہوئی تاریخ اوراپنے آباواجداد کے قابل فخر کارناموں کوطاق نسیان بنادے اپنے ذہن سے اسلام کی عظمت وبرتری کے سارے نقوش کھرچ کر پھینک دے تبھی وہ تہذیب جدید کی حرم سرا میں باریاب ہونے کی اجازت پاسکتا ہے البتہ نظم کا پیرایۂ بیان واقعاتی اور بہت شوخ ہے، نظم شروع ہوتی ہے

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار ۞ ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید ۞ قدِ رعنا میں وہ چم خم کی قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں ۞ گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

پھر کئی اشعار میں سراپا بیان کیا ہے، رفتار وگفتار، حسن وجمال، انداز گفتگو، آواز کالوچ اور دلکشی بیان کرتے ہوئے رفتار کی فتنہ سامانیوں اورناز وانداز کی سرکشی کوایک نئی تمثیل سے بیان کیا ہے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں ۞ سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

پھر اکبرؔ اس سراپا قیامت کے بارگاہ حسن و جمال میں نذرانۂ محبت پیش کرتے ہیں ۔

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار ۞ دولت و عزت و ایماں تیرے قدموں پر نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے ۞ ساری دنیا سے میرے قلب کو سیری ہو جائے

اکبرؔ حسن کی بارگاہ میں جوش ولولہ سے بھرے ہوئے انداز میں دولت عزت ہی نہیں ایمان تک کا نذرانہ پیش کرتے ہیں لیکن حسن قبول کے بجائے اکبرؔ کو سننا پڑا، اکبر کہتے ہیں ۔

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی ۞ ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے ۞ بوئے خوں آتی اس قوم کے افسانوں سے

پھر اس نے طعنہ دینا شروع کیا یہ بڑے نمازی بنتے ہیں اور معصوم صورت نظر آتے ہیں یہی مسلمان سرحد پر بے تحاشا بے قصور انسانوں کا خون بہاتے ہیں اتنے تند خو اور وحشی ہیں کہ آگ میں کود جاتے ہیں اور توپ سے لڑ جاتے ہیں، مسلمانوں کی پوری تاریخ ہی خونیں افسانوں سے بھری ہوئی ہے وہ ناحق خون بہانے کو جہاد کہتے ہیں چودہ سو سالوں کی تاریخ خون سے لت پت ہے مجھے ایسی خونخوار قوم سے کیا لینا دینا اس کے اس کڑوے کسیلے جواب کے بعد شاعر نے اپنی پوری اسلامی تاریخ کی نفی کر دی اکبرؔ کہتے ہیں ۔

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح ۞ اب زمانہ پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ ۞ دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

شاعر کہتا ہے کہ اب نہ ہمارے نعرۂ تکبیر میں وہ زور ہے نہ جہاد کا کوئی تصور، ہم اپنے اسلاف کی ان تمام خصوصیات کو لوح دل سے کھرچ کر پھینک چکے ہیں اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ تہذیب جدید کے پیر مغاں سر سیّد کا مرید ہوں، اکبرؔ کہتے ہیں ۔

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد ۞ میں تو تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد

شاعر نے جب اس بت طناز سے پیر مغاں کا نام لیا اور دین و ایمان کی نفی کر دی

تو یک بیک رو یہ بدل گیا اکبرؔ آگے کی داستان سناتے ہیں ؎

مجھ پر کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں ۞ نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم ۞ تو نکالو دل نازک سے یہ شبہہ یہ وہم

میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اکبرؔ نے تمثیلی نظم سے یہ بتایا ہے کہ تہذیب جدید کے پرستار یورپ کی بارگاہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حاضری دیتے ہیں اکبر نے اپنی نظموں میں اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا ہے کہ سرسیّد کی نگاہیں یورپ کی تجلی گاہوں سے خیرہ ہو چکی ہیں وہ اس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تہذیب جدید جس طرح کے معاشرہ کی تشکیل کرتی ہے اس میں کوئی شخص اپنے دین ومذہب پر قائم ہی نہیں رہ سکتا، یہ نظم ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی ہے جب علی گڈھ تحریک شباب پر تھی اور پورے ملک کے اونچے طبقہ میں اس کی پذیرائی ہو رہی تھی اکبر بات یہاں سے شروع کرتے ہیں ؎

سیّد سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا ۞ چرچا ہے جا بہ جا ترے حال تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر وتدبیر کو خدا ۞ دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم وصلوٰۃ وزکوٰۃ وحج ۞ کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر ۞ بندہ بنا دیا ہے تجھے حُبّ جاہ کا

واعظ کی تلخ اور تند وتیز بات سن کر سیّد نے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کر دیا۔

اس نے جواب دیا کہ مذہب ہو یا رواج ۞ راحت میں جو مُخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

مذہب اگر دنیاوی عیش وآرام سے محروم کر دیتا ہے تو ایسے مذہب کی میرے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں ہے سیّد نے کہا آپ کبھی مسجد وخانقاہ سے باہر نکلے نہیں آپ کو کیا خبر کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں نے دنیا دیکھی ہے آپ سے کہیں

زیادہ باخبر ہوں میں نے یورپ کے حسن و جمال شان وشوکت کے جو نظارے دیکھے ہیں اگر آپ بھی دیکھ لیں تو مجھ سے بڑھ کر آپ اس کے دیوانے ہو جائیں گے اگر ان ہوشربا مناظر کو دیکھ کر اپنے دین و مذہب پر قائم رہ جائیں تو البتہ آپ کو مجھ پر اعتراض کا حق ہوگا، کاش آپ کو بھی یورپ کا سفر درپیش ہو اور میری طرح ان نظاروں کو دیکھیں جن کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہوں، اکبرؔ کی نظم آگے چلتی ہے ؎

یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر ۞ گذرے نظر سے حال رعایا وشاہ کا
وہ آب وتاب شوکت ایوانِ خسروی ۞ وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علوم جدیدہ کی روشنی ۞ جس سے خجل ہو نور رُخ مہر و ماہ کا

شان وشوکت کے ان نظاروں کے بعد اگر کسی یورپین فیملی میں جانے کا اتفاق ہو خود سپردگی اور پذیرائی کی قیامت خیز گھڑی سامنے آجائے دین وایمان سلامت بچالے جائیں تو آپ کے قدم چوم لوں، سیّد کہتے ہیں ؎

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ۞ کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز ودلفریب وگل اندام ونازنیں ۞ عارض پر جن کے بار ہو دامن نگاہ کا

اگر آپ کی تقدس مآبی روکے اور اس ''دعوت نشاط'' کی پذیرائی میں جھجک پیدا ہو تو ؎

رُکئے اگر تو ہنس کے کہے اک بُتِ حسیں ۞ ''دل مولوی! یہ بات نہیں ہے گناہ کا''

سیّد کہتے ہیں کہ آپ اگر اپنا جبہ ودستار ملوث ہونے سے بچالے جائیں تو ؎

اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام ۞ پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا

اکبرؔ بتاتے ہیں کہ آخر میں سیّد نے طنز بھرے لہجے میں واعظ سے کہا:

منبر پہ یوں تو بیٹھ گئے گوشہ میں اے جناب ۞ سب جانتے ہیں وعظ ثواب وگناہ کا

اکبرؔ یہی بتانا چاہتے ہیں کہ تہذیب جدید کے انھیں دلکش نظاروں نے سرسیّد کو وارفتہ مزاج بنادیا ہے۔

## متوسط طبقہ کی ذہنی کشمکش

علی گڈھ تحریک جب شباب پر تھی اور اونچے طبقہ کے ممتاز اور نمایاں افراد اس کی پشت پر تھے دوسری طرف دین و مذہب کا درد رکھنے والے اس تحریک سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں اس زمانہ میں میڈل کلاس ایک ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا ایک طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ علومِ جدیدہ کے فضائل ومناقب میں سر برآوردہ افراد رطب اللسان، سرکاری ملازمتیں اور روٹی روزی کا سوال بھی انھیں کالجوں سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں اور کالج کا بائیکاٹ کرتے ہیں تو مستقبل تاریک نظر آتا ہے اور معاش کا مسئلہ بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے مذہب رخصت ہو رہا ہے اور الحاد کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اسلامی تہذیب اور دین و مذہب کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کیا جا رہا ہے ان کو پرانی قدریں بھی عزیز تھیں ان کو بھی ترک کرنا منظور نہیں تھا، اور جدید تعلیم کے بغیر روزی روٹی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اس صورتِ حال کی وجہ سے وہ سخت ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا، ایک طرف دنیا ہے اور ایک طرف دین، دونوں اپنی اپنی جگہ اہم، اکبرؔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبرؔ ۞ تو صاف کہتے ہیں سیّد، یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں ۞ تو اپنی قوم مچاتی ہے شور، واویلا!
جو اعتدال کی کہیئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر ۞ زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

مسلمانوں کو انگریزوں کی ہر چیز سے نفرت ہے اور اس سلسلہ میں وہ نہایت متشدد ہیں، حتیٰ کہ جائز چیزیں بھی اگر انگریزوں کی طرف منسوب ہیں تو ان سے احتراز کرتے ہیں، اس تشدد کی انتہا یہ ہے کہ سرسیّد اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کے استاد عربک کالج دہلی کے صدر الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کو ایک بار ایک انگریز سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہونا پڑا تو جب تک اس ہاتھ کو صابن سے خوب دھو نہ لیا

اس سے دوسرا کام نہیں کیا، دوسری طرف نئی روشنی کے دلدادہ انگریزوں کی ہر قابل نفرت چیز کے استعمال کو بھی بذریعہ افتخار سمجھتے ہیں، حتی کہ اس سلسلہ میں انھوں نے حرام وحلال کی تمیز بھی اٹھادی ہے دونوں فریق اپنی اپنی انتہاؤں پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، اکبرؔ اسی صورت حال کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

اِدھر ہے ضد کے لیمنڈ بھی پی نہیں سکتے ۞ اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی! صراحیِ مے لا

اکبرؔ کی شکایت ہے کہ اہل اسلام اس صورت حال کو بدلنے کی کوئی مؤثر جدوجہد نہیں کرتے اور گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے ہیں دوسری طرف یورپ سے نئے نئے خیالات کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے اور آسمان لندن سے وحی پر وحی اترتی چلی آرہی ہے، اکبرؔ بتاتے ہیں ؎

اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک ۞ اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

اور بیچارا مسلمان

غرض دوگونہ عذاب است جاں مجنوں را ۞ بلائے صحبتِ لیلیٰ، وفرقت لیلیٰ

## تہذیب جدید وقدیم کا تصادم

اکبرؔ تہذیب جدید کو الحاد کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ نئی روشنی کے دلدادہ بتدریج اسلام کو خیر باد کہہ دیں گے کیونکہ نئی تہذیب کی دعوت دلکش اور خوبصورت لفظوں میں جاری ہے اور حالات بتارہے ہیں کہ مذہب پر جدید تہذیب کو بالادستی حاصل ہوجائے گی، اکبرؔ کہتے ہیں ؎

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو ۞ مس زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

حسینانِ فرنگ بال کٹواتی ہیں اور صرف کندھوں تک رکھتی ہیں، اور اس کو لہریہ دار بنواتی ہیں، کبھی کبھی سنہرے بالوں کی کوئی شوخ لٹ رخساروں پر آجاتی ہے چونکہ بالوں کے سرے پر تھوڑا سا خم ہوتا ہے اس لئے اس کی شکل اُردو حرف لام کی ہوجاتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاندی کی تختی پر سونے کے پانی سے حرف لام لکھ دیا گیا ہے

جو عارض تاباں کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے، اکبؔر کہتے ہیں کہ تہذیب جدید کی چمک دمک اور آب وتاب اچھے خاصے ایمان والوں کو دین سے منحرف کر دیتی ہے، اسی طرح کے ایک دوسرے شعر میں اسلامی تہذیب پر تہذیب جدید کی بالا دستی کا اعتراف کرتے ہیں ؎

زلف نے پر تو دیں نام کو رہنے نہ دیا ۞ آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

اکبؔر بہت ہی دل شکستہ ہو کر غم زدہ آواز میں کہتے ہیں ؎

پہن لے سایہ، مری جاں! اُتار کر پیشواز ۞ زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز

## دام ہمرنگ زمیں

اونچے طبقے کے کچھ لوگوں نے نیک نیتی سے دنیاوی ترقی کے لئے اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے لندن بھیجا لیکن وہ تعلیم کی ڈگری کے ساتھ ایک ''میم'' بھی اپنے ساتھ لائے، یہاں کے اسلامی ماحول اور معاشرہ میں اس کو پسند نہیں کیا گیا، طعنوں تشنوں کا سامنا ہوا تو نوجوان نے اپنی مجبوریوں کو بیان کیا کہ آپ نے مجھے دریا میں اتار دیا اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ پاؤں تر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اکبؔر یہ داستان سناتے ہیں ؎

اک بُت سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد ۞ اس بنا پرسُن رہا ہوں طعنہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم ۞ کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ ۞ ہو کے اب مجبور، خود اس راز کو کرتا ہو فاش

پھر اکبؔر نے نوجوان کی ذہنی کشمکش کو تفصیل سے پیش کیا ہے، نوجوان کہتا ہے کہ میری نئی نئی عمر، رگوں میں جوش شباب موج زن تھا، حسینانِ فرنگ کا ہر سمت جمگھٹا تھا، ایک سے ایک پری تمثال حور شمال زہرہ دشان فرنگ پرا جمائے ہوئے، ہر آنکھ میں دعوتِ شباب، ہر کام پر خود سپردگی کا انداز، دلکش اداؤں اور ساحرانہ نگاہوں کا مجھ پر جادو چل گیا اور میں رفتہ رفتہ ان کے دام گیسو میں گرفتار ہوتا چلا گیا حالانکہ مجھے اپنی قوم اپنی ملت کا پاس تھا، سخت ذہنی کشمکش کے باوجود میں خود کو روکتا رہا لیکن نشہ جوانی اور

جنون شباب عاقبت بینی پر غالب ہو گیا، ایسے ہوشربا ماحول میں
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا ❁ دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا ''دور باش''
دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا ❁ دل ہی تھا آخر، نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

نوجوان کی زبانی صورت حال کی عکاسی کے بعد اکبر نے اس کی نزاکت کو محسوس کیا اور دل میں کہا کہ سرسیّد مسلمانوں کی نوجوان نسل کو تعلیم کے لئے لندن بھیج کر تباہ کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

بار بار اکبر یہ آتا ہے مرے دل میں خیال ❁ حضرت سیّد سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردۂ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

## وہ صرف قوت فرمانروا کو مانتے ہیں

سرسیّد نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اس میں وہ اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے تھے وہ انگریزی حکومت کو رحمت خداوندی ثابت کرتے مسلمانوں پر اس کی اطاعت کو فرض کہتے، حدیث و قرآن کی من مانی تفسیریں بیان کرتے اور شرح کرتے اسلام کے درجنوں عقائد سے واشگاف لفظوں میں انکار کرتے تھے، انھیں اسباب کی وجہ سے دین پسند حلقوں میں سخت اضطراب تھا، اکبر بھی اس صورت حال سے واقف تھے رسائل واخبارات میں پڑھتے رہتے تھے، انھوں نے ایک نظم میں ان حقیقتوں کا اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

کہا کسی نے یہ سیّد سے آپ اے حضرت ❁ نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
نہ آپ عالم برزخ سے مانگتے ہیں مدد ❁ نہ فاتحہ نہ طریق دعا کو مانتے ہیں

پھر اکبر نے دنیا کے اہل مذاہب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سب اپنا اپنا ایک مذہبی تصور رکھتے ہیں، اپنے معبود کی عبادت کرتے ہیں اس سے دعائیں مانگتے ہیں اچھے بُرے وقتوں میں اس کو یاد کرتے ہیں حتی کہ انگریز جو اپنے کو عیسائی کہتے ہیں

اپنے سارے الحاد کے باوجود یہی عقیدہ رکھتے ہیں اکبر کہتے ہیں:

کرسچین بھی فدائی ہیں نام مریم کے ۞ بہ دل مسیح علیہ الثناء کو مانتے ہیں

مسلمانوں میں درجنوں فرقے ہیں اور سب اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا کو مانتے ہیں اور اس سے برے وقتوں میں مدد مانگتے ہیں اس سے دعائیں کرتے ہیں اکبر کہتے ہیں:

مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے ۞ کسی بزرگ کسی مقتدا کو مانتے ہیں

پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ ۞ نہ دست گیر، نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں

سرسیّد نے ان تمام باتوں کے جواب میں کہا کہ:

جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیروِ قرآں ۞ ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں

خدا کے سوا اور کسی سے مانگنا یا کسی کو وسیلہ بنانا شرک ہے۔

وہ بولے شرک ہی ہے جنگ و اختلاف کی جڑ ۞ تو عقلمند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں

اکبر سرسیّد کے جواب کو ذکر کرنے کے بعد اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہتے ہیں کہ سرسیّد کا جواب علمی بنیاد پر صحیح ہے لیکن درحقیقت یہ صرف ان کا دعویٰ ہے وہ خدا کو بھی نہیں مانتے صرف زبانی جمع خرچ ہے اس کا واقعیت سے دور کا تعلق نہیں، اکبر کہتے ہیں:

جواب حضرت سیّد کا خوب ہے اکبر ۞ ہم اس کے قولِ درست و بجا کو مانتے ہیں

ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر ۞ خدا کو، اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوتِ فرمانروا کو مانتے ہیں

## ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجئے

سرسیّد مسلمانوں کو جدید تعلیم کے ساتھ جدید تہذیب کو بھی دعوت دیتے تھے بلکہ تعلیم پر توجہ کم اور نئی روشنی سے گھروں میں اُجالا کرنے کی ترغیب زیادہ دیتے تھے مگر

مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کے ایک حلقہ میں مذہب سے شدید لگاؤ تھا اس لئے قدم قدم پر رکاوٹیں آتی تھیں اس صورت حال کے پیش نظر سر سیّد نے علی گڈھ تحریک سے وابستہ افراد کو کچھ اہم ہدایتیں بھی دے رکھی تھیں اور کہا کہ اگر ان پر عمل کرتے رہو گے تو مسلمان تم سے کبھی برگشتہ نہیں ہوں گے، تم مسلمانوں سے کہتے رہو۔

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم ۞ تحصیل ان کی بھی سحر وشام کیجئے
یورپ میں پھریئے لندن وپیرس بھی دیکھئے ۞ تحقیق ملک کا شغر وشام کیجئے
ہوجایئے طریقۂ مغرب پہ مطمئن ۞ خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجئے

بزرگوں سے عقیدت اور خانقاہوں کا تقدس بھول جایئے یہ سب توہم پرستی ہے کفر واسلام کی بحث کو لپیٹ کر رکھ دیجئے، وسیع المشرب بن کر رہئے، بس یہ دیکھئے کہ عزت وشہرت اور نام ونمود کیسے ملتا ہے شاندار بنگلے بنوایئے گھروں کو یورپین طرز پر سجایئے، وہسکی اور رم کا شوق بھی کچھ بُرا نہیں۔

یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہوجیۓ ۞ موقعہ ملے تو شغل مئے وجام کیجئے

اونچی سوسائٹی اور شائستہ ومہذب ملکوں میں بوس وکنار عیب نہیں تہذیب کی علامت ہے اس لئے ایسے مواقع پر دستِ تمنا کو دراز رکھئے زندگی میں رنگینیاں بھر دیجئے، سر سیّد کہتے ہیں:

نظارۂ مساں سے تر وتازہ رکھئے آنکھ
تفریح پارک میں سحر وشام کیجئے

سر سیّد کچھ راز کی باتیں ان کے کان میں کہتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ان کو گرہ باندھ لیجئے، اکبر بتاتے ہیں ؎

مذہب کا نام لیجئے، عامل نہ ہوجیۓ ۞ جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجئے
طرز قدیم پر نظر آئیں جو مولوی ۞ پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجئے
زنجیر فقہ توڑیئے کہہ کر خلافِ شرع ۞ مضمون لکھئے، دعوئے الہام کیجئے

آخر میں سر سیّد سب سے اہم نکتہ کی بات اپنے ہم نواؤں کو سمجھاتے ہیں:

جو چاہئے وہ کیجئے، بس یہ ضرور ہے
ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجئے

## سرسیّد کو مرید بنا ہی لیا

اکبر کہتے ہیں کہ سرسیّد تمام آزاد خیالیوں، کجراہیوں کے باوجود ایک پیر کے مرید ہو ہی گئے، لیکن وہ پیر و مرشد کون ہے اس کی نشاندہی اکبر کرتے ہیں:

پاؤں کو بہت چھٹکا پٹکا زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی ۞ تدبیر بہت کی اے اکبر، تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی
یورپ نے دکھا کر رنگ اپنے سیّد کو مرید بنا ہی لیا ۞ سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

## دباؤ سے چندہ:

سرسیّد نے علی گڈھ کالج کے لئے چندہ فراہم کرنے کی مہم شروع کی، امراء، رؤساء اور اونچے عہدہ داروں کو لے کر جہاں جاتے ممکن نہ تھا کہ کوئی انکار کر سکے، کالج کے نوجوان طلبہ کا گروپ بنا کر عوام میں بھیجتے یہ رئیس زادے شاندار لباسوں میں ملبوس اور پوری سج دھج کے ساتھ جہاں پہنچ جاتے مجال کیا کہ کوئی بیدلی سے پیش آئے، لوگ کچھ ذہنی دباؤ محسوس کرتے کہ اپنی اوقات سے کہیں زیادہ چندہ دے دینے ہی میں عافیت سمجھتے تھے دباؤ سے چندہ لینے کی اس مہم کو شاعرانہ انداز میں اکبر بیان کرتے ہیں:

دھمکا کے بوسہ لوں گا رُخ رشک ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب! دباؤ سے

## علی گڈھ کی بولی سب سے اونچی

چندہ کی اس مہم کو مدنظر رکھتے ہوئے اکبر نے مڈل کلاس کے لوگوں کے عام رجحان سے روشناس کراتے ہوئے کہا کہ علی گڈھ شاندار مستقبل کا سنہرا خواب دیتا ہے، عیش وعشرت کے طلسماتی محل میں باریابی کی بشارت دیتا ہے عزت ووقار کے ز

ریں تاج کے زیب سر ہونے کی پیش گوئی کرتا ہے ایمان کی خرید وفروخت کے مارکیٹ میں ایمان کی اتنی بڑی قیمت سوائے علی گڈھ کے اور کون دے سکتا ہے، اکبؔر کہتے ہیں:

ایمان بیچنے پہ تو سب ہیں تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڈھ کے بھاؤ سے

## نئی روشنی کا پیر نابالغ

علی گڈھ تحریک کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا اکبؔر اس کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہ اس تحریک کو ملتِ اسلامیہ کے لئے مضر سمجھتے تھے اس کی ہم نوائی کو ''کار خرد منداں نیست'' کہتے تھے کچھ لوگ اس تحریک سے علیٰحدگی پر ان کو طعنے بھی دیتے تھے اکبؔر ان کو جواب دیتے ہیں:

کہتے ہیں اکبؔر یہ تیری عقل کا کیا پھیر ہے ۞ طبع تری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ میں بھی حاضر ہوں گا عنقریب ۞ ہو چکا ہوں پیر، بس نابالغی کی دیر ہے

## کالج میں حوریں

لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم اور ان کو نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی مہم شروع کی گئی تو اس موقعہ پر اکبؔر نے کہا:

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں ۞ حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں
کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پردا ۞ ''تھینک یو'' دیر میں سننے کے لئے کان تو ہیں

حور وغلمان کی یکجائی سے کالج کسی جنت سے کیا کم رہ جائے گا، دل ونگاہ کی جنت علی گڈھ کالج میں لڑکیوں کی تعلیم کا نیا نیا نظم ہوا تھا کالج کا ماحول تعلیم وتربیت کا جو نظام تھا اس کے پیش نظر اکبؔر یہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ خاندانوں کی شرافت کا جو معیار تھا وہ باقی نہیں رہے گا عفت وعصمت کی یہ پیکر جن کے پاؤں کے تلوے بھی کوئی نگاہِ ہوس دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھی وہ ہوسناک نگاہوں کا شکار ہوکر رہ جائیں گی اگرچہ

آغاز کار میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن آزاد خیالی اور جدید فیشن ان کو بہت جلد اس مقام پر پہنچا دے گا جس سے کبھی خاندانی شرافت لرزہ براندام تھی اور وہ سب کچھ ہوگا جس کا آج اظہار کیا جا رہا ہے، اکبر اسی تشویشناک اور خطرناک حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں ۞ دلکش و آزاد خوش رو ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہوں گے پیش ۞ ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بیساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے ۞ ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ
اوج قومی سے شرافت کا ہما گر جائے گا ۞ ماکیاں سے پست تر دکھلائی دیے گی فاختہ

ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو آختہ

## حکومت کی سرپرستی

مسلمانوں کا معاشرہ ابھی اتنا بے حس نہیں تھا اس لئے علی گڈھ تحریک سے مذہب پر جوزد پڑتی تھی اس سے مذہبی جذبات رکھنے والے غیر تمند مسلمان تلملا جاتے تھے مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے حکومت کی سرپرستی ان کو حاصل تھی وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں کہیں کوئی ان کی زبان بند کرنے والا نہ تھا ایک جابر و قاہر حکومت کا ان کی پشت پر ہاتھ تھا اس صورت حال پر اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں طنز کیا، وہ کہتے ہیں:

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس ۞ ''کیسا احمق لوگ تھا'' پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے ۞ اور وہ کافر پکارے ''در پناہِ من بیا''

## الحاد کا انجکشن

اکبر نہ علوم جدید کے مخالف تھے اور نہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے بدگمان تھے بس ان کو یہ غم لاحق تھا کہ سرسیّد نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اور جو

نظام تعلیم وتربیت مرتب کیا ہے اور کالج کا جو ماحول بنایا ہے یہ اچھے خاصے دیندار گھرانوں کے سیدھے سادے اور شریف لڑکوں کو نہ بگاڑ دے وہ تو صحیح نیت اور نیک ارادوں کے ساتھ کالج میں داخل ہوئے ہیں وہ تعلیم حاصل کر کے معاش کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، وہ تعلیم کو اپنے مذہب اور اپنی قوم کی ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں وہ اپنی طبیعت کی پاکیزگی اور گھر کے دینی ماحول کی نظافت کی وجہ سے ہر طرف سے نگاہیں پھیر کر صرف تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن کالج کا ماحول اور اس کے انگریز پروفیسر ان کی دینی رگوں میں جو الحاد کا انجکشن دے رہے ہیں اس کا اثر ان کی زندگی میں ایک دن ظاہر ہو کر رہے گا، اکبر نے اپنی ایک نظم میں اپنی تشویش کا بڑے درد کے ساتھ اظہار کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

خدا علی گڈھ کے مدرسہ کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے
لطیف وخوش طبع چست وچالاک صاف پاکیزہ شاد وخرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت، دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے

اکبر پھر طلبہ کے ذوق وشوق اور تعلیم میں انہماک اور کمال محنت کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان میں مشرقیت کا پورا پورا اثر ہے مگر مغربیت کا رنگ ڈھنگ بتدریج ان میں آتا جا رہا ہے طلبہ کے سلیقہ وتہذیب، اخلاق اور وضعداری کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فیاض بھی ہیں اور ان میں قومی ہمدردی بھی ہے کالج میں پڑھنے والی زہرہ جبینوں کی برق پاش نگاہوں سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتے، ان میں قومی ہمدردی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ رئیس زادے پورے گروپ کے ساتھ عوام میں جاتے ہیں اور ان سے کالج کے لئے چندہ مانگتے ہیں، دست سوال دراز کرنے میں ان کو کوئی جھجک نہیں ہوئی اور نہ وہ اس میں اپنی توہین سمجھتے ہیں اور نہ اپنی عزت وشان اور اپنے وقار کے خلاف سمجھتے ہیں وہ صرف اس جذبے سے کام کرتے ہیں کہ اس سے قوم ومذہب کی سرخروئی اور سربلندی ہوگی، گھر اور خاندان کے ماحول کا یہ اثر

ہے کہ کالج کی سرگرمیوں کو قوم و مذہب کا کام سمجھ کر خلوص دل سے انجام دے رہے ہیں، اکبؔر طلبہ کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے، اکبؔر حال سے نہیں مستقبل سے خائف ہیں وہ طلبہ کی ان تمام سرگرمیوں کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہیں، مگر انجام کیا ہوگا؟ اکبؔر کہتے ہیں:

انھیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی، اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان کالج کے سب مکیں ہیں، ابھی انھیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر، ہے کیسی منزل، ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں، کوئی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق، ادائے طفلی، یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب، سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو دین وملت، نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبؔر کی التجا ہے، جناب باری میں یہ دعا ہے
علومِ حکمت کا درس اُن کو، پروفیسر دیں، سمجھ خدا دے

## نیچریت

سرسیّد اپنی تقریروں اور اپنے مقالوں میں، بالخصوص اسلامی تہذیب وثقافت کی تردید کے دلائل میں نیچر کا لفظ بکثرت استعمال کرتے تھے مسلمانوں کے بہت سے طریقوں، عقیدوں، اصولوں اور روایتوں کو نیچر کے خلاف کہتے اور اس کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے، لفظ نیچر کا استعمال اتنی کثرت سے انھوں نے کیا جیسے مذہبی احکام کو نیچر کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، جب شرعی دلائل کا جواب ان سے نہیں بن پڑتا تھا تو اس کو نیچر کے خلاف کہہ کر رد کر دیتے تھے، نیچر کا لفظ سنتے سنتے لوگوں کے کان پک گئے اس لئے کچھ ہی دنوں کے بعد سرسیّد اور ان کے ہم نواؤں کا ''نیچری''

علم ہوگیا، دینی حلقوں اور اسلام پسندوں کی محفلوں میں وہ اسی لفظ سے یاد کئے جاتے تھے اکبؔر کہتے ہیں کہ نیچریت درحقیقت لباس اور جدید فیشن اختیار کرنے اور ظاہری تبدیلیوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ الحاد کی دعوت ہے، اکبؔر نے دو مصرعوں میں اس کو بیان کردیا ہے:

نیچریت چیست؟ از دیں گم شدن
نے قمیص وکوٹ وپتلون وبٹن

## وعظ نیچر

سرسیّد نے کالج کے چندے کے لئے بہترین مقررین کی ایک ٹیم بنائی تھی ان میں بعض مقررین کا انداز بیان اتنا ولولہ انگیز ہوتا تھا کہ توقع سے زیادہ چندہ ہوجاتا تھا ڈپٹی نذیر احمد اس فن کے ماہر تھے سرسیّد اکثر ان کو اپنی ٹیم میں شامل رکھتے تھے ان کی دھواں دھار تقریروں کے سامنے کوئی زبان نہیں کھول سکتا تھا، اکبؔر کی نگاہوں نے بھی یہ مناظر دیکھے تھے، ان تقریروں کو سن کر کیا تاثر ہوتا تھا اکبؔر اس کو بیان کرتے ہیں:

کیا زور تھا وعظ نیچر میں، دیوتاؤں کا بھی جی چھوٹ گیا
تقویٰ کی بنائیں ہوگئیں شق، شیرازۂ ملّت ٹوٹ گیا

سرسیّد اور ان کے ہم نوا یہ سمجھ رہے تھے یا کم از کم یہ سمجھا رہے تھے کہ اصل دین کی خدمت ہم انجام دے رہے ہیں، اگرچہ وہ دین کا نام تو کم لیتے تھے لیکن قومی خدمت کا ڈھنڈورہ خوب پیٹتے تھے اور مسلمانوں کو یہ باور کرا رہے تھے کہ قوم خوشحال ہوگی اور ترقی کرے گی تو دین بھی ترقی کرے گا اکبر ان جھوٹی طفل تسلیوں کو سن کر جل بھن کر کہتے ہیں:

بزرگان ملت نے کی ہے توجہ ۞ کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقیِ دیں ہوگی اب روز افزوں ۞ علی گڈھ کا کالج ہے لندن کی مسجد
لندن نے اپنی ایک امت بنائی ہے علی گڈھ کا کالج انھیں امتیوں کی مسجد ہے

جدید تہذیب کی پرستش کرنے والے لندن کو قبلہ بنا کر یہاں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

## نیچریوں کی رعونت

علی گڈھ سے ڈگریاں لے کر نکلنے والے عہدوں پر سرفراز کئے جاتے رہے لاٹ بہادر کے دربار میں بار پانے لگے انگریز افسران کی چاپلوسی کرکے ان کی نظر عنایت اپنی ظرف مبذول کرانے میں وہ کامیاب ہورہے تھے، عام مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا معیار زندگی بلند ہوتا جارہا تھا، سماج میں وہ اب امتیازی حیثیت کے مالک بنتے جارہے تھے، عوام سے ان کا ملنا ان کے لئے توہین کا باعث تھا وہ مسلم سماج سے کٹ کر علیحدہ زندگی گذرانے اور جدید تہذیب کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کو اپنی انتہائی کامیابی سمجھتے تھے، اب ان کا دماغ آسمان پر رہنے لگا۔ مذہب کی خوبو ان کی زندگی سے نکل چکی تھی اب اگر دین پسند افراد ان لوگوں کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرتے تو ان کے دماغ کا پارہ اوپر چڑھ جاتا، علماء ومشائخ کا ذکر انتہائی حقارت سے کرتے جیسے وہ حشرات الارض ہیں اور پاؤں سے مسل دینے کے لائق ہیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اب ذہنی وفکری ارتداد اور الحاد کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا، اکبر اس ذہنی انقلاب کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے مشاہدات کو اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابل تو وہ فرعون صفت بن جاتے ہیں اور جب انگریزوں کا سامنا ہوتا ہے تو چپراسیوں کی طرح ''جی حضور'' ''جی سرکار'' کہکر کمر تک جھک جاتے ہیں، اکبر کہتے ہیں:

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جایئے ۞ غیر کا جب سامنا ہو، بس قلی بن جایئے
فلسفہ الحاد کا کرلیجئے فوراً قبول ۞ دین کی ہو بات، تو ابطال پر ٹھن جایئے

## نئی روشنی کے بہروپئے

جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مذہب کو فٹ بال کی گیند بنا رکھی تھی اپنی تقریروں میں

آنسو بہا بہا کر قرآن پڑھتے، مسلمانوں کی پستی و ادبار کا رونا روتے، ایسا محسوس ہوتا کہ دین اور قوم کا جتنا درد ان کے سینوں میں ہے پوری قوم اس سے محروم ہے، قرآن ہی سے انگریزی حکومت کے فضائل ومناقب بیان کرتے، مسلمانوں کو اسلام سے دوری کا طعنہ دیتے اور اپنی قومی و دینی خدمات اور اپنے اخلاص کا اظہار کرتے کیونکہ ان سے کالج کے لئے چندہ لینا ہے اور جب مسلمانوں کی جیب کاٹ کر واپس ہوتے اور وہ کسی دینی مجلس میں بلائے جاتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ اسلامی اقدار کی محافظ یہ جماعت اتنی حقیر وذلیل ہے کہ اس کی مجلس میں شمار ہونا بھی ان کے لئے اپنی شان کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اکبرؔ کہتے ہیں:

چندے کی محفل میں پڑھے روکے قرآن مجید ۞ مذہبی محفل میں لیکن، مثل دشمن جایئے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت ۞ روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جایئے

## تہذیب جدید کے پیر طریقت

جدید تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے فروغ کی بات تو کبھی نہیں کرتا تھا لیکن قومی ترقی قومی ہمدردی کا مظاہرہ ہر محفل میں کرتا تھا، اس حُب قومی کے نام پر وہ سیدھے سادے مسلمانوں کا استحصال کرتے تھے عام مسلمانوں سے اس نام پر چندے لیتے اپنی شان وشوکت میں اضافہ کرتے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے اور اُکسانے اور علی گڑھ تحریک کو منزل تک پہنچانے میں دل وجان سے لگے رہنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتے اور دین پسندوں پر طنز وتعریض کرنے سے کبھی بھی نہیں چوکتے تھے، اکبرؔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں:

کمر باندھی ہے یاروں نے جو راہ حب قومی میں ۞ وہ بولے تو نہیں چلتا، وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر ۞ یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا
لطیف الطبع ساتھی چاہئے فیاض طینت کا ۞ چمن سے بے ہوا کے کارواں یونہیں چلتا

جب چندوں کی فراوانی ہوگی کالج میں دولت کا انبار آئے گا تبھی کالج کے

پروفیسروں اور طلبہ کی شان وشوکت کا مظاہر ہوگا اور یہاں سے لطیف الطبع افراد جو ہر طرح کے دقیانوسی خیالات سے مبرا اور فرسودہ عقائد سے بے تعلق ہوں تعلیم حاصل کر کے عوام میں جائیں گے جدید فیشن اور جدید تہذیب کے مظاہر کے لئے دولت وثروت کا مظاہرہ کریں گے تبھی کالج کے ثمرات وبرکات سے عوم متاثر اور مرعوب ہوں گے، چمن میں بادصبا نہیں چلے گی تو پھولوں میں لاکھ خوشبو ہو صحن چمن سے یہ خوشبو باہر نہیں جائے گی۔

## غلامانہ ذہنیت

سرسیّد کو ترقی پسندی کی دھن میں مسلمانوں کے ہر طریقہ کار سے جیسے ضد سی ہوگئی تھی کئی صدیوں سے ہندوستان میں مسلمان حکمراں رہے جس کی وجہ سے یہاں جمعہ کا دن ہفتہ میں چھٹی کا دن سمجھا جاتا رہا ہے بازاروں مدرسوں اور سرکاری دفاتر میں چھٹی کا دن جمعہ ہر جگہ رائج تھا اس پر برادرانِ وطن نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں عیسائیت کی تبلیغ زور شور سے کی اور کچھ لوگ عیسائی ہو بھی گئے تو عیسائیوں کے نزدیک اتوار محترم دن تھا اس دن چرچ میں حاضری ہوتی تھی، انھوں نے مسلمانوں کے محترم دن جمعہ کو شکست دے کر حکومت کے دفاتر میں اتوار کی چھٹی قانوناً جاری کرادی اور جمعہ کی چھٹی کالعدم ہوگئی، سرسیّد چونکہ انگریزی حکومت کی ہر ادا کے پرستار تھے اس لئے انھوں نے بھی بے چون و چرا تسلیم کرلیا اور کالج میں جمعہ کی چھٹی کے بجائے اتوار کی چھٹی کا اعلان کردیا گیا اس طرح سرسیّد مسلمانوں کو نفسیاتی ایذا پہنچانے میں عیسائیوں کے شریک کار ہوگئے، اکبؔر کہتے ہیں:

مرشد نئی روشنی کا ہے قابلِ قدر ۞ تزئین بھی خوشنما ہے تنویر کے ساتھ
طالب جمعہ کا لیکن اس سے رہے دور ۞ اتوار لگا ہوا ہے اس پیر کے ساتھ

## پنشن یافتہ نبی

سرسیّد نے صرف جدید علوم کی تعلیم کے لئے کالج نہیں کھولا تھا بلکہ تعلیم کے ساتھ تہذیب جدید کی بھی تبلیغ کرنی تھی، ورنہ مذہبی بحثوں کے چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی انھوں نے تہذیب الاخلاق رسالہ کے ذریعہ جمہور امت کے متفق علیہ اصولوں پر تنقید کی چھری چلائی، احادیث کے نئے نئے معنی تراشے اور اگر کوئی تاویل نہ ہو سکی تو بخاری و مسلم ہی کی حدیث کیوں نہ ہو اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا، اپنی تعلیمی مہم ہی کے دوران قرآن کی تفسیر لکھنے کی ان کو سوجھی، بائبل کی شرح لکھنے میں مصروف رہے، ایک کالج چلانے کے لئے چندوں کی جو مہم چلائی تھی وہ کافی تھی یہ چومکھی لڑائی چھیڑنے کا کیا مقصد تھا؟ مسلمانوں کے مذہب اور شریعت اور اسلامی نظام زندگی کو نشانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کو متاثر کیا اور باقاعدہ اسلام پسندوں کے خلاف محاذ کھول دیا، ان کا کوئی لکچر، ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں اسلام کی تنقیص کا کوئی پہلو نہ ہو، مسلمانوں کی تہذیب وثقافت پر اعتراض نہ ہو، ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اسلام کو ماڈرن بنانے کا کوئی منصوبہ لے کر میدان عمل میں آئے ہیں، اکبر کہتے ہیں کہ سرسیّد پہلے کار نبوت انجام دے رہے تھے لیکن اب ریٹائر ہو کر پنشن پا رہے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا کی مذہبی تاریخ میں ہمیں کوئی ایسا نبی نہیں ملتا جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن پائی ہو، اکبر کہتے ہیں:

عقل سیّد بود از انوار حکمت یافتہ ۞ زور بازویش عدورا پنجہا بر تافتہ
مشکلے در پیش ہست، اورا اگر گویم نبی ۞ از انبیاء ہرگز کسے نگذشت پنشن یافتہ

سرسیّد حکمت وفلسفہ سے بھری ہوئی باتیں کرتے ہیں کہ ان کے جواب میں اہل اسلام کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے اور اس بلند مقام سے باتیں کرتے ہیں جس مقام پر کبھی انبیاء فائز ہوا کرتے تھے۔

## مقام حیرت

اکبؔر کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یورپین اقوام بھی وہ کتابیں وہی نصاب پڑھتی ہیں جو سر سیّد کے کالج میں رائج ہے لیکن آج تک کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ اس تعلیم کی وجہ سے یورپ کے لوگ اپنے مذہب سے دور اور ملحد و بددین ہوگئے اور اپنے مذہب مسیحیت کے خلاف انہوں نے مورچہ بندی کی ہو وہی نصاب اور وہی کتابیں سر سیّد اپنے کالج میں پڑھواتے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل اس نصاب کو پڑھ کر اسلام سے برگشتہ ہوجاتی ہے اور اسلام کی جڑ بنیاد کھودنے کی درپے ہوجاتی ہے آخر اس میں کیا راز ہے، اکبؔر کہتے ہیں:

درس تھا یکساں مگر وہ تو مسیحی ہی رہے ۞ تجھ پہ مذہب کے عوض شیطاں کا قابو ہوگیا
ایک ہی بوتل سے پی ہوٹل میں دونوں نے شراب ۞ لطف مستی اُن کو آیا، اور تو اُلّو ہوگیا

## چڑھاوے کا پھول

اکبر کہتے ہیں کہ سر سید انگریزی حکومت کو ’’ظل اللہ فی الارض‘‘ کہہ کر مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی اطاعت کو واجب کہتے ہیں اور مانتے ہیں اور خود اس کا مکمل وفادار ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں ان کا مقصد مسلمانوں کی نئی نسل کو نئی تہذیب جدید کی تبلیغ صرف اس لئے ہے کہ ’’آقایان ولی نعمت‘‘ کی خوشنودی حاصل ہو ان کی نظر عنایت ہم پر زیادہ ہوجائے، اکبر کہتے ہیں کہ جس طرح صاحب کے خانساماں اور بیرے نوکر چاکر صاحب کی میز سجاتے ہیں تو سب سے پہلے تازہ پھول کا گلدستہ میز پر رکھتے ہیں خوش منظر گلدانوں کو دیکھ کر صاحب کی طبیعت تازگی وفرحت محسوس کرے گی تو ہماری خدمت کو حسن قبول حاصل ہوجائے گا سر سید بھی انہیں کی طرح صاحب کی میز کے لئے گلدستے سجاتے ہیں علی گڈھ کالج درحقیقت ایک گلدان ہے جس میں مختلف طبقات کے مسلمانوں کو پھولوں کی جگہ باندھ کر صاحب کے

سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ ان کی نظر عنایت حاصل ہوتی رہے، اکبر نے ایک قطعہ میں یہ بات کہہ دی ہے۔

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے　　مضمون لطیف، خوب برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علی گڈھ کالج　　گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہیے

## مالک اور نوکر

اکبر کہتے ہیں جب رئیس گھرانوں میں خانساماں، بیرے اور نوکر چاکر رکھے جاتے ہیں تو اونچی سوسائٹی میں استعمال ہونے والی اشیاء کے نام بتائے جاتے ہیں ان کی شناخت کرائی جاتی ہے ہر چیز پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے، لب ولہجہ کو سمجھنے کی ان کو ٹرینگ دی جاتی ہے تا کہ ضرورت کے وقت ان سے صحیح ڈھنگ سے کام کی توقع رکھی جائے، گنوار پن کا مظاہرہ نہ کرسکے انگریز اپنی زبان ہندوستانیوں کو اسی حیثیت سے سکھاتے ہیں کہ ہماری صحیح طریقہ سے خدمت انجام دے سکیں علی گڈھ کالج کا واحد مقصد یہی ہے۔

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زبان　　مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کی زباں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل وتمیز　　اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

## نوکری نہ ملی

علی گڈھ کالج کا مقصد دفتری کلرکوں کی کمی کو پورا کرنا تھا طلبہ کا بھی مقصد وحید سرکاری ملازمتوں کا حصول ہی تھا تا کہ زندگی فکر معاش سے آزاد ہوجائے ابتدائی دور میں کالج سے ڈگری لے کر نکلنے والوں کو ملازمتیں بھی ملتی رہیں، سرسید کو فخر ومباہات کا موقعہ حاصل ہوتا رہا اور علی گڈھ کالج کی شہرت ونیکنامی میں اضافہ ہوتا رہا، سرکاری نوکری نئی نویلی دلہن کی طرح ہر خاندان کی منظور نظر بن گئی، اور مسابقت کا جذبہ عام ہوتا گیا لیکن ان کی پیداوار ضرورت سے زائد ہونے لگی اور ملازمتوں کی جگہیں محدود

تھیں اب کوئی خوش قسمت ہی ہوتا تو اس کو سرکاری نوکری ملتی تھی اکبر کے سامنے یہ صورت حال تھی، وہ کہتے ہیں۔

قائم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی — خواہان نوکری نہ رہین طالبان علم
عہدوں سے آرہی ہے صدا ''دوردور'' کی — کالج میں دھوم مچ گئی ہے ''پاس پاس'' کی

نئی روشنی کے دلدادہ یہ طلبہ کالج کے ماحول اورفضا کی وجہ سے دین وشریعت سے آزاد ہو چکے تھے مذہب بیزاری ان کا مزاج بن چکی تھی وہ کالے انگریز بن چکے تھے اس لئے جب تک وہ کالج میں رہے ہمیشہ علماء ومشائخ اور دین ومذہب کا مذاق اڑاتے رہے، ماڈرن اوراپٹوڈیٹ بننے کے لئے کالج کی فضا میں ایسا کرنا ان کے لئے ناگزیر ہو چکا تھا، تہذیب جدید کی اس تجلی گاہ سے وہ ڈگری لے کر نکلے اور عملی زندگی کے میدان میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مستقبل تاریک ہے، دفتروں کی خاک چھانی مگر سب اتنے خوش قسمت کہاں کچھ کو کہیں کہیں معمولی کلرکی مل گئی مگر اکثریت بے روزگار معاشی تنگی کا شکار ہوکر معمولی معمولی نوکریوں اور ذلیل پیشوں پر اتر آئے۔اکبر کہتے ہیں ؎

تم نے واعظ کی خوب داڑھی نوچی — یہ بات مگر نہ اپنے دل میں سوچی
مذہب کو شکست دے کے کیا پائیں گے — آخرکو رہیں گے موچی ہی کے موچی

## پیشین گوئی پوری ہوگئی

سرسید کے قائم کردہ کالج کی طرف سے اکبر کو جو اندیشے تھے وہ سب حقیقت بن کر ان کے سامنے آنے لگے، سرسید ۱۸۹۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے لیکن ان کے بعد اکبر چوبیس سال زندہ رہے اور جس دن سے وہ ڈرتے رہے ان کی زندگی ہی میں وہ دن آگئے، اوراس کے برے دن بتدریج آتے چلے گئے، علی گڈھ کالج شجر اسلام کی جڑوں کے لئے کھولتا ہوا پانی ثابت ہونے لگا، مسلمانوں کی جو اولاد یورپ سے ڈگریاں لے کر یہاں آئی تو ڈگریوں کے ساتھ الحاد کا بھی سرٹیفکیٹ لے کر آئی ان

میں سے اکثر دین بیزار ہی نہیں مذہب دشمن بن کر آئے علی گڈھ میں وہ اونچے عہدوں پر سرفراز کردیئے گئے انہوں نے مسلمانوں کی پوری ایک نسل کو جوان کے زیر تعلیم وتربیت تھی غلط راہوں پر لگادیا اوران کی مذہبی رگوں میں الحاد کا اتنا تیز انجکشن دیا کہ وہ ترقی پسندی کی دھن میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ دین وشریعت اور مذہب گردکارواں بن کررہ گیا کچھ شاعر بن گئے کچھ افسانہ نگار کچھ قائد بنے اور کچھ کارل مارکس اورلینن کے پرستار بن گئے علی گڈھ کالج کی تاریخ کی یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا جواس تعلیم گاہ کی تاریخ سے کچھ بھی واقف ہے، سرسید کے انتقال کے بعد اکبر نے کئی نظمیں لکھیں جوصورتحال کو پیش کرتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ سرسید نے ابتدا ہی سے جو نظام تعلیم وتربیت بنایااس کا لازمی نتیجہ الحادو بے دینی کی حوصلہ افزائی تھا، آج جو نئی نسل مذہب سے دور ہے دور تر ہوتی جارہی ہے یہ کوئی خلاف امید بات نہیں، ناگ پھنی بوکراس سے گلاب کے پھولوں کے پیدا ہونے کی امید رکھنا حماقت نہیں تواور کیا ہے، اکبر کہتے ہیں اورکس درد کے ساتھ کہتے ہیں

ہوائے الحاد رنگ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر، جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے
ہمیں نے دراس ہوا پہ کھولا، کیا اسے چپ جو کوئی بولا
ہمیں ہے اب خود تردد اس کی، طبیعت اب ہاتھ مل رہی ہے
جو پیشوا خود ہوں رند مشرب، تو کیا جمے رنگ وعظ ومذہب
قلوب شیطاں کے متبع ہیں، زبان قرآں پہ چل رہی ہے

اکبر آگے نظم میں یہ بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے ہم کو لامذہب بنایا مگر وہ خود مذہب کے حدود سے باہر نہیں ہوئے، بڑا سے بڑا انگریز اتوار کو چرچ جانا ضروری سمجھتا ہے پوپ کے سامنے اعتراف گناہ کرکے نجات کا طالب ہوتا ہے، ہمارے پڑوسی برادران وطن ہندوؤں نے بھی انگریزی تعلیم حاصل کی اوراونچی سے اونچی نوکری حاصل کی بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوئے مگر اپنے دھرم کو ترک نہیں کیا یہ صرف

مسلمان قوم ہے کہ ذرا سی انگریزی پڑھ لی اور چند دن علی گڈھ کالج میں وہ رہے اور اپنے مذہب پر تیشہ چلانے میں طاق ہوگئے، اکبر بہت ہی دل شکستہ ہوکر درد بھرے دل سے کہتے ہیں۔

خدا کی ساعت ہے یاں کی صدیاں چھپی نہیں ہیں ہماری بدیاں
بلائیں آئیں اور آرہی ہیں کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے

❁ ❁ ❁ ❁

زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو گورِ سید پہ جل رہی ہے

اس صورت حال کی عکاسی اکبرؔ نے اپنی ایک دوسری نظم میں بھی کی ہے، اس نظم میں اس راز سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو گمراہ کرنے میں کچھ نام نہاد مسلمان مفاد پرست افراد کلیدی رول ادا کررہے ہیں کیونکہ اس سے انگریزی حکومت میں ان کو سرخروئی حاصل ہوتی ہے ان کے وقار اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے ان کا عہدہ ایک زینہ اور اوپر چڑھ جاتا ہے، انگریز افسران کی نظر عنایت ان پر مزید بڑھ جاتی ہے، یہ لوگ مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں وہ ان کو بتاتے ہیں کہ مسلمان قوم ترقی کررہی ہے، قوم میں نئی توانائیاں آرہی ہیں حالانکہ حقیقت ان کا منہ چڑاتی ہے، مسلمانوں کی مذہبی زندگی عالم نزع میں مبتلا ہے اور دم توڑ رہی ہے اکبر اپنی اس نظم میں ان تمام حقائق کو کھول کر بیان کرتے ہیں، اس نظم میں اکبر کا سوز و گداز اور دل کا درد بول رہا ہے، نظم ہے

بنائے ملت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان، مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا، کہ خوش ہیں، گویا ابھر رہے ہیں
اُدھر ہے قوم ضعیف و مسکیں، اِدھر ہیں کچھ مرشدان خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
صدائے الحاد اٹھ رہی ہے، خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے

دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے، کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں

آگے چل کر اکبر نے یہ بتایا ہے کہ یہ شاہین صفت قوم مسلمان جو کبھی آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتی تھی آج چاندی کے قفس میں بند ہے وہ انہیں پر نظریں جمائے ہوئے ہے، اس کو یہ احساس بھی نہیں کہ اس کے پر کتر دیئے گئے ہیں اور اس سے اس کی قوت پرواز چھین لی گئی ہے اکبر مزید یہ بتاتے ہیں کہ یورپ میں بھی یہ ہوا ضرور چلی ہے لیکن ابھی وہاں الحاد کا نشتر اتنا تیز نہیں ہے کیوں کہ اس کا سبب کچھ اور ہے اکبر کہتے ہیں۔

مگر وعظ وہاں کی ہے ''نیشن'' رکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے کم لفظ ''سالویشن'' خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے، وہاں وہی عزت[1] بشپ ہے
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں، وہاں کلیسا سنور رہے ہیں

## ڈرامے کا آخری سین

بیسویں صدی کا چوتھائی حصہ قریب الاختتام ہے، سرسید اپنے مشن کی تکمیل کر کے بہت پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے اکبر الہ آبادی دین کے رہزنوں سے ہشیار کرتے کرتے اور جاگتے رہو کا نعرہ لگاتے لگاتے تھک چکے تھے علی گڈھ میں تہذیب جدید کی جو فیکٹری قائم کی گئی تھی اس میں پروڈکشن کا سلسلہ جاری تھا، پورے ملک میں مسلمان قوم دو حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی تھی ایک خالص دنیا دار عہدہ ومنصب کا رسیا، دوسرا خالص دین ومذہب کا فدائی اسلامی ثقافت واقدار کا دیوانہ، دونوں کو ایک دوسرے کی محفلوں سے اجتناب، دونوں کی دنیائیں الگ الگ دونوں کی دلچسپاں علیحدہ علیحدہ ایک جدید تہذیب جدید فیشن کا پرستار بیوی بچے تک تہذیب جدید کا ماڈل بنے ہوئے، انگریزوں کی نقالی میں ہنس کے جوڑے کی طرح ہر محفل میں میاں کے

---

[1] پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا احترام۔

ساتھ بیوی ہلال و بدر کی سب تابشیں اڑائے ہوئے، سوادِ رومہ و کاشان جگمگائے ہوئے حاضر و موجود دوش بدوش ہم نوالہ و ہم پیالہ رونق محفل ہر ایک کی مرکز نگاہ دوسری طرف اسلامی ثقافت کے کھنڈر میں بیٹھے ہوئے قلندر دین کے دیوانے، باقی پوری فضا خاموش اور ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا۔ اکبؔر کہتے ہیں ؎

چرچے ہیں نہ مذہب کے، نہ وہ قصہ، دل ہے — پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل ہے

اس عہد میں مائل سوئے الحاد جو دل ہے — اس کی تو گورنمنٹ ہی رسپانسبل[1] ہے

تنخواہ کے بل سے ہمیں ہوتی ہے مسرت — اور شیخ یہ کہتا ہے کہ یہ سانپ کا بل ہے

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا — محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر[2] ویل ہے

اب دین کا خدا ہی حافظ ہے، اکبر کی آخری فریاد تھی۔

---

[1] ذمہ دار۔

[2] یورپ کے دو مشہور فلاسفر۔

# ''متاعِ عقیدت'' پر ایک نظر

تاج الدین اشعرؔ رام نگری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''متاع عقیدت'' پڑھ کر اشعرؔ صاحب کی قادر الکلامی، زبان و بیان پر دسترس، خوبصورت تعبیرات کے استعمال پر قدرت کاملہ کا اندازہ ہوا، اشعر صاحب کی شاعری کارشیشہ گری و مرصع سازی ہے، وہ ہیروں کو تراش کر ان کی آب و تاب میں اضافہ کرنے کا فن جانتے ہیں، بہترین نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، عشق نبوی یا حب رسول کا اظہار، غزل کی شاعری کی لذیذ ترین داستان، عشق و محبت کے اظہار کا لب ولہجہ سب کچھ شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت اور مقام و مرتبہ کے شایان شان ہونا چاہیئے، محبوب کی زلف معنبر کو سنبل و ریحان اور جبین کو ماہ چہاردہم کہا جاتا ہے، لغت میں بھی اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن جو لوگ الفاظ کی معنویت اور گہرائیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ یہاں بھی احتیاط ہی کرتے ہیں، ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت جس کو محبوب رب العالمین کہا جاتا ہے جس کے دامن تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس کے بارے میں جو الفاظ اور محاورے اور تشبیہیں استعمال کی جائیں تو ان کے اندر بھی تقدس اور طہارت و پاکیزگی کا عنصر شامل ہونا چاہیئے، مثلاً ایک شاعر جبین مقدس اور آپ کے گیسوئے عنبریں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جبین ناز تیری لوحِ محفوظ ہے گویا
تیرا گیسوئے شام افروز ہے آیات قرآنی

پیشانی کو لوحِ محفوظ اور سیاہ زلفوں کو آیات قرآنی سے تشبیہ دی گئی، مشبہ اور مشتبہ بہ دونوں میں تقدس اپنے انتہائی بلند معیار پر ہے اور یہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان بھی ہے، اشعرؔ صاحب اس طرز سخن کے نکتہ شناس ہیں ان کی تمام نظموں میں ہر جگہ عقیدہ کی صلابت کے ساتھ ساتھ عقیدت و ارادت کا تقدس اور انداز

بیان اور طرزِ اظہار کی پاکیزگی نمایاں ہے۔

اشعؔر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے، سیرت کے موضوع سے ان کا خاص تعلق ہے اس لئے وہ عام الفاظ میں اپنے عشق و محبت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات آپ کے امتیازات آپ کی خصوصیات آپ کے معجزات اور تبلیغ اسلام کے غمناک واقعات ان کی نگاہوں میں ہیں وہ ان تمام اوصاف و واقعات کے بجے تلے الفاظ میں خوبصورت اور شگفتہ اسلوب کے ساتھ اپنی نظموں میں سمو دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے کلام کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے، جیسے صاف شفاف کپڑوں میں ''عطر شامۃ العنبر'' چھڑک دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے اشعر صاحب کی نظمیں پڑھ کر عشق رسول اور حب نبوی کی وہی خوشبو ہر قاری کے ذہن وفکر کی فضاؤں میں پھیل جاتی ہے، اشعر صاحب کا جوہر اس وقت زیادہ کھلتا ہے جب وہ مسدس کی ہیئت میں نعتیہ کلام کہتے ہیں، ان کی متعدد نظمیں خاصی طویل ہیں پچیس چھبیس سے زیادہ بند پر مشتمل ہیں اور کتاب کے چھ سات صفحات میں آئی ہیں۔

مسدس کے ہر بند میں ایک خاص پہلو پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور اس کا چھٹا مصرعہ اس بند کی جان ہوتا ہے، وہ اتنا بیساختہ، برجستہ اور رواں دواں ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے پورا بند چمک اٹھتا ہے، یوں سمجھئے کہ چار مصرعے سپیدۂ سحری کی طرح ہیں پانچواں مصرعہ اس سرخ شفق کی مثال ہے جو شہنشاہ خاور کے طلوع ہونے کی بشارت دیتی ہے اور چھٹا مصرعہ دمکتے ہوئے سورج کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس فن کے ماہر میر انیس تھے انہوں نے اس نکتہ کو بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا مرزا دبیر پر ان کی ترجیح کے اسباب میں یہ نکتہ شناسی بھی شامل ہے، اشعر صاحب بھی اس نکتہ سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی بیشتر نظموں میں ان کا یہ جوہر چمکتا دمکتا ہوا نظر آتا ہے، ان کی ایک نظم ''سعادت'' کا یہ بند دیکھئے۔

شکر خدا کہ روح بشر شادماں ہوئی　　بندوں پہ اپنے، رحمت حق مہرباں ہوئی
پستی زمیں کی رو کش صد آسماں ہوئی　　پنہاں تھی شان حسن ازل سے عیاں ہوئی

مژدہ سنایا کعبہ میں روح الامین نے
ہنس کر مزاج پوچھا فلک کا زمین نے

پہلے چار مصرعوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کو روح بشر کی شادمانی اور بندوں پر رحمت حق کی مہربانی، ''شان حسن'' جو ازل سے پنہاں تھی اس کے عیاں ہونے کا ذکر کیا گیا پھر قدم مبارک کے زمین پر پڑنے سے زمین کی رفعت وسر بلندی میں جو بے پناہ اضافہ ہوا اس کا تذکرہ کیا گیا اور جب جبریل نے شہنشاہ کونین کی زمین پر آمد کا مژدہ سنایا تو زمین نے فخر وناز کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا جس کو ہمیشہ اپنی رفعت وسر بلندی کا غرور تھا، اور آج جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک زمین پر پڑے تو زمین کی رفعت وسر بلندی آسمان سے بڑھ گئی، زمین جو اپنی پستی کی وجہ سے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا تھی اس کے فخر وناز کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا، اس کیفیت کو اشعر صاحب نے کتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ہنس کر مزاج پوچھا فلک کا زمین نے

مسدس میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

وہ ذات جس پہ صدقے نگارِ حیات تھی — روز ازل سے رہرو راہ نجات تھی
وہ جس کی منتظر نگہِ کائنات تھی — سب آچکے تھے باقی محمدؐ کی ذات تھی
وہ آگئے تو ختم شب تار ہوگئی — دنیا تمام مطلع انوار ہوگئی

آگے کے بند میں معراج کا ذکر ہے جس میں آیت قرآنی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی طرف اشارہ ہے۔

قربان اس پیمبر امّی کی شان پر — جز وحی حق کچھ آئے نہ جس کی زبان پر
تھے خاک پر قدم تو نظر آسمان پر — خالق سے ہمکلام ہو جو دو کمان پر

عقل شکستہ پا کو بس اتنی خبر ملی
لوٹے تو ہلتی آپ کو زنجیر در ملی

مدعیان عقل وخرد معراج کی تفصیلات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، اس کے بیان کے لئے "عقل شکستہ پا" کی تعبیر کتنی معنی خیز ہے؟ اتنی لمبی مسافت اتنے مختصر وقت میں عقل اس لئے طے نہیں کرسکتی کہ اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں، لیکن سرکار دوعالمؐ کا یہ سفر تو خالق کائنات نے کرایا ہے جس کی بارگاہ میں ناممکن لفظ کا گذر ہی نہیں۔

تیسرے بند میں استفہامیہ جملوں نے بند میں جان ڈال دی ہے۔

جس نے مٹائی سطوت اصنام کون تھا؟ کی دور جس نے ظلمت اوہام، کون تھا؟
جس سے ملی ہے دولت اسلام، کون تھا؟ کی جس نے راہ ورسم وفا عام، کون تھا؟

عورت کو جس نے چادر شرم وحجاب دی
مزدور کے پسینے کو ہیرے کی آب دی

عرب کے سماج میں عورت اور غلام ہی سب سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم تھے اسلام نے آکر ان کو اعزاز واحترام کے منصب پر سرفراز کیا اور زمین سے اٹھا کر آسمان پر بیٹھا دیا۔

ممدوح کے اوصاف وکمالات کا ذکر ہی ممدوح کی عظمت وشان کو دلنشین بناتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کے ساتھ معجزات جو دلائل نبوت ہیں ان کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے، احادیث میں ان کا ذکر بہت تفصیل سے آیا ہے، اشعر صاحب نے کئی کئی صفحات کے مضمون کو چھ مصرعوں میں سمیٹ کر اپنی قادر الکلامی کا اچھا ثبوت دیا ہے، بند کو درج ذیل تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر پڑھئے تو اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

۱- حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ان پتھروں کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے قبل مجھ کو سلام کرتے تھے۔

۲- شق القمر کا معجزہ تو مشہور ہے۔

۳- ایک شخص نے مٹھی میں کنکریوں کو چھپا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کو غیب سے خبریں آتی ہیں بتائیے میری مٹھی میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ

میں خود بتادوں یا وہ چیز جو تمہاری مٹھی میں ہے وہ خود ہی بول دے اس نے کہا کہ اس سے بہتر کیا ہے؟ پھر اس کی مٹھی کی کنکریوں سے کلمہ شہادت کی آواز آئی۔

۴- ایک غزوہ میں آپؐ صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے مشکیزہ میں تھوڑا سا پانی تھا آپؐ نے وضو فرما کر تھوڑا سا پانی مشکیزہ میں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا، جب منزل پر صحابہ کرامؓ پہنچے تو سب نے پیاس کی شدت کی شکایت کی آپؐ نے وہی مشکیزہ منگایا اور اس میں آپؐ نے اپنی انگلیاں ڈال دیں پھر تو اس سے جوش مارتا ہوا پانی ابلنے لگا تمام صحابہؓ نے پیاس بجھائی۔

مسجد نبوی میں ایک ستون تھا جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ دیا کرتے تھے جب ایک صحابیہ نے منبر بنوا کر مسجد نبوی میں رکھ دیا تو آپ خطبہ کے لئے اس منبر پر جب کھڑے ہوئے تو اس ستون سے اس طرح کی آواز آئی جیسے کوئی بچہ سسک سسک کر رو رہا ہے، آپؐ نے منبر سے اتر کر اس کو سینے سے لگایا تو یہ آواز بند ہوئی، اسی ستون کو ''استن حنانہ'' کہا جاتا ہے، ان سارے معجزات کو اشعر صاحب نے صرف ایک بند میں پیش کردیا ہے ان کا بند ہے۔

ہر شے جہاں کی اسکی صداقت پہ ہے گواہ پتھر بھی موم ہو وہ جدھر ڈال دیں نگاہ
حرکت کریں اشارۂ ابرو پہ مہر وماہ بے جان کنکری بھی کرے وِرد لا الہ

انگشت پاک چشمۂ شیریں رواں کرے
منبر کا چوب خشک بچھڑ کر فغاں کرے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں، مقصد تھا کہ کوئی غلام مل جائے کیونکہ وہ خود ہی چکی پیستی تھیں پانی کی مشک لاتی تھیں، جس کی وجہ سے پورا جسم چور ہو جاتا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی تو حضرت علیؓ نے آکر حضرت فاطمہؓ کے آنے کا مقصد بیان کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنگ بدر میں جو صحابہ شہید ہو گئے ہیں ان کی بیواؤں اور ان کے یتیم بچوں کا حق پہلے ہے، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا حال خود ام المومنین حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی مہینوں چولہا جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی، کیونکہ پکانے کے لئے کچھ رہتا ہی نہیں تھا صرف کھجور اور پانی پر گذر ہوتا تھا، ان ساری جزئیات کو اشعر صاحب نے صرف ایک بند میں پیش کر دیا ہے، اور انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ دل شعروں کی معنویت میں کھوجاتا ہے، دل بھر آتا ہے، آنکھیں چھلکنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں شہنشاہ کائنات اور بے سروسامانی کا یہ عالم؟

ہو جسکے گھر میں بے سروسامانی کا یہ حال بے تیل بجھ گیا ہو دیا، وقت انتقال
خود جسکی بیٹی چکی چلانے سے ہونڈھال وہ بدر کے یتیموں کا پہلے کرے خیال
جو سیم وزر مدینے کے ہر گھر میں بانٹ دے
اس دن بھی اپنی رات وہ فاقے سے کاٹ دے

ان کربناک حالات کی کتنے موثر انداز میں عکاسی کی گئی ہے، کہ پڑھ کر ہر مصرعہ پر آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں، جب آپؐ اشاعت اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے سرداروں نے مذاق اڑایا، استہزا کیا، طنز کے تیر چلائے، انہیں سرداروں کی شہ پا کر نوجوانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے آپ کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے آپ وہاں سے بہت غم زدہ اور دل گرفتہ ہو کر لوٹے مگر زبان مبارک پر بددعا کے بجائے **اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون** ہی تھا بڑی سے بڑی مصیبت کے موقعہ پر صبر وضبط سے کام لیا، اشعر صاحب نے ان کربناک واقعات وحالات کو ایک بند میں بیان کر دیا ہے اور بہت موثر بند کہا ہے اور آپ کے "رحمت عالم" ہونے کو واقعات وحقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے جب کہ ان میں اکثر مواقع ایسے تھے کہ آپ موت وزیست کے دوراہے پر کھڑے تھے، بند دیکھئے۔

مصروف سنگباری تھے طائف میں. جب شریر جب غار ثور میں تھا چھپا وہ مہ منیر
بدر واحد میں جب تھا بپا شور داروگیر مینہ کی طرح حنین میں. جب گر رہے تھے تیر
"رحمت لقب" کا فرض ادا کر رہا تھا وہ
زخمی لبوں سے تب بھی دعا کر رہا تھا وہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک دلکش منظر ہم کو فتح مکہ کے وقت نظر آتا ہے جو فتح و جنگ کی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ ہے، اشعر صاحب اس وقت کی عام معافی کا ذکر کرتے ہیں۔

منظر تھا فتح مکہ کا کتنا عجیب تر مجرم تھے بیس سال کے، آگے جھکا کے سر
ہمت نہ تھی کہ شرم سے اوپر اٹھے نظر جس دم نگاہ رحمت عالم اٹھی ادھر

اہل جفا کو عفو وکرم کی امید دی
مکہ کو اَنْتُمُ الطُّلَقَاء کی نوید دی

اس روح نواز، مترنم اور دلکش طویل نظم کا خاتمہ دعا پر کیا ہے، اس سے پہلے انہوں نے بتایا ہے کہ حضور کے لائے ہوئے دین اور ان کے برپا کردہ نظام زندگی اور ان کے پیش کردہ دستور حیات کی افادیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے، اشعر صاحب کو یقین ہے کہ علمی، تمدنی اور سائنسی تمام ترقیوں کے باوجود آج بھی انسان ذہنی سکون سے محروم ہے اور اس کو دل کا چین نصیب نہیں اس لئے ایک دن ایسا آکر رہے گا کہ تمام ترقی یافتہ قومیں نخل اسلام کے سائے میں آئیں گی تبھی ان کو روحانی نشاط اور ذہنی سکون نصیب ہوگا، حالات مجبور کردیں گے تو وہ الحادکی زندگی کو خیرباد کہہ کے اسلام کی روحانی زندگی کو اپنالیں گے۔ اشعر صاحب کہتے ہیں۔

قائم خدا کے دین کی عظمت ہے آج بھی پرنور شاہراہ طریقت ہے آج بھی
زندہ میرے حضور کی سنت ہے آج بھی دنیا کو ان کے دیں کی ضرورت ہے آج بھی

جب ظلمتوں میں نوع بشر ڈوب جائے گی
دنیا بھٹک بھٹک کے اسی در پہ آئے گی

اشعر صاحب چونکہ صحافی ہیں اس لئے اپنے گردوپیش کے حالات سے خوب واقف ہیں، مسلمانوں پر جو گذر چکی ہے اور جو گذر رہی ہے اس کو دیکھ کر غم زدہ اور فکر مند ہیں اس لئے آخری دو بند میں دل کا درد ظاہر کرتے ہوئے خدا سے دعا کی ہے،

وہ کہتے ہیں۔

دشمن زمین ہے تو شرر بار آسماں — نا قابل بیاں ہے شقاوت کی داستاں
ہر روز گر رہی ہیں جفاؤں کی بجلیاں — بیکس ہیں بے پناہ ہیں، اب جائیں ہم کہاں

بدبختیوں نے اب ہمیں یہ دن دکھائے ہیں
ہر سمت ظلم و جبر ہے، ذلت کے سائے ہیں

یارب! نبی کے صدقے میں عز و وقار دے — اس بدنصیب قوم کی قسمت سنوار دے
ایمان کے چمن کو نوید بہار دے — دل میں سرور عشق محمد اتار دے

سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو اور صلوۃ وسلام کا نذرانہ عقیدت نہ پیش ہو، یہ کیسے ممکن ہے، اشعؔر صاحب نے صلوۃ وسلام کے ساتھ ''ہدیۂ ناچیز'' جو بارگاہ رسالت میں پیش کیا ہے اس کی قدر قیمت کا اندازہ کیجئے، انہوں نے عشق ومحبت کی ساری کائنات بارگاہ حسن میں پیش کی ہے اور کس تواضع سے پیش کی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے، بند ملاحظہ ہو۔

محبوب کردگار، صلوۃ وسلام ہو — صد بار صد ہزار صلوٰۃ وسلام ہو
باچشم اشکبار، صلوۃ وسلام ہو — اشعر ترے نثار، صلوٰۃ وسلام ہو

کچھ آنسوؤں کے موتی ہیں، کچھ زخم دل کے پھول
مولیٰ! ہمارا ہدیۂ ناچیز ہو قبول

اشعؔر صاحب کی ایک نعتیہ نظم ''طلوعِ مہر رسالت'' ستر اشعار پر مشتمل ہے مرصع سانچے میں ڈھلی ہوئی، برجستہ رواں دواں ہے کہ پڑھئے تو دل وفور جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، ہر بند پانچ شعروں پر مشتمل ہے ہر بند کا خاتمہ ایسے شعر پر کرتے ہیں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے اور دل عشق ومحبت اور عقیدت وارادت کی روحانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے ایک بند میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکین کی جانب سے توڑے جانے والے مصائب کا ذکر کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا بلند معیار بھی، ہر شعر میں تقابل کا انداز اختیار کر کے شعر کی معنوی وسعتوں کو کہاں سے

کہاں تک پہنچا دیا گیا ہے، بند ملاحظہ کیجئے

وہ سنگبارئ طائف سے دلفگار بھی ہے ۔ تو دشمنوں کیلئے اسکے دل میں پیار بھی ہے
کھلے ہیں جسم پہ صدہا گلاب زخموں کے ۔ مگر وہ صبر وعزیمت کا کوہسار بھی ہے
کھلا کے اوروں کو خالی شکم جو سو جائے ۔ اسی کا سارے خزانوں پہ اختیار بھی ہے
اسی کے خون کے پیاسے بھی اہل مکہ ہیں ۔ امانتوں کے لئے اس پہ اعتبار بھی ہے
یہ سب کو مہر ووفا کے اصول دیتا ہے
وہ کانٹے پھینکنے والوں کو پھول دیتا ہے

ایک بند میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم کارناموں کا ذکر کیا ہے اور اس انقلاب کو پیش کیا جو آپ نے ۲۳ سالہ عہد رسالت میں پیدا کیا، انسانیت جو ذلت کی پست ترین سطح پر تھی اس کو اوج ثریا تک پہنچانے کا ذکر کرتے ہیں، یہ سب کچھ بہت شگفتہ اسلوب میں کرتے ہیں، الفاظ نرم ونازک، انداز بیان بہت سبک اور ہلکا، ان کا بند پڑھئے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فرش گل پر چلتے ہیں ہر طرف عقیدت ومحبت کے گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، استعارات وکنایات اور تلمیحات کا حسن استعمال، ذہن وفکر میں ایک نورانی فضا بناتا ہوا چلا جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اسلوب کے باوجود علم ہے فکر ہے، حقائق ہیں، جیسے سامنے سیرۃ النبیؐ کے اوراق کھلے ہوتے ہیں، اشعؔر صاحب کا بند ہے۔

جہان کہنہ میں برپا وہ انقلاب کیا ۔ کہ کفر وشرک کو وہم وخیال وخواب کیا
اٹھا کے فرش زمیں کے حقیر ذروں کو ۔ حریف مہر کیا، رشک آفتاب کیا
نہ ملک وقوم نہ رنگ ونسب ہے باعث فخر ۔ فضیلتوں کا مرتب نیا نصاب کیا
عجیب شان تھی اس کی کہ خود تو امّی تھا ۔ مگر خدا نے اسے صاحب کتاب کیا
جہاں میں علم کے دریا بہادیئے اُس نے
جہالتوں کے نشاں تک مٹادیئے اس نے

اشعؔر صاحب صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ بارگاہ رسالت میں زبانی دعوائے

محبت کی کوئی قیمت نہیں، دعویٰ کے ساتھ عملی ثبوت بھی ضروری ہے، یہاں دودھ پینے والے مجنوؤں کی نہیں خون دینے والے مجنوؤں کی ضرورت ہے، ان کی عقیدت وارادت اتنی طاقتور ہے کہ وہ اپنی بات قسم کھا کر کہتے ہیں یہاں بھی ان کے طرز بیان کی نفاست، شاعرانہ اسلوب کی دلکشی اپنے شباب پر ہے۔

نبی سے ہم کو محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں — مگر ثبوت اطاعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
فقط زبان کا دعوائے عشق ناکافی — عمل سے اسکی شہادت نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہماری زیست کے آئین زندگی کا نظام — اگر خدا کی شریعت نہیں، تو کچھ بھی نہیں
عمل کا نام ہے اسلام جس کو کہتے ہیں — جو سامنے یہ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر ہم اب بھی نبی کے غلام ہوجائیں
قسم خدا کی جہاں کے امام ہوجائیں

اشعؔر صاحب کی ایک طویل نظم، ''اے ہادی اعظم'' کے عنوان سے بڑی دلکش اور روح نواز ہے یہ نظم ان کی قادرالکلامی کا بھی ثبوت فراہم کرتی ہے عصری آگاہی کی روشنی میں انہوں نے جو حقائق پیش کئے ہیں اور جس انداز میں پیش کئے وہ دلوں کو چھولینے والا ہے، ہر قاری یہ محسوس کرے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے کیونکہ اشعؔر کے بیان میں بولتی ہوئی صداقت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی انہوں نے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج بھی سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کے نفاذ کی ضرورت ہے، آج کا ترقی یافتہ انسان زمین سے اٹھ کر ثریا تک پہنچ گیا ہے، خلاؤں پر اس کی حکمرانی ہوچکی ہے سائنسی انکشافات نے قوانین فطرت کے سارے حجابات اٹھادیئے ہیں، انسان خلاؤں میں جنوں اور شیاطین کی طرح چہل قدمی کرنے لگا ہے، آسمان کی بلندیوں میں غرور وتمکنت کا تخت حکومت بچھا کر بیٹھ گیا ہے ہزاروں ہزار میلوں کی دوری تک وہ بیک وقت ساری دنیا کے مناظر روئے زمین پر بسنے والوں کو دکھا سکتا ہے، آپ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں، جنگل اور بیابان میں ہوں، پہاڑوں کی کھوہ یا گھنی جھاڑیوں میں

ہوں، زمین کے تہ خانوں میں ہوں ہر جگہ وہ اپنی بات پہنچا سکتا ہے خلائی اسٹیشنوں اور مصنوعی سیاروں نے دنیا کی پوری تاریخ بدل کر رکھ دی ہے لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اشعؔر کہتے ہیں کہ یہ انسان کی ترقی ہے، انسانیت کی نہیں، تہذیب وشرافت کی نہیں جس کی ساری دنیا کو ضرورت ہے۔

عصر حاضر کے علوم وفنون سائنس جغرافیہ میں انسان نے وہ بلند مقام حاصل کرلیا کہ آج سے پہلے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اس علمی وسائنسی ترقی نے انسانیت کو فروغ نہیں دیا، انسان تمام تہذیب وترقی کے دعوے کے باوجود وحشی، سفاک، خونخوار انسانیت کا دشمن ہوکر رہ گیا ہے، علم اور وحشت میں تضاد ہے لیکن انسان اس تضاد کا شکار ہے کہ تمام علمی کمالات کے باوجود وحشی اور درندہ بھی ہے۔

اشعؔر صاحب کے دعوے کے ثبوت کے لئے پچھلے پچاس سالوں کی تاریخ شاہد ہے، دوسری جنگ عظیم میں کروڑوں انسانوں کی تباہی اسی حضرت انسان کے ہاتھوں ہوئی، ہیروشیما کی بات چھوڑیئے کہ لاکھوں لاکھ بے قصور انسان مکھی مچھر کی طرح مسل کر رکھ دیئے گئے اور آج تک ان کی نسل تخلیقی نقائص کا شکار ہے تازہ ثبوت اسامہ بن لادن ایک شخص سے انتقام لینے کے لئے امریکہ جیسے سپر پاور ملک نے کتنے راکٹ داغے، کتنے انسان مرے، کتنی تباہی آئی؟ یہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، نیوکلیائی ہتھیاروں کی جنگ میں جو تباہیاں اب تک دنیا دیکھ چکی ہے، یاجوج ماجوج کی تباہی کی جو احادیث میں منظر کشی کی گئی ہے کیا اس سے کم ہے؟

اشعؔر صاحب اسی پس منظر میں اپنی یہ نظم کہتے ہیں، یہ ان کی نظم ان کے شاعرانہ خوبصورت انداز بیان کے ساتھ کچھ ٹھوس حقیقتیں بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اور وہ بھی بہت دلکش اسلوب میں، اس نظم کے دو تین بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، وہ اپنی نظم کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے ہادئ اعظم! دین ترا سرچشمۂ راحت آج بھی ہے
اے ختم رسل! تعلیم تری سامان سعادت آج بھی ہے

اے سرور دیں! پیغام ترا گلبانگ صداقت آج بھی ہے
اے رہبر عالم! اسوہ ترا مینار ہدایت آج بھی ہے
دنیا میں مدینہ سے جاری، فیضان رسالت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے
فرمانِ الٰہی بندوں کو پہنچا بھی دیا، سمجھا بھی دیا
ان پر جو حقائق پنہاں تھے، ہر طرح انہیں بتلا بھی دیا
دنیا میں بھی جینا سکھلایا، مومن کو غم عقبیٰ بھی دیا
تعلیم جو دی انسانوں کو، خود کر کے اسے دکھلا بھی دیا
روشن ترا اسوہ آج بھی ہے، زندہ تیری سیرت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو پھر تیری ضرورت آج بھی دیا

عہد حاضر کو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کیوں ہے؟ اشعر صاحب حالات کی عکاسی کرتے ہیں ان کی نگاہوں کے سامنے عالم اسلام کی پوری صورت حال ہے، عراق، مصر، ترکی اور الجزائر میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آخر آخر میں سعودیہ عربیہ جس طرح سامراجیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے، یہ کربناک صورت حال ان کے سامنے ہے، ان تمام ملکوں میں بزور قوت الحاد کو پھیلایا جا رہا ہے، کیوں کہ ان کے سروں پر سامراج کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے، اشعؔر کہتے ہیں۔

توپوں کی زباں سے امن کے اب پیغام سنائے جاتے ہیں
چوراہوں پر ہتھیاروں کے بازار سجائے جاتے ہیں
طاقت کے توازن کی خاطر فتنے وہ اٹھائے جاتے ہیں
دھرتی پر زخمی لاشوں کے انبار لگائے جاتے ہیں
سفاک ہیں سائنس وحکمت، خونخوار سیاست آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

مغرب سے لے کر مشرق تک شیطان کا سکہ چلتا ہے
تہذیب کے عشرت خانوں میں الحاد کا ساغر ڈھلتا ہے
اشک غربت، مظلوم کا خون، ایوان ہوس میں جلتا ہے
جو چاند کی مٹی لاتا ہے، دھرتی کا حسن کچلتا ہے
باصد ہمہ زعم علم وخرد، ہنگامۂ وحشت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

مغرب سے لے کر مشرق تک شیطان کا سکہ چلتا ہے
تہذیب کے عشرت خانوں میں الحاد کا ساغر ڈھلتا ہے
اشک غربت، مظلوم کا خون، ایوان ہوس میں جلتا ہے
جو چاند کی مٹی لاتا ہے، دھرتی کا حسن کچلتا ہے
باصد ہمہ زعم علم وخرد، ہنگامۂ وحشت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

اس نظم کے آخر میں اشعرؔ اسلام کی ابدیت پر اپنے یقین کا اظہار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول آئے ان کی تعلیمات کا دور ختم ہو گیا اور ان کے ماننے والوں نے اپنی تہذیب میں تحریف وترمیم کر کے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا، صرف حضور کا لایا ہوا دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں آج تک کوئی آمیزش یا تحریف نہیں ہوئی کیوں کہ قرآن جو اس کے دستور کی کتاب ہے اس کی حفاظت خود خدا نے اپنے ذمہ لی ہے اور دنیا میں ایسے اسباب وذرائع پیدا کر دیئے کہ کسی بھی طرح قرآن میں ایک حرف کی کمی بیشی کا امکان بھی ختم ہو گیا اس لئے جو دین کی صداقت عہد رسالت میں تھی وہی کھری صداقت آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے، اشعر صاحب کا بند ہے:

ہر دیش میں، ہر جگ میں یوں تو کچھ سچے رہبر آتے رہے
ہر دور کے انسانوں کے لئے قانون ہدایت لاتے رہے

کچھ لوگ اسے اپناتے رہے، کچھ لوگ اسے ٹھکراتے رہے
کچھ لوگ بدل کر روپ اپنا، سونے میں کھوٹ ملاتے رہے
آدرش ترے، تعلیم تری، بے میل صداقت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

اشعؔر صاحب کی ایک نظم کا عنوان ہے "یہ جشن ولادت کی شب ہے" جو ۲۴ بند پر مشتمل ہے، ابتدائی بندوں میں انہوں نے جشن کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے، الفاظ بڑے بجے تلے، انداز بیان دلکش، استعارات وکنایات کے پھولوں سے سجایا ہے، کیونکہ کسی عظیم ہستی کا استقبال جو اہتمام چاہتا ہے اشعر صاحب اس سے واقف ہیں اس لئے اس ہستی کے شایان شان سجاوٹ کا نظم کرتے ہیں محفل استقبالیہ کو سجاتے اور سنوارتے ہیں، اس سلسلہ کا صرف ایک بند بطور مثال پیش کرتا ہوں، دیکھئے کہ ان کے تخیل نے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں؟ بند ہے۔

کرنوں سے فضاؤں کو بھر دیں، یہ چاند ستاروں سے کہہ دو
برسائیں زمیں پر لالہ وگل، جنت کی بہاروں سے کہہ دو
تعظیم نبیؐ میں جھک جائیں، کعبہ کے مناروں سے کہہ دو
انساں کا مسیحا آتا ہے، دکھ درد کے ماروں سے کہہ دو
یہ درد سے راحت کی شب ہے، یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

پورے اہتمام سے بزم استقبال سجا کر شہنشاہ کونین کا استقبال کیا جاتا ہے پھر آپ کے اوصاف وکمالات اور عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے، پھر عہد رسالت کی برکات وثمرات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بے خود ہو جاتے ہیں اس بیخودی میں ایک طویل مسافت کر لیتے ہیں تو ان کو ہوش آتا ہے اور اپنے اردگرد مسلمانوں کی تباہی وبربادی کے دلخراش مناظر کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں، پھر اپنے عزم وہمت کا اظہار کرتے ہوئے پورے یقین واعتماد کے ساتھ

کہتے ہیں کہ ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی، اسی ماحول میں ان کو مسجد بابری کے انہدام کا خونبار واقعہ یاد آجاتا ہے تو تڑپ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں

ہم عشق نبی کے متوالے، کب جان کی پروا رکھتے ہیں
دل میں ہے اسی چاہت کا مزا، سر میں وہی سودا رکھتے ہیں
سینوں میں تڑپ، کاندھوں پہ کفن، ہاتھوں پہ کلیجہ رکھتے ہیں
آندھی میں جلاتے ہیں شمعیں، طوفاں میں سفینہ رکھتے ہیں
جذبوں کی حرارت کی شب ہے یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

ہے دیر مگر اندھیر نہیں، یہ ظلم کی طاقت ٹوٹے گی
قانون الٰہی گھات میں ہے، باطل کی رعونت ٹوٹے گی
جب حد سے ستم بڑھ جائے گا، تب برق مشیت ٹوٹے گی
یہ ملک بھی آخر ٹوٹے گا، جب ''جائے عبادت'' ٹوٹے گی
مولیٰ! یہ اجابت کی شب ہے، یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

''طیبہ کی زیارت'' کے عنوان سے ان کی ایک نعت ہے جس میں کئی اشعار کمال عشق و محبت کے ترجمان ہیں اور بڑے روح نواز اور ایمان افروز ہیں، یہاں مجاز کا گذر نہیں، حقیقت ہی حقیقت ہے، آپ بھی سماعت فرمائیں۔

جب روضۂ اقدس کے آگے آنکھوں میں چھلک آئیں آنسو
تب لعل و گہر سے بھی بڑھ کر ہر قطرے کی قیمت ہوتی ہے
جب سینہ میں دل کی ہر دھڑکن دیتی ہے صدائے صل علیٰ
اس وقت محبت کو حاصل معراج محبت ہوتی ہے
سو بار بھی گر پیاسی آنکھیں لیں گنبد خضریٰ کے بوسے
ہر بار نگاہوں کو حاصل اک تازہ لذت ہوتی ہے

اس نعت کا ایک شعر تو دل میں تراز و ہو جانے والا ہے، صرف ایک لفظ ''لگتا ہے'' سے وہ اپنے عقیدے کے تقدس کو بھی محفوظ کر گئے، پہلے مصرعہ میں تصور کی بنائی تصویر کا روحانی نظروں سے نظارہ کرتے ہیں پھر حضور کے جسم اطہر کی خوشبو محسوس ہونے کا اظہار کر کے شعر میں جان ڈال دی ہے، ان کا شعر ہے۔

لگتا ہے غلاموں کو جیسے وہ دیکھ رہے ہیں جالی سے
ماحول میں ہر سو پھیلی ہوئی خوشبوئے محبت ہوتی ہے

''اے شہِ کون ومکان'' کی نعمت میں خاص طور پر یہ اشعار اپنے انداز بیان کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔

حرف ناخواندہ ہے تو پھر بھی تیری چوکھٹ سے — علم وحکمت کے خزانوں کو ابلتا دیکھا
پتھروں سے تری طائف نے تواضع کی تھی — تجھ کو بدلے میں لٹاتے گل ولالہ دیکھا
تو نے دنیا کو زر وسیم لٹایا جس روز — گھر میں اس روز بھی چولہا تیرا ٹھنڈا دیکھا

مقطع کا شعر اپنے ابہام کی وجہ سے بہت معنی خیز ہو گیا ہے۔

اے شہ کون ومکاں میں تیری رحمت کے نثار — گوشۂ چشم سے کچھ حال ہمارا دیکھا؟

''ذکر جمیل'' کے یہ دو شعر خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔

عاشق ہندی ہوں گنگا میں وضو کرتا ہوں میں
پھر جمال مصطفٰے کی گفتگو کرتا ہوں میں
وجد کرتی ہے صبا، ہر سو چٹک جاتے ہیں پھول
جب چمن میں شرح زلف مشکبو کرتا ہوں میں

''فیضانِ رسالت'' کے یہ اشعار خوبصورت، دلکش اور معنوی اعتبار سے قابل قدر نظر آئے۔

کہکشاں انکے نقوش کف پا کی تصویر — ماہ کامل کو اک آئینہ حیرت سمجھے
اہل دل جاں ہی نہیں کون ومکاں کو بھی فقط — آپ کی اک نگہِ لطف کی قیمت سمجھے
یہ بھی ایک معجزہ انکا ہے کہ ہر دشمن جاں — ان کو صادق کہے، سر تاج امانت سمجھے

اُلوہیت اور نبوت میں جن لوگوں نے غلوئے عقیدت کی وجہ سے فرق کوملحوظ نہیں رکھا ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تم نے افسوس، بشر بھی اسے رہنے نہ دیا — ہم جیسے اوج کمال بشریت سمجھے

''متاعِ عقیدت'' میں ایک مقام پر دل میں کھٹک پیدا ہوئی اس کا بھی اظہار ضروری ہے اشعر صاحب کا یہ لاجواب شعر۔

تم نے افسوس بشر بھی اسے رہنے نہ دیا
ہم جسے اوجِ کمال بشریت سمجھے

پڑھ کر جب ان کا یہ شعر

وہ شبِ اسرار کا دولہا، عرش کا مسند نشیں
ساقیٔ تسنیم وکوثر، قاسم خلد بریں

پڑھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا جس بات کی ان کو دوسروں سے شکایت تھی وہی بات ان کے یہاں کیسے آ گئی؟ انہیں کا لب ولہجہ، انہیں کے الفاظ، انہیں کا سوقیانہ اندازِ بیان اور انہیں کے خیالات جس سے وہ خود بیزار ہیں کیوں اپنا لیا، ہوسکتا ہے وہ خود بھی اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس کریں، ذیل کے دوشعروں پر بھی نظرثانی کی ضرورت ہے۔

جب ترے قدوم ناز فرشِ خاک پر پڑے — خشک ریگزار میں پھول سے بکھر گئے
انگشت پاک چشمۂ شیریں رواں کرے — منبر کا چوب خشک بچھڑ کر فغاں کرے

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اور دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ دونوں محل نظر ہیں اہل زبان کی طرف سے ان پر انگلیاں اٹھائی جائیں گی، دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ سے تاریخی واقعیت بھی مجروح ہوتی ہے۔

''متاعِ عقیدت'' پڑھ کر دل کو ڈھارس ہوئی کہ اردو شاعری عالم نزع میں نہیں ہے ابھی اس میں زندگی کی حرارت موجود ہے، پچھلے پچاس برسوں سے مصائب کی بارش نے عروس شاعری کے سارے نقوش اور رنگ دھودیئے ہیں اب نہ اس میں کشش اور

جاذبیت رہ گئی نہ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کو تسکین دینے کی صلاحیت باقی ہے، اردو مشاعروں میں جو ہجوم نظر آتا ہے وہ رنگین پر وبال والی قمریوں اور فاختاؤں کی نغمہ سنجیوں کے طفیل ہے ان کے چہچہوں سے گلستان مشاعرہ کچھ دیر کے لئے آباد ہو جاتا ہے اگر یہ قمریاں اور فاختائیں اڑ جائیں تو یہ چمن صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔

اُردو شاعری کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ اردو دنیا پیہم حوادث و مصائب ذہنی وفکری کشمکش میں مبتلا رہی، اور موت وزیست کی لڑائی لڑتی رہی، ایسی صورت حال میں جذبات مر جاتے ہیں، امنگوں پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے، طائر فکر کے پر و بال جھڑ جاتے ہیں ایسے ماحول میں کسی اچھی شاعری کی توقع فضول ہے دوسری بات یہ کہ اردو شاعری کے پاس اس ملک میں کوئی موضوع نہیں رہ گیا، غزل کی شاعری کے لئے جس گہری فکر اور بلند نظری کی ضرورت ہے وہ یہاں عنقا ہو چکی ہے صرف روزی روٹی کی وجہ سے کچھ لوگ اردو سے جڑے ہوئے ہیں، اسی لئے ادھر پچاس سالوں سے کسی شاعر کا کوئی ایسا دیوان یا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا جس پر اہل نظر توجہ دیں، ہمارے ملک میں سر دست نعت ہی ایک ایسا موضوع ہے جس پر محنت کی جائے تو شاید اردو شاعری کے تن مردہ میں زندگی کی کچھ رمق آجائے، ’’متاعِ عقیدت‘‘ پڑھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔

# افکارِ عالم

## فکرِ اسلامی کی روشنی میں

علمی، ادبی تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

جلد دوم

مولانا نظام الدین اسیر ادروی



شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴

# تفصیلات



زیر سرپرستی

**حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم**

مہتمم دار العلوم دیو بند

زیر انتظام

**بدر الدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دار العلوم دیو بند**

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (   )

نام کتاب : افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد دوم)
تالیف : مولانا اسیر ادروی
سن اشاعت : شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء
صفحات : ۴۱۶
تعداد اشاعت: بارِ اول، گیارہ سو
کمپیوٹر کتابت: محمد عیاض قاسمی، دیو بند
ہدیہ : /=

ناشر

**شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیو بند**

فون: 01336-222429

# ترتیب

# حرفِ اول

مولانا اسیر ادروی بہت اچھا لکھنے والوں میں ہیں، ان کی متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر آچکی ہیں، جنہیں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، موصوف جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کردیتے ہیں، زیر نظر کتاب ان کے لکھے ہوئے مضامین کا اہم مجموعہ ہے، یہ تمام مضامین ماہنامہ ''ترجمان الاسلام'' میں شائع ہوچکے ہیں، مولانا ہی اس رسالہ کے ایڈیٹر بھی ہیں، موصوف کی خواہش تھی کہ ان کے یہ مضامین شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے کتابی صورت میں شائع کردئے جائیں، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب مفتی مدرسہ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس اور رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم، نے ان کی یہ خواہش اپنی سفارش کے ساتھ مجلس شوریٰ میں پیش کردی، مؤقر اراکین شوریٰ نے کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو منظور کرلیا، اور اکیڈمی کو ہدایت دی کہ مولانا اسیر ادروی کے یہ مضامین جو علمی بھی ہیں، ادبی بھی اور تاریخی اہمیت کے حامل بھی، کتاب کی صورت میں شائع کردیئے جائیں، کتاب ۲۳×۳۶=۱۶ سائز میں آٹھ سو صفحات سے آگے جارہی تھی، اس ضخامت کی وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو بجائے ایک جلد میں طبع کرنے کے دو جلدوں میں لایا جائے، بعض دوسرے حضرات کی بھی یہی رائے تھی، اس لئے مضامین کے اس مجموعے کو دو جلدوں میں شائع کیا جارہا ہے۔

یہ کتاب کسی ایک موضوع پر مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا ایک اچھا اور مفید مجموعہ ہے، اس لئے دو جلدوں میں ہونے کے بعد بھی ہر جلد بجائے خود مکمل ہے، جس سے پوری طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی فاضل مؤلف کی دوسری کتابوں کی طرح قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور یہ بھی امید ہے کہ زندگی کی علمی وادبی شاہراہ پر مولانا کا سفر جاری رہے گا۔

کفیل احمد علوی

انچارج شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

۹؍شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۲؍اگست ۲۰۰۸ء

# ''عرفانِ محبت'' کا مطالعہ

آیئے آج ہم کچھ دیر کے لئے شعر وادب کی گلریز وادی میں چلتے ہیں، جہاں زعفران زار کشمیر کی مشکبار ہوائیں چلتی ہیں، جہاں تاج کی چاندنی نور برساتی ہے اور مالوہ کی سہانی سلونی رات کی زلف معنبر خوشبوئیں لٹاتی ہے۔

''شعر وادب'' چمکتے ہوئے صاف وشفاف بلور کا پیمانہ ہے، کوئی اس میں کوثر وتسنیم اور زمزم کے لطف لیتا ہے اور روحانی کیف وسرور کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، کوئی اس میں وہسکی اور رِم کی چسکیاں لیتا ہے اور اس کی نگاہوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں، جہاں رقص وسرور کی محفلیں جمی ہوئی ہیں اور حسن وشباب کے عریاں نظارے دعوت نظر دیتے ہیں، یہ جام بلور کسی کو عشق حقیقی کی لطافت و پاکیزگی کی مقدس فضاؤں میں لے جاتا ہے اور کسی کو عریانی وفحاشی اور ہوا وہوس کی کثافت ہی کثافت دیتا ہے، یہ اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا ذہن ومزاج۔

آج ہم صہبائے محبت کا ایک ایسا پاکیزہ چھلکتا ہوا جام پیش کرنا چاہتے ہیں جو ''مئے طہور'' سے لبالب بھرا ہوا ہے کہ اگر چھلک کر زمین پر اس کے چند قطرے گر جائیں تو ان حیات بخش قطرات سے چمن زار عشق حقیقی لہلہا اٹھے اور وہ گل بوٹے کھلیں کہ زمین لالہ زار بن جائے، اور جو اس کے چند گھونٹ پی لے تو اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ حجابات اٹھ جائیں جو ''حسن مستور'' کی تجلیوں کے لئے حجاب بنے ہوئے ہیں۔

عشق ومحبت جیسا پاکیزہ لفظ عشق مجازی اور بوالہوسی کی دنیا میں اپنے کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی پاکیزگی، اپنا تقدس اور اپنی لطافت ونفاست کھوتا جارہا ہے یہ لفظ زبان پر آتے ہی دل ہوا وہوس کے ایمان سوز نظاروں میں کھو جاتا ہے، اب یہ ایک ایسا پامال اور فرسودہ لفظ بن چکا ہے کہ زبان سے اس کا اظہار بھی ثقاہت کے خلاف محسوس ہونے لگا ہے۔

البتہ کچھ اہل دل نے اس کی آبرو کو بچائے رکھا ہے مگر ان کو کتنا خون جگر جلانا پڑا ہے، سوز وگداز کی کیسی کیسی بھٹیوں میں اپنے افکار وخیالات کو تپا کر کندن بنانا پڑا ہے اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سلوک ومعرفت کی راہوں سے گذرے ہیں، جنہوں نے عشق حقیقی کے تپتے ہوئے صحراؤں کی رہ نوردی کی ہے اور محبوب حقیقی کی طلب میں شب بیداری، تہجد گذاری، ذکر وفکر کی خارزار وادیوں سے گذرتے ہوئے اپنے تلووں کو لہولہان کیا ہے۔

ایسے لوگ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو عشق حقیقی اور محبت کے چراغ کو اپنے خون جگر سے روشن کرتے ہیں لیکن جب اس چراغ کی روشنی فضا میں پھیلتی ہے تو روشنی کے دیوانے اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں، ایسی ہی ایک عظیم ترین شخصیت قدوۃ العارفین شیخ المشائخ مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ کی تھی جن کا مجموعہ کلام ''عرفان محبت'' اس وقت میرے سامنے ہے، ان کی ذات مرجع خلائق ہی نہیں مرجع علماء ومشائخ بن گئی تھی، ان کی خدمت میں ہندوستان کے مشاہیر علماء، محدثین اور مشائخ کی حاضری واستفادہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے، بڑے بڑے مدعیان علم وفن کو ان کی مجلس میں سر جھکائے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس لئے ان کے کلام کی حلاوت میں روح کی لطافت، اور قلب کی پاکیزگی، عشق کی شوریدگی، جوش وسرمستی شامل ہے، اس کا ظاہری لباس بڑا شوخ اور رنگین ہے لیکن ذرا ٹھہر کر اس کی گہرائی اور معنویت پر غور کیجئے تو عشق حقیقی کا سوز وگداز، باطنی کیف ودرد کی ایک دنیا نظر آتی ہے۔

شعر وادب میں جب محبت کا لفظ آتا ہے تو مادی نگاہوں کے سامنے شادابی ورعنائی کا ایک پیکر جمیل آجاتا ہے، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب، میخانہ بدوش آنکھیں اور گھٹاؤں سے چشمک زنی کرتی ہوئی زلف شبگوں کہ جس کو چھو لینے، پاجانے اور چوم لینے کا ایک شدید جذبہ ایک جوان دل میں جاگ جائے، ہوسناک نگاہوں کے اس کھیل کو محبت کا نام دیا جاتا ہے، شعراء اس کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں اس طرح عشق

ومحبت کے ایک پاکیزہ جذبے کو رسوا کیا جاتا ہے، اس کے تقدس کو پامال کیا جاتا ہے، مرزا غالبؔ کو بھی اس کا احساس تھا اس نے اس کا ماتم بھی کیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مولانا پرتاپ گڈھی کے یہاں محبت ایک پاکیزہ اور مقدس ترین جذبے کا نام ہے تصوف وسلوک اور معرفت کی کٹھن راہوں کی ایک منزل ہے اور عارفین کا ایک بلند ترین مقام ہے جہاں تک رسائی کچھ آسان نہیں، اس محبت یا عشق حقیقی کی وادی میں وہی قدم رکھ سکتا ہے جو آبلہ پائی کی شکایت نہ کرے، پاؤں کے چھالوں کی اذیت کا احساس نہ ہو اس کی ساری کائنات لٹ جائے تو اس کو کوئی غم نہ ہو، اپنے اور یگانے بیگانے ہو جائیں تو اس کو اس کا کوئی ملال نہ ہو، دنیاوی زندگی کے سارے سہارے ٹوٹ کر بکھر جائیں تو اس کو صدمہ کے بجائے خوشی ہو کیوں کہ اس کے دل میں محبوب حقیقی کی بے پناہ محبت کے سوا اور کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے مولانا موصوف نے خود اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

نہ کوئی راہ پا جائے، نہ کوئی غیر آجائے　　حریم دل کا احمد اپنے ہر دم پاسباں رہنا

اگر آپ نے بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہے، ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر کچھ استفادہ کیا ہے تو آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ کہیں رنگ جلال غالب ہے، ہر بات میں سختی، ہر قدم پر دارو گیر، ہر لغزش پر تنبیہ اور سرزنش، مسترشدین ہر قدم پر لرزاں و ترساں، اس کے برعکس کہیں رنگِ جمال غالب ہے ہر ایک سے شفقت ومحبت، ہر ایک کی دلداری ہر ایک سے قربت ومحبت، اظہار ندامت پر مسرت، غلطیوں اور لغزشوں پر عفو وکرم، ہر مسترشد کو یہ یقین کہ مجھے قربت واختصاص حاصل ہے، یہ ان مشائخ کے یہاں ہوتا ہے جن پر جلال کے بجائے جمال کا غلبہ ہے، خطا کاروں کی ناز برداری اسی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے جو محبت مرشد کو محبوب حقیقی سے ہوتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے ان کے دلوں کو پھولوں میں بسا دیا ہے، ان کے تنفس سے محبت کی خوشبو پھوٹتی ہے ان کے الفاظ اتنے شیریں ہوتے ہیں کہ دلوں میں

اتر جاتے ہیں، یہ ان مشائخ کی غیر اختیاری کیفیت ہوتی ہے ان کی مجلس میں جانے والے ہر شخص کو اس سے کیف وسرور حاصل ہوتا ہے، اس کا دل کھنچتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کے قدموں پر سر رکھ دے، اسی کا نام ''فیضان محبت'' ہے مرکز محبت تو مرشد کا دل ہوتا ہے اس سے فیوض وبرکات کا صدور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے اور ہر شخص اس سے فیضیاب ہوتا ہے لیکن خود طالب کا دل محبت کا مرکز بن جائے اس بلند مقام کا حاصل کرنا کچھ آسان نہیں اسی لئے ایک شاعر نے کہا ہے ع

فیضان محبت عام تو ہے، عرفان محبت عام نہیں

مولانا موصوف کے دیوان میں سیکڑوں اور ہزاروں بار لفظ محبت کا استعمال ہے یہاں تک کہ ان کے مجموعۂ کلام کا نام بھی ''عرفان محبت'' ہے جہاں جہاں بھی موصوف نے لفظ محبت استعمال کیا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ارضی اور مادی محبت سے ماورا کوئی دوسری شئے ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

'عشق مجازی'' میں محبت ورقابت لازم وملزوم ہیں لیکن مولانا موصوف کے کلام مین اس کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ وہ محبت کے مفہوم کو اتنا وسیع اور اتنا بلند بنا دیتے ہیں کہ وہ اس کائنات پر چھا جاتی ہے اس محبت میں نہ کوئی حریف ہے اور نہ رقیب، بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ''محبت'' ایک مسلک زندگی ہے جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے، اور جو محبت میں شاعر کا شریک ہوتا ہے وہ ان کا ہم مسلک ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو ان کی محفل میں عزت ووقار حاصل ہوتا ہے، مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے اور لفظ محبت کی معنوی وسعت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے وہ فرماتے ہیں۔

ہاتھوں میں ہے ہر وقت ہی دامانِ محبت — کچھ اور ہی عالم میں ہیں خاصانِ محبت
جو بھی ہوا سو جان سے قربانِ محبت — واللہ وہی ہو گیا سلطانِ محبت
حاصل نہیں جب تک تجھے عرفانِ محبت — کامل نہیں ہرگز ترا ایمانِ محبت
کیا کہنا ہے، اللہ رے فیضانِ محبت — ہر آن نظر آتی ہے اک شانِ محبت
ہر حال میں رہتے ہیں غزل خوانِ محبت — فردوس بہ داماں ہیں غلامانِ محبت

رونا کبھی ہنسنا کبھی، جلنا کبھی بجھنا الوان محبت ہیں، یہ الوانِ محبت

خاصانِ محبت، سلطان محبت، غلامانِ محبت کے قوافی پر نظر ڈالئے، کیا غزل کے کسی شاعر کے یہاں یہ قافیے استعمال ہو سکتے ہیں، مقطع میں بھی اہل محبت سے خطاب ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رقابت کا تصور بھی اس محبت میں ممکن نہیں، محبت ایک مسلک زندگی ہے جس کی ایک علیحدہ دنیا ہے، فرماتے ہیں:

فرماتے ہیں یہ اہل محبت، ہو مبارک احمد! تیرا دیوان ہے، دیوانِ محبت

ایک دوسری غزل میں بھی مفہوم محبت کی جو وضاحت پیش کی گئی ہے اسی کے شواہد ملتے ہیں، اس غزل کی بھی ردیف، محبت ہے، اس غزل کا مقطع ہے۔

ادھر ہی ہوا میں بھی احمد روانہ چلا جس طرف کاروانِ محبت

ارضی اور مادی محبت میں تنگ دلی، تنگ نظری ہوتی ہے اور رقابت کی اتنی چنگاریاں راہوں میں ہوتی ہیں کہ وہاں کاروانِ محبت کی ترتیب ہی ناممکن ہوتی ہے، موصوف کے ساتھ پورا کاروانِ محبت ہے جس میں سے ہر ایک فرد کو محبت کا دعویٰ ہے اور سب کا محبوب بھی ایک ہی ہے ورنہ کارواں کیسے مرتب ہوتا، یہ کاروانِ محبت ایسا کارواں ہے کہ اس میں راستے کے ہر موڑ پر لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

شاعر کے نزدیک دعوائے محبت درحقیقت عہدنامہ کی پابندی کا نام ہے، محبت کی شریعت کے اوامر ونواہی ہیں اس کے احکام اور اس کی شرائط کی پابندی ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو محبت کا دعویٰ کرتا ہے شاعر کو اس کا احساس ہی نہیں، یقین ہے، وہ فرماتے ہیں:

بھولے ہیں نہ بھولیں گے کسی حال میں ہرگز ہر وقت نگاہوں میں ہے پیمانِ محبت

جو لوگ مقام جمال پر فائز ہیں، وہ ہر وقت اپنے حال میں مست رہتے ہیں، ان کے باطن کی نگاہیں اتنی روشن ہوتی ہیں کہ وہ ہمہ وقت جلوۂ محبوب سے اکتساب فیض میں مصروف رہتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے پورے وجود پر جوش، کیف و سرمستی چھائی رہتی ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر حال میں رہتے ہیں غزل خوان محبت فردوس بداماں ہیں غلامانِ محبت
ہر وقت جہاں ہیں ترے جلووں کی بہاریں فردوس کہیں یا اُسے زندانِ محبت

ہے ہر وقت اک کیف ومستی کا عالم جہاں سے الگ ہے جہانِ محبت
محبت محبت زباں پر ہے جاری ہماری زباں ہے زبانِ محبت

شاعر کو اپنے مقام ومرتبہ کا احساس ہے اس کو محبت کا عرفان حاصل ہے، لیکن سلوک ومعرفت میں اس راز کا زبان پر آنا اپنے مقام ومرتبہ کا دوسروں کو احساس دلانا جرم ہے، اس کا زبان پر آنا ناممکن ہے، اس لئے جب بات کہی جاتی ہے تو استعاروں اور کنایوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

کبھی عرش پر ہیں کبھی فرش پر ہیں یہ شانِ محبت یہ آنِ محبت

اس محبت کے کچھ آداب ہوتے ہیں، کچھ تقاضے ہوتے ہیں، تواضع، خاکساری خود کو اس راہ میں مٹادینا، خودی کو پامال کردینا اس محبت کی پہلی منزل ہے، اس راہ میں انانیت اور پندار سم قاتل ہے خود اپنی ہستی اور وجود پر مالکانہ تصرف بھی جائز نہیں، کیوں کہ محبوب حقیقی نے محبت کرنے والوں کی جان اور مال سب خرید لیا ہے **اِنَّ اللّٰہ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ** ہمارا وجود ہماری جان بھی ہماری کہاں رہی، موصوف فرماتے ہیں:

محبت تیری یہ برکت، محبت تجھ پہ صد رحمت نہیں پندار دیکھا میں نے سرشار محبت میں
کوئی نازاں نہ ہو گر جان بھی ان پر فدا کردے نہیں کچھ جان کی قیمت ہے بازار محبت میں

محبت میں ایک مقام وہ آتا ہے جب محبت کرنے والے میں خود شان محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے یہ کمال محبت کی دلیل ہوتی ہے یہ مقام کاملین کو حاصل ہوتا ہے پھر عوام وخواص کا رجوع ان کی طرف ہونے لگتا ہے جس طرح محفل میں شمع روشن ہو جاتی ہے تو پروانے از خود اس کے گرد آجاتے ہیں، لیکن وہ اپنی ذات کی منزل نہیں منزل نما بنائے رکھتے ہیں دوسروں کو ان کی ذات سے محبوب حقیقی کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی

ہے موصوف کہتے ہیں:

پکڑ لے ہاتھ جوان کا وہی محبوب تک پہنچے　　خوشا، یہ شان محبوبی، فدا کار محبت میں
خدا کا فضل ہے ورنہ میں اس قابل نہ تھا احمد　　کہ میں نے آگ جو بھر دی ہے اشعار محبت میں

مولانا موصوف نے سلوک ومعرفت کی مئے طہور کو پیش کرنے کے لئے غزل کا پیمانہ استعمال کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اس پیمانے کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی ہے بات وہی ہے، انداز بیان بھی وہی ہے،لب ولہجہ بھی غزل کا ہے مگر ان کی غزل پڑھتے ہوئے ذرا رُک کر شعروں پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسری دنیا کی بات ہے۔

محبوب سے ملاقات، سوال وجواب، کیف وسرور کا ایک نیا عالم ہوتا ہے اور محبت کی زندگی کا نا قابل فراموش واقعہ بن جاتا ہے، پھر محبوب حقیقی کا مقام عرش بریں ہے اس لئے محبوب حقیقی جس جگہ کو اپنی تجلیات کا مرکز یا اپنی جلوہ گاہ بنالے وہ جگہ خود عرش بریں بن جاتی ہے، محبوب سے قربت محبت کی معراج ہے اگر اس مقام پر فائز ہو جانے کی وجہ سے سالک پر کیف وسرمستی طاری ہو جائے تو یہ عین فطرت ہے، درج ذیل اشعار کو دیکھئے، اور پڑھئے، اور روحانی سرور وانبساط حاصل کیجئے، اور یہ بھی سوچئے کہ اس سے خوب صورت غزل اور کیا ہوسکتی ہے۔

ہے کیف سے لبریز سوالات کا عالم　　جنت کی بھی جنت ہے جوابات کا عالم
واللہ، نرالا ہے، تیری بات کا عالم　　بالا ہے تخیل سے، تری ذات کا عالم
محسوس لگا ہونے کہ دل عرش بریں ہے　　اللہ رے یہ ان کی ملاقات کا عالم
دل جھومنے لگتا ہے مسرت سے ہمارا　　یاد آتا ہے جب ان کے خطابات کا عالم

معرفت وسلوک میں سالک کا ایسے مقامات سے گذر ہوتا ہے کہ عقل وخرد کی دنیا جو مادیات کے مشاہدے کی عادی ہے اس کو محال سمجھتی ہے، کرۂ زمہریر، کرۂ نار اور خرقِ التیام کی بحث کرنے لگتی ہے اور کبھی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، ہر قدم پر عقل وخرد کا ہاتھ رہوار فکر کی لگام کھینچ لیتا ہے لیکن حقیقت حقیقت ہی رہے گی، مادی اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل وہاں تک نہ پہنچ سکے تو اس کا قصور ہے،

موصوف نے اس کا اظہار ایک شعر میں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

لاکھ مشاہدۂ حق کی گفتگو ہو مگر بادۂ وساغر کہے بغیر بات بنتی نہیں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی واردات وکیفیات کے بیان میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی اور اگر بیچ میں کوئی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے تو غزلیت مجروح ہوتی ہے انداز بیان میں وہ جاذبیت اور دل کشی باقی نہیں رہتی اور سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ سالک اگر اپنی واردات وکیفیات کا اظہار اشارات وکنایات کے پردوں میں بیان کرنے کے بجائے غیر مبہم الفاظ میں بیان کرے تو دعویٰ محبت کے خام ہونے کا الزام آ جاتا ہے، رازِ عشق کا افشاء بذات خود محبت کی شریعت میں نا قابل معافی جرم ہے اس لئے غزل ہی کا لب ولہجہ اور انداز بیان مستعار لینا پڑتا ہے، مولانا موصوف مرشد کامل اور شیخ المشائخ ہیں، اہل دل ہیں، شان جمالی کے مظہر ہیں، ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے اور ان اشعار کو پڑھئے۔

اب رفتہ رفتہ ہوش میں کچھ آ رہے ہیں ہم محفل سے ان کی روتے ہوئے جا رہے ہیں ہم

جب آ رہے تھے دل کا تھا عالم ہی اور کچھ عالم ہی دل کا اور ہے جب جا رہے ہیں ہم

یہ راز وہ ہے جس کو سمجھتے ہیں اہل عشق کچھ کھو رہے ہیں شوق سے کچھ پا رہے ہیں ہم

آخری شعر کی معنوی وسعتوں پر نگاہ ڈالئے محبوب حقیقی کو پانے کے لئے دنیاوی عزت وشہرت، دولت وثروت، اعزاز وافتخار، آرام وآسائش، عہدہ ومنصب سب کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر اگر قسمت نے یاوری کی تو اس کی محفل مین بار پا سکتے ہیں، اپنی ساری کائنات کو ٹھکرا دینے کو کچھ کھو رہے ہیں شوق کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں گویا اپنی ساری کائنات لٹا کر خوش ہیں اپنی بے سروسامانی پر نازاں ہیں لیکن اس کے صلے میں محبوب حقیقی کی محبت وقربت جیسی دولت بے بہا حاصل ہوئی اس کو ''کچھ پا رہے ہیں ہم'' کے پردۂ ابہام میں چھپا لے گئے کیونکہ اس کے اظہار کی اجازت نہیں، سچی بات یہ ہے کہ کسی شخصیت بالخصوص اللہ والوں کی شخصیات اور ان کے مقام

ومرتبہ کو سمجھنا کچھ آسان نہیں موصوف نے بڑا مزہ لے لیکر اس کو خود بیان کیا ہے۔

احمد! تجھے نہ جانا، نہ سمجھا تمام عمر گو ساتھ جارہے ہیں ترے، آرہے ہیں ہم

بہت سے قرآنی حقائق کو غزل کے لباس میں اتنا خوشنما بنا کر پیش کیا ہے کہ پہلے مرحلہ میں نگاہ اس کی تہ تک نہیں پہنچتی ہے اور جب ذہن اس معنی کا ادراک کر لیتا ہے تو اس کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے تو لیلائے حقیقی بے حجاب سامنے آجاتی ہے، قرآن میں خدا نے کہا ہے **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الوَرِيْد** ہم انسان کی رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہم نے خدا کو دیکھا ہے، اسی طرح قرآن نے اپنے مخلص بندوں کے متعلق کہا ہے **فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ** مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، ظاہر ہے کہ دونوں کی یاد میں زمین آسمان کا فرق ہے خدا بندے کو یاد کرے یہ معراج عبدیت ہے، اور یہ مقام بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے موصوف کی غزل کے یہ چند اشعار پڑھئے۔

قیامت ہے تراانز دیک ہوکر دور ہو جانا نظر کے سامنے رہتے ہوئے مستور ہو جانا

یہ اکرام محبت ہے، یہ انعام محبت ہے کہ اس کے فضل سے ذاکر کا بھی مذکور ہو جانا

یہ محبت ہی کا فضل ہے کہ خدا بندے کو یاد کرتا ہے غالب نے بھی اس نکتہ کو پالیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اگر چہ اس میں ایک نئی بات کہی گئی ہے مگر مولانا موصوف نے اس کو انعامِ محبت اور اکرام محبت سے تعبیر کر کے دونوں کے یاد کرنے کے فرق کو ظاہر کر دیا ہے گویا محبوب کی طرف سے طالب کے جذبہ محبت کا اعزاز بھی ہے اور محبت کی طرف سے انعام بھی، اور یہی حقیقت واقعہ بھی ہے۔

سالک کی دنیا ہی اور ہوتی ہے اسکی خوشی وغم کے اسرار کو کون سمجھے گا یہ تو باطنی کیفیات کے زیر اثر ہیں اور وہاں تک کسی نگاہ کی رسائی بہت مشکل ہے موصوف فرماتے ہیں۔

ارے ناداں نہ سمجھے گا یہ اسرار محبت ہیں کبھی رنجور ہو جانا، کبھی مسرور ہو جانا

جو ہیں اہل محبت بس وہی اس کو سمجھتے ہیں ۔۔۔ کسی کا دیکھ لینا، درد کا کافور ہو جانا

شریعت کی پابندیوں کو خدا کی نعمت تصور کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ پابندیاں نہ ہوتیں تو انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ جاتا جب کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، موصوف کہتے ہیں۔

اگر آزاد ہم ہوتے، خدا جانے کہاں ہوتے ۔۔۔ مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہو جانا

سلوک وطریقت کی راہوں میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سالک تجلیات کی پھوار میں نہا جاتا ہے، کیف وسرمستی کے ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے کہ اس کا لفظوں میں بیان دشوار ہو جاتا ہے لیکن تزکیۂ نفس کے لئے کبھی کبھی کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔

قیامت ہے ترے عاشق کا مجبور بیاں رہنا ۔۔۔ زباں رکھتے ہوئے بھی، اللہ اللہ بے زباں رہنا

اگر دل میں قوت تحمل ہے اور آنکھوں کو تاب نظارہ ہے تو محبوب حقیقی کی قربت اسے نصیب ہو جاتی ہے موصوف کا شعر ہے۔

مبارک تجھ کو اسرار کرم کا راز داں رہنا ۔۔۔ مبارک ہوز میں پر تیرا بن کر آسماں رہنا

زمین وآسمان کے تقابل نے شعر میں جو حسن پیدا کر لیا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے، اب اسی غزل کے چند اشعار اور

یہ فیضانِ محبت ہے یہ احسانِ محبت ہے ۔۔۔ سراپا داستاں رہتے ہوئے بے داستاں رہنا

یہی ضبط محبت ہے، یہی شرط محبت ہے ۔۔۔ تڑپنا رات دن اور پھر بھی بے آہ وفغاں رہنا

یہ معراجِ محبت ہے، یہ اعجاز محبت ہے ۔۔۔ ہزاروں زخم کھا کر مسکرانا، شادماں رہنا

آخری شعر کا صحیح مفہوم وہی لوگ زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو حضرت موصوف کی نجی زندگی سے واقف ہیں، ان کی جلوت وخلوت کی مصروفیتوں سے آشنا ہیں اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے ہے، موصوف کی زندگی کو یقیناً محبت کا اعجاز اور آپ کو محبت کی معراج حاصل تھی۔

ارضی اور مادی محبت جن مراحل سے گذرتی ہے ہر غزل گو شاعر اس کا اظہار کرتا ہے، کیفیات، واردات اور اس کے اظہار میں عشق حقیقی وعشق مجازی دونوں میں

یکسانیت ہے، لیکن جس کا دل عشق حقیقی کی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے سطحی محبت کے غزل گو شعرا جو کچھ کہتے ہیں یہاں بھی اس سے مختلف لب ولہجہ نہیں ہے، اب درج ذیل اشعار اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر پڑھئے کہ اس کا کہنے والا شیخ وقت ہے، مرشد کامل ہے ساری دنیا سے کٹ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا ہے، لباس چہرہ ہر چیز سے جذب وجنوں کیف وسرمستی شوریدگی وارفتگی نمایاں ہے اس لئے اس کی زبان سے جو بات نکلی ہے وہ یقیناً اس دنیا کی نہیں، اس کا عالم ہی اور ہے موصوف کا ایک شعر ہے، یہ یاد رکھئے کہ ''وعدۂ فردا'' اردو غزل کا خاص لفظ ہے۔

گذر رہی ہے جو دل پر، وہ کوئی کیا جانے   بنا دیا مجھے بے کیف یاد فردا نے

یاد فردا اس شعر کی جان ہے کل میدان حشر قائم ہونے والا ہے، حساب وکتاب کا مرحلہ درپیش ہوگا محبوب حقیقی کی بارگاہ میں حاضری ہوگی، ہم نے محبت ادا کرنے میں جو کوتاہیاں کی ہیں اس کی جوابدہی کرنی ہے، ظاہر ہے یہ فکر جاں سوز اور روح گداز ہے اس لئے آج کی زندگی بے کیف ہوجائے تو یقیناً یہی ایک فطری ردعمل ہے، اسی غزل کے چند شعر اور سنئے، اردو غزل میں ایک ذات شریف حضرت ناصح کی بھی ہوتی ہے شعراء نے اس پر خوب طبع آزمائی کی ہے موصوف نے جو کچھ کہا ہے وہ سب سے جداگانہ ہے، آپ کا ایک شعر ہے۔

نہیں جو شمع محبت کے ہائے پروانے   خدا کی شان، وہ آئے ہیں ہم کو سمجھانے

کہیں بھی ہم ہوں مگر فیض ہے یہ ساقی کا   ہمارے پاس پہنچتے ہیں اڑ کے پیمانے

پیمانے کا اڑ کر پہنچنا اردو غزل میں ایک نیا خیال ہے، مگر دوسری طرف یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ سالک کا وہ مقام ہے جو پوری زندگی کو تج دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

نہ جس کے دل پہ لگی چوٹ ہو محبت کی   وہ بدنصیب بھلا کیف درد کیا جانے

جس کا دل محبت آشنا نہیں، وہ درد محبت کی لذت سے ناواقف ہے وہ تو بدنصیب

ہے پھر اسے کسی اہل محبت کو سمجھانے اور نصیحت کرنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے۔
کمال عشق یہ ہے کہ ساری کائنات لٹادو، متاع زندگی کو محبوب کے قدموں پر نچھاور کردو مگر لب کو سی رکھو، زبان خاموش ہو، یہ سبق پروانے سے حاصل کرو، موصوف کہتے ہیں۔

کمال یہ ہے کہ آواز تک نہیں آتی وفورشوق میں یوں جل رہے ہیں پروانے

پھر اس شعر کے بعد مقطع نے پہلے شعر کو مئے دوآتشہ بنادیا ہے، کہتے ہیں۔

نثار جان حزیں کردے شوق سے احمد کھڑا ہے کون؟ ذرا دیکھ، تیرے سرہانے

محبت کی معراج یہی ہے کہ محبوب کے قدموں میں حیات مستعار کو ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوجائے، مولانا پرتاپ گڈھی کی شاعری تفریح طبع کے لئے نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی کا مشن تھا اس مشن کے لئے اپنی شاعری کے ذریعہ انہوں نے کچھ رہنما اصول بنائے ہیں، ان کا کوئی شعر قافیہ پیمائی کے لئے یا قافیہ سے مجبور ہوکر نہیں کہا گیا ہے، وہ نثر سے زیادہ اپنے اشعار سے اپنی مجلسوں میں کام لیتے تھے، وہ بہ تکلف یا مشق ومزاولت سے شاعر نہیں بنے بلکہ قدرت نے ان کی زبان پر الہامات کی بارش کردی اور قدرت نے خود ہی ان سے شعر کہلوائے ہیں، آپ خود غور کریں کہ ایک انتہائی پسماندہ اور دور افتادہ گاؤں میں نشو ونما پائی، گاؤں کی سادہ زندگی گذاری، دیہاتی زبان اور دیہات کے لباس میں زندگی کا بڑا حصہ گذارا چالیس سال کی عمر سے پہلے آپ کی زبان سے ایک شعر نہیں نکلا نہ کسی شاعر کے دیوان کا مطالعہ کیا اور نہ شعر وشاعری کی طرف طبعی رجحان تھا، نوجوانی ہی میں تصوف کی طرف میلان ہوا اور ہندوستان کے مشہور شیخ مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ایک خلیفہ سے بیعت ہوگئے وہ بزرگ اگر چہ جامعہ ازہر مصر میں سترہ سال تعلیم حاصل کرکے آئے تھے اور پوری بخاری شریف نوک زبان تھی مگر تصوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ دیہاتی زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اتنی سادہ زندگی بسر کی کہ یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ عالم فاضل ہیں، مولانا پرتاپ گڈھی ان سے بیعت تھے، مرشد کا رنگ مسترشد پر لازمی طور پر پڑتا

ہے، ان حالات میں مولانا موصوف کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نظر نہیں آتا کہ یہ کہا جا سکے کہ اس نے رہوار شاعری کو مہمیز کیا ہوگا اور ان کی شاعری کی قوت خوابیدہ کو بیدار کر دیا ہو، بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری الہامی ہے اور عطیہ خداوندی، اسی راہ سے قدرت ان سے اصلاح وتزکیہ باطن کا کام لینا چاہتی تھی خود کہتے ہیں۔

یہ دل کی ہے آواز جو آتی ہے زباں پر　　　توبہ کریں، کیا کہتے ہیں؟ شاعر میں نہیں ہوں

ان کی مجلسوں میں حاضری دینے والے بتاتے ہیں کہ حضرت پرتاپ گڈھی پر جب ایک خاص طرح کا کیف طاری ہوتا تو اپنی مجلس میں اشعار پڑھتے اور ترنم سے پڑھتے تھے، سننے والوں کا تاثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے الفاظ زبان سے نہیں دل سے نکل رہے ہیں، اور سامعین پر وہی کیف طاری ہو جاتا تھا جس میں وہ خود ڈوبے ہوئے رہتے تھے، سلوک ومعرفت کے اسباق اپنے اشعار کی زبان میں پڑھاتے تھے ذرا آپ صورتِ حال کا تصور کیجئے ایک عمر رسیدہ سیدھا سادہ انسان معمولی لباس میں نصف ساق تک چڑھا ہوا پاجامہ، موٹا ڈھیلا ڈھالا لنبا کرتا دو پلی یا گول سادہ ٹوپی، دائم المریض، ہر دم دوا کا سلسلہ جاری جو دوا چاہے کھلا دیجئے وہ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے تھے کہ یہ دوا کیوں کھلائی جا رہی ہے، ایسا شخص ترنم سے اشعار پڑھے، ترنم بھی ایسا نہیں کہ قوت سامعہ کے لئے اس میں کوئی دلکشی ہو لیکن ان کے اشعار پر پوری مجلس سر دھنتی تھی، رقت قلب سے آنکھیں بھر آتی تھیں دل بولنے لگتا تھا اور رجوع الی اللہ کے جذبے کو ایک غیر مرئی ہاتھ بیدار کر دیتا تھا۔

عرفان محبت کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں جہاں نگاہ رک گئی، کچھ ٹھہر کر سوچا پھر پڑھا، دل نے جو اثر قبول کیا وہی تاثرات آپ کے سامنے میں نے پیش کر دیئے ہیں، اردو شاعری کے نقاد ''عرفان محبت'' کو کس نگاہ سے دیکھیں گے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، ہوسکتا ہے لفظوں کے بازیگر اس کے بعض ثقیل الفاظ پر اعتراض کریں، تعقید لفظی پر انگلیاں اٹھائیں، ترکیبوں اور جملوں کی بندش کے بارے میں نکتہ چینی کریں، میں اس طرح کی تنقید کو اس لئے بے محل سمجھتا ہوں کہ یہ شاعری اپنی قادر الکلامی کے

اظہار کے لئے نہیں ہے بلکہ شاعری کو اپنے بلند مقاصد کے لئے ذریعہ بنایا گیا ہے اگر اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی ایک دو اینٹیں خستہ ہوں تب بھی وہ دوسری منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

حضرت پرتاپ گڈھی شیخ المشائخ اور قطب الاقطاب کہے جاتے تھے ہندوستان کے مشاہیر علماء ومشائخ ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، عارفین ان کے مقام ومرتبہ سے واقف تھے وہ ان کی شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے حقائق محسوس کرتے تھے اور سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ عشق حقیقی کی جو آگ ان کے سینے میں بھڑک رہی تھی غزل کے ذریعہ اسی آتش شوق کی گرمی ان لوگوں کے دلوں تک پہنچا رہے تھے جو عشق کی حرارت سے خالی تھے، مولانا موصوف کی شاعری کو صرف اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے، انہوں نے خود بھی کہا ہے

تنہا نہ چل سکیں گے، محبت کی راہ میں میں چل رہا ہوں آپ مرے ساتھ آیئے
میں چل رہا ہوں منزل مقصود کی طرف چلنا ہو آپ کو بھی تو ہمراہ آیئے

# حضرت نانوتوی کا قصیدہ بہاریہ

## در نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسن کاکوروی کا قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' کافی مشہور ہے کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے سلسلہ میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، لیکن اس قصیدہ پر ہندو مذہبیات کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ دیر تک رہوارِ فکر کاشی اور متھرا کی فضاؤں میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ وحدانیت اور توحید کا پیغام لیکر آنے والے شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال ایسے ماحول اور ایسی فضا میں کیا جانا چاہئے تھا جو آپ ﷺ کے منصب نبوت کے شایان شان ہے۔

اس کے برخلاف مولانا قاسم نانوتویؒ کے قصیدہ بہاریہ میں ایک ایسی لطیف و پاکیزہ، عشق و محبت کے جذبات میں آگ لگا دینے والی فضا کی منظر کشی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے جو دلوں کو بدمست اور سرشار کر دیتی ہے، احساسات پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے، شوریدگی و آشفتگی اور ایسی بیتابی کا ماحول بن جاتا ہے جو محبوب رب العالمین کے استقبال اور خیر مقدم کے شایان شان ہے عشق میں دیوانگی کا ظہور بہار کی آمد سے وابستہ ہے، گریبان کے چاک کرنے اور دامن کو تار تار کرنے کا یہی موسم ہے، پوری اردو شاعری اس کی عکاس ہے اس لئے حضرت نانوتوی کا یہ نعتیہ قصیدہ بہاریہ ہونے کی وجہ سے بڑا وجد آفریں اور احساسات کو مہمیز کرنے والا ہے اور جب بہار کی منظر کشی کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل آتا ہے تو روح عشق و محبت کے جذبات سے سرشار ہو جاتی ہے۔

حضرت نانوتوی شاعر تھے؟ میرے ذہن میں اسکا تصور بھی نہیں تھا، کیوں کہ میں ان کو تحصیل شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے دیکھتا ہوں، میلہ خدا شناسی میں پادریوں اور آریہ سماجیوں کو ایسے گھاٹ پر مارتے پاتا ہوں جہاں ان کو پانی بھی نہ مل

سکا، رڑکی میں دیانند سرسوتی کی پناہ گاہ مین گھس کران کی چرب زبانی کے لبادہ کو تار تار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، فرسودہ اور بوسیدہ علم کلام کی جگہ ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال کراس پر ایک شاندار محل تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے دار العلوم دیو بند کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں آخرانہوں نے شعر وشاعری سے کب دلچسپی لی؟ ان کی شخصیت اور ان کے گرد وپیش کے ماحول سے شاعری کا کوئی جوڑ اور ربط نظر نہیں آتا، وہ تنہائی پسند، تقشّف کی حد تک زاہد مرتاض نظر آتے ہیں لیکن ان کے کاغذات میں یہ قصیدہ بہار یہ نعتیہ ملا تو یقین کرنا پڑا کہ یہ کلام انہیں کا ہے اور یہ جو ہر بھی ان کی تہ در تہ شخصیت میں کہیں پوشیدہ تھا جس کا ظہور بعد میں ہوا۔

حضرت نانوتوی غالب، مومن اور میر کے ہم عصر ہیں یہ تینوں اردو شاعری کے اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں ہیں، اقلیم سخن پر ان کی حکمرانی تھی، حضرت نانوتوی اس حکمراں طبقہ میں نہیں تھے وہ تو عبد الحق محدث دہلوی شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبد العزیز محدث کی صف میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ذہین وفطین انسان اپنے گرد وپیش پر ناقدانہ نظر رکھتا ہے، اپنے گرد وپیش کے حالات سے بے تعلق ہو کر بھی اس کا مزاج شناس ہوتا ہے، شاعری بھی اس دور میں ذریعہ اظہار کا بہت مؤثر وسیلہ تھا اگر علماء کی صفوں میں بھی اس ذریعہ اظہار کو اپنانے والے کچھ لوگ ملتے ہیں تو یہ کوئی حیرتناک بات نہیں ہے، حضرت نانوتوی کا شمار بھی انہیں علماء میں تھا جن کی فطرت میں جوہر شاعری پوشیدہ تھا، اور اس کا کبھی کبھی ظہور بھی ہوا۔

حضرت نانوتوی کا وہ قصیدہ (۱۵۱) اشعار پر مشتمل ہے، اس کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ کہنہ مشق اور ایک قادر الکلام شاعر تھے، لیکن اس کمال کا ظہور اس لئے نہیں ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طوفانی زندگی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی جو آپ کے شاعرانہ جذبات کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی اس سے نبرد آزمائی وقت کا پہلا اور بڑا فریضہ تھا، اس طوفانی دور میں شاعری ''تیز آندھی میں

چراغوں کا سفر ہو جیسے“ لیکن یہ حیرت انگیز حقیقت کیسے تسلیم کی جائے، اتنے طویل قصیدہ کہنے میں کامیابی اسی وقت ہوسکتی ہے جب سالہا سال مشقِ سخن کا سلسلہ رہا ہو، یک بیک اتنا مرصع کلام تخلیق کرنا تجربات کی دنیا میں قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت نانوتوی کا کلام ہم کو کہیں نظر نہیں آتا سوائے اردو وفارسی کی چند نظموں کے، اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے آپنے نظمیں لکھی ہونگی لیکن نہ کسی کو سنایا نہ اس کی اشاعت ہونے دی پھر وہ ضائع ہوگئیں اس کی حفاظت آپنے مناسب نہیں سمجھی ہوگی لیکن ان تمام شکوک وشبہات کے باوجود یہ قصیدہ بہاریہ آپ کی تخلیق ہے اور اس کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت نانوتوی میں قوت تخیّل وہبی تھی، ہر ذہین وفطین انسان کی فطرت میں یہ جوہر موجود رہتا ہے اور اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے لیکن طائرِ تخیل کی بلند پروازی کو اپنے حدود میں رکھنے کے لئے قوت ممیّزہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بے سمت پرواز کو روک سکے اور یہ جوہر تجربات ومشاہدات پر گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کسبی ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں حضرت نانوتوی میں یہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود تھیں صرف الفاظ کا صحیح استعمال جو تخیل کی بنائی ہوئی تصویر متشکل کرکے دوسروں کے سامنے پیش کرسکے اسی کا نام شاعری ہے حضرت نانوتوی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری قدرت حاصل تھی اس لئے وہ اس طویل قصیدہ کے کہنے میں کامیاب ہوئے، قصیدہ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا ہے کہ الفاظ کی گہرائی معنویت اور ان کی وسعتوں پر آپ کی نگاہ تھی آپ کی نثری کتابوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے یہ طویل قصیدہ آپ کے قلم کا شاہکار بن کر ظاہر ہوا تو کوئی تعجب خیز انکشاف نہیں بلکہ ایک صداقت تھی جو دیر میں ظاہر ہوئی۔

ایک بات اور حضرت نانوتوی کا ابتدائی دور اردو کے عنفوان شباب کا دور تھا ابھی اس میں پختگی نہیں آئی تھی بہت سے الفاظ اس زمانہ میں مستعمل تھے جو بعد میں متروک ہوئے، یہ الفاظ اردو شاعری میں ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں اسی طرح بہت سے

الفاظ کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی آج سے مختلف تھا بعد کے دور میں اس کی بھی اصلاح کردی گئی، اس لئے حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ میں بھی ایسے الفاظ، تلفظ اور لب ولہجہ کو اختیار کیا گیا ہے جو بعد کے دور میں متروک ہوئے اس قصیدہ کا مطالعہ اسی دور کے چوکھٹے میں رکھ کر کرنا چاہیئے۔

قصیدہ میں تخیل کی بلند پروازی، تجربات ومشاہدات کی خوب صورت منظر کشی مظاہر فطرت کا مطالعہ اور اس کی تصویر کشی اتنے دل کش انداز میں ہے کہ پڑھتے ہوئے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے، قصیدہ کا عنوان ہے ''قصیدہ بہاریہ در نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

نہووے نغمہ سرا کس طرح سے بلبل زار — کہ آئی ہے نئے سر سے چمن چمن میں بہار
ہر اک کو حسب لیاقت بہار دیتی ہے — کسی کو برگ، کسی کو گل اور کسی کو بار
کیا ہے بھیج کے سیل آب چاہ کو معزول — بجائے بادصبا، بوئے گل ہے کار گذار
کریں ہیں مرغ چمن سارے مشق موسیقی — کہ گانے ہیں انہیں اس سال شکر حق میں ملار

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کا شہرہ ہے، آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے پھولوں کی خوشبو فضا میں ہر طرف دڑتی پھرتی جیسے بادصبا کے ہاتھ سے چمن کی آرائش کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بوئے گل چمن کو سنوارنے اور سجانے میں لگی ہوئی ہے تمام مرغان چمن نے جو خوش الحان ہیں ابھی سے موسیقی کی مشق شروع کردی ہے کیونکہ جب بہار کی سواری اس سال آئے گی تو اس کے استقبال میں استقبالیہ ترانے گانے ہیں اس کی بعد حضرت نانوتوی کہتے ہیں۔

بہار گل کی خبر سن کے چھڑکے ہے پانی — سحاب، سبزۂ پژمردہ پر کہ ہو ہوشیار
پھریں ہیں کھیلتے آب رواں و بادصبا — کھلے ہیں غنچے ہنسیں ہیں گل وخوش ہیں ہزار
خوشی سے مرغ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں — کفِ ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
اچھلتے ہیں کہیں دیکھ اک طرف کو فوارے — کہیں ہیں کودتے اونچے سے آب پر ابشار
چمن کو دیکھ کے پھولا پھلا ہوا قمری — کرے ہے سرو پہ تسبیح حق پکار پکار

آدمی کی آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتی ہیں تو پانی کے چھینٹے ڈال کر اس کو ہوشیار کیا جاتا ہے اس تجربہ سے کام لیکر حضرت نانوتوی نے کہا: دھوپ کی شدت کی وجہ سے سبزے مرجھا جاتے ہیں جو چمن میں اداسی پیدا کرتے ہیں بادل کو خیال آیا کہ موسم گل کی آمد آمد کا شہرہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کو سنوارنا سجانا اور اس کو استقبال کے لئے چاق و چوبند کرنا میری ذمہ داری ہے اس لئے اس نے اونگھتے ہوئے پودوں پر پانی چھڑک کر ان کو ہوشیار کر دیا یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ جوں ہی پہلی بارش ہوتی ہے سبزوں میں تازگی آجاتی ہے سکڑے سمٹے ہوئے سبزے پانی پی کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر حضرت نانوتوی بتاتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کی خبر کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اس لئے ہر طرف بہجت و مسرت کے نظارے نظر آتے ہیں، جب کہیں خوشی کی کوئی تقریب ہوتی ہے تو بچے بچیاں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہر طرف بے مقصد دوڑتے پھرتے ہیں ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں ہر دیکھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہاں کوئی جشن خوشی کی کوئی تقریب ہونے والی ہے، اس طرح کائنات کی ہر چیز فرط مسرت سے کھیل کود کر رہی ہے آب رواں، بادصبا خوشی سے دوڑ بھاگ کر رہے ہیں، چمن میں غنچوں اور پھولوں کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل رہی ہے، بلبل ہزار داستان اپنی جگہ "حق سرہٗ" کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہے کہ اب جلدی بہار کا روح افروز دور آنے والا ہے جب اس کو نغمہ سرائیوں کا سنہرا موقعہ ہاتھ آئیگا۔

باغوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ ان کا گانا ہے ادھر ادھر پھدکتے پھرنا ان کا رقص مسرت ہے اس محفل طرب میں درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں پانی کے فوارے وفود مسرت سے اچھل رہے ہیں آبشار کا پانی پچاسوں فٹ کی بلندی سے نیچے پانی کی سطح پر کود کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہا ہے، قمری سرو کے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھ کر بہجت و مسرت کے موقعہ پر "سبحان تیری قدرت" کے نغمے الاپ رہی ہے گویا پوری کائنات فرط مسرت سے جھوم رہی ہے، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں ہر چیز سے مسرت نمایاں ہے، حضرت نانوتوی کا طائر فکر

کن کن وادیوں کی خبر رکھتا ہے درج ذیل اشعار دیکھئے۔

ہوا ہے چرخ کا سب، اب کے صرف بارش آب — زمین سے اسے ہووےگی حاجت امطار
چمن میں کثرت گل سے رہی نہ گنجائش — پھرے ہے چارطرف بوئے گل، خدائی خوار
عجب نہیں جو جمئیں آب تیغ سے پھر سر — کہ نام آب ہی نشو ونما کو ہے درکار
سمجھ کے تخم بشر، کیا عجب جو مردوں کو — قوائے نامیہ دیں اب کی بار برگ وبار

استقبال بہار کے اہتمام میں پورے چمنستان عالم کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے آسمان نے اتنی فیاضی سے بارش کی ہے کہ اس کا سارا خزانہ آب ختم ہو گیا ہے، اگر اتفاقاً آسمان کو بھی پانی کی ضرورت پیش آ گئی تو اس کو زمین سے پانی مانگنا پڑے گا، اسی وجہ سے چمن میں پاؤں رکھنے کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی، انتہا یہ ہے کہ جو خوشبو ہمیشہ پھولوں کے ساتھ رہی جہاں پھول رہا وہیں خوشبو بھی رہی مگر پھولوں کے اژدحام کی وجہ سے خوشبو کو پھولوں کی صحبت نصیب نہیں کیونکہ چمن میں پاؤں رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اس لئے خوشبو ہر طرف آوارہ و سرگشتہ گھوم پھر رہی ہے شاعر کو صرف یہ کہنا ہے کہ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس اندازِ بیان نے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کر دیا ہے پھر حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کی خبر سے نشو ونما کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''آبِ تیغ'' (تلوار کی دھار) جو انسان سے حیات چھین لیتی ہے اس کا وجود مٹا دیتی ہے لیکن اب بہار کی قوت اتنی طاقتور ہے کہ آپ میں چونکہ پانی (آب) کا ذکر ہے اور اب صرف پانی کا نام لینا نشو ونما کے لئے کافی ہے اس لئے آب تیغ سے انسان مرنے کے بجائے زندگی پا جائیگا ایسی زبردست قوت نمو کی وجہ سی مُردوں اور لاشوں میں جان پڑ جائیگی کیونکہ قوت نمو اس کو تخلیق انسان کے لئے بیج سمجھ لے گی اور بیج سے پیداوار ہوتی ہے اس لئے انہی لاشوں سے انسان از سر نو وجود میں آ جائیں گے، یہ بہار کی پیدا کردہ زبردست قوت نمو کا فیض ہوگا، اس کے بعد کے اشعار ہیں۔

یقیں ہے اب کے تر و تازگی کے باعث سے — بغیر آگ کے پکنا ہو کشت کا دشوار

جو بوئیں ہاتھ سے اپنے ہی زاہدان خشک تو نکلے شجرہ طوبیٰ زدانہ ہالے شمار
شرار دانۂ بارود کو لگے ہیں پھول عموم فیض بہاری سے آگ ہے گلزار

کھیتوں میں گندم کی بالیوں میں دانے اس وقت پکتے ہیں جب ان کو دھوپ کی تمازت ملتی ہے کھیتوں کو سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سال موسم بہار کی شادابی اور تر وتازگی کا یہ عالم ہے کہ سورج کی حرارت نا کام ہوگئی ہے اور کھیتوں میں دانوں کو پکانے کی صلاحیت اس سے ختم ہوگئی ہے اس لئے آگ جلا کر کھیتوں کو حرارت پہنچانے کا نظم کرنا ہوگا تبھی کھیتوں میں دانے پختہ ہونگے ''زاہدان خشک''میں لفظ خشک سے کام لیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے کہا کہ خشکی اور طراوٹ تو دونوں متضاد ہیں سوکھی زمین میں کوئی پودہ جم نہیں سکتا اگر دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پودے گاڑ بھی دیئے جائیں تو چند گھنٹوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو جائینگے لیکن اب کے موسم بہار کی طراوٹ اور تر وتازگی اور شادابی کا حال یہ ہے کہ خشک زمین میں بھی پودے لگا دیئے جائیں وہ شجرۂ طوبیٰ کی طرح ہرے بھرے ہونگے ''زاہدان خشک'' کی مناسبت سے یہاں شجرۂ طوبیٰ کا ذکر کیا گیا ہے حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں کہ موسم بہار کی شدت طراوت اس درجہ کی ہے کہ بارود کا ذرہ ذرہ جو ایک چنگاری ہوتا ہے وہ پھول بن گیا ہے، بارود ایک آتش کدہ اور آگ کا خزانہ ہے اور موسم بہار کے صدقے میں گل وگلزار ہوگیا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ پر آگ گلزار بن گئی تھی

یہ فیض عام ہے سر پر ہرن کی شاخیں ہیں بدن میں شیر کے گل، اور دم میں سیہہ کے خار
بجھانی ہے دل آتش کی بھی تپش، یارب کرم میں آپ کو دشمن سے بھی نہیں انکار
بساط سبزہ، مشجر بنا ہے صحن چمن پڑا جو سطح پہ سبزہ کے سایۂ اشجار

بارہ سنگھا کے ہرن کے سر پر شاخ در شاخ سینگیں ہوں یا شیر کے بدن پر بالوں کے گچھے جو پھول کی شکل اختیار کر گئے ہیں یا ساہی کے بدن پر جو لمبے لمبے کانٹے ہیں وہ سب اسی بہار کا صدقہ ہے، اور شدت طراوت کا یہ عالم ہے کہ آگ کے سینے میں جو تپش اور جلن ہے وہ بھی بجھ گئی ہے حالانکہ آگ اور پانی میں ازلی بیر ہے اور ایک

دوسرے کے دشمن ہیں لیکن پانی کی شرافت اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں سے بھی سلوک کرنے سے اس کا انکار نہیں ہوتا اس نے آگ کے دل میں جو تپش تھی اس کو ختم کرکے آگ کو راحت پہنچائی آخری شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس پر شاعر کی قوت مشاہدہ داد و تحسین کی مستحق ہے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کیا ہے، کہتے ہیں کہ صحن چمن میں سبزہ کا ہرا ہرا فرش بچھا ہوا تھا وہ شطرنجی یعنی پھول دار فرش بن گیا ہے کیونکہ درختوں کے سائے جب سبزے کے ہرے ہرے فرش پر آتے ہیں تو دھوپ چھاؤں کی وجہ سے یہ سبز فرش، معلوم ہوتا ہے کہ صحن چمن مین شرنجی بچھا دی گئی ہے، اور بہت پرتکلف فرش کا اہتمام نظر آتا ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں۔

ہوا کو غنچۂ دل بستہ کی ہے دل جوئی ادھر ہے آب تلک شاخ و برگ سب پہ نثار
کرے ہے سبزۂ نو خاستہ پہ گل سایہ اوڑھاتی آب رواں کی ہیں چادریں انہار
یہ قدر خاک ہے، ہیں باغ باغ وہ عاشق کبھی رہے تھا سدا جن کے دل کے بیچ غبار

فطرت نے چمن کی آرائش میں ہوا اور پانی سب کو لگا رکھا ہے تا کہ کوئی آزردہ خاطر نہ رہے غنچہ یا کلی جب تک پھول نہ بنے اس کی پیتاں سمٹی رہتی ہیں اس کو ''دل بستہ'' بجھے ہوئے دل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور چمن میں کوئی آزردہ خاطر نہ رہے اس لئے ہوا غنچۂ دل بستہ کی خوشامدیں کر رہی ہے اس کو جھولا جھلا رہی ہے تا کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگے، پانی کی پھواریں تمام درختوں، پودوں اور پھول پتیوں کو نہلا رہی ہیں، پانی ان پر نچھاور اور قربان ہوکر ان کی شادابی میں اضافہ کر رہا ہے، چمن میں جو سبزے نئے نئے اگ رہے ہیں اس کو نو مولود بچے کی حیثیت میں رکھا گیا ہے جس طرح مائیں بچوں کو دھوپ کی تپش سے بچاتی ہیں، ٹھنڈے سائے میں رکھتی ہیں اور ان کے اوپر کوئی باریک کپڑا اُڑھا دیتی ہیں اسی طرح یہ مولود سبزے اور پودے ہیں ان کی راحت کے لئے پھولوں نے ان پر سایہ کر رکھا ہے کہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا نہ جائیں نہروں نے آبِ رواں بھیج کر ان کو پانی کی چادر اوڑھا دی ہے، آبِ رواں اپنے لغوی معنی میں بھی ہے اور آب رواں مکمل اور تن زیب کی طرح باریک کپڑا

ہوتا ہے گرمیوں میں اس کے کرتے اور انگر کھے پہنے جاتے ہیں، یہ مفہوم بھی یہاں مراد ہے یعنی نہروں نے بہت باریک کپڑے نومولود سبزوں کو اوڑھادئے ہیں آگے شعر میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ سارے پودے زمین سے اگتے ہیں باغوں میں درختوں کی جڑیں اسی زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں جب باغ زمین کا مرہونِ منت ہے تو عاشقوں کا دل ''باغ باغ'' اور خوش کیوں نہ ہو جائے، رقیبوں کی طرف سے جو دل میں غبار ہے وہ غبار زمین کا ہی حصہ ہے اس لئے اس میں باغ پیدا ہو گیا تو غبار اس باغ کے درختوں کی جڑوں کی خوراک بن گیا تو عاشق کے دل میں اغیار کی طرف سے جو غبار تھا ختم ہو گیا اور دل صاف ہو گیا، حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| نہ ہووے رشک سے لالہ کے دل پہ کب تک داغ | کہ گل ہے سوختہ جاں، تھی جو شمع آتش بار |
| نہ ہووے دنگ کوئی کب تلک کہ لالہ وگل | نکالیں سبز شجر سبزہ سرخ گل سے عذار |
| جلائے گر کہیں ہم شکل شاخ شمع کو بھی | دھوئیں بکھیر دے آتش کے دم میں باد بہار |
| یہ ربط ہے گل وبو میں، اگر جدا ہو بو | تو جان کھونے کو ہو اپنی، گل وہیں تیار |

لالہ کا رنگ خوب سرخ ہوتا ہے اور پنکھڑیوں میں کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں اس کو لالہ کے دل کا داغ کہا گیا یہ داغ پھول اور شمع سے رشک کی وجہ سے پڑے کہ وہ سب دل جلے ہیں مرے دل میں عشق ومحبت کی وہ آگ نہیں اس لئے مارے رشک کے اس کے دل میں داغ پڑ گئے پھر کہتے ہیں کہ چمن میں سرسبز وشاداب درختوں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کا رنگ ہرا اور سبز ہے لیکن ان سے جو پھول نکلتے ہیں وہ معشوق کے رخساروں کی طرح سرخ ہیں حیرت ہوتی ہے کہ آخر سبز درختوں کی شاخوں میں یہ سرخ پھول کیسے پیدا ہو گئے، جوش بہار کا عالم یہ ہے کہ شمع جو ایک شاخ کے مانند ہوتی ہے اس کو جلا دیا جائے تو باد بہاری شمع کو شاخ سمجھ کر آگ کی حلق میں دھواں بھر کر اس کا وجود مٹا دے، پھول اور خوشبو دونوں کے عشق ومحبت کا یہ عالم ہے کہ اگر پھول سے خوشبو جدا ہو کر کہیں چلی جائے تو پھول خوشبو کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا وہیں دم توڑ دیگا کیوں کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔

لگائے منھ بھی نہ گلدم، خدا کی قدرت ہے
اور اس کی دم سے لگایوں پھرے گل بے خار

چنور سنہری بنائے ہیں ہر شجر کے لئے
شعاع کی مہ وخور میں لگا کے چرخ نے تار

سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ
نسیم تیز کو کچھ شمع سے نہیں پیکار

بہ شکل شاخ بنا کرکے شمع کچھ مانگے
تو منصب شجر طور ہی دلائے بہار

یہ سبزہ زار کا رتبہ ہے شجرۂ موسیٰ
بنا ہے خاص تجلی کا مطلع انوار

اسی لئے چمنستان میں رنگ مہندی نے
کیا ظہور ورق ہائے سبز میں ناچار

گلدم ولائتی بلبل کو کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہ اور سر پر چوٹی ہوتی ہے اور اس کی دم کے نیچے کے پر سرخ ہوتے ہیں اس کو پھول کہتے ہیں، وہ پھولوں کی عاشق کہی جاتی ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کے اب کہ موسم بہار میں پھولوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلبل پھولوں کو منھ تک نہیں لگاتی، الٹے پھول ہی اس کے دم کے پیچھے لگا ہوا ہے جب انسان کے پاس دولت کا انبار ہو جاتا ہے تو اس میں ایک طرح سے بے اعتنائی آجاتی ہے۔ ''چنور'' دیہاتی لفظ ''چنری'' دلہنوں کا لباس ہوتا ہے جس میں سلمہ ستارہ اور چمک دار تار ٹانکے جاتے ہیں، تمام درختوں اور پودوں کو دلہن کا لباس تیار کرنے کے لئے آسمان کو ذمہ داری دی گئی ہے وہ چاند سورج کی کرنوں میں تار ڈال کر، سنہری چنری بنا کر چمن کے سارے درختوں اور پودوں کو دلہن کی طرح سجا رہا ہے۔

جوش بہار کا یہ عالم ہے کہ اگر شمع جل رہی ہے اور باد نسیم کا ادھر سے گذر ہو جاتا ہے تو شمع اس لئے بجھ جاتی ہے، کیونکہ باد نسیم کو شمع سے کوئی عداوت نہیں ہے وہ کیوں بجھائے گی مگر غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

موسم بہار کی فیاضی اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر شمع کہہ دے کہ میں درخت کی شاخ ہوں مجھ کو بھی فیضان بہار سے حصہ ملنا چاہئے تو شجر طور جس زمین پر ہے وہ زمین سفارش کریگی کہ جب اس بہار کا فیض سب کو پہنچ رہا ہے زمین کا ہر پودہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے تو شمع جو خود کو شاخ کہہ رہی ہے تو اس کو پھول پتیوں کی سوغات ملنی چاہئے تو شمع میں بھی پھول پتیاں پیدا ہو جائینگی،

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ کائنات میں سب سے بڑا رتبہ تو سبزہ زار کا ہے کیونکہ شجرۂ طور بھی اسی میں سے ہے اس پر تجلی ربانی ہوئی جبکہ کائنات کی کسی اور چیز پر تجلی نہیں ظاہر ہوئی مہندی کی پتیاں جب پیس کر نرم و نازک ہتھیلیوں پر لگائی جاتی ہیں تو ان کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے جب کہ پتیوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، چونکہ پتیوں کا ہرا رنگ ہی تجلی گاہ ربانی ہے اس لئے مہندی کے رنگ نے ہری ہری پتیوں میں حلول کر کے ظہور کیا سبز پتیوں کا احترام کیا اور ان کا رنگ نہیں بدلا، حضرت نانوتوی پھر فرماتے ہیں۔

ہنود کو ہے گماں دیکھ کر یہ اعجوبے  کہ اب کے لیں ہیں جنم زار میں اوتار

یعنی یہ قوم تو ہر حیرت ناک چیز کو دیکھ کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس سال موسم بہار نے وہ حیرت ناک جلوے دکھائے ہیں کہ یہ قوم پرست قوم کہے گی کہ اب کے اوتار نے سبزہ زاروں میں جنم لیا ہے اور پھر اس کی پرستش کرنے لگے گی۔

نزاکت چمنستان بیان کیا کیجئے  کہ صنع حق کے تئیں دیکھ عقل ہے بیکار
نہ شاخ گل کے تئیں تاب بار شبنم ہے  نہ کوئی لمحہ ہے شبنم کو دھوپ ہی کی سہار
ہوا کی ایک ٹھسک سے ہے چور چور حباب  رگڑ سے آب کی، ڈھانگیں ہیں آبجو کی فگار
پڑے پھپھولے حبابوں کی نرمی تن سے  بندھا جو بوندوں کی کثرت سے تن پہ ان کے تار
گرا دیا ہے تلے، گل نے بار سایہ کو۔  کہ رنگ و بو کا اٹھانا بھی تھا اسے دشوار
نہ ہو کہاں تئیں آب رواں کا پتلا حال  خراش سبزہ بہ پا، سر پہ سایۂ گل بار
پچھاڑ کھا کے گرے ہے چمن میں چادر آب  ہوا ہے کثرت لغزش سے آب بھی ناچار
کمر پہ بار گراں بوئے گل، تلے پھسلن  نہ لڑکھڑائے کہاں تک ہوا دم رفتار
جو گر پڑے تو اٹھا جا نہ سایہ گل سے  نہ تھم سکے جو پھسل جائے موجۂ جوئبار

جب آدمی ناز و نعمت میں پلا ہوا ہوتا ہے تو معمولی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا، چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اس کے لئے پہاڑ بن جاتی ہیں، بہار نے چمن کو بڑے ناز و نعم سے پالا ہے اس لئے اس کی ہر چیز میں نزاکت آ گئی ہے اس نزاکت کی کیا کیفیت ہے حضرت نانوتوی نے محسوس اور مشاہداتی مناظر دکھائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پھول تو پھول اس کی

شاخیں اور پتیاں اتنی نرم ونازک ہیں کہ وہ شبنم کے قطروں کا بار بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرسکتیں اور خود شبنم جو اسی چمن کے ہم نشینوں میں شامل ہے اتنی نازک اندام ہے کہ سورج کی معمولی حرارت بھی اس کے تن نازک کا وجود مٹادیتی ہے چمن کی نہروں میں جو حبابوں کے تاج محل کھڑے ہیں ان کو ہوا کی ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو وہ چور چور ہوجاتے ہیں، نہروں میں پانی چلتا ہے تو نہر کے کناروں سے رگڑ کھا کر اس کے پاؤں زخمی ہوجاتے ہیں، نہر کے حبابوں کا بدن اتنا نازک ہے کہ بارش کی بوندوں کا تار بھی ان کے بدن کو چھوجاتا ہے تو ان کے بدن میں چھالے پڑ جاتے ہیں، پھولوں کا عالم یہ ہے کہ ان پر رنگ وبو کا اتنا بڑا بوجھ ہے کہ اسی کو اٹھانا ان کے لئے دشوار ہے اس پر شاخوں کے سائے کا مزید باران کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا، تو سر سے سایہ کے بوجھ کو اتار کر زمین پر ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ سایہ زمین پر ہی پڑتا ہے مگر اس کی یہ تعبیر کتنی خوبصورت اور رومان انگیز ہے۔

چمن کی نہروں میں جو پانی رواں دواں ہے اس کا بھی حال بہت پتلا ہے یعنی بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہے کیوں کہ جب وہ چلتا ہے تو سبزے اس کے پاؤں تلے آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں خراش آجاتی ہے اور قدم زخمی ہوجاتے ہیں پھر اس پر پھولوں کے سایہ کا بوجھ خود بارِ گراں، پاؤں زخمی اور اتنے بڑے بوجھ کو لیکر چلنا بہت دقت طلب کام ہے اس لئے اس کا حال بہت پتلا ہوگیا۔

پانی آسمان سے اترتا ہے تو ہوا کے تھپیڑے کھا کر زمین پر گرتا ہے تو ایک دھما کا سا ہوتا ہے پانی بھی چمن میں پھسل کر بے تحاشا گرتا ہے کیوں کہ بار بار اس کو ٹھوکر لگتی ہے اور پاؤں میں لغزش ہوتی ہے اس لئے برسات کی پھسلن میں جیسے آدمی بے تحاشا گرتا ہے اسی طرح پانی چمن میں بار بار گر جاتا ہے، چمن میں ہوا بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے ایک تو اپنی کمر پر خوشبو کا بھاری بوجھ لاد رکھا ہے دوسرے زمین پر بارش کی وجہ سے پھسلن ہوگئی ہے بھاری بوجھ کی وجہ سے ہر ہر قدم پر پھسل جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب گری اور تب گری، خوشبو کے بوجھ کا تصور بڑا شاعرانہ تصور ہے، آگے کہتے

ہیں کہ پھولوں کا سایہ اگر زمین پر گر پڑے تو پھولوں کے لئے سائے کا اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے نہر میں چلنے والے پانی کی موج کو اگر ٹھوکر لگ گئی تو پھر اس کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا وہ پھسلتی ہوئی دور تک چلی جائے گی۔ حضرت نانوتویؒ کہتے ہیں۔

کہاں زمین، کہاں یاسمین ولالۂ وورد — فلک بھی گرد ہوا دیکھ کر چمن کی بہار
زمیں سے چرخ ہے ہر طرح اب کے شرمندہ — زمیں میں گڑ جا اگر چرخ کی بسے کچھ چار
دکھائے چرخ اگر اپنے چاند سورج کو — مقابلہ پہ ہر اک حوض باغ ہو تیار
کئے ہیں آپ زمیں نے جواب بارش میں — بجائے بوندوں کے فوارے اس طرف تیار

اب کی بار موسم نے زمین کو انتہائی حسین اور خوب صورت بنا دیا ہے ہر طرف چنبیلی گلاب اور گل لالہ اپنی بہار دکھا رہے ہیں جن کو دیکھ کر آسمان شرمندہ ہے زمین کی آرائش وزیبائش کے مقابلہ میں میری آرائش وزیبائش گرد ہوگئی ہے، مارے شرم کے وہ زمین میں گڑا جا رہا ہے اگر رفع خجالت کے لئے آسمان اپنے چاند سورج دکھائے کہ ہمارے پاس نور کا خزانہ ہے تو زمین بھی مقابلہ پر آجائیگی اور چمن کے حوض کو اس کے مقابلہ میں پیش کر دے گی جن میں پانی سیال چاندی کی طرح ہلوریں لے رہا ہے جس سے چاند سورج خود شرمندہ ہو جائیں، آسمان اگر بارش برسا کر اپنی برتری کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو زمین اپنے فوارے اس کے جواب میں پیش کر دے گی تم ننھی ننھی بوندیں برسا کر مغرور ہو اس کے مقابلہ میں یہ فوارے پورے جوش وخروش سے برستے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے زمین وآسمان کے تقابل میں زمین کی برتری دکھائی ہے زمین کو یہ برتری اسی موسم میں ملی ہے، یہاں ماضی کا کوئی ذکر نہیں، زمین وآسمان کے اسی تقابل سے گریز کے اشعار شروع ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد مدحیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے آگے کے یہ دو شعر کتنے معنی خیز کہے ہیں، ملاحظہ ہو۔

پہنچ سکے شجر طور کو کہیں طوبیٰ — مقام یار کو کب پہنچے مسکنِ اغیار
زمین وچرخ میں کیوں ہو نہ فرق چرخ وزمیں — یہ سب کا بار اٹھائے وہ سب کے سر پہ سوار

زمین کی فضیلت و برتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ شجر طور زمین پر شجر طوبیٰ

آسمان پر مگر زمین کا یہ درخت آسمان کے درخت سے کہیں زیادہ باعظمت اور بلند رتبہ ہے کیوں کہ شجر طور پر تجلی ربانی ہوئی اور وہ محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے اور طوبیٰ کو یہ شرف حاصل نہیں، اس پر فرشتے رہتے ہیں ان کی حیثیت رقیب اور اغیار کی ہے، رقیب اور غیر کا گھر محبوب کے گھر سے افضل کیسے ہوسکتا ہے اسی لئے شجر طور کو شجر طوبیٰ پر فضیلت حاصل ہے آخر میں ایک مشاہداتی دلیل پیش کرتے ہیں کہ زمین آسمان میں تو زمین آسمان کا فرق ہے، یعنی بہت بڑا فرق ہے کیوں کہ زمین سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور آسمان سب کے سر کا بوجھ بنا ہوا ہے کیوں کہ اوپر ہے سب کے سر پر چھایا ہوا ہے۔

حضرت نانوتویؒ اب تک کائنات کی چمن بندی کرتے رہے اس کے بعد مدح کے اشعار آئینگے قصیدہ عربی زبان سے فارسی کے راستہ سے اردو میں آیا ہے اس لئے اس صنف سخن میں عربی شاعری کا انداز بیان پایا جاتا ہے، عربی زبان کے شعراء قصیدہ کے آغاز میں عشق ومحبت کے اشعار کہتے تھے اور پورا زور قلم صرف کرتے تھے اسی کو تشبیب کہتے ہیں، فارسی زبان میں جب قصیدہ آیا تو عشق ومحبت کے بجائے مناظر فطرت کی تصویر کشی، بہار اور موسم گل کی دل فریبیوں اور رعنائیوں کا ذکر تشبیب کی جگہ کہنے لگے، اردو قصیدہ نگاری میں بھی یہی طریقہ رہا، محسن کاکوروی کے قصیدہ نعتیہ میں یہی مناظر فطرت کی عکاسی ہے، حضرت نانوتویؒ نے فارسی شعراء سے متاثر ہو کر بہاریہ لکھنے کو ترجیح دی، تشبیب درحقیقت قصیدہ کی تمہید ہوتی ہے اور جب اصل مدح شروع ہوتی ہے اس سے پہلے گریز کا ایک یا دو شعر لکھ کر تشبیب اور مدح میں مکمل ربط پیدا کر دیتے ہیں گریز کا شعر تشبیب اور مدح کا نقطۂ اتصال ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے بھی گریز کے شعروں میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت نانوتوی کا کمال فن ''بہاریہ'' مین پوری طرح عروج پر ہے جو ایک قادرالکلام شاعر ہونے کی سند ہے قوت تخئیل انتہائی بلند پرواز، قوت مشاہدہ بہت ژرف بیں اور دقیقہ رس ضرب الامثال اردو زبان کے خوبصورت محاورے بہ کثرت

استعمال کئے ہیں، صنعت تجنیس کی رعایت نے اشعار کو حسین وجمیل بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے، جوش بہار کے خوبصورت مناظر کی عکاسی ہی کے سلسلہ میں زمین وآسمان کا تقابل کیا گیا اور زمین کی آسمان پر برتری دکھائی گئی اس کے بعد نعت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

کرے ہے ذرۂ کوئے محمدی سے خجل فلک کے شمس وقمر کو زمیں کے لیل ونہار

وہی زمین وآسمان کا تقابل، اگر آسمان کے چاند سورج اپنی روشنی اور آب وتاب پر فخر کرتے ہیں تو زمین سرکار دو عالم ﷺ کی گلی کوچوں اور گذر گاہوں کی خاک کے ذرے کو فضا میں اچھال دیتی ہے کہ ان خاک کے ذروں کی آب وتاب اور چمک دمک کو تمہاری آب وتاب کہاں پہنچ سکتی ہے، چاند سورج کو سوائے ندامت کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔

فلک پہ عیسیٰؑ وادریسؑ ہیں تو خیر سہی زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختارؐ
فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانی احمدؐ زمیں پہ کچھ نہ ہو، پر ہے محمدی سرکار

کئی پیغمبروں کا آسمان پر ہونا فلک کے لئے باعث افتخار ضرور ہے لیکن افضل الانبیاء والمرسلین ﷺ کا زمین پر ہونا ہی اس کی افضلیت وبرتری کے لئے کافی ہے۔

نثار کیا کروں، مفلس ہوں، نام پر اس کے فلک سے عقد ثریا لوں، دے اگر وہ ادھار
ثنا کر اس کی فقط قاسم اور سب کو چھوڑ کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار
ثنا کر اس کی، اگر حق سے کچھ لیا چاہے تو اس سے کہہ، اگر اللہ سے ہے کچھ درکار
الٰہی! کس سے بیاں ہو سکے ثنا اسکی کہ جس پہ ایسا تیری ذات خاص کا ہے پیار
جو تو اسے نہ بناتا تو سارے عالم کو نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار
کہاں وہ رتبہ؟ کہاں عقل نارسا اپنی کہاں وہ نور خدا، اور کہاں یہ دیدۂ زار
چراغ عقل ہے گل، اس کے نور کے آگے زباں کا منہ نہیں جو مدح میں کرے گفتار
جہاں کہ جلتے ہوں پر عقل کل کے بھی پھر کیا لگی ہے جان جو پہنچیں وہاں میرے افکار
مگر کرے مری روح القدس مددگاری تو اس کی مدح میں میں بھی کروں رقم اشعار

جو جبرئیل مدد پر ہو فکر کی میری تو آگے بڑھ کے کہوں، اے جہان کے سردار

حضرت نانوتوی نے ان اشعار میں حضور ﷺ کے رتبہ بلند اور شان رفیع کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس کے وجود کے صدقہ میں ساری کائنات نے خلعت وجود پایا، جس خالق کائنات کے حضور میں کائنات کی ہر چیز سر بہ سجود ہے وہی ذات عالی جس ذات مقدس کو اپنا محبوب بنالے تو اس عظیم المرتبت شخصیت کی مدح وثنا میں زبان کا منہ ہے کہ گفتگو کرے جب کہ

هزار بار بشویم دہاں زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

ہاں اگر جبرئیل مدد کریں تو میں زباں کھولوں، رسول اللہ ﷺ نے مداح رسول حسانؓ بن ثابت کے لئے دعا فرمائی تھی أَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسْ اے اللہ جبرئیل کے ذریعہ ان کی مدد فرما، پھر آگے حضرت نانوتوی خالص نعت کے اشعار کہتے ہیں۔

تو فخر کون ومکاں زبدۂ زمیں وزماں امیر لشکر پیغمبراں، شہ ابرار
خدا ترا، تو خدا کا حبیب اور محبوب خدا ہے آپکا عاشق تم اس کے عاشق زار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی تو نور شمس گر اور انبیاء ہیں شمس نہار
حیات جان ہے تو، ہیں اگر وہ جان جہاں تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
طفیل آپ کے ہے کائنات کی ہستی بجا ہے کہئے اگر تم کو مبدء الآثار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تابہ وجود قیامت آپ کی تھی دیکھئے تو اک رفتار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں ترے کمال کسی میں نہیں مگر دوچار
گرفت ہو تو تیرے ایک بندہ ہونے میں جو ہو سکے تو خدائی کا اک ترے انکار

مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ ہم مین ان میں فرق ہے، ہماری طرح وہ کھاتے پیتے ہیں بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں جیسے ہم ویسے وہ بھی ہیں یعنی حضور ﷺ کو اللہ کا بندہ کہتے اور آپ کے رسول ہونے سے انکار کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہنم رسید ہوئے رسالت سے انکار اور صرف بندہ کہنے پر گرفت ہوئی، حضور سے اگر کسی کمال کی

نفی کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ آپ خدا نہیں ہیں بقیہ سارے کمالات آپ کی ذات میں موجود ہیں۔

بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال — بغیر بندگی کیا ہے، لگے جو تجھ کو عار
جو دیکھیں اتنے کمالوں پہ تیری یکتائی — رہے کسی کو نہ وحدت وجود کا انکار

صوفیا کا ایک طبقہ وحدت الوجود کا قائل ہے، وجود کا اطلاق صرف ایک ذات واجب الوجود پر کیا جاسکتا ہے باقی ساری کائنات اسی وجود کا پرتو اور اس کے مظاہر ہیں کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کی جلوہ گری ہے بذات خود کائنات کا اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں، صوفیا کا ایک طبقہ اس کا انکار کرتا ہے حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اس نظریہ کا انکار کرنے والے سرکار دو عالم ﷺ کے کمالات میں یکتائی و بے مثالی کو دیکھ لیں کہ آپ کے کمالات کے سامنے کسی کمال کی کوئی حقیقت نہیں، دنیا کے سارے کمالات آپ کے کمالات کے سامنے گرد ہیں کائنات میں صرف آپ کا کمال ہی حقیقی کمال ہے جب آپ کی یکتائی اور بے مثالی اس درجہ کی ہے تو خالق کائنات کے بارے میں وحدت الوجود کے نظریے کی وہ خود تائید کرنے لگیں گے، آگے کہتے ہیں۔

یہ اجتماع کمالات کا تجھے اعجاز — دیا تھا تا نہ کریں انبیاء کہیں تکرار
تو آئینہ ہے کمالات کبریائی کا — وہ آپ دیکھتے ہیں اپنا جلوۂ دیدار
پہنچ سکا ترے رتبہ تلک نہ کوئی نبی — ہوئے ہیں معجزہ والے بھی اس جگہ ناچار
جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے — کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی! اقرار
لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا — اگر ظہور نہ ہوتا تمہارا آخرکار
خدا کے طالب دیدار حضرت موسیٰ — تمہارا لیجئے، خدا آپ طالب دیدار
کہاں بلندئ طور اور کہاں تری معراج — کہیں ہوئے ہیں زمیں آسمان بھی ہموار
جمال کو تیری کب پہنچے حسن یوسف کا — وہ دلربائے زلیخا، تو شاہد ستار
اگر قمر میں کچھ آجائے تیرے چہرہ کا نور — تو رات دن ہو، اور آگے ہو اس کے دن شبِ تار

یہاں شاعرانہ تخیل پورے عروج پر ہے اور طائر فکر کی پرواز انتہائی بلند نظر آتی

ہے کہتے ہیں کہ اگر رات میں چوہویں رات کا چاند نکلا ہوا ور آپ کے چہرے کا نور، آب وتاب اوراس کی روشنی پا جائے تو چاند کی روشنی کا یہ عالم ہوگا کہ رات دن سے اتنی زیادہ روشن اورتاب ناک ہو جائے گی کہ جب صبح کوسورج طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اس چاند کی روشنی کے مقابلہ میں جس مین حضور کے چہرۂ زیبا کا نور شامل ہوگیا ہے اتنی کمزور اور مدھم معلوم ہوگی کہ لوگ کہیں کے کہ دن نہیں بلکہ تاریک ترین رات ہے، اب چاند طلوع ہوگا تو دن ہوگا اور سورج نکلے گا تو رات ہوگی وہ بھی تاریک ترین رات، اس کے بعد حضرت نانوتوی نے استعارات کنایات تشبیہات وتمثیلات کا مینا بازار لگا دیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

جمال ہے تیرا معنی حسن ظاہر میں — کیا ہے معجزہ سے تو نے آپ کو اظہار
رہا جمال کے تیرے حجاب بشریت — نجانا کون ہے، کچھ بھی، کسی نے جز ستار
سوا خدا کے، بھلا تجھے کوئی کیا جانے — تو شمس نور ہے، شپر نمط اولوا الابصار
سما سکے تیری خلوت میں کب نبی وملک — خدا غیور، تو اس کا حبیب اور اغیار
جو آئینہ میں پڑے عکس خالی کا تیرے — تو اشک مہر کا ہو جائے مطلع الانوار
تمہارا خالِ قدم دیکھ رشک سے مہ کے — جگر پہ داغ ہو، سورج کو ہے عذاب انصار
نہ بن پڑا وہ جمال آپ کا سارک شب بھی — کمر میں گوکی کروڑ دل کئے چڑھاء اتار
اگر پڑے تیرے تلوے میں عکس سورج کا — تو آگے نور قدم کے ہو تیرے خالی شمار
سفید دیدۂ بے نور سا ہے دیدۂ نور — بصیرہ ہونے کوتلوے کا تل ہے تیرے بکار
بنا شعاعوں کی جاروب تیرے کوچہ سے مہر — کرے ہیں دور اندھیرے کا روز گرد وغبار

کتنا خوبصورت شعر ہے، قوت مشاہدہ کی یہ معراج ہے کہ وہ دیکھتی ہے کہ سورج روز جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی لمبی لمبی کرنیں جھاڑو کے تنکے کی طرح معلوم ہوتی ہیں، اس سے خیال پیدا ہوا کہ شاید سرکار دو عالم ﷺ کی بابرکت مقدس گلیوں کو چوں اور گذر گاہوں کی صفائی کے لئے سورج نے شعاعوں کا جھاڑو بنایا ہے اور اس سے اندھیرے کے گرد وغبار کو صاف کر رہا ہے، مقام کی عظمت واہمیت کے پیش نظر اسی

کے شایان شان ہر چیز استعمال ہوتی ہے اسلئے مدینہ کی گلیوں کی صفائی کے لئے تنکوں کا نہیں شعاعوں کا ہی جھاڑو زیادہ مناسب اور اسکی شایان شان ہے، پھر کہتے ہیں:

اگر ترے رخ سے گل کو دوں تشبیہ — شعاع مہر کو ہو آرزوے منصب خار
مربی مہ خور ذرّے ذرّے کوچے کے — معلم الملکوت آپ کا سگِ دربار
خوشا نصیب یہ نسبت کہاں نصیب مرے — تو جس قدر ہے بھلا، میں برا اسی مقدار
نہ پہنچیں گنتی میں ہرگز ترے کمالوں کی — میرے بھی عیب شہ دوسرا، شہ ابرار
قبول جرم سے امت کے تیری کھا دھوکا — عجب نہیں ہے جو شیطان بھی نیکوکار
جو چھو بھی دیوے سگ کوچہ تیرا اس کی نعش — تو پھر تو خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار
عجب نہیں، تری خاطر سے تری امت کے — گناہ ہوویں قیامت کو طاعتوں میں شمار
بکیں گے آپ کی امت کے جرم ایسے گراں — کہ لاکھوں مغفرتیں کم سے کم پہ ہوں گی نثار
کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو — تو قاسمی بھی طریقہ ہو، صوفیوں میں شمار
ترے بھروسے پہ رکھتا ہے غرّۂ طاعت — گناہِ قاسم برگشتہ بخت، بداطوار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گنہ کئے میں نے — تجھے شفیع کہے کون؟ گر نہ ہو بدکار
تمہارے حرف شفاعت پہ عفو ہے عاشق — اگر گناہ کو ہے خوف غصۂ قہار
یہ سن کے، آپ شفیع گناہ گاراں ہیں — کئے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار
ترے لحاظ سے اتنی تو ہوگئی تخفیف — بشر گناہ کریں اور ملائک استغفار
دعا تری مرے مطلب کی ہو اگر حامی — تو بخت بد کو ملے حق کے گھر سے بھی پھٹکار
یہ ہے اجابت حق کو تری دعا کا لحاظ — قضاء مبرم ومشروط کی سنیں نہ پکار
خدا ترا، تو جہاں کا ہے واجب الطاعۃ — جہاں کو تجھ سے، تجھے اپنے حق سے ہے سروکار
قضا کو تیری یہ خاطر، مگر تجھے وہ ہے — قضاء حق سے نیاز اور نیاز کا اقرار
اگر جواب دیا بیکسوں کو تونے بھی — تو کوئی اتنا نہیں جو کرے کچھ استفسار
کروڑوں جرموں کے آگے یہ نام کا اسلام — کریگا یا نبی اللہ! کیا مرے پہ پکار
دکھائے، دیکھئے کیا اپنا طالع بدبیں — نگاہ لطف تری ہو نہ گر مری غم خوار

برا ہوں، بد ہوں، گنہگار ہوں پر تیرا ہوں — ترا کہیں ہیں مجھے، گو کہ ہوں میں ناہنجار
لگے ہے سگ کو ترے، میرے نام سے گو عیب — پر تیرے نام کا لگنا مجھے ہے عز و وقار
تو بہترین خلائق، میں بدترین جہاں — تو سرورِ دو جہاں، میں کمینہ خدمت گار

اس کے بعد آٹھ دس شعروں میں حضرت نانوتوی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ قصیدہ حضرت نانوتوی نے اس دور میں لکھا ہے جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا اور آپ روپوشی کی زندگی گذار رہے تھے، انگریزوں نے ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا، آپ کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھیا اور آپ پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ گرفتاری کا مطلب پھانسی یا کالے پانی کی سزا تھی اس سے ہلکی سزا کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا روپوشی کا یہ دور ایک سال سے کم نہیں تھا سارا کاروبارِ زندگی معطل تھا، عزیز و اقارب سے رشتہ کٹا ہوا تھا سخت ذہنی اذیت میں آپ گرفتار رہتے تھے انہی حالات میں یہ قصیدہ لکھا گیا، ممکن ہے مرا خیال صحیح نہ ہو، کیوں کہ حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کے اشعار میں تہ در تہ معنویت ہے، اور درج ذیل اشعار سے ان کی منشا اور رہی ہو بہر حال اشعار حاضر ہیں:

بہت دنوں سے تمنا ہے کیجئے عرض حال — اگر ہو اپنا کسی طرح تیرے در تک بار
وہ آرزوئیں جو ہیں مدتوں سے دل میں بھری — کہوں میں کھول کے دل اور نکالوں دل کا غبار
مگر جہاں ہو فلک آستاں سے بھی نیچا — وہاں ہو قاسم بے بال و پر کا کیونکہ گذار
نہ جبرئیل کے پر ہیں، نہ ہے براق کوئی — جو اڑ کے در تئیں پہنچوں تمہارے یا ہو سوار
کشش پہ تری لئے اپنا بار بیٹھے ہیں — تکے ہے تیری طرف کو، یہ اپنا دیدۂ زار
یہ میری جان نکمی سے تھی سو اس کے بھی — پڑے ہیں چرخ و زماں پیچھے، باندھ کر ہتھیار
مدد کر، اے کرم احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامیٔ کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی — کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا تجھے سردار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا — بنے گا کون ہمارا، ترے سوا غم خوار

کیا ہے سگ نمط ابلیس نے میرا پیچھا ہوا ہے نفس، موا سانپ سا گلے کا ہار

پھر اس کے بعد اپنی بیکسی اور اپنے درد وکرب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی دلی تمناؤں اور جذبات کا اظہار کیا ہے چونکہ وہ تصوف وسلوک کی راہ کے راہی تھے ان کا رہوار فکر اسی جانب مڑ گیا ہے پھر دیر تک چلتا رہا عشق نبویؐ کا سوز، دیارِ مدینہ پہنچنے کی تڑپ اور اس مقدس سرزمین میں اپنے وجود کے تحلیل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں یہ ساری باتیں اندرونی کرب کی وجہ بہت ہی موثر الفاظ میں کہی ہیں، اشعار دیکھئے:

وہ عقل بے خرد اپنی، یہ زور حرص وہوا اسے بجھاؤں میں یا انسے آ کے ہوں دو چار

دکھائے ہے مرے دل کو لبھانے کو ہر دم ہزار طرح کے دنیائے کہنہ سال سنگار

ادھر ہجوم تمنا، ادھر نصیبوں سے کرے ہے، بخت زبوں، ہر امید سے انکار

رجاء وخوف کی موجوں میں ہے امید کی ناؤ جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہووے بیڑا پار

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ کہ ہو سگان مدینہ میں میرا نام شمار

جیوں تو ساتھ سگان حرم کے تیرے، پھروں مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار

جو یہ نصیب نہ ہو، اور کہاں نصیب مرے کہ میں ہوں اور سگان حرم کی تیرے قطار

اڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشت خاک قاسم کا کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے بن کے غبار

مگر نسیم مدینہ ہے، گرد باد بنا کشاں کشاں مجھے لے جا جہاں ہے تیرا مزار

ہوس نہیں مجھے اس سے بھی کچھ رہی لیکن خدا کی اور تری الفت سے میرا سینہ فگار

لگے وہ تیر غم عشق کا مرے دل میں ہزار پارہ ہو دل خون دل میں ہو سرشار

لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی جلا دے چرخ ستم گر کو ایک ہی جھونکا

صدائے صور قیامت ہو اپنا اک نالہ بجائے برق ہو اپنی ہی آہ آتش بار

چبھے کچھ ایسے مرے نوک خار غم دل میں کہ پھوٹے آنکھوں کے رستہ سے اک لہو کی فوار

یا ناتواں ہوں، غم عشق میں کہ جائے نکل ذرا بھی جان کو او پر کا سانس لے جو سہار

تمہارے عشق میں رورو کے ہوں نحیف اتنا کہ آنکھیں چشمہ آبی سے ہوں درون غبار
یہ لاغری ہو کہ جان ضعیف کو دم نقل نہووے ساتھ اٹھانا بدن کا کچھ دشوار
رہے نہ منصب شیخ المشائخی کی طلب نہ جی کو بھائے یہ دنیا کا کچھ بناؤ سنگار
ہوا اشارہ میں دو ٹکڑے جو قمر کا جگر کوئی اشارہ ہمارے بھی دل کے ہو جا پار

دل کی آرزوئیں اور تمنائیں عشق کی تڑپ اور محبت کے سوز وگداز دلی اضطراب کے ساتھ دربار رسالت میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ کہاں میں اور کہاں وہ دربار عالی تبار جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے پاس ادب کرتے ہیں درخواست اور فریاد کا یہ لب ولہجہ اس عظیم بارگاہ کی شایاں نہیں اس لئے وہ اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں دل اور زبان کو سرزنش کرتے ہیں اور درود وسلام پر بات کرتے ہیں۔

یہ کیا ہے شور وغل؟ اتنا سمجھ تو کچھ قاسم نہ کچھ ترا بڑا رتبہ، نہ کچھ بلند تبار
تو تھام اپنے تئیں حد سے پا نہ دھر باہر سنبھال اپنے تئیں اور سنبھل کے کر گفتار
ادب کی جا ہے یہ، چپ ہو تو اور زباں کر بند وہ جائے، چھوڑ اسے پر نہ کر تو کچھ اصرار
دل شکست ضروری ہے جوش رحمت کو گرے ہے باز کہیں جب تلک نہ دیکھے شکار
وہ آپ رحم کرینگے، مگر سنیں تو سہی شکست شیشۂ دل کی ترے کبھی جھنکار
بس اب درود پڑھ اس پر اور اس کے آل پہ تو جو خوش ہو تجھ سے وہ اور اس کی عترت اطہار
الٰہی! اس پہ اور اس کی تمام آل پہ بھیج وہ رحمتیں کہ عدد کر نہ سکے ان کو شمار

یہ قصیدہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت لکھا گیا جب اردو زبان تراش خراش کے مرحلے سے گذر رہی تھی، اس دور میں ایسے الفاظ کی بہتات تھی جو بعد میں متروک ہوئے، اس دور کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی کہیں ثقیل تھا، اسی تلفظ کی ادائیگی کے لئے املا بھی اسی کے مطابق تھا جو اب قطعاً متروک ہے، ہم نے اس قصیدے میں جو املا تھا، ہو بہو ٹھیک وہی لکھا ہے تا کہ اس عہد کی زبان سے مطابقت باقی رہے، قصیدہ میں تعقید لفظی نظر آئیگی لیکن یہ حضرت نانوتوی کی مجبوری تھی، وہ بہت ہی وسیع مفہوم کو صرف دو مصرعوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں اس لئے الفاظ اپنے مقام پر اکثر جگہ نہیں

رہے، یہ مجبوری ہر اس شاعر کو پیش آتی ہے جو دقیق مضامین کو شعروں میں پیش کرتا ہے، مگر بہرحال اس کی وجہ سے اشعار ثقیل اور بوجھل ہو جاتے ہیں۔

یہ قصیدہ اپنی معنوی وسعت، فکر کی گہرائی، ژرف بینی، بے مثال قوت مشاہدہ کا غماز اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی روح نواز تصویر کشی میں ایک مثالی اور لاجواب قصیدہ ہے، حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کو شعر و شاعری سے ظاہری بے تعلقی اور ان کی کم سخنی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے، یہ قصیدہ پڑھ کر دل کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس سے پہلے آپ کو شعر و شاعری سے کوئی سروکار نہیں رہا ہوگا، قصیدہ صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق استاذِ فن کے قلم کا رہین منت ہے، اب یہ طویل قصیدہ اردو ادب کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء سے بحث کرنے والے ادیبوں اور نقادوں کی خدمت میں پیش ہے تاکہ وہ اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرسکیں۔

اسیرؔ ادروی

بنارس ۲۰ رجولائی ۱۹۹۹ء

# تین رزمیہ مثنویاں

واقعہ ایک ہے جسکو تین شاعروں نے شعری لباس پہنایا ہے، آج سے ایک صدی قبل ۱۰/ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۵/جون ۱۸۹۳ء میں اعظم گڈھ ضلع کے ایک دم مشرقی حصہ میں ایک جانکاہ حادثہ ہوا تھا، اس دیار میں اس حادثہ کو ''گوکچھنی'' کہا جاتا ہے جو درحقیقت گئو رکھشنی کی تحریف ہے یا عوام کی تصرف لسانی ہے گایوں کی حفاظت کے لئے ایک تنظیم ضلع بلیا کے دیہاتوں میں قائم ہوئی تھی جیسا کہ لفٹنٹ گورنر نے بلیا میں منعقدہ دربار میں جو ۱۱/اگست ۱۸۹۳ء کو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے بتایا کہ اس دیار میں سارے فسادات گئو رکھشنی سبھاؤں کی وجہ سے ہوئے، یہ تحریک بڑے شباب پر تھی، اس کا ایک مکمل نظام تھا اور تمام دیہاتوں میں اس کے کارکن پھیلے ہوئے تھے، جارحانہ اقدام کا آغاز میرے گاؤں ادری سے ہوا اس میں زیادتی اپنے ہی لوگوں کی تھی یہ گاؤں افغانی النسل یوسف زئی پٹھانوں پر مشتمل تھا جو ایک وسیع وعریض ٹیلے پر آباد ہے پھر بتدریج دوسری برادریوں کی آبادی ہوئی جس وقت یہ حادثہ ہوا اس کی آبادی دوڈھائی سوگھروں پر مشتمل تھی چونکہ جاگیردارانہ نظام تھا گاؤں کا حاکم ہوتا تھا دلّا خاں مکھیا تھے وہ اپنے کھیتوں کی طرف سے آرہے تھے ایک جگہ ایک تنومند گائے بندھی ہوئی تھی یہ دیکھ کر اپنے کارندوں سے کہا کہ یہ گائے کھول لو بقرعید پر قربانی ہوگی گائے کھول کر آگئی اور آبادی میں زمیندار کے دروازے پر باندھ دی گئی، آسامیوں کو زمیندار سے بولنے کی ہمت نہیں تھی اس نے گئو رکھشنی تحریک کے لوگوں سے مل کر اپنی فریاد کی انہوں نے مدد کا وعدہ کرلیا اور ادری پر حملہ کا پلان بنالیا، ادری ایک چھوٹی سی آبادی تھی اور دوڈھائی سوگھروں پر مشتمل تھی، صورت حال انتہائی خطرناک ہوگئی جے جے کارکی، جب اطراف کے دیہاتوں کی طرف سے آواز آتی تو پورا گاؤں سہم جاتا ۹/ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ کو لوگوں کے بیان کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مسلح مجمع جے جے کا نعرہ لگاتا ہوا ادری کے پوربی حصہ میں ایک پنڈت کے باغ میں جو یہاں مصر کا باغ

مشہور تھا، آ کر ٹھہر گیا، یہ باغ گاؤں سے دوتین فرلانگ پر ہے ادری کے پوری آبادی پر انتہائی خوف وہراس طاری ہو گیا، مگر مصیبت تو سر پر آ چکی تھی افغان برادری کو للکارا اور گاؤں کے مشرقی حصہ میں جوانوں کی صف بندی کر دی اور صف کے آگے گھوڑ سوار دوڑ لگا رہے تھے جیسے فوج حملہ کرنے کے لئے تیار ہے، دوپہر ہو گئی مگر حملہ نہیں ہوا ہمارے گھر کی روایت ہے کہ شب میں ایک فقیر آیا اور مسلمانوں سے کہا کہ آپ کورے مٹی کے برتن کی کنکریاں توڑ لیں اور ہر کنکری پر قرآن کی یہ آیت پڑھ کر دم کر کے رکھ لیں اور شب میں گاؤں کی چاروں سمتوں میں ایک ایک کر کے فاصلہ پر گراتے جائیں انشاء اللہ آپ محفوظ رہیں گے چنانچہ پورے گاؤں میں یہ کنکریاں پڑھی گئیں رات کے پچھلے پہر تمام کنکریاں چاروں طرف گرا دی گئیں اسکا اثر یہ ہوا کہ حملہ آوروں میں سے بہتوں نے بتایا کہ ہم لوگ گاؤں کی طرف دیکھتے تھے ہر طرف ننگی تلواریں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں اس لئے پنڈتوں نے حملہ کی اجازت نہیں دی مجمع حملہ کے لئے تقاضا کرتا رہا لیکن پنڈتوں نے ان کو روکا اور بتایا کہ تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا عجیب کشمکش تھی ادری کے قرب وجوار کے معزز اور سربرآوردہ ہندو زمینداروں نے مجمع سے کہا کہ ہم مسلمانوں سے گفتگو کرنے جا رہے ہیں آپ لوگ ہمارا انتظار کریں چنانچہ آدھے درجن سے زائد زمیندار صافہ باندھے انگرکھا پہنے لاٹھی ہاتھوں میں لئے مجمع سے نکلے اور وہاں آئے جہاں مسلمانوں نے صف بندی کر رکھی تھی انہوں نے آ کر گاؤں کے مکھیا دلّا خاں سے مل کر کہا کہ ہم صلح کرنے کے ارادے سے آپ کے پاس آئے ہیں، دلّا خان نے تڑک کر کہا کہ تم لوگ لڑنے آئے ہو تو پہلے دو دو ہاتھ ہو جائیں صلح تو بعد کی بات ہے، مگر ہندو زمیندار سچے دل سے صلح کی نیت سے آئے تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ خون خرابے سے پہلے ہو جائے تو بہتر ہے اور اپنی پگڑیاں کھول کر ان کے پاؤں پر رکھ دیں اور کہا: صاحب صلح ہو جائے تو بہتر ہے، بس ہماری ایک شرط ہے کہ جو گائے آپ کھول کر لائے ہیں وہ ہم کو واپس کر دیں تا کہ ہم مجمع کو دکھا سکیں کہ ہم نے جنگ جیت لی جس کے لئے ہم نے یہاں تک سفر کیا وہ یہی گائے ہے

جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جب بات یہاں تک آئی تو انصاری برادری کے دو چار پڑھے لکھے بزرگ تھے انہوں نے دلا خاں مکھیا سے کہا کہ آپ گائے ان کو دے دیں اس کی قربانی جائز نہیں یہ چھینا ہوا مال ہے قربانی اپنے جانوروں کی کرنی چاہیئے اور خود جا کر گائے کھونٹے سے کھول کر صلح کے لئے آنے والوں کے حوالے کر دی وہ گائے لے کر مصر کے باغ کی طرف چلے اور گئو ماتا کی جے کے نعرے لگائے مجمع نے بھی گائے کو دیکھ کر گئو ماتا کی جے کے نعرے لگائے صلح والوں نے جا کر مجمع کو مطمئن کیا کہ اب ہم لڑائی جیت چکے اب ہمارا یہاں کے لوگوں سے لڑنا بے مقصد ہوگا مجمع میں اختلاف رائے پیدا ہوا کہ اب ہم سب گھروں کو لوٹ جائیں یا اور کوئی پروگرام بنائیں کچھ لوگ تو وہیں سے اپنے اپنے گاؤں چلے گئے بڑا حصہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ایک حصہ کوپا گنج کی طرف بڑھا اور دوسرا بڑا حصہ قصبہ مئو کی طرف چلا، جوادری سے مغربی جانب دو کوس کے فاصلہ پر تھا، رات میں چل کر صبح سویرے مئو میں داخل ہو گیا، گئو رکھشنی تحریک نے ہر طرف فضا گرم کر دی تھی کوپا گنج میں کیا قیامت گذری اس کے متعلق صرف زبانی روایتیں ہیں، کسی شاعر نے اس واقعہ پر طبع آزمائی نہیں کی البتہ قصبہ مئو میں ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ کی صبح سے شام تک محاذ آرائی ہوئی دونوں طرف سے کچھ لوگ قتل ہوئے کچھ مسلمان شہید ہوئے ''گوکچھنی'' کا صرف اتنا واقعہ ہے اسی واقعہ پر قصبہ کے تین شاعروں نے طبع آزمائیاں کیں یہ تینوں مثنویاں میرے سامنے ہیں، اتفاق سے ان تینوں حضرات نے اس حادثہ جانکاہ میں شب و روز گذارے ہیں غم و غصہ اور خوف و ہراس کا جو ماحول تھا اس کے چشم دید مشاہد ہیں اس لئے ان کے انداز بیان غم و غصہ اور نفرت کے شدید جذبات کا شاہکار ہیں اور اس حادثہ کو میدان جہاد کی حیثیت دیکر اسی لب و لہجہ میں یہ مثنویاں قلم بند کی ہیں ہر ایک نے میدان جنگ کا ولولہ انگیز نقشہ کھینچا ہے بہادروں کی انفرادی لڑائیوں کی منظر کشی کی ہے، گئو رکھشنی تحریک نے جو نفرت کی فضا بنائی تھی اس کے ردِ عمل کے طور پر ان مثنویوں میں ان کے جوابات بھی ولولہ انگیز انداز میں دیئے گئے ہیں، تینوں مثنویوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی مثنوی کے شاعر کا نام خلیفہ پیر محمد ہے جو قصبہ مئو محلّہ کیاری ٹولہ کے باشندے تھے کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں معلوم ہوتے شعر وشاعری سے تعلق ضرور ہے اردو زبان وادب سے واقفیت کم ہے، کلام پر قدرت معلوم ہوتی ہے میرا جہاں تک خیال ہے وہ یہاں کی علاقائی شاعری ''پچرا'' اور ''خیال'' کے شاعر ہیں اس لئے وہ جو سوچتے ہیں اس کو شاعری لباس پہنا دیتے ہیں صرف ایک شعر میں جنگ کا نتیجہ بتا دیتے ہیں۔

مر گئے دو تین سو کافر پلید اور چھ مومن ہوئے اس جا شہید

خاتمہ جنگ کو دو شعروں میں سمیٹ لیا ہے، انداز بیان شاعرانہ ہے اور اچھا ہے۔

غم سے دل ہر ایک کا شانہ ہوا خانۂ مومن عزا خانہ ہوا

اک عجب ڈھنگ کی پریشانی ہوئی اور دو گانہ، نہ قربانی ہوئی

پیر محمد خلیفہ کی مثنوی مختصر اور صرف ۱۴۴ اشعروں پر مشتمل ہے البتہ اس ماحول اور دردکی غمنا کی کی ترجمانی مکمل ہے۔

(۲) دوسری مثنوی قدرے طویل ہے اس کے شاعر مولانا حکیم بشیر اللہ صاحب ہیں جو تعلیم یافتہ قصبہ کے محلّہ گھوناتھ پورہ کے رہنے والے تھے، بہت باوقار باعزت، شاہی جامع مسجد کٹرہ کے امام وخطیب تھے تین دہائیوں تک یہ فرائض انجام دیتے رہے، صاحب زہد وتقویٰ اور عوام میں ان کا بڑا احترام تھا، خلافت تحریک ۱۹۲۰ء میں جب مسلمانوں نے اپنی عدالتیں قائم کیں تو قصبہ مئو کی عدالت میں تین قاضی مقرر ہوئے ان میں ایک یہی مثنوی نگار تھے، انہوں نے اس مثنوی میں برادرانِ وطن کے مذہبی خیالات وعقائد پر ظریفانہ انداز میں نکتہ چینیاں کی ہیں اس وقت کا ماحول یہی تھا یہ مثنوی دلچسپ ہے انہوں نے چشم دید حالات لکھے ہیں ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بہت تحقیق سے لکھتا ہوں حالات نہیں مشکوک ہے اس میں کوئی بات

کہ خود موجود تھا بندہ وہاں پر یہ سب حالات گذرے ہیں جہاں پر

مثنوی نگار نے حادثہ کی ابتدا بتاتے ہوئے مثنوی میں ادری کے واقعہ کا ذکر کئے

شعروں میں کیا ہے اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ادری میں صلح نامہ ہو جانے کے بعد وہاں کے مجمع کی بڑی تعداد قصبہ مئو آ گئی، البتہ یہ جارحانہ تحریک اس دیار میں ہر طرف تھی عام اشتعال پھیلا تھا اس لئے مئو میں کئی سمتوں سے حملہ آوروں کی بھیڑ پہلے سے اکٹھا تھی یہ مثنوی قدرے طویل ہے تقریباً چار سو اشعار پر مشتمل ہے اور جنگ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے، یہ کوئی با قاعدہ جنگ نہیں تھی نہ ملک گیری مقصد تھا قصبہ کے مدافعت کرنے والے حضرات شام تک اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تو باہری حملہ آور محلّہ میں گھس آئے اور گھروں کی کھپریل پیٹ ڈالی مسجد کے لوٹے اور دروازے توڑ ڈالے دن ڈوبتے حملہ آور کم ہوتے گئے اور پھر میدان جنگ خالی ہو گیا اعظم گڈھ مرکز سے فورس آ چکی تھی اس نے گھروں میں گھس کر قصبہ کے غیر مسلموں کو گرفتار کیا اور اپنے ساتھ ہتھکڑی لگا کر اعظم گڈھ لے گئے ان پر بلوہ اور فوجداری کا مقدمہ چلا بہتوں کو سزا ہوئی اور اس جھگڑے میں چھ مسلمانوں کے شہید ہونے کا ذکر ہے اور ہر ایک کا پورا تعارف کرایا ہے کئی مثنوی نگاروں نے عین ہنگامہ میں زوردار بارش کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے حملہ آوروں کی ہمتیں پست ہو گئیں کیوں کہ وہ کھلے میدان میں تھے شاعر نے کہا:

اسی کے بعد بجلی پھر جو کڑکی — سبھی کے دل کو اس نے پر خطر کی
ہوئے تب بھیگ کر کافر فراری — انہیں تھی پہلے ہی سے آہ وزاری
مسلماں نے کہا کافر بھگے اب — نہیں میدان میں کوئی رہے اب

مثنوی نگار نے بتایا کہ قصبہ کے لوگ اپنے گھروں پر آئے تاکہ کچھ کھا پی لیں مگر ابھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ اک شور بلند ہوا اور معلوم ہوا کہ ایک بڑا جتھہ کہیں سے آ گیا اور نئے جوش وخروش سے حملہ ہوگا مثنوی نگار لکھتے ہیں:

کہ اک موضع ہے ادری یاں سے دو کوس — وہاں کفار آئے چڑھ کے افسوس
کیا تب صلح ان سے واں کے افغاں — بچایا جان کو اپنی ہر اساں
چلے آئے مئو کفار اک دم — ہوئے سب جمع پھر اک بار باہم

اس کے بعد نئے جوش وخروش سے جنگ شروع ہوگئی یہاں بہادروں کے فرداً فرداً کارناموں کا ذکر کیا ہے اور ایک کرامت کا بھی ذکر کیا ہے حملہ آوروں کی طرف سے شدت سے حملہ ہوا:

ہوئے ظاہر بہت میداں میں لڑکے وہ دونوں ہاتھ میں شمشیر پکڑے
وہ کرکے قتل کفاروں کو اکثر درختوں پر چلے جاتے تھے چڑھ کر

قصبہ کے ایک مشہور بہادر خلیفہ رحیم اللہ کا ذکر تینوں مثنوی نگاروں نے کیا ہے وہ بہت جری تھے فن بنوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا، وہ جس طرف حملہ آور ہوتے، دشمن ادھر سے چھنٹ جاتے، مثنوی نگار نے حملہ آوروں کو اعظم گڈھ عدالت سے سزا پانے کے واقعہ پر اپنی مثنوی ختم کی ہے۔

سزا پائی ہر اک حسب قوانین بحسب جرم سب کفار بے دین

مثنوی نگار نے ہر واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، شہید ہونے والوں کے نام مقام ومحلّہ کو بتایا ہے ان کے فن حرب میں کمال کو دکھایا ہے، مثنوی اپنے ماحول اور فضا کی ترجمان ہے اردو زبان وادب اور قوافی کی جو خامیاں نظر آتی ہیں وہ قصبہ کے ماحول کا اثر ہے وہ کہنہ مشق شاعر نہیں ہیں البتہ جذبات کی شدت ہر جگہ نمایاں ہے یہ اس وقت کے ماحول کا اثر ہے۔

(۳) تیسری مثنوی جس کو یہاں شہرت حاصل ہوئی وہ مولوی نور محمد صاحب کی ہے جو ایک خاندان میں محفوظ ہے اس کی نقلیں لوگوں نے حاصل کیں اور اپنے طور پر مطالعہ میں رکھا لیکن ان مثنویوں کی علمی سطح بہت پست ہے، نہ قوافی صحیح ہیں نہ الفاظ صحیح ہیں، بڑی حد تک اس کو تک بندی کہہ سکتے ہیں یہ مثنوی ضرور قابل مطالعہ ہے یہ اس دیار میں اردو اجنبیت کی وجہ سے ہے مولوی نور محمد صاحب کوٹھا کی ولادت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء کو ہوئی یہ باقاعدہ سند یافتہ عالم تھے، دہلی جا کر میاں نذیر حسین سے حدیث پڑھی، فراغت کے بعد درس وتدریس کا بھی عرصہ تک سلسلہ رہا، اتر پردیش اور بہار کے کئی مدرسوں میں فرائض تدریس انجام دیئے، قصبہ کے مشہور مدرسہ فیض عام

میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں آپ کی وفات ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی ان کی یہ مثنوی حادثہ کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوئی، ان کا خاندان قصبہ میں اسماعیل کوٹھا کے نام سے مشہور ہے ان کی مثنوی مکمل اور مفصل ہے مثنوی مخطوطہ کی شکل میں خاندان میں محفوظ ہے، بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں حاصل کی ہیں میرے سامنے مثنوی کی جو نقل ہے اس کی ابتداء میں تمہید کے عنوان سے بارہ تیرہ صفحات نثر میں ہیں میرے معلوم نہیں مثنوی نگار کے قلم سے ہے یا ناقل نے یہ اضافہ کیا ہے اس تحریر میں بہت مستند تاریخی حوالوں سے قصبہ میں صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے قربانی کے مسئلہ پر یہاں جو اختلافات جھگڑے مقدمات چلے ہر ایک کا تاریخ وار تذکرہ ہے یہ ساری تفصیل انہوں نے اردو گزٹ اعظم گڈھ کے حوالے سے لکھی ہے چونکہ یہ تحریر اہم ہے اس لئے اختصار کے ساتھ اس کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

قصبہ میں کتوا برادری مالدار تھی اور یہاں کے انصاریوں پر حاوی بھی تھی کیوں کہ یہاں کی صنعت پارچہ بافی میں اس دور میں ہاتھ سے کتا ہوا سوت استعمال ہوتا تھا جو گاؤں میں تیار ہوتا تھا یہ برادری اس کو خرید کر محفوظ رکھتی اور فروخت کرتی تھی، اس لئے ان کی مہاجنی قائم تھی قربانی کے مسئلہ پر یہ برادری بہت تشدد پسند تھی قصبہ کا پہلا اور مشہورترین واقعہ کمال شاہی کا قصہ ہے کمال نام کا ایک بنکر جو باز کی مسجد کے قریب رہتا تھا اس نے اپنے گھر میں قربانی کی کتوا برادری کو اس کی خبر ہوگئی اور اس کا گھر گھیر لیا اور گھر میں گھس گئے، وہ ایک مٹی کے بنے ہوئے کوٹھلہ میں چھپ گیا جو غلہ رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے اس بھیڑ نے اس کو بلم برچھا اور لاٹھیوں سے قتل کر دیا یہ بڑا دردناک واقعہ تھا پورے قصبہ پر اس کا بڑا اثر تھا، پھر ۱۸۸۴ء کے ایک مقدمہ کا مفصل ذکر کیا گیا جو بیتی مصر بنام جیتن بیتن واسماعیل کے عنوان سے انگریز مجسٹریٹ ایف میولاک جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع اعظم گڈھ کی عدالت میں چلا اس کا فیصلہ جنوری ۱۸۸۴ء میں ہوا فیصلہ میں قصبہ مئو کی تاریخ ۱۸۰۶ء سے نزاع گئوکشی کو دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ایک بلوہ عظیم ہوا بہت سے لوگوں کو سزائیں ہوئیں تعزیری

پولیس قصبہ میں لگائی گئی کبھی ہندوؤں سے اور کبھی مسلمانوں سے رقم وصول کی گئی پھر اس تحریر میں ۱۸۶۴ء کے ایک مقدمہ کے فیصلہ کا ذکر کیا گیا ہے غرضیکہ قصبہ میں یہ نزاع تقریباً ایک صدی تک قائم رہا۔

مثنوی میں بہت سی زائد باتیں بھی ہیں، آغاز داستان کے عنوان سے شاعر نے اصل واقعہ کی ابتدا کی اور بتایا کہ دوہری گھاٹ کی طرف سے کچھ بوچڑ (جانور بیچنے والے نٹ) دیہاتوں سے گائیں خرید کر مسلم علاقہ میں فروخت کرنے کے لئے لا رہے تھے کل ۴۲ گائیں تھیں موضع بھدرسہ میں جب پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے جتھہ بنا کر ساری گائیں چھین لیں، ریوڑ والے فوراً تھانے گئے گائے چھننے کی رپٹ لکھوائی تھانے سے چند سپاہی موقعہ واردات پر پہنچے وہاں ایک مسلح مجمع موجود تھا پولیس نے جب گایوں کی واپسی کے لئے کہا تو مجمع نے پولیس پر حملہ کر دیا اور گائیں لے کر چلے گئے پولیس کچھ نہ کر سکی اور تھانے پر اطلاع دی، تھانیدار مسلح پولیس لے کر پہنچا مجمع سے آٹھ سرغنہ کو گرفتار کیا اور تھانے لایا اور ان پر مقدمہ چلایا عدالت نے ہر ایک کو ایک ایک سال کی سزا دی اور جیل بھیج دیا، ملزمان نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی وہاں کچھ دنوں مقدمہ کی سماعت ہوئی ملزموں پر مزید جرائم ثابت ہوئے ہائی کورٹ میں ڈکیتی، راہ زنی کے جرم میں جج نے سزا کم کرنے کے بجائے تین تین سال کی سزا کا حکم دیا اس طرح ان کی سزا ایک سال سے بڑھ کر چار سال ہو گئی مثنوی نگار نے لکھا۔

یعنی پہلے یہ سزا اک سال تھی　　اور بڑھ کر چار سالہ ہو گئی

مئو کے حادثہ عظیم سے متفرق واقعات جو اطراف میں ہوئے مثنوی نگار نے قاری کو اس سے بھی روشناس کرایا ہے ۱۹/اپریل ۱۸۹۳ء کو ضلع گورکھپور کا ایک واقعہ لکھا ہے جس میں خریدے ہوئے جانور تحریک کے ہم نواؤں نے چھین لئے ان کی کوئی داد وفریاد نہیں ہوئی۔

جب کہ وہ بازار سے گھر لے چلے　　راستے میں ہندوؤں نے آن کے
دل میں لائے کچھ نہ ڈر سرکار کا　　سب زبردستی انہوں نے لے لیا

واقعات متفرقہ میں سوناڈیہہ کا واقعہ بھی لکھاً ہے جس میں ایک بھینس چھین لی گئی تھی یہ ۲۲ اپریل ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے اسی طرح ایک قصاب کے ہاتھ سے بھی جانوروں کے چھیننے کا واقعہ لکھا ہے جو ۲۳ مئی ۱۸۹۳ء کو سکندر پور ضلع بلیا میں پیش آیا، مثنوی نگار نے تین ضلعوں میں گئو رکھشنی کی جارحانہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے مئو کے اطراف میں جو فضا گرم تھی اس کی اچھی عکاسی کی ہے اور بتایا ہے کہ عیدالاضحیٰ سے چند دنوں قبل ہی سے سرگرم تحریک شروع ہوگئی تھی اور حملہ شروع کر دیا گیا تھا مئو کے حادثہ عظیم سے ایک دن قبل موضع ادری میں بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوا مگر وہاں مقابلہ نہیں ہوا وہاں وقت حالات ماحول اور صورت حال کی ہولنا کی کے مدنظر بڑی شان وشوکت کے ساتھ مجمع نے آکر صلح کی درخواست کی اور مسلمانوں نے صلح کر لی یہاں حملہ آوروں کی منشا کے مطابق خونریزی نہیں ہوئی تو مجمع کا ایک حصہ کو پاگنج کی طرف بڑھا اور بڑا حصہ مئو کی طرف چلا جو یہاں سے دوکوس پر تھا وہاں کے بلوے میں سرگرم حصہ لیا غرضیکہ یہ ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے، کہیں کہیں نثر سے بھی وضاحت کی گئی ہے جب قصبہ مئو میں مقابلہ آرائی ہوئی تو اس جنگ کے ہیرو خلیفہ رحیم اللہ کے کارناموں کو بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے ان کے خاندان انکے علم وفضل اوران سے اپنے تلمذ کا ذکر فخریہ انداز میں کیا ہے ان کے جنگی کارناموں کو ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تھا یہی اس رزم کا روح رواں — ساتھ ساتھ اس کے تھے باقی مرد ماں
تھا خلیفہ یہ بھی اپنے وقت کا — ہمت ومردانگی میں فرد تھا
قدمیانہ اور دہرا تھا بدن — پہلواں روئیں تن واستاد فن
ان کی تھی پوشاک اس دن اے اخی — خاص اپنی آنکھ کی دیکھی ہوئی
پاؤں میں پاجامہ آدھی ساق تک — تھا عرب کے قطع کا بے ریب وشک
اس جری کے تن میں روز کار زار — تھا مزیب اک انگر کھا بند دار
ایک سیہ عمامہ تھا سر پر بندھا — دیکھنے میں کیا ہی دلکش خوشنما
جس طرح فرق رسول اللہ پر — تھا بروز فتح مکہ زیب سر

جوش میں شوق شہادت کے یہ تھے　　چاند پورہ کے پیاڑے میں کھڑے
غل ہوا نا گاہ، باغی آ گئے　　بس وہیں سے رزم گہ میں آ گئے
تھے پٹوکہ سے کمر باندھے ہوئے　　ہاتھ میں چھوٹی سی اک لاٹھی لئے

پھر شاعر نے جنگ میں ان کے کمالات اور مردانگی کے بہت سے پہلو دکھائے، ایک موقعہ پر مثنوی نگار نے اس دور کے ایک مشہور عالم مولانا امام الدین پنجابی کا کردار بڑا شاندار لکھا ہے پورے لشکر میں ان کی ولولہ انگیز تقریر کو نظم کیا ہے، دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی موصوف کا تذکرہ کیا ہے لیکن مولوی نور محمد صاحب نے اس ذکر کا حق ادا کر دیا ہے اور میدان جنگ کا نقشہ کھینچ دیا ہے جیسا کہ صحابہ کرام میدان جہاد میں پر جوش تقریریں کرتے پھرتے تھے، بالکل وہی لب ولہجہ وہی جوش وخروش وہی ولولہ انگیز کہ سن کر مارے جوش کے مجاہدین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور پوری قوت سے دشمنوں پر حملہ آور ہو جاتے مثنوی کا یہ حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، چونکہ مثنوی نگار قادر الکلام شاعر تھے اس لئے اس کا حق ادا کر دیا ہے مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دین داروں کے کمال افسر بھی تھے　　مولوی اک صوبۂ پنجاب کے
نام امام الدین، پنجابی لقب　　ہمت وجرأت میں یکتا، منتخب
دیتے تھے ترغیب اور تحریص جنگ　　تا بڑھیں دل اور پیدا ہو امنگ
شیر مردو! جیت لو میدان کو　　یا فدا کر دو تم اپنی جان کو
کر دو ٹھنڈی یا کہ نار کار زار　　یا کہ اپنی جان کو کردو نثار
یاد رکھو مومنان پاک دیں　　مژدۂ جاں بخش ختم المرسلیں
جنت الفردوس، باغ سرمدی　　تیغ کے سائے کے نیچے ہے دھری
ہے شہادت، آج گر مارے گئے　　اور اگر زندہ بچے غازی ہوئے
آج کے دن ہیں، در جنت کھلے　　شوق سے تم بے خطر، جاؤ چلے

یہاں نثر میں آیات قرآنی اور نظم میں جنت کی نعمتوں کی تفصیل بھی ہے آخر میں

مثنوی نگار کہتا ہے۔

کہہ رہا ہے آج رب العالمین میرے پیارے غازیان پاک دیں
بیچتا ہوں آج فردوس بریں لے لے بدلے اس کے جان مومنیں
مول لیتا ہوں میں جان مومنیں اس کے بدلے دے کے فردوس بریں

شاعر نے پھر بتایا کہ اس تقریر سے مسلمانوں میں جوش وخروش بڑھ گیا اور بڑی بہادری سے لاکھوں حملہ آور مارے گئے اور مسلمانوں میں چھ حضرات شہید ہوئے پھر پولیس آئی قصبہ کے حملہ آوروں میں سے کچھ کی گرفتاری ہوئی اور شہدا کی لاشوں کو اٹھوا کر تھانے لائے اور یہاں اعظم گڈھ بھیجی گئیں مثنوی نگار نے شہیدوں کی تعداد نام بہ نام چھ بتائی ہے یہی دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی لکھا ہے، اعظم گڈھ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا دوسرے دن لاشیں ورثاء کو سپرد کر دی گئیں، لاشوں کو لیکر پا پیادہ اعظم گڈھ سے مئو آئے یہاں عامۃ المسلمین نے جمع ہو کر اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ شہدا کو عیدگاہ کے قریب امام باڑے کے میدان میں یک جا ایک قبر میں دفن کیا جائے چنانچہ ایک وسیع وعریض قبر کھودی گئی جس میں ساری لاشیں بلا غسل وکفن خون آلود کپڑوں میں دفن کی گئیں پورے قصبہ میں حزن وغم کا عجیب عالم تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر گھر سے ایک جنازہ اٹھ رہا ہے۔

جن تینوں مثنویوں کا تعارف کرایا گیا ہے اس دور کی فضا کا ہر ایک پر پورا پورا اثر ہے مغلیہ دور سے لے کر اب تک بہت وقار باعزت رہے اس مظلومیت کا تصور بھی نہی تھا اس لئے یہ حادثہ عرصہ تک یہاں کے عوام کے دل ودماغ پر چھایا رہا یہ واقعہ جون ۱۸۹۳ء میں ہوا اور دوسرے سال ۱۸۹۴ء انگریز افسران نے دونوں فریق میں صلح کرائی۔

تینوں مثنویاں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، تینوں میں واقعہ کی منظر کی کوشش کی گئی ہے، لیکن زبان وبیان شاعرانہ کم ہے بس وزن اور بحر کا لحاظ رکھا گیا ہے، قوافی اور ردیف میں بھی لغزشیں ہیں، پہلے مثنوی نگار خلیفہ پیر محمد معمولی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، دوسرے مثنوی نگار عالم فاضل ضرور ہیں لیکن شعر وادب سے واسطہ کم معلوم ہوتا

ہے اس لئے غلیل کو گردیل اور مٹی کی گولی کو گلٹا کہتے ہیں اسی طرح مقامی بولی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، تیسرے مثنوی نگار مولوی نور محمد کوٹھا مستند عالم اور درس وتدریس سے ہمیشہ وابستہ رہے اس لئے زبان وبیان پر قدرت لب ولہجہ عالمانہ محسوس ہوتا ہے۔

یہ تینوں مثنویاں مخطوطہ کی شکل میں کہنے والے کے خاندان میں محفوظ ہیں اور کوئی اب تک طبع نہیں ہوئی ہے، مثنوی میں انگریزی حکومت کی تعریف اور اس کے لئے دعا خیر کا ذکر پوری مرعوبیت کے ساتھ پایا جاتا ہے بات یہ ہے کہ ہندوستان گیر بغاوت ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں انگریزوں نے جو بے پناہ مظالم کئے تھے اس نے پورے ملک کو تھرتھرا دیا تھا بالخصوص مسلمانوں کے پچاسوں ہزار افراد کو پھانسیوں پر چڑھا دیا گیا، کالے پانی بھیجا گیا ان کی یاد ابھی لوگوں کے ذہن میں موجود تھی اور بچھو کی طرح احساس کو ڈنک مار رہی تھی، یہ خیر خواہی وقت کی مجبوری ہے، مثنوی میں الفاظ سہل سادہ، روانی وسلاست قوافی وردیف میں برجستگی سے جان پڑتی ہے انداز بیان میں جاذبیت ضروری ہے ورنہ مثنوی خسرہ کھتونی بن کر رہ جائیگی، بدقسمتی سے ان مثنویوں میں یہ خامیاں موجود ہیں۔

# مولانا آزاد اور ہندوستان کی آزادی

## گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ سیاستدانوں کے حلقہ میں ایک ایسی قد آور شخصیت تھی جس کے سامنے سارے سیاستداں بونے معلوم ہوتے تھے، فہم وفراست نکتہ سی ومعاملہ فہمی، بصیرت ودور اندیشی، حالات وماحول کی نبض شناسی وہ کون سا جوہر ہے جو اس شخصیت میں نہ رہا ہو پیچیدہ تر مسئلہ کو اس کی عالی دماغی اس طرح حل کرتی جیسے اس سے سادہ اور کوئی مسئلہ ہی نہ ہو، سیاسیات کی الجھی ہوئی گتھیوں اور مسائل کے عقدۂ لاینحل کو ان کا ناخن گرہ کشا اس طرح کھول دیتا تھا جیسے اس کے نزدیک یہ گرہ بھی کوئی گرہ تھی، تقریر وتحریر دونوں مثالی، وہبی اور خداداد، اس کا قلم خارا شگاف، دلوں کی دنیا زیروزبر کرنے والا، جس موضوع پر چل پڑا، پورے ملک میں تہلکہ مچادیا، اس کے اخبار کے صفحات طریقہ اظہار کی جدت وعظمت اور جوش تحریر کے دہکتے اور لودیتے ہوئے انگارے اپنے دامن میں لے کر عوام وخواص کی محفلوں میں جب آتے تو یہ آگ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے سینوں میں دہکنے لگتی تھی، اس کے قلم کی جادو نگاری اور جرأت نگارش نے اسے برطانوی حکومت کی نگاہ میں معتوب بنادیا اور اسے بنگال کی سرزمین سے جلاوطن کرایا، وہی شخصیت جب مسند خطابت پر متمکن ہوتی اور اس کی رعد آسا آواز فضا میں گونجتی تو برطانوی اقتدار کے شیش محل کے درودیوار لرزنے لگتے تھے، تقریر سننے والوں کا تاثر یہ تھا جیسے کوئی طوفان گرجتا، اڈتا دھاڑتا، مایوسی وشکست خوردگی کے سارے خس وخاشاک کو اپنے تیز دھارے میں بہاتا ہوا آگے بڑھتا جارہا ہے، نپے تلے الفاظ، تیرونشتر کی طرح تیز وتند جملے، دلوں کی دنیا میں ہیجان کرنے والا انداز بیان، آواز کا اتار چڑھاؤ، زیروبم، تسلسل وروانی، سلاست بیان، جوش خطابت کی سحر آفرینی کی وجہ سے کچھ ایسا سماں بندھ جاتا تھا کہ سننے والوں کو اپنے

گردوپیش کا ہوش نہیں رہتا تھا، پورا مجمع جیسے مسمر بزم کا معمول ہوکر رہ گیا ہو۔

علم وفضل خداداد تھا، مطالعہ اتنا وسیع تھا جیسے اس کا دماغ ایک ایسی لائبریری ہو جس میں ہر موضوع پر تحقیقی مواد موجود ہے، اس قدآور شخصیت کی رفعت وبلندی کا جائزہ لینے کے لئے بڑے بڑے مدعیان علم جب اپنا سر اٹھاتے تھے تو ان کے سروں کی دستار فضیلت گر جاتی تھی اور نگاہیں احساس کمتری سے جھک جاتیں اسی عبقری، بے مثال عجوبۂ روز گار شخصیت کو سارا ملک پورے ادب واحترام کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے پر عظمت نام سے یاد کرتا ہے اور ان کی خدمت میں عقیدت واحترام کے نذرانے پیش کرتا ہے، ان کی مرعوب کن مجلس میں بڑے سے بڑی علمی اور سیاسی شخصیتوں کو نہ جرأتِ گفتار تھی، نہ یارائے سخن، ان کے فضل وکمال عظمت وجلال کے آستانے پر ہر سر خم، ہر پیشانی وفور عقیدت واحترام سے جھکی ہوئی، اور احساس برتری سے تنی ہوئی گردنیں اس طرح جھک جاتیں جیسے وہ وبال دوش ہوں۔

## قدرت کی فیاضی:

قدرت بھی مولانا آزاد کے سلسلہ میں کتنی فیاض تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ان کی عمر تیرہ اور چودہ سال ہی کی تھی کہ ان کے زور خطابت اور ان کے قلم کی سحر نگاری نے پورے ملک کے دانشوروں اور مفکروں سے اپنا لوہا منوالیا اور ان کی محفلوں میں اس نوعمر لڑکے کے لئے مسند صدارت خالی کردی جاتی تھی، اسی کمسنی کی عمر میں بڑے بڑے مفکرین اور اہل علم نے ان کو ''مولانا'' اور ''ابوالکلام'' کا معزز خطاب دے دیا حالانکہ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے صرف فیروز بخت یا محی الدین تھے کیوں کہ ابھی وہ بچپن کے حدود سے نکلے بھی نہیں تھے۔

## حالی کی حیرت:

مولانا آزاد فطرتاً انتہائی ذکی وذہین تھے، بارہ تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے

اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو اس وقت کے مسلم الثبوت اہل علم انہیں دیکھ کر انگشت بدنداں اور حیرت زدہ رہ گئے ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس میں وہ نظر آنے لگتے ہیں اور ہندوستان کے معیاری رسالہ ''مخزن'' لاہور میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے ہیں، یہ مضامین زور بیان، شوکت الفاظ، صحافیانہ انداز نگارش کے شاہکار ہیں اور علمی مجلسوں مین ان کے دقیع تعارف کا ذریعہ بنتے ہیں اور جب ان مضامین کے پڑھنے والوں سے آزاد کا بالمشافہہ تعارف کرایا جاتا ہے تو حالی وشبلی جیسے اہل علم کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ کمسن لڑکا ایسے مضامین لکھ سکتا ہے، لیکن سچائی یہی ہے، اس لئے لوگوں کو تجربات کے بعد یقین کرنا ہی پڑا۔

اخبار ''لسان الصدق'' ۲۰ نومبر ۱۹۰۲ء کو آزاد کی ادارت میں جاری ہوا اس وقت آزاد کی عمر صرف ۱۴ سال تھی، اخبار جلد ہی علمی حلقوں میں مقبول ہو گیا اس کی مقبولیت کی واحد وجہ یہی تھی کہ آزاد کے قلم سے اہم ترین مسائل پر محققانہ مضامین خطیبانہ زور بیان کے ساتھ شائع ہوتے تھے، مئی ۱۹۰۳ء سے حالی کی مشہور کتاب ''حیات جاوید'' پر تبصرہ شروع کر دیا اور کئی قسطوں میں مسلسل لکھتے رہے اس سلسلہ مضمون نے حالی اور ان کے حلقے کو بہت متاثر کیا اور جب مولانا آزاد انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے تو حالی بھی اس جلسہ میں موجود تھے، مولوی وحید الدین نے حالی سے آزاد کا تعارف کرایا کہ یہ ہیں ''لسان الصدق'' کے مدیر گرامی آزاد، تو حالی حیرت سے اس کمسن لڑکے کا منہ دیکھتے رہ گئے، اور بار بار پوچھتے رہے کہ، یہ آزاد ہیں؟ آخر حالی نے خود آزاد سے ان کی عمر دریافت کی، پھر اس کے بعد کہا، ابھی بہت کمسن ہو۔

## آزاد کے لئے مسند صدارت خالی کر دی گئی:

آزاد لسان الصدق کے علاوہ دوسرے اخبارات میں بھی مضامین لکھتے رہے، ان کا ہر مضمون اہل علم کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا تھا، کسی بھی اخبار یا رسالہ میں ان کا مضمون شائع ہوتا تھا تو لوگ ذوق وشوق سے اس کو حاصل کرتے اور بیساختہ داد

وتحسین دیتے، زورِ قلم کے ساتھ قدرت نے آزاد کو مزاج بھی خطیبانہ دیا تھا، ان کی تقریر کی جادو اثری کے وہ تمام لوگ شاہد ہیں جنھوں نے ایک بار بھی آزاد کی تقریر سنی ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہوا تو اس کے ایک اجلاس کی صدارت سولہ سالہ آزاد کو دی گئی ان کی صدارتی تقریر زورِ بیان، شوکت الفاظ، روانی وسلاست، بیساختگی و برجستگی، حالات ومسائل پر بے لاگ اور مستحکم رائے کا اظہار کچھ اتنا پر اثر تھا کہ اس تقریر کے بعد کسی جوہر شناس نے اس نوعمر لڑکے کو ''ابوالکلام'' کہہ کر پکارا اور عالمانہ انداز بیان نے اس کمسنی ہی میں، مولانا کی دستار فضیلت ان کے سر پر باندھ دی اور پھر آپ پورے ملک میں ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے نام سے مشہور ہوگئے، یہ نام ہی ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کے ساز دل کے لئے مضراب بن گیا، تحریروں سے لذت لینے والے ابھی سیر بھی نہیں ہوئے تھے کہ سامعہ نے آگے بڑھ کر انکے الفاظ کے موتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کردیا۔

## علامہ شبلی اور آزاد:

علامہ شبلی ممبئ میں مقیم تھے، مولانا آزاد بھی انہیں دنوں ممبئ گئے ہوئے تھے اس وقت ان کی عمر کا سترہواں سال چل رہا تھا، دونوں کی ملاقات ایک مجلس میں ہوئی تو علامہ شبلی نے ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کا بیٹا سمجھا اور ان سے کہا کہ ''ابوالکلام آزاد آپ کے والد ہیں؟ مولانا آزاد نے مسکرا کر کہا کہ میں خود ابوالکلام ہوں، علامہ شبلی کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے وہ اخباروں کے ذریعہ مولانا آزاد کی شعر وشاعری اور ان کی ساحرانہ انشا پردازی سے واقف تھے اسی واقفیت کی روشنی میں آزاد کو ایک کہنہ مشق اور عمر دراز آدمی تصور کرتے تھے لیکن علامہ شبلی کی یہ حیرت زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں مولانا علی محمود اور پنجاب کے مولانا نظام الدین اور علامہ شبلی کی ایک صحبت میں مناظرہ کی کسی بحث میں ''رشیدیہ'' کے متن پر گفتگو ہورہی تھی، علامہ شبلی مولانا علی محمود کو رشیدیہ کے بعض مطالب کو سمجھانا چاہتے تھے

لیکن مولانا علی محمود ہر بار الجھ پڑتے تھے، کج بحثی بڑھتی چلی گئی تو مولانا آزاد نے بحث میں دخل دے کر مولانا علی محمود کو اپنے دلائل سے مطمئن کیا اور وہ خاموش ہو گئے، علامہ شبلی بہت محظوظ ہوئے اور کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو، تب مولانا آزاد نے ایک زوردار تقریر کی جس سے خوش ہو کر علامہ شبلی نے کہا صاحبزادے! تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ہے، تمہیں کسی علمی نمائش میں بطور عجوبہ پیش کرنا چاہیئے، انہیں ملاقاتوں کا تاثر تھا کہ علامہ شبلی نے مولانا آزاد کو اس کم عمری کے باوجود ''الندوہ'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔

## آزاد نے اپنی راہ خود بنائی:

مولانا آزاد انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر ۱۹۰۴ء میں مولوی محمد یوسف جعفری سے انگریزی سیکھنی شروع کی، چونکہ ذہن دراک اور ذہانت فطری تھی اس لئے بہت جلد انگریزی کتابوں کے مطالعہ کی ان کی استعداد پیدا ہو گئی، اور ہر موضوع پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھنی شروع کر دی، اگرچہ زندگی میں کبھی بھی انہوں نے انگریزی کو اپنا ذریعہ اظہار نہیں بنایا جب کہ ان کو زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی، انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کا جذبہ صرف اس لئے پیدا ہوا کہ مستقبل میں انہیں یورپ اور دوسرے ملکوں کا دورہ کرنا ہندوستان میں تیز تر سیاسی سرگرمیوں کے لئے ضروری تھا اس کا خاکہ وہ اپنے ذہن میں بنا چکے تھے، ہندوستان میں ان کی مقبولیت وشہرت بڑھتی جارہی تھی، امرتسر کے مشہور اخبار ''وکیل'' کے مالک نے بہ اصرار الندوہ سے استعفاء دینے پر آپ کو مجبور کیا اور اپنے اخبار وکیل کی پوری ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی، وکیل اس زمانہ میں اردو کا مشہور ترین اخبار تھا، آپ نے اس اخبار کے ذریعہ علی گڈھ اور ترکی کے مسائل پر اپنے خیالات کا پوری بلند آہنگی کے ساتھ اظہار کیا، اخبار کی اشاعت کئی گنی بڑھ گئی۔

## مولانا آزاد انقلابیوں کے ہراول دستے میں:

آزاد کی عمر کا سترہواں سال تھا، اب وہ ہندوستان میں دور دور تک متعارف ہو

چکے تھے، اخبار کے صفحات اور اسٹیج دونوں سے ان کی صلاحیت وقابلیت ذہن ومزاج، عظمت فکر ونظر، استنباط مسائل، استخراج نتائج کی بے پناہ استعداد کا اب ہر شخص اعتراف کرتا جا رہا تھا، اس کم عمری ہی میں آزاد ہندستان کی آزادی کے مسئلہ پر انتہائی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ سوچنے لگے تھے اور مسلمانوں میں بیداری اور جوش جہاد پیدا کرنے کی راہیں سوچا کرتے تھے، اس وقت تک مسلمانوں کا کوئی طبقہ اجتماعی طور پر میدان میں نہیں آیا تھا جو براہ راست برطانوی اقتدار سے نبرد آزما ہو، برادران وطن کی بھی کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جس نے آزادی کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہو، انڈین نیشنل کانگریس ابھی سرکار پرستوں کے نرغے میں تھی، البتہ انڈر گراؤنڈ کچھ سیاسی سرگرمیاں بنگال میں جاری تھیں جس کا مقصد برطانوی اقتدار کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا، تھانوں پر حملہ کرنا، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا اس کے پروگرام میں شامل تھا۔

مولانا آزاد بھی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کے حق میں تھے لیکن ابھی تک ان کے سامنے کوئی واضح راستہ نہیں تھا اتفاق سے انہیں حالات میں ان کا تعارف بنگال کے مشہور انقلابی لیڈر شیام سندر چکرورتی سے ہو گیا، یہ جنوری ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے، مسٹر چکرورتی مولانا آزاد کے خیالات وجذبات اور گفتگو سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے دوسرے انقلابیوں سے مولانا آزاد کا تعارف کرایا، انڈر گراؤنڈ کام کرنے والے انقلابی ہر نئے آدمی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ معلوم نہیں کون برطانوی ایجنٹ اور جاسوس ہے اس لئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے اس لئے پہلے مرحلہ پر مولانا آزاد سے بھی ان کو بدگمانی رہی کیونکہ یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سرزمین میں ہونے والی تیز تر سیاسی سرگرمیوں میں مسلمانوں کا وجود عنقا تھا اور عام طور پر ان کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ مسلمان انگریزی حکومت کا خیر خواہ ہے، سرسید اور ان کے ہم نواؤں کے خیالات، ان کی سرگرمیاں، غلامانہ ذہنیت کا اظہار ان کی نگاہوں کے سامنے تھا اس لئے انقلابی ہندو بنگالی کسی مسلمان پر قطعی بھروسہ نہیں کرتے تھے،

مولانا آزاد کے سامنے بھی یہی صورتِ حال آئی ہر انقلابی نے مولانا آزاد کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھا، اس لئے انقلابیوں کی عام مجلسوں تک تو مولانا آزاد کی رسائی تھی لیکن ان کی خصوصی میٹنگوں میں ان کی شرکت کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے دلوں میں یہ کھٹک تھی کہ ممکن ہے یہ بھی سرسید کے ہم نواؤں میں سے ہوں مولانا نے اس صورت حال کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کی خودداری کو ٹھیس لگ رہی تھی اس لئے انہوں نے انقلابیوں سے بحثیں کیں، گرما گرم گفتگوئیں کیں اور بالآخر ان کو اس صداقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ چند سرکاری مسلمانوں اور عہدہ داروں کو دیکھ کر پوری مسلمان قوم پر بداعتمادی کرنا غلط ہے، تمام اسلامی ممالک مصر، ایران، اور ترکی میں جمہوریت کی بحالی کے لئے مسلمان سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے دل آزادی کی تڑپ سے خالی ہوں یہ انقلابیوں کی غلطی ہے کہ وہ مسلمانوں میں کام نہیں کرتے اور قصداً ان کو سیاسی سرگرمیوں میں شریک نہیں کرتے، مولانا آزاد نے ان کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ اگر مسلمان قوم کو سیاست سے بے دخل کر دیا گیا اور ان سے علیحدہ ہو کر کوئی جدوجہد کی گئی تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، حصولِ آزادی کے لئے دونوں کی مشترکہ جدوجہد ضروری ہے اس کے بغیر آزادی کا تصور بھی محال ہے۔

پہلے تو وہ مولانا آزاد کی باتوں پر یقین نہ کر سکے لیکن بتدریج انقلابی مولانا آزاد کے ہم نوا اور ہم خیال ہوتے گئے، دوسری طرف مولانا آزاد نے مسلمان نوجوانوں میں کام کرنا شروع کر دیا، ان میں آزادی کا جذبہ اور جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے اپنی شعلہ بیانی اور آتش نوائی سے کام لیا اور مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں جوشِ عمل کی آگ بھڑکا دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد مسلمان نوجوانوں کی ایک پرجوش جماعت نے آزادی کے پرچم کو پوری قوت سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا، اس طرح ہندو بنگالی انقلابیوں کا ذہن از خود صاف ہوتا چلا گیا، مسلمان بنگالی انقلابیوں نے بنگال میں اتنی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا کہ پورے بنگال کو شعلہ جوالہ اور

کوہ آتش فشاں بنا دیا، سیکڑوں نو جوانوں نے قید و بند کو کھیل سمجھ لیا اور کتنوں نے آگے بڑھ کر دار و رسن کو چوم لیا۔

## یورپ اور مسلم ممالک کا دورہ:

۱۹۰۷ء کی ابتداء میں مولانا آزاد عراق، شام، ترکی اور مصر کے دورے پر گئے، اسی سال آپ نے یورپ کے بعض ملکوں کا بھی دورہ کیا، مقصد سفر کیا تھا؟ اس کے متعلق مولانا آزاد نے صراحتاً کوئی بات نہیں کہی ہے، البتہ قرائن سے ان کا مقصد سفر متعین کیا جا سکتا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد انقلابیوں کے ہراول دستہ میں شامل ہو چکے تھے اور مسلمانوں کا انقلابیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، مستقبل میں اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کو آپ بصیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اس لئے آپ نے سب سے پہلے خود ان سے رابطہ پیدا کیا اور اس تحریک آزادی میں شمولیت کے بارے میں اپنے اخلاص کا پورا یقین دلا دیا تب آپ نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا کہ جلد از جلد آزادی کے دیوانوں کی صف بندی کی جائے پھر آپ نے اس کے لئے جدوجہد کی اور ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے مسئلہ پر ہندو اور مسلمانوں کا ملا جلا جو ردِ عمل حکومت کے سامنے آیا یہ نتیجہ تھا مولانا آزاد کی مسلسل جدوجہد کا۔

لیکن خود مسلمانوں میں مستقل طور پر کس نہج پر کام کیا جائے؟ اس کا کوئی واضح راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا اسی راستہ کی تلاش میں مسلم ممالک اور یورپ کا دورہ کیا، کیونکہ اس سفر میں آپ نے انہیں لوگوں سے زیادہ ملاقاتیں کیں جو ان ملکوں میں انقلاب کے ہراول دستے میں شامل تھے، ترکی میں ''ینگ ٹرکش گروپ'' اور مصطفے کمال کے ہم نواؤں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے، عراق میں غزالی انقلابیوں سے راہ رسم پیدا کی جا رہی ہے، ترکی میں انقلاب کے چند اہم لیڈروں سے ان کی ملاقاتیں اہمیت کی حامل ہیں، اور جب آپ ہندوستان واپس آئے تو ان ممالک کے قائدین تحریک سے آپ کی خط و کتابت بھی رہی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان ممالک میں

ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگ آزادی میں رہنمائی کی تربیت حاصل کرنے گئے تھے اور انہوں نے اس سبق کو خوب یاد رکھا کیونکہ بعد میں انہیں خطوط پر آپ نے کام شروع کیا جن کا آپ مشاہدہ کر چکے تھے حتیٰ کہ وہی لب ولہجہ اور طرز فکر بھی اپنا لیا جو مسلم ممالک میں سکہ رائج الوقت بنا ہوا تھا۔

## مولانا آزاد کی آواز بانگ درا بن گئی:

مولانا آزاد اگرچہ تیز تر سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنا حلقۂ عمل صحیح طور پر نہیں بنا سکے ہیں، ان کی فہم وفراست تدبر وذہانت اور عبقری ذہن ودماغ نے جو عقدے حل کئے تھے اور آزادی کی تحریک کو صحیح سمت دینے اور اس کے لئے ایک پر جوش ٹیم تیار کرنے کے لئے ان کے ذہن میں جو خاکے تھے ان میں رنگ بھرنے کے لئے ان کو کوئی ایسا اخبار چاہئے تھا جس کو آزادی کے ساتھ ایک پالیسی پر چلا سکیں اور قوم کو مسلسل جھنجھوڑ کر بیدار کر سکیں اس مقصد کے لئے مسٹر محمد علی نے جنوری ۱۹۱۱ء میں جب کامریڈ نکالا تو مولانا آزاد کا یہ جذبہ جوالامکھی بن گیا اور انہوں نے بڑی سرگرمی سے اس پہلو پر سوچنا شروع کر دیا، اس زمانے میں پنجاب اور یوپی سے بہت سے روزنامے، ہفت روزہ اور ماہنامے نکلتے تھے لیکن اردو کی کتابت وطباعت کی طرف سے وہ مطمئن نہیں تھے وہ اس میں جدت پیدا کرنے کے قائل تھے اس لئے خط نستعلیق کے بجائے اردو ٹائپ کو ترجیح دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ ایک ایسا پریس قائم ہو جس میں اردو ٹائپ میں اخبار چھپ سکے اور اخبار میں تصویریں بھی شائع ہو سکیں اسلئے انہوں نے کلکتہ میں الہلال نام سے ایک پریس قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مولانا آزاد کا ہر فیصلہ درحقیقت عمل کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے، انہوں نے حسب منشا ٹائپ کا پریس قائم کر لیا، اور ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ''الہلال'' نام سے اپنا منفرد اور ممتاز اخبار نکالا، جو اخباروں کی دنیا میں اس طرح رہا جیسے خزف ریزوں کے ڈھیر میں یاقوت وجواہر سے مرصع تاج زریں، اس نے پہلی ہی اشاعت میں پورے ملک کو

چونکا دیا اور آناً فاناً اس نے وہ مقبولیت حاصل کر لی جواب تک کسی اردو اخبار نے نہیں حاصل کی تھی، الہلال پڑھنے والے اس کی تاریخ اشاعت پر بڑی بے چینی کے ساتھ ڈاکیہ کا انتظار کرتے اور ہاتھ میں آتے ہی جب تک ابتدا سے انتہا تک اسے ختم نہیں کر لیتے دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، بہت جلد ہی اس کی اشاعت ۲۸ ہزار تک پہنچ گئی اور اس کے بہت سے شمارے دوبارہ سہ بارہ شائع کرنے پڑے، یہ اخبار ایسا تھا کہ اس کو رندان خراباتی سے لیکر علماء و مشائخ کی خلوتوں تک شرف باریابی حاصل تھا اس کے مصور ہونے کے باوجود اہل تقویٰ وفتویٰ سبھی پڑھتے تھے۔

ابھی تک سیاسی سرگرمیاں ایک مخصوص حلقہ میں تھیں اور ابھی تک سیاست اور سیاسی مسائل پر بحث ومباحثہ خلوت کدوں سے سڑکوں اور بازاروں میں نہیں آئی تھی، الہلال نے جذبۂ آزادی کی آگ کو اتنا دہکایا کہ لاکھوں سینے اس کی بھٹی بن گئے اور خواص سے گذر کر عوام تک ہر طرح کی قیامتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ سینوں میں رکھنے لگے، مولانا آزاد نے اخبار کے صفحات سے شعلہ بیان مقرر اور آتش نوا خطیب کا کام لیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی خلافت سے ہندوستانی مسلمانوں کا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا تھا اور ہر دل ترکوں کی ہمدردی سے معمور تھا، یہاں کے غریب عوام ترکوں کے لئے چندے کرتے ہیں، جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور دوا علاج کے لئے یہاں سے طبی مشن بھیجے جاتے ہیں جیسے ترکوں کا مسئلہ خود اپنے گھر ہندوستان کا مسئلہ ہو اس طرح کا جوش وخروش پایا جاتا تھا، خدمت کا ایک نشہ ہر شخص پر سوار تھا، الہلال نے اس شراب کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا کیونکہ اس میں ایک پہلو انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا بھی تھا اس لئے سیاسیات عالم پر نظر رکھنے والا وہی کریگا جو الہلال کر رہا تھا، اس لئے ہندوستان کا علمی حلقہ خصوصیت سے الہلال کا دیوانہ تھا یہ وقتی مسائل پر بڑی جچی تلی رائے پیش کرتا تھا، اس کے ہر آرٹیکل میں خلوص اور اظہار بیان سے تدبر وفراست کا نور جھلکتا تھا، جذباتی مسائل کے موقعوں پر برطانوی حکومت کے ایوان غرور پر نفرت وغصہ کے انگارے برسانے میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی، ایسے

موقعوں پر الہلال کا قلم خارا شگاف بن جاتا تھا۔

۱۹۱۳ء کے اہم ترین مسائل میں مسجد کانپور کے توڑے جانے کا واقعہ اور علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کی سرد جنگ کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے ان موقعوں پر الہلال نے جو کچھ لکھا وہ قول فیصل تھا اور مسجد کانپور کے انہدام کے مسئلہ پر مسلمانوں کی غیرت وحمیت کی رگوں میں جوش انتقام کا گرم خون دوڑا دیا، الہلال کا آرٹیکل ''مشہد اکبر کا دردناک نظارہ'' نے ہزاروں شعلہ بیان خطیبوں، اور آتش نوا اسپیکروں سے زیادہ کام کیا، ایوان حکومت میں زلزلہ آ گیا، اس کی پر غرور جبین اقتدار پر شکن پڑ گئی اور برطانیہ کی نادر شاہی حکومت نے الہلال کو پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ کرلیا، الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی۔ ۸/ستمبر ۱۹۱۳ء کو زرِ ضمانت طلب کیا گیا اور ۲۳/ستمبر ۱۹۱۳ء کو دو ہزار کی ضمانت دیدی گئی جسے حکومت نے ضبط کرلیا، اس کے چند ہی دنوں بعد الہلال سے دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی مولانا آزاد نے یہ ضمانت بھی دیدی اور الہلال کو جاری رکھا، بعد میں یہ ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔

آپ نے البلاغ کے نام سے دوسرا پریس قائم کیا اور اخبار البلاغ جاری کیا ۱۲/نومبر ۱۹۱۵ء کو اس کا پہلا شمارہ نکلا، یہ اخبار بھی الہلال کا نقش ثانی ثابت ہوا وہی لب ولہجہ، وہی تیور، وہی انداز بیان وہی جذبات وہی خیالات وہی پالیسی اس لئے معلوم تھا کہ اس کی زندگی بھی بہت مختصر ہوگی، چنانچہ ۳۱/مارچ ۱۹۱۶ء کو پانچ مہینہ کی زندگی میں برطانوی سامراج کی بھینٹ چڑھ گیا اور اخبار ضبط کرلیا گیا۔

## مولانا آزاد جلا وطن کئے گئے:

اخبار کی ضبطی کے ساتھ مولانا آزاد کا پورے صوبہ بنگال سے اخراج کر دیا گیا، پنجاب اور یوپی میں داخلہ پہلے ہی سے بند تھا اس لئے آپ نے بہار کے ایک مقام رانچی کو منتخب کیا، بعد میں جلا وطنی نظر بندی میں تبدیل کردی گئی اور آپ پر ہر طرح کی قانونی پابندیاں عائد کردی گئیں، اسی قید خانے میں گاندھی جی نے مولانا آزاد سے ملنا

چاہا تو حکومت نے ان کو ملاقات کی اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو گاندھی جی سے بھی بڑا حکومت کا دشمن سمجھتی تھی۔

## مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح:

اگست ۱۹۱٦ء میں مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح حیات تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی جب کہ رانچی میں نظر بندی کا سلسلہ جاری تھا، کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی، زبان وادب کی چاشنی، انداز بیان کی شوخی، استعارات وکنایات کا مینا بازار بادہ وساغر کی اصطلاح میں معارف وحقائق اور مشاہدۂ حق کی گفتگو، اندازِ بیان زبان وادب کا چٹخارہ رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب خوان صد ہزار نعمت ثابت ہوئی یوں تو کہنے کو یہ آپ بیتی ہے، نجی زندگی کے حالات ہیں لیکن استعارات وکنایات کے اتنے دبیز پردے ہیں کہ حقیقت وواقعیت کا پتہ لگانا کچھ آسان نہیں اور شاید دانستہ ایسا کیا گیا کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے عجوبہ پسند رہا ہے، کھلی ہوئی حقیقیت اسے دیر میں متأثر کرتی ہے لیکن جو بات علم وادراک کے حدود سے آگے ہو، اندھیروں کے لمس کی طرح اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے تو اس کی طرف دلوں کی عقیدت جھکتی ہے اور مرعوبیت سجدہ ریز ہوتی ہے، یا ان کے جدت پسند ذہن نے ایک نئے اسلوب کی آپ بیتی کہنے کا تہیہ کیا ہو، اور یہ بھی مدنظر رہا ہو کہ ہر شخص اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس کے مفہوم کو سمجھے، غرضیکہ پوری کتاب پڑھ جائیے تو آپ محسوس کریں گے کہ نرم اور ملائم، خوبصورت، حسین، رنگارنگ، جاذب نظر ریشم کے تھان پلٹے جارہے ہیں ریشم کی ملائمت کا لمس انگلیوں میں گدگدی پیدا کرے گا، آنکھیں سرور حاصل کریں گی، لیکن جب آخری پردہ اس ریشمی تھان کا اٹھ جائے گا تو اس میں اس عبت حریر کا وجود کا عنقا ہوگا جس کی آپ کو تلاش ہے، کیونکہ وہ اس میں مستور ہی نہیں تھی، ریشمی تھانوں کی دکان سے نگاہیں لذت اندوز ہوسکتی ہیں لیکن دل کی تشنگی اس سے دور نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

## رانچی نظر بندی کی یادگار:

مولانا آزاد کی رانچی میں نظر بندی دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی تھی لیکن مولانا آزاد جیسا قلم کا جادوگر اور کردار عمل کا رسیا اپنی دلچسپیوں کا سامان اسی بنجر علاقہ سے فراہم کر لیتا ہے تذکرہ کی ترتیب کے ساتھ رانچی میں ۱۴/۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انجمن اسلامیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا، اس انجمن کی بنیاد اپنے دل ودماغ کی تسکین کے لئے آپ ہی نے ڈالی تھی، آپ نے وہاں کے باشندوں میں کردار وعمل کی روح پھونکنے کا ایک ذریعہ اختیار کیا تھا آپ کی ہدایات اور مشوروں پر اس کے پروگرام بنتے رہے، بعد میں مقامی باشندوں نے اسی انجمن کو آزاد کی یادگار کے طور پر ایک کالج کی شکل دیدی جو آج بھی رانچی میں مولانا آزاد کی نظر بندی کی یاد دلاتا ہے۔

## قفس میں رہ کے بہار چمن کا نظارہ:

مولانا آزاد رانچی کی چھوٹی سی دنیا میں محصور ہیں اور ادھر ہندوستان کی سیاسی فضا میں امس بڑھتی جا رہی ہے جس سے لوگ بے چین ہو کر نئی آب وہوا کی تلاش میں دیوانہ وار سڑکوں پر آجاتے ہیں، خلافت کمیٹی بنجاتی ہے، جمعیۃ علماء ہند وجود میں آجاتی ہے، گانگریس پر بتدریج آزادی پسندوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے، گاندھی جی افریقہ کی سرزمین سے ہندستان واپس آچکے ہیں، ہندو قوم تو اب تک ان کی قدر شناس نہ ہوسکی تھی لیکن مسلمانوں نے انہیں سر اور آنکھوں پر بٹھایا، خلافت فنڈ سے گاندھی جی کے دورے کرائے جا رہے ہیں، مولانا محمد علی کے اخبار کا مریڈ کا لب ولہجہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے، بلکہ کبھی کبھی آگ اگلنے لگتا ہے، حسرت موہانی انتہا پسندوں کے امام ہوتے جا رہے ہیں اور ملک میں سیاسی بیداری عام ہوتی جا رہی ہے لیکن مولانا آزاد اپنی چھوٹی سی دنیا سے جھانک کر ان حالات کو دیکھتے ہیں، دل تڑپتا ہے کہ آگے بڑھ کر لشکر سیاست کے اس ہراول دستے کو صحیح رخ پر لگا دیں، نظر بندی

کے آلام ومصائب کے باوجود ذہن ودماغ نے جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے اسکے مطابق ملک کی رہنمائی کا آغاز کریں لیکن نظر بندی کے کانٹے دار تاروں کی باڑھ کو چھلانگ لگا کر پار کرنے کی کوئی شکل نہیں اس لئے خاموش تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔

## زندانِ رانچی سے رہائی:

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مولانا آزاد کی رانچی کی نظر بندی ختم کی جاتی ہے اور چار سال کی گھٹن والی زندگی سے نجات حاصل ہوتی ہے، آپ سیدھے دہلی پہنچ جاتے ہیں اور حکیم اجمل صاحب کے مکان پر گاندھی جی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور پہلی ملاقات میں چوٹی کے ان دونوں لیڈروں کو مولانا آزاد مشورہ دیتے ہیں کہ فوراً وائسرائے سے ایک موقر وفد مل کر مسائل کو ان کے سامنے رکھے اور اس کے بعد ایک متعینہ لائحہ عمل پر کام کا آغاز کر دیا جائے، چنانچہ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وفد وائسرائے سے ملتا ہے، اس وفد میں چوٹی کے زعماء شامل ہوتے ہیں اور ۲۰؍جنوری کو کانگریس اور لیگ کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوتا ہے جس میں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، لوکمانیہ تلک، مسٹر محمد علی، شوکت علی، گاندھی جی اور حسرت موہانی جیسے اکابر شریک اجلاس ہوتے ہیں، خطبہ صدارت کا لب ولہجہ اتنا گرم تھا کہ حکومت اس کو برداشت نہ کر سکی اور فوراً ضبط کر لیا گیا لیکن اجلاس نے حکومت سے عدم تشدد کی جنگ کا آغاز ترک موالات کے اسلحہ سے کرنے پر پوری سنجیدگی سے غور کیا، لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

## اعلانِ جنگ کر دیا گیا:

مولانا آزاد نے ۲۹؍فروری ۱۹۲۰ء کو صوبائی پیمانے پر دہلی میں ایک اجلاس بلایا جس میں گاندھی جی نے اپنے ذہن ومزاج کے برعکس ایک گرم تقریر کی اور کہا کہ اب عرضداشتوں وفود کی خوشامدانہ ملاقاتوں کا زمانہ گذر گیا، اب راست اقدام کا وقت

آ گیا ہے ہمیں چاہئے کہ حکومت کے تمام خطابات ترک کردیں، نوکریاں چھوڑ دیں اور ترک موالات پر مضبوطی سے عمل شروع کردیں، بغیر ان ہتھیاروں کے آزادی کی لڑائی جیتی نہیں جاسکتی، گاندھی جی کا یہ پیغام بانگ جرس بن گیا اور کارواں کے آگے بڑھنے کا اعلان کردیا مسلمانوں کا سب سے محترم طبقہ علماء کا تھا وہ ابتدا ہی سے برطانوی اقتدار کو برداشت نہیں کررہے تھے اور آزادی کی تلاش میں ساری دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے اور کفن بردوش جنگ آزادی کے مختلف محاذوں پر صف بستہ تھے انہوں نے کانگریس کے اس فیصلہ کے بعد حکومت برطانیہ سے کسی طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا اور پانچ سو سے زائد علماء کے دستخطوں سے ایک فتویٰ شائع کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ سرکاری کونسلوں کا ممبر ہونا، عدالتوں میں وکالت کرنا، سرکاری ونیم سرکاری مدرسوں، اسکولوں، کالجوں، میں پڑھانا، اعزازی عہدے اور سرکاری خطابات رکھنا ناجائز ہے، باخصوص برطانوی حکومت کی تمام نوکریاں جن سے حکومت کو طاقت ملتی ہے وہ سب حرام ہیں، خاص طور سے پولیس اور فوج کی نوکری کرنا حرام ہے اور سخت گناہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے بھائیوں پر گولیاں چلاتے ہیں۔

یہ فتویٰ بڑے سائز میں طبع کرا کے تمام شہروں اور قصبوں میں پہنچا دیا گیا، اس فتویٰ نے پورے ملک میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف نفرت اور غم وغصہ کی آگ دہکادی اور ہندوستان کی سیاست میں ایک بھونچال آگیا اور اسی تاریخ سے عوام وخواص نے اس پر عمل کر کے یہ ثابت کردیا کہ مسلمان آزادی کی تلاش میں کہاں تک جاسکتا ہے۔

## مولانا آزاد کو امام الہند کا خطاب:

ترکِ موالات کی تحریک بتدریج آگے بڑھ رہی تھی، اسی زمانہ میں تحریک ریشمی رومال کے قائدین شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو ممبئی کے انڈیا گیٹ پر مالٹا کی قید سے رہائی پا کر اترے اور جب ہندوستان میں امام الہند کی تجویز پیش کر کے شیخ الہند سے اس اہم منصب کو قبول کرنے

کی درخواست کی گئی تو شیخ الہند نے فرمایا کہ موجودہ حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ اس عظیم منصب کا اور کوئی حقدار نہیں ہے، اگر چہ باقاعدہ اس منصب کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن شیخ الہند کی زبان سے نکلی ہوئی بات ملک میں پھیل گئی اور اکثر اخبارات ورسائل مولانا آزاد کے نام کے ساتھ امام الہند لکھنے لگے۔

## انگریزی حکومت سے عدم تعاون کی پہلی نشانی:

مولانا آزاد اور گاندھی جی نے مل کر کانگریس کے اجلاس میں تحریکِ خلافت کے ساتھ ہمدردی وتعاون کی تجویز پاس کرائی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہندوستان گیر دورہ کیا، اس دورے میں حکومت سے عدم تعاون کے جذبے کو آتش سیال بنادیا گیا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڈھ میں شیخ الہند کی صدارت میں جلسہ ہوتا ہے، مولانا آزاد کی انقلاب آفریں تقریر ہوتی ہے اور فوراً فیصلہ کرلیا جاتا ہے کہ ایک نیشنل مسلم یونورسٹی قائم کی جائے، فیصلہ اور عمل دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آتے ہیں اسی دن اس قومی یونیورسٹی کا یوم تاسیس منایا گیا جس کا مادی وجود دہلی میں ظہور پذیر ہوا اور حسب تجویز مولانا آزاد اس نئی قومی مسلم یونیورسٹی کا نام جامعہ ملیہ رکھا گیا، اسی طرح کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے مقابلہ میں جامعہ اسلامیہ قائم کیا گیا کیونکہ مدرسہ عالیہ میں اگر چہ مشرقی علوم پڑھائے جاتے تھے لیکن سارادر دبست حکومت کے ہاتھوں میں تھا، مولانا آزاد کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور ایک آزاد ادارہ مشرقی علوم کے لئے قائم کیا جس کے پہلے شیخ الحدیث ہندوعرب کے شیخ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ہوئے۔

## وہ بھی کیا دن تھے؟

گاندھی جی مولانا آزاد کے قائم کردہ اس مدرسہ کو دیکھنے کلکتہ گئے، ان سے طلبہ کا تعارف کراتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ اس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جن کی نگاہیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں، یہ وہ جماعت ہے

جس نے حکومت سے مقاطعہ کے پہلے دن یہ عہد کیا تو آج تک اس عہد پر پوری قوت کے ساتھ قائم ہے اس کے جواب میں گاندھی جی نے طلبہ سے جو خطاب کیا یہ چند جملے ہی ان کی بڑائی کے اظہار کے لئے کافی ہیں انہوں نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اس وقت اسلام خطرے میں ہے، خلافت اسلامیہ تباہ کر دی گئی، مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کرلیا گیا، اور ہندوستان کی قومی خودمختاری کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں شکست دی گئی، آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمر بستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انہیں ادا کریں''

مولانا آزاد کو ۲۶ ؍دسمبر ۱۹۲۰ء کے کانگریس اجلاس کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال کی سزا دے کر علی پور جیل بھیج دیا گیا۔

## حکومت کے بائیکاٹ کا اعلان چیلنج بن گیا:

یہ وہ دور ہے جب تحریک خلافت شباب پر تھی، عوامی سطح پر سیاسی بیداری تحریک خلافت ہی کا ثمرہ تھی، سیاسی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمان سیاست کے زینہ سے بغاوت کے منبر پر کھڑا ہوکر برطانوی حکومت سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار ہے، انہیں حالات میں کراچی میں ۱۸؍ جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کی صدارت میں خلافت کمیٹی کا آل انڈیا اجلاس ہوا، اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ کسی بھی ایماندار مسلمان کا برٹش فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے، انگریزی حکومت کو کسی طرح کی مدد پہنچانا بدترین گناہ ہے، مسلمانوں کو انگریزی فوج سے علیحدہ ہو جانا چاہئے اس تجویز کے پیش کرنے والے اور تائید کرنے والوں مین مولانا حسین احمد مدنی مولانا نثار احمد پیر غلام مجدد شنکراچاریہ، مولانا محمد علی وغیرہ تھے، اسی دوران کیرالہ اور مالابار ہل کے موپلا کسانوں نے تحریک خلافت اور ترک خلافت اور ترک موالات کے فتویٰ کی تبلیغ میں سرکاری کچہریوں اور عمارتوں میں توڑ پھوڑ اور آتشزدگی شروع کردی، کراچی اجلاس کے بعد مولانا محمد علی کیرالہ جارہے تھے

کہ حکومت نے ان کو گرفتار کرلیا مولانا مدنی کو دیوبند سے اور دوسرے لوگوں کو مختلف مقامات سے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا، گاندھی جی ترچنا پلی میں تھے خبر ملتے ہی انہوں نے کراچی کی تجویز کو ہر جگہ دہرانے کا اعلان کر دیا اور مولانا آزاد سے کہا کہ آپ فوراً کلکتہ چلے جائیں اور اس تجویز کو آگے بڑھائیں، مولانا حسین احمد مدنی مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، پیر غلام مجدد اور مولانا نثار احمد پر مقدمہ چلا کر دو سال کی سزائے سخت تجویز کر کے سابر متی جیل بھیج دیا گیا، ترک موالات کی تحریک میں روح پھونکنے کے لئے مولانا آزاد نے ۲۴؍ستمبر ۱۹۲۱ء کو ''پیغام'' نام سے اپنا اخبار نکالا، جس کے ایک شمارے میں انہوں نے کیا آخری منزل آ گئی؟ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے ملک کے باشندوں کو مشورہ دیا کہ جیل خانوں سے یہ گھبرائیں نہیں کیونکہ جنگ آزادی کا فیصلہ میدان جنگ میں نہیں جیل خانوں میں ہوگا، موجودہ جدو جہد کی آخری منزل جیل خانہ ہے، اس کے دوسرے ہی مہینے مولانا آزاد کو پھر گرفتار کرلیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا، لیکن جلد ہی حکومت کا نشہ اترنے لگا اور اس نے پنڈت مدن موہن ملویہ کو بلا کر حکومت اور کانگریس میں مصالحت کرانے کے لئے مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سے گفتگو کرنے کی بات کی، مالویہ جی پہلے مولانا آزاد سے جیل میں ملے، مولانا آزاد نے ان کو جواب دیا کہ جب تک پوری ورکنگ کمیٹی کی رہائی کی بات نہیں ہوگی تب تک میری رہائی کے کوئی معنی نہیں، پھر مالویہ جی وائسرائے سے ملے تو وائسرائے نے گاندھی جی سے ملنے کے لئے کہا، گاندھی جی نے مالویہ جی سے کہا کہ مولانا آزاد کی رائے اور فیصلہ حق بجانب ہے، اسی کے ساتھ ساتھ علی برادران کی بھی رہائی ضروری ہے، ان شرائط کو دیکھ کر وائسرائے نے براہِ راست گاندھی جی سے بات کرنا ضروری سمجھا، پھر گاندھی جی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے سے ملے، اور سب کی رہائی ایک ساتھ عمل میں آئی، مولانا آزاد تو جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے لاہور چلے گئے جہاں ان کو جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنی تھی جو ۱۸؍نومبر ۱۹۲۱ء کو ہو رہا تھا۔

## پرنس آف ویلز کی آمد:

اسی نومبر میں شہزادہ برطانیہ پرنس آف ویلز ہندوستان آیا مگر ناراض ہندستان اس کے شایانِ شان استقبال کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوا، کچھ زرخرید اور حکومت کے کاسہ لیس استقبال کے جلوس میں شریک ہوئے، جذباتی سیاسی ورکر اس جلوس پرٹوٹ پڑے، بلوہ ہوگیا، پچاس آدمی مارے گئے، چارسو کے قریب زخمی ہوئے اس میں ایک چوتھائی کانگریس کے وَرکر تھے، حکومت نے کانگریس والینٹر کور کو خلافِ قانون قرار دے دیا، بے تحاشا گرفتاریاں شروع ہوگئیں، جواہر لال نہرو بھی اس زد میں آگئے، کیونکہ ہڑتال کرانے والوں میں یہ پیش پیش تھے، حکومت نے اپنی انتہائی برہمی کے اظہار کیلئے پنجاب، یوپی، بنگال، بہار ممبئی میں جلسے جلوس پر پابندی لگادی۔

مولانا آزاد کی گرفتاری کی افواہ گرم تھی کیونکہ جب شہزادہ کلکتہ آیا تو عوام نے اتنا سخت بائیکاٹ کیا کہ کلکتہ جیسا مردم خیز گنجان شہر سائیں سائیں کررہا تھا، ایک متنفس بھی سڑک پر نظر نہیں آرہا تھا، حکومت ہند کی سخت توہین ہوئی کہ شہزادے کے شایانِ شان خیر مقدم نہ کراسکی، اس لئے مولانا آزاد کو یقین تھا کہ میری گرفتاری صبح وشام میں ہونے والی ہے کیونکہ تمام لیڈران جوان کے ساتھ شریک کار تھے سب جیلوں میں خیمہ لگا چکے تھے، ۷/دسمبر ۱۹۲۱ء کو قابل وثوق ذرائع سے گرفتاری کی تصدیق ہوگئی، انہیں دنوں بدایوں میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ہورہا تھا مولانا آزاد کو اس میں شریک ہونا تھا لیکن آپ نے قصداً بدایوں کا سفر نہیں کیا اس وقت تک بنگال میں ایک ہزار والنٹیر گرفتار ہوچکے تھے ۹/دسمبر ۱۹۲۱ء کو شب میں مسٹر کرن شنکر کے مکان پر ایک خفیہ میٹنگ میں مولانا آزاد شریک تھے، ۱۰/دسمبر کو دن میں چار بجے پولیس افسر مولانا آزاد کی قیام گاہ پر پہنچا اور مولانا آزاد گرفتار کر لئے گئے، اسی دن سی آر داس بھی گرفتار کئے گئے، گرفتاری کے دوسرے دن ایک زبردست جلسہ عام ہوا جس میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک آتش بار تقریر کی، نتیجہ ظاہر تھا، مولانا ظفر علی خاں گرفتار کر لئے گئے اور جیل بھیج دیئے گئے۔

## پھول کانٹے بن گئے:

برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کی آگ اتنی تیزی سے پھیلتی جارہی تھی کہ پورا ملک جوالامکھی بن گیا مردوں نے اپنی فطری جرأت کا مظاہرہ کیا تو عورتوں نے بھی آگے بڑھ کر ثابت کردیا کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

پھول صرف چٹکیوں سے مسلا ہی نہیں جا سکتا کبھی اس کی نرم و نازک اور ملائم پتیاں نوکدار کانٹوں کی بھی شکل اختیار کرسکتی ہیں۔

اسی مہینہ میں ۳۰؍دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند خواتین کانفرنس علی برادران کی والدہ بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی اجلاس میں مسلمان اور ہندو خواتین دونوں دوش بدوش جنگ آزادی کی صف بندی کے لئے تیار ہوگئیں، اجلاس میں سرگرم حصہ لینے والیوں میں مسز کستور با گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی چودھرائن، شریمتی انوسیا بائی، شریمتی سرلا دیوی ہندو خواتین ہیں تو دوسری طرف محترمہ امجدی بیگم مولانا محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم ڈاکٹر انصاری، محترمہ حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ، محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے اسماء گرامی مسلمان عوتوں میں قابل ذکر ہیں، بی امان نے اپنا خطبہ صدارت اس پیغام پر ختم کیا۔

> ''اچھی اور پیاری بہنو! قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ، جب ہمارے ملک کے مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو ہم کو ہی آزادی کا پرچم لہرانا ہوگا، اٹھو اور اٹھ کر حکومت کو بتادو کہ ہم ہر قیمت پر آزادی کے اس پرچم کو لہرا کر رہیں گے چاہے اس راہ میں ہمارے جسم کے ٹکڑے ہی ٹکڑے کیوں نہ ہو جائیں''

## مولانا آزاد کا عدالتی بیان:

مولانا آزاد کی سزا کا فیصلہ کئی پیشیوں کے باوجود ابھی نا تمام ہی رہا، تیسرے

مہینے میں انہوں نے اپنا تاریخی بیان دیا جو ''قول فیصل'' کے نام سے پورے ملک کو معلوم ہے جو جرأتِ حق، اخلاصِ عمل اور اپنے اصولوں کی صداقت پر ایمان کامل کا مظہر ہے اور اللہ کے مقدس بندوں کے سینوں میں اتر گیا تو دوسری طرف ادب وانشاء کا ایسا درشا ہوا رہے کہ اسے اردو ادب کا گل سرسبد تصور کیا گیا، عدالت نے ایک سال کی سزا تجویز کی اور علی پور بھیج دیا۔

## مولانا آزاد کا مدبرانہ فیصلہ:

خلافت تحریک کی حمایت کرکے کانگریس مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی، اور اس تنظیم پر ترقی پسندوں اور آزادی کے دیوانوں کا مکمل قبضہ ہوگیا لیکن کانگریس کی تاریخ میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ معلوم ہوتا تھا یہ تنظیم ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اپنی طاقت کھو دیگی اور حکومت کی نگاہوں میں اپنا بھرم کھودے گی۔

۲۶ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا، مولانا آزاد ان دنوں جیل میں تھے اجلاس میں اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہوگیا کہ دستور ساز اسمبلی میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے ایک گروپ کہتا تھا کہ اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لیا جائے اس گروپ میں سی آر داس موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ تھے انہوں نے کانگریس سے الگ ہو کر ایک سوراج پارٹی بنالی، یہ واقعہ پہلی جنوری کا ہے ۲۶ر جنوری کو مولانا آزاد علی پور جیل سے رہا ہوئے اسی دن جواہر لال نہرو بھی جیل سے چھوٹے، فوراً ہی گیا میں کانگریس کا اجلاس بلایا گیا اور دونوں گروپ کو دعوت نامے بھیجے گئے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ مولانا آزاد کے ہاتھ میں دے دیا تھا تمام چوٹی کے لیڈر جہاں دیدہ اور معمر رہنما دو جذباتی گروپ میں منقسم تھے ان دونوں کو ایک رشتہ میں پرونے کے لئے ایک ۳۵ سالہ کم عمر لیڈر مولانا آزاد کو منتخب کیا گیا یہ ان کے تدبر اور فراست کا امتحان تھا اور آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے، آپ نے اس کا حل یہ نکالا کہ جو گروپ کونسلوں کے الیکشن میں حصہ لینا چاہتا ہے، وہ تین ماہ کے اندر ۳۰ر اپریل تک

۲۵/لاکھ روپیہ چندہ اور پچاس ہزار والنٹیر بھرتی کریں اور کسی طرح مخالفانہ پروپیگنڈہ نہ کریں اور یہ بھی ہدایت کی کہ جو لوگ الیکشن میں حصہ لینے کے مخالف ہیں وہ کسی طرح کی مخالفت ہرگز نہ کریں، نہ ان کاموں میں رکاوٹ ڈالیں گے،، اس فیصلہ کو دونوں فریق نے تسلیم کرلیا اور کانگریس انتشار سے محفوظ رہ گئی۔

## بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

کانگریس مین جب سے مولانا آزاد نے شرکت کی اس وقت سے لیکر ابتک ہندو مسلم اتحاد مثالی تھا، جلوسوں میں نعرۂ تکبیر پر ہندو بھی بلند آہنگی سے اللہ اکبر کہتے تھے، حکومت کے لئے یہ اتحاد سب سے بڑا دشمن تھا انہوں نے ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' پر عمل کرتے ہوئے ۲۳/فروری ۱۹۲۳ء کو کانگریس کے ایک ہندو لیڈر جو ہندوؤں میں بہت مقبول تھے سوامی شردھانند کو جیل سے رہا کردیا، واسرائے نے ان کو وائسرائے ہاؤس بلایا اور رازدارانہ گفتگو کی، وائسرائے نے سوامی جی سے کہا کہ:

> ''اس ملک میں جو باشندے مسلمان ہوگئے ہیں یا کئے جارہے ہیں انہیں پھر سے ہند بنالیا جائے اور ہندو مذہبی تنظیم فوجی اور جنگی بنیادوں پر کی جائے ورنہ مسلمان اس ملک میں برتری حاصل کرلیں گے، اور سیاسی قیادت انہیں کے ہاتھوں میں رہے گی''

یہ لارڈ ہارڈنگ کے جادو کے بول تھے جو پھونک مارتے ہی آدمی کو بھیڑیا اور چیتا بنادے بنگال کا جادو بھی انگریزوں کے جادو کا پانی بھرے، ایک انگریز ہندوستان کے ۳۵ کروڑ انسانوں کو چند لمحوں میں انسانیت سے حیوانیت کی نچلی سطح پر اتاردے یہ کوئی سوچ سکتا ہے؟ لیکن ہوا یہی، دنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو مسلم دو مختلف مذہب رکھتے ہوئے ایک ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے دونوں حقیقی بھائی ہیں چند لمحوں میں وہ اس طرح دست و گریبان ہوئے جیسے اجنبی کتوں سے کتے لڑا کرتے ہیں، ایک شور ایک ہنگامۂ چیخ پکار سے فضا گونج اٹھتی ہے۔

سوامی جی نے سنگھٹن کی تحریک چلا کر پورے ہندوستان میں ہندو مسلم بلووں کا آغاز کردیا، ہر طرف آتش فساد بھڑکادی اور چند ہی دنوں میں ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوکررہ گیا، مولانا آزاد نے دلی صدمے کے ساتھ اس حادثے کو دیکھا اور فوراً آگرہ روانہ ہوگئے جہاں سوامی شردھانند خاندانی مسلمانوں کو طاقت اور لالچ سے ہندو بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے مولانا آزاد جب آگرہ پہنچے تو سوامی شردھانند اسی دن آگرہ سے رخصت ہوگئے تاکہ مولانا آزاد کا سامنا نہ کرنا پڑے، مولانا آزاد نے بہ اصرار ان کو روکنا چاہا لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، کانگریس کے دوسرے عہدے دار جوشدھی اور سنگھٹن میں پیش پیش تھے ان کو بلا کر فہمائش کی ان لیڈروں نے اعتراف کیا کہ اس فضا کو بدلنے کی ہماری طرف سے کوئی کوشش نہیں ہوئی، مولانا آزاد نے سمجھ لیا کہ آدمی کے پاگل بن جانے کے لئے کسی لمبی مدت کی ضرورت نہیں چند لمحوں میں دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہوسکتی ہے، اس پاگل پن کا اثر برسوں تک رہا اور ہندو مسلم منافرت اور ایک دوسرے سے دوری بڑھتی چلی گئی۔

## مولانا آزاد صدر کانگریس:

۲۶ ستمبر ۱۹۲۳ء کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس کا خاص اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا اس وقت مولانا آزاد کی عمر صرف ۳۵ سال تھی کانگریس ہائی کمان میں اتنا کم عمر اور کوئی دوسرا رکن نہیں تھا اس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر انصاری تھے، اس اجلاس کے شرکاء میں مشہور لوگوں میں سی آر داس، حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، سردار پٹیل، راجندر پرشاد اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں انہیں حالات پر اظہار افسوس کیا جو شدھی سنگھٹن نے پیدا کردیئے تھے۔

## الہلال کا دوبارہ اجرا اور ضبطی:

الہلال ۱۹۱۲ء سے نکل کر گنتی کے چند سالوں میں بند ہوگیا تھا، حکومت کی

دارو گیر نے اس کی زندگی مختصر کر دی مولانا آزاد نے ۲؍ جون ۱۹۲۷ء میں از سر نو الہلال کا ڈکلریشن داخل کر کے اخبار جاری کیا لیکن اس کی عمر پھر مختصر نکلی ۹؍ دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے پر حکومت نے اس کی تجہیز و تکفین کی آخری کارروائی انجام دے دی، پورے چھ مہینے برطانوی حکومت مولانا آزاد کے شعلہ بار قلم کی آتش افشانیوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتی رہی لیکن اس کی آتش نوائی اور شعلہ باری میں کوئی فرق نہیں آیا اس لئے اس کی تاب ضبط جواب دے گئی اور الہلال ہمیشہ کے لئے ضبط کرلیا، مولانا آزاد نے جوابی وار کرنا چاہا اور ''الاقدام'' کے نام سے دوسرے اخبار کا ڈکلریشن داخل کر دیا لیکن اب حکومت ان کے قلم کو آزاد رکھنا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لئے ''الاقدام'' کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

## مجلس احرار اسلام اور مولانا آزاد:

مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری اور بعض دوسرے اکابر لیڈروں کے مشورہ سے مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے صدر چودھری افضل حق بنائے گئے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجلس احرار کے متفقہ لیڈر قرار پائے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دوسرے سرگرم لیڈروں نے مجلس احرار میں شمولیت اختیار کی یہ تنظیم مسلمانوں میں گرم سیاست کی روح پھونکنے والی ثابت ہوئی، اس جماعت کے لیڈروں ورکروں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں بڑے بڑے مصائب جھیلے، اس کے کارکنوں میں فوجی اسپرٹ تھی اپنے تیز و تند بیانات اور حکومت پر کڑی نکتہ چینیوں کی وجہ سے اس کے اکثر لیڈروں کی جیل کی زندگی باہر کی زندگی سے زیادہ تھی، اس کے رضا کاروں کی وردی سرخ تھی، مجلس احرار کا جلوس سرخ پوشوں کا جلوس ہو جاتا تھا۔

## نیشنلسٹ مسلم پارٹی:

مسلمانوں کی انفرادیت کو قائم رکھنے اور آزادی کی راہ میں جدو جہد کو امتیازی

حیثیت سے بروئے کار لانے کے لئے اور ہندو مسلم اتحاد اوران میں یک جہتی پیدا کرنے اور ہر ایک کو دوسرے سے قریب لانے کی نیت سے جولائی ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر انصاری نے آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی قائم کی اس کے سرگرم لیڈروں میں مولانا آزاد، مسٹر رفیع الدین قدوائی، خواجہ عبدالمجید، (علی گڈھ) تصدق احمد شیروانی (علی گڈھ) آصف علی بیرسٹر (دہلی) خان عبدالغفار خان (پشاور) سید محمود (بہار) جیسے اکابر تھے۔

## نہرو رپورٹ دریا برد کردی گئی:

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اورڈاکٹر انصاری، اس کانفرنس کی روح رواں تھے، نہرو رپورٹ جو موتی لال نہرو نے کانگریس کے ایماء سے مرتب کی تھی جس پر مختلف پارٹیوں نے اپنا ردعمل ظاہر کیا تھا، اس کے بہت سے اصولوں سے مسلمانوں کو شکایت تھی، مختلف مسلم سیاسی پارٹیوں نے اس کی مخالفت کی تھی، کانگریس کے کئی مسلم لیڈران اس رپورٹ کی وجہ سے کانگریس چھوڑ چکے تھے اس لئے اس سالانہ اجلاس میں نہرو رپورٹ پھر زیر بحث آئی تو پوری سبجکٹ کمیٹی نے اس رپورٹ کو رد کردیا، اور طے کیا گیا کہ اب ہمارا نصب العین مکمل آزادی ہوگا اس سے کم پر ہم راضی نہیں، آزادئ کامل کو اپنا نصب العین تسلیم کرتے ہی نہرو رپورٹ از خود کالعدم ہوگئی، بہت سے اختلافات کو جنم دیکر آخر کار نہرو رپورٹ دریائے رادی میں غرق کردی گئی اور ملک کو اس سے نجات ملی۔

## مولانا آزاد صدر کانگریس:

جواہر لال نہرو کی مدت صدارت ختم ہوگئی تو مہاتما گاندھی کی تجویز اور دوسرے رہنماؤں کی حمایت سے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا یہ انتخاب

اتفاق رائے سے عمل مین آیا، مولانا آزاد نے نئی ورکنگ کمیٹی ترتیب دی اور اس کا پہلا اجلاس بلایا اور تجویز پاس کی کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کر کے ہر کانگریس ممبر مستعفی ہو جائے اور اگر کوئی ممبر استعفاء نہ دے تو عوام اس کو استعفاء دینے پر مجبور کر دیں، چنانچہ اس تجویز پر فوراً عمل ہوا ۲۷ ممبران نے اپنا استعفاء اسی دن گورنر کو پیش کر دیا۔

دوسری اہم ترین تجویز یہ پاس ہوئی کہ آزادی کے جذبے کو عام کرنے کے لئے پورے ملک میں ایک مقررہ تاریخ پر یوم آزادی منایا جائے اور گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ پوری پبلیسٹی کر کے عوام کو آزادی کی اہمیت وضرورت سمجھائی جائے اور جگہ جگہ جلسے کر کے یہ عہد کیا جائے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے ہم اسے لے کر رہیں گے اور عوام سے ہاتھ اٹھوا کر اس عہد کی تصدیق وتائید کرائی جائے ۲۶ /جنوری تاریخ اس کے لئے مقرر کر دی گئی۔

تجویزوں کی تائید میں پورے ملک کے کانگریسی ممبران کونسل کی تعداد ۱۷۲ تھی فروری ۱۹۳۰ء میں سب کے سب مستعفی ہو گئے۔

## نمک ستیہ گرہ:

مولانا آزاد کی صدارت کے دور میں گورنمنٹ نے نمک پر ٹیکس لگا دیا جس کے جواب میں ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا گیا، گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے یہ تحریک شروع کر دی ۱۴۱ میل چل کر ڈانڈی کے مقام پر پہنچے اور اپنے ہاتھ سے نمک بنانا شروع کر دیا، مولانا نے فوراً میٹنگ بلا کر گاندھی جی کے پروگرام کی تائید میں رزولیشن پاس کرایا اور تمام صوبائی کمیٹیوں کو سرکلر بھیج دیا کہ ستیہ گرہ میں حصہ لینے کے لئے فوراً تیار ہو جائیں، حکومت سے یہ لڑائی پورے ملک میں پھیلا دی گئی حکومت یہ دیکھ کر بوکھلا گئی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا، گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے اور کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا اور ہر طرف کانگریسی ورکروں کی گرفتاری شروع ہو گئی، ممبئی میں ''جوہو'' کے مقام پر جہاں جہاں نمک بنایا جاتا ہے

وہاں نمک کے اجارہ داروں کے خلاف مظاہرہ کا سلسلہ جاری تھا مشہور لوگوں میں عابد علی جعفری علی یوسف مہر علی مسٹر صادق مسٹر نریمان وغیرہ گرفتار کر لئے گئے، گرفتاری کے خلاف ممبئ میں زبردست ہڑتال ہوئی، جلوس نکلے، شولا پور میں کچھ اسٹیشنوں میں آگ لگا دی گئی پولیس نے گولیاں چلائیں ۱۲۵ افراد مارے گئے ہزاروں زخمی ہوئے، اس محاذ پر ابھی گھمسان کی جنگ جاری ہی تھی کہ مولانا آزاد نے جیل سے باہر ارکان عاملہ کی میٹنگ طلب کر کے فوج اور پولیس کے خلاف ایک تجویز پاس کر دی، تجویز حکومت نے ضبط کر لی، ۱۹۳۰ء کے آخر تک پنجاب، بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام، اندھرا پردیش، مہاراشٹر، ممبئ وغیرہ صوبوں میں کانگریس کے فیصلے کے مطابق کسانوں نے لگان اور مال گذاری دینی بند کر دی، آسام میں مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ایک زبردست کسان تنظیم بنائی جو بنگال کے میمن سنگھ ضلع تک پھیل گئی تھی، حکومت نے کسانوں کو بے تحاشا گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

پشاور میں خان عبدالغفار خان کے سرخ پوش خدائی خدمت گاروں پر حکومت نے مظالم توڑے کیونکہ وہ نمک ستیہ گرہ میں پر جوش حصہ لے رہے تھے، پشاور میں گرفتاریاں شروع ہوئیں تو شہریوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، اس موقعہ پر قبائیلیوں اور سرکاری آدمیوں میں جھڑپ ہوگئی، دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں جس سے بغاوت پھوٹ پڑی، برطانوی بکتر بند گاڑیوں کے آگے شہریوں نے روک لگا دی تو افسروں نے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا لیکن سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا، حکم عدولی کرنے والے سب سپاہیوں کو گرفتار کر کے چودہ چودہ سال کی سزائیں دی گئیں، فوج کی گولیوں سے اس موقعہ پر سات سو بہادر پٹھانوں نے جام شہادت نوش کیا اور قصہ خوانی بازار انسانی خون سے لالہ زار ہو گیا۔

## مولانا آزاد کی گرفتاری:

مولانا آزاد حالات کی رفتار پر بحیثیت صدر کانگریس گہری نگاہ رکھے ہوئے

تھے اپنی گرفتاری سے قبل آپ نے کانگریس کے نظام کو ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل کر دیا تھا، یہی ڈکٹیٹر تحریک کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار ہوگا ڈکٹیٹروں کی پوری فہرست تیار کر دی گئی تاکہ ایک ڈکٹیٹر کی گرفتاری کے بعد از خود دوسرا ڈکٹیٹر زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لے ۱۶؍نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا آزاد نے میرٹھ میں ستیہ گرہ کر کے ایک سخت تقریر کی، حکومت نے گرفتاری میں تاخیر نہیں کی جلسہ گاہ سے گرفتار کر کے ڈیڑھ سال کے لئے سیدھے جیل بھیج دیا، اپنی گرفتاری سے قبل آپ نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا قائم مقام بنا دیا تھا اس لئے حکومت نے مولانا آزاد کی گرفتاری کے بعد ڈاکٹر انصاری کو گرفتار کر لیا اور جیل بھیج دیا ڈاکٹر انصاری نے اپنا قائم مقام بھی نامزد کر دیا تھا اس نے کام سنبھالا وہ بھی گرفتار ہوا اس طرح تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے کانگریس کے رہنما گرفتار ہوتے چلے گئے۔

## مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری:

مولانا حسرت موہانی نے دلچسپ ستیہ گرہ کیا، جوں ہی پولیس گرفتاری کے لئے آگے بڑھی مولانا حسرت موہانی پارک کی زمین پر لیٹ گئے اور دونوں مٹھیوں سے گھاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا، پولیس کے کئی جوانوں نے پوری قوت سے اٹھایا تو ان کا بدن لاش کی طرح اکڑا ہوا تھا، اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے جا رہے تھے، چونکہ حسرت ناک میں بولتے تھے، اس لئے ان کا ’’انقلاب زندہ باد‘‘ بڑا مزیدار ہوتا تھا، کہنے کو یہ واقعہ دلچسپی اور دل لگی کا واقعہ ہے، لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا حسرت کی وہ شخصیت ہے جس نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا، ان کی شاعرانہ عظمت مستقبل میں ریسرچ اور تحقیق کا موضوع بننے والی تھی، مسلمانوں میں انتہائی عظمت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن اتنی بڑی شخصیت بھی آزادی کی راہ میں سنگ سرراہ کی طرح ٹھوکروں میں اپنی ذات کو ڈال دیتی ہے، اپنی شخصیت کو فنا کر دینا، اپنی عظمت کو لات مار دینا، پولیس کے مظالم اور قید

وبند کو تفریح بنا دینا اسی جذبۂ خلوص کا مظاہرہ تھا جو ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں تھا۔

## مولانا محمد علی کی جرأتِ اظہار:

کانگریس کی تحریک اور ستیہ گرہ کی وجہ سے پورا ملک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا حکومت نے تنگ آکر اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی اور لندن میں گول میز کانفرنس بلائی، نومبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی رہنما لندن پہنچے، حاکم محکوم، بادشاہ ورعایا، آقا وغلام ایک سطح پر بیٹھے پھر بھی نادرشاہ نادرشاہ ہے اور ہٹلر ہٹلر، اس لئے لب ولہجہ کا فرق، آمرانہ حکم اور عاجزانہ گذارش کی سرحدیں مقرر ہیں لیکن ان سرحدوں کو پار کرنے والی ایک شخصیت اس کانفرنس میں نکلی اور وہ ہندوستان کے ہر دل عزیز لیڈر مولانا محمد علی تھے انہوں نے اس کانفرنس میں جو کچھ کہا وہ جنگ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا گیا، کیونکہ یہ جرأتِ اظہار نہ پہلے پائی گئی اور نہ بعد میں، مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے نادرشاہوں اور ہٹلروں سے ان کے محل میں ان کے گھر پر خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''اے سفید فام آقاؤ! سن لو، آج تم کو میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ دینا ہوگا اور اگر تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میں تم سے اسی لندن میں تین گز زمین اپنی قبر کے لئے لے کر رہوں گا''

باب اجابت پر کھڑا فرشتہ مولانا محمد علی کے ان الفاظ کو نوٹ کر رہا تھا اس لئے جب آزادی کا پروانہ مولانا محمد علی کے ہاتھوں میں نہیں دیا گیا تو قدرت نے ایک قبر کی زمین لندن میں مولانا محمد علی جوہر کے لئے مہیا کردی، کیونکہ ابھی ان کی تقریر کے یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور لندن میں تین گز زمین پانے کا استحقاق ثابت کردیا لیکن وہ غلام ملک کے نمائندہ بن کر گئے تھے اور اپنے ملک کو آزادی کا پرعظمت مقام نہیں دلا سکے تھے جو

ان کا نصب العین تھا اس لئے اپنے مطلق العنان آقاؤں کی ناپاک سرزمین میں دفن ہونے کو ان کی غیرت نے قبول نہ کیا اور خدا نے بھی اس کی لاج رکھی، قدرت نے ان کی عظمت واحترام میں اضافہ کے لئے اپنی مقدس سرزمین بیت المقدس کی آغوش میں سپرد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مفتی فلسطین کی درخواست پر مولانا محمد علی جوہر کی لاش بذریعہ ہوائی جہاز بیت المقدس پہنچی اور وہیں آزادئ ہند کا بطل جلیل ہمیشہ کے لئے محو خواب ہے، مولانا محمد علی جوہر بہت پہلے کہہ چکے تھے۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

گول میز کانفرنس ایک ڈرامہ بن کر رہ گئی، ہندوستانی رہنماؤں کا قافلہ بے لیل مرام غلام آباد ہندوستان واپس لوٹ آیا۔

## مولانا آزاد کی رہائی اور گرفتاری:

کانپور میں ۱۳۶ ستیہ گرہیوں پر جیل میں بڑے مظالم ہوئے جب اس کی خبر جیل سے باہر آئی تو اس پر بے چینی کا اظہار کیا گیا، گاندھی جی وائسرائے سے ملے اس کے نتیجہ میں ایک لائحہ عمل طے ہوا جس سے سیاسی معاملات میں کچھ پیشرفت ہوئی، اسی معاہدہ کے تحت مولانا آزاد میرٹھ جیل سے رہا ہو کر باہر آئے دس مہینے بعد حکومت نے ایک آرڈی نینس جاری کر کے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور پھر ممتاز لیڈروں کی گرفتاری شروع ہوگئی، پہلے گاندھی جی گرفتار ہوئے پھر کانگریس کے ڈکٹیٹر راجندر پرشاد ہوئے اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر انصاری تھے پٹنہ میں راج گوپال آچاریہ گرفتار کر لئے گئے، راجندر پرشاد اپنے گھر پر پولیس کے نرغے میں آگئے اسی دن متھرا بابو اور اچاریہ کر پلانی بھی پکڑے گئے، اسی مہینہ میں مولانا آزاد کو دہلی میں گرفتار کر کے ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔

## الیکشن:

۲۷/ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو گاندھی جی نے کانگریس سے باضابطہ وابستگی کو ختم کر دیا

جب کہ مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر انصاری گووند بلبھ پنت کی منشا کے خلاف یہ فیصلہ تھا، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس کو تسلیم کرلیا، سردار پٹیل کی منشا یہی تھی، البتہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاندھی جی کے لئے کانگریس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا ان کا مقام ومنصب علیٰ حالہ باقی رہے گا۔

حکومت کی طرف سے جو تجویز اصلاحات نافذ ہوئی اس کے تحت ملک میں الیکشن ناگزیر تھا تاکہ صوبائی اسمبلیوں کو اختیارات سپرد کئے جائیں اور محدود اختیارات کی وزارتیں صوبوں میں کام کرنے لگیں، اس لئے سال کے آخر میں ماہ نومبر ۱۹۳۴ء میں پورے ملک میں مرکزی اسمبلی کا الیکشن ہوا، پنجاب کو چھوڑ کر کانگریس اور نیشنلسٹوں کو ہر جگہ بڑی اکثریت حاصل رہی، جتنے سرمایہ دار تھے وہ الیکشن میں سو فیصد ناکام رہے مرکزی اسمبلی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی منتخب ہوئے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

ابتداء ۱۹۳۷ء میں صوبائی وزارتیں بن گئیں بیشتر صوبوں میں اختیارات کانگریس کے ہاتھ میں آ گئے، ممبئ میں مخلوط حکومت بنی تھی لیکن چند مہینوں میں ٹوٹ گئی تو مولانا آزاد کو دعوت دی گئی کہ وہ وزارت کی تشکیل کریں آپ نے مسٹر کھیر کو وزیر اعلیٰ اور کنہیا لال منشی کو ہوم منسٹر اور محمد یٰسین نوری اور دوسرے کانگریسی وزراء کو قلمدانِ وزارت تقسیم کر کے کانگریس کو ممبئ کی حکومت تفویض کردی اس چند صوبوں کے علاوہ پورے ملک میں کانگریسی وزارتیں کام کرنے لگیں۔

## دوسری جنگ عظیم اور کانگریس کا نقطۂ نگاہ:

مئی ۱۹۳۹ء کو کانگریس نے کلکتہ سے اپنی مجلس عاملہ کی فہرست جاری کی جس میں مندرجہ ذیل نام تھے، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، سروجنی نائیڈو، سردار پٹیل، شنکر راؤ دیو، جمنا لال بجاج، جے رام دولت رام جے پی کرپلانی، ڈاکٹر سیتارمیہ، بھولا بھائی ڈیسائی، ہری کرشن مہتاب ڈاکٹر بدھن چندر رائے، ڈاکٹر برفلا

چندر گھوش یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کرایا جو پانچ سال تک آگ اور خون کی بارش کرتی رہی، جنگ کا اعلان ہوتے ہی اسی ہفتہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد کی مرتب کردہ پالیسی بیان پر دستخط کر کے اخبارات کو اشاعت کے لئے دے دیا، بیان یہ تھا:

> ''ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی میں بھی اسی طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پہلی لڑائی میں دیکھا تھا، ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے ہرگز برطانوی سامراج کو فتح مند دیکھنا نہیں چاہتے، ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں ہماری راہ بالکل اس کے مخالف سمت میں جارہی ہے''

اس پالیسی کے بعد حکومت سے تعاون اور جنگ میں اس کی مدد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لئے ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا کہ وزارتیں مستعفی ہو جائیں دوسرے دن تمام وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

## مولانا صدر کانگریس بنائے گئے:

جنگ کی وجہ سے ملک کی سیاست انتہائی پیچیدہ ہوتی جارہی تھی کانگریس کے لئے ایک ایسے مدبر صدر کی ضرورت تھی جس کے تدبر وفراست کی قسم کھائی جاسکے، اور کانگریس کی پالیسی کو حالات کے خارزار سے صحیح سلامت گزار سکے، گاندھی جی کی نگاہ مولانا آزاد پر پڑی، پوری ورکنگ کمیٹی نے اس کی تائید کردی اس لئے مولانا آزاد دوسری بار پھر آل انڈیا کانگریس کے صدر منتخب ہوگئے اور اپنی صدارت کے پہلے ہی دن آپ نے اپنی پالیسی کا اعلان کر دیا۔

کانگریس نہیں چاہتی کہ برطانیہ کی حمایت میں ہندوستانی سپاہیوں کو لڑایا اور کٹایا جائے، اس جنگ میں ہمارا کوئی تعاون حکومت کے لئے نہیں ہے۔

جنگ جاری ہوئے گیارہ ماہ ہو چکے ہیں حکومت کو روپئے کی بھی ضرورت ہے اور فوج بھرتی کے لئے ہندوستانی جوانوں کی بھی کانگریس ان دونوں سے پہلے ہی دن

سے انکار کرتی رہی اور دونوں کاموں میں مخالفت کرتی رہی، راجندر پرشاد اور ان کے کئی ساتھی جنگ کے سلسلہ میں کانگریس کی پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو گئے، وہ حکومت کو تعاون دینا چاہتے تھے، مگر کچھ شرطوں کے ساتھ مولانا آزاد نے ان لوگوں کو لکھا کہ آپ لوگوں کی شرطیں مجھے منظور ہیں مگر برطانوی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی شرط کو تسلیم کرے گی، جب تک انگریزوں کا رویہ نہ بدلے جنگ میں شرکت محض ایک علمی مسئلہ رہے گی، مولانا آزاد کے اس جچے تلے جواب سے مطمئن ہو کر ممبران ورکنگ کمیٹی نے اپنے استعفیٰ واپس لے لئے۔

مولانا آزاد نے صدر ہونے کے بعد سابقہ ورکنگ کمیٹی میں جو دس ارکان پر مشتمل تھی اس کو بڑھا کر ۱۵ کرنا چاہا اور انہوں نے نئے ارکان میں جواہر لال نہرو، سی راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی کے ناموں کا اضافہ کیا اور ایک سیٹ خالی چھوڑ دی تاکہ اُسے مناسب شخصیت سے پُر کیا جا سکے۔

## حکومت کی مدد کسی قیمت پر نہیں:

یورپ میں جنگ کی آگ پھیلتی جا رہی تھی حکومت ہندوستان کے تعاون کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہی تھی لیکن آزادی کے دیوانے کچھ اور ہی رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، آزادی کی طلبگار جماعتوں کے کڑے رویہ کی وجہ سے صورت حال کشیدہ تر ہوتی جا رہی تھی، حکومت نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا، وہ آئے، صدر کانگریس مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سے ملے، پھر دوسرے ہوا خواہان حکومت برطانیہ سے ملاقاتیں کیں، درجہ نو آبادیات اور دوسرے مسائل کی بحث اس طرح چھڑ گئی کہ کرپس بددل ہو کر انگلینڈ واپس ہو گئے اور مقصد سفر ناکام رہا۔

☆☆☆

## رام گڈھ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس:

۲۴؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو رام گڈھ کے مظہر الحق میں کانگریس کا سالانہ جلسۂ عام مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا، اس اجلاس میں مولانا آزاد نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ بڑا ہی بصیرت افروز ہے اور مولانا آزاد کے نکتہ چینوں کے لئے ایک بہترین سبق، آپ نے بات وہاں سے شروع کی کہ اب ہمارا کاروان منزل کے بہت قریب آ گیا ہے، ہماری منزل ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، کل جو موہوم تھی آج وہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ رہی ہے، ہندوستان اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے، مختلف نسل و مذہب کے ماننے والوں کا مشترکہ ہندوستان آزادی حاصل کر کے رہے گا، پھر آپ نے انتہائی جرأت ایمانی کے ساتھ فرمایا۔

> ''میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس سے چھوٹے سے چھوٹا حصہ ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا''

مولانا آزاد نے اپنا پر جوش سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت وعظمت کو پر عزم الفاظ میں بیان کیا۔

''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسے ہندو مذہب کا ہے، اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آرہا ہے، جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں'' (خطبات آزادی مرتبہ اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۶۰۷-۶۰۸)

## مولانا آزاد پھر زندانِ حکومت میں:

اجلاس کے بعد انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام بنایا گیا، سب سے پہلے ونوبا بھاوے نے ستیہ گرہ کی اور گرفتاری دی اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ستیہ گرہ کی اور گرفتار ہوئے اسی طرح ترتیب سے باری باری گرفتاری دینے کا پروگرام طے تھا، مولانا آزاد کو ابھی اس پروگرام پر عمل نہیں کرنا تھا کیونکہ وہ صدر کانگریس تھے، ان کے ذمہ تحریک کو آگے بڑھانا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا، پنجاب میں ستیہ گرہ کی تنظیم کے بعد لاہور سے واپس ہوئے اور جب آپ الٰہ آباد اسٹیشن پہنچے اور ٹرین سے اتر کر ریفریشمنٹ روم میں جانے کی غرض سے جا رہے تھے کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر تسلیمات پیش کی اور وارنٹ گرفتاری سامنے رکھا، مولانا آزاد نے مسکرا کر کہا کہ آپ نے مجھے یہ امتیاز دیکر جو عزت افزائی کی ہے اس کا بہت بہت شکریہ، ابھی تو ضابطہ کے مطابق انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کی ایک تقریر کی بنا پر ہوئی عدالت نے ۱۸ مہینے کی سزا دیکر نینی جیل بھیج دیا، کچھ دنوں بعد گاندھی جی الٰہ آباد آئے تو مولانا آزاد سے ملنے جیل

گئے، دونوں میں کھل کر بات ہوئی اس ملاقات کے بعد گاندھی جی نے بیان میں جب یہ کہا کہ عدم تشدد میرا ذاتی عقیدہ ہے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو اپنا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ہے، اس بیان سے عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ مولانا آزاد نے گاندھی جی سے قصداً یہ بیان اس لئے دلایا ہے کہ مستقبل میں وہ کانگریس کو عدم تشدد کا پابند رکھنا نہیں چاہتے، اور بوقت ضرورت تشدد پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ لوگوں کے یہ خیالات ایک دم بے بنیاد بھی نہیں تھے۔

۱۹۴۱ء کے بالکل آخر میں جاپان ہندوستان کی سرحدی ریاستوں پر حملہ آور ہو گیا اور ہندوستان کے پھاٹک پر وہ دستک دے رہا تھا اس صورتِ حال کو دیکھ کر چینی وزیر اعظم چیانگ کائی شیک نے حکومتِ برطانیہ کو مشورہ دیا کہ ہندوستانی لیڈروں کی جائز شکایتوں کو جلد سے جلد دور کر کے ان کا تعاون حاصل کرنا چاہئے، اسی مشورہ کی بنیاد پر مولانا آزاد اور دوسرے بڑے رہنما جیلوں سے رہا کر دئے گئے، مولانا آزاد نے رہا ہوتے ہی باردولی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور صلاح ومشورہ کے بعد اپنا بیان جاری کر دیا کہ:

"اگر حکومت اپنا رویہ بدل دے تو کانگریس بھی اپنا رویہ بدلنے پر تیار ہے"

## وَردھا میں کانگریس کا اجلاس:

جنوری ۱۹۴۲ء میں واردھا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا، آپ نے خطبۂ صدارت میں کانگریس کی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"۱۶ ماہ قبل ہم جہاں تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں تاہم کانگریس کے بدلنے کا دارومدار برطانوی حکومت کے رویہ پر ہے، ہمارے اور گاندھی جی کے درمیان اختلاف ہے، گاندھی جی جنگ کے سایہ میں آزادی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور ہم خواہ جنگ ہو خواہ امن کے ذریعہ آزادی کو خوش آمدید کہنے کو تیار

ہیں، نیز ہم اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے جب تک ہمیں مکمل آزادی نہ مل جائے گاندھی جی عدم تشدد کے نظریہ سے اس مسئلہ خاص کو دیکھتے ہیں اور ہم عدم تشدد کو سیاسی بنیادوں پر اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہمارا مقصد حاصل نہ ہو جائے۔''

مولانا آزاد نے کانگریس کے تذبذب کو دور کر دیا کہ عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں کہ اسے ہر قیمت پر اور ہر مرحلہ پر رہنما بنایا جائے، حالات اس عقیدہ کی شکل بدل بھی سکتے ہیں، مولانا آزاد اسی نقطۂ نگاہ سے سوچتے تھے پھر بعد میں پوری ورکنگ کمیٹی سوائے گاندھی جی کے مولانا آزاد سے متفق ہوگئی اور بعد میں اسی نقطۂ نگاہ سے عمل بھی کیا گیا جیسا کہ بعد کی تاریخ بتاتی ہے۔

کانگریس کے اس فیصلہ کو عام کرنے کے لئے مولانا آزاد نے مختلف اہم مرکزی مقامات پر جا کر تقریریں کیں اور بیانات دیئے اور عوام کو بتایا کہ اگر آزادی ہمارے نرم رویہ سے نہیں مل سکتی تو ہمارا رویہ بدل بھی سکتا ہے، پورے ملک کے عوام کو اس جدوجہد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

چیانگ کائی شیک وزیراعظم چین کو حکومت برطانیہ نے ہندوستانی لیڈروں کو رام کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا، مولانا آزاد نے ملاقات کے وقت واضح لفظوں میں کہا کہ ہم اپنے فیصلہ سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں بغیر مکمل آزادی کی گارنٹی کے ہم کوئی تعاون حکومت کو نہیں دے سکتے، چیانگ کائی شیک نے واپس جا کر حکومت سے اپیل کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ہندوستان کو سیاسی آزادی دے کر اختیارات سونپ دینا چاہئے، لیکن انگریزی حکومت کی گردن تنی ہی رہی ذرا بھی جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، جنگ کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ چند ہفتوں میں جاپان کا ہندوستان پر قبضہ ہو جائے گا اسی دوران ہندوستان کے مشہور لیڈر سبھاش چندر بوس خفیہ طور پر جرمنی پہنچ گئے اور برلن ریڈیو سے ہندوستان کی آزادی کا پیغام بھیجا انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی لیڈروں کا ہٹلر سے قریبی تعلق ہوتا جا رہا ہے اس

نے سمجھ لیا کہ اب صورت حال قابو سے باہر ہوتی جارہی ہے اگر جلد ہی ہندوستان کو اس جنگ میں شامل نہیں کیا گیا تو نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لئے مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے سیاسی بحران کو دور کرنے کے لئے جلد ہی ایک مشن ہندوستان جارہا ہے تاکہ وہاں کے عوام کو مطمئن کرسکے، مارچ میں مسٹر کرپس ہندوستان آگئے تو وائسرائے نے بذریعہ تار مولانا آزاد کو دہلی مدعو کیا ۲۹/ مارچ کو آزاد سے کرپس کی ملاقات ہوئی، مشن نے مولانا آزاد سے کہا کہ اب جونئی کونسل بنے گی اس کے سب ممبر ہندوستانی ہوں گے اور انگریز افسر سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں گے لیکن سردست نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

مولانا آزاد نے اس کا جواب ورکنگ کمیٹی کے فیصلے تک کے لئے ملتوی کردیا آپ نے فوراً ورکنگ کمیٹی طلب کرلی اور تمام ارکان کو اپنا یہ فیصلہ سنادیا کہ کوئی بھی فرد ذاتی حیثیت سے مشن سے ملاقات نہیں کرے گا، ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد سے اتفاق کرتے ہوئے کلی اختیارات آپ کے سپرد کردیئے کہ وہ تنہا مشن سے گفتگو کریں اور کمیٹی کو اس سے آگاہ کرتے رہیں۔

اپنی صف کو درست اور مستحکم کرنے کے بعد ہر شب مولانا آزاد اور مشن کے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور دوسرے دن ورکنگ کمیٹی تفصیلات پر غور کرتی اور فیصلہ صادر کرتی، کرپس مشن نے کانگریس کے علاوہ اور دوسرے لوگوں سے بھی ملاقاتیں کیں، اپریل تک صورت حال اطمینان بخش رہی گفتگو کامیابی کے ساتھ چلتی رہی، دونوں فریق ایک متفقہ لائحہ عمل پر آنے کی کوشش کرتے رہے، اس لئے کانگریس نے واردھا میں ایک فارمولہ مرتب کرکے مولانا آزاد کو سپرد کیا جو برطانوی حکومت سے مفاہمت پر مبنی تھا، دوسرے دن مولانا آزاد نے یہ فارمولا مشن کے سامنے رکھا تو کرپس نے جواب دیا کہ فارمولہ پر عمل جنگ ختم ہونے کے بعد کیا جائیگا، مولانا آزاد نے کہا کہ ایسے اہم معاملے کو عارضی اور اجمالی خاکہ پیش کردیا جائے تاکہ ہندوستان کو یقین ہوجائے کہ حکومت واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے لیکن مشن اس پر راضی نہیں ہوا اس

لئے مولانا آزاد نے کرپس تجویز کو مسترد کر دیا اور کہا کہ کرپس تجویز میں ابتداءً بہت خوش رنگ تصویریں کھینچی گئیں لیکن بعد میں وہ تصویر دھندلی ہوتی چلی گئی اس لئے ہم اس کو رد کرنے پر مجبور ہو گئے کرپس مشن ناکامیوں کا بوجھ لے کر انگلینڈ واپس چلا گیا، عالمی جنگ کی حالت اور بھی خطرناک ہو گئی، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی کا اب ایک ہی نعرہ تھا ''کرو یا مرو'' پھر کچھ ہی دنوں میں اس نعرے کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دینے لگی۔

## تشدد یا عدم تشدد؟

انگریزی نمائندے شرافت اور سنجیدہ گفتگو کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکے حاکمانہ غرور ہندوستان کی رائے عامہ کے سامنے جھکنے سے ان کو روکتا رہا وہ نہایت بے نیازی کے ساتھ ہندوستانی لیڈروں کی تجاویز کو ٹھکرا کر لندن لوٹتے رہے، اس صورتِ حال سے تنگ آ کر مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی نے ''کوئٹ انڈیا'' کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا چونکہ اس تجویز کے تحت عدم تشدد اور اہنسا کی پابندی مشکوک تھی اس لئے گاندھی جی اس سے کلی طور پر مطمئن نہیں تھے لیکن مولانا آزاد اس تحریک کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے رہے، وہ سوچتے تھے کہ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو آزادی بہت دور چلی جائے گی اس لئے فوراً انگریزوں سے یہ کہہ دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں، بحیثیت صدر کانگریس انہوں نے یہ طے کیا کہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو مکمل ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ممبئی بلا کر اس کے سامنے تجویز رکھ دی جائے، آپ نے پریس نمائندوں کے سامنے واضح الفاظ میں کہا کہ:

> ''ملک کے دفاع کے لئے انتظامات موثر اور عمدہ طریقے پر اس وقت تک نہیں کئے جا سکتے جب تک عوام کو پوری طرح یہ نہ سمجھا دیا جائے کہ ان کی قسمت بھی اس جنگ میں شامل ہے اس لئے کانگریس آزادی کے فوراً اعلان اور طاقت کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سپرد کئے جانے کے علاوہ اور کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتی''

## کوئٹ انڈیا تجویز:

کرپس مشن کے ناکام ہونے کے بعد ہی کانگریس کی طرف سے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ عوام کو دیا گیا پھر مولانا آزاد اور گاندھی جی نے ایک گفتگو میں ''ہندوستان چھوڑ و'' تحریک کی تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا کہ آخری تدبیر کے طور پر تجویز ورکنگ کمیٹی میں ضرور آئے۔

ان چار مہینوں میں مولانا آزاد نے ملک کے مختلف خطوں میں اپنے مستقبل کے پروگرام سے ملک کو آگاہ کیا حکومت بھی جان گئی کہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں کرسیِ صدارت سے کون سی تجویز آنے والی ہے، ملک کا مزاج اس تحریک کی حمایت کے لئے تیار ہو چکا تھا، مستبل کے طوفان میں چھلانگ لگانے کے لئے آزادی کے دیوانے تیار کھڑے تھے صرف حکم کا انتظار تھا، اسی تجویز کے باقاعدہ اعلان کے لئے ۸/اگست کا یہ اجلاس ممبئ میں بلایا گیا تھا تا کہ حکومت سے کھل کر کہہ دیا جائے،

ہرچہ بادا باد کشتی در آب اند اختیم

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ممبئ میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں شروع ہوا، ساری دنیا کی خبررساں ایجنسیوں کے رپورٹر موجود تھے، مولانا آزاد نے ایک بہت ہی پر جوش تقریر کر کے ''کوئٹ انڈیا'' ہندوستان چھوڑو کی تجویز پیش کردی، گاندھی جی نے کہا کہ مولانا آزاد کی تجویز سے حرف بحرف متفق ہوں اور اس تجویز کی تائید کرتا ہوں پھر پنڈت جواہر لال نہرو کی تائیدی تقریر نے دلوں میں آگ لگا دی، نصف شب تک اجلاس کی کاروائی چلتی رہی اور پھر کل کے لئے ملتوی کردی گئی۔

## کانگریس ورکنگ کمیٹی گرفتار:

ایوانِ حکومت تک جب یہ تجویز پہنچی تو اس نے بلا تاخیر کانگریس کو خلافِ قانون

جماعت قرار دے کر تمام لیڈروں کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا ابھی صبح بھی نہیں ہوئی کہ رات کے پچھلے پہر سارے ارکان ورکنگ کمیٹی گرفتار کر کے ممبئ ریلوے اسٹیشن پہنچا دیئے گئے اور ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیئے گئے، مہاتما گاندھی، کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو، اور مہادیو ڈیسائی کو پونہ میں اتار کر آغاخان کے محل میں قید کر دیا گیا، مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سید محمود وغیرہ کو احمد نگر قلعہ میں رکھا گیا، شنکر راؤ گووند ولبھ پنت، ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ، اچاریہ کرپلانی، جاکٹر پرفلا گھوش وغیرہ کو نامعلوم جگہ بھیج دیا گیا، دی دی گری، نیلم سنجیوا ریڈی، مسٹر کامراج کوامروتی جیل میں ڈالا گیا، اس طرح پوری ورکنگ کمیٹی کو مختلف جیلوں میں ڈالا گیا اور اس خبر پر اتنا کڑا سنسر بٹھا دیا گیا کہ عوام کو پتہ ہی نہیں چلا کہ ہمارے لیڈروں کو زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا، دوسری آزادی پسند جماعتوں میں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام، کے تمام رہنماؤں کی فہرست گورنمنٹ کے پاس تیار رکھی تھی اسی شب میں گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

## گرفتاری کا ردِ عمل:

۹/اگست کو جب ہندوستانی عوام نے اپنے لیڈروں کی گرفتاری کی خبر سنی تو غم وغصہ سے بھر گئے اور ہندوستان کے طول وعرض میں دیوانوں کی طرح ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک خانوں، تھانوں، کچہریوں پر ٹوٹ پڑے، توڑ پھوڑ، آتش زدگی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے، ریلوے لائنیں اکھاڑ دی گئیں، کوتوالیوں میں آگ لگا دی گئی، دو ہفتے تک حکومت کا نظام معطل ہو کر رہ گیا، پورے ملک میں ایسا زلزلہ آ گیا کہ ایوان حکومت کے کنگرے تھرتھرانے لگے، بنیادیں ہل گئیں، انگریزوں کے چہروں پر حاکمانہ غرور کے بجائے خوف زدگی کی ہوائیاں اڑنے لگیں، حکومت نے سمجھ لیا کہ ہمارے اقتدار کے آخری ایام ہیں، لیکن آہستہ آہستہ حکومت نے تشدد کا جواب تشدد سے دینا شروع کیا، لاکھوں افراد گرفتار ہوئے،

کوڑوں کی سزائیں دی گئیں، تین تین چار چار سالوں کے لئے جیلوں میں چکی پیسنے کے لئے بھیج دیا، آبادی کی آبادی کو آگ لگا کر پھونک دیا گیا، نادرشاہی جاگ پڑی، اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں اپنے مظالم کی آخری قسط پوری کر دی۔

## قلعہ احمد نگر میں مولانا آزاد:

احمد نگر قلعہ میں جہاں مولانا آزاد قید کئے گئے تھے ان کی مصروفیات کیا تھیں، اس کا صرف اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ قلعہ سے رہائی پا کر باہر آئے تو ان کے ہاتھوں میں ''غبار خاطر'' کا مسودہ تھا جو ادبی خطوط نویسی کا ایک شاہکار ہے، لیکن اس قید کے زمانے میں آپ کو کئی حادثات سے دو چار ہونا پڑا، سب سے بڑا صدمہ ان کو اس خبر سے پہنچا کہ ان کی محبوب ترین بیوی زلیخا بیگم، ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئیں اس آخری وقت میں مولانا آزاد ان کے سرہانے نہیں تھے ان کی وفات سے ان کے دل و دماغ کو کتنی چوٹ پہنچی؟ ''غبار خاطر'' کا ایک خط اس کی ترجمانی کرتا ہے، دوسرا صدمہ آپ کو اپنی ہمشیرہ آبرو بیگم کے انتقال کا اٹھانا پڑا جو انہیں ایام میں بھوپال میں راہی ملک بقا ہوئی تھیں، لیکن ان حوادثات کے موقعہ پر انہوں نے بے مثال صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تا کہ ان کی خودداری اور انا مجروح نہ ہو سکے انہوں نے ملک کی رہنمائی کی جو عظیم ذمہ داری اپنے سر لی تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سینے میں فولاد کا جگر ہو۔

## مولانا آزاد بانکوڑہ جیل میں:

قلعہ احمد نگر کے قیام کے آخری دنوں میں مولانا آزاد اور سید محمود کو ٹیکہ لگائے جانے کی وجہ سے بخار ہو گیا، اور کئی دنوں تک مسلسل رہا، اس موقعہ پر پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کی ایک مخلص تیمار دار کی طرح خدمت کی اور ہمہ وقت آپ کی ضروریات کا لحاظ رکھا اور ہمہ وقت آپ کے پاس حاضر رہے، اپریل میں احمد نگر کے

کلکٹر نے حکومت کو رپورٹ دی کہ شدید گرمی کی وجہ سے مولانا آزاد کا قلعہ میں رکھنا مناسب نہیں ہے اس رپورٹ پر حکومت نے مولانا آزاد کو بانکوڑہ جیل منتقل کر دیا اور مسٹر آصف علی کو بٹالہ جیل میں، مسٹر آصف علی کی علالت دراز ہوتی چلی گئی تو حکومت نے ان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا اس سے پہلے سید محمود بھی رہا ہو چکے تھے۔

## دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی:

اب ۱۹۴۵ء کا زمانہ آ چکا ہے، چھ سال پہلے جس جنگ کی ابتداء ہوئی تھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو تباہ و برباد کر کے ختم ہوگئی، یورپ سے جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے، برطانیہ، امریکہ، اور فرانس جنگ جیت چکے تھے، اٹلی، جرمنی اور جاپان تینوں غلام بنائے جا چکے تھے اور اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھے، برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل جو جنگ کے اس پانچ سالہ دور میں وزیر اعظم رہے جنگ جیتنے کے بعد انگلینڈ کے عوام نے ان کو وزارت سے محروم کر دیا، الیکشن میں لیبر پارٹی جیت گئی اور اب مسٹر ایٹلی وزیر اعظم بن گئے جو مزدوروں کے نمائندہ تھے، مولانا آزاد نے جیل ہی سے ان کی کامیابی پر ان کو مبارکباد کا تار دے دیا، اس کے جواب میں مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے مولانا آزاد کو جوابی تار دیا اور ان کے شکریہ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہماری لیبر پارٹی ہندوستان کے لئے صحیح حل نکالنے کی مخلصانہ کوشش کرے گی۔

## مولانا آزاد کی رہائی:

۱۵؍جون ۱۹۴۵ء کو حکومت نے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کو بانکوڑہ جیل سے رہا کر دیا، آپ نے رہا ہوتے ہی اپنے سکریٹری اجمل خان کو تار دیا کہ وہ فوراً کلکتہ پہنچ کر مجھ سے ملاقات کریں آپ بانکوڑہ سے براہ راست کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے، کیونکہ رفیقہ حیات کی دائمی جدائی کا غم تازہ ہو گیا تھا، اس کی وفاؤں کا اب صرف یہی صلہ باقی رہ گیا تھا کہ پہلی فرصت میں اس کی قبر پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھ لی جائے

تاکہ اس فرض کی ادائیگی کے بعد قومی خدمت کی ذمہ داری کو یکسو ہو کر پورا کیا جائے۔

کلکتہ اسٹیشن پر کانگریس کی صدر مسز لبانیہ پر بھارتہ کی قیادت میں ہزاروں کی بھیڑ نے مولانا آزاد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بینڈ باجے کے ساتھ جلوس روانہ ہوا تو مولانا آزاد نے کہا کہ میرے بہت سے ساتھی ابھی جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں ہمیں خوشی منانے کا ابھی کوئی حق نہیں ہے اگر آپ لوگ بینڈ باجے کو بند کر دیں تو بہتر ہوگا، بینڈ فوراً بند کر دیا گیا اس کی جگہ عوام کے فلک شگاف نعروں نے لے لی، انقلاب زندہ باد، مولانا آزاد زندہ باد کے پرشور نعروں نے کلکتہ کی فضا میں جوش و جذبات کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔

## بیوی کی قبر پر:

کلکتہ پہنچ کر سب سے پہلے آپ رفیقۂ حیات زلیخا بیگم کی قبر پر گئے، قبر دیکھتے ہی رقت طاری ہوگئی، آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں، فاتحہ پڑھی اور دل کے درد کو سمیٹے ہوئے سیدھے گھر آئے عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے:

> ”مولانا کے گھر پہنچتے ہی میں حاضر ہوگیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا“

## وائسرائے کا تار:

۱۶؍جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے بذریعہ تار مولانا آزاد کو مطلع کیا کہ ۲۵؍جون کو شملہ میں گول میز کانفرنس بلا رہا ہوں اور میں آپ کو اس میں شرکت کی دعوت دے رہا ہوں مولانا آزاد نے جواب دیا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان جیلوں سے باہر آجائیں تو مجھے یہ دعوت منظور ہے ورنہ نہیں، وائسرائے نے اسی دن تمام ارکان کو مختلف جیلوں سے رہائی کا حکم بھیج دیا۔

مولانا آزاد ابھی ابھی جیل سے تین سال کے بعد باہر آئے ہیں سیاسی حالات

پر ایک دھندسی چھائی ہوئی ہے، عوام اور حکومت کے رجحان اور جذبات سے پوری واقفیت نہیں ہے کہ ارونا آصف علی جو ابھی تک روپوشی کی زندگی گذار رہی تھیں، آ ئیں اور انہوں نے مولانا آزاد کو تفصیل سے حالات بتائے حکومت اور عوامی تنظیموں کے جذبات سے آگاہ کیا اور پھر انڈر گراؤنڈ ہو گئیں، دو ہفتے کے بعد مولانا آزاد نے ذاتی طور پر وائسرائے سے کہہ کر ان کی گرفتاری کو منسوخ کرایا تب وہ منظر عام پر آ ئیں۔

## مولانا آزاد کانگریس کے واحد نمائندہ:

مولانا آزاد نے ایک ذہین فرد کو اپنا سکریٹری بنا لینا ضروری سمجھا، آپ کی نظر انتخاب بنگال قانون ساز اسمبلی کے ایک ممتاز رکن مسٹر ہمایوں کبیر پر پڑی، آپ نے ان کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ ۲۰؍ جون کو ممبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لئے ایجنڈہ جاری کر دیں، مولانا آزاد نے پہنچ کر ٹھیک وہیں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے گھر پر قیام کیا جہاں سے تین سال قبل گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر کے جیل خانے بھیجے گئے تھے، گاندھی جی برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے، ورکنگ کمیٹی میں وائسرائے کا ۲۵؍ جون کے لئے دعوت نامہ زیر بحث رہا، پوری ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد کو اپنا واحد لیڈر تسلیم کر کے وائسرائے سے گفتگو کرنے کا مجاز بنا دیا، ضابطہ کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد آپ شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے اور شیوا ے ہوٹل میں قیام کیا، وائسرائے نے اصرار کر کے ان کو وائسریگل لاج میں اپنے قریب قیام کرنے کے لئے راضی کر لیا۔

## شملہ کانفرنس:

وائسرائے نے مولانا آزاد سے پہلی ملاقات میں سرکاری تجویزوں کی وضاحت کی اور کہا کہ دورانِ جنگ کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہے لیکن ایگزیکٹیو کونسل کے تمام ممبر ہندوستانی ہوں گے اور وہی دستور بنانے کے مجاز ہوں گے، وائسرائے کونسل

کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور اسی پر عمل کرے گا، جنگ کے مکمل اختتام پر آزادی کا مسئلہ حل کیا جائے گا بشرطیکہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے، اس کے جواب میں مولانا آزاد نے کہا کہ یہ مفاہمت اس لئے ناقابل اعتبار ہے کہ مسلم لیگ کو حکومت کی حمایت حاصل ہے وائسرائے نے کہا کہ اگر موجودہ صورت حال میں مسلم لیگ کے لیڈر یہ گمان کریں گے تو وہ غلطی پر ہوں گے، حکومت قطعی غیر جانبدار رہے گی۔

دوسرے دن ۲۶/جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے آل پارٹیز کانفرنس بلائی جس میں کانگریس، مسلم لیگ، شیڈول کاسٹ کے صدر، سکھوں کے نمائندے، نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا، وائسرائے نے افتتاحی تقریر میں صورتحال پر روشنی ڈالی اور زیر بحث آنے والے مسائل سے شرکاء کانفرنس کو واقف کرایا، اس کے بعد ہر گروپ ہر پارٹی کے نمائندوں نے اپنی اپنی جماعتوں کے نقطۂ نگاہ کو کانفرنس میں پیش کیا، کانفرنس دن بھر چلتی رہی، کانفرنس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے اور بیچ کی کوئی راہ نہیں نکل سکی، اس لئے وائسرائے نے بادل ناخواستہ کانفرنس کو غیر معین وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا سفینہ ساحل کے قریب آکر پھر گرداب میں چلا گیا۔

## الیکشن کی معرکہ آرائیاں:

برطانوی حکومت پر اب لیبر پارٹی کا قبضہ تھا، وزیر اعظم مسٹر ایٹلی ہندوستان کے معاملہ میں مخلص تھے وہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل چاہتے تھے ان کے ایماء سے وائسرائے نے استصواب رائے کے لئے جنرل الیکشن کا اعلان کر دیا، مولانا آزاد نے وائسرائے کو لکھا کہ جب الیکشن کا فیصلہ کر لیا گیا تو وہ تمام لوگ جو جیلوں میں اب تک بند ہیں اگر وہ رہا نہ ہوئے تو اس کا ردِ عمل خراب ہوگا، اس لئے اگر الیکشن صحیح ڈھنگ سے کرانا ہے تو ان قیدیوں کو رہا کیا جانا ضروری ہے چنانچہ وائسرائے نے فوراً تمام قیدیوں کو رہائی کا حکم بھیج دیا اور سب کے سب جیلوں سے باہر آگئے، پورے ملک میں

الیکشن کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوگئیں، الیکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر تھا، ہندو ہندو کو ووٹ دے گا، اور مسلمان مسلمان کو، الیکشن میں کانگریس صد فی صد کامیاب ہوئی اس کے تمام امیدوار جیت گئے مسلم لیگ ۷۰ فیصد کامیاب ہوئی یہی استصواب رائے تقسیم ملک کی بنیاد ہے، اسی الیکشن کی بنار پر صوبوں میں حکومتیں بنیں مرکز میں مخلوط حکومت قائم ہوئی، کانگریس کی طرف سے مدعو جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ تھے مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خاں راجہ غضنفر علی اور سردار عبدالرب نشتر، ۲۱ ر جنوری ۱۹۴۶ء کو مرکزی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا اب اسمبلی کی کرسیوں پر وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو کل جیلوں میں چکیاں پیس رہے تھے ہال میں سفید گاندھی ٹوپیوں کی باڑھ آئی ہوئی تھی، لیکن آزادی کی یہ پہلی قسط تھی، مکمل آزادی ابھی دور کہیں تھی، اس منزل پر پہنچنے کے لئے لندن سے ایک وزارتی مشن آیا اس کے سامنے سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ پاکستان کا تھا جس کے تسلیم کئے بغیر مسلم لیگ کو راضی نہیں کیا جا سکتا تھا، کانگریس بالخصوص مولانا آزاد تقسیم ملک کو کئی حیثیتوں سے غلط سمجھتے تھے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے تو اس کو خودکشی سے تعبیر کرتے تھے وزارتی مشن سے گفتگو کے بعد آپ نے ایک اخباری بیان دیا جس میں آپ نے کہا۔

”تقسیم مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ مسائل کھڑا کر دے گی، پاکستان کی اسکیم شکست کی علامت ہے، قومی وطن کا خیال اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی نہیں کہ ایک کونے میں جو ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو سمٹ کر بیٹھ جائیں، پاکستان کی مانگ بزدلی کی علامت ہے مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ ہے کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈال سکتے ہیں، یاد رکھو کہ پاکستان کا نعرہ لگانے والوں کی ایک روز جب آنکھ کھلے گی تو دیکھیں گے کہ راتوں رات وہ اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں اور پردیسی حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے، جو خالص ہندو راج

ہوگا.......بعد کی تاریخ نے مولانا آزاد کی حرف بحرف تصدیق کردی کیا اب بھی مولانا آزاد کی دور بینی پر تم کو شک ہے؟

## مولانا آزاد کی صدارت کے سات سال:

کانگریس کی پوری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ مولانا آزاد مسلسل سات سال تک کانگریس کے متفقہ طور پر صدر رہے جب کہ یہ پورا دور تدبر وفراست، ذہانت وفطانت کا امتحانی دور تھا، ملک میں نازک ترین اور اہم ترین مسائل اسی سات سالہ دور میں پیش آئے، دوسری جنگ عظیم اسی دور میں شروع ہوئی ۱۹۴۲ء کی طوفانی تحریک سے لیکر الیکشن کی معرکہ آرائیوں تک اور ۱۹۴۷ء کی اس سرحدی چوکی تک جہاں سے آزادی کی منزل کے نشانات کا آغاز ہوتا ہے، مولانا آزاد صدر کانگریس رہے، اس طرح جنگ آزادی کی رہنمائی کا جو اہم ترین دور تھا وہ مولانا آزاد کی ذہانت وفطانت کی وجہ سے بڑی کامرانی وسرفرازی سے گذر گیا، اس دور میں بہت سے نازک مرحلے آئے جب ورکنگ کمیٹی میں اختلاف رائے کا سخت ترین اندیشہ تھا لیکن ہر موڑ پر دانشمندی نے صحیح سمت کی رہنمائی کی اور کامیابی کے ساتھ ان خاردار وادیوں سے آپ گذر گئے، اب آپ محسوس کرنے لگے تھے کہ مجھے صدارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانا چاہئے اس لئے آپ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میری جگہ کانگریس کا صدر جواہر لال نہرو کو چن لیا جائے مگر مولانا آزاد کے اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لئے ورکنگ کمیٹی بروقت تیار نہیں ہوئی لیکن بعد میں مولانا آزاد کے فیصلہ کے سامنے کمیٹی کو جھکنا پڑا اور جواہر لال نہرو صدر منتخب کر لئے گئے۔

مولانا آزاد نے جس وقت مسند صدارت چھوڑی ہے اس وقت کاروان آزادی اپنی منزل کے ابتدائی زینوں تک آچکا تھا اب چند ہی زینوں کے بعد رختِ سفر اتار دینا تھا، تجربہ کے طور پر ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے وزراء شامل تھے، اہم ترین عہدوں پر دونوں قوموں کے لوگ سرفراز

تھے، یہ تجربہ ان لوگوں کی چشم بصیرت کھول دینے کے لئے کافی تھا جو تقسیم ملک پر بضد تھے لیکن اس سے سبق نہیں لیا گیا، وزارتی مشن کے آنے کے بعد تقسیم کا اصول تسلیم نہ کرنے پر جو قیامت خیز طوفان لیگ نے برپا کیا اس طوفان نے ان کو بھی تقسیم کے ہم نوا ہونے پر مجبور کر دیا جو تقسیم کے سب سے بڑے دشمن تھے۔

## مولانا آزاد کی بصیرت:

مولانا آزاد ابتدا ہی سے متحدہ ہندوستان کے حامی تھے، مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھتے تھے، مستقبل میں ان کے امن وامان کی زندگی اور دین ومذہب اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی ضمانت اس میں سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ تقسیم سے مسلمانوں کا فائدہ کم اور نقصانات زیادہ ہیں، ان کو یقین تھا کہ اگر ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ گورنمنٹ کا اصول طے کر لیا جاتا ہے تو مسلمان اپنی فطری ذہانت وفطانت کی وجہ سے شریک غالب کی حیثیت اختیار کر جائے گا اور اگر برابری کی سطح پر بھی رہا تو وہ جارحانہ تنگ نظری اور خونخوار نہ فرقہ واریت تو ہرگز نہ پیدا ہوگی جو ردعمل کے طور پر تقسیم کے دوسرے ہی دن ہندو قوم میں پیدا ہوگئی، مولانا آزاد بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمان جو ہندوستان میں ہیں وہ عذاب کی دہکتی ہوئی بھٹی میں ہمیشہ جلتے بھنتے رہیں گے کیونکہ اب وہ شریک حکومت اور برابر کی حیثیت میں بھی نہ رہ جائیں گے بلکہ ایک اقلیت ایک محکوم ومظلوم طبقہ کا درجہ اختیار کر جائیں گے، جمہوریت کا نام رکھتے ہوئے بھی ہندوستان میں ایک فرقہ کی جابرانہ آمریت قائم ہو جائے گی، ایک فرقہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہے گا فیصلہ کرے گا، مسلمان اس میں دخل دینے کی بھی پوزیشن میں نہیں رہ جائے گا۔

یہ سوچ سوچ کر ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی، درد وکرب نے اس سیماب صفت انسان کو منجمد بنا دیا، اپنے دل کے درد کو پورے ملک کے مسلمانوں میں گھوم گھوم کر بانٹتے پھر رہے تھے لیکن بہت کم لوگ ان کے شریک ہوئے، ہندوستان کا دانشور طبقہ

جس کی نمائندگی علی گڈھ کر رہا تھا اس نے اپنی بصیرت و بصارت دونوں اس ماحول میں کھودی تھی، انہیں لوگوں سے سب سے زیادہ توقع تھی کہ سیاست کے رموز و اسرار کو عام مسلمانوں سے زیارہ گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے، لیکن واقعہ اس کے برعکس نکلا، علی گڈھ کی سرزمین مولانا آزاد کے لئے سرزمین طائف بن گئی اور آپ کئی بار وہاں سے لہولہان واپس آئے، زہریلے تیروں کا نشانہ تو آزادی کے بعد بھی ان کو بنایا جاتا رہا جب کہ وہاں کا دانشور طبقہ مایوسیوں کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا تھا، ان کا ترکش اب بھی خالی نہیں، مولانا آزاد کی کردارکشی کے جذبہ سے مجبور ہوکر اب بھی کتابیں لکھی جارہی ہیں، رسالوں میں تیز وتند مضامین شائع ہورہے ہیں جب کہ اپنی غلطی کا احساس ان لوگوں کو بھی بہت جلد ہوگیا تھا جو اس تحریک کے قائد اور اپنے کو پاکستان کا خالق تصور کرتے تھے لیکن ایک طبقہ آج بھی مولانا آزاد کے ناکردہ گناہ کو معاف نہ کرسکا۔

دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''مسلم انڈیا'' میں پشاور سے شائع ہونے والے اخبار ''فرنٹیر پوسٹ'' کی ایک رپورٹ کی بنیاد پر پاکستانی فوج کے ایک ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش (جنھوں نے مسٹر محمد علی جناح کی آخری بیماری میں ان کا علاج کیا تھا) کی زبانی حسب ذیل بیان شائع ہوا ہے، کرنل الٰہی بخش بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وزیراعظم لیاقت علی خاں قائداعظم کو دیکھنے آرہے ہیں اس وقت قائداعظم مسٹر جناح بستر مرگ پر تھے، اور کوئٹہ کے قریب زیارت نام کی جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے، دوسرے دن وزیراعظم لیاقت علی خاں جب وہاں پہنچے اور قائداعظم کو سلام کیا تو اس کا انہوں نے جواب نہیں دیا، تب لیاقت علی خاں نے آمنے سامنے ہوکر پوچھا، قائد کیسے ہیں؟ قائداعظم غصہ سے پھٹ پڑے اور کہا کہ تم اپنے کو بڑا آدمی سمجھنے لگے ہو تم کچھ بھی نہیں ہو، میں نے تم کو پاکستان کا وزیراعظم بنایا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے پاکستان بنایا ہے؟ اس کے بعد قائداعظم نے کہا کہ مجھے اب احساس ہوگیا ہے کہ میں نے اپنی

زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی کی ہے، اب اگر مجھے موقعہ ملا تو دہلی جا کر جواہر لال نہرو سے کہوں گا کہ ماضی کی غلطیوں کو بھلا کر میرے دوست بن جاؤ۔

یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا مگر وہ بہت زور سے کانپ رہا تھا، میں نے لیاقت علی صاحب سے کہا کہ مریض کے لئے اتنے غصہ اور جذباتی انداز میں گفتگو کرنا درست نہیں ہے، لیاقت علی خاں نے کمرے سے باہر آ کر کہا کہ:

بڈھے کو اب جا کر اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔

(قومی مورچہ بنارس اشاعت ۱۵/اگست ۱۹۸۸ء ص ۲ کالم ۷ و ۸)

# مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلیؒ

## اسلامی ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلیؒ مدیر الفرقان ۴؍مئی ۱۹۹۷ کو ۹۲ سال کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، پوری زندگی انہوں نے دین حق کی سر بلندی اور اسلام دشمن فتنوں سے نبرد آزمائی میں گذار دی، سنگین سے سنگین تر حالات بھی ان کی دینی جدو جہد، احقاق حق اور ابطالِ باطل کی راہ میں پیش قدمی کو نہ روک سکے، ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن دریا میں اتر کر طوفان کی ہولناکیوں اور ہلاکت خیزیوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ اور ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، ان کی تعداد اتنی مختصر ہوتی ہے کہ ہر دور میں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، ایسے ہی کمیاب افراد میں حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی شامل ہے۔

ان کا عزم آہنی، ان کی ہمت فولادی، ان کا جوش عمل طوفان بدوش ان کا حوصلہ نا قابل شکست، دین کی راہ میں ان کی جدو جہد سیماب صفت، ان کا عزم جواں ہمت بلند پارے کی طرح ہمہ وقت متحرک، اور رواں دواں، وہ جس مہم پر چلے پورے جوش وخروش اور پورے ولولے کے ساتھ چلے ان کا دل دین حق کی سر بلندی کے جذبات سے معمور، ان کا دماغ علوم ومعارف کا خزانہ، ذہانت وفطانت ان کی کنیز، زورِ استدلال زورِ بیان ان کا غلام، علماء حق کے خلاف فتنہ بر پا کرنے والوں کے محاذ پر پوری جاں سپاری اور جذبہ فدا کاری کے ساتھ ٹوٹ پڑنے والے، کبھی کبھی تو دل جذبات کے لاؤ لشکر لے کر اتنی تیز روی کے ساتھ پیش قدمی کے لئے آگے بڑھا کہ عقل اور مصلحت دونوں اپنی جگہ دم بخود اور حیرت زدہ رہ گئیں، سست گامی انہوں نے کبھی نہیں سیکھی تیز گامی بلکہ برق رفتاری ان کی فطرت تھی۔

## میدان عمل کا انتخاب:

مولانا مرحوم دینی جدوجہد اور اپنی عملی سرگرمیوں میں اپنی راہ خود منتخب کرتے، کسی خارجی دباؤ یا کسی دوسرے کے مشوروں کا ان کی عملی سرگرمیوں میں کبھی کوئی دخل نہیں رہا دل میں جو جذبہ ابھرتا دل کی گہرائیوں سے ابھرتا، مصلحت اندیشی، خطرات کے احتمالات کا کہیں دور دور گذر نہیں ہوتا انجام سے بے پرواہ ہو کر طوفان میں چھلانگ لگا دینا، ان کا مزاج تھا، عقل دلی جذبات کے تابع تھی، دل اپنی پسندیدہ راہ پر چل پڑتا، عقل کو اس کا دامن پکڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۲۶ء میں سند فضیلت لے کر اپنے وطن سنبھل میں لوٹ کر آئے تو پورے ہندوستان میں بدعات وخرافات مشرکانہ عقائد اور رسم ورواج کی حمایت میں بدایوں اور بریلی کے علماء نے ایک شور برپا کر رکھا تھا، ان تمام خرافات کو سند جواز ہی نہیں دے رکھی تھی بلکہ ان بدعات کی مخالفت کرنے والوں کو سب وشتم اور دشنام طرازی سے آگے بڑھ کر ان پر کفر کا فتویٰ دے رکھا تھا، علماء دیوبند نے بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد وخیالات کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا تھا اور جاہلی رسم ورواج کے خلاف اپنی اصلاح جاری کر رکھی تھی وہ اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ مسلم معاشرہ میں دیکھنا چاہتے تھے علماء سوء جو ان خرافات کی پشت پناہی کر رہے تھے ان کے مفاد پر اس سے ضرب پڑتی تھی اس لئے وہ تحریکِ اصلاح کی مہم میں پوری جاں سپاری کے ساتھ حصہ لینے والوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور ان پر اپنی کمینگاہوں سے زہریلے تیر برسا رہے تھے علماء حق کو ذلیل ورسوا کرنے اور جاہل عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلا کر ان کی جان کے دشمن بنانے کی ہر امکانی جدوجہد کر رہے تھے اور وہ بڑی حد تک اپنی تگ ودو میں کامیاب بھی ہو رہے تھے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے کہ علماء حق کو بعض مقامات پر جانے میں جان کے خطرات لاحق تھے۔

بدعات ومشرکانہ عقائد وخیالات کی حمایت میں انوار ساطعہ تو بہت پہلے لکھی جا

چکی تھی اور اس کے جواب میں حضرت گنگوہی کے حکم سے مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری ''براہین قاطعہ'' لکھ کر شائع کر چکے تھے جس کی اشاعت کے بعد علماء سوء کی تکفیری مہم پر شباب آگیا اور علماء دیوبند ایسے کافر بنائے گئے کہ جوان کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہو جائے۔

حرمین شریفین کے علماء اور مفتیوں کو دھوکا دے کر مولوی احمد رضا خاں بریلوی فتویٰ حاصل کر چکے تھے اور پورے ملک میں اس کی اشاعت ہو چکی تھی، جس کا نام ''حسام الحرمین'' رکھا گیا تھا، جب یہ تلوار نیام سے نکلی تو باہر نا کردہ گناہ مسلمانوں کی گردن اس کی زد میں تھی، خصوصیت کے ساتھ شاہ اسمٰعیل شہید حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کو غیر مبہم الفاظ میں کافر کہا گیا اور انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیا گیا، اللہ کے ان نیک بندوں کو برملا مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا ہر حمایتی کافر کہتا اپنے رسالوں اور کتابوں میں لکھتا تھا شہروں اور قصبوں سے لے کر دیہاتوں اور گاؤں کے ناخواندہ اور سیدھے سادے مسلمانوں کو بھی سبق پڑھایا جاتا کہ علماء دیوبند کے جلسوں اور وعظوں میں جانا گناہ اور کافروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، اس طرح علماء حق کی راہوں میں زہریلے کانٹے بچھا دیئے گئے تھے ان کی تحریک اصلاح کی راہیں جاں لیوا خطرات سے معمور ہو گئیں، تکفیر کے آتشکدے میں انگارے دہک رہے تھے اور یہ انگارے اڑ اڑ کر ہندوستان سے حجاز تک علماء حق کی راہوں میں لودے رہے تھے۔

ٹھیک یہی ماحول تھا اور یہی حالات تھے جب مولانا منظور نعمانی دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر وطن آئے تھے سنبھل اور امروہہ کے مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے چار سال گذار چکے تھے اسی تدریسی دور میں بریلوی فرقے سے تین چار مناظرے مختلف مقامات پر کر چکے تھے، لیکن مولانا نعمانی اپنی اس محدود جدو جہد اور عملی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے وہ اس سے بہت آگے جانے کا حوصلہ رکھتے تھے، تکفیری فتنے کی شدت کا تقاضا کچھ وار بچانے کے ساتھ ساتھ وار کرنا

بھی ضروری ہوتا ہے انہوں نے ایک بار حالات کا جائزہ لیا اور ذہن میں ایک لائحہ عمل بنایا اور دشمن کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کا جذبہ ابھرا اور یہ جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ انجام سے بے پروا ہو کر اس دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور فتنوں کے سرچشمہ اور منبع ومخرج بریلی جا کر اس فتنہ کے دہانے کو بند کرنے کا عزم بالجزم کر لیا، ساری مصلحتوں اور خطروں کو پس پشت ڈالا، عقل اور مآل اندیشی دامن پکڑتی رہی لیکن آپ دامن جھٹک کر آگے بڑھ گئے اور بریلی پہنچ کر وہیں خیمہ گاڑ دیا،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

## مناظروں کا دور:

اس دور کے اہم ترین فتنوں میں سب سے خطرناک بریلویت کا فتنہ تھا، بدعتوں کی حمایت کرنے والے علماء سوء خود بدعات مشرکانہ خیالات وعقائد میں گرفتار تھے اور خودساختہ رسم ورواج، میلاد، عرس، قوالی، قبروں پر چراغاں، نذر ونیاز، چڑھاوا اور میلوں ٹھیلوں کو کارِ ثواب بنا کر گناہوں کے دل دل میں گردن تک دھنسے ہوئے تھے اور جاہل اور سیدھے سادے عام مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کر کے یہ سمجھا رہے تھے کہ اصل دین یہی ہے، علماء دیوبند جو عوام کو بدعقیدگی کی اس دَلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے ان کی آواز کو بے اثر بنانے کے لئے ان کو کافر ومشرک دشمن اولیاء ورسول کہتے تھے اس صورت حال کی وجہ سے عوام کی اصلاح دشوار سے دشوار تر ہوتی چلی گئی، مولانا نعمانی کا خیال تھا کہ جب تک اس سانپ کے پھن کو کچلا نہیں جاتا کوئی بھی مصلح اس کے زہر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور انہوں نے یہی کیا۔

چار سال تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے اس مدت میں آپ درڈ ضلع نینی تال، سنبھل ضلع مرادآباد، گیا (بہار) اور سلانوالی (پنجاب) میں باطل شکن مناظرے کر چکے تھے، اب آپ تدریسی مشغلے سے آزاد ہو چکے تھے اب شب وروز کا ہر لمحہ اسی

فتنہ کی سرکوبی کے لئے وقف تھا، اور اس کی تدابیر پر غور و فکر کرنے میں گذرتا تھا، آپ نے بریلوی مکتب فکر کے سب سے مضبوط قلعہ مدرسہ منظر اسلام بریلی پر حملے کے آغاز سے اپنی مہم شروع کی اور خود ان کے مدرسہ میں گئے جوان کا ایک محفوظ قلعہ تھا، مولوی احمد رضا خاں صاحب تو حسام الحرمین کی تلوار اپنے جانشینوں کے ہاتھ میں دیکر عدم آباد کے سفر پر جا چکے تھے البتہ ان کے جانشین تخت اقتدار پر متمکن تھے مولانا نعمانی نے انہیں کو مناظرہ کا چیلنج دیا لیکن جب مناظرہ کی نوبت آئی تو اپنی جگہ انہوں نے اپنے مدرسہ کے صدر مدرس مولوی سردار احمد گورداسپوری کو اپنا وکیل بنا کر کھڑا کر دیا، جب سوال و جواب کا آغاز ہوا تو فریق مخالف نے علماء دیوبند کو "حلوہ مانڈا" نہ ملنے کا طعنہ دیا، مولانا نعمانی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ حرام کا حلوہ مانڈا نہ تم کو مبارک نہ ہم کو ہماری فاقہ کشی سنت رسول پر عمل آوری کا ایک ذریعہ ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے ہیں اور آپ کئی کئی وقت بھوکے رہے، اس کے جواب میں فریق مخالف نے کہا تم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوکا کہہ دیا تم نے سرکار دو عالم کی توہین کی تم مرتد ہو گئے اور واجب القتل ہو، بریلوی مکتبِ فکر کے صدر نے مسند صدارت سے بھی یہی اعلان کیا کہ بالکل واجب القتل ہے، حضورؐ کی توہین کی وجہ سے مرتد ہو گیا اور مرتد کی سزا قتل ہے، غیرتمند مسلمان اس کو برداشت نہیں کرسکتا قتل، قتل کی تکرار سے ان پیشہ ور قاتلوں کو اشارہ دینا تھا جو اسی مقصد کے لئے بلائے گئے تھے کہ حملہ کر دو، مولانا نعمانی کے ساتھ والے سازش کی اس تہ کو فوراً سمجھ گئے اور آپ کو اپنے حصار میں لے لیا اور بڑی مشکلوں سے جان بچائی ایک شور برپا ہو گیا، ہر طرف سے یہی آواز آرہی تھی مارو، جانے نہ پائے، قتل کر دو، مرتد ہو گیا، مرتد کو قتل کرنا ضروری ہے، مولانا نعمانی کے حامیوں نے چاروں طرف سے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور گیٹ سے باہر نکال لائے قلعہ رضویہ کے سورما اپنی سازش میں ناکام ہو گئے البتہ شکست کی ذلت کی سیاہی ان کے چہروں پر چھائی ہوئی تھی یہ مولانا نعمانی کی جرأت قلندرانہ کا تاریخ ساز مظاہرہ تھا۔

## ادری ضلع اعظم گڈھ کا مناظرہ:

بریلی کے مناظرہ کے کچھ ہی دنوں بعد میرے وطن ادری اعظم گڈھ میں ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا، یہاں بریلوی مکتب فکر کے دو ممتاز اور سر برآوردہ مولوی صاحبان موجود تھے ایک مولوی نعیم الدین مرادآبادی اور دوسرے مولوی حشمت علی پیلی بھیتی یہ دونوں ایک جلسہ عام میں تقریر کے لئے بلائے گئے تھے، دن مین جلسہ ہو رہا تھا ۱۱ بجے کا وقت ہوگا اسٹیج پر مولوی حشمت علی صاحب تقریر کر رہے تھے اور مولوی نعیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔

ٹھیک اسی صورت حال میں مولانا عبداللطیف نعمانی نے جلسہ عام میں جا کر ان دونوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور ان کے فرار کا راستہ بند کر دیا، اس کے باوجود مولوی نعیم الدین پہلی ٹرین سے فرار کر گئے البتہ عوام نے مولوی حشمت علی صاحب کو زبردستی روک لیا، پھر تین دنوں تک بڑا ہی ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا ہمارا چھوٹا سا گاؤں ادری ان دنوں آدمیوں کا جنگل بن گیا تھا پورا ضلع سمٹ آیا تھا، مناظرہ کا موضوع مسئلہ علم غیب تھا، لیکن فریق مخالف جب بھی اصل موضوع پر گفتگو آتی تو وہ حسام الحرمین کے فتوؤں کی بات لے آتے، اکابر علماء دیوبند کی کتابوں کی عبارتوں پر تقریر شروع کر دیتے، جب جب مولانا نعمانی اصل موضوع پر ان کو گھیر کر لے آتے تو اول فول بکنا شروع کر دیتے، جھنجھلاہٹ بڑھی، سخت سست الفاظ کا استعمال مولوی حشمت علی کی طرف سے مسلسل چلتا رہا، علماء دیوبند کے کفر کا اعلان دانت پیس پیس کر کرتے مولانا نعمانی مولوی حشمت علی کی اس حرکت مذبوحی پر صرف مسکراتے رہتے تھے، جب مولانا نعمانی کی گرفت سے نکلنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو اپنے ہم مشربوں سے کہہ کر بذریعہ پولیس تیسرے دن مناظرہ بند کرا دیا، حلقہ کے تھانیدار نے نقض امن کا اندیشہ بتا کر اعلان کر دیا کہ کل سے مناظرہ بند کیا جاتا ہے، اگر چہ موضوع مناظرہ پر مولانا نعمانی کے سارے سوالات تشنۂ جواب ہی رہے، مولوی حشمت علی نے اصل موضوع پر کبھی گفتگو

کرنے کی جرأت ہی نہیں کی لیکن عام مسلمانوں نے علی رؤس الاشہاد یہ جان لیا کہ حق مولانا نعمانی کی طرف ہے فریقِ مخالف کے پاس سوائے سب وشتم دشنام طرازی اور کافر گری کے اور کوئی علمی جواب نہیں، وہ آخر تک اپنی کم علمی کی پردہ پوشی کی جد وجہد میں مصروف رہے۔

تین دنوں کے بعد یہ مناظرہ بند ہو گیا لیکن اس کا اثر ہمارے ضلع اعظم گڑھ کے مسلمانوں پر اتنا پڑا کہ یہاں کی نوے (۹۰) فیصد آبادی جو بدعات وخرافات میں مبتلا تھی وہ اس سے تائب ہوگئی اور ضلع اعظم کے سواد اعظم گڑھ نے مولانا نعمانی کے اس جرأت مندانہ اقدام سے حق کی روشنی پالی اور سابقہ روش سے ایک دم کنارہ کش ہو گئے، سوائے چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے پورا ضلع ان بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد وخیالات سے پاک ہو گیا، اور ان لاکھوں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی جو توفیق حاصل ہوئی اس کے اجر میں مولانا مرحوم اجر عظیم کے مستحق ہوئے۔

## وہابی اور وہابیت کا طعنہ:

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جب دجل وفریب سے کام لیکر علماء حق کے خلاف علماء حجاز سے فتویٰ حاصل کیا تھا اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹ کر آئے اور اس فتویٰ کو حسام الحرمین کے نام سے طباعت کا انتظام کر رہے تھے تب تک حجاز میں انقلاب آچکا تھا، ترکی حکومت خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے حجاز کا گورنر شریف حسین تھا، اس زمانہ میں جدہ میں انگریزوں کا فوجی جنرل ولسن جدہ میں مقیم تھا، اس نے شریف حسین کو ورغلا کر باغی بنا دیا اور بغاوت کر کے حجاز سے ترکی حکومت کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لی اس وقت ترکی فوجیں حجاز میں بہت کم تھیں، پہلی جنگ عظیم شباب پر تھی ترکوں کی ساری فوجیں حجاز سے باہر مختلف محاذوں پر جنگ میں مصروف تھیں اس لئے بڑی آسانی سے شریف حسین کامیاب ہو گیا اور انگریزوں کا آلۂ کار بن کر حجاز کا حکمراں ہو گیا اسی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اوران کے تین دیگر رفقاء کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کیا تھا، اورانہوں نے ان بزرگوں کو چار سالوں کے لئے جزیرہ مالٹا کے جیل خانے بھیج دیا تھا، اسی جنگ عظیم کے موقعہ پر انگریزوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کرکے خلافت عثمانیہ کا وجود مٹادینے کی کارروائیاں شروع کر دیں جس کی وجہ سے پورے عالمِ اسلام میں تہلکہ مچ گیا ہندوستان میں اسی واقعہ کی وجہ سے تحریک خلافت چلی یہ اتنی طاقتور تحریک تھی کہ انگریزی نظام حکومت بے اثر ہوکر رہ گیا عوام نے اپنی پولیس اور اپنی عدالتیں قائم کرلیں سارے باہمی مسائل ازخود حل کرتے، مقدمات کے فیصلے کرتے، مجرموں کو سزائیں دیتے، پورے ملک میں ’’خلافت زندہ باد‘‘ کے نعرے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی دوسری تمام سیاسی پارٹیاں یا تو خلافت تحریک کی حمایت کرتیں یا مفلوج ہوکر رہ گئی تھیں، اوران کی سرگرمیوں پر اداسی پڑگئی، مولانا محمد علی مولانا شوکت علی ہندوستان کے ہیرو بن گئے سارے مسلمان تو ہم آواز تھے ہی غیر مسلم بھی نعرۂ تکبیر اللہ اکبر میں ہم آواز تھے، ہندو مسلم اتحاد کا اتنا شاندار بے مثال مظاہرہ ہندوستان کی تاریخ نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شخص یا جماعت کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا جس سے اس اتحاد پر ضرب پڑتی تو پورے ملک کی اس پر لعنت برسنے لگتی تحریک خلافت کی مخالفت کرنے والوں کے جنازے پڑے رہ جاتے ان کو دفن کرنے والے نہیں ملتے تھے۔

لیکن ہندوستان کے مقدر میں ابھی غلامی کے بہت دن تھے، ہندوستان میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی بحالی کے لئے پوری قوت سے تحریک چلائی جارہی تھی دوسری طرف خود ترکی میں ایک ترکی لیڈر مصطفے کمال پاشا نے اپنے ہاتھوں قباء خلافت کو تار تار کردیا، ترکی کے شیخ الاسلام نے جب مصطفے کمال کو خدا اور رسول اور قرآن کا واسطہ دیا تو اس نے شیخ الاسلام کے ہاتھوں سے قرآن پاک چھین کران کے سر پر دے مارا اور کہا اپنا قرآن لے جاؤ ہم کو اس کی ضرورت نہیں اقتدار پانے کے بعد مصطفے کمال نے عربی زبان پر پابندی لگادی لکھنے پڑھنے اور بولنے پر ہی نہیں عربی زبان میں اذان

کہنے پر بھی سخت سزادی جاتی تھی اسلامی لباس پہننا جرم قرار دیا گیا، دینی مدارس بند کرا دیئے اور ترکی کی سرزمین سے خلافت کا جنازہ نکال دیا ہندوستان کی تحریکِ خلافت اپنی موت آپ مرگئی۔

تحریکِ خلافت کے اس پورے دور میں مولوی احمد رضا خاں کی حسام الحرمین کی تلوار زنگ کھاتی رہی کیونکہ اس کی اشاعت سے اتحاد واتفاق میں خلل پڑتا تھا اس طرح کی اٹھنے والی ہر آواز کوعوام گلا گھونٹ کر بند کرنے کے لئے بیتابی کے ساتھ دوڑ پڑتے تھے اس لئے ان کی تکفیری مہم اپنی قبر میں سوتی رہی، حالات نے پلٹا کھایا حجاز میں شریف حسین کی بغاوت کی سزا والی نجد سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شریف حسین پر حملہ کرکے دی شریف حسین کوشکست ہوئی پورے حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا قبضہ ہو گیا اس نے اپنے مسلک کی رو سے قبروں پر بنے ہوئے قبوں کومنہدم کرا دیا، سلطان کے اس اقدام کی خبر جب ہندوستان پہنچی تو اس کی مذمت میں جلسے ہونے لگے، رضا خانی جماعت نے اس معاملہ کو اپنی جماعت کا ایشوء بنالیا اور علماء دیوبند کوسعودی حکومت کے ان اقدامات سے جوڑ دیا اور ان کو وہابی اور نجدی کی گالیاں دینی شروع کردی، حسام الحرمین کی تلوار پر از سرنو سان چڑھائی گئی تحریکِ خلافت کے پورے دور میں ان کی تکفیری مہم جو مردہ خانے میں لاش کی طرح پڑی رہی پھر اس میں جان ڈالی گئی اور پھر وہ میدان میں آگئے۔

ٹھیک یہی زمانہ، یہی ماحول، یہی گرم فضا تھی جب مولانا منظور نعمانی نے ۱۹۳۰ء میں بریلی میں قیام کا فیصلہ کیا اور وہاں جا کرسکونت پذیر ہوگئے، اپنے مشن کی اشاعت کیلئے آپ نے ایک ماہوار رسالہ الفرقان کے نام سے ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جاری کیا جو آج تک جاری ہے اور دین کی خدمت انجام دے رہا ہے اور بدعت میں ہزاروں مضامین اور ان گنت مناظروں کی روداد یں اپنی فائلوں میں چھپائے ہوئے ہے۔

## مناظرے ہی مناظرے:

بتدریج علماء دیوبند کی تحریک اصلاح تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی اس کی تیز

رفتاری دیکھ کر بریلوی مکتب فکر پوری بدحواسی کے ساتھ اپنی چراگاہوں کی حفاظت کے لئے تگ ودو کر رہا تھا، کافرگری کی مہم میں تیزی لانے کے لئے نئی نئی گالیاں ایجاد کر رہا تھا، سب وشتم، دشنام طرازی میں ان کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی، کافرگری کی مہم کا یہ دور شباب تھا اس دور میں مولانا نعمانی جان ہتھیلیوں پر لے کر ان تمام مقامات تک پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں رضا خانی جماعت کے نمائندوں نے زہر افشانی کی ہے، ہر طرح کے خطرات کا سامنا کرتے ان کے تمام جبہ قبہ والے مولویوں کو مولانا نعمانی کا چیلنج عام تھا، کیسا ہی خطرناک ماحول ہو کتنے ہی اندیشناک حالات ہوں آپ کا بروقت اس مقام تک پہنچنا ضروری تھا، مولانا مرحوم پورے دس سال تک مسلسل ان کے تعاقب میں رہے ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا جہاں رضا خانیوں نے بدعات وخرافات کی حمایت میں لن ترانیاں ہانکی ہوں اور مولانا نعمانی کی حق کی آواز وہاں نہ گونجی ہو، بریلی مکتب فکر کے لوگ مسلمانوں کی شکل وصورت میں رہ کر اسلام کی شکل بگاڑنے والے جہاں بھی گئے ان کو للکارا ان کے خلاف تقریریں کیں، مضامین لکھے، مناظرے کئے اور تمام متنازع فیہ مسائل کو علم واستدلال کی روشنی میں حق کو اتنا واضح کر دیا کہ ہندوستان کا سواد اعظم جس کو قدرت نے ذرا بھی علم دیا تھا سچائی کو پا گیا اور اس نے بدعات وخرافات سے توبہ کر لی، احقاق حق اور ابطال باطل کا کوئی دقیقہ آپ نے نہیں چھوڑا، دس برسوں کی انتھک جد وجہد کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب جو لوگ اپنے آباء واجداد کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں وہ حق کی روشنی کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اس کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تب آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مناظروں کی ضرورت نہیں، اب اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اب جو لوگ بدعات وخرافات سے چمٹے ہوئے ہیں اس کو گناہ سمجھتے ہوئے چمٹے ہوئے ہیں ایسے لوگوں کی اصلاح اب انتہائی دشوار ہو چکی ہے۔

اب آپ نے طے کیا کہ مثبت انداز میں دین کی خدمت ہی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، بدعت پسندوں کی جماعت ایک فرقہ اور ایک پارٹی بن چکی ہے حق اور

ناحق کی تمیز کئے بغیر اپنے فرقہ یا پارٹی کی حمایت کرتی ہے اسی کو شریعت کی اصطلاح میں عقیدت جاہلیہ کہتے ہیں مناظروں کی یہ ہنگامہ آرائیاں دوسری جنگ عظیم کی ابتداء ۱۹۴۹ء تک رہیں پھر بدریج ان میں کمی آتی چلی گئی بالآخر ایک دم بند ہو گئیں۔

## دوسرا دور:

کچھ کم وبیش دس سال مولانا نعمانی نے احقاق حق وابطال باطل میں مجاہدانہ عزم وثبات مولفانہ ایمان ویقین، قلندرانہ جرأت وہمت کے ساتھ خدمات انجام دیں اور حق کی آواز شہروں اور قصبوں سے لے کر گاؤں اور دور دراز دیہاتوں تک پہنچا دی، اب مسلمانوں کا ہر طبقہ سمجھ گیا کہ حق کیا ہے صداقت کیا ہے؟ بدعات وخرافات کیا ہے؟ اسلام کے تقاضے اور دین وشریعت کا ہم سے مطالبہ کیا ہے اور صحیح دین کیا ہے؟ اتمام حجت کردی گئی، اب جو لوگ باطل عقائد اور مشرکانہ رسم ورواج میں گرفتار رہے ان کو بھی یہ علم ہو گیا کہ ہندوستان کے جلیل القدر علماء ہمارے طرز عمل کو دین وشریعت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن علماء سوء اور بریلوی مکتب فکر کے علماء بھٹکے ہوئے مسلمانوں کی غلط روش کو صحیح بتانے کی وجہ سے وہ بدعات وخرافات میں گرفتار رہے، مولانا نعمانی کی اس دس سالہ جدو جہد اور اعلان حق کے بعد اب لاعلمی یا جہالت کی تاریکی دین وشریعت کے خلاف راہ اختیار کرنے کا بہانہ نہیں رہ گئی، اب ان کی گمراہی دانستہ اور خود اختیاری اور باطل کو باطل سمجھ کر تھی، دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ مولانا مرحوم تاحد امکانی ادا کر چکے تھے اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے روز وروشن کی طرح واضح ہو چکا ہے اب باطل پر اصرار ضد کے نتیجہ میں تھا اس لئے اب ہر جدو جہد رائیگاں تھی، آپ نے مناظروں کی راہ ترک کردی اور خدمتِ دین کی دوسری راہوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔

## جماعت اسلامی کی تشکیل:

اس غور وفکر کے دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو کبھی جمعیۃ علماء ہند کے اخبار

میں کام کرتے تھے اب انہوں نے اپنا ایک رسالہ حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے نام سے جاری کر رکھا تھا مولانا نعمانی اس کی ابتدائی اشاعت سے اس کا مطالعہ کر رہے تھے اب بھی ترجمان القرآن پابندی سے دیکھتے اور پڑھتے تھے اس میں اقامت دین، حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب کی جو دعوت دی جارہی تھی، بتدریج آپ اس سے متاثر ہوتے رہے، یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد یہ دعوت آپ کے دل کی آواز بن گئی، دل جذبات سے سرشار ایثار وقربانی آپ کی فطرت آپ کا مزاج، دین وملت کی خدمت کے لئے سوز وگداز سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے اثر پذیری اس کا ایک عنصر تھا، مولانا نعمانی مودودی صاحب کی تحریروں سے اس قدر متأثر ہوئے کہ دل ان کی اقامت دین اور اسلامی انقلاب کی دعوت سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا، دل کی تڑپ بڑھتی چلی گئی اور آپ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دین کی خدمت کا اس سے بہتر طریقہ موجودہ دور میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء شروع ہو چکی تھی بین الاقوامی صورتِ حال بدلتی جا رہی تھی اب ہر ہندوستانی محسوس کرنے لگا تھا کہ ملک کو آزاد ہونا ہے، انگریزوں کی حکومت کا آفتاب بہت جلد غروب ہونے والا ہے سیاستدان اور ہر طبقہ کے مفکرین اور ماہرین ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے، سیاسی پارٹیوں کے خیموں میں مستقبل کے نقشے بنائے جانے لگے تھے، خاکے تیار کئے جارہے تھے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سب سے زیادہ فکرمند مسلمان تھے، ہندو اپنی اکثریت اور سیاسی بالادستی کی وجہ سے مطمئن تھے کہ ملک میں جو بھی نظام حکومت قائم ہوگا بہر حال ان کو بالادستی حاصل ہوگی مسلمان اقلیت میں تھے، اس لئے وہ تشویش میں مبتلا تھے کہ اگر انگریز ہندوستان سے اپنا بوریا بستر اٹھا لیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے تو ایسا تو نہیں کہ مسلمان اکثریت کا غلام ہو جائے جب کہ آزادی کی راہ میں ان کی قربانیاں دوسروں سے کسی طرح کم نہیں تھیں، لیکن ان کے سامنے کوئی فارمولہ، کوئی منصوبہ، اور نظام حکومت کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔

مودودی صاحب نے خالص اسلامی اصطلاحات میں اسلامی انقلاب کی جب دعوت دی اور اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں جس لب ولہجہ میں اپنا خاکہ پیش کیا وہ ایسا دل کش اور اسلامی روح ومزاج کے موفق تھا کہ جولوگ مودودی صاحب سے براہ راست متعارف نہیں تھے ان کو غائبانہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسا عالم دین، مفکر اسلام اور زہد وتقدس کے بلند مقام پر فائز سمجھتے تھے وہ عہد حاضر کے جمال الدین افغانی اور ادریس السنوسی کی طرح مراہب فی اللیل ومجاہد فی النہار تصور کرتے تھے، مولانا نعمانی بھی انہیں لوگوں میں سے تھے، دل کی تڑپ اتنی بڑھی کہ مودودی صاحب کو خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر جلد ہی دہلی آمد کے موقعہ پر مولانا نعمانی کی ان سے ملاقات بھی ہوگئی، انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان کلین شیو، سر پر لمبے لمبے انگریزی بال دیدہ زیب لباس میں بہت ہی اسمارٹ جیسے ابھی ابھی کالج یا یونورسٹی سے ادب یا آرٹ پر لیکچر دیکر آرہے ہیں دین اور مسلمانوں کی شکل وصورت لباس، ذہن ومزاج کے لازمی نتائج کی ان پر پرچھائیں بھی نہیں پڑتی تھی، مولانا نعمانی کے دل کو انہیں اس کی شکل وصورت میں دیکھ کر دھکا ضرور لگا لیکن ان کی تحریروں سے دل اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس ناخوشگوار صورت حال نے بھی ان کو بدگمان نہیں ہونے دیا، اسے عملی بے اعتدالی یا تساہلی سمجھ کر تاویل کرلی اور یہ یقین کرلیا کہ جو دعوت وہ دے رہے ہیں، بالآخر ان کو دین کے صحیح سانچے میں ایک دن ڈھال دے گی، اور وہ صحیح معنی میں مفکر اسلام کے بلند منصب کے شایان شان اپنا طرز عمل بدل لیں گے، اور ہر ایک کے لئے قابل قبول اپنے کو ثابت کردیں گے۔

مودودی صاحب کے ذہن میں اب تک کسی تنظیم کا کوئی خاکہ نہیں تھا نہ جماعت بنانے کا کوئی ارادہ، کچھ ہی دنوں بعد جب ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کا اظہار کیا تو سب سے پہلے جس نے پوری صدق دلی اور پورے جوش وجذبے سے مودودی صاحب کا ساتھ دیا اور دست تعاون بڑھایا وہ مولانا نعمانی مرحوم تھے، جماعتِ اسلامی کی حمایت میں اپنے رسالہ الفرقان سے پورا پورا کام لیا اور

عوام تک بات پہنچانے اور علم واستدلال کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کی اہمیت وضرورت بتانے میں کلیدی رول ادا کیا اور اس کا حلقہ تعارف مولانا مرحوم ہی کی جدو جہد اور ایثار وقربانی کے طفیل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اپنی ذات سے آپ جماعتِ اسلامی کے نصب العین کے لئے ہر طرح کی قربانیوں کے لئے تیار ہو گئے حتی کہ جب مودودی صاحب نے دارالاسلام کی تجویز رکھی اور عملی اقدام کیا تو سب سے پہلے مولانا نعمانی ہی ہجرت کر کے دارالاسلام تشریف لے گئے، دماغ اور قلم مودودی صاحب کا تھا خاکہ وہ بناتے مگر اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی ساری ذمہ داری مولانا نعمانی نے از خود اپنے سر لے رکھی تھی، عوام وخواص کے ذہنی وفکری رجحانات کو جماعت کی طرف موڑنے میں مولانا مرحوم کی زبان اور ان کے قلم کی ساری توانائیاں وقف تھیں، یہ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی جرمنی کا بھوت انگریزوں پر ہی نہیں پورے یورپ، امریکہ اور روس کے سروں پر سوار تھا سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، ہندوستان کے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں نے موقعہ کو غنیمت جانا اور وہ آزادی کی تحریک کو تیز سے تیز تر کرنے میں مصروف ہو گئے، حکومت کی طرف سے رہنماؤں کی مسلسل گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا تحریک نے پوری کر دی، اس ہنگامہ خیز جنگ کے زمانہ میں اکابر علماء دیوبند سیاسی سرگرمیوں میں اس طرح مصروف تھے کہ کسی دوسری طرف نظر ڈالنے کی ان کو فرصت ہی نہیں تھی، اسی وجہ سے اکابر علماء میں سے کسی نے بھی جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے بلند بانگ دعووں کی جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، جماعت اسلامی کی حمایت ومخالفت دونوں میں سے کوئی چیز نہیں تھی مولانا نعمانی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور جب مولانا ابوالحسن ندوی ان کے رفیق کار ہو گئے تو ان کو اور بھی تقویت ملی اس طرح جماعت اسلامی کو پروان چڑھانے میں مولانا نعمانی نے اہم ترین رول ادا کیا اور وہ بتدریج عوامی جماعت بنتی چلی گئی۔

## شک کا کانٹا:

مگر کچھ عرصہ بعد آپ کو احساس ہوا کہ جو راہ منتخب کی گئی ہے وہ کعبہ کے بجائے ترکستان کو جا رہی ہے، مودودی صاحب کے بیانات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور بتدریج بلند بانگ دعوے کرتے جا رہے تھے، ان کا خارا شگاف قلم اپنا جوہر دکھانے میں برابر مصروف رہا، اسلاف امت پر ان کی تنقید لب ولہجہ انتہائی جارحانہ ہوتا جا رہا تھا، پوری امت اسلامیہ کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تین چوتھائی قرآن کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی، اسلاف کے سارے کارناموں میں شک وارتیاب کے کانٹے چبھونے کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا نعمانی نے ان کے قلم کو لگام دینے کی جدو جہد کا آغاز کیا اور امیر کارواں کے رخ کو غلط سمت میں جانے سے روکنے اور موڑنے کی دیانت داری کے ساتھ پوری کوشش کی لیکن جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو آپ نے سفر روک دیا اور ٹھہر کر صورت حال پر غور کرنا شروع کیا تو آپ کو بہت جلد یقین ہو گیا کہ اقامت دین، حکومتِ الہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کا ایک مستقل فرقہ بنانے کی جدوجہد کی جارہی ہے جس میں بہت سے بنیادی عقائد سے بھی انحراف کا قوی اندیشہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ چل کر یہ جماعت ہدایت کے بجائے ضلالت کی دل دل میں نہ گرفتار ہو جائے۔

## علیحدگی کا فیصلہ:

اسی دوران مودودی صاحب کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں شائع ہو گئی، جس کو پڑھ کر مولانا نعمانی کا شبہہ یقین میں بدل گیا کہ جماعت اسلامی در حقیقت مسلمانوں میں ایک گمراہ فرقہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

مودودی صاحب نے اس کتاب میں دعویٰ کیا کہ عہد نبوت میں الہ، رب

عبادۃ، دین کی اصطلاحیں رائج تھیں نزول قرآن کے وقت عوام وخواص ان کے صحیح اور حقیقی مفہوم کو سمجھتے تھے، لیکن اس کے بعد ان اصطلاحوں کے مفہوم بدلتے چلے گئے حتی کہ ان کی حقیقتیں مستور ہو گئیں اور پوری امت اسلامیہ عہد رسالت کے بعد کے علماء کی بیان کردہ تشریحات ہی کو ان اصطلاحات کا حاصل سمجھنے لگی، جو عہد رسالت کے مفہوم سے قطعاً جدا گانہ چیز تھی بعد کے علماء نے ان اصطلاحوں کو مفہوم کو یا تو غلط سمجھا یا ناقص سمجھا اسی وجہ سے تین چوتھائی قرآن کے معانی ومفاہیم کو دنیائے اسلام کے علماء نے نہیں سمجھا، مودودی صاحب کے اس دعوی کا تاثر کیا ہوا؟ مولانا نعمانی کے الفاظ ہیں۔

''واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد قرآن کی ساری تعلیم بلکہ دین غیر مستند اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے، جب الہٰ، رب، عبادت اور دین جیسے الفاظ جو قرآن پاک میں یقیناً سیکڑوں جگہ آئے ہیں اور اس کے کم ہی صفحات ایسے ہوں گے جو ان الفاظ سے خالی ہوں اور قرآنی دعوت وتعلیم میں جن کی وہ بنیادی اہمیت ہے یقیناً دوسرے لفظ نہیں جب ان کے متعلق مان لیا جائے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد امت مسلمہ صدیوں سے ان کا جو مفہوم ومدعا سمجھتی رہی وہ صحیح نہیں ہے، غلط ہے، یا ناقص ہے اور اس کی وجہ سے دعوت توحید سے متعلق قرآنی آیات اور کلمہ لا الہٰ الا اللہ کا مطلب ومدعا بھی غلط سمجھا جاتا رہا ہے تو پھر قرآن کی کسی آیت اور اس کے کسی کلمہ کے متعلق بھی اطمینان کی گنجائش نہیں رہی، کہ ان کا وہی مطلب ومدعا ہے جو اب تک جمہور امت سمجھتی رہی ہے اس کے بعد ملحدین کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے کہ وہ لغت کی کتابوں وغیرہ کا سہارا لے کر زبان وقلم کے زور سے سارے دین کو بدل کر رکھ دیں'' (مولانا مودودی کے ساتھ میری سرگذشت ص ۸۴)

مولانا نعمانی کا یہ تاثر الفاظ کے پردوں میں چھپے ہوئے ان جراثیم کی وجہ سے تھا جو داعیانہ لب ولہجہ کے ریشمی غلافوں پر رینگ رہے تھے، لاعلمی اور جہالت کا الزام

پوری امت اسلامیہ پر تھا عہد رسالت کے بعد کے تمام محدثین، فقہاء، تابعین، تبع تابعین، علماء، محققین، شارحین حدیث اور مفسرین قرآن پر اس کی زد پڑتی ہے وہ خود غلط فہمی کا شکار تھے اور چودہ سو برسوں سے پوری امت کو غلط فہمی کا شکار بنائے رکھا، عالم اسلام کا سارا علمی سرمایہ نا قابلِ اعتبار غلط فہمیوں کا شاہکار، خس وخاشاک کا انبار ہو گیا، تین چوتھائی قرآن کو سمجھ نہ سکے اور تفسیروں کے انبار لگا دیئے مودودی صاحب کے اس دعوے کی روشنی میں تمام تفسیریں دریا برد کر دینے کے لائق، تمام مفسرین گردن زدنی ہو گئے کہ انہوں نے قرآن کی وہ تفسیر نہیں کی جو نزول کے وقت سمجھی جاتی تھی۔

سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے پوری امت کی اس غلطی کو دریافت کیا جس کو دریافت کرنے سے چودہ سو سالوں کے ذہین ترین علماء اور محققین بھی عاجز رہ گئے، کیا الہام ہوا؟ کیا کوئی وحی آ گئی یا کم از کم نزول قرآن کے وقت جو صحابہ کرام موجود تھے جو ان قرآنی اصطلاحات کے حقیقی مفہوم و معنی کو سمجھتے تھے انہوں نے ان اصطلاحات کی تشریح میں کوئی کتاب لکھی تھی جو اتفاق سے مودودی صاحب کے ہاتھ لگ گئی تب اس غلطی کا احساس ہوا؟۔

مولانا نعمانی نے جب مودودی صاحب کی یہ بلند پروازی اور یہ جسارت دیکھی تو ان کے دل کو سخت چوٹ لگی، انہوں نے یقین کر لیا کہ مودودی صاحب اسلام کی خدمت کے بجائے اسلام کی بنیاد کھودنے کی تیاری کر رہے ہیں اور امت کو گمراہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں، مولانا نعمانی تو جماعت اسلامی کی تشکیل اور اس کو متحرک وفعال بنانے میں قربانیاں دے رہے تھے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں اگر میری زندگی بھی کام آ جائے تو اس کو اپنی سعادت سمجھوں گا، اقامت دین کا یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ انہوں نے اپنے اساتذہ علماء دیوبند اور اکابر امت سے بھی اس سلسلہ میں استصواب نہیں کیا اور نہ ان کے مشوروں کا انتظار کیا صرف اپنے دلی جذبے سے بیتاب ہو کر ہر طرح کی قربانیوں کے لئے تیار ہو گئے تھے اب جو دل ودماغ کو شدید چوٹ پہنچی تو آپ نے اسی دن فیصلہ کر لیا کہ جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر لوں گا،

مودودی صاحب کو امیر کارواں بنا کر غلط راہ پر پڑ گیا، وہیں سے آپ الٹے پاؤں واپس ہو گئے بلا جھجک اور بلا خوف لومۃ لائم آپ نے اپنی غلط فہمیوں کا اعتراف کر لیا اور اپنی غلطی کے اعلان کے لئے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں جماعت اسلامی سے علیحدگی کی پوری داستان دوسو صفحات پر مشتمل ایک کتاب میں لکھ دی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

میں جب ''اسماء الرجال'' لکھ رہا تھا تو دوران مطالعہ بعض محدثین کا یہ بیان نظر سے گذرا کہ ہم جب کسی سے حدیث کے سماع کے لئے جاتے ہیں تو کچھ دن ٹھہر کر پہلے اس کی نماز دیکھتے ہیں اور روز وشب کی مصروفیات کا کچھ اندازہ کرتے ہیں اگر وہ شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہیں تب ہم ان سے حدیثیں لیتے ہیں ورنہ واپس ہو جاتے ہیں، بعض محدثین تو ظاہری شکل وصورت اور وضع قطع پر بھی نظر رکھتے تھے اگر ذرا بھی خلاف سنت کچھ نظر آیا تو الٹے پاؤں واپس ہو جاتے تھے اور اس کی حدیث نہیں لیتے تھے ایک محدث سفر پر گئے اور جب واپس ہوئے تو ان کے رفقاء نے ان سے پوچھا کہ آپ کوفہ گئے تھے جابر جعفی سے حدیث نہیں لکھی؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں جابر جعفی کے یہاں گیا تھا لیکن میں نے دیکھا **کان طویل اللحیة فرجعت** میں نے دیکھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے اس لئے واپس ہو گیا۔

محدثین کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ دین انھیں لوگوں سے لیا جائے جو خود بھی دین کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں، اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی زبان یا ان کے قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہ الفاظ کی جادوگری اور انداز بیان کی ساحری ہے اس کی پس پشت حقیقت اور صداقت کچھ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ حدیث وقرآن کی تعلیم جس نے مستند علماء سے حاصل نہ کی ہو، قرآن وحدیث کو اہل لغت اور جاہلی شعراء کے حوالے سے نہ سمجھا ہو، تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے افراد کسی نہ کسی منزل پر

بھٹک جاتے ہیں اپنے ساتھ دوسروں کی بھی عاقبت خراب کرتے ہیں اگر کسی نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے غیر دینی ماحول میں زندگی گذاری ہو اور بعد میں دین کی طرف میلان ہوا اور اپنے مطالعہ سے دین کو سمجھا اور سیکھا اگر قدرت نے زبان وقلم سے کام لینے کی اس میں صلاحیت رکھ دی ہے تو آغاز کار میں وہ محتاط قدم اٹھاتا ہے اگر عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی یا اس کا کوئی اپنا حلقہ اثر بن گیا تو بالعموم ایسے لوگ دین کے صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں سوائے اس کے کہ اس کی زمام فکر کسی ایسے محقق متدین عالم کے ہاتھوں میں ہو جس کو رسوخ فی العلم حاصل ہو، ماضی قریب میں اس کی کئی ایک مثالیں نگاہوں کے سامنے ہیں اگر دینی حلقوں کے لوگوں نے ان کو اپنا رہنما بنالیا تو ہمیشہ تلخ نتیجہ نکلتا ہے۔

مولانا نعمانی شدت دین پسندی اسلام کے تحفظ وبقاء کے جذبے سے سرشار ہونے کی وجہ سے مودودی صاحب کے حلقہ میں آ گئے اور آپ کی زندگی کے چند بیش قیمت سال ضائع ہو گئے جس کا مولانا موصوف کو ہمیشہ افسوس رہا۔

## خدمت دین کی نئی راہیں:

انتہائی دلی صدمہ اور روحانی کرب جھیل کر آپ نے بعجلت تمام جماعت اسلامی سے قطع تعلق کرلیا، دین میں ایک نئے فرقہ کے وجود میں آنے اور دین میں تحریف کی جسارت کرنے والوں کو آپ کی ذات سے سہارا ملا اس سے آپ کو جو ذہنی اذیت پہنچی اس کی تلافی کے لئے سب سے پہلے انابت الی اللہ اور اعلان براءت کر کے صدق دلی سے توبہ کی اور مستقبل کے لئے ایک نیا لائحہ عمل اختیار کیا۔

مولانا نعمانی اس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متأثر تھے آپ نے ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی حضرت رائے پوری نے بیعت کے بعد آپ کو بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی طرف رجوع کرنے اور ان کی خدمت میں حاضری کے لئے

تاکید فرمائی، شاید اس میں راز یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے تعلق سے جو روحانی کرب اور دینی وفکری زخم لگے ہیں ان زخموں کا مداوا اس طرح ہو جائے گا، مولانا نعمانی پہلی فرصت میں بستی نظام الدین دہلی اس وقت حاضر ہوئے جب مولانا الیاس صاحب بستر علالت پر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے انہوں نے اس حالت میں بھی مولانا نعمانی کا کھڑے ہو کر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں انشاء اللہ اس بیماری سے اچھا ہو جاؤں گا اور مولانا نعمانی سے وعدہ لیا کہ کچھ وقت جماعت میں لگائیں گے، آپ نے وعدہ کر لیا، قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید سچ مچ مولانا الیاس صاحب اس تشویشناک بیماری سے صحت یاب ہو گئے، مولانا نعمانی پہلی بار ان کے ساتھ موات کے سفر میں گئے پھر کچھ دنوں بعد مولانا کاندھلوی نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ کا سفر کیا اس جماعت شریک ہونے کے لئے مولانا نعمانی بریلی سے لکھنؤ پہنچے اور ان کے ساتھ رہ کر پوری دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت کے کاموں اور اصولوں کو دیکھا اور اس کے طریقہ کار کا گہرا مطالعہ کیا جب دل اس طریقہ کار کی افادیت پر مطمئن ہو گیا تو پوری بصیرت اور انشراح قلب کے ساتھ بقیہ زندگی دعوت وتبلیغ کے لئے وقف کر دی اور اپنے رسالہ الفرقان کو دعوت وتبلیغ کے لئے خاص کر لیا آپ نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی مقدس راہ میں صرف کرتے رہے یہاں تک کہ آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

## مولانا نعمانی کی مومنانہ فراست:

مولانا نعمانی کا دل داعیانہ جذبات کا امین اور متکلمانہ اوصاف سے متصف تھا، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے اپنے اپنے حلقے ہیں اور پھر مسلمانوں میں مختلف الخیال درجنوں فرقے اور گروہ ہیں ایسے ماحول میں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ باقی رکھنا دین کا درد رکھنے والے ہر عالم دین کا فریضہ ہے زمانہ کی نبض پر ان کی انگلیاں رکھے رہنا ضروری ہے اگر بروقت علماء حق نے تیقظ

و بیداری کا ثبوت نہیں دیا تو بہت ممکن ہے اسلام نئے فتنوں کا شکار ہو جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ذہنی وفکری اعتبار سے غلط راہوں پر چل پڑے گا۔

ماضی قریب میں ایران کے اندر خمینی اور ان کے ہم نواؤں نے رضا شاہ پہلوی کی خاندانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اس کو تہس نہس کر کے عوامی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، حکومت کی اس تبدیلی کو خمینی نے اسلامی انقلاب کا نام دیا حالانکہ ایران کی حکومت ایک شیعہ خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے شیعوں کے ہاتھوں میں آئی تھی، دونوں ایک سرزمین میں رہنے والے، اس کے آب ودانہ پر پرورش پانے والے، دونوں شیعی مسلک کے پابند اور وفادار، دونوں اپنے مسلک میں متشدد، دونوں ایک ذہن ومزاج اور ایک عقیدہ ومسلک کے ماننے والے، پھر ایک کے ہاتھ سے دوسرے نے حکومت چھین لی ایک شیعہ حکمراں گیا دوسرا شیعہ حکمراں آیا پھر یہ اسلامی انقلاب ہو گیا؟ شد ومد کے ساتھ اس کا پروپیگنڈہ کیوں کیا گیا؟ اس میں ایک گہری اور دوررس سازش تھی، جس کی تہ تک آسانی سے پہنچنا مشکل تھا، خمینی اور ان کے ہم نواؤں کے ذہن میں کچھ خفیہ مقاصد تھے، جس کو بہت دیر میں سمجھا گیا، اسی وجہ سے امام خمینی اور ان کے ہم نواؤں نے اس تبدیلی حکومت کو ''اسلامی انقلاب'' کا نام دے کر اتنے بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا کہ ایران تو ایران خود ہندوستان میں اچھے خاصے پڑھے لکھے، اچھے مصنف اور اہل قلم، اچھے واعظ اور مقرر شیعہ نہیں، اہل سنت والجماعۃ کا ایک مقتدر طبقہ سازش کا شکار ہو گیا اور اس کو اسلامی انقلاب کہہ کر اس نئی حکومت کے ہر اقدام کو اسلام کی بالا دستی کا نام دیکر اس کی ہم نوائی کرنے لگے، ایسے کئی اہل علم کے نام میرے ذہن میں ہیں جن کا تعلق جماعت دیوبند سے تھا، انھوں نے اس شیعہ حکومت کی ہندوستان میں تائید وحمایت ہی نہیں کی بلکہ عالمی پیمانے پر اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا، اور شیعہ سنی مکمل اتحاد کا مشورہ دینے لگے حکومت کے اقدامات پر اس کو مبارکباد دینے لگے، نئی شیعی حکومت نے ہندستان کے بہت سے علماء اہل سنت والجماعۃ اور ممتاز افراد کو دعوت دے کر ایران کی سیر

وسیاست کے لئے مدعو کیا اور ایسے مناظر دکھائے کہ وہ واپس آ کر ایران کے اسلامی انقلاب کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگے، فضا ایسی بن گئی جیسے سچ مچ ایران سے اسلامی انقلاب کا آغاز ہو کر سارے عالم میں برپا ہو جائے گا، کسی نے خمینی کے عقائد وخیالات اور جذبات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

خمینی صاحب کا ایران کی حکومت پر قبضہ کو اسلامی انقلاب کا نام دینے کا واحد مقصد امت اسلامیہ کے سواد اعظم اہل سنت والجماعۃ کے دلوں میں رافضیوں اور شیعوں سے متعلق ایک نرم گوشہ پیدا کرنے کی ایک خفیہ سازش تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اب تک امت کا سواد اعظم شیعوں اور رافضیوں سے انتہائی دوری رکھتا ہے وہ چاہتے تھے کہ یہ دوری اور علیحدگی ختم ہوتا کہ امت کے سواد اعظم میں گھس کر شیعیت کا فروغ دینے کا ایک چور راستہ تلاش کرلیا جائے اس مقصد میں جزوی طور پر کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئے جیسا کہ افریقہ سے ایک ہندوستانی عالم نے ہندوستانی خبریں بھیجیں انہوں نے بتایا کہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران کے کچھ نمائندے یہاں آئے اور انہوں نے یہاں شیعی سنی اتحاد کے لئے ایک تنظیم قائم کی اور پھر بتدریج اس تنظیم کے ذریعہ انہوں نے شیعیت کے فروغ کی کوشش جاری رکھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری تنظیم اور اس کا حلقہ اثر پورا کا پورا شیعہ ہو گیا جبکہ وہ سب کے سب اہل سنت والجماعۃ کے لوگ تھے، سب نے اجتماعی طور پر شیعیت قبول کر لی۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اس فتنہ کے دوررس تنائج کو پہلے ہی مرحلہ پر سمجھ گئے اور انہوں نے اسی موضوع پر ایک معرکہ الآرا مدلل ومستند کتاب لکھ کر امام خمینی کی تحریروں سے ان کی اندرونی سازشوں کو بے نقاب کر دیا، اس کتاب نے ہندوستان کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی کی، ذہن ومزاج اور غور وفکر کے رخ کو بدل کر رکھ دیا، کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر جہاں یہ چاہا کہ ہندوستان کے مسلمان اس سازش کو سمجھ کر ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنے اور ماننے کی غلطی سے بچ جائیں

وہیں آپ کی خواہش تھی کہ عالم اسلام کے علماء کو بھی اس حقیقت سے آشنا کر دیا جائے اور کتاب کا عربی ترجمہ کر کے اسلامی ممالک کے علماء تک پہنچا دیا جائے لیکن قانونی پابندیوں سے مجبور ہو گئے لیکن اس کتاب کا پورے ملک پر اثر ہوا اور جو اہل علم اس دام فریب کے شکار تھے وہ بہت جلد سنبھل گئے اور ان کو اپنی غلطی کا بہت جلد احساس ہو گیا، بعد کے حالات نے مولانا نعمانی کے موقف کی حرف بحرف تائید کر دی، اس کے بعد آپ نے ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے ممتاز علماء شیعوں اور رافضیوں سے متعلق ایک متفقہ فتویٰ شائع کر کے حجت تمام کر دی۔

## تصانیف:

مولانی نعمانی نے دین کی خدمت کی جو راہ اختیار کی اس میں زبان وقلم دونوں سے ہمیشہ کام لیا، دس سالہ مناظروں کے دور میں آپ نے الفرقان رسالہ محض اسی خیال سے جاری کیا تھا مختلف فیہ مسائل پر مدلل اور بصیرت افروز مضامین شائع کئے جائیں گے، چنانچہ اس دور کے الفرقان میں اس عہد کے تمام مسائل پر سیر حاصل اور اطمینان بخش بحثیں مولانا موصوف کے قلم سے ملیں گی اور انہیں مسائل پر آپ نے درجنوں مستقل کتابیں بھی تحریر فرمائیں، اور سب اسی زمانہ میں شائع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور ان کے بہترین ثمرات ونتائج بھی برآمد ہوئے، الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر اپنے تحقیقی وتفصیلی مضامین کے لحاظ سے ایک مثالی نمبر تھا اتنی تفصیل وتحقیق حضرت مجدد الف ثانی کی زندگی اور ان کے کارناموں، اکبر کی بے راہ روی وگمراہی، ابوالفضل اور فیضی کے سیاہ کرتوتوں کی یکجا طور پر آپ کو سوائے الفرقان کے اور کہیں نہیں ملے گی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نمبر بھی اپنے مواد اور مضامین کے اعتبار سے ممتاز اور منفرد ثابت ہوا، مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی پر آپ کی کتاب علم وتحقیق کا شاہکار ہے بریلوی فرقہ کی پھیلائی ہوئی تہمت تراشیوں اور اتہام پردازیوں کی مدلل تردید اور شاہ صاحب کی اصلاحی تحریک کی اہمیت وعظمت کو تاریخی حقائق کی روشنی میں

پیش کیا گیا ہے، محمد بن عبدالوہاب کو بھی ایک بدنام مصلح کے طور پر ہندوستان میں بریلوی فرقہ نے پیش کیا مولانا موصوف کی کتاب نے غلط فہمیوں کی تردید کی اور بدگمانیوں کی ایک ایک تہ کو کھول کر سامنے پیش کر دیا ہے اور حقیقت قارئین کے سامنے آجاتی ہے، آخری دور میں خمینی اور اس کے نام نہاد اسلامی انقلاب پر مولانا ہی کی پہلی کتاب ہے جس نے حقائق سے پردہ اٹھایا جس کو پروپیگنڈے کی دبیز ریشمی چادروں میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، اور بہت سے اہل علم کی نگاہیں ظاہر کو دیکھ کر دھوکا کھا گئی تھیں، مولانا موصوف کی دقیقہ رس نگاہ نے تہ در تہ حقیقت کو پالیا اور اس کو علیٰ رؤس الاشہاد پیش کر کے مسلمانوں کو بہت بڑے فریب اور سازش سے بروقت متنبہ کر کے بچالیا۔

مولانا موصوف کی جماعت اسلامی سے وابستگی فکر و نظر کی ایک لغزش تھی، آپ نے ابتداء سے انتہاء تک کی کہانی جزئی تفصیلات کے ساتھ پیش کر کے صورتحال کو آئینہ کر دیا، اس کتاب کو پڑھ کر مولانا مرحوم کے اخلاص، دیانتداری، صداقت و دیانت کے اس بلند مقام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو خدا کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا اور آپ کی دینی خدمت کے بے پناہ جذبات کا یقین ہو جاتا ہے، آپ نے بلا خوف لومۃ لائم پوست کندہ حالات، ہر بات کو واضح لفظوں میں بیان کر کے علماء اسلام کی حق پرستی کی روایت کو روشن اور تابناک بنایا۔

زندگی کے اخیر دور میں جب آپ نے دین کی اشاعت اور دعوت و تبلیغ کے لئے اپنی ذات کو وقف کر دیا تھا اس دور میں آپ نے کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کرائیں ''اسلام کیا ہے؟'' ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟'' دین و شریعت'' جیسی کتابیں جو بلاتکلف جو ہر متلاشی حق غیر مسلم کے ہاتھ میں دی جاسکتی ہیں ان کتابوں میں اسلام کو بہت ہی سادہ لفظوں میں پیش کیا گیا ہے کہ ہر انصاف پسند انسانیت دوست غیر مسلم کے دل میں اسلام کی عظمت و صداقت جاگزیں ہوسکتی ہے۔ آپ کی ایک اہم ترین کتاب ''معارف الحدیث'' ہے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کتاب میں احادیثِ نبوی کی ایسے دلنشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے کہ دل

اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے چونکہ مولانا کو علم حدیث سے گہری مناسبت تھی، آپ کا مطالعہ وسیع تھا، حدیث آپ نے علامہ انور شاہ کشمیری سے پڑھی تھی اس لئے فہم حدیث کا ذوق اور مزاج بن گیا تھا ایک بار تو جب ندوۃ العلماء میں اس کے شیخ الحدیث شاہ حلیم عطار کی جگہ خالی ہوئی تو ارباب ندوۃ نے اصرار کر کے آپ کو بخاری ومسلم کا درس دینے پر مجبور کیا آپ نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے ایک کتاب مسلم شریف کا درس اپنے ذمہ لے لیا اور تقریباً دو سال آپ نے اس کا درس دیا تھا حدیث سے اتنی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے معارف الحدیث ایک قابل قدر تصنیف بن گئی ہے ان کے علاوہ کئی درجن کتابیں مختلف موضوعات پر آپ کے قلم سے نکلیں، بعض بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے جو کتابوں کی مقبولت کی دلیل ہے باطل فرقوں کے سلسلہ میں آپ کا قلم ہمیشہ خارا شگاف ثابت ہوا ہے اس کی شہادت کے لئے مختلف فرقوں سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے رسالے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

## سیاسی مسلک:

مولانا سیاست سے عملاً دور رہے لیکن ذہنی وفکری اعتبار سے وہ جمعیۃ علماء سے وابستہ تھے اور جمعیۃ کے اکابر سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے اسی تعلق کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں انہوں نے جمعیۃ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ایک تاریخی اور مثالی کردار ادا کیا جمعیۃ علماء سے ہمارے بعض اکابر خوش نہیں تھے کہ وہ کانگریس کی حمایت کر رہی ہے انہیں بزرگوں میں حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ بھی تھے مولانا نعمانی نے ان کو جمعیۃ سے قریب کرنے کے لئے ایک بڑا ہی جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

۱۹۳۷ء میں صوبوں میں محدود اختیارات کی کانگریس حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اس کی وجہ سے اب پورے ملک کو یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان مستقبل قریب میں آزاد ہو کر رہے گا اب ہندوستان کی آزادی کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جمعیۃ علماء کے مفکرین کو اندیشہ تھا کہ ہندوستان میں حکومت جمہوری ہوگی، زمام حکومت کانگریس

والوں کے ہاتھ میں ہوگی، مسلمانوں کے مسائل کا تعلق انہیں کانگریس رہنماؤں سے ہوگا جو اس وقت حکومت کی کرسیوں پر بیٹھے ہونگے مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے ان کے نمائندوں کی تعداد بھی بہت محدود ہوگی اس لئے کوئی ایسا نظام مرتب کیا جائے کہ جس کی وجہ سے ہم کانگریس پر اثر انداز ہوسکیں اور ان سے طاقت کے بل پر مسلمانوں کے مسائل حل کرائیں اس کے لئے ایک خاکہ ''نظام ملت'' کے نام سے بنایا گیا اور طے یہ کیا گیا کہ اس کی عام ممبر سازی ہو اور تمام مسلمانوں کو ممبر بنایا جائے جو اس تنظیم کا ممبر ہو لازمی طور پر وہ کانگریس کا بھی ممبر ہو اور جمعیۃ سے بھی وابستہ رہے اس طرح جب ہم لاکھوں ممبروں کی طاقت اپنے ساتھ رکھیں گے تو کانگریسی حکومت پر پورے طور پر اثر انداز ہوسکیں گے ہمارے مسائل سے ان کو انحراف کی ہمت نہ ہوگی، مولانا نعمانی جمعیۃ کے اس فارمولہ کو لے کر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں گئے اور تفصیلی گفتگو کی حضرت تھانوی آپ کی گفتگو سے مطمئن ہوگئے اور فرمایا کہ تجویز بہتر ہے میرا دل اس کو قبول کرتا ہے آپ دوبارہ پھر ملیں تاکہ میں بھی کچھ سوچ لوں، مولانا دوبارہ حاضر خدمت ہوئے حضرت تھانوی نے انشراح قلب سے اس تجویز کو منظور کر لیا البتہ یہ فرمایا کہ میں اپنے کچھ آدمیوں کو ایک دن بلاؤں آپ ان کے سامنے بھی اسی تفصیل سے گفتگو کریں اور ان کو بھی ہم خیال بنالیں تو اس کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن جب تیسری بار مولانا موصوف ملے تو حضرت تھانوی کی مجلس میں تین بزرگ اور بھی تھے مولانا نعمانی نے ان کو بھی تفصیل سے خاکہ سمجھایا، اس کی افادیت بتائی مگر ان میں سے ایک بزرگ نے جو حضرت تھانوی سے بہت قریب تھے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور حضرت تھانوی سے بھی کہا کہ حضرت ابھی اس کا اعلان نہ فرمائیں، مولانا نعمانی بے نیل ومرام واپس آئے اور چند ہی دنوں بعد حضرت تھانوی کی طرف سے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان آگیا، مولانا نعمانی کی ساری جدوجہد رائیگاں چلی گئی، مولانا نعمانی نے سیاست سے ایک دم کنارہ کشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

## مقبولیت اور اعزاز واکرام:

مولانا نعمانی کی دینی خدمات کو پورے ملک میں حسن قبول حاصل ہوا، اکابر علماء ملت کا آپ کی ذات پر اعتماد بڑھتا چلا گیا، صف اول کے علماء کی مجلسوں میں آپ کو اعزاز واحترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا، اور موثر تنظیموں نے آپ کو اپنا رکن بنایا، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ ہمیشہ ملک کے مایۂ ناز اور ممتاز علماء پر مشتمل ہوتی رہی ہے اور ایسی ہی شخصیت کو منتخب کیا جاتا تھا جس کے علم وفضل، زہد وتقویٰ، تدبر وفراست اور اس کی دینی خدمات کی اہمیت کو پورا ملک تسلیم کر چکا ہو اور اس کی قومی وملی جدو جہد کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہو، تب اربابِ مجلس شوریٰ دارالعلوم اس شخصیت کو مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کرتی ہے، ۱۹۴۴ء میں جب مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر کے اس کا اعلان فرمادیا اور دعوت وتبلیغ کے مقدس مشن میں لگ گئے تھے تو ایک دن مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء ہند ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بتایا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے آپ کو اپنا رکن منتخب کرلیا ہے، انتخاب علماء دیوبند کا آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور آپ کے شاندار اور عظیم الشان دینی کارناموں کا عملی اعتراف تھا اس وقت سے لے کر تازندگی تقریباً ۵۳ سال تک مسلسل آپ مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور کئی اہم ترین مسائل میں نازک موڑ پر آپ نے دارالعلوم کی عزت ووقار کو چار چاند لگائے اور انتشار سے بچایا بعض موقوں پر تو آپ نے مثالی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عالم اسلام کے مسلمانوں کی تنظیم ''رابطہ عالم اسلامی'' کی بنیاد ۱۹۶۲ء میں پڑی جس کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں تھا، رابطہ کے قیام کے تیسرے سال ۱۹۶۴ء میں مولانا نعمانی کو بھی اس کا ممبر بنالیا گیا اس طرح ہندوستان کے دو مشہور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی اس کے رکن ہوگئے اس تعلق کی وجہ سے عالم اسلام کے مسائل سے آپ کو سابقہ پڑا اور قدرت کو آپ سے جو خدمت لینی تھی لی اور ہر سال حج

وعمرہ کی سعادت اس پر مزید انعام خداوندی تھا اسی لئے مولانا نعمانی کے حج اور عمروں کی صحیح تعداد بتانی بھی دشوار ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے عائلی وسماجی قوانین جن کو رائج اصطلاح میں ''مسلم پرسنل لا'' کہا جاتا ہے اس کی حفاظت وبقا کا مسئلہ آزادی کے بعد بڑی اہمیت کے ساتھ ابھرا اور مختلف طرح کے اندیشوں نے مسلمانوں کو گھیر لیا۔

اور کئی بار اس سلسلہ میں مسلمانوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جب بار بار اس راہ میں رکاوٹیں آئیں تو اکابر ملت نے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کی یہ تنظیم ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے نام سے بعد میں قائم ہوگئی اس تنظیم کے تاسیسی ارکان میں مولانا مرحوم کا اسم گرامی شامل ہے آپ اس تنظیم کے قائم کرنے والوں میں تھے، زندگی کے اخیر لمحات تک آپ اس کے رکن رہے۔

## زندگی کا آخری دور:

میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک پورے چار سال لکھنؤ میں رہا ہوں مولانا مرحوم کی دید وشنید حاصل ہوئی اور کبھی کبھی سلام ومصافحہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی بعض معاملوں میں ایک دو بار مولانا کے گھر پر بھی حاضری دی مولانا مجھ سے واقف نہیں تھے البتہ غائبانہ میرا نام جانتے تھے جیسا کہ مولانا محمد عارف صاحب سنبھلی مدظلہ نے بتایا کہ جب ہماری کتاب مولانا موصوف کو دی اور مصنف کا تعارف کرانا چاہا تو مولانا نے فرمایا کہ میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، غائبانہ تعارف کا واقعہ یہ ہوا کہ جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا تو ایک مشہور عالم نے اکبر کی گمراہی کا واحد ذمہ دار ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائیوں کو ثابت کیا، میں اس سے متفق نہیں تھا، میں نے ایک مضمون لکھا جس میں میں نے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ذمہ دار ملا عبدالقادر بدایونی، ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی کو بھی قرار دیا جو اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اور فیضی اور ابوالفضل کے جرم کو کچھ ہلکا دکھانے کی کوشش کی تھی

مضمون اشاعت کے لئے الفرقان کو بھیج دیا مولانا میرے مضمون سے متفق نہیں تھے لیکن الفرقان میں شائع کیا البتہ مضمون سے پہلے آٹھ صفحوں کا نوٹ لکھا، پھر اس کے بعد میرا مضمون اور پھر مضمون کے خاتمہ پر تین چار صفحوں کا استدراک، میرے مضمون کو دونوں طرف سے گھیر کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا، میں طالب علم مولانا عالم بے مثال کچھ کہنے کی میری جرأت کہاں؟ میرے لئے یہی کیا کم تھا کہ مولانا نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا، اسی مضمون کی وجہ سے مولانا مجھ سے غائبانہ واقف تھے مولانا سے بالمشافہہ ایک دو بار ملنے کے باوجود میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس ایک ارادتمند کی طرح کبھی کبھی سلام ومصافحہ کی سعادت حاصل کر لیا کرتا تھا البتہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں چار سالوں تک آپ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت ملی، میری قیام گاہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر مرکز کی مسجد تھی جس میں آپ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے دو رکعت نماز جو چند منٹوں میں ادا ہو جاتی تھی اس کا تاثر آج تک میرے دل میں موجود ہے مولانا پر خوف وخشیت الٰہی کا غلبہ تھا آپ کے خشوع وخضوع اور استغراق کا عالم دیدنی ہوتا تھا قرأت کرتے ہوئے آپ کی آواز شدت گریہ سے بھرا جاتی تھی، ترغیب وترہیب کی آیتوں پر ہچکیاں بندھ جاتیں تھرتھراتے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی زبان سے الفاظ قرآنی کی ادائیگی اور اس پر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آپ کی غمناک آواز ایسی کیفیت پیدا کرتی تھی کہ خود میری آنکھیں بھر آتی تھیں، طویل علالت کے باوجود دماغ برابر کام کرتا رہا یادداشت صحیح تھی بہت سی تحریریں جو بعد میں شائع ہوئیں اسی معذوری کے زمانہ میں املا کرائیں، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نعمانی زندگی کی آخری سانس تک دین کی خدمت پوری قوت ایمانی کے ساتھ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس مجبوری میں بھی جب اپنی ضرورتوں کے لئے بھی زبان کو جنبش دینی دشوار تھی دین وشریعت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے کام کرتے رہے۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء، اللّٰهم اغفر وارحم وانت خير الراحمين

# مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

## چند یادیں اور چند باتیں

ایک بزرگ، کشیدہ قامت، دبلے پتلے، رنگ صاف، روشن چہرہ سر اور ڈاڑھی کے بال ایک دم سفید، صاف شفاف سفید لباس میں ملبوس ایک کمرے میں تن تنہا بیٹھے ہوئے ہیں ان کی چاروں سمت عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل بکھرے ہوئے ہیں، ان کے ایک ہاتھ میں اسٹیل کی ایک چھوٹی سی قینچی ہے، سامنے ڈیسک پر ایک عربی رسالہ کھلا ہوا ہے اور انتہائی انہماک سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں، دوران مطالعہ کبھی کبھی وہ قینچی سے رسالہ میں سے آدھی انچ کی ایک چٹ کاٹ لیتے ہیں، ان کی داہنی جانب لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس ہے اس پر عربی کے حروف تہجی لکھے ہوئے ہیں، ان حروف کے نیچے ایک انچ کا لمبا سوراخ ہے، وہ چٹ کسی سوراخ میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح وہ تمام رسالوں اور اخباروں پر عمل جراحی یکے بعد دیگرے کرر ہے ہیں، برسوں سے ان کا یہ دلچسپ مشغلہ ہے۔

یہ بزرگ دار العلوم دیو بند کے شعبہ تکمیل ادب کے استاد، جدید عربی ادب اور عربی صحافت کے امام مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں جو جدید عربی کی تصنیف وتالیف میں مصروف ہیں لیکن اس تصنیف کا آغاز قلم کے بجائے قینچی سے کیا جار ہا ہے۔

کوئی بھی اہم منصوبہ اور شاندار کارنامہ جنون کی حدوں تک پہنچی ہوئی جدو جہد کے بغیر وجود میں نہیں آتا، دنیا کی دلچسپیوں سے صرف نظر کر کے مکمل یکسوئی اور انہماک ہی کامیابی کی کلید ہوتی ہے، قیس ریگستان میں ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے اور سر دھن رہا ہے لوگوں نے اس کو دیوانہ کہا چھیڑنے کے لئے پوچھا اس کڑی دھوپ میں کیا فضول کام کر رہے ہو؟

گفت ما مشق نام لیلیٰ می کنیم

کمال عشق کے لئے دیوانگی ضروری ہے کچھ ایسا ہی منظر مولانا کیرانوی کے انہماک کا ہے، برسہابرس کی شبانہ روز کی جاں گسل جدو جہد کے بعد جدید عربی کی تین لغتیں مرتب کیں جو ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی لغتیں ہیں، آج یہ لغتیں تمام مدارس اسلامیہ اور جدید علوم کی یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی کی لائبریریوں میں موجود ہیں ان کے بغیر جدید عربی صحافت کے میدان میں کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا، رہنما کے بغیر سفر کیسے ممکن ہے؟۔

ہندوستان میں جدید عربی ادب وصحافت کی اشاعت کا صرف ایک ہی مرکز تھا اور دارالعلوم دیوبند جس کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کی عظیم خدمات کی وجہ سے از ہر ہند کہا جاتا ہے، اس کا جدید عربی ادب وصحافت کی نشر واشاعت میں موئی قابل ذکر حصہ نہیں تھا، مولانا کیرانوی نے اس کمی کو محسوس کیا اور جب وہ دارالعلوم آئے تو انہوں نے جدید عربی ادب وصحافت کی ترویج کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا، اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں آپ نے ایک کتاب تین حصوں میں "القراءة الواضحه" کے نام سے لکھی لیکن قدیم طرز تدریس سے وہ غیر مطمئن تھے اس لئے انہوں نے ان تینوں حصوں کی الگ الگ "دلیل" بھی لکھ کر شائع کی تاکہ اساتذہ اسی انداز پر اس کتاب کو پڑھائیں، آج موصوف کی یہ کتاب اکثر مدارس اسلامیہ اور کئی یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی کے نصاب میں شامل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

مولانا کیرانوی قدرت کی عطا کردہ حیرتناک صلاحیتوں کا ایک دلنواز پیکر تھے، نیت کے سچے، دھن کے پکے، جدو جہد ان کا مزاج، اخلاص ان کا جوہر ذاتی دماغ اولوالعزمانہ منصوبوں اور اسکیموں کا خزانہ، اپنی ہر اسکیم اور ہر منصوبہ میں انتہاء پسند، آغاز وانجام میں ان کے نزدیک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہتا تھا، جس کام کا آغاز کرتے پوری دھوم دھام سے کرتے اور انجام تک پہنچ جانے کا حوصلہ رکھتے عملی جدو جہد کا کوئی

بھی خاکہ بناتے تو اس میں رنگ بھرنے میں پے در پے ناکامیاں بھی ان کا حوصلہ پست نہیں کرسکتی تھیں، ان کو نچلا بیٹھنا آتا ہی نہیں تھا وہ ایک سیماب صفت انسان تھے، انہیں جب احاطۂ دارالعلوم میں باریابی کا موقعہ ملا تو پہلے ہی مرحلہ پر انہوں نے سوچا کہ جدید عربی صحافت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، دارالعلوم کے طلبہ کی اس سے محرومی ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئی انہوں نے عزم بالجزم کرلیا کہ وہ اس سمت میں طلباء دارالعلوم کی مکمل رہنمائی کرکے ان کو منزل تک پہنچا کر رہیں گے اور انہوں نے کام کا آغاز کردیا، اس منصوبہ میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں تھا وہ تن تنہا اس مہم کو سر کرنے کے لئے چل پڑے اس مرحلہ پر ان کی سیمابی فطرت کا مظاہرہ ہوتا ہے انہوں نے طلبہ کی اصولی رہنمائی کرنے کے بعد سارا بار طلبہ پر ڈال دیا، وہ اپنے ذہن سے سوچیں، غور وفکر کی عادت ڈالیں اپنی فطری ذہانت سے پورا پورا کام لیں اور قدرتی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں الفاظ کو ذہن نشین کریں، عربی تعبیرات کو حافظہ میں محفوظ کریں، ادب کے ابتدائی درجات کے طلبہ میں ایک کو سائل اور دوسرے کو مجیب مقرر کرکے درس میں کھڑا کردیتے کہ وہ سبق کے سارے الفاظ اور ساری تعبیرات کو برجستہ زبانی سوال وجواب میں ظاہر کریں، منتہی طلبہ کو عنوان دیدیا کہ اس عنوان پر لکھ کر لائیں، ان کا وقت مقرر کردیا گیا جوں ہی وقت مقررہ ختم ہوگیا، کاپیاں ان کے ہاتھوں سے لے لی گئیں اگر کسی نے صرف ایک دوسطر لکھ کر چھوڑ دیا ہے، لاپرواہی کا ثبوت دیا ہے تو ان کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہوجاتا اور اس برہمی کی حالت میں جب اس کو عربی لب ولہجہ میں لتاڑتے تو یہ منظر قابل دید ہوتا، ایک تیز وتند آبشار کی طرح الفاظ ان کی زبان سے نکلتے اور اتنی روانی سے بولتے جیسے منہ زور سیلاب رواں دواں ہے، اس وقت جدید عربی میں مہارت اور عربی تعبیرات پر ان کی وسیع نگاہ اور مکمل واقفیت کا پتہ چلتا تھا، یہ ان کا طلبہ کے ساتھ رویہ تھا جنھوں نے اپنے ذہن پر زور نہیں ڈالا، سہل انگاری سے کام لیا اور جن طلبہ نے پورا مضمون لکھ دیا ہے ان کی کاپیاں جانچتے ہوئے توصیفی کلمات ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کہتے جاتے، اچھا

لکھا ہے لیکن یہ جملہ ایسے لکھ دو تو بہتر ہے، یہ جملہ بدل دو تو عبارت خوبصورت ہو جائے گی، تعریف کرتے جاتے الفاظ، جملے اور سطر کی سطر کٹتی جاتی، کوئی سطر ایسی نہیں بچتی جو نوک قلم سے مجروح نہ ہوئی ہو لیکن طالب علم کی توصیف وتحسین کا سلسلہ بھی جاری ہے تاکہ حوصلہ بلند رہے، وہ جانتے تھے کہ بیجا سختی، اور حوصلہ شکنی انسانی صلاحیتوں کے ابھرنے کی راہ میں کبھی کبھی سنگِ گراں بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انتہائی انہاک میں طلبہ پسینہ پسینہ ہو جاتے مگر تعمیل حکم میں غور وفکر کا کوئی پہلو سہل نگاری سے کام لے کر چھوڑتے نہیں تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی، غلطیاں تو عمر کے تقاضے کے زیر اثر ہوتی ہی ہیں لیکن ان غلطیوں پر ان کو ندامت اور شرمندگی نہیں ہوتی تھی، بس اتنا ہوتا کہ وہ سمجھتے کہ ذرا اور غور وفکر سے کام لیا ہوتا تو یہ غلطی سرزد نہ ہوتی اور مستقبل میں اور بھی غور وفکر سے کام لینے کا ان میں جذبہ پیدا ہوتا۔

اس لگن، محنت اور دل کی تڑپ کے ساتھ وہ طلبہ کو سکھاتے اور پڑھاتے ان کی عتاب آمیز شفقت طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی تھی ان کے اس طرز تعلیم وتدریس نے جادو کا کام کیا اور حیرتناک نتائج برآمد ہوئے، جس کو دنیا نے دیکھا ان کے طریقۂ تدریس کی مکمل افادیت کا ظہور اس وقت ہوا جب تکمیل ادب کا کورس پورا ہونے کے بعد ایک پوری ٹیم سامنے آئی جدید عربی صحافت کے میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے لگی۔

یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا اس مدت میں مولانا کیرانوی کے شاگردوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے ہندوستان اور پاکستان میں اپنے استاد کا نام روشن کیا، اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت میں چار چاند لگا دئے، آج وہ عربی اخبارات ومجلّات کے مدیر ہیں، کالم نگار ہیں، عربی کے بہترین فیچر لکھتے ہیں، فی البدیہہ تقریریں کرتے ہیں، اپنی مادری زبان سے بھی کہیں زیادہ روانی کے ساتھ وہ عربی میں مضامین لکھتے ہیں، مولانا کیرانوی کے تلامذہ آج ملک اور بیرونی ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جو اپنے

استاد کے ساتھ اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی سرخ روئی کا باعث اور اس کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

مولانا کیرانوی سیماب صفت انسان تھے، جدو جہد، تگ ودوان کے خمیر میں شامل تھی وہ جس طرف رخ کرتے تھے تو پورے عزم وارادہ اور اپنی فطری توانائیوں کے ساتھ کرتے تھے، پھر اس کام کے لئے اپنا پورا وجود وقف کر دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں انقلاب کے بعد نئے نظام میں ارباب مجلس شوریٰ نے ان کو معاون مہتمم بنا دیا، انہوں نے نہ اس کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نہ اس کے طالب تھے، یہ دارالعلوم کا عبوری دور تھا پورے نظام پر کنٹرول کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ تھا، ارباب شوریٰ کی نگاہ میں اس کام کے لئے مولانا کیرانوی سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی، ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو یہ عہدہ سونپ دیا گیا، اب ان کی ساری توانائیاں اسی محاذ پر صرف ہونے لگیں اور شب وروز نئے نظام کو مستحکم بنانے میں وہ مصروف ہو گئے اور اپنی ساری توانائیاں اس محاذ پر لگا دیں۔

دارالعلوم کی کئی قدیم عمارتیں انمل اور بے جوڑ سی لگتی تھیں، بلا وجہ گلیارا، اوپر جانے والے زینے غیر موزوں، چھتیں نیچی اونچی ان باتوں سے عمارت کا حسن مجروح ہوتا تھا اور کئی طرح کی زحمتیں تھیں، مولانا کیرانوی نے سب سے پہلے یہ پلان بنایا کہ ان عمارتوں میں جزوی تبدیلیاں کر دی جائیں تو یہ عمارت مناسب، موزوں اور دیدہ زیب ہو جائے گی، اسی طرح دارالاساتذہ کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی لیکن عملاً منصوبہ بند طریقے سے یہ کام نہیں ہوا، یہ ساری پلاننگ کرنے کے بعد مسئلہ سرمایہ کا پیدا ہوا انہوں نے پہلے ہی مرحلہ پر یہ فیصلہ کر لیا کہ دارالعلوم کے بجٹ پر اس کا بار نہیں ڈالا جائے گا، اس لئے انہوں نے ملک کے دورے کرنے شروع کر دیئے، مختلف مقامات کے سفر کئے ہر جگہ کامیابی ان کے قدم چومتی رہی، اور ہر سفر سے واپسی کے بعد وہ اتنا سرمایہ لے کر دارالعلوم واپس ہوتے تھے کہ تعمیری سلسلہ رکنے نہ پائے، اس دھن میں انہوں نے اپنی کمزور صحت اور بیماری کو بھی پس پشت ڈال دیا، سارا نقشہ

خود ان کا بنایا ہوا، ساری ترمیمات ان کے ذہن کی سوچی ہوئی، اس کے اخراجات کا بھی اندازہ انہیں کو تھا اس لئے اتنے سرمایہ کی فراہمی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی، اس تمام تگ ودو نے چند مہینوں میں ایسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا کہ ہر وارد وصادر حیرت زدہ رہ گیا، قدیم عمارتوں میں تمام پیوندکاریوں کے باوجود کہیں سے یہ پتہ نہ چلتا کہ قدیم عمارت میں کہیں پیوند کاری کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس تمام عمارتوں کے تناسب اور موزونیت میں ایک نئی طرح کا حسن پیدا ہو گیا، دارالعلوم کا نظم ونسق ایسا چاق وچوبند ہو گیا کہ اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اساتذہ اپنی درسگاہوں میں اپنے وقت سے پہلے تو آ سکتے تھے تاخیر اب کسی کو پسند نہیں رہی۔

مولانا کیرانوی کا ذہن بہت تیز سوچتا اور فیصلہ کرتا تھا، ان میں قوتِ فیصلہ بدرجہ اتم موجود تھی، کبھی وہ کسی مسئلہ میں حیص بیص کا شکار نہیں ہوتے تھے، سوچا، غور کیا اور فیصلہ کر لیا اور کام کا آغاز کر دیا، وہ جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور اس کے شعبہ مرکز دعوت اسلام کے سربراہ تھے، عہدہ قبول کرتے ہی انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کا دائرہ کار متعین کر لیا اور کام کا خاکہ بنا لیا انہوں نے اس شعبہ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا پلان بنایا۔

وہ جب معاون مہتمم تھے تعمیر کے سلسلہ میں فراہمی سرمایہ کے لئے دورہ کرتے ہوئے بنارس آئے میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا، وہ جامعہ کے مہمان خانے میں قیام پذیر ہوئے، ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تو رفیق مکرم مفتی ابوالقاسم نعمانی نے میرا تعارف کرایا اور میری ایک کتاب کا ذکر کیا جو میں نے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' کے نام سے لکھی تھی اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے اشاعت کے لئے امداد بھی منظور ہوئی تھی مگر میں نے قبول نہیں کی، انہوں نے مسودہ مانگا، میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا رات میں انہوں نے مطالعہ کیا اور صبح کو چائے پر انہوں نے فرمایا کہ مسودہ مجھے دے دیجئے میں اسے مرکز دعوت اسلام کی طرف سے شائع کرنا چاہتا ہوں اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، میں

نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور چار مہینے کے بعد جب ایک کنونشن کے سلسلہ میں میں دہلی گیا تو مولانا کیرانوی نے ایک شخص کے ذریعہ پندرہ نسخے مجھے بھیج دیئے، میں حیرت زدہ رہ گیا، اتنے دن تو کاتب کی خوشامد کرتے کرتے گذر جاتے ہیں، اتنی قلیل مدت میں پونے چار سو صفحات کی کتابت پھر طباعت جلد سازی سارے کام مکمل ہو گئے یہ تھا مولانا کیرانوی کا طریقہ کار، کتاب کافی مقبول ہوئی، اتر پردیش اردو اکیڈمی نے بہت سے نسخے لائبریریوں کو عطیہ دینے کے لئے خریدے، اس سے مولانا کیرانوی نے اندازہ لگایا کہ کاروباری حیثیت سے اس کتاب کی اشاعت مفید ہے اور کچھ میری تحریروں کے بارے میں ان کے تاثرات میری حیثیت سے کچھ زیادہ ہی اچھے تھے ان کو مجھ سے حسن ظن قائم ہو گیا جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

اسی سال جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک اجلاس میں جمعیۃ کی تاریخ مرتب کرانے کا فیصلہ کیا، تاریخ مرتب کون کرے، متعدد نام پیش ہوئے مگر کسی پر اتفاق رائے نہ ہو سکا، آخر میں مولانا کیرانوی نے نہ جانے کس خوش فہمی کی بنا پر میرا نام پیش کر دیا اور پوری کمیٹی نے اتفاق رائے سے منظور کر لیا، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کمیٹی کے اس فیصلہ سے مجھ کو مطلع فرمایا اور کہا کہ چھ ماہ کے لئے دہلی آ جایئے آپ کو وہاں ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں گی، میں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر بنارس میں رہ کر اس کام کو کرنا مناسب سمجھا اور یہی میں نے کہا بھی البتہ میٹر اور مواد کے لئے مرکزی دفتر میں حاضر ضروری ہے اسلئے جب ضرورت محسوس ہوگی میں ہفتہ عشرہ کے لئے دہلی آتا رہوں گا لیکن ترتیب بنارس ہی میں رہ کر ہوگی چنانچہ یہ منظور کر لیا گیا۔

میں نے اسی سال کتاب بڑے سائز کے پانچ سو صفحات میں مرتب کر دی دوسرے سال جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا سیشن ممبئی میں ہونے والا تھا، اب اجلاس کی تاریخوں میں چند مہینے باقی تھے، مولانا کیرانوی نے کتابت کرائی اور پریس میں بھیج دی، اجلاس سے چند دنوں پہلے کتاب آئی بائنڈنگ اور گرد پوش کی تیاری میں یہ دن ختم ہو گئے، اس کی رسم اجرا ممبئی میں ادا کی جانے والی تھی اس لئے بہت بڑی تعداد میں

کتاب ممبئی بھیج دی گئی، حضرت مولانا مدنیؒ کے ہاتھوں اس کی رسم اجراء ادا ہوئی اور اسی دن وہ تمام نسخے فروخت ہو گئے جو ممبئی میں موجود تھے، اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد پورا ایڈیشن ختم ہو گیا تو مولانا کیرانوی نے اب کی بار آفسٹ کی کتابت کرائی جو تقریباً آٹھ سو صفحات میں آئی جب موصوف اپنے دورے کے سلسلہ میں بنارس تشریف لائے تو کتابت شدہ کاپی بھی ہمراہ لیتے آئے میں نے اس پر نظر ثانی اور غلطیوں کی نشاندہی کی جو بعد میں کاتب سے درست کرالی گئیں، ابھی اس کی طباعت کے سلسلہ میں بات چیت چل ہی رہی تھی کہ مولانا کیرانوی جمعیۃ علماء سے علیحدہ ہو گئے، اپنے عہدے کا چارج دیتے ہوئے یہ کتابت شدہ کاپی بھی صدر دفتر کے حوالے کر دی، وہ آج بھی صدر دفتر میں موجود ہے لیکن تاریخ جمعیۃ علماء ہند دوبارہ نہیں چھپ سکی، اس میں کیا راز ہے، مجھے نہیں معلوم۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

پہلے میرا اور مولانا کیرانوی کا ذاتی تعلقات کے علاوہ ذہنی وفکری رشتہ بھی ایک تھا، ہم دونوں ہی جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ تھے بلکہ میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو میں جمعیۃ علماء کے اکابر سے ذہنی وفکری طور پر وابستہ تھا، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی جمعیۃ علماء میں کئی بار شکست وریخت ہوئی لیکن میں نے اس کی جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، باری باری کر کے لوگ جمعیۃ سے علیحدہ ہوتے رہے یہ سب میری نگاہوں کے سامنے تھا لیکن میں نے جو راہ پہلے دن اختیار کر لی تھی، آج تک پوری ثبات قدمی سے اس پر قائم ہوں

اہل خرد تو روز بدلتے رہے خدا
ہم اہل عشق جس کے ہوئے اس کے ہو لئے

بعض لوگوں نے مولانا کیرانوی سے میرے تعلقات کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا حالانکہ یہ حیرت کی بات نہیں تھی، یہ بڑی کم ظرفی کی بات ہے کہ برسہا برس سے جس سے تعلقات ہوں اور ہر ایک نے ایک دوسرے کو ہر طرح پرکھا ہوا اتفاقاً ذرا سا ذہنی یا

فکری اختلاف پیدا ہو گیا تو اس اختلاف کی وجہ سے بغض وعناد اور کینہ پروری کو اپنے دل میں جگہ دے دی جائے؟ ہمارے جیسے گوشہ نشین اسی عقیدت واحترام کے ساتھ دونوں فریق سے ملتے رہے، مولانا کیرانوی کو میرے نقطۂ نگاہ سے مکمل واقفیت تھی اور میں خود موصوف کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھا لیکن اختلاف کے اس پورے دور میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی اسی بشاشت اسی خوش دلی اور اسی اعزاز واحترام سے ملے جو ہمیشہ مجھے ان کی طرف سے حاصل تھا، کبھی بھی مجھ سے اس اختلاف کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی آئی، مجھے ہمیشہ علمی مشورے دیتے رہے، نئی کتابوں کے لئے موضوع بتاتے رہے میری کتاب کا جب بھی کوئی مسودہ پہنچا بلا تاخیر وہ کاتب کے حوالے ہو جاتا تھا، میرے اوپر ان کو مکمل اعتماد تھا میں ان کے اخلاص سے بہت متاثر تھا، ان کا ہر رویہ ان کی صاف دلی اور خلوص کا مظہر تھا، شرافت، عزت نفس، وضعداری، اخلاص اور حسن سلوک یہ ان کے فطری کمالات تھے اور میں ان کا ہر دم مشاہدہ کرتا رہتا تھا اور

ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس لئے ہمارے درمیان اخلاص ومودت کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔

جن دنوں معاون مہتمم تھے ایک بار جب وہ بنارس آئے تو میں نے بصد ادب عرض کیا کہ آپ انتظامی ذمہ داریوں سے دامن بچا لے جاتے تو بہتر ہوتا، انہوں نے بڑے جھٹکے سے پوچھا وہ کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کے علمی کارناموں کو ہر طرف سراہا جا رہا ہے، آپ کی مرتب کردہ لغتوں نے جو مقبولیت علمی دنیا میں حاصل کی ہے یہ سعادت بہت کم اہل علم کو حاصل ہوتی ہے اگر آپ اسی طرح کے علمی کاموں میں اپنے اوقات لگاتے تو ذہنی سکون بھی رہتا اور آپ کی تصانیف آپ کی دائمی یادگار ہوتیں، پھر انتظامیہ کا کوئی بھی عہدہ جس کے زیر اثر طلبہ اور اساتذہ سب آتے ہوں اس عہدہ پر رہ کر کوئی بھی اپنی عزت سلامت نہیں لیجا سکا، اس شخص کو اس کے حلقہ اثر کا ہدف بننا پڑتا ہے اور جب تک کوئی کام زیر اثر حلقہ کے خلاف نہیں ہوتا وہ خاموش رہتا ہے اور جس

دن ایک معمولی کام بھی اس کے منشا کے خلاف ہوا تو تنقیدوں کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے پھر انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری زندگی کے کارناموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے جو ذہنی اذیت ملتی ہے وہ اس سے الگ ہے میں اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں میں ان حالات سے گذرا ہوں۔

میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئے، کچھ سوچا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو انتظامیہ سے علیحدہ ہونا پڑا اور انہوں نے اپنی تدریسی ذمہ داری پر قناعت کر لی، لیکن یہ فیصلہ انہوں نے بہت دیر میں کیا، جو چیز بلندی سے گرتی ہے پستی کی طرف آنے کی اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی ہے، معاون مہتمم کے بڑے عہدے سے ہٹ کر چھوٹے عہدے پر قناعت کر لی لیکن جلد ہی تدریسی خدمات بھی چھوڑنے پر مجبور ہوئے، یہی نوشتۂ تقدیر تھا۔

مولانا کیرانوی بڑے وضعدار عالم تھے، جب بہت قریب سے ملتے تب اس کا اندازہ ہوتا ہے وہ اساتذہ ہی کو نہیں طلبہ کو بھی خودشناس بنانا چاہتے تھے، ان کا نظریہ تھا کہ علماء اور طلباء کو اس انداز سے رہنا چاہئے کہ دوسروں کی ان پر حقارت آمیز نظر نہ پڑے دوسروں کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہوں اس کے لئے خودشناسی ضروری ہے، خودداری غرور نہیں ایک خوبصورت طرز زندگی ہے۔

من لم یکرم نفسه لایکرم

کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، ایک بار وہ درسگاہ سے نکلے اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک طالب علم سامنے آ گیا وہ مطبخ سے کھانا لے کر اپنے کمرے جا رہا تھا، ایک ہاتھ میں روٹی دوسرے ہاتھ میں سالن کا کٹورا، آپ اس کی طرف بڑھے اور اس کے ہاتھ سے روٹی اور سالن کا برتن چھین لیا اور فرمایا جاؤ، تم کو کھانا اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک ٹفن کیریر خرید کر نہیں لاؤ گے سائلوں اور فقیروں کی وضع اختیار کرو گے تو دنیا تمہاری کیا عزت کرے گی، تمہارے ہی جیسے لوگ علماء کے وقار کو مجروح کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

مولانا کیرانوی کا مزاج اور سوچنے کا یہ انداز تھا، وہ کہتے تھے کہ غربت اور امارت سے وضعداری میں فرق نہیں آنا چاہیے، دونوں صورتوں میں انسان کو اپنی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، احساس خودی انسان کی بہت بڑی دولت ہے، آئینہ میں چمک نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، تواضع اور خاکساری یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ورسوا کردو، وہ چاہتے تھے کہ اساتذہ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں، جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے حوصلے مر جائیں گے اس کی امنگیں دم توڑ دیں گی ایسا آدمی کبھی بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اس کا عزم کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا اس لئے عربی مدارس سے وابستہ ہر ایک کو ایک خوددار انسان کی طرح دوسروں کے سامنے آنا چاہیے۔

مولانا کیرانوی نے تاریخ جمعیۃ علماء کی ترتیب میرے ذمہ ڈالی تو اس وقت میں ''تفسیروں میں اسرائیلی روایات'' لکھ رہا تھا اس کی تکمیل کے بعد تاریخ پر کام شروع کیا، دونوں کا مسودہ ایک ساتھ میں نے ان کو بھیج دیا تاریخ تو انہوں نے مرکز دعوت اسلام کی طرف سے شائع کی لیکن تفسیروں میں اسرئیلی روایات اپنے ذاتی کتب خانہ حسینیہ کی طرف سے شائع کی۔

مولانا کیرانوی کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان کے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، جمعیۃ علماء سے سارے اختلافات کے باوجود اس عقیدت وارادت میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی، مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں نے اپنی نئی کتاب ''مآثر شیخ الاسلام'' کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا، میں ایک سیمنار کے سلسلہ میں جب دہلی گیا ہوا تھا وہیں میرے رفیق سفر نے ایک دن دارالعلوم دیوبند میں گذارنے کی تجویز رکھی، مجھے بھی اشتیاق تھا، ہم لوگ دیوبند گئے، میں شام کو مولانا کیرانوی کی خدمت میں مسودہ لے کر حاضر ہوا، بڑے تپاک سے ملے، بہت ہی پر تکلف ناشتہ کا انتظام کیا، کچھ دیر تک ایک دوسرے کی خیر وعافیت معلوم کی جاتی رہی پھر میں نے عرض کیا، میں ایک تحفہ آپ کی خدمت میں پیش

کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں اور میں نے بیگ سے مسودہ نکال کر ان کے سامنے پیش کر دیا، کتاب کا نام پڑھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی، چند منٹ مسودہ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں ایک تصنیفی ادارہ ''دارالمولفین'' کے نام سے کھولوں جس میں ذہین اہل علم کو تصنیف و تالیف کی تربیت دی جائے اور پھر ان کو شائع کیا جائے، اس ادارہ سے سب سے پہلے ''مآثر شیخ الاسلام'' کو شائع کروں، شیخ الاسلام کی ذات مقدس سے جو مجھے نسبت اور دل میں جو عظمت ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ادارہ کا اسی کتاب سے افتتاح ہو۔

مولانا کیرانوی نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کا ادارہ کھولنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، یک بیک چند منٹوں میں انہوں نے فیصلہ کر لیا، کبھی کسی مسئلہ میں وہ تذبذب کا شکار نہیں ہوتے تھے، ان کی قوت فیصلہ اتنی طاقتور تھی چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد میں نے سنا کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک عمارت خرید لی ہے اس میں اپنے نفاست پسند مزاج کے مطابق ترمیم کر کے ادارہ کی بنیاد ڈال دی ہے پھر اسی ادارہ دارالمؤلفین سے سب سے پہلی کتاب ''مآثر شیخ الاسلام'' شائع کی جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، فوٹو آفسیٹ کی کتابت و طباعت سنہری ڈائی کی خوبصورت جلد حسین و جمیل گرد پوش سے کتاب کو مزین کیا اور دبستان دیوبند کی دور حاضر میں سب سے محترم اور عظیم شخصیت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے دست مبارک سے رسم اجرا ادا کرائی، ان کے خلوص نیت کا ثمرہ تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد دو کتابیں شیخ الاسلام کی سوانح کے سلسلہ میں شائع ہوئیں مگر مآثر شیخ الاسلام کی اشاعت پر کوئی حرف نہیں آیا، ہند اور بیرون ہند کتاب پھیل گئی، عقیدت کے ہاتھوں سے لی گئی اور محبت کی نگاہوں سے پڑھی گئی۔

پھر اسی دارالمؤلفین سے میری کتاب ''فن اسماء الرجال، تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ، تحریک آزادی اور مسلمان، پونے چار سو صفحات میں ''احیاء اسلام کی عظیم تحریک'' پانچ سو صفحات میں اور آخر میں ''کاروان رفتہ'' جس میں پونے پانچ سو

مشاہیر کا تذکرہ ہے سامنے آئی، جب حضرت نانوتویؒ کی شخصیت پر میری کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی تو مولانا کیرانویؒ کو کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ یہ کتاب دارالمؤلفین ہی کی طرف سے شائع ہوتی تو بہتر ہوتا ان کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ اس کتاب کی ترتیب ایک ایسے مخلص کرم فرما کے ایما سے ہوئی ہے کہ اب دوسرے ادارہ سے اس کا شائع ہونا بہتر نہیں ہوگا، مولانا کیرانوی کا فوراً جواب آیا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے صحیح صورت حال بیان کردی، بلا تکلف یہ کتاب انہیں کے حوالے کر دیجئے کیونکہ ان کا حق ہے اگرچہ دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ہی اسے شائع کرتا، خط کے آخر میں انہوں نے جو بات لکھی اس سے میں بہت متاثر ہوا، انہوں نے تحریر فرمایا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا ہر حال میں آپ کی تصنیفات انشاء اللہ شائع کرتا رہوں گا، اس جملہ پر پہنچ کر میرے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ شاید انہوں نے بیک اجل کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سن لی ہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت جلد اس دنیائے فانی سے میرا رخت سفر اٹھ جانے والا ہے، میری آخری کتاب ''کاروانِ رفتہ'' جب پریس سے آئی تو ان کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

# حدیث یار

ہمہ گیر شہرت کے مالک، پاکستان کے جلیل القدر محقق عالم، انتہائی وسیع المطالعہ اسکالر، درجنوں اہم ترین علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف، جسٹس مولانا تقی عثمانی نے ایک بار اپنے رسالہ ''البلاغ'' کراچی میں لکھا تھا کہ:۔

عراق کے ایک مشہور عالم پاکستان تشریف لائے اور جب کراچی آئے تو وہ میرے مہمان ہوئے، انہوں نے مجھے بتایا کہ میں متحدہ ہندوستان کی علمی وتہذیبی واسلامی تاریخ پر تحقیق کرر ہا ہوں، اسلامی ہند کی شخصیات، علماء ومحدثین اوراعاظم رجال پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور ایسے مآخذ ومراجع کی نشاندہی کریں جو عربی زبان میں ہوں تاکہ میرے لئے استفادہ آسان ہو۔

میں نے ان سے کہا کہ پورے ہندوستان (بھارت پاکستان بنگلہ دیش) میں آپ کے معیاری کام کے لئے صرف دو کتابیں کارآمد ہیں، ایک مولانا عبدالحئ رائے بریلوی کی ''نزہۃ الخواطر'' دوسری مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''رجال السند والہند'' تیسری اور کوئی کتاب نہیں۔

کسی زمانے میں عبدالرحمٰن بجنوری نے ''دیوان غالب'' کے ایک ایڈیشن پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں آسمانی کتابیں دو ہیں ''وید'' اور ''دیوان غالب'' مولانا عثمانی نے بھی اس عراقی عالم کو کچھ ایسا ہی جواب دیا کہ موجودہ دور میں علم تحقیق کا جو بلند معیار قائم کیا گیا ہے اس معیار پر اترنے والی اپنے موضوع پر یہی دو کتابیں ہیں، یہ بات قاضی صاحب کی زندگی میں کہی گئی، یہ ایک معیاری عالم کا بڑا فراخدلانہ اعتراف ہے جو مولانا عثمانی کی عالی ظرفی کا شاہکار بھی ہے اور قاضی صاحب کے لئے سند افتخار بھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس موضوع پر کتابیں نہیں لکھی گئیں، کتابیں لکھی گئیں

اور درجنوں کتابیں لکھی گئیں، اولاً تو ان میں بیشتر اردو زبان میں تھیں اور جو عربی زبان میں تھیں وہ آج کے دور میں علم و تحقیق کے ٹھوس معیار بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ان میں سے کئی ایک کتابوں کے نام میرے ذہن میں ہیں مگر ان کے نام شمار کرانے سے کوئی فائدہ نہیں، قاضی صاحب کی کتاب علم و تحقیق کے کڑے سے کڑے معیار پر کھری اترنے کی چونکہ بھرپور صلاحیت رکھتی ہے اس لئے اس کو نظر انداز کرنا کسی بھی اہل علم کے لئے ممکن نہیں۔

## فن تاریخ کا موضوع:

ہندوستان کی تاریخ اور عرب و ہند تعلقات و روابط پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ان سے کئی الماریاں بھر سکتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں سمجھی گئی جو اس عراقی عالم کے اخذ کردہ موضوع پر بہترین رہنمائی کر سکتی ہو۔

بات یہ ہے کہ تاریخ شاہی وقائع نگاروں کے جمع کردہ واقعات کے انبار ہی کا نام نہیں، بادشاہوں کی لشکر کشی و فتوحات، شکست و پسپائی کی داستانوں ہی کو تاریخ کا موضوع سمجھنا اس فن کی افادیت کو محدود کر دینا ہے، تاریخ قوموں کی تہذیبی و تمدنی سفر کی روداد بھی ہوتی ہے آج کا مورخ و محقق واقعات کے پس منظر میں ان عوامل کو تلاش کرتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال میں سب سے اہم کردار انجام دیتے ہیں ایک محقق مورخ کا سب سے دلچسپ سب سے دقیق اور سب سے اہم موضوع انہیں عوامل کی تلاش ہوتی ہے، داستان سرائی کرنے والے قصہ گو مؤرخوں کے بس کا یہ کام نہیں، یہ مشکل کام سید سلیمان ندوی کر سکتے ہیں یا قاضی اطہر مبارک پوری۔

مولانا عثمانی نے عراقی عالم سے قاضی صاحب کی صرف ایک عربی کتاب کا نام بتایا اگر وہ عراقی عالم اردو زبان سے واقف ہوتے تو قاضی صاحب کی آدھے درجن سے زائد کتابیں ان کی مکمل رہنمائی کے لئے موجود تھیں جن کی مولانا عثمانی نشاندہی فرما سکتے تھے۔

## قاضی صاحب کی کتابوں کا امتیازی وصف:

اب تک ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں صرف جغرافیائی حیثیت سے دو الگ الگ ملک عرب اور ہندوستان کے تعلقات وروابط کو منظر عام پر لایا گیا ہے، قاضی صاحب کی ذہنی اپج یہ ہے کہ انہوں نے ان روابط میں تقدس و پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کردیا ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی نفوذ کے عہد کی نشاندہی اسلامی تہذیب وتمدن کے اولین دور کی عکاسی اور منظر کشی، ان کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کو زیادہ اہمیت دی ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان تعلقات وروابط کے الگ الگ دور قائم کئے ہیں، اور ہر عہد پر ان کی ایک مستقل کتاب ہے مثلاً عہد رسالت میں ہندوستان سے تعلقات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں روابط پھر بنوامیہ کے دور حکومت میں اور پھر بنو عباس کے عہد خلافت میں عرب وہند کے تعلقات وروابط کیا تھے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہر عہد پر ان کی الگ الگ کتابیں ہیں، اپنے موضوع سے ربط پیدا کرنے کے لئے انہوں نے قبل از اسلام کی تاریخ کو بھی قدیم مآخذ سے پیش کیا ہے اور جب عہد رسالت کا آغاز ہوتا ہے ان کا قلم ابر گہر بار بن جاتا ہے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر بات کو موتیوں سے زیادہ قیمتی سمجھ کر تاریخ واحادیث کے صفحات سے چن کر سامنے رکھ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان باتوں سے پوری ملت اسلامیہ کو جذباتی تعلق ہے، جب ان حقائق کو صحیح الفکر ذہن ومزاج کا مسلمان پڑھتا ہے تو اس کی ذہنی فضا میں نورانی کرنوں کی چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کیف وسرور اور نشاط وانبساط کی گل پوش اور معطر وادیوں میں پہنچ جاتا ہے، یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں میں مشترک ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں کی طرف منسوب ہونے والی ہر بات متاعِ ایمان اور سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

☆☆☆

## عالمِ اسلام میں مقبولیت:

یہی وجہ ہے کہ جب قاضی صاحب کی کتابوں کی شہرت ہندوستان سے چل کر حجاز سے ہوتے ہوئے مصر تک پہنچی تو اختلاف زبان نے جو دشواریاں پیدا کیں اہل علم نے ان پر فتح حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا، قاضی صاحب کی شاہکار کتابیں زیادہ تر اردو میں ہیں لیکن یہ کتابیں جس موضوع اور جن معلومات پر مشتمل ہیں ان کا تعلق عالم اسلام سے ہے اس لئے یہ کتابیں ہندو پاک ہی کا نہیں عالم اسلام کا ورثہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی محقق عالم جو اردو زبان سے ذرا بھی واقف ہے اس نے قاضی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کو اپنی متاع گم شدہ ہاتھ آ گئی، آباء واجداد کا مدفون خزانہ اس کو مل گیا، اس نے لکھا کہ عربی زبان کا دامن ان جواہرات سے خالی ہے جن سے یہ کتابیں بھری ہیں تو اس نے پہلی فرصت میں ان کو اردو سے عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

## مصری عالم کے ذریعہ عربی میں ترجمہ:

مصر اسلامی علوم وفنون کا ہمیشہ ایک قابل اعتماد مرکز رہا، وہاں کے علماء نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا اور حیرتناک علمی کارنامے انجام دئے اور آج تک علمی دنیا مصری علماء کے احسانات سے زیر بار ہے اور جب تک دنیا قائم رہے گی مصر کے اہل علم کے احسانات سے علمی دنیا سبکدوش نہیں ہوسکتی، اسی مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ عبدالعزیز عزت نے جب قاضی صاحب کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کے حیرت واستعجاب کی حد نہیں رہی کہ آج تک مورخین کی نگاہوں سے یہ جواہر پارے کیوں پوشیدہ رہے جو ان کتابوں میں موجود ہیں، ان کے ذہنی افق پر حقائق ومعارف کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو گیا، اتنی مختصر کتابیں اور اتنی قیمتی معلومات سے مملو، جیسے کسی ماہر فن نے گراں بہا جواہرات کو پرکھ کر، جانچ کر اور ان کی صحیح قدر وقیمت کا

اندازہ کر کے کتاب کے صفحات میں بھر دیئے ہیں، اس شدید تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے از خود قاضی صاحب کی دو کتابوں ''ہندوستان میں عربوں کی حکومت'' اور ''عرب وہند عہد رسالت میں'' کو اردو سے عربی میں منتقل کیا اور اسی وقت پریس میں دے دیا وہ بہت جلد طبع ہو کر مصر وحجاز میں عام ہو گئیں۔

## قاضی صاحب کا انداز تحریر:

قاضی صاحب کا قلم بڑا محتاط تھا غیر ضروری بسط وتفصیل قاضی صاحب کے مزاج کے خلاف تھی، طول کلام جس کی افادیت بہت محدود ہوتی ہے اس سے وہ ہمیشہ محترز رہے، وہ الفاظ کا انبار جمع کرنے کے بجائے حقائق ومعارف کے موتی چننے کے قائل تھے، وہ کوئی ساون بھادوں کی گھٹا نہیں تھی کہ جھومتی ہوئی آئی اور موسلا دھار برس کر رخصت ہو گئی اس کا پانی زمین پر پھیلا، بڑھا، اس کی بہت تھوڑی مقدار سے کھیتوں نے اپنی پیاس بجھائی، بقیہ سارا پانی نالیوں نالوں ندیوں اور دریاؤں کے راستے خلیج بنگال میں جا کر گم ہو گیا۔

قاضی صاحب کا قلم ابر نیساں تھا جس کے ایک ایک قطرے کے لئے صدف کا منہ کھلا رہتا ہے اور جب ایک قطرہ بھی مل گیا تو اس کو بیش قیمت امانت کی طرح اپنے سینہ سے لگا کر رکھ لیا، وہی قطرہ جب صدف کے سینہ سے باہر آتا ہے تو وہ در شہوار بن کر آتا ہے جو تاجداروں کے تاج میں جگہ پاتا ہے۔

میں اس کی شہادت میں قاضی صاحب کی ایک درجن کے قریب کتابوں کو بلا تکلف پیش کر سکتا ہوں کہ مملکت علم تحقیق کے تاجداروں نے اس سے اپنے علم وتحقیق کے تاج کی زینت بڑھائی۔

## محسن سندھ کا خطاب:

قاضی صاحب ایک سیمنار کے سلسلے میں پاکستان گئے تو پاکستان کی کئی

یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے اعزاز میں ایک پر شکوہ تقریب کا انعقاد کیا جس میں خصوصیت کے ساتھ متعدد یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا، قاضی صاحب چیف گیسٹ کی معزز کرسی پر تشریف فرما تھے، کئی ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے علم وفن پر روشنی ڈالی ان کی عظیم الشان خدمات کو سراہا اور قاضی صاحب کی ان کتابوں کے حوالے سے بات کی جن میں سندھ کے ابتدائی عہد اسلامی کی روشن اور تابناک تاریخ تھی تقریب کی صدارت وزیر اعلیٰ سندھ نے کی گومل یونیورسٹی کے چانسلر پرفیسر ذی شان خٹک نے اپنی افتتاحی تقریر میں قاضی صاحب کی علمی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو شاندار لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا، انہوں نے کہا کہ مہمان محترم حضرت قاضی صاحب نے ہم کو ہماری تاریخ سے روشناس کرا کے ہمارے سر کو فخر سے اونچا کر دیا، ہم اب تک تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم تھے، ہمارا شاندار ماضی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا، ہم خود اپنی اور اپنے علاقہ کی تاریخ اس کی قدر و قیمت اور مقام و مرتبہ سے نا آشنا تھے، قاضی صاحب نے ہماری شناخت بنائی ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر دیا، انہوں نے اہل سندھ پر یہ اتنا بڑا احسان کیا کہ ہمارا سر عقیدت واحترام کی وجہ سے ان کے سامنے خم ہے، ہم اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے، ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ اس احسان کا شکریہ ادا کرسکیں، سوائے اس کے کہ پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے ہم نے آپ کو ''محسن سندھ'' تسلیم کرلیا ہے ہم کو اس اعتراف پر فخر ہے، ناز ہے، ہم آپ کی کتابوں کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکے ہیں، ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ساری کتابیں ہم سندھی زبان میں شائع کر کے سندھ کے عوام تک پہنچائیں اور ان کو بتائیں کہ تمہارے آباواجداد کیا تھے؟ تمہارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ ہم آخر میں مہمان خصوصی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے ان افادات کو عام کرنے کے خیال سے ہمیں ان کتابوں کو سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

قاضی صاحب کو اپنی کتابوں سے جلب منفعت کا تصور کبھی نہیں آیا وہ تو اپنی علمی

جدو جہد کے ثمرات کو عام کرنے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے دائرے کو وسیع کرنے میں دلی وروحانی مسرت محسوس کرتے تھے، اس لئے بلا کسی رائلٹی اور معاوضہ کے اس تنظیم کو ترجمہ اور اشاعت کی اجازت دیدی جو خاص اسی مقصد کے لئے تنظیم فکر ونظر سندھ کے نام سے تشکیل دی گئی تھی کچھ عرصہ بعد قاضی صاحب کی آدھے درجن کتابوں کے سندھی زبان میں ترجمے ہوئے اور شائع ہوئے ان کی اشاعت پورے پاکستان میں ہوئی اور علمی حلقوں میں یہ کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

## تصانیف کا علمی وزن:

مجھے معلوم ہوا کہ کچھ مصنّفین پابندی کے ساتھ متعینہ صفحات روزانہ لکھا کرتے تھے، بعض کثیر التصانیف مصنّفین کے سلسلے میں یہ خبر ہے کہ وہ کسی طالب علم کو بٹھا کر زبانی املا کراتے تھے، تصنیف وتالیف کے اس آسان طریقہ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چند مہینوں میں کتاب مکمل ہوکر پریس سے باہر آجاتی ہے اس طرح ان مصنّفین نے بہت کم مدت میں تصانیف کا انبار لگادیا۔

اس کے برعکس قاضی صاحب مہینوں جدو جہد کے چراغ میں اپنا خون جلا کر صرف چند صفحات ہی لکھ سکتے تھے، ان کی کتابیں عوام کے لئے نہیں خواص کے لئے تھیں ان کے پیش نظر اور مخاطب اہل فکر ونظر، علماء اور محققین کی جماعت تھی اس لئے ان کا معیار علم وتحقیق اتنا بلند تھا کہ زود نویس مصنّفین کی نگاہ اس بلندی تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی، سستی شہرت حاصل کر کے عوام میں مقبولیت کا حصول قاضی صاحب کے پیش نظر کبھی نہیں رہا، قاضی صاحب کا کام پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر اپنی عظمتوں کا اہرام کھڑا کرنا نہیں تھا بلکہ وہ سخت چٹانوں کا کلیجہ چیر کر لعل وجواہر نکالنے کے قائل تھے، یہ محنت طلب اور دیر طلب کام تھا اس کے لئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت تھی، خسرو پرویز کے شاہی فرمان کی نہیں، یہی وجہ ہے کہ سہل انگار مصنفوں کی درجنوں تصانیف پر قاضی صاحب کی ایک ایک تصنیف بھاری تھی، ان کی ایک کتاب کئی کئی برسوں میں پایۂ

تکمیل کو پہنچتی تھی، قاضی صاحب لال قلعہ نہیں تاج محل بنانے کے قائل تھے، یہ صحیح ہے کہ لال قلعہ کی بلند و بالا فصیلوں کا جاہ وجلال، شان وشکوہ سیاحوں کے دل ودماغ پر مرعوبیت طاری کردیتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاج محل کا حسن وجمال اور قدر و قیمت اپنا جواب آپ ہے، سیاح اس کے نقش ونگار اس کی صناعی وفنکاری اس کے قیمتی جڑے ہوئے ہیرے اور جواہرات کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، کیف وانبساط کی جو دولت اس کو حاصل ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت کو بہتر طور پر وہی سمجھتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کا حال کچھ ایسا ہی ہے وہ اپنی کتابوں کو رطب ویابس تفصیلات سے ضخیم اور بھاری بھرکم بنانے کے قائل نہیں تھے، ان کی حیثیت مرصع ساز کی تھی وہ لعل وزمرد اور یاقوت وجواہر کو تراش کر نگینہ کی طرح جڑتے تھے جو لوگ ان کی قدر و قیمت کو جانتے پہچانتے تھے وہ اس کی طرف لپکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جوہر کی قدر جوہری جانتا ہے اگر کوئی اہل علم قاضی صاحب کے فن کی عظمت سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنی کم علمی کا راز فاش کرتا ہے، جواہرات کی قدر و قیمت میں اس کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

## رجال السند والہند کا مصری ایڈیشن:

قاضی صاحب کی عربی تصنیف رجال السند والہند جب مرتب ہوئی تو ان کو کوئی ناشر نہیں ملا کیونکہ قاضی صاحب ابھی اونچے علمی طبقہ میں کچھ زیادہ روشناس نہیں تھے، ممبئی میں قیام تھا، وہاں عربی کتابوں کا ایک ناشر تھا قاضی صاحب کا اس سے تعارف بھی تھا مگر کوئی بھی ناشر غیر مشہور مصنف کی کسی ضخیم کتاب کی اشاعت پر اس لئے نہیں آمادہ ہوتا کہ اولاً تو اس پر ایک خطیر رقم صرف ہوگی دوسرے کتاب کی فروخت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ ایک ایڈیشن کتنے دنوں میں ختم ہوگا، اس لئے قاضی صاحب نے کچھ اپنے ذرائع سے اور کچھ اس ناشر کے تعاون سے ٹائپ میں ہندستانی پریس سے کتاب کو طبع کرایا لیکن کتاب عربی میں تھی اور ضخیم بھی اسلئے بہت سست رفتاری سے کتاب نکل

رہی تھی، ہندستان میں خود اردو کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں خاص طور سے جب وہ کتاب خالص علمی اور تحقیقی ہو، یہ ایڈیشن کتب خانوں میں برسوں پڑا رہا، اس دوارن قاضی صاحب کی چھ سات کتابیں ندوۃ المصنّفین دہلی جیسے مشہور و معتمد ادارہ سے شائع ہوکر ہندوپاک میں قبولیت حاصل کر چکی تھیں، ہندوپاک کے دانشور طبقہ نے ان کتابوں کی قدر و قیمت کو جانا اور سراہا، اخبارات و رسائل نے ان کتابوں کے بارے میں شاندار تبصرے لکھے۔

اب قاضی صاحب کی علمی شہرت عروج پر آ چکی تھی، دوسرے معاشی کشمکش سے بھی وہ بڑی حد تک نجات حاصل کر چکے تھے اس لئے انہوں نے سفر حج کے ساتھ اسلامی ملکوں کی سیاحت ان کے کتب خانوں سے استفادہ اور مشہور اہل علم سے ملاقات کا پروگرام بنایا، اسی دورے میں آپ قاہرہ گئے، مقصد یہ تھا کہ ''رجال السند والہند'' کا اضافہ شدہ جدید ایڈیشن اعلیٰ معیار پر طبع کرائیں، اب ان کو حجاز کے ایک بہت بڑے تاجر کتب کا تعاون بھی مل گیا تھا اس لئے کتاب کا نیا ایڈیشن بڑی آب وتاب کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہو گیا، کتاب کا بڑا ذخیرہ تو حجاز آ گیا جہاں سے عالم اسلام میں پھیل گیا، اور قاہرہ کے کتب خانوں سے یورپ اور امریکہ کی دانشگاہوں تک پہنچ گیا اسی کے ساتھ قاضی صاحب کی دوسری کتاب **العقد الثمین فیمن ورد فی الهند من الصحابة والتابعین،** کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوکر اسلامی ممالک کے دانشکدوں میں پہنچ گیا۔

## ملک و بیرون ملک کے ممتاز دانشوروں سے روابط:

تیسری یا چوتھی بار قاضی صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا اور زیارت حرمین سے فراغت حاصل کر لی تو حجاز کی سربرآوردہ علمی شخصیتوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا اس سلسلہ میں انہوں نے صحافیوں ادیبوں، اخبارات ورسائل کے مدیروں، مہاجر علماء ومشائخ اور متعدد جامعات کے جلیل القدر اساتذہ سے معاصرانہ ملاقاتیں کیں باہمی

تعارف کے بعد اپنی اپنی تصانیف کا تبادلہ کیا معتمد وممتاز علماء کی قیام گاہوں پر عشائیہ پر مدعو کئے گئے جہاں دوسرے اہل علم سے بھی ملاقات اور تعارف ہوا، پھر یہ روابط ان میں سے اکثر علماء ومشائخ کے ساتھ قاضی صاحب سے تادم اخیر قائم رہے ایک دوسرے کو خطوط لکھے گئے، مصر وحجاز کے لئے علماء و مصنّفین سے ان کی برابر خط وکتابت رہی، ہند پاک کے اکثر مشاہیر علماء سے ان کی مراسلت جاری تھی، آج بھی ان اکابر کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ قاضی صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قاضی صاحب کے علمی مقام ومرتبہ کو کتنا بلند سمجھا اور ان کی عظمت کا وہ کس طرح اعتراف کرتے رہے۔

قاہرہ (مصر) میں فضیلۃ الاستاد عبدالمنعم النمر ، شیخ صلاح ابواسمعیل مقری، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے ملاقاتیں رہیں، آخرالذکر حجاز میں مشہور صحافی عبدالقدوس انصاری مدیر المنہل ،مورخ الجزیرہ استاد احمد الجاسر،فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے اپنے علم وفن میں اسلامی دنیا میں اہم مقام رکھتے ہیں، قاضی صاحب کی ان سے معاصرانہ ملاقاتیں، تصانیف کا تبادلہ اور بعد میں مراسلت کا سلسلہ یہ بتاتا ہے کہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ہند وپاک کے متعدد مشاہیر اہل علم سے ان کی مراسلت تھی جن کے خطوط قاضی صاحب کی فائلوں میں نظر آتے ہیں ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ یونیورسٹی، پروفیسر نذیر احمد دہلی، مولانا حبیب ریحان ازہری تاج المساجد بھوپال مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کلکتہ یونیورسٹی، شیخ محمد خلیل ادارۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمد سلیم پاکستان، شاعر مزدور احسان دانش لاہور وغیرہ کے خطوط بڑی تعداد میں ہیں۔

## جہد مسلسل کی ابتدائی داستان:

قاضی صاحب آج جس بلند مقام پر نظر آتے ہیں ان کے طالب علمی کے دور

میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، عربی مدارس کے طلبہ جس ماحول میں اپنی تعلیمی زندگی گذارتے ہیں ان کی علمی ترقی ان کے ذہن وفکر میں وسعت پیدا کرنے میں اس کا کوئی رول نہیں ہوتا بس اسباق میں حاضری ایک خاص طرح کا لباس ان کی سعادتمندی کی سب سے بڑی سند ہوتی ہے، دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جس دین کی وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس پر کیا گذر رہی ہی؟ اسلام اور مسلمانوں کو کن چیلنجوں کا سامنا ہے، فراغت کے بعد وقت کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟ ان تمام باتوں سے ان کا ذہن خالی ہوتا ہے، دینی مدارس کے اساتذہ اور ارباب انتظام بھی اس صورت حال کو برقرار رکھنے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عربی مدارس سے جب طلبہ سند فراغت لیکر باہر آتے ہیں تو ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، اور دس بارہ سال کی تعلیمی زندگی کی انتھک محنت بھی ان کو رائیگاں نظر آتی ہے، کسی گاؤں دیہات کے مکتب میں معلّمی تلاش کرتے ہیں، بڑے مدارس میں فرائض تدریس ادا کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی، اسٹیج پر کھڑے ہونے کے لئے علم ومطالعہ اور معلومات چاہیئے وہ ان سے محروم ہیں کیوں کہ درسی کتابوں کے علاوہ خالی اوقات میں بھی دوسری کتابوں کا مطالعہ شجر ممنوعہ تھا، قلم پکڑنے کی پوری تعلیمی زندگی میں کبھی نوبت ہی نہیں آئی تو فراغت کے بعد چند سطریں بھی ان کے لئے دشوار ہوتی ہیں۔

قاضی صاحب نے بھی اسی ماحول اور انہیں حالات میں تعلم حاصل کی اور سند فراغت حاصل کی مگر وہ دارالاقامہ کے بجائے اپنے گھر پر رہتے اوقات درس میں آتے اور پھر واپس ہو جاتے اس لئے عام طلبہ کے تفریحی مشاغل اور تضییع اوقات کی دلچسپیوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا، گھر کے حالات بھی ان کی علمی نشو ونما کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں تھے لیکن اپنے طبعی رجحان اور فطری ذوق وشوق کے بل بوتے کی وجہ سے حالات پر قابو پاتے اور اپنے مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتے، ان کی خام سفالہ پوش نیم تاریک دالان ان کا دار المطالعہ تھی، وہ قدرت کی عطا کردہ فطری

صلاحیتوں کے نتیجہ میں از خود اپنے مطالعہ کی لائن متعین کرتے اور حالات سے لڑتے الجھتے، ٹکراتے اسی لائن پر آگے بڑھتے رہے، راستہ دشوار تھا مگر منزل تصور کی آنکھوں کے سامنے تھی، اور منزل تک پہنچنے کا عزم بالجزم دل میں موجود تھا۔

یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

جس کا مسلک بن جائے اس کو منزل تک پہنچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

## آغاز سفر:

قاضی صاحب نے عام طلباء مدارس اسلامیہ کی راہ سے ہٹ کر اپنی راہ خود بنائی تھی، اس میں کسی کی رہنمائی کا کوئی دخل نہیں تھا، اس لئے اس راہ پر چلنے کے لئے دل ودماغ میں جو روشنی ہونی چاہیے ان کے ذہنی افق پر اس کی کرنیں پڑنی شروع ہوگئی تھیں، انہوں نے طالب علمی کے دور میں شعر وشاعری کو لے کر اپنے سفر کا آغاز کردیا تھا، ان کی نظمیں رسائل واخبارات میں آنے لگی تھیں، پھر انہوں نے چھوٹے چھوٹے اور مختصر مضامین لکھنے شروع کردیئے، سب سے زیادہ حوصلہ ان کو رسالہ ''قائد'' مرادآباد کی جانب سے ملا، یہ رسالہ استاد محترم ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' کے مصنف مولانا سید محمد میاں صاحب نے مرادآباد سے جاری کیا تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم میں بڑا زور تھا ان کا اپنا ایک مخصوص طرز تحریر تھا، اردو ادب میں ان کی تحریر نے اپنی شناخت بنالی تھی، وہ فکر ولی اللّٰہی کے ترجمان تھے اس لئے انہوں نے ''قائد'' کا معیار بہت بلند رکھا تھا، رسالہ میں عام اور سرسری مضامین کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے رسالہ کا بڑا حصہ خود آپ ہی کے رشحات قلم سے بھرا رہتا تھا، قاضی صاحب نے اسی رسالہ میں لکھنا شروع کیا، قائد میں قاضی صاحب کے مضامین کی اشاعت ان کے پختہ کار اہل قلم ہونے کی سند بن گئی، ان کا حلقہ تعارف بڑھنے لگا، پھر انہوں نے دوسرے رسائل میں بھی اپنے مضامین شائع کرائے، ابتدائی کامیابیوں کے بعد جوش وجذبہ کروٹیں لے کر اٹھتا ہے تو ایک مضمون کی اشاعت کے بعد دوسرے مضمون کی

داغ بیل پڑ جاتی ہے، دل میں امنگوں کا طوفان اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے، پکی روشنائی سے اپنے نام کا چھپ جانا ہر اہل قلم کے لئے ابتداءً بڑا حوصلہ افزا ہوتا ہے قاضی صاحب بھی اس فطری جذبے سے خالی نہیں تھے، اس لئے ان کے لکھنے کی رفتار بڑھ گئی، شب و روز نئے نئے موضوعات اور عنوانات سوچتے، لکھتے، کاٹتے، بناتے، سنوارتے، کچھ رسالوں کو بھیج دیتے کچھ فائل کی زینت بن کر رہ جاتے، اب قافلہ چل پڑا تھا، اب قافلہ کو منزل تک پہنچانے کے لئے حوصلے اور امنگیں اور جوش و جذبہ سب اس کے ہمرکاب ہو گئے۔

## راستے کے نشیب و فراز:

جب تعلیم سے فارغ ہوئے ان کے سامنے علمی زندگی کا لق ودق میدان تھا، کوئی واضح راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، نشانات مٹے مٹے دھندلے دھندلے، زندگی کے اس چوراہے پر کھڑے ہو کر مختلف سمتوں میں جانے والے راستوں کو دیکھا کئی راستوں پر تھوڑی دور چل کر لوٹ آئے، تدریسی زندگی اختیار کی وہ راس نہیں آئی، امرتسر سے اک گمنام ادارے کا دعوتنامہ ملا، ادارہ کیسا ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ اس کے وسائل کیا ہیں؟ کچھ معلوم نہیں، انہوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے اور امرتسر پہنچ گئے، وہ ایک شخص کا ذاتی ادارہ تھا، تنخواہ غنیمت تھی، کام شروع کر دیا، مرکز تنظیم اہل سنت نام تھا ایک بخاری صاحب اس کے مالک تھے وہ چھوٹے چھوٹے کتابچے طبع کراتے اور تقسیم کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے ذمہ لٹریچر مرتب کرنا پھر اس کو لے کر لاہور جا کر طبع کرانا ہو گیا کیونکہ امرتسر میں کوئی اچھا اردو پریس نہیں تھا، کئی مہینے امرتسر اور لاہور کے درمیان آمد و رفت جاری رہی۔

قاضی صاحب لاہور میں اخبار ''زمزم'' کے پریس میں طباعت کا کام کراتے تھے ایک دن اخبار زم زم کے مالک سے ان کی ملاقات ہو گئی، وہ غائبانہ طور پر قاضی

صاحب کی صلاحیتوں سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ وہاں زندگی کیوں برباد کررہے ہیں، اس ادارہ کا کوئی مستقبل نہیں نہ اس کا کوئی وزن ہے نہ وہ آپ کی حیثیت کے مطابق حق المحنت دے سکتا ہے، آپ ہمارے یہاں آجائیں، کام بھی آپ کے ذہن ومزاج کے مطابق ہوگا اور حق المحنت بھی بہت معقول اور مناسب ہوگا۔

اس پیشکش کو ٹھکرانا حالات کے پیش نظر نادانی تھی، آپ نے بخاری صاحب سے گفتگو کر کے لاہور جانے کا راستہ صاف کرلیا اور لاہور پہنچ کر اخبار زمزم کے دفتر سے وابستہ ہوگئے مگر اخبار کی مجلس ادارت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

## ایک عظیم تالیف:

اخبار زمزم کے مالک عبدالرحیم انصاری اپنے پریس سے ایک نئے انداز کی تفسیر مرتب کرانا چاہتے تھے، قاضی صاحب کو اسی مقصد سے بلایا تھا زمزم اخبار جس بلڈنگ میں تھا وہ خاصی بڑی تھی اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں قاضی صاحب کا دارالتالیف قائم کردیا گیا جس میں قدیم علماء کی طرح زمینی فرش پر نشست تھی۔

اس تفسیر کا نام ''منتخب التفاسیر'' تجویز ہو چکا تھا کام کا خاکہ یہ تھا کی سات تفسیروں کے خلاصے ہر ہر آیت کے تحت جمع کر دیئے جائیں، ساتوں تفسیریں دفتر میں فراہم کردی گئیں، کچھ تفسیروں میں ایک ایک آیت کے تحت مصنف نے کئی کئی صفحات لکھے ہیں، ان عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کرنا پھر لمبی لمبی بحثوں کی تلخیص اس انداز سے کرنی کہ مفسر کی رائے کا خلاصہ آجائے اور اتنی ہی سطروں میں آئے جتنی جگہ ہر صفحہ میں ایک تفسیر کے لئے مقرر رہے۔

کام بہت نازک اور ذمہ داری کا تھا، تلخیص کے لئے بڑے علم ومطالعہ کی ضرورت تھی مگر قاضی صاحب کی علمی استعداد ہر شک وشبہہ سے بالاتر تھی مگر مفسر کے مقصد کو سمجھ لینا پھر اس کو مختصر لفظوں میں اردو میں منتقل کرنا وقت طلب امر تھا اس لئے

ابتداء میں کام سست رفتاری سے چلا لیکن دو چار پاروں کے بعد ذہن وفراست نے یاوری کی، پہلے ایک پارہ بھی ایک ماہ میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اوسطاً دو ماہ لگ جاتے تھے لیکن کام جب آگے بڑھا تو ایک ماہ میں ایک پارہ سے بھی زیادہ کا اوسط آنے لگا، تین سال میں یہ تفسیر مکمل ہوگئی۔

میں تقسیم ملک سے قبل فروری ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچا تو تفسیر کتابت کے مرحلے میں تھی، میں چار مہینے لاہور میں رہ کر مئی کے آخر میں وطن واپس آگیا، قاضی صاحب لاہور میں رہے، تقسیم ملک کے عذاب کی سرخ آندھی چلنی شروع ہوگئی، فضا گرد آلود اور آسمان کے کنارے خون آلود نظر آنے لگے تھے، حالات صاف بتا رہے تھے کہ کوئی بہت بڑا طوفان امروز وفردا میں آنے والا ہے، قاضی صاحب بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھے، فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز ہو چکا تھا، نفرتوں کا سیلاب پھیلتا اور بڑھتا جا رہا تھا جب حالات ایک دم بگڑ گئے تو تقسیم ملک سے دو ماقبل وسط جون میں لاہور چھوڑ کر وطن آگئے، پھر وہ قیامت شروع ہوگئی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، آسمان سے عذاب کے انگارے برسنے لگے، کروڑوں مسلمان تباہ وبرباد ہوئے مارے کاٹے گئے، ماں بہنوں کی عصمتیں لٹیں، کئی ہزار عورتیں اغوا ہوئیں، اربوں کھربوں کی جائداد مسلمانوں کی نذر آتش ہوئی اور کچھ عرصے کے لئے مسلمان بے یار ومددگار اور بے سہارا ہوکر رہ گیا اس کی فریاد کو سننے والا نہیں رہا، قاضی صاحب اس ہمہ گیر ہنگامۂ محشر میں اپنی مصیبت بھول گئے، اچھے مستقبل کا سنہرا خواب چور ہوکر رہ گیا۔

## لاہور سے واپسی کے بعد:

لاہور سے واپسی کے بعد معاش کا مسئلہ پھر اٹھ کھڑا ہوا، مگر یہ مسئلہ تو زندگی کے ساتھ ہے، دکھ کی بات یہ تھی کہ لاہور میں قاضی صاحب ترقی وشہرت کے چند زینوں ہی تک پہنچے تھے کہ وہ عمارت ہی زمین بوس ہوگئی۔

وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

لاہور میں قاضی صاحب کا حلقہ تعارف بڑا پر شکوہ تھا، جن لوگوں سے ایک بار ملکر لوگ فخر محسوس کرتے تھے وہ قاضی صاحب کے حلقہ احباب اور بے تکلف دوستوں میں تھے ہندوستان کے مشہور صحافی مولانا عثمان فارقلیط اخبار زمزم کے ایڈیٹر تھے ان کا دفتر اور قاضی صاحب کا دفتر آمنے سامنے تھا، دونوں نیشنلسٹ تھے اس لئے ذہنی وفکری اتحاد نے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا، دفتر ساتھ جانا ساتھ ہی اکثر واپس آنا، پھر قاضی صاحب اور فارقلیط صاحب اندرون بھائی گیٹ ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے اس لئے شب وروز کی ملاقاتیں تھیں۔

میں نے وہیں اخبار مدینہ بجنور کے مشہور ایڈیٹر ابوسعید برنی کو دیکھا جو بھوپال کے تھے ان دنوں لاہور میں تھے وہ قاضی صاحب سے ملنے آئے یہ محفل بڑی بے تکلفی کی محفل تھی، لاہور کی ایک مشہور شخصیت شاعر مزدور حضرت احسان دانش کی تھی جو مزنگ میں رہتے تھے ان سے تو اتنے گہرے مراسم تھے کہ ہفتہ میں متعدد بار مزنگ چار بجے جانا اور عشاء کے بعد واپس ہونا معمول بن گیا تھا، اپنے قیام لاہور کے زمانے میں چار ماہ قاضی صاحب کے ہمراہ میں بھی ہوتا تھا، کبھی کبھی احسان صاحب ہم لوگوں کو روک لیتے، عشاء کے بعد ان کے دفتر میں جمع ہوتے تو آدھی آدھی رات تک اپنی نظمیں سناتے، وہ راتیں لاہور کی زندگی کی یادگار راتیں تھیں۔

لاہور میں ایک اور بھاری بھر کم شخصیت علامہ تاجور نجیب آبادی کی تھی قاضی صاحب کی ان کے پاس بھی آمد ورفت تھی اور خاطر مدارت چلتی تھی ایک بار میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

میری اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قاضی صاحب خلوت نشین اور زاہد خشک نہیں تھے بلکہ بزم آرائی کے بھی قائل تھے لیکن اہل علم کی محفلوں کے علاوہ دوسری اور کوئی جگہ وہ جانا پسند نہیں کرتے تھے، احسان دانش کے توسط سے دو تین باذوق نوجوان جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتے تھے ان سے بھی آمد ورفت تھی جن میں عشرت کرتپوری شعر وشاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور اظہار اثر ناول نگاری سے آج کل

ایک غازی آباد میں ہیں دوسرے دہلی میں۔

قاضی صاحب کو سب سے بڑا دھچکا یہ لگا کہ تین سال کی شبانہ روز مشقتوں کے بعد جو تفسیر مرتب کی اور ایک ہزار سے زائد صفحات میں آئی تھی اس کو کتابت کے مرحلے میں چھوڑ آئے تھے لیکن پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس مسودہ پر کیا گذری، تقسیم ملک کی افراتفری میں نہ کاتب کا پتہ چلا نہ مسودہ کا، نہ عبدالرحیم انصاری کا سراغ ملا اور نہ دوسرے ذرائع سے کچھ پتہ چلا، ہوسکتا ہے کہ لاہور کے فسادات، آتشزدگی، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارتگری میں یہ مسودہ بھی کہیں تباہ ہوگیا جس کا قلق قاضی صاحب کو آخر وقت تک رہا۔

## منزل کی تلاش:

لاہور سے واپسی کے بعد کچھ دنوں بہرائچ میں قیام رہا، مشہور عالم مولانا محفوظ الرحمٰن نامی نے **الانصار** نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا قاضی صاحب کو اس کا مدیر بنایا تھا، قاضی صاحب نے بہرائچ جا کر ذمہ داری سنبھال لی لیکن ویکلی اخبار کے لئے جو وسائل چاہیئے وہ بہرائچ میں عنقا تھے، پھر بھی کچھ دنوں تک اس کی اشاعت ہوتی رہی لیکن آخر میں مالی کمزوری کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا قاضی صاحب وطن آگئے پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بحیثیت استاد ادب کے ان کی تقرری ہوگئی اور وہ ڈابھیل چلے گئے، پاکستان کے مشہور محدث، قادیانیت کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کی قیادت کرنے والے، فن حدیث میں مشہور کتاب "**معارف السنن**" کے مصنف مولانا یوسف بنوری اس زنانہ میں اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے قاضی صاحب کو ان کی رفاقت حاصل ہوئی وہ بہت ہی جید الاستعداد اور بہت ہی حاضر دماغ عالم تھے جدید وقدیم عربی تصانیف پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، قاضی صاحب ان کی مجلس کے رکن بن گئے اور تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، لیکن تدریسی زندگی ان کو راس نہ پہلے آئی اور نہ اب، اس لئے ان کا مزاج

لگی بندھی تعلیم اور ماحول سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں پیدا کر سکا، کچھ دنوں کے بعد دل کے تقاضوں نے مجبور کیا اور جامعہ اسلامیہ سے ترک تعلق کر کے وطن آ گئے۔

## عروس البلاد ممبئی میں:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں، چکر چلتا رہا، آخر میں ممبئی نے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی، قاضی صاحب کے ممبئی جانے کی تقریب یہ ہوئی کہ جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے تعاون سے ایک اخبار ''**جمہوریت**'' کے نام سے نکالنا طے ہوا، یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، حامد الانصاری غازی ممبئی میں قیام پذیر تھے ان کو ایڈیٹر بنایا گیا اور جوائنٹ ایڈیٹر قاضی صاحب ہوئے ساری تیاریاں کر لی گئی تو قاضی صاحب بھی ممبئی پہنچ گئے، اور اپنی ذمہ داری سنبھال لی، اخبار نکل بھی گیا لیکن اخبار کی ذمہ داری جن کے سر تھی ان میں اخلاص کے بجائے جلب منفعت کا جذبہ چھپا ہوا تھا، اس لئے اختلافات شروع ہو گئے، قاضی صاحب خالص دینی ذہن ومزاج کے آدمی تھے بازیگر سیاستداں نہیں تھے، دیانتداری اور پاک آمدنی پر یقین رکھتے تھے، غازی صاحب کو قاضی صاحب کی اوارت میں شمولیت منظور نہیں تھی وہ خود معاشی اعتبار سے پریشان حال تھے، انہوں نے ''جمہوریت'' کو ذریعہ معاش بنالیا اور مختار کل بن گئے جمعیۃ علماء مہاراشٹر کا وزیر بلڈنگ میں دفتر تھا اس کے دو کمروں پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے کرایہ جمعیۃ ادا کرتی اور قابض غازی صاحب تھے اب اخبار کو بھی انہوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تو قاضی صاحب کی خودداری کو ٹھیس لگی وہ اخبار سے بے تعلق ہو گئے اور دفتر میں قیام بھی ترک کر دیا۔

## اخبار انقلاب سے وابستگی:

ممبئی کا سب سے بڑا اردو اخبار انقلاب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے جب اس کے مالک عبد الحمید انصاری کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے ''جمہوریت'' سے قطع تعلق کر لیا تو انہوں نے اپنے اخبار میں آنے کی پیشکش کی قاضی صاحب نے ان کو

امدار غیبی سمجھا، ان کی دعوت کو منظور کر لیا اور انقلاب میں آ گئے، اور رپن روڈ پر ایک کمرہ ان کو قیام کے لئے مل گیا پھر چالیس سالوں تک اپنا مخصوص کالم جواہر القرآن اوراحوال ومعارف کے نام سے لکھتے رہے، اگر ان تمام مضامین کو جمع کیا جائے تو شاید دس بارہ ضخیم جلدوں میں آئیں، اس کالم میں بالعموم علمی مسائل ہی پر لکھتے تھے، آخر میں چند سطریں حالات حاضرہ سے متعلق ہوتی تھیں۔

## ممبئی کے شب وروز:

قیام ممبئی کے زمانے سے قاضی صاحب کا تصنیفی دور شروع ہوتا ہے بارہ چودہ سالوں کی صحرانوردی کے بعد ان کو عروس البلاد ممبئی میں ایک گوشۂ عافیت مل گیا، ایک پرانا خستہ کمرہ، جس میں چٹائیوں کا فرش ایک بدرنگ ڈیسک، شکن آلود چادر پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوئیں، قلم ہاتھ میں لئے ہوئے آنکھیں ڈیسک پر رکھے ہوئے کاغذ پر، جیسے گوتم بدھ کا کوئی مجسمہ، ساکت وصامت ممبئی جیسے شہر کے ہنگامہ خیز اور طوفاں بدوش ماحول سے ایک دم بے نیاز، قاضی صاحب علم وتحقیق کی دنیا میں گم، بت بنے گھنٹوں بیٹھے رہتے، قلم چلتا رہتا، ایک طرف مٹی کے تیل کا اسٹو واس پر ایک چھوٹی سی دیگچی میں آزوقہ تیار ہورہا ہے یہ فقیرانہ اور قلندرانہ طرز زندگی قاضی صاحب کو بہت عزیز تھا اس کے لئے وہ شاہی ضیافتوں کو بھی ٹھکرادیتے تھے۔

## شاہانہ دعوت سے انکار:

ایک بار شاہ اردن ہندوستان کے دورے پر آئے اور جب ممبئی آئے تو جوہریوں کے بادشاہ عرب جوہری نے شاہ اردن کی شاہی دعوت کی عرب جوہری نے قاضی صاحب کو مدعو کیا کیونکہ قاضی صاحب عرب ملکوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی ترجمانی کرنے کے لئے لائے جاتے تھے اس لئے عرب جوہری بھی قاضی صاحب سے واقف تھا شاہ اردن کی ترجمانی بھی قاضی صاحب کرتے تھے، ڈنر فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا اس کا دعوت نامہ قاضی صاحب کی جیب میں تھا، وہ جب اپنے

کمرے میں آئے تو دعوت نامہ کو غور سے پڑھا، اس میں ڈنر کے بعد بہت ہی اعلی پیمانے پر رقص وسرور کا بھی پروگرام تھا ممبئی کی مشہور فلمی اداکاریں اور ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھیں، جوں ہی پروگرام کی یہ سطریں پڑھیں ان کی دینی غیرت اور عالمانہ وقار کو ٹھیس لگی، انہوں نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکائی اور چھولہے پر کھچڑی کے لئے دیگچی چڑھادی اور گنگنانے لگے

ازما بجز حکایت مہر وفا مپرس ماقصۂ سکندو دارا نخواندہ ایم

حافظ شیرازی کو ہندوستان کے بادشاہ نے یہاں تشریف آوری کی دعوت دی، حافظ شیرازی ان دنوں معاشی تنگیوں میں مبتلا تھے، دل میں خیال آیا کہ شاہی دربار سے وابستگی ایک شاندار زندگی کا پیش خیمہ ہے، دل میں یہ خیال ابھی آیا ہی تھا کہ اسی دوران اندر سے کنیز ایک پیالے میں دودھ لیکر آئی اور پیش کیا، دودھ پی کر شکم پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ جب تک مجھے یہ میسر ہے شیراز چھوڑنے کی ضرورت نہیں اور ہندوستان آنے سے صاف انکار کردیا، قاضی صاحب بھی کچھ اسی ذہن ومزاج کے بزرگ تھے۔

## عظمتوں کا چراغ روشن رکھا:

ایک بار شاہ ایران رضا شاہ پہلوی خیر سگالی کے دورے پر ہندوستان آئے اور ممبئی میں اسی عرب جوہری کو ان کی میزبانی کی عزت حاصل ہوئی قاضی صاحب اس ڈنر میں مدعو تھے، صبح کو اخبار میں نہ یہ خبر پڑھی کہ شاہ ایران کی عروس البلاد ممبئی میں تشریف آوری کی خوشی میں مہاراشٹر حکومت نے تین دنوں کے لئے شراب سے پابندی اٹھالی ہے ہر شخص آزادانہ شراب خرید سکتا ہے اور پی سکتا ہے میکدے کے پیر مغاں کا اعزاز یہی ہے کہ اس کی نگاہوں کے سامنے

ہر سمت ساغروں میں چھلکتی ہوئی شراب

کا دلکش منظر ہو اور رندانِ بلانوش اس کا استقبال کریں، ہندوستان کی سرزمین نے یہ شاندار روایت قائم کررکھی ہے کہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کا ان کے

ذہن ومزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شایانِ شان استقبال کرتی آئی ہے۔

آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد خادم حرمین شریفین شاہ سعود ہندوستان کے دورے پر آئے تو بنارس میں ان کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ ان کے راستہ مین جتنے مندر پڑتے تھے ان تمام مقامات پر سفید لٹھے کے لمبے لمبے بینر بنائے گئے اوران پر بہت ہی جلی قلم سے کلمۂ شہادت لکھ کران بینروں سے مندر کو چھپا دیا گیا تا کہ شاہ کی نظران پر نہ پڑے، سڑکوں پر جگہ جگہ عظیم الشان گیٹ بنائے گئے ان پر جو بینر لگائے گئے ان پر ایکس X کی صورت میں دو تلواریں بنا کر دائیں بائیں **لا الٰہ الا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ** کی سطر جگمگا رہی تھی لاکھوں کی بھیڑ میں جب شاہ سعود ان سڑکوں سے گذرے تو ان کو محسوس ہوا ہوگا کہ وہ بنارس میں نہیں حجاز کی شاہراہوں پر چل رہے ہیں، رواداری کی یہ شاندار روایت ہمیشہ یہاں رہی، شاہ ایران کی آمد کے موقعہ پر ان کے ذہن ومزاج کی رعایت کرتے ہوئے ممبئی کی سرزمین نے اس روایت کو قائم رکھا، اور میکدوں کے دروازے کھول دیئے۔

قاضی صاحب نے اخبار میں خبر پڑھتے ہی عرب جوہری سے معذرت کردی، نشہ برساتی ہوئی فضا میں قاضی صاحب کے جانے کا کیا سوال ع

قاضی شہر کجا؟ رند خرابات کجا؟

قاضی صاحب اسی شان قلندری کے ساتھ چالیس برسوں تک ممبئی میں رہے ان کے دامن فضل وکمال پر کبھی کوئی دھبہ نہیں پڑا، نشہ برساتی ہوئی ممبئی کی فضا کا ان کے دل ودماغ پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا، یہ خودشناسی، خودداری اپنے مقام ومرتبہ کے صحیح احساس اور استقامت کا ایسا حیرتناک کارنامہ ہے کہ اس کی مثال عملی زندگی میں بہت ہی کمیاب ہے۔

## شعر وادب کی مجلس میں شرکت:

قاضی صاحب عالمانہ وقار کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے اس لئے جہاں اس کو

ٹھیس لگنے کا احتمال نہیں ہوتا تھا آپ وہاں شریک بھی ہوتے تھے مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں ممبئی میں تھا انہیں دنوں ایک قدیم طرز کی محفل شعر وسخن منعقد ہوئی اس میں انہوں نے شرکت کی میں خود ان کے ہمراہ تھا، حیدرآباد کے ایک رئیس زادے انس حیدرآبادی ممبئی میں رہتے تھے وہ ایک شاندار فلیٹ میں رہتے تھے انہوں نے اپنے فلیٹ کے ہال میں ایک محفل شعر وسخن منعقد کی صرف شعرا اور صرف تین چار اہل علم مدعو تھے کل بیس بائیس افراد تھے ممبئی کی مقبول ترین شخصیت حکیم اعظمی کے ہمراہ ہم دونوں بھی اس محفل میں شریک ہوئے تمام لوگ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے تو ایک نوجوان ایک چھوٹی سے مرادآبادی سینی میں ایک موٹی سی موم بتی جلا کر لایا اور صدر مشاعرہ کے سامنے رکھ دی، انس حیدرآبادی نے صدر سے مخاطب ہوکر کہا حضرت! بسم اللہ، صدر نے شمع اپنی داہنی جانب سرکا دی، شمع سامنے آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کلام سنائیں، شاعر نے غزل پیش کی، غزل تمام کرکے شمع اپنی داہنی جانب بڑھا دی، اسی طرح شمع گردش کرتی ہوئی قاضی صاحب اور پھر میرے سامنے آئی اور جلدی سے داہنی جانب سرکا دی کیوں کہ ہم دونوں کو پڑھنا نہیں تھا، شمع گردش کرتی ہوئی ممبئی ریڈیو سے وابستہ رفعت سروش کے سامنے آئی انہوں نے ایک آزاد نظم سنائی اور خوب داد وتحسین وصول کی اب شمع مہمان خصوصی ساغر نظامی کے سامنے تھی یہ ان کے شباب کا زمانہ تھا اور ان کی شاعری پر بھی شباب آیا ہوا تھا انہوں نے متعدد غزلیں اور نظمیں سنا کر شمع صدر کے سامنے بڑھا دی، صدر نے پھونک مار کر شمع بجھا دی، یہ مشاعرہ کے ختم ہونے کا اعلان تھا، باہر نکل کر قاضی صاحب نے رفعت سروش سے کچھ دیر باتیں کیں پھر ہم لوگ اپنے کمرے پر لوٹ آئے۔

## رسالہ البلاغ:

اخبار انقلاب سے آپ وابستہ تھے لیکن اخبار کے دفتر شاذ ونادر ہی جاتے تھے جو کالم آپ کے ذمہ تھا وہ کسی بھی وقت لکھ کر جیب میں ڈال لیتے اور جب شام کو

کمرے سے نکلتے تو انقلاب کے کاتب کی قیام گاہ راستہ میں پڑتی تھی اپنی تحریر ان کے حوالے کر دیتے وہی اس کالم کی کتابت بھی کرتے تھے، قاضی صاحب اب بالکل آزاد تھے، بعد میں انہوں نے انجمن اسلامیہ کے ہائی اسکول میں دینیات کے دو گھنٹے لے لئے تھے وہاں البتہ پابندی سے جاتے تھے تیسری دل چسپی کی جگہ صابو صدیق کا مسافر خانہ تھا جہاں انجمن خدام النبی کا دفتر تھا جس کو ممبئی کے ایک دیندار مخیّر رئیس احمد غریب نے قائم کیا تھا، جس کا مقصد زائرین حرم کو سہولت فراہم کرنا تھا انہیں کی تجویز پر ایک رسالہ البلاغ کا اجرا ہوا قاضی صاحب اس کے مدیر تھے یہ رسالہ بیسیوں سال تک قاضی صاحب تن تنہا نکالتے تھے، یہ ساری مصروفیات ۴ بجے شام کے بعد کی تھیں اس کے علاوہ وہ شب و روز کا زیادہ حصہ اپنے دارالمطالعہ میں تصنیف و تالیف اور مطالعہ میں گذارتے بلاضرورت کہیں آنا جانا پسند نہیں تھا آپ کی تین درجن کے قریب کتابیں اسی خلوت گزینی کے نتیجہ میں مرتب ہوئیں اور آپ کی شہرت کو چار چاند لگا ئے۔

## عربی ادب کا ذوق:

قاضی صاحب کا عربی ادب کا ذوق بڑا پختہ تھا، دوارن گفتگو بے تکلف احباب کی محفلوں میں اکثر سبعہ معلقہ دیوان حماسہ مختلف جاہلی شعراء کے اشعار سناتے اور اس کی معنویت کی وضاحت کرتے، بیشمار عربی اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے، چونکہ شب و روز عربی کتابوں کا ہی مطالعہ تھا اس لئے ذرا سی توجہ سے عربی کی بہت مرصع نثر لکھتے تھے، بعض عربی کتابوں پر جو انہوں نے مقدمے اور پیش لفظ لکھے ہیں، بہت رواں دواں، سلیس اور فصیح عربی میں ہیں، کہیں کہیں سجع کی رعایت اور قافیہ پیمائی بھی نظر آتی ہے، یہی عربی ادب کا ذوق آگے چل کر مزید نکھر گیا، ان کی عربی عبارتوں میں کہیں تکلف اور آورد کی جھلک نہیں ملتی نہ کہیں اظہار مطالب میں اغلاق و ابہام کا شائبہ ہے "رجال السند والہند" ان کی عربی کی پہلی تصنیف ہے، دوسری کتاب "العقد الثمین"، جب آپ کے قلم سے نکلی تو عام متداول عربی تاریخ و سیر کی کتابوں کا

جو انداز ہے ٹھیک وہی انداز بیان وہی سادہ لب ولہجہ بلاکسی عبارت آرائی اور تصنع کے صاف ستھری سلیس عربی ہے، جدید صحافتی عربی ان کی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ ہے قدماء کے رنگ میں ہے جو ان کی کتابوں کے علمی معیار کو بلند کر دیتی ہے۔

## قاضی صاحب کی دوراندیشی:

قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے اردو کتابوں کے بجائے مآخذ ومراجع کی عربی کتابوں کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے، ہم لوگ اپنی عمر کے طبعی تقاضوں کے زیر اثر اردو وادب، شعروشاعری، سیاسی تاریخ، افسانوں ناولوں اوراد بی رسالوں کی گلریز وادیوں کی سیر کو حاصل زندگی سمجھتے تھے، قاضی صاحب تذکرہ الحفاظ، المسالک والمما لک جیسی خشک کتابوں کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے تھے، معاشی حالت زیر وزبر تھی مگر کیسے کیسے چار پیسے جوڑ کر عربی کی ان کتابوں کو خریدتے، جلد سازی کرتے، اس پر کاغذ کا غلاف چڑھاتے، اور سجا کر طاق پر رکھتے ان کتابوں کو پھول کی طرح چھوتے، نہایت احتیاط اور نفاست کے ساتھ ان کے اوراق پلٹتے اور گھنٹوں ان کے مطالعہ میں منہمک رہتے، طبقات خلیفہ بن خباط، وفیات الاعیان، تہذیب التہذیب وغیرہ کتابیں اسی دورغربت وافلاس کی خرید کردہ تھیں حیرت ہوتی ہے کہ طالب علمی کے دور میں کس طرح انہوں نے ان کتابوں کی قدر و قیمت کو پہچانا جب کہ ہم لوگ ان کتابوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے ان کی افادیت کا تصور بھی ہمارے دماغ سے اونچا تھا اور اگر قاضی صاحب کے بتانے سے کچھ سمجھ بھی جاتے تو اس کو کوہ کندن کاہ برآوردن سمجھتے اور کہتے تھے اور ہم ان کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھتے کیوں کہ ہمارا شعورخام تھا قاضی صاحب اس سے بہت آگے جاچکے تھے، ہماری جارحانہ تنقیدوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ہماری گمراہ طبیعتوں نے ہم کو رنگین کھلونے دے کر بہکا رکھا تھا اور قاضی صاحب ثریا پر کمند ڈالنے کی فکر میں مصروف تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو علمی مجلسوں میں صدرنشینی کی عزت وسرفرازی نصیب ہوئی اور ہم کو صف فعال میں بھی جگہ نہ ملی۔

## قاضی صاحب کی شاعری:

ہر ذہین عالم میں شاعری کا جوہر موجود ہوتا ہے بس ذوق سلیم اور موزونی طبع درکار ہوتی ہے، قاضی صاحب بھی شاعر تھے اور اپنے دور طالب علمی میں بہت لکھتے تھے، اس دور میں ان کی شاعری ہی ان کی شناخت بن گئی تھی، وہ غزل کے بجائے صرف مذہبی واصلاحی نظمیں لکھتے تھے، جس میں جوش وجذبہ کی فراوانی تو ضرور تھی مگر لطف بیان، طرز اظہار میں جدت، زبان وبیان کی چاشنی، برجستگی وسلاست اور شگفتگی کا عنصر بہت کم تھا، انکی شاعری اصلاحی نظموں تک محدود تھی کبھی کبھار کوئی نعت لکھ دیتے تھے۔

عمر کے ساتھ ان کی شاعری پر بھی نکھار آنے لگا تھا، ان کے شعروں میں رمزیت، معنویت، استعارات کا خوبصورت استعمال اور تخئیل کی کارفرمائیاں نظر آنے لگی تھیں، جن میں زبان وادب کی چاشنی، انداز بیان کی لطافت، تخیل کی فن کاری جگہ جگہ نظر آنے لگی، اب وہ غزلیں بھی لکھنے لگے تھے ان کی کچھ غزلیں پاکیزہ اور دلکش ہیں لیکن اس کا بڑا حصہ سادگی بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے دلکشی وجاذبیت سے عاری ہے، سچی بات یہ ہے کہ یہ قاضی صاحب کا فن نہیں تھا اور نہ ان کی ذہنی ساخت غزل کی شاعری کو قبول کرتی تھی غزل کی شاعری کے لئے حسن پرستی تھوڑی سی ذہنی وفکری آوارگی کی ضرورت ہے تبھی وہ مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑ سکتی ہے، تخیل کی بلند پروازی، محاکات کی رنگ آمیزی، طرز اظہار کی شوخی کے تام جھام کے ساتھ جب عروس غزل جلوہ افروز ہوتی ہے تبھی اس کی جانب فکر ونظر کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔

قاضی صاحب خالص علمی آدمی تھے، ان کا ذہن ومزاج تحقیقی تھا صداقت کی تلاش وجستجو اور حقیقت کی دریافت ان کی فطرت تھی اور غزل کی شاعری ہوا میں گرہ باندھنے کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی تصنیفی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا توانہوں نے شاعری سے ایک دم توبہ کرلی۔

ان کے پاس ایک ضخیم مجموعہ کلام تھا اس میں ابتدائی دور سے لے کر آخری دور

تک کا کلام ہے، اس میں ہر طرح کا کلام ہے، مذہبی واصلاحی نظموں کا تناسب زیادہ ہے، ان میں کچھ نظمیں بڑی جاندار اور مرصع ہیں برجستگی وسلاست بھی ہے کہیں بڑے شگفتہ نمونے مل جاتے ہیں، ان کی مذہبی واصلاحی نظموں کا بڑا حصہ اس دور کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکا ہے، جن حالات اور فضا میں یہ نظمیں لکھی گئی تھیں یہ نظمیں ان کی عکاس ہیں اس لئے وہ پسند بھی کی جاتی رہیں۔

قاضی صاحب کا مکمل مجموعۂ کلام ان کے ورثاء کے پاس موجود ہے، ان کی ابتدائی زندگی کی علمی وادبی سرگرمیوں اور تدریجی ارتقا کا پورا پورا عکس ہے اگر اسی نقطۂ نگاہ سے اس کو شائع کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

## آخری بات:

حضرت نانوتویؒ پر جب میری کتاب شائع ہوگئی تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے حضرت گنگوہیؒ کی سوانح حیات پر کام شروع کردیا تھا، کام بڑی تیزی سے چل رہا تھا، تقریباً دوسو صفحے سیاہ کر چکا تھا کہ ۱۴ر جولائی کی شب میں قاضی صاحب کے صاحبزادے کا فون آیا کہ آج والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

یہ چند لفظوں کی خبر تھی جو دل ودماغ پر بجلی بن کر گری، ہوش وحواس صبر وضبط، غور وفکر، قوت عمل سب کو خاکستر کرگئی، دماغ نے کام کرنا اور انگلیوں نے قلم پکڑنا چھوڑ دیا، چاہنے کے باوجود بھی ایک حرف نہ لکھ سکا مسودہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا قلم ہاتھ میں لیتا قاضی صاحب کا حادثۂ وفات غموں کی سیاہ چادر آنکھوں کے سامنے تان دیتا، اس اندھیرے میں قلم نے چلنے سے انکار کردیا، میرے قابو میں اس وقت آیا جب خود یہ غمناک کہانی موضوعِ سخن بن گئی۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

# احسان دانش

## ذرہ جو آفتاب بن گیا

متوسط القامت، کسا ہوا بدن، ہلکا سانولا رنگ، کلین شیو، علی گڈھ پاجامہ، عمدہ سلی ہوئی سرج کی شیروانی، سر پر جناح کیپ، ہاتھوں میں بڑا اور خوبصورت چرمی بیگ، یہ ہیں ہندوستان کے مشہور و معتبر شاعر مزدور حضرت احسان دانش جو کبھی بن دانش کہے جاتے تھے وہ مزدوری اور گارامٹی اور معماری کرتے کرتے بزم شعر وادب کے صدر نشین ہو گئے اور شعر وادب کی مجلسوں میں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے، ایک زمانہ تھا کہ ان کی زبان سے ان کی نظمیں سننے کے لئے لوگ دیوانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے آزادی سے قبل جن چند مخصوص شعراء کی انقلاب آفریں نظموں کا سکہ رواں تھا لوگوں کے دلوں پر ان کی حکمرانی تھی اور جن کا ہر شعر عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جاتا تھا انہیں میں حضرت احسان دانش بھی تھے، ان کی نظموں میں دلوں کو چھو لینے والی تاثیر تھی، جبر واستحصال کے شکار کسان اور مزدور طبقہ کی زندگی اور ان کے درد وکرب کی وہ ایسی منظر کشی کرتے تھے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شعر دل کی گہرائیوں سے سراپا فریاد بن کر شاعر کی زبان پر آرہا ہے، فریاد کی لے یوں ہی کربناک ہوتی ہے پھر اس پر حضرت احسان دانش کے پڑھنے کا مخصوص اور پر اثر انداز، دونوں ہاتھ باندھے سروقد اس طرح پرسکون کھڑے ہوتے کہ کسی عضو بدن میں ہلکی سی بھی جنبش نہیں ہوتی، پھر لب ولہجہ کا سوز وگداز، آواز کا درد، نہ بہت بلند اور نہ بہت پست، ایک نرم رو دریا کی روانی کی طرح وہ اپنی نظمیں سناتے تھے اور ہزاروں ہزار کی بھیڑ کے باوجود جب وہ نظمیں پڑھتے تھے تو مجمع پر ایک سناٹا چھا جاتا تھا، مشاعرہ گاہ جیسے شہر خموشاں بن جاتی تھی، ان کے لب ولہجہ میں تاثیر پیدا کرنے میں ان کے گہرے تجربات ومشاہدات کا بڑا دخل تھا جس کی وجہ سے ان کا

ہر شعر حقیقت وواقعیت کا مرقع بن جاتا تھا کیوں کہ انہوں نے وہ تمام اذیتیں جھیلی تھیں جو غربت وافلاس کے فولادی شکنجوں میں جکڑے ہوئے اس طبقہ میں عام ہیں، وہ دردوکرب کی ان تمام منزلوں سے گذرے ہیں جو مزدور طبقہ کا مقدر بن چکی ہیں اس لئے جب وہ اسٹیج پر آتے تھے تو غربت وافلاس کی گود میں پالے ہوئے وقت اور حالات کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طبقہ کے دردوکرب کا اپنے لفظوں میں اظہار کرتے تھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ احسان دانش نہیں بلکہ ظلم وجبر اور استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک مظلوم اور ستم رسیدہ انسان کی روح بول رہی ہے، چیخ رہی ہے، بین کر رہی ہے اور فریاد کر رہی ہیں چونکہ میں نے حضرت احسان کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے میرے یہ تاثرات الفاظ کی طلسم بندی نہیں، اظہار صداقت ہے۔

میں ۱۹۴۶ء کے اخیر میں ان سے لاہور میں ملا، بلکہ مجھے تین چار مہینے تک ان کی معیت حاصل رہی، ملاقات کی تقریب یہ ہوئی کہ مشہور مصنف قاضی اطہر مبارکپوری جو میرے مخلص اور بزرگ دوستوں میں سے ہیں وہ لاہور سے شائع ہونے والے واحد نیشنلسٹ اخبار ''زمزم'' سے وابستہ تھے، صحافت کو ذریعہ معاش بنانے کے ارادہ سے میں ان کے ساتھ لاہور پہنچ گیا، ہم لوگ اندرون بھاٹی گیٹ مبارک منزل میں رہتے تھے جس کے ایک حصہ میں اخبار زمزم کے ایڈیٹر مشہور صحافی عثمان فارقلیط قیام پذیر تھے اور احسان صاحب محلّہ مزنگ میں رہتے تھے، مزنگ کا فاصلہ یہاں سے دوکیلو میٹر کے قریب تھا ہم دونوں ہفتہ میں تین چار بار احسان صاحب سے ملنے مزنگ ضرور جاتے تھے، یہ ان کی بلند اخلاقی کا کرشمہ تھا کہ وہ ہم لوگوں سے برابر کے دوستوں کی طرح ملتے تھے اور کبھی کبھی اصرار کر کے شب کو روک لیتے اور مجبور کرتے کہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔

ایک دن حسب معمول ہم لوگ ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے باتوں میں مصروف تھے کہ شام کی ڈاک سے ایک خط آ گیا احسان صاحب نے وہ خط مجھے دیتے ہوئے کہا

کہ استاد! پڑھو، وہ لکھنے پڑھنے والے بے تکلف دوستوں، اپنے ملنے والوں بلکہ بعض اوقات اپنے عقیدت مند شاگردوں کو بھی استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے، یہ ان کا اپنا مخصوص انداز خطاب تھا خط اردو میں صاف لکھا ہوا تھا مکتوب نگار نے لکھا تھا کہ میری کئی لاکھ کی جائداد کا عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے، وکیل نے کہا کہ اگر اپنے وطن کے کسی معزز اور مشہور آدمی کی شہادت عدالت میں پیش کردیں تو آپ کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا، از راہ کرم تشریف لاکر شہادت دیدیں تو بڑا اکرم ہوگا، خط سن لینے کے بعد انہوں نے جو کچھ بتایا اسے سن کر ہماری آنکھیں آنسوؤں سے چھلک آئیں، انہوں نے بتایا کہ یہ جن صاحب کا خط ہے وہ ہمارے وطن کاندھلہ کے بہت بڑے رئیس ہیں، میں جب اپنے وطن میں تھا تو ان کی کوٹھی میں پنکھا کھینچنے پر ملازم تھا، پہلے بجلی کے پنکھے عام نہیں تھے رئیسوں کے یہاں چھت میں کڑے لگا کر ایک لمبے تختے میں کپڑوں کے جھالردار پنکھے بنائے جاتے تھے، بیچ تختے میں ایک کڑے سے رسی باندھ کر کمرے سے باہر نکال دی جاتی تھی تاکہ نوکر کمرے سے باہر برآمدے میں بیٹھ کر پنکھا کھینچے، انہوں نے بتایا کہ ایک بار مئی یا جون کا مہینہ تھا وہ اندر کمرے میں آرام فرما تھے، دوپہر کا وقت تھا، میں برآمدہ میں بیٹھا ہوا پنکھا کھینچ رہا تھا، دیر تک پنکھا کھینچتے ہوئے تکان آگئی اور اس کے ساتھ غنودگی بھی، معلوم نہیں کب میرے ہاتھ سے رسّی چھوٹ گئی اور پنکھے کا چلنا رک گیا، میں بے خبری میں نیند کے جھونکے کھانے لگا وہ اندر کی گرمی سے پریشان ہوکر جھنجلائے ہوئے کواڑ کھول کر باہر نکلے اور مجھے اونگھتے ہوئے دیکھا تو اتنی زور سے میرے گالوں پر طمانچہ مارا کہ میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں میری عمر اس وقت دس گیارہ سال تھی، آج بھی جب میں اس بھرپور طمانچے کی چوٹ کو سوچتا ہوں تو غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اپنے گالوں پر چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابھی وہ طمانچہ میرے گالوں پر لگا ہے، یہ واقعہ سنا کر احسان صاحب تو ہنسنے لگے اور ہم پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی اور ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

ایک بار ہم لوگوں کے ساتھ کچھ چیزوں کی خریداری کے لئے انارکلی چلے تو راستہ میں کئی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ اس عمارت میں میں نے راجگیر کا کام کیا ہے، ایک بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلے کی بنی ہوئی ہے، یہاں میں نے گارا مٹی کا کام کیا ہے، اس دور کے کئی دلدوز واقعات سناتے ہوئے کہا کہ جب شام کو میں اپنے ساتھی مزدوروں کے ساتھ اپنے اڈے پر آتا تو سردیوں کے زمانہ میں دیوار کی پٹریاں جلا کر سارے مزدور ساتھی آگ تاپتے تھے، کیونکہ کسی کے پاس لحاف نہیں تھا، میں اسی الاؤ کی روشنی میں کاغذ پنسل نکال کر اشعار لکھتا تو میرے مزدور ساتھی آپس میں کہتے کہ ''سالا شاعری کرتا ہے'' انارکلی کی ایک دوکان سے انہوں نے اپنے دفتر کے لئے ناریل کا ٹاٹ خریدا، دکاندار نے ٹاٹ کو لپیٹ کر بنڈل بنایا اور اس کو سُتلی سے باندھ دیا، قیمت دیکر جب احسان صاحب نے بنڈل اٹھا کر بغل میں دبایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا چرمی بیگ اٹھایا تو میرے دوست قاضی اطہر مبارکپوری لپکے کہ ان کے ہاتھ سے بنڈل لے کر رکشے تک لے جائیں تو احسان صاحب نے کہا کہ آپ جیسے عالم فاضل میرا سامان اٹھائیں، یہ میرے لئے بڑے شرم کی بات ہے، اس کے بعد میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ دونوں سے چھوٹا ہوں، مجھے دیدیجئے، لیکن احسان صاحب نے ایک نہ سنی اور کہا کہ انارکلی کی سڑکوں نے مجھے مزدوروں کے لباس میں چلتے پھرتے برسوں دیکھا ہے، آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی اور خود ہی بنڈل دکان سے رکشے تک پہنچایا، یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب احسان صاحب کے قدر شناس لاہور میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور اہل علم و فن ان کے شاعرانہ کمالات پر ایمان لا چکے تھے، اب وہ ہر مجلس میں اعزاز و احترام کے مقام پر بٹھائے جاتے تھے، لیکن وہ اپنے ماضی کو بھولے نہیں تھے بلکہ انتہائی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اس کو بیان بھی کرتے تھے، یہ ان کی فطری شرافت اور عالی ظرفی کی دلیل تھی، وہ اپنے ماضی کی عبرتناک تصویر پر حال کی سنہری چادر ڈال کر جھوٹی عزت کے قائل نہیں تھے، یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا، احسان صاحب کا کاروبار اچھا خاصا تھا،

مشاعروں سے بھی اچھی آمدنی ہو جاتی تھی، ایک دو منزلہ مکان رہائش کے لئے، اور اس کے بالمقابل ایک بڑا سا کتب خانہ تھا جو ایک ہندو شاگرد بھیم سین ظفر ادیب کی شرکت میں کامیابی سے چل رہا تھا، کتب خانہ سے متصل ان کا اپنا دفتر تھا جس میں صاف ستھرا زمینی فرش پڑا رہتا تھا، جس میں وہ اپنے ملاقاتیوں سے ملتے تھے، ان کا بڑا لڑکا ذیشان جامعہ ملیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا اور اس کو ایک معقول رقم اخراجات کے لئے بھیجتے تھے، خود بہت صاف ستھرا اور اچھا لباس استعمال کرتے تھے لیکن ابتدائی زمانہ کی تلخیوں نے ان کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا، نمود و نمائش سے سخت نفرت تھی، سادگی، تواضع، بے نفسی، بے نیازی اس طرح ان کے دل و دماغ میں رچ بس چکی تھی، کہ پلنگ اور مسہری ہوتے ہوئے بھی یا تو تخت پر سوتے تھے یا زمین پر، محنت مزدوری کرنے والوں سے دل کھول کر ملتے تھے ان کا بڑا الحاظ و خیال رکھتے ان کے شاگردوں میں اس وقت کئی ایک حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تھے وہ چاہتے تھے کہ حضرت احسان کی کچھ خدمت کریں لیکن احسان صاحب نے ان سے ایک طرح قطع تعلق کر رکھا تھا نہ وہ کبھی احسان صاحب کے پاس آتے تھے اور نہ کبھی احسان صاحب ان سے ملنے جاتے تھے البتہ ان کے کئی شاگرد جو بعد میں اچھے شاعر اور ادیب اور مصنف ہوئے اور شہرت حاصل کی ان میں کوئی جوتے بناتا تھا کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا، مشہور ناول نگار جو آج کل جاسوسی کہانیوں کے لئے مشہور ہیں، اظہار اثر جو دہلی میں اقامت گزیں ہیں اور شاعر عشرت کرت پوری جو غازی آباد میں سروس کرتے ہیں، درد احسانی وغیرہ اسی دور کے شاگرد اور حضرت احسان صاحب کے جاں نثاروں اور حاضر باشوں میں تھے جو احسان صاحب کے واسطے سے ہمارے بھی بے تکلف دوست ہو گئے تھے ان شاگردوں کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ آج بھی وہ احسان صاحب کو ایک محسن کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور جب ان کی یاد آتی ہے تو کچھ دیر کے لئے اداس ہو جاتے ہیں، احسان صاحب صوم وصلوۃ کے پابند تھے اور جب نماز کا وقت قریب ہوتا تھا تو کان اذان کی طرف لگائے رہتے تھے نماز گھر میں پڑھتے تھے،

احسان صاحب کا وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھا وہ مشہور عالم دین بانی تبلیغی جماعت مولانا الیاس کاندھلوی کو چچا کہتے تھے، ان کی تعلیم پرائمری درجات سے آگے نہیں بڑھی، کم عمری ہی سے محنت مزدوری میں لگ گئے چودہ سال کی عمر میں تلاش معاش میں لاہور چلے گئے یہیں وہ مزدور سے ترقی کر کے راجگیر (معمار) بنے اسی زمانہ میں انہوں نے شاعری شروع کی، انہوں نے لائل پور کے ایک مشاعرے میں پہلے پہل اپنی ایک نعت سنائی، کلام اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے لب ولہجہ سے مشاعرہ لوٹ لیا، مشاعرہ ان کی شہرت کا سنگ بنیاد بنا، ان کے مجموعہ کلام ''نوائے کارگر'' کی بہت سی نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں ''نوائے کارگر'' کے علاوہ ''آتش خاموش'' نفیر فطرت'' چراغاں'' اور مقامات'' ان کے کلام کے مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے تھے، احسان فطرتاً شاعر تھے، شاعری جن حالات میں پنپتی ہے اور نشو ونما پاتی ہے ان سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، تعلیم واجبی سے بھی کمتر تھی، شعر وادب کا مطالعہ تو بہت دور کی بات، ماحول بھی اَن پڑھ مزدوروں کا ملا، نہ ذہنی وقلبی سکون میسر تھا نہ جسمانی اطمینان نصیب، فکر معاش کا زہریلا نشتر رگ رگ میں پیوست تھا، ان تمام باتوں کے باوجود وہ شاعری کرتے رہے، پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑوں میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہے، خوش لباس شاعروں کے طعنے سنتے رہے اوان کی استہزاء کا شکار ہوتے رہے لیکن جب وہ مشاعرہ میں اسٹیج پر آتے، درد وکرب اور سوز وگداز سے بھرپور لب ولہجہ میں اپنی نظمیں سناتے تو اکثر لوگوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں اور استہزاء کرنے والے شعراء اپنی نگاہوں میں خود رسوا ہو جاتے۔

احسان غزل شاذ ونادر ہی لکھتے تھے، وہ غزل کے نہیں، نظموں کے شاعر تھے، وہ اس درد وکرب کے ترجمان تھے جو غربت وافلاس کے سینوں میں پرورش پاتا ہے، اس لئے جب وہ مشاعروں میں اپنی نظم پڑھتے تھے تو مجمع پر ایک سناٹا چھا جاتا تھا، داد وتحسین کا سلسلہ رک جاتا تھا، پورے مشاعرہ میں صرف ایک غمناک اور درد سے بھری ہوئی آواز گونجتی تھی اور وہ آواز احسان کی ہوتی تھی۔

احسان ایک خاموش انقلاب کے پیامبر تھے، وہ روح آزادی کو صرف بیدار کرنے کا فرض انجام دے رہے تھے، جو طبقہ جبر واستحصال کا شکار تھا وہ اس طبقہ کے نمائندہ تھے، وہ اس طبقے کی رگ وپے میں جو درد جو غم جو کرب کروٹیں لے رہا تھا اس کا اظہار کرتے تھے تاکہ غیرت وحمیت اور خودداری انسانیت بیدار ہو جو جہاد آزادی کی پہلی منزل ہے، رجز یا آتش نوائی کے لئے ان کا لب ولہجہ سازگار نہیں تھا، وہ کاروان آزادی کے حدی خواں تھے کہ یہ کارواں سبک رفتاری سے آگے بڑھتا جائے، کہیں راہ میں رکنے نہ پائے، اسی لئے ان کے لے کی آواز دھیمی تھی جو نشاطِ سفر تو پیدا کرتی تھی، جوش وخروش نہیں۔

ان کی قادرالکلامی اور پرگوئی کا بھی مجھے ایک تجربہ ہوا، میں نے ایک دن اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے پیش کی انہوں نے کہا پڑھیئے میں نے پوری غزل سنادی وہ خاموشی سے سنتے رہے غزل تمام ہونے کے بعد کہا لکھئے، انہوں نے ایک شعر لکھوایا پھر دوسرا پھر تیسرا یہاں تک کہ میری غزل سے بڑی ایک دوسری غزل تیار ہوگئی، اور وہ قافئے استعمال کئے جو میری غزل میں استعمال نہیں ہوئے تھے، میرے کسی شعر میں کوئی ترمیم کی نہ کوئی مصرعہ بدلا، میری غزل اس سے پہلے اخبار مدینہ بجنور میں شائع ہوچکی تھی۔

احسان صاحب کے اس اضافہ کو اپنی غزل کے ساتھ تبرکاً لکھ لیا، اصلاح کا یہی طریقہ تھا وہ شاگردوں سے زبانی سنتے اور زبانی اصلاح دیتے جاتے تھے، ایک دن ہم لوگ حسب معمول حاضر ہوئے اور سلسلۂ گفتگو دراز ہو گیا تو انہوں نے اصرار کے ساتھ کھانے پر مجبور کیا، کھانے سے فراغت کے بعد جب دفتر میں آئے تو سلسلۂ گفتگو میں انہوں نے اپنی ایک رباعی سنائی جس میں اندھیری رات میں جگنوؤں کی چمک کو جنوں کی برات سے تشبیہ دی گئی تھی یہ ایک نئی تمثیل تھی میں نے اس کی تحسین کرتے ہوئے اس کی تشریح کی، تو بہت خوش ہوئے اور پھر جو رباعیات اور قطعات سنانے کا سلسلہ شروع ہوا تو رات کے دو بج گئے اور احسان صاحب سناتے چلے گئے پھر از راہ

ذرہ نوازی انہوں نے کہا کہ سنج تو بہت ملتے ہیں لیکن سخن فہم بہت کم، آج جی بھر کر آپ لوگوں کو میں نے اس لئے سنایا کہ آپ لوگوں نے اس ماحول، فضا اور کیفیت کو پا جانے کا احساس دلایا جو میں نے ان رباعیوں اور قطعات کو کہتے ہوئے پیش نظر رکھا تھا۔

آج ۴۸ سال بعد ان پر کیف مجلسوں کو یاد کرتا ہوں تو ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے، جنوری ۱۹۴۷ء کی ابتداء میں میں بیمار ہو کر وطن واپس آ گیا، مارچ ۱۹۴۷ء سے لاہور میں ہنگاموں کی ابتداء ہو چکی تھی فضا میں تناؤ اور تلخی بڑھتی جا رہی تھی، تقسیم ملک کا عذاب قریب آتا جا رہا تھا اور چند مہینوں بعد آنے والی قیامت کے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی تھی جس کا آغاز ملک میں فسادات، قتل و غارتگری، اور خوں ریزی کی تباہیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ ہو چکا تھا اس لئے جون ۱۹۴۷ء کے آخر میں رفیق محترم قاضی اطہر مبارکپوری اور مولانا عثمان فارقلیط اپنے اپنے وطن لوٹ گئے، دو مہینے بعد ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا، پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے پوری دنیا واقف ہے، پانچ سال بعد معلوم ہوا کہ احسان صاحب کے پارٹنر بھیم سین ظفر ادیب دہلی آ گئے یہیں اپنی پوری زندگی گذاری اور یہیں وفات پائی وہ احسان صاحب کی زندگی پر کوئی کتاب مرتب کر رہے تھے اس سلسلے میں وہ کئی بار لاہور جا کر احسان صاحب سے ملے بھی تھے پھر پتہ نہیں چلا کہ کتاب کا کیا حشر ہوا؟ قاضی صاحب سے معلوم ہوا کہ خود احسان صاحب نے ''جہان دانش'' کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی، لیکن مجھے وہ کتاب نہیں مل سکی، تقسیم کے بعد حضرت احسان دو تین بار ہندوستان مشاعروں میں آئے لیکن میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی، یہ بھی سنا تھا کہ وہ مزنگ کا مکان چھوڑ کر انارکلی میں آ گئے ہیں یہیں ان کا رہائشی مکان بھی ہے اور کتب خانہ بھی۔

احسان صاحب اپنی عسرت و تنگدستی کی وجہ سے پرائمری سے آگے نہیں پڑھ سکے تاہم اپنے ذوق و شوق سے نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی کا وسیع مطالعہ اس زمانہ میں کیا جب وہ مزدوری کرتے تھے اور بڑی ادبی مہارت پیدا کی، مزدوری،

معماری، باغبانی، اور چوکیداری جیسے پیشوں کو اختیار کرتے رہے لیکن کتب بینی برابر جاری رہی، احسان صاحب شاعر مزدور تھے یہ رنگ پسند گروپ سے ہمیشہ علیحدہ رہے ان کی بہت سی نظموں نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی جس مشاعرہ میں پہنچ جاتے اسے لوٹ لیتے۔

اعظم گڈھ میں ۱۹۳۸ء میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں ملک کے مشاہیر شعراء کے ساتھ احسان صاحب بھی شریک ہوئے تھے، میں نے اسی مشاعرہ میں ان کی مشہور نظم ''جشن بیچارگی'' پڑھتے ہوئے سنی، نظم میں ایک غریب مزدور کی لڑکی کی شادی کی منظر کشی کی گئی ہے، غربت و افلاس کی گود میں پلی ہوئی لڑکی سرخ جوڑے میں ماں باپ سے رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی بار بار آنکھوں کو پونچھتی ہے، سسکیوں اور ہچکیوں سے پورا بدن کانپ رہا ہے کہ افلاس کا مارا اس کا بوڑھا باپ آخری نصیحت کرنے اور اپنی لختِ جگر کو رخصتی کے الفاظ کہنے کے لئے آتا ہے، دولہن بنی ہوئی بیٹی کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھتا ہے اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان نصیحت کرتے ہوئے تسلی دیتا ہے۔

زیور جو نہیں ہے تو خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری ڈاڑھی کی تیرے ہاتھ ہے بیٹی

درد و کرب کا یہ کلائمکس اور نقطۂ عروج ہے، پوری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے غربت و افلاس کا زہر جو باپ کی نس نس میں سمایا ہوا ہے اس کا علاج تو اس کے بس میں نہیں تھا اس لئے اپنی بیٹی سے جو اس کے گھر سے رخصت ہو کر اجنبی لوگوں میں جا رہی ہے دل کے پورے درد کے ساتھ ہر آنے والی مصیبت کو برداشت کرنے کی نصیحت کرتا ہے اور سب سے کربناک جملہ کہتا ہے کہ لاج اس مری ڈاڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی! احسان صاحب کے پڑھنے کے انداز نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ جو مشاعرہ دوسرے شاعروں کے کلام پر داد تحسین کے ہنگاموں سے گونج رہا تھا ابھی احسان صاحب نے اپنی نظم کے چند ہی اشعار پڑھے تھے کہ مجمع پر شہر خموشاں کی کیفیت

طاری ہوگئی، مشاعرہ کے بعد ہر شخص کی زبان پر احسان صاحب ہی کا نام رہ گیا، یہی نظم حاصل مشاعرہ ہوکر رہ گئی، جب وہ اعظم گڈھ کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرہ میں گئے جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا یہی نظم سنائی تو وہاں کے ایک استاد نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اس نظم کو سن کر سامعین میں سے کچھ ایسے آبدیدہ ہو گئے کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اس کے بعد دو تین دنوں تک احسان صاحب علی گڈھ میں رہے جس پروفیسر کے یہاں جاتے تو اندرون خانہ سے اسی نظم کی فرمائش ہوتی اور اس کو سن کر مستورات کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

(قومی آواز لکھنؤ ۴؍اپریل ۱۹۸۲ء)

۲۴؍مارچ ۱۹۸۲ء کے قومی آواز میں حضرت احسان کی وفات کی خبر شائع ہوئی تو پڑھ کر کلیجہ دھک سے ہو گیا، افسوس

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

# ایک عہد ساز شخصیت

## جس نے اسلامی ہند کو اندلس نہیں بننے دیا

یورپ کی سامراجی طاقتوں نے اپنی اپنی ہوس ملک گیری کے عفریت کو مذہبی لباس پہنا کر اپنی حکومت کے استحکام کا ایک تجربہ آج سے ڈھائی تین سو سال قبل اندلس میں کیا جہاں نوسو سالہ مسلم حکومت کو اپنی متحدہ فوجی طاقت اور سیاسی حکمت عملی سے فتح کیا اور اپنی حکومت کو دیرپا اور اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کا جال بچھایا اور عیسائی پادریوں کی ایک پوری فوج کو اس مورچہ کے فتح کرنے پر لگا دیا لیکن جب یہ مرحلہ دیر طلب محسوس ہوا تو انہوں نے جبر وقہر کی سان چڑھائی ہوئی تلواریں سونت لیں اور ہر سر کو مجبور کیا کہ وہ صلیب کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے اور جو اکڑنے کی کوشش کرے اس کی گردن ماردی جائے، تجربہ ان کا کامیاب رہا پر اس طرح پورے اندلس پر صلیب پرستوں کا ایسا جابرانہ وقاہرانہ قبضہ ہوگیا کہ کسی بھی توحید پرست متنفس کو اندلس کی فضاء میں سانس لینے کی اجازت نہیں رہی، کسی مسلمان کو اپنی نوسو سالہ عظمت واقتدار کی نشانیوں کو مڑکر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں دی گئی جہاں کبھی وہ شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کے ساتھ حکمراں رہے اسی سرزمین میں ان سے ایک محکوم اور غلام کی حیثیت سے بھی جینے کا حق چھین لیا گیا ان کا پُر ہیبت آوازوں میں اعلان تھا یا تو عیسائی ہوجاؤ یا اس سرزمین سے دور نکل جاؤ پھر دوبارہ اس کی عظمت کی طرف مڑکر دیکھا تو تمہارا سر تمہارے قدموں میں ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پورے ملک میں ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار مسلمانوں کو عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا ننگی تلواروں کے سائے میں ان کو بپتسمہ دیا گیا، جن بزدل، بے غیرت اسلام کا نام لینے والوں نے ایمان کے بجائے اپنی جان کی حفاظت کو

اولیت دی وہ سب کے سب عیسائی ہوگئے جو غیرتمند ایمان پر ثابت قدم تھے انہوں نے اندلس کی سرزمین ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی اور کئی نسلوں تک خانہ بدوشی کی مصیبت بھری زندگی گذارتے رہے۔

یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا کہ حکمراں عیش پسند اور تملق پسندوں کے نرغے میں گھرے رہے وہ اس شدید غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دولت وحکومت ان کی زرخرید کنیز ہے وہ ہمارے قبضہ واختیار سے کبھی باہر نہیں جاسکتی ملک کے علماء ومشائخ تقرب سلطانی حاصل کرنے، دولت دنیا سمیٹنے اور پیری مریدی کی دکان سجانے میں لگے رہے ان کے سینوں میں اسلامی غیرت وحمیت مرچکی تھی، ایمانی جرأت وشجاعت دنیا طلبی کے بوجھ سے دم توڑ چکی تھی اور جب عیسائیت ان پر حملہ آور ہوئی تو وہ بزدلوں اور بے غیرتوں کی طرح گوشۂ عافیت تلاش کرتے رہے اور سامان تعیش چھن جانے پر عورتوں کی طرح ٹسوے بہاتے رہے اسلام کے مٹ جانے اور شمع ایمان کے بجھ جانے کا غم نہیں تھا اسلام کے تحفظ اور ایمان کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دینے کا جذبہ فنا ہو چکا تھا اس لئے وہ دشمن کا مقابلہ کرکے عیسائیت کی یلغار کو روکنے کی نہ ان میں ہمت وجرأت تھی اور نہ ان کے بازوؤں میں طاقت وقوت وہمت وغیرت، حد یہ ہے کہ غرناطہ کا حکمراں ابوعبداللہ فرڈی فنڈ اور از ابیلا کو قلعہ کی کنجیاں جان کی امان پر حوالہ کرکے محل میں روتا ہوا اپنی بہن عائشہ کے سامنے گیا تو اس کی غیور اسلامی حمیت وغیرت اور جرأت ایمانی کی پیکر جذبات سے کھولتی ہوئی بہن نے جو کہا وہ اسلامی تاریخ میں آب زر سے لکھا گیا، اس نے خشمگیں نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور کہا:

''جب تم نے بہادر مرد اور غیرت مند مسلمان کی طرح اپنی حکومت اور اسلامی اقتدار کی حفاظت کیلئے اپنی جان نہیں دے دی تو اب عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟ تم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے، تم نے ناموران اسلام اور اپنے غیور آباءواجداد کی آبرو خاک میں ملا دی، مجھے ایسے بے غیرت بھائی کی بہن بننا منظور نہیں''

☆☆☆

## انجام کار:

صلیب پرستوں کے سامنے پسپائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوسو سالہ حکومت کے دور عروج کی ساری علامتیں اور نشانیاں حرف غلط کی طرح مٹادی گئیں قلعہ حمرا کی بلند و بالا فصیلوں سے اسلامی پرچم کو اتار کر وہاں صلیبی جھنڈا لہرا دیا گیا دنیا کی مشہور ترین عظیم الشان مسجد قرطبہ جو اپنے طول وعرض اور اپنی آرائش وزیبائش اور عظمت وجلال کے اعتبار سے لاثانی اور بے مثال تھی وہ گرجا گھر بنادی گئی کسی مسلمان کو وہاں سجدہ ریز ہونے تک کی اجازت نہیں رہی جس دن ایوان حکومت سے اسلام کا پرچم اتارا گیا اس دن سے آج تک اندلس کی ہزاروں ہزار مسجدوں کے بلند میناروں سے صدائے توحید اللہ اکبر کی آواز فضا میں بلند نہیں ہوئی اور آج تک وہ سرزمین اللہ اکبر کی آواز سے محروم چلی آرہی ہے، اتنا وسیع وعریض، سرسبز وشاداب، حسین وجمیل ملک مسلمانوں سے ایک دم خالی ہوگیا، آج بھی کوئی مسلمان سیاح قرطبہ میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ لے یہ ناممکن ہے، اندلس کی شکست اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کی بدترین شکست ہے اس شکست سے اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ داغدار ہوگئی، اندلس کی تاریخ پڑھتے ہوئے غیور اور حساس دل کے سارے زخم ہرے ہوجاتے ہیں اور ان سے خون رسنے لگتا ہے۔

## ہندوستان میں دوسرا تجربہ کرنے کی کوشش:

اندلس پر قبضہ کرنے کے سو سال بعد ہندوستان میں بھی انگریزی سامراج نے یہی تاریخ دہرانے کی کوشش کی، ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو مکمل طور پر شکست دینے کے لئے عیسائیت کو ہندوستان پر مسلط کرنے کی ہر امکانی کوشش کی، لیکن ایک مرد مسلمان ایک مجاہد اسلام نے اپنی قوت ایمانی سے وہ حیرتناک کارنامہ انجام دیا کہ اتنی بڑی جابر وقاہر حکومت کی منصوبہ بندی کی شیرازہ بندی ٹوٹ

کراس کا ہر ورق ناکامی کی فضاؤں میں اڑ کر گم ہو گیا۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے نہیں تاجر اور سوداگر کی حیثیت سے آئے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی ان کے کاروباری ادارے کا نام تھا یہ بنگال اور مدراس میں بانس، بھوسہ، مچھلی اور تیل کی تجارت کرتے تھے اور اس کے منافع پر گذر بسر کرتے تھے یہاں محنت ومشقت کر کے جو کمائی کرتے تھے وہ اپنے خاندان والوں کو اپنے وطن بھیجتے رہتے تھے بالکل ایسے جیسے آج خلیجی ممالک یا ملیشیا وغیرہ میں ہندوستانی تجارت یا ملازمت کر کے گذر بسر کرتے ہیں، بالکل یہی حال انگریزوں کا تھا لیکن اس کاروباری زندگی میں ان کو کچھ تجربے حاصل ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ یہاں ضمیر اور ایمان بھی سستے نرخ پر مل جاتا ہے۔

## ہندوستان میں طوائف الملوکی:

ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی اس لئے پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی ہر علاقہ میں چھوٹی چھوٹی خودمختار حکومتیں تھیں ہر دربار میں اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے سازشیں ہوتی رہتی تھیں ہر جگہ برسر اقتدار حکمراں کے خلاف ایک مخالف طاقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی اس صورت حال سے واقف تھی انگریزوں نے اپنے کاروباری مفادات کے لئے ایک چھوٹی سی فوج مرتب کر رکھی تھی، جس میں ٹامی نسل کے لچے لفنگے، غنڈے یورپ کے شہروں کے جرائم پیشہ افراد یورپ سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے ان کو کمپنی نے اپنی فوج میں شامل کر لیا، ان کو جدید طرز کے اسلحہ فراہم کرائے گئے وہ انتہائی خونخوار اور جری تھے بظاہر یہ تجارت کی حفاظت کے لئے تھے، لیکن ہندوستان میں فتوحات کا دروازہ اسی فوج نے کھولا، بنگال کے حکمراں سراج الدولہ کے دربار میں اقتدار کے لئے رسہ کشی چل رہی تھی سراج الدولہ کے مقابلہ میں محمد قاسم تخت حکومت کا دعویدار تھا اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد طلب کی کمپنی اس کی مدد کے لئے حق المحنت طے

کر کے تیار ہوگئی اور سراج الدولہ کے وزیر جنگ میر جعفر کو خرید لیا جب سراج الدولہ اور کمپنی کی فوج کا مقابلہ ہوا تو سراج الدولہ کی فوج کی توپوں میں گولوں کے بجائے بھس بھرا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند گھنٹوں میں سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو چند ہزار انگریزی فوج نے شکست دے دی میر قاسم کو تخت حکومت مل گیا اور کمپنی کو اتنی بڑی دولت ملی کہ سال بھر کی تجارت میں بھی اتنا منافع نہیں مل سکتا تھا، سب سے بڑا فائدہ کمپنی کو یہ ہوا کہ بنگال کی حکومت پر کمپنی کا درو بست قائم ہو گیا جس کو چاہا تخت پر بیٹھا دیا جس کو چاہا تخت سے اتار دیا۔

کرناٹک میں نواب محمد علی اور چاند شاہ کو لڑا کر یہی کھیل کھیلا گیا، میسور میں سلطان ٹیپو کے خلاف اس کے وزرا میر صادق اور پورنیا وغیرہ کو لالچ دے کر ان کو خرید لیا اور ان کو اپنی سازش میں شریک کر کے اتنی طاقتور اور مضبوط حکومت کو کمپنی نے تہس نہس کر کے رکھ دیا مرہٹوں کی طاقت نا قابل تسخیر مانی جاتی تھی لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنا مطیع وفرماں بردار بنالیا حیدر آباد کو فوجی دباؤ میں لے کر نواب حیدر آباد کے دربار میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا جس کی مرضی کے بغیر نواب صاحب کوئی حرکت نہیں کر سکتے تھے واجد علی شاہ کو بیک بینی ودو گوش لکھنؤ سے نکال کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کر دیا، آخر آخر میں دہلی دربار میں کمپنی کا دخل بڑھ گیا حکومت چھین کر بادشاہ کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور اس کو بے دست و پا کر دیا گیا اس طرح پورے ملک میں کہیں بھی انگریزوں کو کسی بڑی فوج کشی کی نوبت نہیں آئی اور پورے ملک پر قبضہ ہو گیا اور یہ قبضہ اتنے رعب داب اور دبدبہ کے ساتھ تھا کہ ان چند مٹھی بھر انگریز کے سامنے کسی کو کھڑے ہونے کی جرأت وہمت نہیں ہوتی تھی چند انگریز ہندستانیوں کے بڑے سے بڑے مجمع کی طرف سے گذر جاتے وہ مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا، اس صورت حال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دماغ آسمان پر پہنچا، لندن میں عیش وعشرت کے شادیانے بجنے لگے۔

☆☆☆

## اقتدار کو مستحکم کیا جائے:

اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے مقبوضات پر قابو رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بنائے اور فوج بھی مکمل وفادار ہو ہندوستان کے باشندوں پر بھروسہ کرنا خطرہ مول لینا تھا اور اتنی بڑی تعداد میں یورپ سے انگریزوں کو یہاں لانا ممکن نہ تھا جو پورے ہندوستان پر کنٹرول کرسکیں اس لئے انگریزوں نے یہیں کے ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج بنائی، بالکل ویسی ہی جیسی مغلیہ دورِ حکومت میں مشترکہ فوج تھی اسی نہج پر بلکہ بڑی حد تک وہی قدیم فوج ایسٹ انڈیا کمپنی کی وفادار ہوگئی، لیکن کمپنی کبھی بھی اس ہندوستانی فوج پر کلی طور سے مطمئن نہیں رہی، کسی بھی وقت وطن پرستی کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہے اور کمپنی کی حکومت واقتدار کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے، کمپنی کے ڈائرکٹروں نے لندن میں اپنے ذہین ترین افراد سے اس سلسلہ میں استصواب رائے کیا انگلینڈ کی حکومت سے صلاح ومشورے کئے، بہت غور وفکر کے بعد طے کیا گیا کہ جس طرح اندلس میں عیسائیت کی تبلیغ کر کے پورے ملک کو عیسائی بنا کر حکومت کو استحکام دیا گیا اور اس کو ناقابل تسخیر بنایا گیا بالکل اسی نہج پر ہندوستان میں بھی یہاں کے باشندوں کی اکثریت کو عیسائی بنا کر اس تجربہ سے فائدہ اٹھایا جائے جب حاکم ومحکوم دونوں کا مذہب ایک ہوجائے گا تو فطری طور پر رعایا حکومت کی وفادار ہوگی اس طرح ہندوستان پر ہماری حکومت زوال کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجائے گی، اندلس میں مسلم حکومت کے سقوط کے بعد عیسائی حکومت کو اسی لئے استحکام حاصل ہوا کہ اب اس سرزمین میں کوئی غیر عیسائی نہیں رہ گیا تھا۔

## پورے ملک کو عیسائی بنادیا جائے:

انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کے مشورے کی تائید کی اور لندن پارلیمنٹ میں اس اسکیم کی توثیق کی گئی، حکومت نے اس اسکیم کے خاکے میں رنگ بھرنے کا آغاز کردیا۔

شہری آبادی سے بہت دور جنگلی علاقہ میں جہاں عام لوگوں کا گذر نہیں تھا وہاں

ایک فصیل بند مدرسہ قائم کیا اسلامی علوم وفنون کے ماہر اساتذہ فراہم کئے اور شہری علاقہ کے نوجوانوں کو ان علوم اسلامی وفنون کے ماہر اساتذہ فراہم کئے اور شہری علاقہ کے نوجوانوں کو ان علوم اسلامی کی تحصیل کے لئے داخل کیا گیا ان کو بیش قرار ماہوار وظیفہ اور تعلیم کی تکمیل کے بعد بہترین مستقبل کی ضمانت دی گئی، تعلیم وتربیت کا طریقہ یہ رکھا گیا کہ اس ادارہ میں اسٹاف اور طلبہ کے علاوہ کسی بھی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں رکھی گئی اگر مصلحت کا تقاضا ہوا کہ کسی کو اس ادارہ کا معائنہ کرایا جائے تو انگلینڈ کی حکومت کے وزیر داخلہ سے باضابطہ اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہوگا، عام شاہراہ سے جو ذیلی سڑک ادارہ کی طرف جاتی ہے اس روڈ پر جلی قلم سے لکھا ہوا بورڈ لگا ہوا تھا ''یہ عام راستہ نہیں ہے'' یعنی اس سڑک پر سواری کے مڑتے ہی پولس گذرنے والے کو گرفتار کرسکتی تھی، سرکاری اجازت نامہ صرف قانونی گنجائش تھی ورنہ عملاً کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاتی تھی حکومت کے اہم ترین ارکان ہی ادارہ کی ضرورتوں کے تحت وہاں جاسکتے تھے، ادارہ میں تمام اساتذہ انگریز تھے جو اسلامی علوم وفنون قرآن وحدیث فقہ وتفسیر اور تاریخ وسیرت کے ماہرین مانے جاتے تھے، عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ان کو درجہ کمال حاصل تھا اور فصیح زبان بولتے اور لکھتے تھے، کئی درجن انگریز اساتذہ اور طلبہ یونیفارم لمبی لمبی سفید عبائیں، عمامے، مولویانہ پاجامے، چہرے پر خوبصورت داڑھیاں عربی وضع قطع، عربی میں سلام وکلام مزاج پرسی سوال وجواب بالکل ایسے ہی جیسے دارالعلوم دیوبند میں طلبہ واساتذہ رہتے ہیں کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ سب سخت قسم کے عیسائی ہیں، اس ادارہ میں پہنچ کر ایک مسلمان حیرت زدہ رہ جائے کہ اس جنگلی علاقے میں علماء اسلام کی یہ مقدس جماعت زمین سے نکل پڑی ہے یا آسمان سے اتر آئی ہے، قدآور خوبصورت گورے چٹے صاف شفاف اسلامی لباس میں ملبوس اساتذہ وطلبہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے نورانی فرشتوں کی کوئی جماعت اس سرزمین پر اتر پڑی ہے، خالص اسلامی ماحول اس ادارہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

چھ سات سال کے نصاب اور دوران تعلیم یونیفارم عربی اور اردو زبان کی پابندی ہر ایک کے لئے لازم تھی، کسی بھی وقت اپنی مادری زبان استعمال کرنے کی ان کو اجازت نہیں تھی، اس طرح یہ ادارہ ۱۸۰۰ء سے اپنے طلبہ کو تعلیم دے رہا تھا اوران کو تربیت دیتا تھا ہمارے عربی مدارس کی کتابیں داخل درس تھیں انہیں کتابوں سے ان کو اسلام پر اعتراضات کرنے کا فن سکھایا جاتا تھا اور جب نصاب مکمل ہوجاتا تھا تو انکو ماہر علوم اسلامیہ کی ڈگری دے دی جاتی تھی اور وہ بڑے بڑے گرجا گھروں میں پادری بن کر لمبی سے لمبی تنخواہ پاسکتا تھا اور انگلینڈ کی حکومت اپنے کسی مقبوضہ ملک میں سرکاری الاؤنس اور تنخواہ پر بھیج سکتی تھی، اس ادارہ کے طلبہ تکمیل نصاب کے بعد عربی اردو زبانوں کے ماہر، فراٹے سے ان زبانوں میں تقریریں کرنے والے، اسلامی کتابوں کے حوالے دینے والے، احادیث اور روایتوں پر نقد و جرح کرنے والے تیز وطرار عالم مانے جاتے تھے۔

## ہندوستان میں پادریوں کی فوج:

اسی ادارہ کے تربیت یافتہ پادریوں کو ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں بھیجا گیا تاکہ پورے ملک کو عیسائی بنانے کی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

یہ ادارہ انیسویں صدی کے آخر تک رہا، اس کے تربیت یافتہ نوجوان جوش وجذبہ سے بھرے ہوئے پادری ہندوستان کے ہر خطہ میں متعین کردیئے گئے، ملتان وپشاور سے لے کر آسام وبرما تک ان کی تگ ودو جاری ہوگئی اور دارالحکومت دہلی میں لندن کا اسقف اعظم پادری پی فنڈر اپنے معاون پادریوں کی ایک ٹیم کے ساتھ عیسائی پادریوں کی فوج کی کمان سنبھالے ہوئے تھا اور خود اس کی ذاتی سرگرمیاں دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے شروع ہوکر اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی مجلسوں تک جاری تھیں۔

یہ عیسائی مشنریز اپنے ساتھ پریس بھی لائے تھے جب کہ ہندوستان میں ابھی پریس نہیں تھا سردھنہ اور مرزاپور میں ان کے بڑے پریس تھے ان چھاپہ خانوں میں

اہل قلم عیسائی پادری مقرر کئے گئے جو اردو میں اسلام کے خلاف کتابیں لکھ کر طبع کراتے اور ملک میں مفت تقسیم کرتے، بازاروں، میلوں ٹھیلوں میں اس کی اشاعت کرتے تمام پادریوں کی ذمہ داری تھی کہ جن جن مواقع پر ہندوستانیوں کا اجتماع ہوتا ہے جیسے ہندوؤں کے سالانہ میلے، تیرتھ گاہیں، مسلمانوں کی نماز جمعہ اور عیدین کے تیوہار وہاں اپنے اسٹال لگائیں، اردو زبان میں عیسائیت کے فضائل ومناقب پر تقریریں کریں اپنا لٹریچر اور انجیل کے چھوٹے چھوٹے نسخے تقسیم کریں۔

حکومت کے تمام افسران، عہدیداران گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر ان کو بنایا جائے جو خود بھی پکے عیسائی ہوں اور اسی کے ساتھ مشنری ذہن ومزاج کے ہوں اور ان کو عیسائیت کی تبلیغ اور فروغ سے ذاتی دلچسپی ہو، تمام انگریز افسران کو حکم تھا کہ جن علاقوں میں پادری تبلیغ کے لئے جائیں پولیس کو ان کی حفاظت کے لئے مقرر کریں، پولیس پادری کے ساتھ ساتھ رہے تاکہ کسی کو پادریوں سے الجھنے کی ہمت نہ ہو اور نہ کوئی خلفشار پیدا کرنے کی جرأت کرے، ترغیب وترہیب کے سارے وسائل اختیار کرنے کا ان کو حق حاصل تھا، ہندوؤں یا مسلمانوں میں جو معزز شخص عیسائیت قبول کرلے اس کو اعزاز واکرام عزت وعہدہ حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیا جائے ان کو ہر طرح کے عیش وآرام کی سہولتیں فراہم کرائی جائیں، ان کو فروغ عیسائیت کے معاملہ میں شریک صلاح ومشورہ کیا جائے اگر مسلمانوں کے اہل علم طبقہ میں سے کوئی عیسائی ہوجائے تو اس کو پادری کا عہدہ اور تنخواہ دی جائے، پادری محی الدین پشاوری، پادری صفدر علی، پادری علی، پادری عبدالکریم، پادری عمادالدین وغیرہ اس دور کے مشہور اور سرگرم پادری تھے جو علماء اسلام سے مناظرہ کرنے اور اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے میں پیش پیش تھے۔

## دہلی کی جامع مسجد کو گرجا گھر بنانے کا فیصلہ:

مسلمان اور ہندو جو سرکاری ملازم تھے ہر ایک کو اتوار کے دن اپنے افسر کے

بنگلہ پر حاضر ہوکر پادریوں کی تقریریں سننی ضروری تھیں اور وہ اس کی پابندی کرنے لگے تھے، پھر اس کے بعد براہ راست تمام مسلمانوں اور ہندو ملازموں کو فرداً فرداً خط لکھا گیا کہ جلد سے جلد عیسائیت قبول کرلیں ورنہ ملازمت سے سبکدوش کردیئے جائیں گے اور سب سے آخر میں کلکتہ کے لاٹ پادری ویڈمنڈ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دارالحکومت کلکتہ میں رہتا تھا جو پورے ملک میں عیسائیت کی مہم کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار تھا اس نے ایک کھلا خط شائع کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہر ہندوستانی از خود جلد از جلد عیسائیت قبول کرلے اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا ورنہ نتیجہ کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، یہ آخری الٹی میٹم تھا کہ اب اس کے بعد بزور طاقت ان کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کردیا جائیگا، اتنی سخت وارننگ کے باوجود پورے ملک سے احتجاج کی ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی انگریزی حکومت نے سمجھ لیا ہندوستانیوں کی حمیت وغیرت مر چکی ہے، بالخصوص مسلمانوں کی غیرت ایمانی دم توڑ چکی ہے اب اس میں کسی جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے اس لئے اس نے دہلی کی مشہور شاہجہانی جامع مسجد جو قلب شہر میں واقع ہے اس کو بڑا گرجا گھر بنانے کا فیصلہ کرلیا اور بڑی سرگرمی سے گردوپیش کا جائزہ لے کر اس سلسلہ میں عملی اقدام کے امکانات کا جائزہ لیا جانے لگا، لندن کے اسقف اعظم پادری پی فنڈر کو اسی جائزہ کے لئے لندن سے بلا کر دارالحکومت دہلی میں متعین کیا گیا۔

## پادری فنڈر کا چیلنج:

پادری پی فنڈر نے لندن میں قیام کے دوران ایک کتاب ''میزان الحق'' کے نام سے اردو میں لکھی تھی، جس میں دین عیسوی کے برحق ہونے کے دلائل اور اسلام کے باطل ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اور جب اس کو شائع کیا گیا تو لندن میں ہر حلقہ سے کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا اور پادریوں کی اکثریت نے کہا کہ یہ کتاب الہام سے لکھی گئی ہے اس کا جواب دینا ممکن نہیں، جو کتاب الہام سے لکھی گئی ہو اس کا

جواب دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، ہر چہار جانب کی تعریفوں سے پادری فنڈر کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اس نے یقین کر لیا تھا کہ علماء اسلام سے اس کا جواب ناممکن ہے وہ یہی کتاب ''میزان الحق'' لے کر دار الحکومت دہلی آیا اور کتاب تقسیم کر کے چیلنج کیا کہ اگر مسلمان اپنے کو اہل حق سمجھتے ہیں تو اس کتاب کے دلائل کو توڑ دیں اور کتاب کا جواب لکھ دیں۔

## چیلنج منظور ہے:

یہ ۱۸۵۴ء کے آغاز کی بات ہے، پورے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا اور حکومت پورے ملک کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی تھی پورا ملک اس کی مٹھی میں تھا، ہر شخص سہما ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ فنڈر کی زبان میں ایک ظالم و جابر حکومت بول رہی ہے، فنڈر کا جواب دینے کا مطلب حکومت سے جنگ کرنی ہے اور اس کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، عوام کی تو کیا حیثیت تھی بادشاہ وقت خود لال قلعہ کی چہار دیواری میں قید تھا اور کمپنی کا وظیفہ خوار تھا قلعہ کی فصیل کے باہر اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی پوری دہلی پر کمپنی حکمراں تھی ہندوستان میں اسلام اسی بے بسی و بے کسی کے عالم میں تھا کہ ایک غیرتمند مرد مسلمان اٹھا اور پادری پی فنڈر کے چیلنج کے جواب میں پوری قوت ایمانی کے ساتھ اعلان کیا کہ میں مجمع عام میں پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں وہ مرد مسلماں اور مجاہد اعظم **مولانا رحمت اللہ کیرانوی** تھے۔

## مناظرہ کے وقت ماحول اور فضا:

تبلیغ عیسائیت کا ماحول اتنا گرم ہو چکا تھا کہ سرسید جیسا انگریز پرست بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ دار الحکومت دہلی میں جتنے سرکاری ملازم تھے اور چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز تھے چاہے وہ ہندو رہے ہوں یا مسلمان ہر ایک کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ امروز فردا میں ہم سب لوگوں کو چاہے بہ رضا و رغبت چاہے بہ جبر و اکراہ عیسائیت قبول کر لینا

پڑے گا، فرداً فرداً ملازم کو چٹھیوں اور سرکلر کے ذریعہ ان کو عیسائیت قبول کرنے کی دعوت ملتی رہتی تھی۔

ابھی جبر وقہر کا مرحلہ نہیں آیا تھا البتہ کلکتہ کا بڑا پادری ایک کھلا خط تمام ہندوستانیوں کے نام لکھ چکا تھا کہ اب ہر شخص کو عیسائیت قبول کر لینا ضروری ہو گیا ہے خط پڑھ کر کچھ ضمیر فروش تو عیسائیت قبول کر چکے تھے کچھ تذبذب میں تھے، بقیہ تمام لوگ کانپ کر رہ گئے کہ اب ایمان کی خیر نہیں، ہفتہ دو ہفتہ میں جبری حکم نافذ ہو کر رہے گا اگر ہم نے عیسائیت قبول نہیں کی تو ہم سے اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جائے گا، یہ سوچ کر جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت تھی ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا نہیں کوئی ان کو صحیح راہ دکھانے والا نہیں کوئی بھی ان کی فریاد سننے والا نہیں تھا حتی کہ کوئی صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں تھا مرعوبیت کا وہ عالم تھا کہ اس جبر وقہر کے مقابلہ میں کسی کو زبان سے انکار کا لفظ برملا کہنے کی بھی ہمت نہیں تھی، بس گوشہ تنہائی میں آنسو بہا کر رہ جانا ان کا مقدر بن چکا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے غراتے ہوئے شیر کے سامنے ہرن اور خونخوار درندوں کے سامنے بکریاں کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا، ٹھیک اسی کربناک اور خوف زدہ ماحول میں **مولانا رحمت اللہ کیرانوی** جیسے مرد مسلمان نے دہاڑتے ہوئے طوفان سے لڑنے کا اعلان کر دیا اور کہہ دیا

یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

پادری فنڈر کے چیلنج کے جواب میں مولانا موصوف کے اعلان کا مطلب یہ تھا کہ توحید پرستوں کے بدن میں جب تک جان ہے وہ کبھی بھی تم کو ہندوستان کو اندلس بنانے کا موقعہ نہیں دیں گے، تمہارے خواب کو چکنا چور کر دیں گے نعرۂ توحید کی تثلیث پرستی کے شور وشغف سے دبانے، توحید کے مراکز ومساجد کو تثلیث پرستوں کا اڈا بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جب تک اس سرزمین پر ایک بھی توحید پرست زندہ رہا وہ کبھی تمہارے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دے گا۔

## وہ مردِ مسلمان کون تھا؟

شیر جیسا کلیجہ رکھنے والا مردِ مسلمان کون تھا؟ جس نے تن تنہا اپنی جان ناتواں کی ایمانی طاقت سے کام لے کر اتنی جابر وقاہر حکومت کو چیلنج کر دیا، اس میں حیرت کی کیا بات ہے اسلامی تاریخ یہی رہی ہے، تنہا ایک فرد نے ملکوں کی کایا پلٹ دی ہے فاتح سندھ محمد قاسم نے ہندوستان کی زمین کو روند ڈالا اور اسلام کی روشنی کو کہاں تک پہنچا دیا طارق بن زیادہی کے عزم جواں نے سمندروں کو کشتیوں کے ذریعہ عبور کر کے کشتیوں کو ساحل سمندر پر جلا کر خاکستر کر دیا کہ اب اس سرزمین کو فتح کر کے ہم کو یہیں قیام کرنا ہے وطن لوٹ کر جانے کا کیا سوال؟

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

سعد بن وقاصؓ کی قوت ایمانی تھی کہ سیلاب سے چنگھاڑتے ہوئے دجلہ میں گھوڑے ڈال دیئے اور پار اتر گئے اور غضبناک سیلاب منہ دیکھتا رہ گیا اگر ہندوستان کا ایک مردِ مجاہد عیسائیت کے طوفان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا کہ یا تو طوفان کو رکنا ہوگا ورنہ میری لاش اس سیلاب کو روک کر رہے گی تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟ مسلمان قوم تو عجائبات کو وجود میں لانے والی قوم ہی رہی ہے، اندلس کے بے غیرت عیش پسند حکمرانوں نے بزدلی دکھائی تو ہندوستان کے علماء اتنے بے غیرت نہیں وہ نہتے ہو کر جنگ کرنا جانتے ہیں، ایمان کی طاقت ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، ضلع مظفرنگر کے ایک معمولی قصبہ کیرانہ کا وہ شیر دل مسلمان جن کو بہت کم لوگ جانتے تھے اور چند دنوں کے بعد ہندوستان ہی نہیں تمام اسلامی ممالک بلکہ ان سے کہیں زیادہ یورپ کے ممالک کی زبانوں پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام جاری ہو گیا اور وہ عالمی شہرت کے مالک ہوئے کیونکہ انہوں نے ایسے کربناک سناٹے میں اپنی زلزلہ افگن آواز سے ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں جان ڈال دی تھی۔

## مولانا رحمت اللہ کیرانوی:

مولانا موصوف کیرانہ ضلع مظفر نگر کے محلّہ دربار کلاں میں جمادی الاول ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے والد کا نام خلیل اللہ عرف مولوی خلیل الرحمٰن تھا، یہ کیرانہ کے عثمانی شیوخ میں سے تھے، مولانا کے مورث اعلیٰ میں ایک حکیم محمد حسن تھے جو اپنے والد کے ساتھ شہنشاہ اکبر کے ایک حادثے میں زخمی ہوجانے پر معالج رہے، صحت کے بعد اکبر نے خوش ہوکر حکیم محمد حسن کو پرگنہ کیرانہ ومضافات بطور جاگیر دیا ذی قعدہ ۹۱۵ھ کو فرمان شاہی جاری ہوا یہ فرمان شاہی آپ کے خاندان میں محفوظ رہا، کیرانہ جاگیر میں ملنے کے بعد یہ خاندان پانی پت سے کیرانہ منتقل ہوگیا تب سے یہ خاندان یہیں آباد ہے، آپ کے خاندان کے افراد ہر دور میں مغلیہ دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر ہمیشہ فائز رہے، شاہجہاں بادشاہ بھی کیرانہ میں تین دن اس خاندان کا مہمان رہا اس نے اپنی یادداشت میں اس کا ذکر کیا ہے غرضیکہ مولانا رحمت اللہ ایک بڑے جاگیردار گھرانے کے فرد تھے، نہایت شان وشوکت کے ماحول میں آپ نے پرورش پائی، دینداری اس گھرانے کی ایک بڑی خصوصیت تھی اسی لئے مولانا رحمت اللہ نے مشاہیر علماء ہند سے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر آپ نے دہلی کا سفر کیا اور مدرسہ مولانا محمد حیات دہلی میں داخل ہوئے اور مدرسہ کے دارالاقامہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی اسی دوران آپ کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب دہلی میں مہاراجہ ہندوراؤ کے میر منشی مقرر ہوکر دہلی میں قیام پذیر ہوگئے مولانا رحمت اللہ صاحب بھی اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے اور مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے دہلی کے بعد آپ نے بغرض تعلیم لکھنؤ کا سفر کیا اور اس دور کے مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی بالخصوص مفتی سعد اللہ صاحب سے زیادہ استفادہ کیا اور پھر اپنی خاندانی روایت کے مطابق فن طب کی تعلیم حکیم فیض محمد صاحب سے حاصل کی اور مسٹر لوکارتھم سے ریاضی بھی پڑھی آپکے مشہور اساتذہ میں مولانا محمد حیات صاحب دہلی مولانا مفتی

سعد اللہ صاحب مولانا احمد علی صاحب بڈولی ضلع مظفر نگر جو بعد میں وزیر مہاراجہ پٹیالہ ہوئے ،مولانا عبدالرحمٰن چشتی مولانا امام بخش صہبائی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

## تعلیم سے فراغت کے بعد:

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ اپنے وطن کیرانہ واپس ہوئے اور اپنے محلّہ دربارکلاں کی مسجد میں درس وتدریس کا آغاز فرمایااور پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینی علوم وفنون کی تعلیم دینے لگے، اگر چہ تعلیم وتدریس کا یہ دور بہت مختصر رہا لیکن ہندوستان کے درجنوں مشاہیر علماء نے اسی مختصر دور میں آپ سے تعلیم حاصل کی اور درجہ کمال کو پہنچے،مولانا عبدالوہاب ویلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات ویلور مولانا بدرالاسلام عثمانی کیرانوی (جوتر کی جاکرشاہی کتب خانہ حمیدیہ کے مہتمم ہوئے) مولانا احمد اللہ چکوالی اورمولانا عبدالسمیع رامپوری جیسے مشہور علماء آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں آپ کے سلسلہ تدریس کو ابھی چند ہی سال گذرے تھے کہ مہاراجہ ہندوراؤ دہلی نے آپ کے والد مولوی خلیل اللہ اورآپ کو دہلی بلاکر ان کونگراں امور ریاست اور مولانا رحمت اللہ صاحب کو اپنا میر منشی مقرر کردیا، کچھ ہی دِنوں کے بعد آپ کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا، خاندانی حالات کا تقاضا ہوا تو آپ نے اپنی جگہ چھوٹے بھائی مولوی محمد جلیل کو میر منشی مقرر کردیا، اورخود کیرانہ واپس آگئے اور از سر نو درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔

## ردعیسائیت کا عزم بالجزم:

دوبارہ تدریسی سلسلہ شروع کرنے کے وقت ملک میں حالات تشویشناک حد تک بگڑ چکے تھے، کمپنی کے مقبوضات کا دائرہ انتہائی وسیع ہوچکا تھا سلطنت مغلیہ کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر لال قلعہ کے اندر ضرور تھا لیکن دارالحکومت دہلی پر کمپنی کا قبضہ تھا اور بادشاہ بے دست وپا ہوکر لال قلعہ کے حصار میں بند تھا، پادریوں کی فوج

پورے ملک میں دندناتی پھر رہی تھی خود دارالحکومت دہلی میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے چیلنج بنی ہوئی تھی، دہلی میں یورپ کا مایۂ ناز عالم پادری پی فنڈر کی لن ترانیاں پورے زور وشور سے جاری تھیں یہ خبریں مولانا رحمت اللہ صاحب کو برابر ملتی رہتی تھیں ان کے جیسا بیدار مغز اور حساس عالم دین اس سے صرف نظر کیسے کرسکتا تھا مگر وہ دہلی سے دور اپنے وطن کیرانہ میں درس وتدریس میں مصروف تھے مگر عیسائی پادریوں کے ان اعتراضات سے باخبر تھے جو وہ اسلام پر کرتے تھے اور اپنی تقریروں میں زور وشور کے ساتھ بیان کرتے تھے اسلئے کیرانہ کے دوران قیام آپ نے ان اعتراضات کے جواب میں ایک کتاب ”ازالۃ الاوھام“ کے نام سے لکھنی شروع کردی۔

## جہاد کی راہ میں:

صورتِ حال کی کربنا کی نے مولانا رحمت اللہ صاحب سے سلسلہ تدریس چھڑادیا اور وہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکل پڑے، دہلی کی شاہجہانی مسجد کو گرجا گھر بنانے کی افواہ مسلمانوں میں بڑے زوروں سے گردش کررہی تھی، پادری فنڈر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو چیلنج کررہا تھا کہ اگر کسی مسلمان میں جرأت وہمت ہے تو سامنے آئے اور دین مسیحی کو باطل قرار دے اور کسی بھی مسلمان عالم کو اپنے مذہب کے حق ہونے کا دعویٰ ہے تو میری کتاب ”میزان الحق“ کا جواب دے، جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کا جم غفیر آباد تھا، اس کی تقریروں میں ہزاروں مسلمان بھی شریک ہوتے تھے، لیکن پادری فنڈر کے جواب میں ایک آواز بھی کسی سمت سے نہیں اٹھتی تھی کسی میں لب کشائی کی جرأت ہی نہیں تھی، جب کہ دہلی علماء سے بھری ہوئی تھی اور یہ علماء بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے لیکن کوئی بھی سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ پادری فنڈر کی ہفوات کا جواب دینا اپنے قتل کے محضر پر دستخط کرنا ہے اس لئے ہر طرف سناٹا تھا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو اس صورت حال سے سخت بے چینی تھی ان کے دل

کو جو چوٹ پہنچتی تھی اس کا مداوا صرف یہ تھا کہ پادری فنڈر کی زبان کو لگام دی جائے اور جب تاب ضبط نہیں رہی تو ایک دن آپ نے پادری فنڈر کے چیلنج کا جواب دے دیا اور اعلان کر دیا کہ پادری فنڈر جب چاہے جہاں چاہے اور جس موضوع پر چاہے میں اس سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

مولانا موصوف نے اس اعلان ہی پر بس نہیں کیا بلکہ براہ راست پادری فنڈر کی قیام گاہ پر جا کر بالمشافہہ چیلنج دینے کا عزم بالجزم کر لیا، مولانا موصوف کے ایک مخلص دوست مولوی امیر اللہ میر مختار مہاراجہ بنارس تھے وہ پادری فنڈر سے بھی واقف تھے مولانا موصوف نے ان سے اپنے فیصلہ کا اظہار کیا اور فرمایا کہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا پادری فنڈر سے مل کر اس کو چیلنج دینا ہے، وہ تیار ہو گئے، آپ ان کو لے کر پادری فنڈر کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

## پادری فنڈر کو براہ راست چیلنج:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے جب پادری فنڈر کا جواب دینے کا اعلان کیا تھا اس وقت یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ پادری فنڈر کی ہفوات کے جواب میں مسلمان اب تک خاموش رہے، یا اس کی کتاب "**میزان الحق**" کا جواب نہیں دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا اس کی تقریریں لاجواب اور اس کی کتاب الہام سے لکھی گئی ہے، ہماری طرف سے اس کا جواب اس لئے نہیں دیا گیا کہ ہم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ "**میزان الحق**" میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کی حیثیت تارعنکبوت سے زیادہ نہیں تھی۔

اس غیر مبہم اور واضح اعلان کے بعد آپ براہ راست گفتگو کے لئے اس کے گھر پہنچے اتفاق سے وہ گھر پر نہیں تھا اس لئے بذریعہ تحریر اس کو چیلنج کیا گیا جس کا اس نے جواب دیا یہ خط و کتابت مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے درمیان ۲۳/ مارچ ۱۸۵۴ء سے ۷/اپریل ۱۸۵۴ء تک چلتی رہی، عنوان مناظرہ، تاریخ، اور مقام مناظرہ

سب پادری فنڈر کی صوابدید کے مطابق طے ہوا، مولانا موصوف نے اپنی طرف سے اس کی کسی تجویز کو رد نہیں کیا، کیونکہ آپ ہر حال اور ہر طرح کے ماحول میں اس سے مناظرہ کر کے اس کو اس کی اوقات بتا دینے کا تہیہ کر چکے تھے، کیونکہ آپ اس کے مبلغ علم کا اندازہ کر چکے تھے مناظرہ ۱۰/ اپریل ۱۸۵۴ء کو بمقام کٹرہ عبدالمسیح آگرہ ہونا طے پا گیا۔

## مناظرہ گاہ:

یہ مناظرہ ایک عیسائی کے احاطہ میں تمام اعلیٰ عہدیداران حکومت کی موجودگی میں ہونا طے ہوگیا حکومت کی پوری مشنری کو اس پر حیرت تھی، اب تک کمپنی کے انگریز افسران اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو پورے ملک میں ایک آواز بھی سنائی نہیں دی تھی کہ سرکاری طور پر تبلیغ عیسائیت کی جو مہم چلائی جارہی ہے اس کے خلاف آواز کسی ہندوستانی نے اٹھائی ہو یا کسی نے اس میں رخنہ اندازی کی کوشش کی ہو اس طرح کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملی تھی، یہ پہلا تجربہ تھا کہ یورپ کے مایۂ ناز پادری کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا گیا تھا، وہ حیرت زدہ بھی تھے اور ان کو غصہ بھی تھا کہ حکومت کے پلان کو سبوتاژ کرنے کی کسی ہندوستانی کو کیسے جرأت ہوئی؟ پادری فنڈر نے تبلیغ عیسائیت کا جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اس کا منطقی نتیجہ تو یہی تھا، چیلنج کا جواب چیلنج ہی ہوتا ہے، للکار کا جواب للکار ہی سے دیا جاتا ہے اس لئے مجبوراً ان کو اس مناظرہ کا نظم ونسق سنبھالنا پڑا۔

عام مسلمان تو دہشت زدہ تھے اس لئے عام تماشائی کی حیثیت سے بھی شریک ہونے کی ہمت نہیں رکھتے تھے دوسرے یہ کہ مناظرہ کا ماحول ایسا رکھا گیا جیسے کوئی سرکاری پروگرام منعقد ہورہا ہے ہر طرف مسلح پولس ہتھیار لگائے افسران، بڑے سے بڑے فوجی افسر سرکاری عہدیداران ہر طرف چھائے ہوئے تھے عام مسلمان اس راہ سے گذرنے کو بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھتے تھے، صرف علماء اسلام اور شہر آگرہ کے کچھ معزز افراد اس مناظرہ میں موجود تھے، حکومت کے افسران کچھ تو اپنے عہدہ کی

ذمہ داری اور ڈیوٹی سمجھ کر شریک ہوئے اور بہت سے اونچے درجے کے انگریز افسر ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اپنے طور پر بصد ذوق وشوق مناظرہ گاہ میں حاضر تھےان کوسب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ آج یورپ کا سب سے بڑا عیسائی عالم جب مجمع عام میں علماء اسلام کو ذلت آمیز شکست دے گا اور ان کا منہ بند کر دے گا تو پورے ملک میں عیسائیت سیلاب کی طرح پھیل جائیگی اور حکومت کی منشا از خود پوری ہو جائے گی، اس مناظرہ میں مسلمانوں کی شکست کے بعد عیسائیت کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جائے گی، اسی خوش فہمی کی وجہ سے اعلیٰ عہدیدار، مشنری ذہن ومزاج کے انگریز افسران اپنی پوری وردی میں اپنی کرسیوں پر غرور وتمکنت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ کی رودادوں میں جن مخصوص حاضرین کے نام دیئے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچین سکنند صدر صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر ایڈلی ترجمان حکومت کمپنی، پادری ولیم گلین، پادری فنڈر، پادری فرنچ اور دوسرے پادریوں کی فوج قطار اندر قطار مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ میر مختار راجہ بنارس، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، منشی سراج الحق، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر علی خان وغیرہ یہ پہلے دن کی فہرست ہے دوسرے دن ایک ہزار کے قریب مجمع تھا افسران کی تعداد بھی زیادہ تھی اور مسلمانوں کا مجمع دوسرے تیسرے دن زیادہ ہوتا چلا گیا۔

## مناظرہ شروع ہوتا ہے:

یہ مناظرہ تین دنوں تک چلتا رہا پہلے دن نسخ پر بحث ہوئی اور سارے دن اسی موضوع پر گفتگو چلتی رہی دوسرے دن انجیل میں تحریف وترمیم کی بحث چلی یہ بحث کافی ہنگامہ خیز بھی رہی اور فیصلہ کن بھی۔

یہ مناظرہ تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر ہو رہا تھا اس کی شہرت پورے

ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ انگلینڈ تک تھی اور اس کے نتیجہ کا انتہائی بے چینی کے ساتھ ہر طرف انتظار کیا جا رہا تھا، مناظرہ کا پہلا اجلاس صبح سویرے ۱۰/ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱/ رجب ۱۲۷۰ھ بروز دوشنبہ شروع ہوا سب سے پہلے پادری فنڈر اسٹیج پر آیا اور اپنی افتتاحی تقریر سے مناظرہ کا آغاز کیا اس نے اپنی تقریر میں کہا، یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مناظرہ کیوں کر منعقد ہوا، یہ مولانا رحمت اللہ کی سعی وکوشش اور خواہش کا نتیجہ ہے، اس سے فائدہ کی صورت میرے نزدیک نظر نہیں آتی، میری تمنا یہ ہے کہ دین عیسوی کی حقیقت مسلمانوں کے سامنے رکھوں، مباحثہ کے عنوانات نسخ وتحریف، الوہیت وحیات مسیح، تثلیث، رسالت محمدی طے ہوئے ہیں۔

پھر اس نے دین عیسوی کے برحق ہونے اور انجیل کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے محفوظ اور ہر قسم کی تحریفات سے پاک صاف ہونے پر روشنی ڈالی گویا اس نے فریق مخالف کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کر دیا کہ ہمارا مذہب حق ہے ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔

پھر اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ رسالت محمدی کے بعد دین عیسوی منسوخ ہو گیا اب دین عیسوی پر عمل کر کے آخرت میں نجات ممکن نہیں، پورے دن اسی موضوع پر سوال وجواب ہوتا رہا۔

## دوسرے دن کا اجلاس:

پہلے دن پادری نے مدعی بن کر اپنا دعویٰ پیش کیا فریق مخالف کو اس کا جواب دینا تھا اور اس کے دعوے کو غلط ثابت کرنا تھا دوسرے دن کے اجلاس میں مولانا رحمت اللہ صاحب مدعی ہوئے اور تقریر کے لئے کھڑے ہوئے نسخ پر بحث ہو چکی تھی آج تحریف انجیل پر بحث ہونی تھی مسلمان مدعی تھے کہ انجیل محرف ہے مولانا کیرانوی نے اپنی تقریر میں انجیل کے محرف ہونے پر متعدد دلائل دیئے اور ثابت کیا کہ آج آپ کے ہاتھ میں جو انجیل ہے وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی،

اس کی حفاظت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک کوئی قابل اعتماد طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے انجیل میں جگہ جگہ تحریف ہوتی رہی جو مذہب ایک ایسی کتاب پر منحصر ہو جو اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہی وہ مذہب برحق کیسے ہوسکتا ہے، اسلئے دین محمدی کے مقابلہ میں عیسوی کو پیش کرنا قرین انصاف نہیں۔

## سوال و جواب:

مولانا موصوف کی مفصل اور مدلل تقریر کے بعد پادری فنڈر نے کہا کہ آپ کی دلیلوں سے انجیل کا محرف ہونا نہیں ثابت ہوتا اس لئے آپ کے دلائل ہمارے لئے کچھ مضر نہیں، تحریف کی ایسی دلیل پیش کی جائے جس سے انکار کی گنجائش نہ ہو، اس جواب پر مولانا نے براہ راست فنڈر سے پوچھا کہ آپ کو کس طرح کی دلیل چاہئے، آپ بتائیں تو ہم اس طرح کی بھی دلیل پیش کرسکتے ہیں، پادری فنڈر نے کہا کہ آپ موجودہ انجیل میں کوئی ایسی عبارت بتایئے جو پہلے کے نسخوں میں موجود نہیں تھی اور آج کی انجیل میں ہے تو ہم اس کو تحریف تسلیم کرلیں گے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا کہ ابھی لیجئے، آپ نے اپنے رفیق ڈاکٹر وزیر خاں سے فرمایا کہ وہ عبارت نکال کر پیش کیجئے جو دیکھی گئی ہے، انہوں نے یوحنا کے پہلے خط باب ۵ آیت ۷-۸ کا حوالہ دیا اور کہا کہ سب مانتے ہیں کہ یہ آیات قدیم نسخوں میں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے نسخوں میں موجود ہیں۔

اس کھلی ہوئی شہادت اور ناقابل انکار ثبوت پر پادری فنڈر نے کہا کہ ہاں صاحب! اس جگہ، اس کے علاوہ ایک دو جگہ اور اس طرح کی تحریف ہوئی ہے، یہ اعتراف مجمع عام میں ہوا تھا اور پورا مجمع گوش برآواز تھا حاضرین پوری توجہ سے بحث سن رہے تھے اس لئے جوں ہی پادری فنڈر نے تحریف کا اعتراف کیا مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا ہوگیا، مسلمانوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے رومال اور ٹوپیاں فضا میں اچھال کر اپنی خوشی کا مظاہرہ کرنے لگے، یہ منظر دیکھ کر پادریوں کے چہرے فق

ہوگئے، انگریز افسران متحیر تھے کہ یہ کیا ہوگیا، چونکہ یہ بحث اردو میں ہورہی تھی اور وہ اردو سمجھ نہیں رہے تھے اس لئے مسٹر اسمتھ صدر دیوانی نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے پادری فرنچ سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا ہوگیا ہے؟ کیا بات ہوگئی؟ یہ اظہار مسرت کیسا ہے؟ تو پادری فرنچ نے انگریزی میں سمجھایا کہ مولوی صاحب انجیل کے مفسروں کی کتابوں سے چھ سات مقامات جہاں تحریف ہوئی ہے ڈھونڈ کر لائے ہیں۔

اس کے بعد پادری فنڈر کے معاون پادری فرنچ نے کھڑے ہوکر کہا کہ فنڈر صاحب بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ انجیل مقدس میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے، پادری فرنچ کے اس اعلان پر مولوی قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ نے منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار سے کہا کہ نوٹ کرلیجئے کہ پادری فنڈر نے آٹھ جگہ انجیل میں تحریف کا اقرار کیا ہے، پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا، ہاں صاحب ضرور لکھ لیجئے میں کہتا ہوں کہ سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے۔

اب وہ مجمع جس پر پہلے خوف وہراس طاری تھا بے قابو ہوتا جارہا تھا ایک طرف ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور مسلمان ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے دوسری طرف پادریوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مردنی چھائی ہوئی تھی، ان کی آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں، شرمندگی وندامت اور شکست کی ذلت کا وہ عالم تھا کہ حکومت کی پوری طاقت کے باوجود ان کی زبان گنگ ہوئی جارہی تھی، ایسی روشن اور واضح شکست ہوئی کہ عوام وخواص کسی سے بھی چھپی نہیں رہ گئی اگر افسران کی اتنی بڑی تعداد موجود نہ ہوتی تو شاید وہ بہت کچھ ہوجاتا جو ہندوستان کا مزاج ہے لیکن صرف اظہار مسرت تک بات رہ گئی۔

## ذلت پر ذلت:

پادری فنڈر اب حواس باختہ ہوچکا تھا اور حواس باختہ انسان جو بھی حرکت کرتا ہے وہ اس کے خلاف ہی جاتی ہے اور مزید ذلت ورسوائی کا باعث ہوتی ہے، نا قابل

برداشت ذلت سے جھنجھلا کر پادری فنڈر جوش میں کھڑا ہو گیا اس نے ایک لمبی تقریر کی اور کہا کہ ایسی تحریفوں سے انجیل کی اصولی تعلیم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اپنی تقریر میں زور بیان پیدا کرنے کے لئے اس نے مفتی ریاض الاسلام صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ مفتی صاحب! آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کی تحریفات سے انجیل مقدس کی اصولی تعلیم اور انجیل کے مطالب میں کیا فرق پڑتا ہے؟ فنڈر کا روئے سخن مفتی ریاض الاسلام کی طرف تھا تو مفتی صاحب ہی کھڑے ہوئے اور جو کچھ فرمایا وہ ایک غیر تمند انسان کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہے آپ نے فنڈر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب! جب کسی وثیقہ یا دستاویز میں ایک جگہ بھی ملاوٹ جعل سازی ثابت ہو جائے تو پورا وثیقہ اور دستاویز قابل اعتماد نہیں رہ جاتا اگر بقول آپ کے انجیل میں سات آٹھ جگہ تحریف ہو گئی تو اس کا اعتماد تو اٹھ گیا کیا ثبوت ہے کہ دوسرے مقامات میں تحریف نہیں ہوئی اس لئے آپ کے ہاتھ میں جو انجیل ہے اس میں اصلی کتنی ہے؟ نقلی اور جعلی کتنی ہے کیا معلوم؟ پادری صاحب آپ غور فرمائیں کہ انجیل میں جہاں کہیں دو عبارتیں ہوں دونوں میں تضاد یا اختلاف ہو تو کیا دونوں کو خدا کا کلام کہہ سکتے ہیں؟ پادری فنڈر نے اس کے جواب میں کہا نہیں، ان میں سے کوئی ایک ہی خدا کا کلام ہو سکتا ہے، تب مفتی صاحب نے پر روز الفاظ میں فرمایا کہ اہل اسلام کا یہی دعویٰ ہے کہ موجودہ بائبل کا مجموعہ سب کا سب خدا کا کلام نہیں ہے، اس کا جواب پادری فنڈر کے پاس کچھ نہیں تھا **فبهت الذی کفر**، وہ ایک دم چپ ہو گیا اور وقت کے ختم ہونے کا بہانا بنا کر جلسہ کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

## مناظرہ کے تین دن:

یہ تاریخ ساز مناظرہ تین دنوں تک جاری رہا ان تین دنوں میں پادری سطحی باتوں اور عوام اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے کی جانے والی تقریروں کو دہراتے رہے، علماء اسلام کی مدلل بحثوں کے سامنے وہ طفل مکتب ثابت ہوتے تھے، کسی مسئلہ پر

پادری فنڈر چند منٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکا، تیسرے دن مسلمانوں کی فتح مبین اور جوش وخروش کو دیکھ کر اس کی ہمت ٹوٹ گی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی آگرہ میں قیام پذیر ہوکر روز تقاضے کرتے رہے کہ چوتھا اجلاس بلایئے مگر پادری فنڈر کو اپنی ساری لن ترانیاں بھول گئیں اونٹ پہاڑ کے سامنے بلبلا کر رہ گیا، اس کے معاون پادریوں پر بھی مایوسی طاری رہی، باہمی صلاح ومشورہ سے تمام پادریوں نے طے کیا کہ آئندہ مناظرہ کا سلسلہ بند ہوجانا ہی مصلحت کا تقاضا ہے، حالانکہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے پادری فنڈر کا جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ طے ہو چکا تھا کہ جب تک نسخ وتحریف کے مسئلہ پر پوری بحث نہ ہوجائے مناظرہ کا سلسلہ جاری رہے گا، لیکن تین دنوں کی ذلتوں کے یہ پہاڑ سے دن کسی طرح پادریوں کے سروں سے گذر گئے اب مزید ذلت برداشت کرنے کے لئے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں تھے اس لئے وہ اپنے طور پر طے کر چکے تھے کہ اب مناظرہ کسی قیمت پر جاری نہیں رکھا جائے گا، مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے رفیق ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ آگرہ میں ہفتوں مقیم رہے اور بار بار پادری فنڈر سے مطالبہ کرتے رہے کہ مناظرہ کے جلسے بلایئے تاکہ بحث مکمل ہوجائے مگر وہ کسی حال میں تیار نہیں ہوا۔

## پادری فنڈر کا فرار:

مولانا رحمت اللہ صاحب آگرہ میں کئی ہفتے قیام کے بعد وطن واپس آگئے اب ان کو یقین تھا کہ پادری فنڈر کی لفاظیاں، لن ترانیاں، اور چرب زبانیاں یقیناً بند ہوجائیں گی اور ان شاء اللہ یہ مناظرہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کا خواب دیکھنے والوں کی نیندیں حرام کردے گا ان کا خواب چکنا چور ہوجائے گا، آپ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک دن آپ نے سنا کہ پادری فنڈر ہندوستان میں فروغ دین عیسوی کی مہم چھوڑ کر راتوں رات لندن فرار کر گیا کیوں کہ عام پادریوں اور حکومت کے اعلیٰ افسران کی نگاہوں میں اس کی قدر وقیمت ختم ہوچکی تھی، حکومت کے ذمہ داروں کی

رپورٹ سے لندن میں یہ خبر عام ہوچکی تھی کہ ہندوستان میں پادری فنڈر کو ذلت آمیز شکست ہوگئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لندن میں جس عہدہ پر تھا اس سے معزول کر دیا گیا، کیونکہ مناظرہ میں اس کی شکست سے حکومت کا وہ منصوبہ جو پورے ملک کو عیسائی بنا کر اندلس کی طرح حکومت کو مستحکم بنانا پیش نظر تھا وہ منصوبہ فیل ہوگیا۔

## انقلابی اقدام:

بظاہر یہ دو مذہبوں کے عالموں میں مباحثہ ومناظرہ تھا جو اکثر ہوتا رہتا ہے لیکن یہ صرف مناظرہ نہیں تھا بلکہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مستقبل میں دین عیسوی کی اشاعت کا طریقہ کار کیا ہوا، اس مناظرہ سے یہ اندازہ کرنا تھا کہ مسلمانوں میں اپنے دین کی طرف سے مدافعت کی کتنی طاقت ہے کیا علمی سطح پر ان کو شکست دے کر احساس کمتری میں مبتلا کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو عیسائیت کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اگر کوئی طاقت حائل ہونے کی جرأت بھی کرے گی تو جبر وقہر کی تلوار ان کا سارا نشہ ہرن کر دے گی مگر اس تجربہ کا نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف نکلا، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کی موجودگی میں پادری فنڈر کو ذلت آمیز شکست دے کر وارننگ دے دی کہ جو لوگ اسلامی ہند کو اندلس بنانا چاہتے ہیں عیسائیت کو بہ جبر واکراہ نافذ کر کے اسلام کو شکست دینے کا خواب دیکھتے ہیں وہ یہ خواب دیکھنا چھوڑ دیں، یہ اندلس نہیں ہندوستان ہے یہاں کے علماء عیش پسند نہیں خارزار وادیوں کو روندنے والے ہیں اور انگاروں پر چل کر اپنے دین کی حفاظت کا حوصلہ رکھتے ہیں، اندلس کے بزدل حکمراں نہیں کہ میدان جنگ میں مردانہ وار جان دینے کے بجائے عورتوں کی طرح روتے ہوئے قلعہ کی کنجیاں حوالے کر دیں، مولانا رحمت اللہ نے اپنے رفقاء کو ہمراہ لے کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ مناظرہ کر کے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا کہ تثلیث پرستی کی سیاہی سے نیر اسلام کی تابانیوں کو اس سرزمین میں شکست دینا ممکن نہیں ہے۔

## مناظرہ کے اثرات:

مناظرہ آگرہ میں ہوا وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار انسانوں کی موجودگی میں لیکن اس کے دوررس اثرات مرتب ہونے سے مسلمان اور ہندو دونوں طبقوں میں یہ یقین پیدا ہوگیا کہ انگریزوں کی یہ نئی حکومت دونوں کے مذہبوں کی دشمن ہے، وہ اس ملک کی دونوں بڑی قوموں کے مذہبوں کے نام ونشان مٹادینا چاہتی ہے اس لئے نئی حکومت کے خلاف پورے ملک میں نفرت بتدریج بڑھتی رہی یہاں تک کہ فوج تک اس کے اثرات پہنچ گئے، اور میرٹھ چھاؤنی میں نفرت کا پہاڑ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا، میرٹھ چھاؤنی کے فوجیوں کو جو کارتوس دیئے گئے ان کو دانت سے کاٹ کر بندوق میں لگانا پڑتا تھا، ان کارتوسوں کے بارے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اس میں گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے مسلمان اور ہندو دونوں طرح کے فوجیوں نے یقین کرلیا کہ ہمارے مذہب اور دھرم کو نشٹ کرنے کی حکومت نے سازش کی ہے۔

مناظرہ آگرہ کے تین سالوں بعد مئی ۱۸۵۷ء میں اسی مسئلہ کو لے کر بغاوت ہوگئی جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، باغی فوجیوں نے اپنے انگریز افسران پر بندوق تان لی اور جو سامنے آیا باغیوں کی گولی اس کے سینہ سے پار کر گئی میرٹھ کی فوج دہلی تک چڑھ آئی انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا ان کی زندگی کے برے دن آگئے۔

## خون آشام انتقام:

ملک کو عیسائیت پر مجبور کرنے اور ہندوستان کو اندلس بنانے کا خواب چکنا چور ہوگیا اب وہ یہ خواب دیکھنے کی پوزیشن ہی میں نہیں رہے بڑی مشکلوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت بچائی، اور جب فوجی بغاوت پر اپنی ہزاروں جانیں گنوا کر قابو پالیا تو جوش انتقام میں انگریز وحشی درندہ بن گیا اور چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی

طرح گرد و پیش کے ہر شخص کو ڈسنے کے لئے اس کی زبان لپلپانے لگی اس فوجی بغاوت کے دبانے کے بعد انگریزوں نے اپنے ان دشمنوں کو فراموش نہیں کیا جو آگرہ میں مناظرہ کر کے عیسائیت کی راہ میں سنگ گراں بن گئے اور حکومت کے پلان کو ناکام کر دیا تھا اس سلسلہ میں سرفہرست مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں تھے، ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بیدار مغز علماء اور مجاہدین اسلام کی ایک پوری جماعت بھی انگریزوں کی مجرم بن گئی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی صرف زبان ہی سے اپنا فرض انجام دینے کے قائل نہیں تھے وہ تلوار کے بھی دھنی تھے اس لئے تین سال قبل کے واقعہ مناظرہ کو مدنظر رکھ کر ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کرایا گیا، فوج اور پولس ان کی گرفتاری کے لئے دوڑ پڑی۔

## مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ہجرت:

مولانا رحمت اللہ صاحب بھی دشمن کی طرف سے غافل نہیں تھے شاہانہ زندگی گذارنے والے نوکروں چاکروں کی فوج جلو میں رکھنے والے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی عالم دین بھی تھے اسلام کے محافظ تھے اس لئے دین کی حفاظت کے لئے انہوں نے جو قدم اٹھایا تھا اس پر ثابت قدم بھی تھے جان ہتھیلی پر رکھ کر انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تھا، اس لئے ہر قسم کے مصائب جھیلنے کا بھی ان کے دل میں حوصلہ تھا، صحرانوردی، بادیہ پیمائی اور آبلہ پائی کے لئے بھی وہ پہلے سے تیار تھے، اور انہوں نے عملی طور پر کر کے اسے دکھا بھی دیا، کس طرح ان کے محل پر چھاپہ پڑا، کیسے پنجیٹھہ کے دیہات میں گھاس کاٹی؟ کیسے نام بدل کر ہزاروں میل جنگلوں اور بیابانوں کا سفر کر کے کراچی کی بندرگاہ پہنچے؟ یہ ایک طویل ترین داستان ہے، بادبانی کشتی کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچے، یہ ہندوستان کے اس دور کے کئی علماء مجاہدین کی داستان ہے جو دردناک و کربناک ہے درس غیرت وحمیت اور حوصلہ بخش بھی پولیس اور فوج ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہاتھوں میں لئے ناکام واپس ہوگئی، مولانا رحمت اللہ صاحب

اللہ کی حفاظت میں پہنچ گئے، انگریزی حکومت دانت پیس کر رہ گئی، نہ سرکاری پادریوں کے ذریعہ ان کو شکست دے سکی اور نہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لے کر کتوں کی طرح دوڑنے والی پولیس ان کا کچھ بگاڑ سکی کیوں کہ

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی ترست

خدا نے اپنے دین کی حفاظت کرنے والے کی حفاظت فرمائی پیادہ پائی سے تلوے ضرور لہولہان ہوئے لیکن دل اپنی کامیابی پر مسرور اور خوش تھا مکہ معظمہ پہنچ کر اللہ کے گھر کے سائے میں طرح اقامت ڈال دی۔

## مناظرہ کے بعد کے تین سال:

۱۰/ اپریل ۱۸۵۴ء کو مناظرہ ہوا، اور مئی ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خلاف بغاوت کا کوہ آتش فشاں پھٹا اس درمیانی مدت میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی خاموش بیٹھے نہیں رہے بلکہ شب وروز اس طرح کے پیش بندیوں میں مصروف رہے کہ مستقبل میں حکومت تبلیغ عیسائیت میں کسی طرح کامیاب نہ ہوسکے مولانا موصوف اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے آپ کو اب یہ یقین تھا کہ یورپ کا بڑا سے بڑا پادری بھی ہندوستان آ کر کسی مسلمان عالم دین سے مجمع عام میں مناظرہ ومباحثہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا، البتہ اپنے اپنے حلقہ عمل میں پادریوں کی کوششیں جاری رہیں گی اور وہ ناخواندہ عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہیں گے اس لئے اس کا انسداد بھی ضروری ہے آپ نے ضروری سمجھا کہ عیسائیت اور صلیب پرستی جیسے باطل مذہب کی بخیہ ادھیڑ کر عوام کے سامنے رکھ دی جائے اور اہل علم کی رہنمائی کے لئے علمی انداز کی تصانیف مرتب کی جائیں تاکہ ہر پڑھا لکھا مسلمان پادریوں کے ہر طرح کے سوالات کے جوابات دے سکے اور پھر پلٹ کر ان سے سوال کر کے ان کا منہ بند کر سکے، اس لئے وہ مسلسل اور شب وروز تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور ایسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ دیں کہ یورپ کے اخباروں نے صاف

اعتراف کیا کہ اگر یہ کتابیں شائع ہوتی رہیں تو کبھی بھی کوئی شخص عیسائیت کے قریب نہیں جائے گا عیسائیت اپنے خول میں بند ہو کر رہ جائے گی۔

## تصانیف:

مولانا موصوف کے پیش نظر عیسائیت کے سیلاب کو روکنا وقت کا سب سے اہم ترین فریضہ تھا اس لئے آپ نے اپنی ساری توجہ اسی طرف رکھی تھی جب کہ اس دور میں باصلاحیت علماء کی کمی نہیں تھی لیکن قدرت کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کام کی اسی کو توفیق ملتی ہے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو ہندوستانی تاریخ کے اس نازک موڑ پر قدرت نے اسی اہم اور نازک کام کے لئے خلعت وجود بخشا تھا اس لئے اس مہم میں اس وقت آپ کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **اظہار الحق:** یہ کتاب مناظرہ آگرہ کی مکمل روداد ہے جو ترکی کے بادشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کی خواہش اور خیر الدین پاشا تونسی صدر اعظم کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد آگرہ میں مناظرہ کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مناظرہ سے دس برس بعد جب آپ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے تو سلطان ترکی کی دعوت پر آپ ترکی تشریف لے گئے تھے وہیں قسطنطنیہ میں ۱۶/رجب ۱۲۸۰ھ میں اس کتاب کی تالیف شروع کی اور آخری ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوئی اور ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ سے شائع ہوئی، پھر صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے عربی سے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور **ابراز الحق** کے نام سے مکمل ترکی میں ترجمہ شائع ہوا، پھر یورپ کی متعدد زبانوں میں ترکی حکومت کی طرف سے اس کے ترجمے کرا کے شائع کئے گئے، جن کو پادری خاص کوشش اور اہتمام سے تلف کرنے کی کوشش کرتے رہے، کتاب مصر سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے، مولانا سلیم اللہ صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، مولوی غلام محمد بھانجا راندیری نے گجراتی زبان میں ترجمہ

کر کے شائع کیا، اظہار الحق کے انگریزی ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے، ابواب کی تفصیل اس طرح ہے باب اول بیان و تفصیل کتب عہد قدیم وجدید باب دوم بیان و تفصیل اثبات تحریف انجیل باب سوم نسخ انجیل باب چہارم ابطال تثلیث باب پنجم قرآن کا کلام اللہ ہونا باب ششم اثبات نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم واعتراضات و جوابات پادریان۔

۲- ازالة الاوهام: یہ ضخیم کتاب بڑے سائز کے ۶۵۴ صفحات پر مشتمل ہے سید المطابع بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین کے زیر اہتمام فارسی میں ۱۲۶۹ء میں شائع ہوئی، ردِ نصاریٰ کے اکثر مباحث کا مسکت جواب ہے، اس میں پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق میں جو اعتراضات ہیں ان کے دنداں شکن جوابات بھی شامل ہیں۔

۳- ازالة الشكوك: یہ کتاب عیسائیوں کے ۳۹ سوالات کا جواب ہے، ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں ہندوستان میں تصنیف ہوئی اور دو جلدوں میں شائع ہوئی اس میں نبوت محمدی اور تحریف بائبل کے مدلل ثبوت ہیں دونوں جلدیں ایک ہزار ایک سو سولہ صفحات پر مشتمل ہیں اس کتاب کے سبب تالیف کے متعلق مولانا مرحوم نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے:

> ۱۲۶۹ میں دو امر باعث ہوئے کہ پادریوں کے سوالات کا جواب لکھوں ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دے کر اور چھ سوال اور بڑھا کر ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولی عہد بہادر دام اجلالہٗ کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب مفخم الیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں اور ان کا امر ماننا پڑا۔

مولانا مرحوم کے ایک شاگرد مولانا عبدالوہاب ویلوری بانی مدرسہ باقیات

الصالحات ویلور نے کتاب کی پہلی جلد مدراس میں چھپوائی دوسری جلد ان کے صاحبزادے مولانا ابوالفضل ضیاء الدین محمد صاحب مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات ویلور نے طبع کرائی اس طرح ماہ شعبان ۱۲۸۸ھ میں کتاب مکمل دوجلدوں میں شائع ہوگئی۔

۴- **اعجاز عیسوی:** اس کتاب میں مولانا مرحوم نے کامل طور پر بائبل کا غیر معتبر ہونا اوراس کا محرف ہونا ثابت کیا ہے، یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں لکھی گئی پہلی بار آگرہ ہی سے اوردوسری بارمطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی،۲۰۰صفحات پرمشتمل ہے۔

۵- **احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث:** دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کو باطل ثابت کیا گیا ہے، ۱۲۷۱ھ میں مناظرہ اکبرآباد کے فوراًبعد تصنیف ہوئی اور مطبع رضوی دہلی سے ۱۲۹۲ھ سے طبع ہوکر شائع ہوئی، انجیل کی تحریف پر بہت ہی محققانہ بحث ہے جوصرف ۵۶صفحات پر مشتمل ہے متوسط تقطیع پراسی زمانہ میں فخرالمطابع دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

## غیرمطبوعہ تصانیف:

مولانا کیرانوی کوقدرت کی طرف سے ردعیسائیت کے سلسلہ میں وہبی طور پر وہ علم دیا گیا تھا کہ ان کاقلم رکنا جانتاہی نہ تھا، کچھ کتابیں حالات اور ماحول کے تقاضوں کے تحت شائع ہوتی رہیں لیکن کئی کتابیں غیرمطبوعہ رہ گئیں میرے لئے علم کا کوئی ذریعہ نہیں کہ معلوم کروں کہ یہ مخطوطے کہاں اورکس حال میں ہیں؟ لیکن مولانا مرحوم کے ورثاء نے ان تصانیف کا ذکر کیا ہے، خاندانی تحریروں سے غیرمطبوعہ کے نام اوران کے مباحث کا پتہ چلتاہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

**بروق لامعہ:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کامدلل اثبات اورخاتم المرسلین پرختم رسالت کوثابت کیاہے کتاب میرے علم کے مطابق اب تک طبع نہیں ہوئی۔

**معدّل اعوجاج المیزان:** یہ کتاب میزان الحق مولفہ پادری پی فنڈر کا جواب ہے مولانا محمد سلیم صاحب سابق مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کی ایک تحریر سے

معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ''نور افشاں'' (۳۰ جلد ۱۲) مطبوعہ ۲۴؍ جولائی ۱۸۸۴ء میں پادری صفدر علی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ ان کے پاس ہے۔

**تقلیب المطاعن:** یہ کتاب ''تحقیق دین'' مؤلفہ پادری لاسمند کا رد اور جواب ہے، کتاب غیر مطبوع ہے۔

**معیار التحقیق:** یہ کتاب ''تحقیق الایمان'' مؤلفہ پادری صفدر علی کا دندان شکن جواب ہے۔

## مناظرہ کی رودادیں:

مناظرہ اکبر آباد (آگرہ) چونکہ ہمہ گیر شہرت کا مالک تھا اس لئے پورے ملک میں اس کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں مناظرہ تین دن تک چلا روزانہ کی رودادیں اس دور کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں جن کی دستیابی اب ممکن نہیں رہی کچھ رودادیں کتابی شکل میں شائع ہوئیں، ایک روداد ''**البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف**'' کے نام سے وزیرالدین صاحب نے مرتب کی تھی جو حافظ عبداللہ صاحب کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں مناظرہ کے فوراً بعد فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی اور ولی عہد بہادر مرزا فخر الدین ابن بہادر شاہ ظفر دہلی کے حکم سے چھپ کر انہیں کے حکم سے ہندوستان کے اطراف واکناف میں اشاعت پذیر ہوئی یہ روداد مناظرہ اکبر آباد آگرہ کے سلسلہ میں مولانا موصوف اور پادری فنڈر کے آخری خطوط کا مجموعہ ہے۔

ایک روداد مناظرہ دو حصوں میں اسی زمانہ میں سید عبداللہ اکبر آبادی نے مرتب کی تھی ایک حصہ کا نام ''مباحث مذہبی'' اور دوسرے حصہ کا نام ''مراسلات مذہبی'' تھا، دونوں حصے اسی دور میں ۱۲۷۱ھ میں ۱۸۷ صفحات پر مشتمل مطبع منعمیہ اکبر آباد سے چھپوا کر شائع کئے گئے، اور سب سے جامع اور مکمل روداد خود مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے قلم سے اظہار الحق کے نام سے شائع ہوئی اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے اور شائع ہوئے۔

## تاریخ ساز کارنامہ:

رودادیں جھوٹی سچی جتنی بھی شائع ہوئیں لیکن ان کا وجود مٹ گیا لیکن یہ حقیقت پتھر کی لکیر کی طرح تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ یورپ کا مایۂ ناز پادری جو پادریوں کی پوری فوج کا امیر لشکر اور سپہ سالار تھا جس کی لن ترانیاں آسمان کو چھورہی تھیں وہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سن کر کانپنے لگا تھا وہ ہندوستان سے اس طرح فرار ہوا جیسے خرگوش شکاری کی آہٹ پا کر بے تحاشا بھاگتا ہے اور پھر دوبارہ اس کو ہندوستان کی طرف کسی کھڑکی سے بھی جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے معلوم نہیں کہاں مرکھپ گیا، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا سب سے بڑا اور عہد ساز کارنامہ یہ ہے کہ اندلس کی اسلامی حکومت اپنے لاؤلشکر کے باوجود عیسائیت کے جس سیلاب کو نہ روک سکی انہوں نے نہتے اور تن تنہا یورپ کی اس طوفانی یلغار اور عیسائیت کے سیلاب کو اس طرح روک دیا کہ یہ سیلاب پھر اپنے مخرج اور منبع میں بند ہوکر رہ گیا اور انگریزوں کی دوسوسالہ حکومت ہندوستان کو اندلس بنانے کا خواب نہ دیکھ سکی۔

## ہجرت کے بعد:

انگریزی حکومت کے پنجۂ عذاب سے بچ کر مکہ مکرمہ جب آپ پہنچے تو آپ سے کچھ ہی دنوں پہلے حاجی امداداللہ تھانوی جو انگریزوں سے جہاد کرنے میں سرخیل علماء تھے انہیں مصیبتوں سے گذر کر جن سے مولانا کیرانوی گزر رہے تھے مکہ مکرمہ پہنچ کر رباط داؤدیہ میں قیام پذیر تھے، مولانا کیرانوی کی حاجی صاحب سے مطاف میں ملاقات ہوئی، طواف سے فراغت کے بعد حاجی صاحب مولانا موصوف کو اپنی کوٹھری میں لے گئے اور وہیں قیام فرمایا کچھ ہی دنوں بعد مولانا موصوف اساتذۂ حرم کی فہرست میں شامل کر لئے گئے اس دور میں حرم مکہ کے شیخ العلماء سید احمد دحلان تھے

مولانا سے سوال و جواب کے بعد ان کو مولانا موصوف کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوگیا پھر اپنے گھر پر بلا کر بڑا اعزاز و اکرام کیا انہوں نے مولانا موصوف سے انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا پورا واقعہ سنا تو بہت متاثر ہوئے، انہیں کی سفارش پر مسجد حرم میں مولانا مرحوم کا باقاعدہ درس شروع ہوا اور علماء حرم کے دفتر میں باقاعدہ آپ کا نام درج کر کے وظیفہ مقرر ہوا، پھر آپ ہجرت کی نیت سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہوگئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا۔

## حکومت ترکی کی طرف سے دعوت:

اس وقت حجاز پر ترکی کی حکومت تھی اور سلطان عبدالعزیز خان تخت حکومت پر متمکن تھے ترکی حکومت کے گورنر شریف عبداللہ بن عون بن محمد امیر مکہ تھے مولانا کیرانوی کا ان سے تعارف ہوگیا امیر مکہ نے مناظرہ کی پوری روداد سن کر بہت مبارک باد دی تھی پھر وہ مولانا کی از حد قدر و منزلت کرنے لگے اس طرح مولانا کیرانوی اپنے دینی مرکز میں عزت و احترام کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔

وقت جب کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو کیسے کیسے حیرتناک طریقوں سے اس کی رسوائی پر مہر لگا دیتا ہے، پادری فنڈر ہندوستان سے فرار کے بعد جرمنی، سوئزرلینڈ اور انگلستان میں رہا مگر وہ کہیں پاؤں نہیں جما سکا آخرکار چرچ مشنری سوسائٹی لندن نے اس کو ترکی بھیج دیا اور وہ قسطنطنیہ پہنچ گیا وہ اپنی شرانگیز فطرت سے مجبور تھا اس لئے ترکی جا کر تقریریں شروع کیں بیشتر تقریروں میں ہندوستان میں اپنی شاندار کارگذاری کو بیان کرتا اور اعلان کرتا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کی شاندار فتح اور اسلام کو شکست ہوچکی ہے، ہندوستان کے تمام علماء لاجواب ہوچکے ہیں ان میں اب جرأت نہیں کہ مجھ سے گفتگو کرسکیں، آج پورے ہندوستان میں عام طور سے مسلمان عیسائیت قبول کررہے ہیں عنقریب پورا ہندوستان عیسائیت کی آغوش میں آجائے گا اور ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ترکی کے بادشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کو پادری فنڈر کی یہ لن ترانیاں پہنچتی رہتی تھیں، وہ دین پسند اور مذہبی جذبات رکھنے والا بادشاہ تھا اس کو ہندوستان کے بارے میں یہ باتیں سن کر انتہائی فکر لاحق ہوئی ان کو حقیقت حال کے لئے بے چینی ہوئی، انہوں نے فوراً حکم دیا کہ امیر مکہ عبداللہ کو خط لکھ کر تاکید کی جائے کہ اس سال ہندوستان سے حج کے لئے آنے والوں میں سے ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جو آگرہ میں عیسائیوں سے ہونے والے مناظرہ کے بارے میں مستند معلومات رکھتے ہوں، یہ حکم نامہ لکھ کر امیر مکہ کو پہلی فرصت میں بھیج دیا گیا، امیر مکہ کو جب یہ خط ملا تو اس نے بواپسی ڈاک جواب دیا کہ جس عالم سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا تھا وہ عالم خود ہی مکہ مکرمہ میں موجود ہیں اور مناظرہ کے مختصر حالات جو مولانا موصوف سے اس کو معلوم ہوئے تھے وہ بھی تحریر کردیئے، سلطان ترکی کو جوں ہی یہ خط ملا فوراً یہ حکم نامہ جاری کیا کہ مولانا موصوف کو شاہی مہمان کی حیثیت سے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے، ہم ملاقات کے مشتاق ہیں، امیر مکہ نے مولانا موصوف سے خط وکتابت کی ساری باتیں بتائیں اور کہا کہ شاہ ترکی کی طرف سے آپ کو قسطنطنیہ بلایا گیا ہے، سرکاری طور پر ہم اس کا انتظام کردیں گے، چنانچہ مولانا کا یہ سفر قسطنطنیہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں ہوا۔

## شاہی اعزاز و پذیرائی:

امیر مکہ نے مولانا موصوف کو پورے اعزاز کے ساتھ قسطنطنیہ کے لئے روانہ کیا، جس دن مولانا موصوف دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچے پادری فنڈر کو اس کی خبر مل گئی، وہ اسی رات میں قسطنطنیہ سے خفیہ طور پر فرار ہوگیا اور ترکی کی حدود سلطنت سے باہر چلا گیا پھر اس کے بعد تاریخ میں کہیں فنڈر کا نام نظر نہیں آتا گمنامی کی زندگی گذار کر راہی ملک عدم ہوا مولانا شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوئے سلطان نے ایک مجلس علماء منعقد کی جس میں وزراء سلطنت کے علاوہ اہل علم اصحاب کو بلایا گیا اور

مولانا مرحوم سے ہندوستان میں مذہب عیسوی کی شکست اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے مفصل حالات سنے، دوسرے دن سلطان نے دولت عثمانیہ میں اس فتنہ وفساد کو روکنے کے لئے ترکی کے سارے مسیحی مبلغین کو گرفتار کر کے جیل بھیجنے کا حکم جاری کر دیا اور ان کی ساری کتابیں ضبط کر لی گئیں اور ان کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی ان کو مجمع عام میں تقریر کرنے سے حکماً روک دیا گیا، اس طرح سلطان ترکی نے صلیب پرستوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکی کو پاک صاف کر دیا۔

مولانا مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے سلطان ترکی اکثر نماز عشاء کے بعد مولانا مرحوم کو شرف باریابی بخشتے اس وقت صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی اور ترکی حکومت کے شیخ الاسلام وغیرہ بھی شریک مجلس ہوتے تھے، سلطان عبدالعزیز مولانا مرحوم کی جلیل القدر دینی و مذہبی خدمات اور آپ کے مجاہدانہ کارناموں سے بہت متاثر تھے، اس لئے مولانا کے اعزاز واکرام اور ان کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر خلعت زریں کے ساتھ تمغہ مجیدی درجہ دوم اور گرانقدر وظیفہ ماہانہ سے سرفراز فرمایا، سلطان کی خواہش اور خیر الدین پاشا کی تحریک پر رجب ۱۲۸۰ھ میں مولانا موصوف نے اپنی مشہور عالم کتاب اظہار الحق لکھنی شروع کی، اور ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ یعنی چھ ماہ میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

قسطنطنیہ ہی میں قیام کے دوران ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں حشر ونشر، نزول وحی، بعثت ونبوت کے مسائل کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھایا ہے اس رسالہ کی تحریر سے جمادی الثانی ۱۲۸۱ھ میں فراغت ہوئی، خیر الدین پاشا کے حکم سے یہ رسالہ طبع ہوا، اظہار الحق مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر بھی یہ رسالہ شائع کیا گیا۔

## دار الہجرۃ واپسی اور مدرسہ صولتیہ کا قیام:

کئی ماہ مسلسل قسطنطنیہ میں قیام کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ واپسی کی اجازت طلب کی، مکہ مکرمہ واپس آ کر مسجد حرم میں درس وتدریس کا سلسلہ حسب سابق شروع کر دیا، لیکن حرم میں جو تعلیم وتدریس کا طریقہ تھا آپ اس سے مطمئن نہیں تھے، آپ

مکہ میں ایک مستقل مدرسہ جاری کر کے اپنے مرتب کردہ نصاب کے مطابق تعلیم دینا چاہتے تھے، چند معززین سے صلاح ومشورہ کے بعد مدرسہ کے لئے زمین خریدی گئی اور عام مہاجرین سے چندہ کی اپیل کی گئی جس کی پذیرائی ہوئی اور ماہوار چندہ دینے والوں کی ایک فہرست مرتب ہوگئی۔

ابھی اس تحریک پر تین چار ماہ ہی گذرے تھے کہ موسم حج میں کلکتہ کی ایک مالدار بیوہ صولت النساء بیگم اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ حج میں آئیں، ان کا ارادہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں اپنی طرف سے کوئی رباط (مسافر خانہ) بنوائیں، بیگم کے داماد مولانا کیرانوی کی مجلس میں آیا کرتے تھے، ایک دن انہوں نے اپنی خوشدامن صاحبہ کے ارادہ کا ذکر مولانا موصوف سے کیا اور آپ سے اس سلسلہ میں مشورہ چاہا مولانا نے ان کو سمجھایا کہ مکہ مکرمہ میں رباطیں بہت ہیں اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ یہاں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، مولانا کی مجلس سے اٹھ کر اپنی خوشدامن کے پاس گئے اور مولانا کے مشورہ کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور خود جا کر مولانا مرحوم سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ مدرسہ کے لئے زمین کی گفتگو فرمائیں اور میں اپنی موجودگی میں مدرسہ کی تعمیر کرانا چاہتی ہوں، چنانچہ وہ زمین خریدی گئی جس پر آج مدرسہ صولتیہ قائم ہے زمین کی خریداری کے بعد اس پر تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا، اکثر اوقات بیگم صاحبہ تعمیر کی جگہ آ کر اس کی نگرانی کرتیں جب تعمیر مکمل ہوگئی تو مولانا مرحوم نے اس نیک خاتون کی اس نیک یادگار کو اسی کے نام سے موسوم کر کے مدرسہ صولتیہ نام تجویز کیا جو آج تک اس شریف نیک اور مخیّر خاتون کی اس مقدس سرزمین پر مبارک یادگار اور صدقہ جاریہ ہے۔

## ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں:

مولانا مرحوم یکسوئی کے ساتھ مدرسہ صولتیہ میں درس وتدریس اور اسلامی اتحاد کی پرخلوص جدوجہد میں مصروف رہے، حجاز بدستور ترکی حکومت کے ماتحت تھا، سلطان عبدالعزیز خاں کے انتقال کے بعد سلطان عبدالحمید خان سریر آرائے تخت

خلافت تھے اب حجاز کا گورنر عثمان نوری پاشا کو بنایا گیا، یہ ۱۲۹۹ھ کا زمانہ ہے گورنر خالص فوجی دل ودماغ کا تھا اس لئے مزاج میں ایک گونہ سختی تھی، تدبر، دوراندیشی، نظم مملکت کی حکمت عملی اور مصلحت بینی کا فقدان تھا کچھ خودغرض اور فتنہ انگیز لوگوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مدرسہ صولتیہ کی طرف سے بدظن ہوگیا اور اس کو ایک اجنبی ملک کی تحریک سمجھ کر اس کی مخالفت کرنے لگا، اور اپنے عندیہ کو ترکی حکومت پہنچادیا، مولانا کو اس کا علم ہوا تو گورنر کی رپوٹ کے بعد انہوں نے اپنی معروضات بارگاہ سلطانی میں ارسال فرمائیں اس کے بعد سلطان عبدالحمید خاں نے مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی دعوتنامہ موصول ہونے کے بعد آپ قسطنطنیہ روانہ ہوگئے، مولانا مرحوم کا یہ دوسرا سفر ترکی تھا اور پہلے سفر کے ۱۹ سال بعد ہورہا تھا، مولانا کی عمر ۶۷ سال کی ہوچکی تھی قویٰ میں اضمحلال آچکا تھا، اس سفر میں مولانا کے ہمراہ آپ کے برادر زادہ مولوی بدرالاسلام کیرانوی اور مولوی حضرت نور صدر مدرس مدرسہ صولتیہ تھے، اس وفد کا شاہانہ استقبال ہوا، تمام وزرائے سلطنت باری باری مولانا کی قیام گاہ پر آتے رہے اور شرف ملاقات حاصل کرتے رہے، تینوں حضرات کو خلعت سلطانی دیا گیا، دوسرے دن تمغہ مجیدی درجہ چہارم پیش کیا گیا سلطان ترکی عبدالحمید خاں کی جیب خاص سے پانچ ہزار قرش (تقریباً ڈھائی ہزار روپئے) ماہانہ اور دس ہزار قرش (تقریباً پانچ ہزار روپئے) نقد عطا کئے گئے، مزید اعزاز کے لئے کیسۂ مفتاح کعبہ، تسبیح عقیق البحر ایک ایک تسبیح سنگ مقصود کی عنایت فرمائی گئی اور حکومت ترکی کی طرف سے مولانا موصوف کو ''پایۂ حرمین شریفین'' کا خطاب دیا گیا قصر خاص میں جب مولانا موصوف کی حاضری ہوئی تو بادشاہ نے تخت سے دوقدم اٹھ کر آپ کا خیر مقدم کیا اور خوش آمدید کہا۔

مولانا مرحوم اس سفر میں دوسال کے قریب قسطنطنیہ میں رہ گئے اس مدت میں سلطان نے متعدد بار شرف ملاقات بخشا، مولانا کے برادرزادہ مولوی بدرالاسلام بھی ایک بار بادشاہ سے ملاقات کے وقت حاضر تھے، سلطان ترکی نے ان کے متعلق فرمایا

کہ یہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ (سلطان عبدالحمید خاں کا شاہی کتب خانہ جو دنیا کے چند خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے جس میں آل عثمان کے بادشاہوں کے دور کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا ہے) جو قصر یلدز میں ہے اس کا ان کو مہتمم مقرر کرتا ہوں اس لئے مولانا بدرالاسلام وہیں رہ گئے اور آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ رہے دوسال سے زائد قیام کے بعد سلطان نے مکہ مکرمہ مراجعت کی اجازت دی اور ایک مرصع تلوار عنایت کرتے ہوئے فرمایا:

''ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے''

مولانا موصوف ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے مکہ مکرمہ تشریف لائے یہاں آپ کا بڑا پرشکوہ اور شاہانہ استقبال کیا گیا اور سب سے حیرتناک بات یہ تھی کہ عثمان نوری پاشا گورنر حجاز جس کی وجہ سے یہ سفر پیش آیا تھا وہ سب سے آگے تھا اور سب سے پہلے اس نے مولانا مرحوم سے بغلگیر ہوکر آپ کو مبارک باد دی اور اپنی غلط فہمیوں کی آپ سے معافی چاہی۔

## مکہ مکرمہ میں مصروفیات:

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے نظم ونسق کو درست کرنے میں مصروف ہوگئے، اس دوران حجاز کے بہت سے مسائل، ضروریات، حالات وکیفیات کے سلسلہ میں ترکی حکومت کے وزراء عمائدین سلطنت، مشیران سلطانی اور کبھی کبھی خود بارگاہ خلافت میں خطوط لکھتے رہے اور اہل حجاز کے مسائل کو حل کراتے رہے، کبرسنی اور کثرت مشاغل کی وجہ سے آپ کو ضعف بصر کی شکایت ہوگئی اور بڑی تیزی کے ساتھ نظر گرنے لگی نزول الماء (موتیابند) کا عارضہ تھا یہاں تک کہ ۱۳۰۳ھ میں آپ لکھنے پڑھنے سے معذور ہوگئے، یہ خبر سرکاری طور پر سلطان ترکی کو پہنچی تو بارگاہ سلطانی سے حکمنامہ آیا کہ مولانا کو قسطنطنیہ بھیجنے کا فوراً بندوبست کیا جائے تاکہ ماہر ڈاکٹروں کے ذریعہ بہتر سے بہتر علاج کیا جاسکے مولانا موصوف کو شاہی طلبی کی اطلاع ملی تو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے یہ سفر بہت دشوار محسوس ہوا مگر علاج کی

غرض سے یہ سفر کرنا تھا اس لئے مجبوراً بعض رفقاء کو لے کر آپ نے ترکی کا یہ تیسرا سفر کیا۔

## ترکی کا تیسرا سفر:

۲/ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ کو آپ استانبول پہنچے قصر شاہی میں ٹھہرائے گئے، رمضان کا مہینہ تھا افطار کے وقت اکثر شاہی دسترخوان پر آپ بلائے جاتے رہے، ایک دن افطار کے بعد بادشاہ نے کہا کہ کل میں ترکی کے مشہور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بلاؤں گا جو آپ کی آنکھ کا معائنہ کرکے علاج کا فیصلہ کریں گے چنانچہ دوسرے دن پانچ ماہرین امراض چشم ڈاکٹر حاضر ہوئے اور بڑے اہتمام سے معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ نزول الماء کا سلسلہ ابھی جاری ہے اس لئے علاج میں ابھی کم از کم دو ماہ کا وقفہ ضروری ہے، دو ماہ کے بعد ہی علاج کیا جاسکتا ہے، سر دست علاج ملتوی ہوگیا، انہیں مصروفیات میں عید آگئی شاہی حکم سے مولانا کے لئے لباس تیار کرایا گیا، عید کی نماز مولانا نے استانبول میں پڑھی، مولانا واپسی کی اجازت کے خواہاں تھے اگرچہ ابھی زبان سے اس کا اظہار نہیں فرمایا تھا کہ ایک دن سلطان عبدالحمید خان نے مولانا سے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے یہاں مستقل رہیں، اس کے جواب میں مولانا مرحوم نے جو کچھ فرمایا وہ صدق و اخلاص کی کتاب میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے، مولانا نے بادشاہ سے کہا:

> ''اعزہ و اقارب کو چھوڑ کر، ترک وطن کرکے خدا کی پناہ میں اس کے دروازے پر آکر پڑا ہوں، وہی لاج رکھنے والا ہے آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا''۔

سلطان کے دل کو یہ بات لگ گئی، جو خلوص، جو درد ان چند جملوں میں چھپا ہوا تھا اس کی قدر و قیمت کو اس نے پہچان لیا مولانا کے اعزاز و احترام کے جذبات اس کے دل میں اور افزوں ہوگئے، بادشاہ نے کہا کہ علاج ہوجانے کے بعد آپ دار الہجرۃ تشریف لے جائیں مجھ کو کوئی ملال نہیں ہوگا لیکن مولانا اس وقت آپریشن کے لئے تیار

نہیں ہوئے اجازت کے طالب ہوئے، سلطان کو بھی مولانا کی از حد دلداری مقصود تھی اس لئے آپ کی مرضی کے خلاف اصرار نہیں کیا، سلطان سے اجازت لے کر ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ میں آپ مکہ مکرمہ واپس آئے سال بھر بعد ۱۳۰۵ھ میں مکہ مکرمہ کے ایک ڈاکٹر سے آنکھ کا آپریشن کرایا مگر آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔

## کف بصر کے بعد:

آپریشن کی ناکامی کے بعد جب لکھنے پڑھنے سے ایک دم معذور ہو گئے تو مولانا موصوف کے بڑے بھائی حکیم علی اکبر کے لڑکے محمد صدیق پنجاب کے ایک مشنری اسکول میں ماسٹر تھے انہوں نے اپنے لڑکے محمد سعید کو بھی تعلیم کے لئے وہیں داخل کرادیا تھا، مولانا مرحوم کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو اپنے بھتیجے محمد صدیق کو بہت سخت خط لکھا کہ محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر فوراً مرے پاس مکہ مکرمہ بھیج دو، اس کی تعلیم وتربیت میں کروں گا، چنانچہ محمد سعید مکہ مکرمہ آ گئے تھے مولانا مرحوم نے ان کی تعلیم مکمل کرائی اور حضرت حاجی امداداللہ تھانوی کی خدمت میں حاضری دینے کی تاکید فرماتے رہے اس طرح تعلیم وتربیت کے بعد مولوی محمد سعید ایک پختہ کار عالم ہو چکے تھے، مولانا کے کف بصر کے بعد انہوں نے مولانا مرحوم کے خط وکتابت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی شب وروز حاضر خدمت رہتے تھے صرف نماز مغرب سے نماز عشا تک مولانا محمد سعید حضرت حاجی امداداللہ تھانوی کی خدمت میں حاضر رہتے وہاں حاجی صاحب کے نام آئے ہوئے خطوط کو سناتے اور ان کے حکم کے مطابق خطوط کے جوابات لکھتے تھے۔

## وفات:

اب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی عمر ۷۵ سال کی ہو چکی تھی، چار سالوں سے وہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، چلنے پھرنے کی طاقت جواب دے چکی تھی آخر وقت موعود آ گیا، ۲۲ر رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ یوم جمعہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، خادم

اسلام جس کو پایۂ حرمین شریفین کا خطاب حاصل تھا اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک لمبی زندگی دین کی خدمت میں گذاری اس کے صلہ میں قدرت کی طرف سے ایک مقدس سرزمین میں جنة المعلاة مکہ مکرمہ میں ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار میں آسودۂ خواب ہوئے جہاں ان کے رفیق خاص حاجی امداد اللہ تھانوی محوخواب ہیں۔ اللّٰھم اغفر وارحم وانت ارحم الراحمین.

اللہ اللہ کیا انقلاب زمانہ اور گردش ایام کے کرشمے ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی جن کے آباء واجداد کو اکبر جیسا بادشاہ جاگیر پیش کرتا ہے، جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کا تخلیق کار بادشاہ شاہجہاں جس گھرانہ کا مہمان بنتا ہے جس کا شاہانہ کروفر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کے محلّہ کو دربار کلاں کہا جاتا تھا جہاں خدم وحشم کے جلو میں زندگی بسر ہوئی جس کی شرافت وطہارت کی قسم کھائی جاسکتی تھی جس کے اعزاز واحترام میں عقیدت کی پیشانیاں جھک جاتی تھیں جس کی سچائی اور راست گفتاری جس کا صدق واخلاص جس کی پاکبازی وپاک دامنی بے مثال تھی ایسا شریف النفس انسان انگریزی حکومت کا مجرم بن کر حلیہ اور نام بدل کر پیادہ پا جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھان کر چور اور ڈاکوؤں کی طرح کا مجرم بن کر روپوشی کی حالت میں کمپنی کے حدود سلطنت سے نکل رہا ہے، جیسے اس سے بڑا کوئی مجرم نہیں، پولیس بیڑیاں اور ہتھکڑیاں لے کر کتے کی طرح پیچھا کررہی ہے، اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ایک مخلص اور سچا مسلمان ہے حق کا پرستار ہے، باطل سے برسر پیکار ہے، وہ صداقت کو دل میں رکھنے کے بجائے برملا کہنے کا طرفدار ہے وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ تثلیث پرستی کی ظلمت اسلام کی روشنی پر چھا جائے وہ ضلالت کو صداقت کہنے کے لئے تیار نہ تھا، بس اسی جرم میں اس کی اتنی بڑی ریاست کو ظالم وجابر حکومت نے اس کے خاندان کو نان شبینہ کا محتاج بنادیا اور وہ اپنے اعزا واقرباء اور اپنے وطن پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا اور اسی عالم میں جاں جاں آفریں کو سپرد کردی، دین کی راہ میں اس کی انہیں قربانیوں کا خدا کی طرف سے اس کو، اس کے نیک نام اور اس

کے کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا اور ظالم وجابر حکومت کا ہندوستان سے وجود مٹا دیا گیا۔

## تاریخ ساز شخصیت:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے حالات کی نزاکت، خطرات کے ہجوم میں انگریزی حکومت کے منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ان کو پیش نظر رکھ کر اگر ان کی شخصیت کو ایک عہد ساز شخصیت کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے پورے ہندوستان میں حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر جو مہم شروع کی تھی وہ وقتی جوش اور ہنگامی جذبات کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور پچیس تیس سالوں کی شب وروز کی جدوجہد، ادارے کا قیام، علوم اسلامی کی تنفیذ، درس وتدریس، عربی فارسی اور اردوزبانوں کی مکمل تعلیم اور ہزاروں افراد کو اس نظام تعلیم سے وابستہ کر کے ایک پوری ٹیم پر ماہر اساتذہ نے اپنی ساری صلاحیتیں لگادیں تب پادریوں کی یہ فوج تیار ہوئی اور ہندوستان کے مورچہ پر اپنی مہم انجام دینے کے لئے بھیجی گئی، ظاہر ہے کہ ان پادریوں اور عیسائی مشنریز کی فوج سے انگلینڈ کی حکومت کی بہت سی امیدیں، امنگیں اور اس کے جذبات وابستہ تھے، ان کے لئے حکومت کی سطح پر سارے وسائل مہیا کئے گئے تاکہ منصوبہ کسی بھی مرحلہ پر فیل نہ ہونے پائے جہاں کہیں اس مورچہ میں کمزوری نظر آئے حکومت اس کو فوراً دور کرنے کے لئے آمادہ وتیار، ایسی منصوبہ بندی اور پلاننگ کے بعد اتنی طاقتور حکومت اپنی مہم کا آغاز کرتی ہے اور کئی برس تک بلا روک ٹوک اس مہم کو سر کرنے میں صرف کر چکی ہے اور ہر اگلے قدم پر اس کو کامیابی کی امیدیں حسب توقع بڑھتی چلی جاتی ہیں ٹھیک اسی ماحول میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے تن تنہا پادری فنڈر کو نہیں انگریزی حکومت کو گویا چیلنج کر دیا، کیا کوئی مغرور حکومت جس کو اپنی قوت پر ناز ہے اس چیلنج کو برداشت کر سکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود مولانا رحمت اللہ کیرانوی حکومت کے سارے منصوبے کو خاک میں ملانے میں کامیاب ہو گئے کیا یہ

محیر العقول کارنامہ نہیں؟ کیا کوئی شخص اس دور میں ایسا سوچ سکتا تھا مولانا کیرانوی نے اپنی جان داؤ پر لگادی، اپنی پوری ریاست لٹوادی تختہ داران کا منتظر رہا، پھانسی کے پھندے ان کی نگاہوں کے سامنے جھولتے رہے لیکن انہوں نے یہ ہولناک منظر دیکھ کر اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا ان کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا رہا یہاں تک کہ اس مورچہ کو فتح کرلیا۔

انگریزی حکومت کے منصوبے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یورپ کے مایہ ناز اہل علم اور مفکرین اور چرب زبان مقررین کے ذریعہ مسلمان قوم کے اہل علم کو ذہنی وفکری محاذ پر شکست دے دی جائے تاکہ تبلیغ عیسائیت کی راہ میں علماءاسلام جو سنگ راہ بن سکتے ہیں ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے راستے سے ہٹادیا جائے تاکہ تبلیغ عیسائیت کی راہ آسان ہوجائے پھر پورے ملک کو عیسائی بنالینا آسان ہوجائے گا، لیکن حکومت کو پہلے ہی محاذ پر سخت ناکامی ہوئی نتیجہ ان کی امیدوں کے برخلاف نکلا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مناظرہ اکبرآباد میں ناکامی کے بعد بھی تبلیغ عیسائیت کی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی تھی اس لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کامیابی وقتی چیز تھی اور اس کے اثرات ایک مخصوص دائرے تک ہی رہے، حکومت اپنے منصوبے پر عمل کرتی رہی مگر آپ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اس مناظرہ نے پورے ملک پر سب سے پہلا اور گہرا اثر ڈالا کہ اس ملک کے تمام مسلمان اور ہندؤں کو یقین ہوگیا کہ کمپنی کی یہ حکومت ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہب کی دشمن ہے اس لئے حکومت کی طرف سے ذہنوں میں ایک نفرت بیٹھ گئی اور اسی شدید نفرت کا نتیجہ تھا کہ مناظرہ کے تیسرے سال عام بغاوت کا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا اور کمپنی کو اپنی حکومت بچانی دشوار ہوگئی اس بغاوت نے حکومت کی چولیں ہلادی حکومت نے یقین کرلیا کہ اگر تبلیغ عیسائیت کا یہی سلسلہ جاری رہا تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایک انگریز کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دی جائے گی، حکومت کی بقا کا تو کوئی سوال ہی نہیں اور بغاوت کے بعد فوراً تبلیغ عیسائیت کی پالیسی بدل گئی یہ مولانا کیرانوی کے مناظرہ اکبرآباد میں شاندار کامیابی کا ثمرہ تھا انہوں نے ڈائنامیٹ کے

فلیتہ میں آگ لگائی جس نے تین سال بعد زبردست دھما کہ کیا اور حکومت کے دماغ کا نشہ ہرن ہو گیا۔

## احساس فراموش قوم:

جو کام اندلس غرناطہ، قرطبہ کے بادشاہوں نے اپنے تمام لاؤ لشکر کے باوجود انجام نہیں دیا اور پورے اسپین کو اسلامی عظمتوں کا قبرستان بننے کے لئے بے یارومددگار چھوڑ دیا اور آج ڈھائی سوسال سے اس سرزمین کو اللہ اکبر کی آواز سننے سے محروم کردیا، وہ کام ہندوستان میں تن تنہا ایک عالم نے انجام دیا جب کہ اس کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں تھی لیکن یورپ کے تمام ذہنی وفکری قلعوں کو فتح کرکے رکھ دیا ہندوستان کو مکمل طور پر عیسائی بنانے کا جو فیصلہ لندن پارلیمنٹ نے کیا تھا اس فیصلہ کو اپنے جوتوں سے روند کرر کھ دیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اسلامی ہند کی ایک بے مثال شخصیت تھی مگر احسان فراموش ہندوستان ان کو بہت جلد بھول گیا، صاحبان جبہ ودستار انگریزی حکومت کے پرستار ووفادار اور دشمنان اسلام کے کاسہ لیس مسلمانوں کے مسیحا جن کے نامۂ اعمال میں زرطلبی، نام ونمود، عیش وراحت کی طلب کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں آج ان پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی جارہی ہیں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی پر ہندوستان میں کوئی کتاب بلکہ کوئی اہم تحقیقی مقالہ تک نہیں لکھا گیا اور نہ ان کے عظیم کارناموں کو علمی دنیا کے سامنے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا قوموں کی بدبختی کا آخری اسٹیج یہی ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو بھی فراموش کردیتی ہے اور ایسے لوگوں کو سال بہ سال یاد کرنے کی تاریخیں مقرر کرتی ہے جو اسلام کے ایوان کی ایک ایک اینٹ بیچ کر اپنی اپنی عظمت واقتدار کا محل تعمیر کررہے تھے اپنے گھر اور خاندان کے لئے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کراتے رہے۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

# تاریخ عرب

## ایک عیسائی مستشرق کے قلم سے

قوموں کا عروج وزوال قوانین قدرت کے تحت ہے، عروج کے جس طرح کے اصول وضوابط اور شرائط ہیں اسی طرح زوال کے بھی کچھ مخصوص اسباب ہوتے ہیں، عقیدہ میں صلابت، نصب العین سے بے پناہ محبت، عزم وعمل میں طاقت وقوت، اپنے قائد پر غیر متزلزل اعتماد کسی قوم کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر بام فلک پر پہنچا دیتا ہے، فتح وظفر اس کے قدم چومتی ہیں، اس کے اقتدار کا پرچم فضائے آسمانی میں شان وشوکت کے ساتھ اس طرح لہراتا ہے، جیسے صیقل شدہ ننگی تلوار کسی بہادر کے ہاتھ میں لہراتی ہے، اور کسی کو اس کی طرف نظر بھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، پہاڑ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے موجیں مارتا ہوا دریا اس کے لئے راستہ بنا دیتا ہے، اس اولوالعزم قوم کے گھوڑوں کی ٹاپ زمین پر اس طرح پڑتی ہے جیسے مشکلات ومصائب اور دشواریوں کے سروں پر ہتھوڑے برس رہے ہیں، مسلمانوں کا دور عروج ان جملوں کی عملی تصویر ہے، مؤرخ نے لکھا، ان حقیقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا، اپنوں نے قلم بند کیا، غیروں نے اس کی تصدیق کی اور اس کا اعتراف کیا، آج ہم اپنے آباء واجداد کے ان کارناموں کو دہراتے ہیں تو ہماری موجودہ ذلت ونکبت، پسماندگی وادبار کی وجہ سے حقیقت افسانہ بن جاتی ہے اور ''پدرم سلطان بود'' کا طنز سننا پڑتا ہے اور ہماری وہ حیثیت ہو جاتی ہے جیسے کوئی دلق پوش فقیر دست سوال دراز کئے ہوئے ہے اور خود شاہی خاندان کے فرد ہونے کا اعلان کرتا ہے، سننے والے ہنس دیتے ہیں کیوں کہ اس کی موجودہ حالت ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے، مگر ماضی ایک ٹھوس حقیقت ہے، کسی کے تمسخر واستہزا سے بدل نہیں سکتا، کلکتہ میں سلطان ٹیپو شہید کے ورثہ کو رکشا چلاتے ہوئے دنیا نے دیکھا ہے، مٹیا محل برج کے آس پاس شاہان اودھ کے امراء کی اولاد کو

قلی اور مزدوروں کی شکلوں میں دیکھا گیا ہے، دہلی میں شاہانِ مغلیہ کی شہزادیوں کو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لگاتے ہوئے اور برتن مانجھتے ہوئے پایا گیا، ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ حکومت حیدرآباد کے دور کے امراء کی اولاد کو لوگوں کی چارپائیاں بنتے ہوئے اور رکشہ کی مرمت کرتے ہوئے دیکھا گیا، ان سبھوں کی پیشانیوں پر تحریر تھا۔

ہم بھی کبھی تخت وتاج کے مالک تھے

ہمارا عروج افسانہ نہیں حقیقت ہے، اس کی کہانیاں ٹھوس سچائیاں ہیں، ہم ان حقیقتوں کو فراموش نہیں کرسکتے ان کو فراموش کر جانا ہماری موت ہے اور ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اسلام وایمان کی بخشی ہوئی توانائیوں سے یکسر خالی نہیں ہوگئے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ اس زوال کی تاریکیوں سے ہی ہمارے اقبال کا سورج طلوع ہوگا اس لئے اپنی تاریخ دہراتے رہیں گے کیونکہ تاریخ کے انہیں اوراق میں ہماری طاقت کا راز پوشیدہ ہے، ہمیں یقین ہے کہ ماضی کی توانائیوں کا تسلسل مستقبل سے جڑا ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کو ماضی کی زرخیز اور شاداب وادیوں میں لے جاکر ان کی اصل طاقت سے واقف کرانا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے، عالمی پیمانے پر یہ سلسلہ شروع ہوچکا ہے، روئے زمین پر بسنے والے ۹۵ کروڑ مسلمانوں میں زندگی کی حرارت اگرچہ بہت اہم ہے لیکن یہ معمولی حرارت غمازی کرتی ہے کہ اندر اندر توانائیوں کی بھٹی سلگ رہی ہے اور یہ ایک اچھی علامت ہے، ہماری تاریخ ہمارے آباء واجداد کے کارنامے زندگی کی حرارت میں اضافہ کا بہت اچھا ذریعہ ہیں، بس اسی نقطہ نگاہ سے میں آپ کو آپ کے دورِ عروج کی کچھ جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں مگر میں آج کی صحبت میں مسلم مؤرخوں کی کتابوں کے بجائے ایک ایسے غیر مسلم مورخ کی کتاب کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو اسلام کا دوست اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں بلکہ مستشرقین کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جنہوں نے تقریباً ایک صدی سے اسلامی علوم وفنون کی خدمت کے خوبصورت عنوان سے نخل اسلام کی جڑوں میں ہمیشہ گرم پانی دیا ہے تاکہ یہ درخت قبل از وقت سوکھ جائے۔

مصنف کا نام پروفیسر فلپ کے ہٹی اوراس کی کتاب کا نام ''ہسٹری آف عرب'' ہے، کتاب ۱۹۳۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ کتاب بہت بڑی تعداد میں امریکی حکومت نے شائع کر کے اپنے فوجیوں میں تقسیم کی، کتاب کے ترجمے متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں، اردو میں اس کا ترجمہ پچاس سال پہلے شائع ہوا تھا، وہی اردو ایڈیشن میرے پیش نظر ہے، مسلمانوں کے دورعروج کی افسانوی کہانی اور مسلمانوں کی بے مثال تہذیبی وتمدنی ترقیوں سے چونکہ مصنف کا کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے اس لئے اس کے بیان میں کسی مبالغہ آرائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے دل کی آواز اوراس کے صحیح جذبات ہیں، کتاب کا نام اگرچہ تاریخ عرب ہے لیکن عرب کی تاریخ تو اس گفتگو کا نقطۂ آغاز ہے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اس کا اصل موضوع ہے، چونکہ اسلام کا سورج سرزمین عرب کے افق سے طلوع ہوا اس لئے کتاب کے آغاز میں عربوں کی سرزمین اوراس کے باشندوں کی زندگی سے تاریخ کی روشنی میں قاری کو روشناس کرایا ہے، اس نے قبل از اسلام عربوں کی زندگی کی ایک حقیقی تصویر پیش کرتے ہوئے لکھا:

> ''عرب کا ملک تقریباً سارا کا سارا ریگستانی ہے، عرب اپنے ملک کو جزیرہ کہتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ عرب ایک ایسا جزیرہ ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف ریت ہے، اپنے آباء واجداد کی طرح بدوی اب بھی بھیڑوں اور اونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں، اپنے گلّوں کو انہیں قدیم چراگاہوں میں چراتے ہیں اور بھیڑوں کی گلہ بانی کے سوا ایک حد تک گھوڑوں کی پرورش و پرداخت، شکار اور لوٹ مار بھی بدوؤں کی زندگی کے مخصوص مشغلے ہیں''۔

مصنف عربوں کے ذہن ومزاج اوران کی وحشت بھری زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ قوم سخت دل اور انتہائی جفاکش ہے اس کا بیان ہے:

''بدوی کے جسم کی وضع قطع اور اس کے ذہن کی بناوٹ، اس کے ریگستانی وطن کی آب وہوا کی یکسانیت اور خشکی کی سچی آئینہ دار ہے، بدوی عصبوں، نسیجوں اور ہڈیوں کہ ایک گٹھری ہوتا ہے، کھجور اور دودھ اس کی ذوقۂ حیات کے اہم ترین اجزاء ہیں، صرف کھجور اور اونٹ کا گوشت ہی اس کی ٹھوس غذائیں ہیں، کھجور کی گٹھلیوں کی روٹیاں اس کے اونٹ کے روزانہ کی غذا ہے ہر بدوی کھجور اور پانی پر تصرف پانے کا خواب دیکھتا ہے۔

غذا کی طرح اس کا لباس بھی بہت مختصر ہوتا ہے، ایک لمبی قمیص پر کمر بند لپٹا ہوا اور ایک ڈھیلی ڈھالی عبا جو تصویروں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے، سر پر ایک شال جس کو ایک ڈوری سے باندھ لیا جاتا ہے، پاجامہ نہیں پہنا جاتا، جوتا کم ہی استعمال ہوتا ہے''۔

فلپ بتاتا ہے کہ عربوں کی پوری زندگی اونٹ کی رہین منت ہے، اس کو زراعت سے نفرت ہے، کوئی پیشہ یا حرفت اپنانے کے لئے نااہل ہے وہ نیم وحشی جانور کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اس کی کل کائنات صرف اونٹ ہے اور کچھ وہ جانتا ہی نہیں کہ زندگی بسر کرنے کے اور دوسرے بھی بہت سے راستے ہیں اس کی زندگی صرف اونٹوں پر منحصر ہے اس کے علاوہ وہ کچھ سوچتا ہی نہیں اور نہ اس میں سوچنے کی صلاحیت ہے وہ ہمیں تفصیل سے بتاتا ہے:

''عرب کے چوپایوں میں دو جانور بہت اہم ہیں ایک اونٹ اور دوسرا گھوڑا، اونٹ کے بغیر تو یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ریگستان بھی کوئی بسنے کا مقام ہوسکتا ہے، اونٹ بدوی کا کفیل، نقل وحمل کا ذریعہ، اس کے کاروبار میں ذریعہ مبادلہ رہا ہے، دلہن کا جہیز، خوں بہا، قمار بازی کی جیت اور شیخ کی دولت یہ ساری چیزیں اونٹ ہی کی اصطلاح میں شمار کی جاتی ہیں، اونٹ بدوی کا جاں نثار رفیق ہے، پانی کے بجائے وہ اونٹ کا دودھ پیتا ہے اور پانی اپنے چوپایوں کے لئے بچا رکھتا ہے، اس کا گوشت کھاتا ہے، اس کی کھال اوڑھ لیتا ہے، اس کے بالوں سے اپنا خیمہ بنتا ہے، اس کی مینگنیاں ایدھن کے طور پر، اس کی

پیشاب کو سر کے بالوں میں مقوی دوا کے طور پر ڈالتا ہے، کیڑے مکوڑوں کو کاٹنے سے محفوظ رہنے کے لئے اسے اپنے چہرے میں ملتا ہے غرضیکہ اس کے حق میں اونٹ کی حیثیت جہاز صحرا سے بھی زیادہ ہے''۔

فلپ لکھتا ہے کہ قتل و غارت گری، انتقام در انتقام اس طرح کی زندگی گزارنے والوں کی فطرت اور ذہن و مزاج ہی ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے گروہ قبیلہ بنا کر رہتے ہیں وہی ان کی دنیا ہے، یہی قبیلہ ان کی حکومت ہے، ان کا ہر آدمی فوجی ہے، قبیلہ کے کسی فرد پر اگر کسی دوسرے قبیلہ کے فرد نے حملہ کر دیا، لوٹ لیا، یا قتل کر دیا تو پورے قبیلہ کی ذمہ داری ہے کہ قاتل قبیلہ سے انتقام لے، سمجھوتہ، صلح نامہ، باہمی گفت و شنید کا کیا ذکر؟ جب تک دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کے خون سے ان کی تلوار کی پیاس نہیں بجھتی تب تک ان کی تلوار میان میں نہیں جا سکتی، اگر انتقام کے بعد یہ جنگ بڑھ گئی تو برسہا برس تک انتقام در انتقام اور خون کا بدلہ خون کا چکر چلتا رہتا ہے یہ بدوی کچھ ایسے ہی خونخوار تھے، مصنف لکھتا ہے:

''ریگستان کے قدیم دستور کی رو سے خون کا بدلہ خون ہی ہے، اس کے لئے انتقام کے سوا اور کوئی سزا تسلیم نہیں کی جاتی، سزا کی ذمہ داری مقتول کے قریب ترین رشتہ داروں پر عائد ہوتی ہے خون کا جھگڑا چالیس سال بھی جاری رہتا ہے، قبیلہ داری اسپرٹ افراد قبیلہ سے نامحدود اور غیر مشروط وفاداری کی طالب ہوتی ہے، اس کا تصور یہ ہے کہ اس کا قبیلہ ایک خود مکتفی اور مطلق العنان وحدت ہے، اس کو قانوناً حق حاصل ہے کہ دوسرے قبیلوں کو اپنی لوٹ مار اور ہلاکت آفرینیوں کا ہدف بناتے اسلام نے اپنے فوجی مقاصد کے سلسلہ میں قبیلہ داری نظام سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔

فلپ لکھتا ہے کہ ایسی وحشیانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود یہ بدوی حد درجہ مغرور ہوتے ہیں اور دنیا کی کسی قوم کسی فرد کو وہ عزت دینے کے لئے تیار نہیں، وہ خود کو سب سے برتر سب سے بلند و بالا اور بلند رتبہ سمجھتے ہیں وہ لکھتا۔

اپنے کو موجودات کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک عرب قوم دنیا کی تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے اونچے درجے والی عالی ظرف قوم ہے، بدوی کے اسی نقطۂ نظر سے متمدن انسان اطمینان قلب کے لحاظ سے کم مطمئن اور مرتبہ کے لحاظ سے بہت گرا ہوا ہے، عرب اپنے بے میل خون، اپنی ثقافت اپنی شاعری، اپنی تلوار، اپنے گھوڑے اور سب سے بڑھ کر اپنے اعلیٰ حسب نسب پر بے انتہا فخر کرتا ہے وہ انساب میں غیر معمولی تحقیق کا شیدائی ہوتا ہے، اکثر اپنے سلسلہ نسب کو حضرت آدم تک گنا تا ہے۔

فلپ نے بڑی تفصیل سے عرب کے جغرافیائی حالات، عربوں کے ذہن ومزاج بود وباش اوران کی قبائلی زندگی کی خصوصیات کو پیش کیا ہے، ان کے عقائد، ان کے مذہب اور افکار وخیالات سے کم بحث کی ہے اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ریگستانی علاقوں میں رہنے والوں کے لئے دن بہت سخت ہوتا ہے، وہ رات کو زیادہ راحت محسوس کرتے ہیں، کیوں کہ دھوپ کی شدت ریگستان میں نا قابل برداشت ہوتی ہے وہ رات ہی میں سفر کرتے ہیں رات کے پچھلے پہر چلنے والی خوشگوار ہوا کی وہ ہمیشہ تعریف کرتے ہیں **نسیم الصبا جاءت بری القرنفل** جیسے مصرعے بادصبا کی اسی فرحت بیزی کی وجہ سے ہیں، رات میں چاند ان کا رفیق ہوتا ہے ستارے ان کی رہنمائی کرتے ہیں اس لئے چاند کی پرستش کا رجحان ضرور تھا، مصنف نے بتایا ہے کہ عرب جغرافیائی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ میں تجارت اور دوسرے ملکوں میں آنے جانے کا بھی سلسلہ تھا ان سفروں سے وہ بہت سے تجربات بھی حاصل کرتے تھے۔

فلپ کا انداز بیان مسلم مؤرخین کے انداز بیان سے مختلف ہے اس نے صرف تاریخ کے حوالے سے عربوں کو جیسا پایا اس نے ان کی زندگی کو پوری دیانتداری سے پیش کردیا ہے اور بدویوں کی زندگی کے ان پہلوؤں پر زیادہ گفتگو کی ہے جن کو مسلم مؤرخین نظر انداز کردیتے ہیں کیوں کہ یہ ان کی نجی زندگی کے واقعات ہیں اور ان کی

وجہ سے ان کی معاشرتی زندگی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس کی تصویر کشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب ایک نیم وحشی قوم ہے البتہ فلپ نے عربوں کی شاعری کی دل کھول کر تعریف کی ہے اس فن میں ان کے کمال کا پورا پورا اعتراف کیا ہے۔

فلپ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عرب کے بارے میں اس کی معلومات بہت وسیع ہیں قبل مسیح کی روایات سے بھی اس کو مکمل واقفیت ہے، مجموعی طور پر اس کی تفصیلات پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ ریگستان اور اس کی آب وہوا، گلہ بانی کرنے، شب وروز جانوروں کے ساتھ جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے عربوں کی زندگی میں کہیں سے یہ جھلک نظر نہیں آتی کہ وہ ریگستان اور اس کی کانٹے دار جھاڑیوں سے آگے بھی کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والی مخلوق ہے وہ ایسی سنگلاخ چٹانوں کے مانند کھردرے، ناہموار، سخت اور ناقابل تسخیر انسانی جسم رکھنے والی مخلوق ہے وہ ایسی سنگلاخ چٹانوں کے مانند تھے جن کو تراشنے والا کوئی ماہر کاریگر کبھی نہیں آیا ایسی ہی قوم میں مسلمانوں کے پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جنہوں نے ان سنگلاخ چٹانوں کے اندر مخفی یاقوت وزمرد جیسے قیمتی اجزا نکالے اور تہذیب وتمدن کے بازار میں ان کی قدر و قیمت کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور یہی اونٹ اور بھیڑ چرانے والے تہذیب وتمدن کے بانی اور ساری دنیا کے تہذیب وثقافت کے معلم بن کر ساری دنیا پر چھا گئے اور کئی سالوں تک انہیں بدویوں نے بے مثال نظام حکمرانی قائم کرکے دنیا کو تہذیب وثقافت اور بے مثال تمدن اور اخلاق وشائستگی کا سبق پڑھایا۔

مصنف نے صرف دس صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی کے اہم ترین اور بنیادی واقعات کو سمیٹ لیا ہے جس کی جزئیات سیکڑوں صفحات میں مسلم مؤرخین نے بیان کی ہیں، کیوں کہ فلپ صرف ایک مورخ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں برپا ہونے والے انقلاب کے وہ اجزا جو تاریخ عالم میں زندۂ جاوید بن جانے والے تھے صرف انہیں کو اپنے ذہن ومزاج کے مطابق

اخذ کیا ہے یہاں تک کہ مکہ فتح ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی جس کا دارالحکومت مدینہ قرار پایا اور بحیثیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں جو ذہنی وفکری اور عملی تبدیلیاں کی ہیں ان کو مناسب موقعوں پر پیش کرتا چلا گیا ہے، عربوں میں قبیلہ واریت کا جو روگ تھا جس کو مسلمانوں نے عصبیت جاہلیہ کا نام دیا ہے اس کی جڑ کاٹ دی، مصنف نے حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کئے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگو! میری باتوں کو غور سے سنو، دل لگا کر سنو، جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، تم سب کا تعلق ایک برادری سے ہے اس لئے تم میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے بھائی کی کسی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اپنے قبضہ یا استعمال میں لائے، اس طرح عربوں کے تعلقات، یعنی قبائلی رشتہ داری کی گرہ ایک ہی وار میں کٹ گئی اور اس کی جگہ ایمان کی مضبوط گرہ لگا دی گئی، ملک عرب کے لئے ایک طرح کی اسلامی برادری قائم کر دی گئی، اسی نئی جماعت میں نہ تو کسی طرح کا کاہنی نظام تھا نہ ہی پیشواؤں کی حکومت تھی اور نہ کوئی مرکزی دینی عدالت تھی اس کی مسجدیں مشترک عبادت کا مقام ہونے کے علاوہ عام اجتماعی اور فوجی تربیت کا مقام بھی ہوتی تھیں، مسجد میں امام عبادت کے موقعوں پر مسلمانوں کی قیادت کرنے کے سوا میدان کارزار میں اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بھی ہوا کرتا تھا اور تمام مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ وہ ساری دنیا کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی امداد اعانت کریں اور حفاظت کریں ......اسلام نے پچھلی زندگی کی باتوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا، شراب اور قمار بازی، جو عورت کے بعد عربوں کی زندگی کے دو محبوب ترین مشغلے تھے ایک ہی آیت کے ذریعہ حرام کر دیا گیا''۔

مدینہ میں جو معاشرہ ابھر رہا تھا اس کے اندر جو انقلابی تبدیلیاں ہو رہی تھیں عربوں اور بدویوں کے ذہن ومزاج کو جس سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا مصنف نے

اس کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اس نے بتایا کہ مدینہ میں نظم ونسق کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہوگئی تھی لیکن یہ حکومت رتبہ کے لحاظ سے چھوٹی تھی لیکن ایک ایسا مستحکم قلعہ کردیا گیا جس کی ہر ہر اینٹ فولاد کی بنی ہوئی تھی اس کی بنیاد ایمان ویقین کی ٹھوس چٹانوں پر رکھی گئی کہ تیز سے تیز آندھی نہ اس پر اثر انداز ہوسکتی تھی اور نہ زلزلوں کا جھٹکا اس کو متزلزل کرسکتا تھا، رسول اللہ نے دو تین سالوں کی قلیل مدت میں اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، کہ دنیا کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی، اس کے بعد مصنف نے لکھا:

''مدینہ سے اسلام کی دینی حکومت عرب کے طول وعرض میں پھیل گئی اور رفتہ رفتہ اس نے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ کے ایک بڑے حصہ کو مسخر کرلیا، مدینہ کی اسلامی جماعت گویا مستقبل کی ملت اسلامیہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی مختصر سی دنیوی زندگی میں ایک غیر امید افزا ہیولیٰ سے عرب جیسے گمنام اور دنیا سے الگ تھلگ ملک میں ایسی قوم پیدا کی جس کی شیرازہ بندی آپ سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، آپ نے ایک ایسا دین پیش کیا جس نے دنیا کے وسیع وعریض علاقوں میں یہودیت اور نصرانیت کو ان کے اونچے مقام سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لے لی اور آج بھی اولاد آدم کی بہت بڑی تعداد اسی دین کی پیروی کرتی ہے، آپ نے ایک ایسی مملکت کا سنگ بنیاد رکھا جو اس وقت کی متمدن دنیا کے بہترین علاقوں کو بہت جلد اپنے وسیع وعریض دامنوں میں سمیٹ لینے والی تھی، آپ امی تھے لیکن آپ کے ذریعہ ایک ایسی کتاب منظر شہود پر آئی جس کے متعلق دنیا کی آبادی کے آٹھویں حصہ کا یقین اور ایمان ہے کہ یہ کتاب تمام حکمت فلسفہ اور شریعت کا سرچشمہ ہے۔

فلپ اپنی اس کتاب میں نرا مؤرخ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس نے کسی قوم کے عروج وکمال ترقی میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں اس کا بھی بڑی دقیقہ رسی سے جائزہ

لیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا میں ایک نئی قوم تشکیل پا رہی ہے اس کے استحکام میں کن باتوں نے مؤثر ترین رول ادا کیا ہے اس سلسلہ میں اس نے اسلام کے ارکان خمسہ کی اس انداز سے تفصیل دی ہے جیسے مسلمانوں کی ترقی میں ان کا اہم ترین رول رہا ہے ان ارکان کی خارجی تاثیر کی طرف اس نے واضح اشارے کئے ہیں اور بتایا ہے کہ اسلام کی ساری عبادتوں میں ایک ایسی روح کارفرما نظر آتی ہے جو دنیا والوں کی عبادتوں میں اس کا شائبہ بھی نہیں ملتا، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ظاہری فوائد کی نشان دہی کی ہے مثال کے طور پر اس نے حج کے متعلق اپنے جو تاثرات قلم بند کئے ہیں یہاں پیش کئے جاتے ہیں وہ لکھتا ہے:

''فریضۂ حج صدیوں سے اسلام میں متحد کرنے والی ایک زبردست قوت، مختلف عقیدے کے لوگوں کے درمیان ایک موثر ترین رابطہ عام کا کام دیتا چلا آ رہا ہے اس نے تقریباً ہر مستطیع مسلمان کو اس کی زندگی میں کم سے کم ایک بار سفر کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا ہے، تمام عالم کی مسلم برداری کے اس عظیم الشان اجتماع کی اشتراکیت ساز قوت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اس نے حبشیوں، بربریوں، چینیوں، ایرانیوں، عربوں امیر ہوں کہ غریب اعلیٰ ہوں کہ ادنیٰ کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے اور مذہب کی مشترک سطح پر ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع عطا کئے، دنیا کے تمام مذہبوں کے مقابلہ میں صرف اسلام ہی کو کم سے کم اپنی جماعت کی حدوں کے اندر رنگ نسل اور قومیت کے امتیازات مٹا دینے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، خط فاصل صرف مسلمانوں اور باقی انسانیت کے درمیان کھینچا جاتا ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس اجتماع نے اس مقصد کے حصول میں نہایت اہم حصہ لیا ہے، ان اجتماعوں نے ایسے ایسے علاقوں میں بھی دین اسلام کو پھیلانے کے بہترین مواقع فراہم کئے ہیں جو نہ صرف ابھی تک جدید ذرائع حمل ونقل کے ذریعہ متمدن دنیا سے مربوط نہیں ہوئے ہیں

بلکہ وہاں صحافت کی زندہ آواز بھی معدوم ہے''۔

رسول اللہ کے انقلابی تعلیمات کے اہم ترین اجزا کی تفصیلات اور مادی ودنیاوی فوائد کی اہمت وتاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے بتایا کہ ان انقلابی تبدیلیوں نے ان وحشی بدویوں کو انتہائی جوش وجذبہ سے بھر دیا اور ان کو ماہر سیاستداں، اولوالعزم فاتح اور جنگی حکمت عملیوں میں اپنی مثال آپ بنادیا فلپ بہت فراخدلانہ طور پر اعتراف کرتا ہے:

''ایک طرف عربوں نے ایرانی شہنشاہیت کے پرخچے اڑادیئے دوسری طرف انہوں نے بازنطینی سلطنت کی بنیاد ہلادی اگر کوئی ساتویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں میں یہ پیشینگوئی کرنے کی جرأت کرتا کہ اس بیس سال کے اندر باہر ایک نامعلوم طاقت عرب جیسی غیر متمدن اور غیر معروف سرزمین سے اٹھے گی اور اپنے زمانے کی دونہایت طاقتور اور بڑی سلطنتوں پر دھاوے کر کے ایک پر قابض اور متصرف ہوجائے گی اور دوسری سے اس کے بہترین علاقے چھین لے گی تو یقیناً اسے پاگل سمجھا جاتا لیکن اوپر جو کچھ کیا گیا ہے بالکل ایسا ہی واقعہ ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی وفات کے بعد عرب کی بنجر زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے مردم خیز خطۂ زمین میں تبدیل کردیا تھا پھر تو اس خاک سے ایسے ایسے عالی ظرف بلند حوصلہ لوگ اٹھے کہ شمار اور صفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظر نہیں ملتی، عراق، شام اور مصر میں خالد بن ولید، عمرو بن العاص نے جو معرکے سر کئے ہیں حربیات کی تاریخ میں ان کا شمار ایسی مہموں میں ہوتا ہے جو نہایت دلیرانہ سر کئے گئے ہیں، ان کا مقابلہ بجا طور پر نپولین، ہنی پال اور سکندر کی جنگی مہموں سے کیا جاسکتا ہے''۔

فلپ چونکہ عیسائی مؤرخ ہے اس لئے وہ مسلمانوں کی شاندار فتوحات میں مادی اسباب کی تلاش کرتا ہے، عربوں کے انداز جنگ، ان کے تیز رفتار حملوں، برق رفتاری سے ان کے دھاووں کا تذکرہ کرتا ہے اور مسلمان مؤرخوں کی طرح عربوں کی

کامیابی کا راز خلوص للّٰہیت، دین سے بے پناہ وابستگی اور رضاء الٰہی کی جستجو نہیں بتاتا ہے، کیوں کہ اس کا تعلق عقیدت سے ہے اور ایک مؤرخ ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ کرنا بھی نہیں چاہئے تھا یہ کسی تعصب کے زیر اثر نہیں، پھر بھی اس کو ڈھکے چھپے لفظوں میں عربوں کے ایمان ویقین کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے، عربوں کی جنگ میں برتری کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

''جہاں تک عربوں کا تعلق ہے ان کی مثال ایک چست وچالاک اور طاقتور خاندان کی سی تھی جس کے افراد میں ایک نیا جوش اور ولولہ بھرا تھا جس میں عزم وایقان تھا اور انکے نئے دین نے ان کو موت کے ڈر سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں ان میں ہر موقعہ پر بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا گیا اور ایسے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی جن پر فتح حاصل کرنا بظاہر ممکن نہ تھا قلت وکثرت کے پیمانے پر ایسا سوچنا بھی مشکل تھا مگر مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کو ان سے کئی گنا زیادہ دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی اور بتدریج اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا، حجاز کا ایک بڑا حصہ اسلام قبول کر چکا تھا اگر چہ عرب کا ایک بڑا حصہ ابھی دائرۂ اسلام سے باہر تھا البتہ مدینہ میں اسلام کی مرکزی حکومت مستحکم ہو چکی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ پیش آ گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں نے نہایت تدبر وفراست سے کام لیا چاروں خلفا نے یکے بعد دیگرے نظام حکومت کو سنبھالا البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جو حالات پیش آئے ابوبکر صدیقؓ اور پھر عمر فاروق نے اپنے اخلاص، کمال فراست سے اس طرح ان پر قابو پایا کہ اسلام کی طاقت آناً فاناً اتنی بڑھ گئی کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ان کے نام سن کر لرزنے لگیں، قیصر وکسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آ گیا اور مسلمانوں کا دائرۂ حکومت اتنا وسیع ہو گیا کہ بیس برس پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا پروفیسر فلپ نے ان تمام واقعات اور انقلابی پیش قدمیوں کو پوری

دیانتداری کے ساتھ شاندار لفظوں میں بیان کیا ہے دمشق، ایران اور مصر کی فتوحات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے فتح اسکندریہ کے موقعہ پر وہاں کے ذخیرۂ کتب کو جلانے کا الزام مسلمانوں پر لگاتے ہوئے یورپین مصنّفین نہیں تھکتے ہیں فلپ نے حقیقت واقعہ کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیا وہ اپنی کتاب میں بہت واضح لفظوں میں لکھتا ہے:

''قصہ مشہور ہے کہ عمرو بن العاص چودہ مہینے کی طویل مدت تک اسکندریہ کے کتب خانے کی کتابوں کو شہر کے مختلف حماموں میں ایندھن کے طور پر جلواتے رہے، یہ قصہ بالکل من گھڑت ہے اور بے بنیاد ہے، اس سے دلچسپ افسانہ طرازی تو ہوتی ہے لیکن تاریخی نقطہ نظر سے یہ خرافات کے سوا اور کچھ نہیں بطلمیوسی کتب خانے کو جولیس سیزر نے ۴۸ء (ق،م) ہی میں نذر آتش کر دیا تھا اس کے بعد ایک اور کتب خانہ کو جس کا نام چھوٹا کتب خانہ تھا ایک دوسرے بادشاہ تھیوڈوس کے فرمان کی بنا پر ۳۸۹ء میں برباد کرایا گیا، جس زمانہ میں مسلمانوں نے اسکندریہ کو فتح کیا اس وقت وہاں کوئی مشہور کتب خانہ موجود نہ تھا اور نہ اس وقت کے کسی مؤرخ ہی نے یہ الزام عمرو بن العاص پر لگایا''۔

فلپ نے بنوامیہ کے دور خلافت میں عربوں کو دور دراز علاقوں تک اپنے حدود حکومت بڑھانے میں جو شاندار اور حیرتناک کامیابیاں ملیں ان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ۱۳۲ھ تک اسلامی مملکت کے حدود جہاں تک بڑھ گئے تھے ان کی نشاندہی کی ہے اور اسی سال بنوامیہ کا دور خلافت ختم ہوا اور بنوعباس اس پر قابض ہو گئے اور دارالخلافت اب دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا دمشق اجڑ گیا اور بغداد آباد ہو گیا یہاں آکر عربوں نے جو شاندار تہذیب وتمدن اور ثقافت کی بنیاد ڈالی اس کو فلپ نے بڑے ادبیانہ اور انشاء پردازانہ اسلوب میں بیان کیا ہے، پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک کی تاریخ لکھنے کے بعد اس نے آخر میں لکھا:

۷۳۲ء کے اختتام کے ساتھ ساتھ حضرت محمد کی وفات کے بعد پہلی صدی ختم ہوئی ہے اس وقت آپ کے پیرو مسلمان ایک ایسی سلطنت فتح کر چکے تھے جس کا

دامن ایک طرف خلیج بسکے اور دریائے سندھ اور حدود چین تک اور دوسری طرف بحیرۂ خوارزم سے بالائی ٹیل تک پھیلا ہوا تھا، شہر دمشق اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام بن گیا تھا، ناف شہر میں اموی خلفاء کا جگمگاتا ہوا پرشکوہ قصر شاہی کھڑا ہوا تھا، یہ قصر ان سرسبز شاداب میدانوں کے نظاروں پر چھایا ہوا تھا جو جنوب میں دائمی برف پوش جبل الشیخ تک پھیلے ہوئے چلے گئے تھے، یہ محل خاندان بنوامیہ کے بانی خلیفہ معاویہؓ نے تعمیر کرایا تھا اس کے قریب ہی جامع اموی واقع تھی جس کو ولید نے جدید طریقے سے آراستہ کرکے اس طرز تعمیر کا ایسا نگار خانہ بنادیا کہ آج حسن کے شیدائی اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، ایسے ہی دربار میں خلیفہ ولید نے فاتحان اسپین موسیٰ اور طارق کا خیر مقدم کیا گیا ہوگا جو اپنے بیشمار قیدیوں اور بیش بہا جواہرات کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہوئے ہوں گے، اس وقت اسلام کا عروج اپنی انتہاء کو اور اسلام کا پہلا شاہی خاندان اپنے جاہ وجلال کے سب سے اونچے درجے پر پہنچ چکا تھا''۔

فلپ نے لکھا کہ جب فتوحات کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہوا اور دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ شہروں میں عربوں کا گذر ہوا اور وہاں کی تہذیب وثقافت اور تمدنی ترقیات کو دیکھا تو بے حد متاثر ہوئے اور صرف حیرت زدہ ہوکر نہیں رہ گئے بلکہ انہیں جنگ جو قبائل نے اثر پذیری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ قوم ہمیشہ سے علوم وفنون کی رسیا رہی، مختلف علوم وفنون ایجاد کیے، قدیم علوم وفنون میں اضافہ اور جدید تحقیقات کو داخل کرکے ان کے معیار کو بلند کیا، نحو وصرف، فقہ، حدیث، تفسیر، آرٹ، موسیقی اور فن تعمیر میں کمال پیدا کیا، فن تعمیر کو ایسے بلند مقام پر لے گئے کہ آج بھی اسلامی ملکوں میں جوان کی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں ان کو دیکھ کر آج کی ترقی یافتہ دنیا حیرت زدہ ہوجاتی ہے اونٹوں اور بھیڑیوں کے چرانے والے کمبل کے خیموں میں زندگی بسر کرنے والے یہی عرب عیش وتنعم، راحت وآسائش کی طرح طرح کی چیزیں ایجاد کررہے ہیں، آرام دہ محلات تعمیر کررہے ہیں، شہروں میں آب رسانی کے ایسے مستحکم نظام قائم کیے جو صدیوں تک اپنی مثال آپ رہے، دنیا کے دوسرے متمدن

ممالک ان کی ترقیوں کو دیکھ کر مرعوب ہوتے رہے، قوانین عدالت، انصاف میں سہولت اور نظام حکمرانی میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ مفتوحہ شہر کے عوام کو اپنے سابقہ حکمرانوں اور بادشاہوں سے از خود نفرت ہوگئی، مسلمان فاتحوں نے اپنے حسن اخلاق سے ان کے دلوں کو جیت لیا لوگ ان کو عزت و محبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور بہت تیزی سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے، ایران جب فتح ہوا تو وہاں کون مسلمان تھا؟ عراق پر جب عربوں کی تلواریں چمکیں تو اپنے قدیم عقائد کی تیرگیوں میں گم تھے لیکن مسلمانوں کے طرز زندگی اور ان کے عدل وانصاف، دیانت وصداقت کو دیکھ کر ان کے ملکوں سے کفر وشرک کی تاریکیاں اس طرح مٹ گئیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا ان ملکوں میں آفتاب اسلام کی روشنی اس طرح عام ہوئی ان ملکوں کا کوئی گوشہ اس روشنی سے محروم نہیں رہا، فلپ نے بنوامیہ کے شاندار کارناموں کے بیان کے بعد اس کے دردناک انجام کو بتاتے ہوئے خلافت عباسیہ کی تہذیبی وتمدنی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے'':

> ''عباسی خلفاء شمالی افریقہ یا اندلس کو اپنے زیر اقتدار کبھی نہ لا سکے لیکن وہ دنیائے اسلام کے مشرقی حصہ پر مسلسل پانچ سو سال تک فرماں روائی کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۵۸ھ اس خاندان کے ۳۷ ویں خلیفہ کو مغلوں کے ہاتھوں نے برباد کر دیا۔

فلپ لکھتا ہے کہ خلفاء عباسیہ کے دور حکومت ہی میں دنیا نے اسلامی تمدن کے عہد زریں کا نظارہ کیا تھا، اس نے دارالحکومت بغداد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی حسین وجمیل تعمیرات اور خوبصورت عمارتوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ چار سال تک دس لاکھ مزدور ومعمار کام کرتے رہے اور آن کی آن میں تہذیب وتمدن کا ایک حسین گلدستہ تیار ہوگیا پھر اس نے پورے شہر بغداد کا خاکہ لکھا:

> ''اس شہر کے اطراف میں تین فصیلیں اور ایک گہری خندق تھی اندر کی آخری فصیل نوے فٹ اونچی اور شہر کے وسطی حصہ کو گھیرے ہوئے تھی ان فصیلوں

میں چار دروازے تھے، ہر دروازے سے ایک شاہراہ اسلامی سلطنت کے چاروں گوشوں کی طرف جاتی تھی اور ہر شاہراہ دائرہ شہر کے مرکز سے شروع ہوتی تھی، ایوان خلافت جو ''باب الذہب'' یا ''قبۃ الخضراء'' کہلاتا تھا ان تمام دائروں کا مشترک مرکز تھا، ایوان خلافت کے پہلو میں جامع مسجد کھڑی تھی، بارگاہ خلافت کا مینار سطح زمین سے ۱۳۰ فٹ بلند تھا''۔

فلپ بتاتا ہے کہ یہی بغداد ہے جہاں اسلامی تہذیب وتمدن پر ایرانی اثرات پڑنا شروع ہوئے یہیں عربی خلافت ''مشیخیت'' سے زیادہ ایرانی استیدادیت کے احیاء کا مظہر بنی، تخیلات وتصورات کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا پر رفتہ رفتہ ایرانی انقلاب وآداب ایرانی ازدواج، ایرانی شراب، ایرانی دوشیزہ اور ایرانی شاعری کا غلبہ ہوتا چلا گیا محلات شاہی ایرانی بیگمات سے بھر گئے انہیں ایرانی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے خاندان رسالت سے وابستگی کے سب سے بڑے دعویدار بنے اور بنتے چلے گئے، جب کہ ان کی رگوں میں عربیت سے کہیں زیادہ ایرانی خون دوڑ رہا تھا اسی دور میں سائنس کی ترقی اور عالمانہ علمی تحقیقات کے لحاظ سے بڑا کام ہوا، اسلام کو مملکت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی اور سرکاری دفتروں کی زبان اب بھی عربی ہی تھی، فلپ نے مزید لکھا کہ:

''نویں صدی عیسوی دو ایسی شاہانہ ہستیوں کے ساتھ نمودار ہوئی جو عالمی معاملات میں بلندترین مقام پر متمکن تھیں، مغرب میں شارلیمن اور مشرق میں ہارون رشید ان دونوں میں بے شبہ ہارون رشید زیادہ طاقتور اور برتر ثقافت کا نمائندہ تھا......اگر چہ بغداد کو تعمیر ہوئے پچاس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ عدم سے نکلتے ہی اس تھوڑی سی مدت میں وہ بے شمار دولت کا عالمی مرکز اور بین الاقوامی اہمیت کا حامل اور بازنطینیہ کا اکیلا حریف بن بیٹھا، اس کا شکوہ اس سلطنت کی اقبال مندی کے شانہ بہ شانہ چل رہا تھا جس کا یہ دارالسلطنت تھا اور یہ شہر اس درجہ کمال کو پہنچ گیا کہ پوری دنیا میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا''۔

فلپ نے بتایا کہ مسلمانوں نے جس شان وشوکت کی حکومت کی اس وقت تک دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، دولت کی فراوانی، تہذیب وثقافت کا اعلیٰ سے اعلیٰ معیار، شان وشوکت اور تمدنی زندگی کا شاہکار مرقع عربوں کا دربار تھا، اس نے بغداد میں دارالخلافت کے جاہ وجلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اس مدوّر شہر کا ایک تہائی حصہ ایوان خلافت، اس کے حرم، خواجہ سراؤں کے ایوانوں اور عمائدین خاص کی حویلیوں پر مشتمل تھا خاص طور پر بارگاہ خلافت بڑا پرشکوہ تھا اس بارگاہ میں جو مسندیں اور قالین، سراپردا تھے مشرق نے اپنی پوری صناعی اور مہارت اس کے بنانے میں صرف کردی تھی خلیفہ کی شریک زندگی جن کا نام زبیدہ تھا یہ رشتہ میں اس کی چچازاد بہن بھی ہوتی تھی بلکہ بعد کی نسلوں نے اس ملکہ کو عظمت واقبال مندی میں اس کے نامور شوہر ہارون رشید کے ساتھ شریک کردیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ ملکہ دسترخوان پر جواہرات جڑے ہوئے چاندی سونے کے برتنوں کے سوا کوئی دوسرا برتن استعمال نہ کرتی تھی، یہ پہلی ملکہ ہے جس نے اپنی جوتیوں پر جواہرات لگائے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک حج پر اس نے بتیس لاکھ دینار صرف کئے تھے، ان میں اس پچیس میل لمبی نہر کے اخراجات بھی شامل تھے جو مکہ میں پانی لانے کی غرض سے اس کے حکم سے کھودی گئی تھی''۔

آج یورپ کی شاندار عمارتوں بلند بالا کارخانوں، عیش وعشرت کے ایوانوں، عالی شان شراب خانوں اور بلند بالا ہوٹلوں کو یورپ کی برتری وعظمت اور بے مثال تمدنی ترقی کے ثبوت میں پیش کیا جارہا ہے جب کہ عربوں نے اپنے دور حکومت میں جب دنیا تہذیب وثقافت اور تمدنی ترقیوں کے نام سے بھی آشنا نہیں تھی کیوں کہ عرب موجد تھے نقالی نہیں، ایجاد اور نقل میں بہت بڑا فرق ہے، ہر حکومت جب عروج پر ہوتی ہے اپنی طاقت وقوت اپنی دولت وشرافت کے مظاہرہ پر مجبور ہوتی ہے، تاکہ وہ اپنے حریفوں کو مرعوب کرسکے، پھر عربوں نے جس تہذیب وثقافت اور تمدن کا بے

مثال مظاہرہ کیا، وہ نہ تو کسی کی تقلید میں تھا اور نہ مصنوعی نمود و نمائش تھی بلکہ ایک عظیم اور طاقتور حکومت کی اندرونی طاقت وقوت کا عکس تھا، اور لطف یہ کہ دنیا میں اس کی نظیر بھی موجود نہیں تھی یہ خود ان کے دماغ کی اختراع تھی، آج دنیا اس کو عیاشی اور فضول خرچی سے تعبیر کرے گی لیکن آج بھی دنیا میں اس طرح کی فضول خرچیاں اپنی عظمت اور اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، عربوں نے اپنے عروج میں حکومت کے جاہ وجلال کو ثریا تک اس وقت پہنچایا جب یورپ ابھی پیال میں گھس کر گول لکڑی کا تکیہ لگا کر سویا کرتا تھا اس کی اوبڑ کھابڑ گلیوں میں مٹی کا دیا بھی نہیں جلتا تھا، یورپ کا سارا جاہ وجلال دوڈھائی سو سالوں کا رہین منت ہے، زندگی کا سلیقہ یورپ نے انہیں عربوں سے سیکھا، فلپ نے ان تمام حقائق کو بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کے دور عروج کا ایک جزئی واقعہ لکھا ہے اور ایک دلکش منظر ہمارے سامنے پیش کیا ہے:

> ''خلیفہ کی مسند نشینی، شادی، حج اور ممالک غیر کے سفیروں کی باریابی پر خاص طور پر دربار کی دولت شان وشوکت اور جاہ وجلال کا پورا مظاہرہ ہوا کرتا تھا، خلیفہ مامون نے اپنے وزیر کی اٹھارہ سالہ لڑکی بوران سے شادی کی تھی اور اس شادی کا جشن ۸۲۵ء میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا تھا، اس جشن کی تفصیل عربی ادب میں اس زمانہ کی ایک ناقابل فراموش یادگار بن گئی ہے، کہتے ہیں کہ اس شادی کے موقعہ پر دولہا ودلہن کو ایک فرش پر جو موتیوں اور یاقوت سے مزین تھا بیٹھایا گیا اور ایک طلائی کشتی میں ایک ہزار بے مثال بڑے بڑے موتی رکھ کر ان پر نچھاور کئے گئے، دوسو بتیوں کے ایک عنبریں فانوس نے اپنی ضیاپاشیوں سے شب تار کو روز روشن میں بدل دیا تھا، شہزادوں اور عمائدین سلطنت پر مشک خام کی گولیاں نچھاور کی گئی تھیں اور ہر گولی میں ایک شاہی پروانہ تھا جس میں کوئی جاگیر، غلام، یا اسی طرح کے کسی انعام کا وثیقہ تھا''۔

فلپ نے اس طرح کے مناظر کی کثرت سے عکاسی کی ہے لیکن اس کے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ بغداد یا مسلمانوں کی حکومت میں عیاشی اور فضول خرچی کا دور دورہ تھا

بلکہ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دولت کی فراوانی، ملک کی خوشحالی، عوام کی فارغ البالی کا یہ لازمی اور فطری نتیجہ ہوتا ہے اور دنیا کی پوری تاریخ اس فطری تقاضے اور انسانی جذبات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت کو محفوظ و مستحکم بنا چکے ہیں، کسی حریف کی طاقت کا اس کو خوف باقی نہیں رہا، اس کو اپنے قوت بازو اور اپنی تلوار کی کاٹ پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ کسی دشمن کو خاطر میں نہیں لاتے، خلافت عباسیہ کے حکمراں بھی اس فطری جذبے سے مستثنیٰ نہیں تھے، آج یورپ کو اپنی ترقی پر ناز ہے وہ دولت کی بہتات کے سوا اور کیا ہے، پھر بھی عربوں کی حکومت اور یورپ کے موجودہ نظام حکمرانی میں ایک اور بہت بڑا فرق ہے آج یورپ اس دولت کا استعمال مہلک اسلحہ کے بنانے پر صرف کرتا ہے اور انسانیت کو آن کی آن میں کس طرح قتل کردیا جائے کس طرح پورے پورے شہر کے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے یورپ کی ساری کوشش اسی پہلو پر سوچنے میں مصروف ہے اور ساری دولت کا استعمال شیطانی طاقت کو اور طاقتور بنانے میں صرف کرتا ہے، خلافت عباسیہ اس طرح کی شیطانی طاقتوں کے لئے راستہ نہیں کھولتی تھی، وہ دولت کو انسانوں کے لئے حیات بخش اور زندگی دینے میں صرف کررہی تھی وہ اپنے ملک اور سلطنت میں دولت کی فراوانی مال وزر کی کثرت زیادہ سے زیادہ خوشحالی کی تدبیروں میں صرف کرتی تھی فلپ نے اپنی اس کتاب میں اس پہلو پر بھی بہت تفصیل سے کہا ہے وہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی بین الاقوامی تجارت عروج پر تھی، ساری دنیا سے تجارتی روابط خلافت عباسیہ نے قائم کررکھے تھے، وہ لکھتا ہے:

> ''بازاروں میں چین سے چینی مٹی کا سامان، ریشم اور مشک، ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے گرم مسالہ، معدنی اشیاء اور رنگ، ترکوں کے ملک وسط ایشاء سے لعل، یاقوت، نیلم، کپڑے اور غلام، اسکنڈی نیویا اور روس سے شہد، موم، قاقم، سنجاب اور سفید فام غلام اور مشرقی افریقہ سے ہاتھی دانت، سونے کی خاک اور حبشی غلام آیا کرتے تھے، چینی مٹی کے ظروف کی خرید وفروخت کا ایک

خاص بازار بالکل الگ ہی تھا مملکت کے صوبوں سے مقامی پیداوار میں مثلاً مصر سے چاول، غلہ اور کتان، شام سے شیشہ، دھات کا سامان اور میوہ، عرب سے کمخواب، موتی اور ہتھیار، ایران سے عطریات اور ترکاریوں سے لدے ہوئے کارواں اور جہازی قافلے دارالخلافۃ بغداد پہنچتے تھے۔

بغداد اور دوسرے برآمد کے مرکزوں سے عرب تاجر شرق بعید، یورپ اور افریقہ کے کپڑے جواہرات، فلزئی آئینے، شیشے کا سامان اور گرم مسالہ جہازوں کے ذریعہ بھیجا کرتے تھے، حال ہی میں عربی سکوں کے دفینے شمالی روس، فن لینڈ اور سوئیڈن اور جرمنی جیسے دور دراز علاقوں میں برآمد ہوئے ہیں، یہ دفینے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ میں اور اس کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی تجارت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، سند باد جہازی کی داستان جو الف لیلہ کی بہترین داستانوں میں شمار کی جاتی ہے محض من گھڑت افسانہ نہیں بلکہ اس کے متعلق یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اصل میں یہ قصہ مسلمان تاجروں کے بحری سفروں کی رودادوں پر مبنی ہے۔

خلافت عباسیہ کے دور عروج کی تہذیب وشائستگی، قابل رشک معاشرہ، بین الاقوامی تجارت کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کی سرپرستی، تصنیف وتالیف دوسری زبانوں کی علمی وسائنسی کتابوں کے تراجم ایجادات واختراعات غرض متمدن حکومت کا کون سا پہلو ہے جس کو مسلمانوں کی حکومت نے نظر انداز کیا ہو، فلپ نے زندگی کے ہر پہلو پر پوری امانتداری سے روشنی ڈالی ہے وہ آگے بتاتا ہے کہ:

”بغداد کے اس پرتکلف اور اعلیٰ معیار زندگی نے تاریخوں اور افسانوں میں اس زمانے کو ہر دلعزیز بنا رہا ہے خاص کر وقائع عالم میں یہ حقیقت نہایت تابناک ہے کہ اسی دور نے تاریخ اسلام کی یادگارترین اور عقل وخرد اور تہذیب وتمدن کی پوری تاریخ کے ایک نمایاں ترین مذہبی بیداری کے مظاہرے کا مشاہدہ کیا اس کی نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کے زیر اثر پہلوی، سنسکرت اور

سریانی زبانوں سے عربی زبان میں ترجمے ہوئے مسلمان عربوں کے پاس سائنس، فلسفہ اور ادب کا جو کچھ ذاتی سرمایہ تھا وہ بہت ہی حقیر تھا لیکن ریگزار عرب سے وہ اپنے ساتھ علمی تحقیق و تجسس ایک صحیح شعور واحساس اور ذہن ودماغ کی بہت سی مخفی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے، یہ لوگ بہت جلد ان تمام قدیم اور نسبتاً اعلیٰ تہذیب کی حامل قوموں کے ثقافتی خزانوں کے مالک اور وارث بن بیٹھے جن کو انہوں نے یا تو بالکل مغلوب کرلیا تھا یا جن سے نبرد آزما ہوئے تھے، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اس سرچشمہ کے بہاؤ کو اندلس اور صقلیہ کے عربوں نے کس طرح یورپ کی طرف پھیر دیا اور اس نے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کو کس طرح پروان چڑھایا۔

فلپ نے درجنوں علوم وفنون کو شمار کرایا ہے کہ مسلمانوں نے پرانے ملبوں پر نئی تعمیر کر کے ان کو فلک بوس بنا دیا، نام بنام ان علوم وفنون کو پیش کر کے ہر ایک میں جو قابل ذکر اضافہ کیا ان کی نشاندہی کر دی ہے خلافت عباسیہ نے پانچ سو سال میں جو تہذیبی، تمدنی، ثقافتی علمی وتحقیقی خدمات کی ہیں اور بہت سے علوم وفنون کو پیش کر کے ہر ایک میں جو قابل ذکر اضافہ کیا ان کی نشان دہی کر دی ہے خلافت عباسیہ نے پانچ سو سال میں جو تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، علمی وتحقیقی خدمات کی ہیں اور بہت سے علوم وفنون کو اپنی جدید تحقیقات وتخلیقات سے مالا مال کیا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ ترقی اس دور میں ہوئی جب پوری دنیا علم وتحقیق کے اعتبار سے بچپن کے دور سے گذر رہی تھی مسلمانوں کے سامنے کسی قوم کی ترقیوں کی کوئی نظیر ومثال موجود نہیں تھی، لندن، فرانس، جرمنی اور دوسرے یورپین ممالک ظلمت کے دور سے گذر رہے تھے، امریکہ کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ ابھی دنیا اس کے وجود ہی سے بے خبر تھی اور وہاں کے باشندے گمنامی کی دبیز چادروں میں لپٹے ہوئے مہذب دنیا کی نگاہوں سے مستور تھے، وہ دنیا کا ایک گمنام جزیرہ تھا۔

فلپ نے خلافت عباسیہ کے کارناموں سے روشناس کرانے کے بعد اندلس کی

تاریخ بیان کی ہے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک انتہائی شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی اور یورپ میں واقع ہونے کی وجہ سے پورے یورپ کو اس نے متاثر کیا بہت سے علوم وفنون مسلمانوں کی اسی حکومت کے ذریعہ یورپ میں پہنچے، پروفیسر فلپ نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی اس مغربی حکومت نے یورپ میں بیداری کی لہر پیدا کی اور اس کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں آنے کے لئے مہمیز کیا یورپ پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے اس نے لکھا:

''جس زمانہ میں اسلامی مملکت کی مشرقی شاخ اپنے عہد زریں میں داخل ہو رہی تھیں ادھر اسی زمانہ میں اس مملکت کی مغربی شاخ اسپین میں ایسے ہی پرشکوہ عہد سے گذر رہی تھی، یہ زمانہ ہمارے لئے اور بھی اہم ہے کہ عربی ثقافت بڑی حد تک اسلامی اسپین ہی سے مغرب میں داخل ہوئی اور قرون وسطی ابتدائی نصرانی ثقافت میں نفوذ کر کے وہ تمدن پیدا کیا جو ورثے میں ہم کو پہنچا ہے، مغرب کا یہ اسلامی تمدن نویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان اپنے بام عروج پر پہنچ گیا تھا''۔

تاریخی تسلسل کے لئے ذہن میں اسلام کی یہ تاریخ تازہ کر لیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک تھا لیکن صحابہ کرام کے اخلاص نے اس کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا لیکن خاندانی اور موروثی بنانے کا دلوں میں جو مخفی ارادہ تھا وہ پنپتا رہا اتفاق سے خلافت راشدہ کے بعد زمام حکومت بنوامیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ۱۳۲ھ تک وہ اس پر قابض رہے اس لئے جن لوگوں کو خاندان رسالت سے قریبی تعلق تھا انہوں نے بنوامیہ کی حکومت کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور اندر اندر سازشیں چلتی رہیں یہاں تک کہ بنوعباس بنوامیہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے اور خود حکمراں بن گئے، بنوعباس نے حکومت چھین لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے حق میں جلاد صفت بن گئے اور وحشت ودرندگی کی انتہاء کر دی، کوشش کی کہ

بنوامیہ کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچ پائے جو مستقبل میں حکومت کا دعویدار ہو سکے، بنوعباس نے تلاش کر کے بنوامیہ کے نابالغ بچوں تک کو قتل کر ڈالا، دو بھائی بچ گئے ان میں سے ایک بھائی نے آگے چل کر اسپین (اندلس) میں ایک شاندار حکومت کی بنیاد ڈالی، فلپ کی زبانی اس داستان کو سنئے:

''بنی عباس کے دست انتقام سے جو چند اموی اشراف بچ گئے تھے ان میں عبدالرحمٰن نامی ایک بیس سالہ وجیہ، دبلا پتلا، بلند بالا، عقاب جیسا، سرخ بالوں والا نوجوان بھی تھا قدرت نے اس نوجوان کو غیر معمولی مردانگی اور ذہانت عطا کی تھی، یہی عبدالرحمٰن اسپین پہنچا لڑ بھڑ کر اسپین کا مالک بنا اور یہاں اسی بنوامیہ کے اقتدار کو بحال رکھا جو مشرق میں نیست و نابود کر دیا گیا تھا، اپنے وطن سے عبدالرحمٰن کا فرار بڑا ڈرامائی رہا، ایک دن وہ دجلہ کے بائیں ساحل پر ایک بدوی پڑاؤ پر ٹھہرا ہوا تھا یکا یک چند سوار عباسیوں کا سیاہ پھریرا اڑاتے ہوئے نمودار ہوئے، انہیں دیکھتے ہی عبدالرحمٰن اپنے تیرہ سالہ چھوٹے بھائی کو لے کر دریا میں کود پڑا چھوٹے بھائی کو تیرنا اچھی طرح نہ آتا تھا اس پر ہیبت طاری ہوگئی وہ ساحل کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جہاں دشمن کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا تھا اگر تم واپس آجاؤ تو تمہیں امان ہے، نادان لڑکا دشمن کے جھانسے میں آ گیا اور ساحل کی طرف پلٹا اور کم بخت دشمن نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا لیکن بڑے بھائی نے دشمن کی اپیل آفرینوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور تیرتا تیرتا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔

پیدل، بے یارومددگار، مفلس ونادار اس حالت میں عبدالرحمٰن نے جنوب مغرب کی راہ لی، بہت سی مصیبتیں جھیلتا فلسطین پہنچا یہاں اسے ایک دوست مل گیا، فلسطین سے اس نے مغرب کا رخ کیا شمالی افریقہ میں وہ اس ولایت کے عامل کے ہاتھوں قتل ہونے سے بال بال بچا، پھر قبیلہ قبیلہ پھرتا وہ پانچ سال کے بعد سبتہ پہنچ گیا وہ جہاں جہاں گیا نئے حکمراں خاندان کے جاسوس

برابر اس کا پیچھا کرتے رہے، عبدالرحمٰن دمشق کے دسویں اموی خلیفہ کا پوتا تھا، اس کی ماں شمالی افریقہ کے کسی ضلع کے ایک بربر قبیلہ کی عورت تھی، وہ اپنے نانیہال پہنچا تو اس کے ماموؤں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔

عبدالرحمٰن آگے آگے تھا اور موت اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی لیکن زندگی جیت گئی اور موت ہار گئی، سوال یہ تھا کہ جان تو بچ گئی وہ بھی اس حال میں کہ وہ مفلس وقلاش تھا، نہ اس کا کوئی دوست اور ہمدرد تھا، نہ کوئی اس کا ہمنوا وہم خیال اور مددگار تھا لیکن عزم جوانی اور بلند ہمتی انسان کے ناممکن کام کو ممکن بنادیتی ہے، حکومت قائم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، یہ نوعمر نوجوان فولادی عزم وارادہ کا مالک تھا اس کے لئے موجودہ حالت پر قناعت کرلینا ممکن نہ تھا اپنے نانیہال میں پہنچ کر اس نے حالات کا جائزہ لیا، اس وقت بنوامیہ کی جو فوج دمشق سے بھاگ گئی تھی وہ اسپین کے جنوبی حصہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے پڑی تھی اور کوئی اقدام نہیں کرسکی تھی اگرچہ خلافت عباسیہ کا ایک عامل اسپین میں مقیم تھا، عبدالرحمٰن نے دمشق کی فوج میں اپنا اثر ورسوخ بڑھایا، ان میں نیا جوش وجذبہ پیدا کیا پھر اپنے نانیہال قبیلہ سے بربروں کی زبردست فوج فراہم کرلی اور پھر اس نے اندلس پر دھاوا بول دیا، اسپین کے حکمراں شارلمین نے جو عباسیوں کا حلیف اور دوست تھا عبدالرحمٰن کی فوج پر حملہ کے لئے ایک فوج بھیجی لیکن عبدالرحمٰن کی فوج کے علاوہ خود شہریوں نے اپنے حکمراں کی فوج کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا مجبوراً اس کو واپس ہونا پڑا جب لوٹتی ہوئی فوج ایک تنگ گھاٹی سے گذر رہی تھی عبدالرحمٰن کی فوج نے اتنا زبردست حملہ کیا کہ فوج اپنے تمام سرداروں کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر گئی اس کے بعد عبدالرحمٰن کی فوج نے جنوبی اسپین کے تمام شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرکے اپنی حکومت قائم کرلی خلافت عباسیہ کا عامل جو یہاں مقیم تھا اس کو قتل کرکے اس کا سر عباسیوں کے سیاہ پرچم میں لپیٹ کر بغداد بھیج دیا تاکہ آئندہ عباسی حکومت کا کوئی فرد اسپین میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکے، پھر عبدالرحمٰن نے کئی سال کی جدوجہد کے بعد پورے اسپین پر قبضہ کرلیا اور کئی سو سالوں کے لئے بنوامیہ کی

تحویل میں دے دیا اور اتنی شاندار حکومت کی کہ آج بھی اسپین (اندلس) کے دور عروج کی کہانیاں دلچسپ افسانوں کی طرح دلچسپی سے بیان کی جاتی ہیں اور سنی جاتی ہیں۔

اسلام نے اپنے ظہور کے بعد دنیا کی جدید تاریخ بنائی، تہذیب وثقافت کی نئی دنیا بسائی، عدل وانصاف، سچائی وراست بازی، انسانیت کی فوز وفلاح کے لئے وہ مثالی کارنامے انجام دیئے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو یہ سبق ملا کہ انسانیت کے ساتھ شرافت وافضلیت کا جو بلند معیار مسلمانوں نے پیش کیا ہے وہی عام انسانوں کے لئے نجات دہندہ ہے اسلامی تہذیب وثقافت کی روشنی ابھی ایشیاء تک محدود تھی عبدالرحمٰن نے اس کو یورپ تک پہنچا دیا اور اندلس میں اپنی حکومت قائم کر کے پورے یورپ کو متاثر کیا اور ان کو تہذیب وشائستگی کا سبق پڑھایا۔

مسلمانوں کے ذوق وتعمیر نے اپنے پہلے دارالحکومت دمشق میں اپنا پہلا مظاہرہ کیا تھا، بغداد میں اپنے عروج پر پہنچ گیا اندلس (اسپین) میں جا کر اسلامی تہذیب وتمدن، آرٹ، فن تعمیر اور تعمیرات میں جدت طرازی اور شان وشکوہ کا اضافہ کر کے اس فن کو بام ثریا تک پہنچا دیا، مسلمانوں کے دارالحکومت قرطبہ کی جانب ساری دنیا کیا یورپ، کیا ایشاء حیرت واستعجاب کی نگاہوں سے اس طرح دیکھتی تھی جیسے نصف النہار پر آئے ہوئے سورج کو دیکھتے سب ہیں مگر اس کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کی جرأت وہمت کسی میں نہیں ہوتی، پروفیسر فلپ نے پوری صداقت کے ساتھ قاری کو قرطبہ کے حسن وجمال، دلکشی وجاذبیت سے آشنا کیا ہے وہ لکھتا:

> ''پورے یورپ میں خلیفہ عبدالرحمٰن کا دربار ہی سب سے زیادہ شاندار دربار تھا، اس دربار میں جرمنی، اطالیہ اور فرانس کے حکمرانوں کے سوا بازنطینی شہنشاہ نے اپنے سفیر بھیجے تھے، اس کا پایۂ تخت قرطبہ تھا، قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ تھی، یہاں سات سو مسجدیں اور تین سو پبلک حمام تھے، شان وشوکت کے لحاظ سے بغداد اور قسطنطنیہ ہی قرطبہ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، شاہی قصر شہر کی شمالی مشرقی دریائے وادی الکبیر کے کنارے جبل البشارات کی ایک چوٹی پر واقع

تھا، اس میں چار سو حجرے اور کمرے تھے، یہاں ہزاروں لونڈی غلام اور محافظ تھے، کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ثالث کی ایک کنیز بہت ہی دولت چھوڑ کر مری تھی، اس کی وصیت تھی کہ اس دولت کو مسلمانوں کے فدیہ میں صرف کیا جائے جو نصرانیوں کے قبضہ میں ہیں، جب اس بات کا پوری طرح اطمینان کرلیا گیا کہ نصرانیوں کی قید میں کوئی مسلمان قیدی نہیں ہے تو خلیفہ نے ۹۳۹ء میں اپنی ایک اور کنیز زہرہ کی تجویز پر یہ عالیشان قصر تعمیر کرایا اور اس کو ''الزہراء'' ہی کے نام سے موسوم کیا، اس قصر کا سنگ رخام نومیدیا اور قرطاجنہ سے منگایا گیا تھا، اس کے ستون اور حوض، اس کے طلائی مجسمے قسطنطنیہ سے لائے گئے تھے، دس ہزار معمار اور مزدور اور ڈیڑھ ہزار بار برداری کے جانور مسلسل بیس سال تک اس قصر کی تعمیر پر کام کرتے رہے، عبدالرحمٰن ثالث کے بعد کے خلفاء بھی قصر الزہراء کی توسیع اور تزئین و آرائش میں حصہ لیتے رہے، بعد میں اس کے اطراف میں اتنے مکانات بنے کہ یہ قصر ایک نواحی شہر کا مرکز بن گیا اس شہر کے آثار ۱۹۱۰ء میں زمین سے کھود کر نکالے گئے اور اسے اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اندلس کے شاندار **قلعة الحمراء قصر الزهراء** اور دوسرے محلات، حویلیاں اور اس کے باغات عجیب و غریب صنعتوں کے مظہر تھے، ایسے ایسے محل بنائے گئے کہ اس وقت تک دنیا نے نہ دیکھا نہ سنا تھا، تمام مؤرخین حیرت و استعجاب کے قلم سے ان تمام صداقتوں کو لکھتے رہے، خود فلپ بھی اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

''بنوامیہ کا دارالخلافہ قرطبہ یورپ کا سب سے زیادہ متمدن اور مہذب شہر بن گیا تھا، قسطنطنیہ اور بغداد کے بعد تہذیب و تمدن کا یہی تیسرا مرکز تھا، اس شہر کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی، اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکانات، اکیس نواحی محلے، ستر کتب خانے، کتابوں کی بہت سی دکانیں، اور کئی سو مسجدیں تھیں اس شہر کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی تھی، اس کا نام سن کر سیاحوں کے دلوں میں شان و شوکت اور دلکشی و زیبائی کا ایک عجیب نقشہ بھر جاتا تھا، یہاں پکی

سڑکیں اور پختہ شاہراہیں تھیں، ان شاہراہوں پر جو مکان بنے ہوئے تھے ان پر روشنی کر کے راتوں میں ان شاہراہوں کو میلوں تک منور رکھا جاتا تھا، حالانکہ اس زمانے سے سات سو سال بعد بھی شہر لندن کی کسی شاہراہ کو کوئی پبلک لیمپ نصیب نہیں ہوا تھا اور شہر پیرس کی سڑکوں کی بھی صدیوں تک یہ حالت رہی کہ بارش کے موسم میں جو کوئی اپنے گھر کی دہلیز سے نیچے اترتا تو اس کے پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے تھے''۔

اس دور میں مسلمان تہذیب وتمدن کے اس بلند معیار پر تھے کہ یورپ کے باشندوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، فلپ نے اس کو بھی نہیں چھپایا ہے بلکہ غیر مبہم لفظوں میں بیان کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تہذیب وتمدن کے معیار برتری کو پرکھنے کے لئے کسوٹی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی وہ دوسری اقوام وممالک کے باشندوں کی شکل وصورت، طرز رہائش، معاشرتی زندگی کی پسماندگی کو دیکھ کر اس پر تبصرے کرتے تھے اور یہ حق اس دور میں بلاشبہ ان کو حاصل تھا یہ تو مشاہدہ کی بات ہے کہ جتنی بلندی سے نیچے دیکھا جائے گا ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے جیسے ہوائی جہاز سے سطح زمین پر بنی عالیشان عمارتیں ماچس کی ڈبیہ معلوم ہوتی ہیں، فلپ نے ایک مسلمان فلسفی کی یہ بات نقل کی ہے:

شمالی یورپ کو عرب جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ طلیطلہ کے ایک عالم قاضی صاعد بن احمد المتوفی ۱۰۷۰ء کے اس بیان سے بخوبی ہوسکتا ہے قاضی صاحب کا بیان ہے کہ شمالی یورپ کے لوگوں کے سروں پر آفتاب کی شعاعیں بالکل سیدھی نہیں پڑتیں اس لئے اس کی آب وہوا سرد اور ماحول ابر آلود رہتا ہے اسی سے ان لوگوں کے مزاج ٹھنڈے اور ان کی طبیعتیں اجڈ ہیں، ان کے جسم کافی پھیل گئے ہیں چہرے پتلے اور بال لمبے ہوگئے ہیں ان میں جودت طبع اور بصیرت تام کو نہیں بلکہ اس کے بجائے ان پر بیوقوفی اور کند ذہنی مسلط ہے۔

لیون اور تاتارا، بارشلونا کے حکمرانوں کو جب بھی کسی جراح، راج معمار یا استاد

گانے والے یا لباس بنانے والے کی ضرورت ہوتی تو وہ قرطبہ سے رجوع کرتے تھے، اس اسلامی دار السلطنت کی شہرت اتنی دور تک پہنچ گئی تھی کہ جرمنی کی ایک سا کزن راہبہ نے اس شہر کے قصے سن سن کر اس کو ''نگینۂ عالم'' کا لقب دیا تھا۔

قرطبہ کی شہرت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ جب دنیا تہذیب وتمدن اور ترقی کے ابتدائی زینوں پر تھی مسلمان تہذیب وترقی کے بام عروج پر متمکن تھے، انسانی استعمال کی چیزیں اور ضروریات زندگی بہت سادہ اور بھدی تھیں، ایجاد واختراع کا جذبہ مفقود تھا اس کے برعکس مسلمان پچھلی حالت پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے اور مسلسل تجربات کر کے بہتر سے بہتر چیزیں ایجاد کرتے تھے اور استعمال کرتے تھے اس لئے باہر کی دنیا ان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتی تھی کپڑوں کی صنعت صرف ستر پوشی کی ضرورت پوری کرتی تھی لیکن ایک صنعت کی حیثیت سے اس کی ترقی مفقود تھی کپڑوں میں حسن خوبصورتی دلکشی وجاذبیت نزاکت لطافت پیدا کرنے کا کام مسلمانوں نے کیا، فلپ نے ہم کو قرطبہ کی صنعتی ترقی سے روشناس کرایا اس نے بتایا کہ خلفاء کے دور حکومت میں اسپین یورپ کے امیر ترین اور آباد ترین ملکوں میں شمار ہوتا تھا اس کے دار السلطنت قرطبہ میں ۱۳ ہزار پارچہ بافی کے کارخانے تھے وہاں چمڑے کی صنعت بڑے پیمانے پر جاری تھی مراکش میں چمڑے کی دباغت اور ان کی گل کاری کا فن اسپین ہی سے منتقل ہوا تھا ان دونوں ملکوں سے یہ فن فرانس اور انگلستان والوں نے سیکھا آج بھی چمڑے کے لئے جو نام استعمال ہوتے ہیں انہیں عربی ناموں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، اُون اور ریشم کے کپڑے قرطبہ کے سوا مالقہ، المرتیہ اور دوسرے مرکزوں میں بنے جاتے تھے، ریشم کے کیڑوں کی پیدائش ابتداءً چین میں ہوتی تھی اسے اسپین کی سرزمین میں سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی رواج دیا تھا یہاں اس صنعت کو خوب ترقی ہوئی المرتیہ میں شیشے اور کانسے کا سامان تیار ہوتا تھا، جیان اور الغرب سونے چاندی کی کانوں، قرطبہ لوہے اور سیسہ کی کانوں اور مالقہ لعل ویاقوت کی کانوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہو گیا تھا،

طلیطلہ کی تلوار مشہور تھی، فولاد اور دوسری دھاتوں پر سونے چاندی کا مرصع کاری کا فن دنیا نے اسپین ہی سے سیکھا اسپین ہی سے یہ فن یورپ میں گیا، زراعت کے طریقے اسپینی عربوں نے یورپ کو سکھائے، عربوں نے اسپین میں نہریں کھدوائیں، انگور کے باغ لگائے دوسرے پودوں اور پھلوں کے سوا چاول، خوبانی، شفتالو، انار، نارنگی نیشکر، روئی اور زعفران کی کاشت پہلے پہل عربوں نے شروع کی، ہر ایک نے کہا کہ زرعی ترقی اسلامی اسپین کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور یورپ کے لئے لافانی عطیہ ہے، اس نے بتایا کہ شبیلیہ مسلمانوں کا ایک زبردست دریائی بندرگاہ ہے، یہاں سے روئی، زیتون اور تیل برآمد کیا جاتا ہے مصر سے کپڑا اور غلام اور یورپ سے گانے والیاں درآمد کی جاتی تھیں، مالقہ اور جیان کی بندرگاہوں سے زعفران، انجیر، سنگ مرمر، شکر برآمد کی جاتی تھی اسکندریہ اور قسطنطنیہ کے ذریعہ اسپین کی پیداوار کو ہندوستان اور وسطی ایشیاء جیسے دور دراز علاقوں تک میں منڈی مل گئی تھی، فلپ نے بتایا کہ عصر حاضر کے بین الاقوامی جہاز رانی میں بہت سے عربی الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں آج بھی موجود ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جہاز رانی کے میدان میں بھی یورپ نے اسپینی عربوں ہی سے استفادہ کیا ہے ڈاک کا نظام تھا اور سکوں کی ڈھلائی کے لئے ٹکسال گھر تھے نصرانی سلطنتوں میں بھی عربی ہی سکے رائج تھے اور تقریباً چار سو سال سے زائد عرصہ تک صرف عربوں ہی کا یہ سکہ یورپین ممالک میں چلتا تھا۔

عربوں نے تعلیم کا نظام بڑے پیمانے پر قائم کیا، اہل علم کو وظائف دیتے رہے، تعلیمی ادارے قائم کئے اور مفت تعلیم کو رائج کیا جامعہ قرطبہ کا دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں میں شمار تھا بلکہ جامع ازہر اور بغداد کے جامعہ نظامیہ سے بھی اس کی عظمت واہمیت زیادہ تھی جامع قرطبہ میں مسلمانوں کے سوا نصرانی طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے تشنگان علوم اپنی پیاس یہاں آکر بجھاتے تھے، جامعہ قرطبہ کے علاوہ یہاں ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں ظاہر ہے کہ یہ سب قلمی کتابیں تھیں کیوں کہ ابھی پریس ایجاد نہیں ہوا تھا ایک

ایک مخطوطہ کے حاصل کرنے میں بڑی سے بڑی رقم خرچ کی جاتی تھی الفرج اصبہانی کی کتاب الاغانی کے لئے ایک ہزار دینار دیا گیا، ان تفصیلات کو پیش کر کے آخر میں فلپ نے لکھا کہ اسپین کے مسلمانوں کی یہ علمی ترقی اس زمانہ میں تھی جب یورپ کے باشندے اپنے نام کی ہجے سیکھ رہے تھے، یہ علم کی مبادیات بھی بڑی حد تک گنتی کے اراکین کلیسا جانتے تھے۔

پروفیسر فلپ کے ہٹی نے اپنی اس کتاب میں حتی الامکان بحیثیت مؤرخ کے پوری تاریخی دیانتداری سے واقعات کو اپنے اصل تناظر میں پیش کیا ہے، نہ کہیں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور نہ کہیں عربوں کی برتری اور اس دور کے یورپ کی پسماندگی کے بیان سے بخل سے کام لیا ہے اس نے تاریخی حقائق کو جس طرح اور جیسا پایا ہو بہ ہو وہی کتاب کے حوالے کر دیا ہے، عام مستشرقین سے اس کا رویہ قدرے مختلف ہے اور یہ اندیشہ کم ہے کہ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''۔

پروفیسر فلپ کے ہٹی شامی النسل عرب، مذہبا عیسائی اور قومیت کے لحاظ سے امریکی ہے، پہلے فلسطین کی یہودی یونیورسٹی میں اسلامیات کا استاذ تھا اور علمی دنیا میں اپنی بلند پایہ کتابوں اور عالمانہ مقالوں کی وجہ سے بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، پھر وہ امریکہ کی جامعہ پرنسٹن میں ادبیات کا پروفیسر رہا، یہ کتاب History Of the Arabs تاریخ عرب دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء سے کچھ پہلے لکھی تھی جب جنگ شروع ہوگئی تو امریکی حکومت کے ایماء پر اس نے اصل کتاب کی تلخیص کی اس تلخیص کو امریکی حکومت نے شائع کر کے اپنے فوجیوں میں تقسیم کیا اسی تلخیص کے اردو ترجمہ سے ساری معلومات آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ پروفیسر فلپ اور حکومت امریکہ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی سے اچھی طرح واقف ہیں تو پھر مسلمانوں کے دور عروج کی یہ داستان اپنے فوجیوں کو سنانے کا کیا مقصد ہے؟ سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ امریکی حکومت سمجھتی ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی پستی سے اٹھ کر دنیا میں بلند مقام حاصل کیا

اس کے پس منظر میں ان کا جوش عمل، عظمت کردار، بے پناہ جدو جہد اور موت کے خوف کو دل سے نکال دینا کارفرما تھا تب ان کو یہ بلند مقام ملا تھا فتح وظفر نے ان کے قدم چومے، وہ دنیا کے امام اور مقتدا بن گئے جب تک کوئی قوم عرب مسلمانوں کی طرح جہاد زندگی میں شامل نہیں ہوگی اس وقت تک اس کو کامیابی نہیں مل سکتی، فوجیوں کے ذہن میں یہی حقیقت جاگزیں کرنی تھی اس لئے مسلمانوں کے دور عروج کی کہانی اس کو سنائی گئی، اسی لئے یہ کتاب ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، اگر آج کی دنیا میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن جب مسلمانوں کے دور عروج سے سبق لے سکتا ہے اور اپنی قوم کو اس راستہ پر چلانا چاہتا ہے تو کیا خود مسلمانوں کو اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چلنے کے لئے یہ حقائق مہمیز نہیں کر سکتے؟ بس اسی نیک جذبے سے یہ طویل داستان میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

# بلگرام اور غلام علی آزاد بلگرامی

قیام لکھنؤ کے دوران ایک بار بلگرام ایک دوست کی بارات کے سلسلہ میں جانے کا اتفاق ہوا، بلگرام کا نام عرصہ دراز سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، دل میں اس کی عظمت جاگزیں تھی، دماغ نے اس کی ایک ایسی خیالی تصویر بنا رکھی تھی جیسے محسوس ہوتا تھا کہ اس سرزمین میں سے آسمان تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے وہاں کے مشاہیر علماء کے علمی کارناموں نے اس کو خطۂ یونان بنا دیا ہے، اس لئے میرے دل میں بلگرام دیکھنے کا جذبہ بے تکلف باراتیوں کی دلچسپ سرگرمیوں سے کہیں زیادہ تھا۔

جہاں ہم بس اور کاروں سے اترے وہ ایک کھلا ہوا میدان تھا، اسی طویل وعریض صحن کی ایک سمت ایک ٹیلہ پر قدیم طرز کے تھوڑے سے مکانات نظر آئے جو حویلی نما تھے جو خستہ بھی تھے اور اپنی کہن سالگی کی وجہ سے اداس اور آزردہ سے محسوس ہورہے تھے، کچھ گھروں کی دیواریں شکستہ ہیں تو بعض مکانوں کی چھت کا کچھ حصہ زمیں بوس ہو چکا ہے، طویل وعریض مکانات میں کہیں زندگی کی چھل پہل محسوس ہوتی تھی کہیں اداسی اور ویرانی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی، جس حویلی میں بارات اتری وہ اپنے ماضی کی عظمت کی تاریخ کا ایک بوسیدہ اور خستہ ورق تھی، لیکن اس کی جدید کاری نے دیدہ زیب بنا دیا تھا اس حویلی کے چاروں طرف ایک اداسی اس طرح برستی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جیسے رات کے پچھلے پہر شبنم دبے پاؤں آسمان سے اترتی ہے اور درختوں، پودوں، پھولوں اور کلیوں کے رخساروں پر آنسو بن کر غمناک فضا بنا دیتی ہے، بلگرام ایک قدیم اور چھوٹا سا قصبہ ہے جو مسطح زمین پر دور تک پھیلا ہوا ہے مگر عام آبادی سے بلند اس ٹیلہ کی مختصر آبادی ہی درحقیقت تاریخ کا مشہور مقام بلگرام ہے باقی آبادی نشیب میں ہے ٹیلہ کی یہ آبادی اپنی قدامت اور کہن سالگی کی بدولت ویران سی ہے اس کے مکانات جذبات سے عاری انسان کی طرح مایوس اور اداس

کھڑے ہیں اور گلاب کے اجڑے ہوئے بے برگ و بار پودوں کی طرح تھے جن میں کبھی شوخ رنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے رہے ہوں گے یا راہب کے کلیسا کے وہ چراغ تھے جن کا تیل ختم ہو چکا تھے اور ان کی جھلملاہٹ کہہ رہی تھی کہ اب اس کی زندگی کے لمحات بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔

یہی وہ بلگرام ہے جہاں کبھی ہن برستا تھا ٹیلہ کی یہی آبادی دارالامراء تھی، ہر امیر کی شاندار حویلی تھی یہاں حاکم بلگرام کا چھوٹا سا قلعہ تھا جہاں شاندار عربی گھوڑوں کی ہنہناہٹ جاہ وجلال برسا رہی تھی، راجہ سری کی پوری حکومت یہیں کے باشندوں کے زیر نگیں تھی، سلطان شمس الدین التمش کی نظر عنایت شاہان شرقیہ اور مغلیہ بادشاہوں کی دی ہوئی جاگیریں، زمینداریاں اور معافیاں ان کو حاصل تھیں فکر معاش سے آزاد رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، ہر حویلی کے سامنے ہاتھی جھومتا تھا، یہاں کے لوگ شاہی درباروں سے وابستہ تھے، خوشحالی و فارغ البالی نے ان کو بھکنے نہ دیا بلکہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کے فروغ اور ان کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا، اسی لئے کھیپ کی کھیپ علماء، صوفیاء، مشائخ، مصنّفین تیار ہو کر علمی دنیا میں سرفراز رہے جو آج بھی تذکرہ کی کتابوں اور تاریخوں میں زندہ ہیں، دل ودماغ آباد تھے تو ان کی حویلیوں میں عیش وآرام خوشحالی وفارغ البالی خیمہ زن تھی، مادی زندگی کی تمام رعنائیاں ان کے سامنے کنیزوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی تھیں لیکن آج کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، خستہ وشکستہ حویلی میں بارات کی شاندار پذیرائی ہوئی، دسترخوان پر بیش قیمت برتنوں کی جگمگاہٹ، کھانوں کا تنوع، سفید پوش، صاف شفاف لباسوں میں میزبانوں کی دسترخوان پر موجودگی، انداز گفتگو، طرز تخاطب میں پرانی وضعداری کی چاشنی، دودھ کی طرح سفید چاندنی پر بچھے ہوئے لمبے دسترخوان پر دورویہ لکھنوی باراتی اپنی تمام روایتی تہذیب اور وضعداری کے ساتھ اس

طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے نورانی فرشتوں کی قطار آسمان سے اتر پڑی ہو۔

عروج وزوال کی یہ کہانی نئی نہیں بہت پرانی ہے، آنے والی نسلوں کے لئے یہ داستان عبرت ہر طرف بکھری ہوئی ہے، آج کے بلگرام کے شکستہ اور ٹوٹے ہوئے آئینہ میں اس کے شاندار ماضی کا جاہ وجلال بھرا چہرہ دیکھ رہا ہوں، اس کی عظمت ورفعت کا ستارہ مجھے اتنی بلندی پر نظر آتا ہے کہ آنکھوں کا تار نظر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے، یہی وہ بلگرام ہے جہاں سید مرتضٰی زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) پیدا ہوئے جنھوں نے قاموس کی شرح تاج العروس لکھ کر علمی دنیا کو حیرت زدہ کر دیا، ان کی پچاس ساٹھ کتابیں ان کے علم وفضل ان کے مقام ومرتبہ کی شاہد عادل ہیں، اسی بلگرام کے میر سید عبدالجلیل جو شاہان مغلیہ کی آنکھوں کے تارا تھے ان کا مقام ومرتبہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، اسی بلگرام کے خواجہ عمادالدین ہیں جو سطح گنگا پر چل کر تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے، اسی سرزمین میں میر غلام علی آزاد پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی معرکہ آراء کتابوں کے ذریعہ بلگرام کا پرچم آسمان کی بلندیوں تک لہرا دیا، بلگرام کی سرزمین کتنی زرخیز، سونا اگلنے والی تھی کہ اپنے فرزندوں میں علمی طلب کا اتنا جوش وجذبہ پیدا کر دیتی تھی کہ وہ دنیا کے گوشے گوشے میں جا کر اسلامی علوم وفنون حاصل کرتے تھے اور اپنے وطن تک کو اپنے نصب العین کے سامنے بھول جاتے تھے، یہی سید مرتضٰی زبیدی بلگرام سے چل کر یمن تک پہنچے حجاز ومصر کا چکر لگا کر زبید (یمن) میں مقیم ہو گئے کہ وہ بلگرامی کے بجائے زبیدی کہلانے لگے آج مدینہ منورہ میں دفن ہیں۔

ٹیلہ کی یہ چھوٹی سی آبادی کتنی زرخیز تھی اپنے دامن میں کتنے یاقوت وزمرد اور لعل وجواہر کو چھپائے ہوئے تھی کہ جب اس نے اپنا دامن جھٹک دیا تو سینکڑوں ہیرے جواہرات دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ گئے جن کی آب وتاب چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی کی صرف ایک کتاب مآثر الکرام کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام، مشائخ طریقت، اولیاء کبار، علماء ومصنّفین کی اتنی بڑی تعداد اس سرزمین سے اٹھی کہ آج اس ٹیلہ کی پوری مردم شماری بھی اس کی

ہمسری نہیں کرسکتی۔

بلگرام سرزمین ہند کی ان قدیم اور ابتدائی دور کی مسلم آبادیوں میں شامل ہے جب نیک دل اور بہادر مسلم سلاطین نے ہندوستان کی طرف اپنے گھوڑوں کی باگ موڑ دی تھی اور یہاں ایک مضبوط مسلم حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی، بلگرام ایک چھوٹے سے راجہ کی حکومت کا پائے تخت تھا اور ہموار زمین پر آباد دارالحکومت تھا، راجہ کو اپنی فوجی طاقت پر ناز تھا اس لئے اس کا نام بلگرام (طاقت کا سرچشمہ) رکھا تھا، ظاہر ہے کہ طاقت کا سرچشمہ طاقت ہی کے ذریعہ فتح ہوسکتا تھا۔

سادات بلگرام کے مورث اعلیٰ سید محمد صغریٰ بلگرامی سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ) کی فوج میں ایک بلند منصب پر فائز تھے، سلطان نے ان کو بلگرام کے راجہ سری پر حملہ کے لئے بھیجا، انہوں نے بڑی مردانگی سے اس کا مقابلہ کیا اور اس کے طاقت کے غرور کو توڑ کر شکست فاش دے دی، خاندان کے تمام افراد اور سرداران فوج جنگ میں کام آئے اور بلگرام پر سید محمد صغریٰ کا قبضہ ہوگیا اس فتح کی تاریخ لفظ ''خداداد'' سے نکلتی ہے جو ۶۱۴ھ ہوتی ہے سید محمد صغریٰ نے فرمان شاہی کے مطابق اپنے تمام فوجی سرداروں اور ان کی فوج کے ساتھ بلگرام میں قیام کیا اور پورا علاقہ آپ کی جاگیر قرار دیا گیا، سلطان التمش کی طرف سے ۶۲۷ھ میں بلگرام ہی آپ کو گڑھی (چھوٹا قلعہ) بنانے کا حکم دیا گیا یہ قلعہ اسی ٹیلہ پر بنایا گیا جو آج سادات بلگرام کی ٹوٹی پھوٹی آبادی ہے، سید محمد صغریٰ بلگرام کی فتح کے بعد ۳۱ سال زندہ رہے اور شعبان ۶۴۵ھ میں انتقال کیا ان کا مزار آبادی کی شمالی جانب ایک باغ میں بنایا گیا۔

بلگرام میں اس قافلہ علم وعمل کے قیام کے بعد اسلامی علوم وفنون کی نشر واشاعت کا ایک سیل رواں چل پڑا، فکر معاش سے آزاد ہوکر صرف علمی ودینی خدمت کو اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا، مسلم سلاطین جن جن علاقوں کو فتح کرتے وہاں اپنے فوجی سرداروں کو قیام کرنے کا حکم دیتے ان کو معافیاں دے دی جاتیں، علماء اور قاضیوں کا تقرر کردیا جاتا، امام وخطیب اور بزرگان دین کو تمام سہولتیں

فراہم کردی جاتیں وہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ دین اور دینی علوم کی خدمت میں لگ جاتے، اندرون ملک بلگرام جیسی چھوٹی چھوٹی بہت سی آبادیاں تھیں، مسلم سلاطین ان آبادیوں کے خاندانوں کو بڑی بڑی جاگیریں اور معافیاں دے رکھی تھیں، یہیں تھوڑے سے فوجی خاندان کچھ فوجی سردار، امام خطیب قاضی مقرر تھے گویا وہ ایک طرح کی فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے ملکی نظام میں استحکام اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں مدد لی جاتی تھی، یہ آبادیاں فکر معاش سے دور تھیں ہر طرح کی عزت، وقار، خوشحالی اور فارغ البالی انکو حاصل تھی ان آبادیوں کے اہل علم نے اپنی اپنی آبادیوں میں درس وتدریس کا مشغلہ جاری کرر کھا تھا، ملک کے مختلف حصوں میں یہ علمی مراکز کام کررہے تھے، علم وفن حاصل کرنے والے کارواں درکارواں ہمہ وقت ادھر سے اُدھر رواں دواں تھے، انہیں علمی مرکزوں میں ایک بلگرام بھی تھا، ملک کے مختلف حصوں میں یہ علمی مراکز کام کررہے تھے، علم وفن حاصل کرنے والے کارواں درکارواں ہمہ وقت ادھر سے ادھر رواں دواں تھے، انہیں علمی مرکزوں میں ایک بلگرام بھی تھا، خود اس کے باشندے ملک اور بیرون ملک طلب علم کے لئے آیا جایا کرتے تھے، پانچ چھ صدیوں تک یہ اعزاز وافتخار بلگرام کو حاصل رہا یہاں کے امراء اکثر شاہی درباروں سے وابستہ تھے، ان کی جاگیروں اور معافیوں میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا، لیکن جب سلطان دہلی کی طرف سے اودھ کی حکومت میر سید محمد امین اور پھر نواب سعادت علی خاں نیشاپوری کے دست تصرف میں آئی تو شیعہ گردی نے سارا نظام زندگی درہم برہم کردیا، نواب سعادت علی خاں کے دور میں تمام نئے اور پرانے خاندانوں کے وظیفے بند کردیئے گئے اور معافیاں اور جاگیریں یک قلم ضبط کرلی گئیں اور شریفوں کا کام بگڑ گیا ان کی معاشی حالت تباہ وبرباد ہوگئی، تحصیل علم کا مشغلہ چھوڑ کر مجبوراً سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا، علم وفن کی تدریس وتحصیل کا نظام داستان پارینہ بنتا چلا گیا خوشحالی اور فارغ البالی نے بلگرام سے رختِ سفر باندھ لیا دینی علوم کے چرچوں، تدریس وتعلیم کی محفلوں پر سناٹا چھا گیا لکھنؤ کی شیعی حکومت نے پورے صوبہ اودھ کو چھوٹا سا ایران بنادیا، بلگرام

بھی اسی تباہی کی زد میں آ گیا اور اس پر اد بار ونکبت کے بادل چھاتے چلے گئے، قدیم زندگی کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا اور نواب سعادت علی خان نواب لکھنؤ کا جب انتقال ہوا تو ایک دل جلے نے اس کی تاریخ نکالی

سعادت نمک حرام بمرد

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام میں اولیاء وصوفیاء عظام کی تعداد ۶۱ ہے جو خاص بلگرام ہی سے ہے مزید حیرتناک بات یہ ہے کہ ان صوفیاء ومشائخ میں ۲۳ بزرگ صرف ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں علماء وماہرین علم وفن کی فہرست اس کے علاوہ ہے جن کا الگ مستقل تذکرہ ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی ۲۵ ر صفر ۱۱۱۶ھ مطابق ۹ ر جون ۱۷۰۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے اور ۲۴ ر ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ ۱۵ ر ستمبر ۱۷۸۶ء کو وفات پائی، انہوں نے اپنے وطن بلگرام کو اپنی کتابوں کے ذریعہ زندۂ جاوید بنادیا اور اس کی عظمت وشہرت بڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا وہ بلگرام کے علماء کرام اور مشائخ عظام کی فہرست میں آتے ہیں اور اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، صاحب سجادہ، عشق رسول میں سرشار اوراد وظائف کے پابند، شب زندہ دار بزرگوں میں شامل تھے مگر خالص علمی کتابوں کے بجائے انہوں نے تاریخ وتذکرہ کو اپنا موضوع تصنیف بنایا اور اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں جو آج علمی دنیا میں متداول اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں ہر کتاب میں بلگرام کا ذکر کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور آتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا نے بلگرام کی دینی خدمات اور اس کے عظیم ترین رجال کو آزاد بلگرامی کی کتابوں ہی کے ذریعہ جانا اور ان کے مقام ومرتبہ کو پہچانا ہے۔

میر غلام علی آزاد کی پوری تعلیم از اول تا آخر شیخ محمد طفیل اُتر ولوی سے ہوئی، لغت اور حدیث وسیر نبوی وفن ادب اپنے نانا میر سید عبد الجلیل بلگرامی سے حاصل کیا، صحیح بخاری بلکہ صحاح ستہ کی سند واجازت شیخ محمد حیات سندھی مدنی مقیم مدینہ منورہ سے حاصل ہوئی حدیث کی دوسری کتابوں کی اجازت شیخ عبد الوہاب طنطاوی سے مکہ

معظّمہ میں حاصل ہوئی، علامہ طنطاوی نے آپ کے عربی قصائد کی بیحد تحسین کی، آپ ایک عرصہ تک مکہ و مدینہ میں مقیم رہے اور تحصیل علم کرتے رہے حجاز سے واپسی کے بعد نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ابن نواب نظام الملک آصف جاہ والئ حیدرآباد کی مصاحبت میں رہے اور اورنگ آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں آپ نے وفات بھی پائی اور وہیں آج آسودۂ خواب بھی ہیں۔

آپ عربی کے بہترین اور قادر الکلام شاعر تھے فارسی میں بھی مشق سخن کرتے رہے عربی کے سات دیوان یادگار چھوڑے ہیں ان میں دو دیوان تو صرف نعت سرور کائنات پر مشتمل ہیں، شان رسالت میں لمبے لمبے قصیدے لکھے ہیں قصائد میں روح کی تڑپ عشق رسول کی سوزش اور جذبات کا تموج محسوس ہوتا ہے یہ قصائد ان کے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں قدرت کلام زور بیان پورے پورے قصیدوں پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے، نعتوں کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھ ہندوستان کے علماء ادب نے غلام علی آزاد کو "**حسان الهند**" کا خطاب دیا تھا ان کے ان دونوں نعتیہ دیوانوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں اس خطاب کے مستحق تھے۔

ان کی فارسی شاعری کے بھی کئی دیوان ہیں جو چھپ چکے ہیں البتہ اردو میں ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں اور نہ ان کی تصانیف میں کہیں اردو شعر نظر آتا ہے البتہ ہندی شاعری سے متاثر تھے اور شوق سے سنتے تھے دیگر علوم وفنون میں بھی ان کی تصانیف ہیں لیکن اہل علم نے ان کی طرف کوئی خاص اعتناء نہیں کیا، البتہ تاریخ و تذکرہ میں ان کی چھ سات کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں اور انہیں کتابوں کی وجہ سے آج ہندوستان کے علمی حلقہ میں ان کا نام روشن ہے اور یہ کتابیں تذکرہ نویسوں کا ماخذ بنی ہوئی ہیں، تذکرہ و تاریخ کی ان کتابوں میں صرف ایک عربی زبان میں ہے اور باقی ساری کتابیں فارسی میں ہیں۔

ان کی عربی تصنیف "**سبحة المرجان فی آثار هندوستان**" کتاب کے آغاز میں ہندوستان کے فضائل بیان کرتے ہوئے ذخیرۂ روایات سے ان تمام

روایتوں کو جمع کر دیا ہے جن کا سرچشمہ اسرائیلی روایات ہیں، مثلاً حضرت آدم کا لنکا کے ایک پہاڑ پر اترنا، کسی چٹان پر ان کا نشان قدم ہونا، جنت سے پھولوں کے پودے لانا اور انہیں فردوسی پودوں کی وجہ سے ہندوستان کے پھولوں میں خوشبو کا پایا جانا اور یہ کہنا کہ اسی وجہ سے دنیا کے پھولوں میں ایسی خوشبوؤں کا نہ پایا جانا سب انہیں اسرائیلی روایتوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ ان روایتوں کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سب جھوٹ کی پوٹ ہے اور اسرائیلی روایات ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں فرمایا کہ اگر وہ روایتیں قرآنی تصریحات کی تائید کرتی ہیں تو وہ صحیح ہیں اور ان کو بیان کیا جا سکتا ہے اور ان کی تصدیق کی جائے گی اور جن روایتوں میں عقیدۂ توحید کے منافی باتیں ہیں یا اس کی وجہ سے عصمت انبیاء پر حرف آتا ہے یا ان کی تنقیص ہوتی ہے وہ قطعاً جھوٹی روایتیں ہیں ان کی تکذیب کی جائے گی اور ان کا بیان کرنا بھی جائز نہیں ہوگا، اور وہ اسرائیلی روایات جن کا واقعات عالم سے تعلق ہے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سچ بھی ہوسکتی ہیں اور جھوٹی بھی اس لئے اس طرح کی روایتوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **لا تصدقوہ و لا تکذبوہ** نہ ان کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب، خاموشی اختیار کی جائے گی، غلام علی آزاد کی فضائل ہند کے سلسلہ میں یہ تمام روایتیں اسی قبیل کی ہیں کہ ان کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب، بہرحال یہ روایتیں ہندوستان کے فضائل کے سلسلہ میں ایک گونہ روشنی ڈالتی ہیں، آزاد کا ان روایتوں کا ذکر کرنا کچھ بے محل نہیں ہے، آزاد کا علم حدیث تسلیم شدہ ہے کیونکہ وہ **ضوء الدراری فی شرح البخاری** عنوان سے بخاری شریف کی کتاب الزکوٰۃ کی شرح لکھ چکے ہیں پھر ان کے شیوخ حدیث میں مشہور اہل علم ہیں اور مستند ہیں۔

''**سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان**'' کی ابتداء میں ان روایتوں کو ذکر کر کے ہندوستان کی عظمت و افتخار کو چار چاند لگا دیتے ہیں اس ملک کی کلاہ افتخار کو تاج

زرنگار بنادیا ہے، پہلے باب کے تمام ہونے کے بعد دوسرے باب میں ہندوستان کے علماء وفضلا کا تذکرہ وتعارف ہے جو آزاد کا اپنا خاص موضوع ہے۔

تیسرے باب میں عربی زبان کے صنائع بدائع اور محاسن کلام کی بحث چھیڑی ہے اوران پر بہت مفصل کلام کیا ہے، بطور مثال انہوں نے اس سلسلہ میں کئی سو اشعار پیش کئے ہیں، چوتھے باب میں عاشق ومعشوق کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اسی سلسلہ میں انہوں نے ہندوستانی موسیقی ومعشوق کی خصوصیات، اس کے موضوع، اظہار عشق کے انداز بیان اور اسلوب کو بیان کرتے ہوئے عربی اشعار میں خود ہندی شاعری کے تخیل کو پیش کر کے سمجھانے کی کوشش کر کے ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے اپنے عربی اشعار میں اس دلکشی کو باقی رکھا ہے جو ہندی شاعری کی اپنی خصوصیت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندی اشعار کو سامنے رکھ کر ان کو عربی کا لباس پہنا دیا ہے، عربی شاعری میں یہ بالکل نئی چیز تھی اور عربی شاعری کے مزاج اور اس کے آہنگ سے قطعاً مختلف اور جداگانہ ہے، ان اشعار کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان اشعار میں کوئی ہندوستانی شاعر بول رہا ہے یہ خاصا دلچسپ تجربہ ہے ان اشعار کو پڑھ کر غلام علی آزاد کی قادرالکلامی پر ایمان لانا پڑتا ہے، یہ باب خاصا دلچسپ ہے۔

میر غلام علی آزاد کی دوسری کتاب جس کو شہرت حاصل ہوئی اور آج بھی لائبریریوں میں پائی جاتی ہے وہ ''مآثر الکرام'' ہے جس میں خاص طور پر بلگرام کے علماء اور صوفیاء سے متعارف کرایا گیا ہے اصل کتاب تو فارسی میں ہے لیکن اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اسی (۸۰) صوفیاء کا تذکرہ ہے ان کے نام ونسب، ان کے شیوخ وبیعت اور ان کے فضل وکمال کو کہیں اختصار کے ساتھ کہیں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ان صوفیاء میں ۶۱ مشائخ خاص بلگرام کے ہیں، دوسرے حصہ میں ۷۳ علماء فضلاء کے تراجم ہیں انہیں تراجم کے ضمن میں بلگرام کی خود تاریخ بھی آجاتی ہے، بلگرام میں مسلمان کب آئے؟ کس نے اس کو فتح کیا؟ اسی کے ساتھ اس کے دور عروج کی بھی ایک جھلک نگاہوں

کے سامنے آجاتی ہے، آزاد کے زمانہ تک بلگرام پر چھ سو سال گذر چکے تھے اس کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جب کہ بلگرام کی تاریخ تسلسل کے ساتھ انہوں نے کتاب میں نہیں بیان کی ہے لیکن صوفیاء اور علماء کے تذکرہ کے ضمن میں یہ ساری حقیقتیں از خود ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

غلام آزاد کی تاریخ و تذکرہ کے سلسلہ میں ایک کتاب ''روضۃ الاولیاء'' ہے یہ کتاب خلد آباد (حیدرآباد دکن) کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے آزاد خود خلد آباد میں ایک عرصہ مقیم تھے، ۱۱۶۱ھ میں یہ کتاب انہوں نے فارسی زبان میں لکھی۔

ان کی ایک اور کتاب ''ید بیضا'' کے نام سے ہے جو فارسی زبان کے شاعروں کے تذکرہ پر مشتمل ہے یہ کتاب اس دور کی یادگار ہے جب آزاد سندھ میں قیام پذیر تھے یہ کتاب ۱۱۴۸ھ میں مکمل ہوئی۔

تذکرہ کی ایک اور کتاب ''سروآزاد'' ہے، اس کتاب میں ۱۴۳ فارسی زبان کے شاعروں کا ذکر ہے اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے مزید بھاکا زبان کے آٹھ شاعروں کا بھی اس میں تذکرہ شامل ہے، فارسی کے شاعروں میں ۲۹ شعرا خود ان کے وطن بلگرام کے ہیں، آزاد کی ایک کتاب ''خزانہ عامرہ'' کے نام سے ہے اس کتاب میں ان شاعروں کا تذکرہ ہے جو بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں سے وابستہ رہے اور شاہی انعام و اکرام سے نوازے گئے، ۱۱۷۱ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی، ''مآثر الامراء'' کے نام سے جو کتاب آزاد کے نام سے شائع ہوئی اس کے اول مرتب صمصام الدولہ شاہنواز خاں حیدرآبادی ہیں جب وہ یہ کتاب مرتب کر رہے تھے ان کا قتل ہو گیا ان کے کتب خانے میں آگ لگادی گئی، آزاد کو اس کتاب کی تلاش تھی کہ شاید اس کا کچھ حصہ جلنے سے محفوظ رہ گیا ہو، اتفاق سے ایک جگہ اس کے کچھ منتشر اوراق مل گئے ان کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا آزاد نے اس کو از سر نو مرتب کیا، اپنی معلومات اور اپنی کتابوں سے حالات لے کر کتاب کو مکمل کر دیا اور شائع کر دیا، اسی لئے اس کتاب کو بھی ان کی تصنیفات میں جگہ دی گئی۔

تاریخ وتذکرہ کی ان کتابوں کے علاوہ دوسری تصانیف میں بخاری شریف کی ایک مکمل شرح بھی ہے جو ''ضوء الدراری'' کے نام سے لکھ رہے تھے مگر اس کو مکمل نہ کر سکے اور طبع بھی نہیں ہوئی۔

عربی شاعری ان کا دلچسپ مشغلہ تھا، اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اس کو ردیف وار مرتب کر کے شائع کیا گیا، ان کے دو دیوان تو صرف نعتیہ کلام پر مشتمل ہیں اسی لئے ان کو ''حسان الہند'' کا خطاب حاصل ہوا، ان کا ایک اور مجموعہ کلام ''تسلیۃ الفواد'' کے نام سے ہے جو آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے ان میں ان کی وفات سے چار پانچ سال پہلے تک کا کلام موجود ہے ان میں سے بعض دیوان شائع ہوئے، بیشتر غیر مطبوعہ ہیں ان کی ایک کتاب ''مظہر البرکات'' بھی ہے، یہ آزاد کی ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے، ان کے فارسی کلام کو بھی مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔

میر غلام علی آزاد نے اپنی تصانیف کے ذریعہ بلگرام کی چھ سو سال کی اجمالی تاریخ ہمارے سامنے پیش کر کے اس کی عظمت ہمارے دلوں میں بٹھا دی ہے، یہ کام بلگرام کے کسی فرد نے نہیں کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جن صوفیاء اور مشائخ کا ذکر آزاد نے اپنی کتابوں میں کیا ہے ان میں سوائے چند افراد کے کسی کو ہندوستان میں شہرت حاصل نہیں، اور نہ لوگ ان کے ناموں اور کاموں سے واقف ہیں، سید مرتضٰی زبیدی بلگرامی جن کی قبر مدینہ منورہ میں ہے، اپنی مشہور عالم کتاب تاج العروس شرح قاموس کی وجہ سے عالمگیر شہرت کے مالک ہوئے، خود غلام علی آزاد نے اپنی تصانیف کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت پائی دو چار نام اور بھی لئے جا سکتے ہیں مگر اور کسی کو جاننے والے بہت کم لوگ ہیں، غلام علی آزاد کے سحر کار قلم نے اپنے وطن کو جو بلند مقام دے دیا ہے اسی کا ثمرہ ہے کہ آج بھی مشائخ وعلماء بلگرام کے نام زندہ ہیں، اور ان کا ذکر احترام سے کیا جاتا ہے آزاد اپنے وطن کی کہانی سناتے سناتے ۱۲۰۰ھ میں خود اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

بلگرام جاتے ہوئے یہ تفصیلات تو میرے ذہن میں نہیں تھیں لیکن بلگرام کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اس سفر میں کوئی ہم مذاق ساتھی نہیں تھا کہ میں اس کو ہمراہ لے کر بلگرام کے کھنڈرات اور اس کے شہر خموشاں کی سیر کرتا اور اس کی عظمت دیرینہ کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کرتا، فاتح بلگرام کی قبر کہاں ہے؟ سلطان شمس الدین التمش کا کتبہ کہاں لگا ہوا تھا، بلگرام کی گڑھی (خام قلعہ) کہاں تھا؟ امراء بلگرام کی حویلیاں کہاں تھیں؟ مشائخ بلگرام کے مزارات کس حالت میں ہیں؟ چند گھنٹوں کے قیام میں اس کا موقعہ بھی نہیں تھا کہ بارات کے ہنگاموں سے دامن چھڑا کر کھنڈرات کی سیر کرتے، البتہ ان تین گھنٹوں میں بلگرام کی چھ سو سال کی کہانی کی فلم ذہن کے پردے پر چلتی رہی اور دس بجے شب لکھنؤ واپس آیا تو یہ فلم چلنی بند ہوگئی، دل ودماغ پر سناٹا چھا گیا، یہ اداسی اور سناٹا ایسا ہی تھا جیسے کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی کے آکر چلے جانے کے بعد ہوتا ہے، یا جس طرح شادی کے خیمے صبح کو الٹے ہوئے۔

# اسلامیات کا ایک بے مثال محقق عالم

# جو مستشرقین کے لئے ہمیشہ چیلنج بنا رہا

حیدر آباد کے ایک علمی خاندان کے فرد فرید، دنیائے اسلام کے نامور محقق عالم ڈاکٹر حمید اللہ ایم اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ (فرانس) اپنی ذہانت وفطانت، وسعت مطالعہ، اور علم وتحقیق کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کی وجہ سے اسلام کی تہذیبی، تمدنی اور علمی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرنے والے مستشرقین کے لئے پیرس (فرانس) میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک ہمیشہ چیلنج بن کر رہے، مستشرقین نے اسلام کے جس پہلو پر اعتراض کیا اسلام کی تہذیبی تمدنی اور علمی تاریخ میں جب جب شک وارتیاب کے کانٹے بونے کی کوشش کی تو ڈاکٹر حمید اللہ نے آگے بڑھ کر ان تمام بنیادوں کو ڈھا دیا جن میں ان نام نہاد علم وتحقیق کا ہوائی قلعہ تعمیر ہو رہا تھا، پورے یورپ میں وہ اسلامیات کے فقید المثال محقق عالم کی حیثیت سے مشہور ہی نہیں تھے بلکہ یورپین یونیورسٹیوں کے اہل علم وتحقیق کی جس مجلس مذاکرہ ومباحثہ جس سیمنار یا جس کانفرنس میں شریک ہوتے تو انگلیوں سے ان کی جانب احساس مرعوبیت کے ساتھ اشارے کئے جاتے اور بے چینی کے ساتھ ان کے گفتگو کرنے کا انتظار کرتے تھے، وہ قدیم علمی آثار ومخطوطات کے دنیا کے چند گنے چنے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے، ان کے علم وفضل ان کے دین ودیانت ان کی صداقت واخلاص کا نور ان کے چہرے سے ہویدا تھا، ان کی شخصیت کا ایک دلنواز پہلو یہ بھی تھا کہ فرانس میں ہزاروں افراد نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا، یہ ڈاکٹر حمید اللہ کے صرف اخلاص کا جادو تھا جس کی کاٹ یورپ کے نام نہاد محققین کے پاس نہیں تھی، ابھی چند مہینوں پہلے جنوری ۱۹۹۸ء میں پیرس میں نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی ولادت حیدر آباد میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی، یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۳۱ء میں وہ پیرس (فرانس) گئے اور کئی سالوں تک وہاں قیام کر کے انہوں نے ایک خالص اسلامی موضوع ''رسول اکرم اور خلفاء راشدین کے عہد کی سیاسی سرگرمیاں'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اپنے مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ میں ان کو بار بار ترکی جانا پڑا جہاں اسلامیات کے قدیم مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، انہوں نے ایم اے، پی ایچ، ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کر کے اپنے وطن حیدر آباد میں رہنے کا فیصلہ کیا، اس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اپنی نوعیت کی ممتاز یونیورسٹی تھی اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اسلامی دنیا کی وہ واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم ابتدا سے انتہا تک اردو تھا اور سارے علوم وفنون اردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے اور ملک کے ذہین ترین علماء و محققین یونیورسٹی کے دارالتراجم سے وابستہ تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے ڈگری کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا تعلق سیرت محمدیہ سے تھا اور سیرت کے بہت سے پہلوؤں پر دانشوران یورپ کو اعتراضات ہیں اور وہ ان پر نکتہ چینیاں کرتے رہتے ہیں، اس کا تجربہ ان کو اس وقت بھی ہوا جب مقالہ کی منظوری کے آخری مرحلہ ''دائے دا'' کا مرحلہ آیا، ماہرین نے جو سوالات کئے وہ وہی تھے جن کے بارے میں یورپ کے مستشرقین اپنا پورا زور قلم صرف کرتے رہتے ہیں، اس سے ڈاکٹر حمید اللہ کو اندازہ ہوگیا کہ یورپ کی ساری یونیورسیٹیوں میں جن لوگوں کا تعلق اسلامک اسٹڈیز سے ہے ان میں سے کسی کا ذہن صاف نہیں ہے اور انصاف سے کام نہیں لیتے اسی لئے وہ اپنے مضامین، مقالوں اور کتابوں میں ایسے مباحث اٹھاتے رہتے ہیں، جن سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر حرف آتا ہے اور آپ کے لائے ہوئے دین کی طرف سے پورے یورپ کو بدگمانی میں مبتلا کرتے رہتے ہیں، انہیں تجربات ومشاہدات کی بنا پر آپ نے فیصلہ کرلیا کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں رہ کر اپنی پوری زندگی مستشرقین کی مدافعت میں صرف کر دیں گے یہی سوچ کر وہ

عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے، بحیثیت استاذ ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہندوستان آزاد ہوگیا اور بدقسمتی سے ملک دوحصوں میں منقسم ہوگیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تباہیوں اور بربادیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہوگیا، ملک کی تقسیم نے منافرت کا ایسا زہر پھیلایا کہ مسلمانوں کے سارے علمی تہذیبی وتمدنی آثار مٹادینے کی باتیں ہونے لگیں، اسی زد میں ریاست حیدرآباد بھی آگئی، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پولیس ایکشن ہوا، ہزاروں آدمی مارے گئے، ریاست کا نام ونشان مٹ گیا اسی آگ اور خون کی موسلا دھار بارش میں جامعہ عثمانیہ کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہوگئی، اس کا امتیازی کردار دفن کردیا گیا، انہیں حالات میں ڈاکٹر حمیداللہ نے ہمیشہ کے لئے حیدرآباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا اور ۱۹۴۸ء میں وہ پھر پیرس (فرانس) چلے گئے، پھر وہ نصف صدی تک یعنی پورے پچاس سال تک مسلسل علم وتحقیق اور اسلام کے تعارف اس کی عظمت وبرتری، اور اس کے پیش کردہ دستورِ حیات کی پاکیزگی، اس کے نظام حکمرانی، اس کے اصول صلح وجنگ سماجی وخاندانی زندگی کے لئے اس کے قوانین کو پوری دنیائے انسانیت کے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ اور ساری دنیا کے تہذیب وتمدن پر اس کی عظمت وبرتری کو ثابت کرتے رہے اور اس سلسلہ میں اس دور کے تمام مستشرقین سے علمی جنگ کرتے رہے اور کبھی شکست نہیں کھائی، بحث ومذاکرہ اور سیمناروں میں شرکت، علمی مباحثوں اور محاضرات میں اسلامی تہذیب وتاریخ کی وکالت کرتے رہے، پورے فرانس میں اسلام کا تعارف جس بلند معیار سے انہوں نے کرایا اس کے نتیجے میں ہزاروں فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا، ان تمام خالص دینی ومذہبی سرگرمیوں کے باوجود پورے فرانس کی یونیورسٹیوں اور ممتاز ترین کالجوں میں برابر لکچر دینے کے لئے بحیثیت مہمان پروفیسر کے بلائے جاتے رہے، ان کے اخلاص کا عالم یہ تھا کہ یورپ کے ممتاز ترین اسکالروں اور اہل علم وتحقیق کی مجلسوں، مذاکروں اور سیمناروں میں ایک معزز ومحترم رکن کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے اور دوسرے اوقات میں وہ مسجدوں میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم بھی دیتے تھے ان کو اس کام

میں کوئی حجاب نہیں ہوتا تھا۔

آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و تحقیق، مطالعہ اور افادہ و استفادہ میں گذرتا تھا، عظمت و شہرت کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گذارتے تھے، تواضع اور انکسار آپ کی فطرت اور آپ کا مزاج تھا، تعلّیٰ وخودنمائی ان کو چھو کر نہیں گئی تھی، لیکن اسلام کی طرف سے جب مدافعت کا مرحلہ آتا تھا تو آپ کا سر سب سے بلند نظر آتا تھا فرانس میں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنا، علم وتحقیق کے نام پر اسلام کے دامن پر دھبہ ڈالنے کی کوششوں کو برداشت کرنا آپ کے مزاج کے خلاف تھا وہ فوراً سامنے آتے اور اپنی قوت استدلال سے بھرپور کام لیتے اور اس دھبہ کو مٹا کر مطمئن نہیں ہوجاتے تھے بلکہ اسلام کے حقیقی چہرے کو اور روشن وتابناک بنا کر پیش کردیتے تھے، اسلام پر اعتراض کرنے والے سینکڑوں تھے جن میں عام طور پر شرقیات کے پروفیسر السنہ شرقیہ کے شعبے کے صدر، بڑے قومی اخباروں اور مشہور رسالوں کے مدیر علم وتحقیق کے ممتاز ونمایاں افراد تھے ان کی ہمالیاتی شخصیتوں کی پورے فرانس میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، ان میں سے ہر ایک کے وار کو روکنا اور پلٹ کر وار کرنا صرف ڈاکٹر حمید اللہ جیسا محقق عالم ہی کرسکتا تھا اور انہوں نے کر کے دکھادیا۔

انکی تصنیفات اور تحقیق وتعلیق سے آراستہ کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۶۵ ہے، بلااستثناء انکی ہر کتاب علم وتحقیق کا شاہکار، ذہن وفکر کے سامنے نیا افق روشن کرتی ہے۔

آپ نے فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، وہ ترجمہ فرانس میں اتنا مقبول ہوا کہ ان کی زندگی میں اس کے بیس سے زائد ایڈیشن طبع ہوچکے تھے پورے فرانس میں اسلامیات کا مطالعہ کرنے والے مستشرقین اسی ترجمہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے۔

حکومت سعودیہ مدینہ منورہ میں جو قرآن کمپلیکس قائم کر کے دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں قرآن پاک کے تراجم شائع کررہی ہے، فرانسیسی زبان میں جب ترجمہ قرآن کی تلاش ہوئی تو یہی ڈاکٹر حمید اللہ کا ترجمہ ہوچکا ہے اور شائع ہوچکا ہے۔

آپ کی چوتھی کتاب شائع ہوئی ہے وہ درحقیقت آپ کے اہم ترین تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے، یہ سارے مقالے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی سے متعلق ہیں، یہ کتاب بھی فرانسیسی زبان میں ہے، پیرس میں پہلی بار ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

پانچویں کتاب ''ہم روزہ کیوں رکھتے ہیں؟'' کے نام سے فرانسیسی زبان میں ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع کیا گیا ہے، انہوں نے اپنی ایک کتاب میں یہ جائزہ لیا ہے کہ اب تک دنیا کی کتنی زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ ہو چکا ہے اور کب شائع ہوا ہے اور اس کے کتنے ایڈیشن نکلے ہیں یہ کتاب انہوں نے عربی میں لکھی ہے اور استانبول (ترکی) سے شائع ہوئی ہے۔

ایک مستشرق بوسکائی نے صحیح بخاری کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اس نے ترجمہ میں بہت سی غلطیاں کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ کی ہیں، اس کی غلطیوں کی تصحیح کے سلسلہ میں انہوں نے مستقل ایک کتاب لکھ دی ہے جو فرانسیسی زبان میں ہے اور پیرس (فرانس) سے شائع ہوئی ہے۔

ایک معرکۃ الآرا کتاب ''الوثائق السیاسیۃ'' کے نام سے عربی زبان میں لکھی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں جو عہد نامے ہوئے ہیں ان کی تفصیلات ہیں اور ان کی دفعات کی تحقیق وتشریح ہے، چونکہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کا خاص موضوع ہے اور اسی پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے اس لئے یہ کتاب ان کی علمی تحقیق کا شاہکار ہے یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کو قدیم مخطوطات سے خصوصی دلچسپی ہے ان کی پرکھ اور جانچ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، اسی ذہن ومزاج کی وجہ سے آپ نے قدیم علماء اسلام کی کتابوں کے جو مخطوطے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے ان کو تلاش کر کے ان کی تصحیح کی اور تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے ان کتابوں میں ابن تیمیہ کی کتاب الانواء ہے جو حیدرآباد سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

علامہ بلاذری کی مشہور کتاب **انساب الاشراف** جو نا پید تھی اس کا مخطوطہ حاصل کر کے تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے بعد مصر سے ۱۹۵۹ء کو شائع کرایا، قاضی رشید ابن الزبیر کی مشہور کتاب **"الذخائر والتحف"** کو ایڈٹ کیا ہے، یہ کتاب کویت سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی، ابن القیم کی کتاب حقوق الدول فی الاسلام فی احکام اہل الذمۃ کی تحقیق کی اور تعلیق وتحشیہ کے بعد یہ کتاب دمشق سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی، ابوحنیفہ الدینوری کی کتاب النبات کی تحقیق کی اور ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، قدیم ترین اسلامی مورخ ابن اسحاق کی کتاب **المبدأ والمبعث والمغازی** پر تعلیقات وحواشی لکھے اور اس کی تصحیح کی، یہ کتاب رباط سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، واقدی کی فتوح الشام اور کتاب الردۃ کو ایڈٹ کیا یہ کتاب پیرس اور بیروت دونوں مقامات سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب **السیر الکبیر** کو بھی اپنی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کر کے حیدرآباد سے ۱۹۸۹ء میں شائع کرایا۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ یعنی اردو میں شائع ہونے والی الاسلامی انسائیکلوپیڈیا میں ۲۲ مادوں (عنوانوں) سے آپ کے علمی وتحقیقاتی مقالے شامل ہوئے شاید پوری انسائکلوپیڈیا میں تنہا کسی ایک محقق عالم کے اتنے مقالے شامل نہیں ہوئے ہوں گے ان کی ۱۶۵ کتابوں میں یہ چند کتابیں ان کے علمی مقام اور تحقیقی ذہن ومزاج کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں، ان کی تصانیف نے ڈاکٹر حمید اللہ کو عالمی شہرت کا مالک بنادیا اور دنیا کے چند نامور اور ممتاز اہل علم وتحقیق میں آپ کا شمار کرادیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا مستقل قیام تو پیرس (فرانس) میں تھا ایک بڑے ادارہ سے وابستہ تھے لیکن سال میں تین مہینے آپ ترکی میں گذارتے تھے اور جس طرح فرانس کے بڑے اداروں، یونیورسٹیوں، ثقافتی مرکزوں اور ممتاز کالجوں میں لکچر کے لئے بلائے جاتے اسی طرح ہر سال تین مہینے وہ ترکی کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور ثقافتی مرکزوں میں بھی آپ کے لکچر ہوتے تھے۔

چونکہ آپ کو علماء سلف کے قدیم مخطوطات سے خصوصی دلچسپی تھی اور مطالعہ بہت

وسیع تھا اور ترکی میں یہ خزانہ افراط کے ساتھ موجود ہے اس لئے آپ کا زیادہ وقت انہیں لائبریریوں میں گذرتا تھا، بہت سے مخطوطات کے بارے میں لائبریری کے ذمہ داروں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ کون سی کتاب کا مخطوطہ ہے، لائبریرین نے قیاس سے کسی کتاب کا نام لکھ دیا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ نے بڑی باریک بینی سے ان مخطوطات کا مطالعہ کر کے ایک قطعی رائے دی کہ یہ فلاں کتاب کا مخطوطہ ہے ''کتاب السنن'' سعید بن منصور کے مخطوطہ کی بھی یہی سرگذشت ہے اس مخطوطہ پر غلط نام پڑا ہوا تھا، کوپریلی (ترکی) کے کتب خانے میں یہ مخطوطہ تھا جب آپ نے قطعی طور پر معلوم کرلیا کہ یہ سعید بن منصور کی کتاب السنن ہے تو اس کی نقل آپ نے مجلس علمی ڈابھیل کو بھجوائی جس کو استاد محترم محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ نے تحقیق اور تحشیہ کے بعد شائع کیا، اس کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر حمید اللہ کا ۱۸ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں آپ نے اس کتاب کی بازیافت کی پوری داستان بھی لکھ دی ہے۔

مخطوطہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ اور محدث اعظمیؒ کے درمیان نونک جھونک ہوگئی تھی، دونوں اہل علم تھے وسیع المطالعہ تھے دونوں اپنے اپنے موقف پر اڑے رہے دونوں طرف سے رسالوں میں مضامین لکھے گئے تھے، یہ قصہ امام عبدالرزاق کی مشہور کتاب المصنف کے سلسلہ میں ہوا، جسے محدث اعظمیؒ نے اپنی تحقیق وتعلیق کے بعد گیارہ جلدوں میں شائع کیا تھا، اس کتاب کے آخر میں ایک عنوان کتاب الجامع ہے جس کو المصنف کا جزء نہیں بلکہ ان کے استاد حضرت معمر کی کتاب الجامع ہے المصنف سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس کو المصنف کا جزء بنانا صحیح نہیں ہے محدث اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل دیئے ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے استانبول کی لائبریری میں معمر کی کتاب الجامع جزء بنانا صحیح نہیں ہے محدث اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل دیئے ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے استانبول کی لائبریری میں معمر کی کتاب الجامع کا مخطوطہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور پڑھا ہے یہ وہی کتاب ہے جو تھوڑی کمی بیشی کے ساتھ المصنف میں

شائع کر دی گئی ہے، دونوں طرف سے دو دو مضامین رسالوں میں لکھے گئے، بعد میں ڈاکٹر صاحب نے کسی مصلحت سے خاموشی اختیار کر لی اس کی تفصیل میں نے ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر "کتاب الجامع کا قضیہ" کے عنوان میں دے دی ہے، یہ بحث وہیں دیکھی جا سکتی ہے، ڈاکٹر حمید اللہ قدیم مخطوطات کی تلاش میں پوری دنیا کی سیاحت کرتے رہتے تھے، ترکی کے علاوہ مصر، بغداد، دمشق اور دوسرے اسلامی ملکوں کے علاوہ یورپ کی بڑی لائبریوں میں ان کی تلاش وجستجو برابر جاری رہتی تھی۔

ان تمام عظمت وشہرت، عزت واحترام اور بلند علمی مقام کے باوجود آپ میں نمود ونمائش کا شائبہ تک نہیں تھا، اخلاص ان کی زندگی کا ایک بے بہا جوہر تھا جس کی آب تاب کبھی ماند نہیں پڑتی تھی، ان کی ساری علمی وتحقیقی جدوجہد کا مقصد وحید دین کی خدمت اسلام کی سرخ روئی وسربلندی تھا وہ اپنی تمام توانائیوں اور علمی صلاحیتوں کو دین کی راہ میں انتہائی اخلاص کے ساتھ صرف کرتے تھے، ان کا اخلاص کھرا سونا تھا جس میں کھوٹ کا کہیں امکان بھی نہیں تھا، جب کوئی ایسا موقعہ آیا جہاں ان کی شخصیت پر نمود ونمائش اور شہرت کا سایہ پڑنے کا احتمال ہوا وہ اس موقعہ سے کتراجاتے تھے، ۱۹۹۴ء میں سعودی حکومت کی جانب سے ملک فیصل عالمی ایوارڈ کے لئے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب پیش نظر ہوا جو عالمی پیمانے پر اسلام کی خدمت میں مصروف ہو تو مجلس انتخاب کی نگاہ ڈاکٹر حمید اللہ پر پڑی اور ان کو اس ایوارڈ کے قبول کرنے کی پیشکش کی گئی، یہ ایوارڈ عالمی شہرت واعزاز کے علاوہ ایک بہت بڑی رقم پر مشتمل تھا، جب ڈاکٹر حمید اللہ سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور کہا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ توشہ آخرت سمجھ کر کر رہا ہوں اس کے مقابلہ میں عزت وشہرت کی میری نگاہ میں نہ کوئی وقعت ہے اور نہ بڑی سے بڑی رقم کی کوئی قدر وقیمت اس لئے میں اس ایوارڈ کو قبول کرنے سے معذور ہوں یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ کی عمر ۸۶ برس کی ہو چکی تھی، جو معذوریوں کا دور ہوتا ہے، لیکن آپ کی قوت کارکردگی میں کوئی اضمحلال نہیں آیا تھا ان کا علمی وتحقیقی سلسلہ برابر

جاری رہا۔

جب ان کے بارے میں یہ سنا جاتا ہے کہ اس عمر میں بھی وہ اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں، اپنے کپڑے خود صاف کرتے ہیں، بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے، یہ آپ کی کوئی مجبوری نہیں تھی، نوکر گھر میں موجود تھا آپ کا پورا خاندان آپ کے ساتھ رہتا تھا وہ لوگ ان کاموں کو انجام دینے کی خواہش بھی رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنا بار کبھی دوسروں پر نہیں ڈالا یہ آپ کی سادگی اور بے لوثی، اور اپنی قوت کارکردگی کو بحال رکھنے کا ذریعہ تھا، آپ نے اپنا یہ اصول زندگی کبھی نہیں بدلا، یہی معمول نوے سال کی عمر تک رہا یہاں تک کہ آپ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، اس قوت کارکردگی کا راز ان کے باطن میں پوشیدہ تھا وہ راز یہ تھا کہ ان کو اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان کامل اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عزم راسخ اور اسی کے تقاضوں کے مطابق صلاح وتقویٰ اور پاکیزہ زندگی میں ان کی ساری توانائیوں کا راز پوشیدہ تھا یہی ان کی قوت کارکردگی کا سرچشمہ تھا۔

ظاہری اسباب میں ان کا یہ طرز زندگی ایک سن رسیدہ عالم کی صحت کے بارے میں ان کے مشاہدہ کے نتیجہ میں تھا، وہ اپنے عہد شباب میں قاہرہ گئے اور جامعہ ازہر کے ایک ممتاز اور بڑے عالم سے ان کی ملاقات ہوئی جن کی عمر ایک سو سال کے حدود میں تھی اس کے باوجود وہ بلا تکلف چلتے پھرتے اور دوڑ دھوپ کرتے کہیں سے ان کی ذات پر درازئ عمر کے اثرات نظر نہیں آتے تھے ڈاکٹر حمید اللہ نے ان سے ان کی صحت کا راز پوچھا تو انہوں نے ایک خوبصورت جملہ میں مختصر بات بتائی۔

**لنا اعضاء حفظناها فی الصغر فحفظها اللّٰہ لنا فی الکبر**

ہم نے نوجوانی میں اپنے اعضاء کی حفاظت کی اور ہر طرح کی آلودگیوں سے بچا کر رکھا جس کے صلہ میں خداوند قدوس نے بڑھاپے میں ہمارے اعضاء کو قوت کارکردگی سے محروم نہیں کیا۔

بس وہی تقویٰ وطہارت اور پاکیزہ زندگی ڈاکٹر حمید اللہ نے اختیار کر لی کہ پیرس

جیسے فیشن ایبل اور عریانیت، حسن وجمال کی نمود ونمائش کے طوفانی شہر میں بھی انہوں نے اپنے دامن تقدس وطہارت پر دھبہ نہیں پڑنے دیا اور صلاح وتقویٰ کی زندگی پر ان کا ایمان اور راسخ اور کامل ہوگیا، ان کی صحت، ان کی قوت کارکردگی کی بحالی کا بہ ظاہر یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی غذا بہت سادہ رکھی، کھانے کے تنوع میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، تیس سال سے گوشت کھانا ترک کردیا تھا دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیاء، انڈے اور پھل ان کی عام غذا تھی اور اس کی تیاری میں بھی ان کے لئے کوئی زحمت نہیں تھی، اسی قوت کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ پورے نوے سال کی عمر تک علم وتحقیق کے سلسلہ میں پوری سرگرمی سے کام کیا اور کبھی تکان کا احساس نہیں پیدا ہوا، ڈاکٹر حمیداللہ ۱۹۳۰ء میں بغرض تعلیم پیرس گئے اور ہر طرح کی دلچسپیوں سے یکسو اور محترز رہ کر صرف تعلیم حاصل کرتے رہے اور پوری مدت تعلیم میں انتہائی پاکیزہ زندگی گذاری وہیں سے انہوں نے ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں، اپنا موضوع بھی خالص اسلامی رکھا اور ہمیشہ دینی جذبات سے سرشار رہے معلوم نہیں نوے سال کی عمر تک قوت کارگردگی میں عامل یہی عناصر تھے یا کچھ اور یا یہ صرف خدا داد بات تھی، اس کا فیصلہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

ڈاکٹر حمیداللہ کا سیرت رسول کا مطالعہ اتنا وسیع اتنا گہرا اور باریک بینی ودقیقہ رسی کے ساتھ تھا کہ ادھر کئی صدیوں میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی سیرت کے موضوع پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور برابر لکھی جارہی ہیں، اور بہت ہی تحقیق اور وسیع مطالعہ کے بعد لکھی جارہی ہیں لیکن ڈاکٹر حمیداللہ کی وسعت نظر ان سے بھی کچھ اور آگے تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دور کے تمام مشاہیر اہل علم وتحقیق اور مستشرقین کا تنہا جواب دیا جن کا یورپ ہی نہیں پوری علمی دنیا میں طوطی بول رہا تھا، میں اس سلسلہ میں صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ڈاکٹر حمیداللہ کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔

تاریخ اسلام کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ھ میں عرب کے اندر اور عرب کے باہر کے بادشاہوں، گورنروں حکومت کے نمائندوں قبائل کے سرداروں، عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں کو دعوتی خطوط لکھے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی ڈاکٹر حمید اللہ نے ان خطوط کے سلسلہ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ تاریخوں میں سوا دو سو خطوط کا ذکر ہے۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے عرب کے باہر دعوت اسلام نہیں دی دعوتی خطوط مسلمان مؤرخوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، تو آپ کے پاس کیا دلیل ہوگی کہ آپ ثابت کرسکیں کہ حضور نے یہ خطوط لکھے تھے، آپ بخاری و مسلم یا صحاح ستہ کا حوالہ دے کر اس کو خاموش نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ ان کو مانتا ہی نہیں، مستشرقین کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ محمد رسول اللہ صرف عرب کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ عرب کے باہر کی اصلاح کیسے ہو، اور ان کو اسلام کی دعوت کیسے دی جائے وہ کہتے ہیں کہ جب کچھ عیسائی مسلمان ہوگئے تو انہوں نے بتایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں دین کی دعوت کے لئے بھیجا تھا، یہ سن کر محمد عربی کو بھی یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ میں بھی باہر کے ملکوں کو دعوت اسلام دوں لیکن یہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا اس لئے عرب کے باہر کہیں بھی ان کی آواز سنائی نہیں دی اس لئے دعوتی خطوط کا افسانہ بعد کے مسلمان مورخوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے تا کہ اپنے نبی کا درجہ وہ اونچا کرسکیں۔

اگر ایک بھی اصل خط دریافت ہو جائے اور قطعی دلائل سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وہی خط ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے باہر کسی سربراہ کو بھیجا تھا تو مستشرقین کا بنایا ہوا یہ ہوائی قلعہ ہواؤں میں اڑ جائے گا، اتفاق سے ایک ایسا موقعہ آ گیا اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معرکہ کو سر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط ایک فرانسیسی مستشرق موسیو بارتل می نے دریافت کیا وہ ۱۸۵۱ء میں مصر میں قبطی زبان کی تحقیق کے سلسلہ میں کام کررہا تھا وہ قدیم قبطی مخطوطات کی تلاش میں مصر کے ایک علاقہ اخمیم کے قدیم گرجا گھر میں پہنچا

اس کو بہت محفوظ حالت میں لپٹی ہوئی ایک دستاویز پیش کی گئی اس نے اس کو قبطی زبان کا کوئی مخطوطہ سمجھا مگر اس کو پڑھ نہ سکا تو اس نے ایک دوست موسیو بے لین سے پڑھنے کی درخواست کی اس نے بڑی مشکلوں سے اس کو پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ قبطی زبان کا نہیں عربی زبان کا مخطوطہ مکتوب نبوی ہے جو اس گرجا کے بڑے پادری مقوقس کے نام بھیجا گیا تھا، یہ خط ایک جھلی پر تھا، موسیو بارتیل می نے اس خط کو ترکی خلیفہ سلطان عبدالمجید خان کے ہاتھ تین سو اشرفیوں میں فروخت کر دیا پھر وہ خط تبرکات نبوی کے طور پر خزانہ شاہی میں محفوظ کر دیا گیا، اس کا چربہ لے کر اس زمانہ میں اخباروں میں شائع کر دیا گیا تھا، پچاس پچپن برس بعد جرجی زیدان نے ۱۹۰۴ء میں اس کا چربہ لے کر اپنے رسالہ الہلال میں شائع کیا تھا، یہ خط اخمیم گرجا گھر کے بڑے پادری مقوقس کے نام تھا جس کا اسلامی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، اس دور کے مستشرقین نے اس خط کو جعلی ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کیا تھا۔

پھر اتفاق سے ۱۹۳۸ء میں وہ خط بھی دریافت کر لیا گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو بھیجا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ کو اس خط کے ملنے کی اطلاع آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگلیوث نے دی ڈاکٹر حمید اللہ نے اس خط کو دیکھا اور ماہرین سے اس کے بارے میں رائیں معلوم کیں، حسب روایت اس دور کے مستشرقین نے اس خط کو جعلی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور ہر ایک نے اپنے اپنے دلائل دیئے، فرانس، کے رسالوں اور اخباروں میں بہت دنوں تک یہ بحث چلتی رہی، ڈاکٹر حمید اللہ ان مضامین کو پڑھتے رہے، اور ان نامور مستشرقین کے مبلغ علم کا اندازہ کرتے رہے۔

۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک مقوقس، منذر بن ساویٰ گورنر بحرین، اور نجاشی شاہ حبشہ کے نام بھیجے گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں دعوتی خطوط کی اصل دریافت ہوگئی، یہ بڑا دھماکہ خیز انکشاف تھا، تمام مستشرقین، یورپین یونیورسٹیوں کے السنہ شرقیہ شعبے کے صدور، برٹش میوزیم کے ماہرین نے مکتوب نبوی کے جعلی ہونے

کے سلسلہ میں دلائل کا انبار لگادیا، ان تینوں دریافت شدہ خطوط کے سلسلہ میں جن مستشرقین نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی رائیں دیں ہرایک نے بلا استثناء ان خطوط کو جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی اوراس کو مسلم حکومتوں سے رقم حاصل کرنے کا ڈھکوسلہ قرار دیا اس طرح یہ بحث ۱۸۵۱ء سے شروع ہوکر ۱۹۴۴ء تک چلتی رہی، جن مستشرقین نے اس بحث میں حصہ لیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) یہودی النسل مستشرقہ درجینیاوا کا (اٹلی)

(۲) جرمن مستشرق پروفیسر ڈاکٹر بیکر متوفی ۱۹۳۳ء۔

(۳) یہودی النسل مستشرق موسیو وائٹ پروفیسر السنہ شرقیہ پیرس یونیورسٹی (فرانس)

(۴) یہودی النسل جرمن مستشرق پروفیسر نویلدیکی۔

(۵) مشہور مصنف مستشرق کائتانی متوفی ۱۹۳۵ء

(۶) موسیو بارٹیل می فرانسیسی مستشرق مقیم مصر۔

(۷) فرانسیسی مستشرق موسیو رینے نو (پیرس) ایک فرنچ رسالہ کا ایڈیٹر موسیو بے لین (فرانس)

(۹) فروفیسر ما گولیوث آکسفورڈ یونیورسٹی۔

(۱۰) ڈاکٹر پادل کا صدر شعبہ مشرقیات۔ (جرمنی)

(۱۱) مسٹر فلائشر ایک فرنچ رسالہ کا ایڈیٹر۔

(۱۲) پروفیسر بروک ماؤسن۔

(۱۳) مسٹر پول مصنف ''سیرۃ محمدیہ'' (سویڈن)

(۱۴) مسٹر ڈفلاپ (اسکاٹ لینڈ)

مذکورہ بالا مستشرقین نے اخباروں اوررسالوں میں مضامین شائع کئے اور خط کو جعلی ہونے کے بارے میں اپنی قطعی رائے کا اظہار کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے جو دلائل دیئے ان کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے۔

۱-پیغمبر اسلام نے عرب کے باہر دعوتی خطوط بھیجے ہی نہیں آپ خود کو عالمگیری نبی نہیں سمجھتے تھے جب کچھ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے کا ذکر کیا تو مسلمانوں نے اپنے نبی کے بارے میں یہ قصہ گھڑ لیا کہ آپ نے شاہان عالم کو دعوتی خطوط ارسال فرمائے تھے۔

۲- برٹش میوزیم کے ماہرین نے اس جھلی کو جس پر خط لکھا ہوا تھا تیرہ سو سال پرانی ہونے سے انکار کر دیا ہے، یہ بعد کے کسی زمانے میں جعلی خط بنایا گیا ہے۔

۳-سیرۃ ابن ہشام میں جہاں مکتوبات نبوی بھیجے جانے کا ذکر ہے وہاں ابتداء میں ابن اسحاق کا نام نہیں ہے جب کہ سیرۃ ابن ہشام ابن اسحاق کی کتاب کی تہذیب ہے ابن اسحاق کی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے اس لئے معلوم ہوا کہ یہ روایت ابن ہشام کے زمانے کی گھڑی ہوئی ہے۔

۴-قرآن کے جو قدیم نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں ان سے اس مکتوب کا خط کافی مختلف ہے۔

۵-آج کل جعلی چیزیں پرانی کہہ کر بیچی جارہی ہیں مگر وہ حقیقتاً جعلی ہوتی ہیں یہی حال اس خط کا بھی ہے جعلساز نے مالی منفعت کے لئے یہ ہوا اڑادی ہے۔

۶-اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ہے اس میں اور اس جھلی والے خط کی عبارت میں خاصا فرق ہے۔

یہ اعتراضات نجاشی کے نام ۱۹۳۸ء میں پائے جانے والے مکتوب نبوی کے سلسلہ میں ہیں، احادیث میں ہرقل کے نام دعوتی مکتوب ارسال فرمانے کا ذکر مفصل ہے مسلمان مورخین نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے مستشرقین اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ بالکل بے بنیاد دعویٰ ہے مختصر طور پر مستشرقین کے دلائل اور خاص طور پر مسٹر کائتانی کے درج ذیل اعتراضات ہیں۔

۱- مسلمان مورخین کا بیان ہے کہ پیغمبر اسلام نے دعوتی خطوط ۶ ھ کے بالکل آخر میں بھیجے ہیں، پھر وہی مورخین لکھتے ہیں کہ خط لے جانے والے دحیہ کلبیؓ پر

واپسی میں جوڈا کہ پڑا تھا وہ وسط ۶ھ کا واقعہ ہے، سال کے آخر میں روانگی اور وسط سال میں واپسی ایک مضحکہ خیز مغالطہ ہے، سچی بات یہ ہے کہ دحیہ کلبی خط لے کر گئے ہی نہیں تھے، یہ سب افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

۲- مسلم مورخین دحیہ کلبی کے شام ہرقل کے پاس خط لے جانے کا بھی ذکر کرتے ہیں اوران کوخیبر کی مہم میں شریک بھی بتاتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے اس سفر میں کم سے کم دو ماہ کی ضرورت ہے، کیوں کہ ذی الحجہ میں ان کا سفر بتاتے ہیں اور محرم میں خیبر کی مہم پیش آئی ہے اتنی کم مدت میں ہرقل کے پاس بیت المقدس جانا اور واپس آنا ممکن ہی نہیں تھا۔

۳- مسلمان مؤرخین کہتے ہیں کہ دحیہ کلبی نے بیت المقدس میں قیصر سے ملاقات کی جب کہ ایرانیوں سے صلیب کی واپسی پر جوجشن منایا جارہا تھا اس میں شرکت کے لئے آیا تھا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس میں قیصر کی آمد ۶۲۹ء یعنی ۷ھ کے آخر میں ہوئی اس لئے پورا واقعہ ہی غلط ہے۔

۴- سیرۃ ابن ہشام درحقیقت ابن اسحاق کی کتاب کی جدید ترتیب وتہذیب ہے ابن ہشام کی خود تصنیف نہیں اور ابن اسحاق کی اصل کتاب میں سفارتوں اور خطوط لیجانے والوں کا ذکر نہیں ہے، شاید اسی وجہ سے ابن ہشام نے روایت کی ابتداء میں ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے، سفارت کا واقعہ ابن ہشام نے گھڑ لیا ہے۔

۵- پانچواں اعتراض یہ ہے کہ سفیروں کی روانگی ایک اہم ترین واقعہ ہے، اتنے اہم واقعہ کا ذکر عربی تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں صرف ایک ابن عباس سے منقول ہے دیگر صحابہ کے بیانات بالکل مفقود ہیں۔

یہ وہ اشکالات ہیں جن کی بنیاد پر مستشرقین ان کے نام خط بھیجنے کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بعد کے دور میں مسلمان مورخین نے ان سفارتوں اور دعوتی خطوط کا افسانہ لکھ کر تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں شامل کر دیا ہے، واقعاتی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

یہ داستان شروع ہوتی ہے ۱۸۵۱ء سے جب دو خطوط مقوقس اور منذر بن ساریٰ کے نام کے دریافت ہوئے اس دور کے مستشرقین نے ان کو جعلی ثابت کرنے پر اپنی صلاحیتیں لگا دیں، تیسرا خط نجاشی کے نام تھا وہ بیسویں صدی یعنی ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ مکتوبات نبوی پر ایک ساتھ گفتگو اور بحث کا آغاز ہوا اور یورپ کی تمام بڑی یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو مشرقی علوم کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے بالخصوص جو یہودی النسل تھے انہوں نے اس بحث میں بڑے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا، انگریزی اور فرنچ زبانوں کے اخبارات ورسائل میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے، جہاں جہاں ڈاکٹر حمید اللہ اپنے موضوع پر لکچر دینے کے لئے گئے وہاں وہاں یہ مسئلہ چھیڑا گیا، دنیائے اسلام ان تمام مباحث سے ایک دم بے خبر رہی، تنہا ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے وسعت مطالعہ کی بنیاد پر مستشرقین کے سارے اعتراضات اور شکوک وشبہات کو اتنے مضبوط دلائل وشواہد سے رد کیا کہ بعد میں کئی ممتاز مستشرقین نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات سے اتفاق کیا، جوابات تو اصل کتاب ہی میں دیکھنے سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا یہاں تو صرف اس کی ایک معمولی سی جھلک ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات علمی اور تاریخی اعتبار سے بظاہر وزن دار نظر آتے ہیں اس لئے ان کے شکوک وشبہات میں اتنا وزن تو ضرور تھا کہ جن لوگوں کا اسلامیات کا مطالعہ ناقص ہے وہ آسانی سے گمراہ ہوسکتے ہیں اور مستشرقین کی ہم نوائی کرسکتے ہیں مگر ڈاکٹر حمید اللہ نے ثابت کردیا کہ یہ سب فریب نظر ہے، مغالطہ ہے، اور اسلامیات کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے ان سارے اعتراضات کے تحقیقی جوابات دیئے اعتراضات کی ترتیب سے جوابات کے خلاصے میں آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں تفصیل تو اصل کتاب ہی میں دی جاسکتی ہے۔

۱- یہ غلط ہے کہ پیغمبر اسلام اپنے کو صرف عرب کا نبی سمجھتے تھے، قرآن میں تو متعدد مقامات پر آپ کو سارے عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے جانے کا غیر مبہم لفظوں میں

ذکر ہے عیسائیوں کے قبول اسلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجے جانے کا ذکر بے محل اور فضول ہے عیسیٰ علیہ السلام نے تو خود کہا ہے کہ میں صرف بنی اسرائیل کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں کہیں فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں حواریوں کو دوسرے ملکوں میں تبلیغ کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کا بھیجنا یہ عیسائیوں کے توہمات اور خرافات ہیں ان توہمات وخرافات سے پیغمبر اسلام پر اعتراضات لغو ہیں۔

دفتر شکوۂ غم پھینک دو رستے میں کہیں
ان کی محفل میں کہاں لے کے خرافات چلے

۲- برٹش میوزیم کے ماہرین نے خط کی جھلی کو تیرہ سو سال پرانی ماننے سے انکار کیا ہے انہوں نے عہد رسالت میں جو جھلی استعمال ہوتی تھی اس کو کب اور کہاں دیکھا کہ اس جھلی کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ یہ عہد رسالت کی جھلی نہیں معلوم ہوتی، دوسرے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو یہی جھلی دکھائی جائے تو وہ اس کے برعکس رائے دیں گے، یہ ماہرین صرف قیاس آرائی کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، ایک چیز کو ایک ماہر سو برس کی کہے گا تو دوسرا ماہر فن اس کو ایک ہزار برس کی بتا دے گا، ماہرین کے آپس کے اختلافات ہر شخص جانتا ہے جس کو علم آثارِ قدیمہ سے ادنیٰ سا بھی مس ہو، یہ ایک فضول سی دلیل ہے۔

۳- ابن ہشام نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اگر ابتدا میں ابن اسحاق کا نام نہیں لکھا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے درمیان میں کئی بار ابن اسحاق کا نام آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ ابن اسحاق ہی کا قول ہے اور جن خطوط کا ابن ہشام نے اپنے طور سے اضافہ کیا ہے انہوں نے خود اس کی صراحت کر دی ہے کہ فلاں فلاں مکتوبات میرا اضافہ ہے اس لئے یہ اعتراض تاریخ کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۴- اگر مکتوب نبوی کا خط قرآن کے خط سے جداگانہ ہے تو اس پر حرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن کا خط اہتمام سے

آرائش کے ساتھ لکھا جاتا ہے خط کی حیثیت سرکاری مراسلات کی ہوتی ہے اس کا خط ہمیشہ جداگانہ ہوتا ہے، آپ نے عہد نبوی کا قرآن لکھا ہوا دیکھا کہاں؟ بعد کے دور کے لکھے ہوئے قرآن کے خط سے تقابل نادانی ہے، تقابل عہد رسالت کی تحریر سے کیا جانا چاہئے تھا۔

یہ دلیل بھی بچکانہ ہے اگر جعلسازی کا بازار گرم ہے تو بلا سوچے سمجھے ہر چیز کو جعلی قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہے، ہوسکتا ہے کہ جعلی نہ ہو، خود اس شے کو دیکھ کر اور پرکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، دریافت شدہ خط کو سامنے رکھ کر غائر مطالعہ کے بعد دلائل کی روشنی میں فیصلہ کیا جاتا تو قابل توجہ ہوتا یہ تو احمقوں کی بات ہے کہ دودھ سے جل چکے ہوں تو چھاچھ بھی پھونک کر پینا شروع کردیں۔

۶- یہ اعتراض یقیناً قابل توجہ ہے کہ جھلی والے خط میں جو عبارت ہے وہ اسلامی تاریخوں سے بہت کچھ مختلف ہے نجاشی والے خط میں یہ عبارت ہے کہ میں تمہارے پاس اپنے چچا زاد بھائی اور چند مسلمانوں کو بھیج رہا ہوں وہ تمہارے پاس جائیں تو ان سے حسن سلوک کرنا، یہ عبارت بتاتی ہے کہ دعوتی خطوط سے ۱۴ برس پہلے ۵ نبوی میں لکھا گیا اور مدینہ کے بجائے مکہ سے لکھا گیا ہے جب کہ تمام مورخین متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ دعوتی خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ھ کے آخر میں یعنی ۱۴ سال بعد لکھے گئے ہیں۔

یہ طبری کی روایت ہے جس میں نجاشی کے نام والے خط میں یہ عبارت ہے لیکن سیرۃ حلبیہ میں جو خط کا متن ہے اس میں یہ جملہ نہیں ہے، اسی طرح ابن الاثیر نے جو متن دیا ہے اس میں بھی یہ عبارت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ طبری کی متن میں دو الگ الگ خطوں کی عبارت کو ایک خط کی شکل میں نقل کردیا گیا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ دو خطوط ہیں، بعد والا خط یقیناً تبلیغی خط تھا جو ۶ ھ میں لکھا گیا اور ٹھیک وہی متن ہے جو اس دریافت شدہ جھلی والے خط کا متن ہے، یہ دریافت شدہ خط ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل مکتوب نبوی ہے اس میں کوئی جعل اور فریب نہیں ہے کیونکہ اگر

جعلسازی ہوتی تو تاریخ سے وہی عبارت نقل کی جاتی جس میں مسلمانوں کے حبشہ جانے کا ذکر ہے اور جب یہ ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ٦ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو جو خطوط بھیجے تھے انہیں میں یہ نجاشی کا اصلی خط ہے جو اس وقت دریافت ہوا ہے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دینے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ نے اس خط کے مکتوب نبوی ہونے کے جو قرائن پائے جاتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے آپ نے تحریر کیا کہ اس خط کے اصل ہونے میں جن باتوں سے مدد ملتی ہے ہمارے دوستوں نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے جب کہ سب سے زیادہ توجہ کی یہی باتیں مستحق تھیں مثلاً ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ نجاشی کے نام والے خط میں ٹھیک وہی مہر ہے جو سو سال پہلے مقوقس اور منذر بن ساری کے نام دریافت شدہ خطوں میں تھی، دونوں میں ذرا بھی فرق نہیں، اگر جعلسازی ہوتی تو مہر کی یکسانیت ممکن نہ تھی اگر آپ کہیں کہ دونوں خطوط ایک ہی جعلساز کی کارستانی ہے تو ایک صدی کا فاصلہ آپ کے دعویٰ کو خود باطل کر دے گا اور پھر دونوں خطوں کی تحریر میں بھی اختلاف ہے، اور پھر دونوں خطوط کی دستیابی کے مقامات ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

دوسری بات خود جھلی کی تحریر ہے، اس میں نقطے اور اعراب بالکل نہیں ہیں جب کہ پہلی صدی ہجری میں اس کا رواج ہو چکا تھا، عہد رسالت میں اس کا رواج نہیں تھا، اس لئے یہ تحریر خود شہادت دیتی ہے کہ وہ عہد رسالت کی ہے۔

عہد رسالت کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک لفظ کا آدھا حصہ اوپر کی سطر میں اور آدھا حصہ دوسری سطر میں جیسے رسول کا لفظ ہے اوپر کی سطر میں ''رسو'' لکھا اور ''ل'' دوسری سطر میں لکھا گیا، جھلی والے خط میں بالکل اسی کے مطابق تحریر ہے ۱۹۳۱ء میں مصر میں حضرت عثمانؓ کا قرآن دریافت ہوا ہے اس میں بھی تحریر کا یہی انداز ہے، بعد کے دور میں یہ انداز قطعاً ترک کر دیا گیا معلوم ہوا کہ یہ صرف عہد رسالت میں عام طور سے مروج تھا بالکل وہی طریقہ تحریر اس جھلی والے خط میں بھی استعمال کیا گیا، رسم الخط میں بھی عہد رسالت اور اس جھلی والے خط میں پوری مماثلت ہے، جمع کا

الف اس وقت نہیں لکھا جاتا تھا حرف ت کے دو شوشے ہوتے تھے، اس دور کے بعض الفاظ آج بھی قرآن میں اسی رسم الخط کے مطابق ہیں، ان باتوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جعلی والا خط عہد رسالت کا لکھا ہوا ہے عہد رسالت اس کے قریبی زمانے میں میم سطر کے نیچے کے بجائے اوپر لکھا جاتا تھا اور ''لا'' کو ''ع'' کے مشابہ لکھا جاتا تھا، یہی رسم الخط مقوقس، منذر اور نجاشی کے خطوط میں بھی ہے، اس لئے ان تینوں خطوط کو عہد رسالت کا تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور آخری بات یہ ہے کہ خط جس جگہ سے اور جن حالات میں دستیاب ہوا ہے وہ ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہے، کیوں کہ ان کو وہیں ہونا ہی چاہئے تھا۔

اب تک ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ نجاشی کے خط کے اصلی ہونے کے دلائل دیئے گئے، مقوقس اور منذر کے خطوں کا ذکر پہلے آچکا ہے اب صرف ایک خط جو شاہ روم ہرقل کے نام ہے جس کا تاریخ کے علاوہ بخاری وغیرہ میں مفصل ذکر ہے مستشرقین اس خط ہی سے انکار کرتے ہیں، اب اس سلسلہ کے دلائل انتہائی اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے چونکہ مکتوبات نبوی کے سلسلہ میں اتنا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے کہ شاید تاریخ میں کوئی شخص ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، انہوں نے تاریخ کی کتابوں سے سوا دوسو خطوط کا پتہ چلایا ہے جب کہ عام علماء اور مورخین چند خطوط کے ذکر سے آگے نہیں بڑھتے ہیں، اس لئے مستشرقین کا جواب خالص علمی وتحقیقی انداز میں دیتے ہیں اور مسکت جواب دیتے ہیں، مستشرقین کا عام رجحان یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص عرب کا ایک مصلح اور ریفارمر کی حیثیت سے ذکر کریں، ساری دنیا کے لئے ان کو رسول اور پیغمبر ہونے کے دعویٰ کو باطل قرار دیں اسی خیال اور جذبے کی وجہ سے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط بھیجنے کا وہ حتی الامکان انکار کرتے ہیں قیصر روم ہرقل کے نام کے خط کا ذکر اور اس کا متن اسلامی تاریخوں اور حدیثوں میں موجود ہے مگر مستشرقین کہتے ہیں کہ یہ صرف افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں،

ہرقل کے نام نہ کوئی خط بھیجا گیا نہ اس کے پاس پیغمبر اسلام کا کوئی سفیر گیا، میں ان کے شکوک وشبہات اور دلائل کا ذکر اجمالاً کر چکا ہوں اب سلسلہ وار ان کے جوابات ڈاکٹر حمید اللہ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں سارے مستشرقین کے خیالات کی ترجمانی مشہور مصنف کائتانی نے اپنی کتاب میں کی ہے اس لئے اسی کے اعتراضات کے یہ جوابات ہیں۔

۱- کائتانی نے کہا تھا کہ دحیہ کلبی پیغمبر اسلام کا خط لے کر ۶ ھ کے آخر میں جاتے ہیں اور وہاں سے واپسی میں ان پر ڈاکہ پڑنے کو وسط ۶ ھ کا واقعہ بتاتے ہیں دونوں میں تضاد ہے ڈاکٹر حمید اللہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت دحیہ کلبی کے خط لیجانے اور ان پر ڈاکہ پڑنے کا واقعہ جن مورخین کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے ان میں کہیں بھی ڈاکہ کا وقت اور تاریخ نہیں بتائی گئی ہے صرف طبری نے واقدی کی روایت سے ۶ ھ کے وسط کا ذکر کیا ہے، ظاہر ہے کہ واقدی کی روایت حجت نہیں ہوسکتی اور نہ طبری نے اس کو حجت مانا ہے یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر طبری نے پھر دوبارہ اپنے موقعہ پر اس کا ذکر کیا ہے جو ۶ ھ کے بعد کا وقت ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں بعض مورخین کو غلط فہمی ہوئی ہے واقعہ کی تمام جزئیات کا علم ان کو نہیں ہوسکا، اصل واقعہ مستند تاریخوں میں یہ ہے کہ حضرت دحیہ کلبیؓ ۶ ھ کے آخر میں ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۶ میں ہرقل کا خط لے کر چلے جاتے ہوئے تین دن کی مسافت پر قبیلہ خذام کے کچھ لوگوں نے ڈاکہ ڈالا کیوں کہ ان کے ساتھ کچھ مال تجارت بھی تھا، اس قبیلہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے ان کو خبر ملی تو وہ دوڑ کر آئے اور حضرت دحیہؓ کا مال واپس کرایا حضرت دحیہ آگے جانے کے بجائے مدینہ لوٹ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ساری تفصیلات بیان کیں آپ نے قبیلہ خذام کی سرکوبی کے لئے ایک مہم بھیجی، جس نے وہاں جا کر ان کو پوری سزا دی حضرت دحیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیبر کی مہم میں چلے گئے، کیونکہ حضور پابہ رکاب تھے، خیبر کی فتح کے بعد آپ ہرقل کے نام کا خط لے کر دوبارہ سفر پر گئے، اس تفصیل

سے مستشرقین کا وہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ حضرت دحیہ شام گئے اور واپس بھی آ کر خیبر کی جنگ میں شریک ہوئے یہ ناممکن ہے، اس تفصیل نے یہ گرہ بھی کھول دی۔

۲- دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اسلامی سفیر نے بیت المقدس میں قیصر سے ملاقات کی جب وہ صلیب کی واپسی کے جشن میں شرکت کے لئے وہاں آیا ہوا تھا حالانکہ قیصر ۶۲۹ء یعنی ۷ھ کے آخر میں بیت المقدس آیا ہے اس لئے سفیر ۷ھ کی ابتداء میں قیصر سے کیسے مل سکا، ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ قیصر کی بیت المقدس آمد ۶۲۹ء یونانی مورخ تیوقان نے بیان کی ہے مگر دوسرا مورخ نقیفور نے کہا ہے کہ قیصر ۶۲۸ء میں بیت المقدس آیا تھا، اسی کی تائید وہاں کے گرجا گھر کی ایک یادداشت سے بھی ہوتی ہے اور یہ ۷ھ کی ابتداء کا زمانہ ہے، جب حضرت دحیہ شام پہنچے ہیں اس لئے یہ اعتراض لغو ہے۔

۳- یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ ابن ہشام نے ان سفارتوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے جب کہ ابن اسحاق نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، یعنی ابن ہشام کا اپنی طرف سے اضافہ ہے جس کا اصل کتاب میں وجود ہی نہیں، کیونکہ تنہا ابن ہشام ہی نے نہیں طبری، بیہقی، اور قلقشندی سب نے ان خطوط کے متن کو ابن اسحاق ہی کی تاریخ سے لیا ہے سب نے اسی کا حوالہ دیا ہے معلوم ہوا کہ ابن اسحاق کے یہاں یہ متن موجود ہے۔

۴- ایک اہم اور بڑا اعتراض کائتانی کا یہ بھی تھا کہ ہرقل کے پاس سفارت بھیجنے کا واقعہ عہد رسالت کا اہم ترین واقعہ تھا لیکن اتنے اہم واقعہ کو صرف ابن عباس بیان کرتے ہیں اور دوسرا کوئی صحابی اس کو نہیں بیان کرتا، معلوم ہوا کہ سفارت کا واقعہ ہی غلط ہے ورنہ بہت سے صحابہ اس کو بیان کرتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا کہ یہ اسلام کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے، علامہ بلاذری اور احمد بن حنبل نے قیصر کی سفارت کا واقعہ حضرت انسؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا ہے، کنز العمال میں یہ حضرت خالد بن سعید بن العاص سے بھی مروی ہے طبرانی میں تو

خود دحیہ کلبی ہی کی روایت موجود ہے یہ کیسے کہہ دیا گیا کہ تنہا ابن عباس نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

میں نے انتہائی اختصار کے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ کے جوابات سے آپ کو روشناس کرایا اصل بحث اور تفصیل ان کی کتاب ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اعتراضات کے جواب کے بعد خود اپنی طرف سے دعوتی خطوط بھیجے جانے کے اور بھی دلائل وشواہد پیش کئے ہیں جو مستشرقین کو لا جواب کرنے کے لئے کافی ہیں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ قیصر کی حکومت میں وقائع نگاری ہوتی تھی مگر وقائع نگاروں نے مکتوب نبوی کے پہنچنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض اسباب کی بنا پر وقائع نگاری میں ایک صدی کا فصل ہو گیا اس دوران وقائع نگاری موقوف رہی اور یہ وہی زمانہ ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی خطوط بھیجے ہیں اسی وجہ سے بیزنطینی حکومت کے ریکارڈ میں اس کا ذکر نہیں ہے، صرف جنگ موتہ کا ذکر پایا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی۔

مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد امام بخاری ہیں، انہوں نے صحیح بخاری میں ہرقل کے نام دعوتی خط بھیجنے کا مفصل ذکر کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ حضرت دحیہ کلبیؓ کو ہرقل کے پاس نہیں، بلکہ اس کے نمائندہ بُصریٰ کے گورنر کے پاس بھیجا گیا تھا، ان کو ہرقل سے ملنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا، گورنر بصریٰ نے یہ خط ہرقل کو پہنچایا ہے، یہ صداقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ بعد کے دور میں بھی ہرقل کے نام جو خط بھیجا گیا تھا اس کا مسلسل پتہ چلتا ہے یہ خط ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہا ہے اس سلسلہ میں کچھ تاریخی شواہد پیش ہیں پیغمبر اسلام کا دعوتی خط ہرقل کے نام کا عرصہ دراز تک موجود رہا اس کی سب سے پہلی شہادت چھٹی صدی ہجری کے مراکشی مورخ سہیلی نے چشم دید گواہوں کی شہادت پر یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کے زمانے میں اسپین (قسطنطنیہ) کے حکمران انفانسو نے جس کے قبضہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام ہرقل تھا ایک

مسلمان سپہ سالار عبدالملک بن سعید کو دکھایا تھا، اسفانسو کی موت کے بعد یہ نامۂ مبارک اس کے نواسے کو وراثت میں ملا۔

اس واقعہ سے ایک صدی بعد علامہ عینی کہتے ہیں کہ سلطان قلاؤون حاکم مصر نے اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی اس بادشاہ نے سلطان قلاؤون کے سفیر سیف الدین تیج کو نامہ مبارک دکھایا تھا یہ سفارت ۶۸۲ھ میں بھیجی گئی تھی۔

ایک اور شہادت ابن فضل اللہ العمری متوفی ۷۴۸ کی ہے انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ خود شاہ اسپین نے جو ہرقل کی اولاد میں سے ہے مجھ سے بتایا کہ نامۂ نبوی اس وقت بھی شاہی خزانے میں محفوظ ہے۔

مراکشی امیر اور عالم شیخ عبدالحیٔ کتانی کی کتاب میں کئی مقامات پر اس خط کا ذکر آیا ہے انہوں نے خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ) کی کتاب شرح شفا جلد سوم صفحہ ۱۷۴ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اب تک اسپین کے بادشاہوں کے پاس موجود ہے، وہ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں اور سنہری صندوق میں بحفاظت رکھتے ہیں اور نسلاً بعد نسل اس کی نگہداشت کی وصیت کرتے آتے ہیں۔

اسی طرح مراکش کے ایک اور مشہور مصنف شیخ ابو روس بن احمد بن ناصر الراشدی العسکری متوفی ۱۲۳۸ھ کی کتاب الخبر المعرب من الامر المغرب الحال بالاندلس وثغور المغرب میں بھی اس خط کے وجود کا ذکر موجود ہے، شیخ کتانی نے چند اور مسلمان مصنّفین کے حوالے دیئے ہیں، جنہوں نے اس خط کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر حمیداللہ نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے لکھا ہے ان ثبوتوں اور شہادتوں کے بعد اب شاید کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیزنطینی شہنشاہ ہرقل کو تبلیغی خط لکھنا ناممکن نہیں ہے، بلکہ حالات اس کی تائید ہی میں ہیں۔

ڈاکٹر حمیداللہ کے جوابات کی گہرائی اور گیرائی سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ ان کی نظر کتنی وسیع اور ان کا مطالعہ کتنا ہمہ گیر تھا، نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں

ان کی ذہنی رفتار کتنی تیز تھی، اسی بھرپور اور ہمہ جہتی صلاحیتوں کی بنیاد پر عالم اسلام میں ان کو عظمت واحترام حاصل ہوا اور ان کے اخلاص نے فرانس والوں کے دلوں میں ان کیلئے ادب واحترام کا ایک نرم گوشہ پیدا کرلیا تھا اسلئے ان کی باتیں سنجیدگی اور توجہ سے سنی جاتی تھیں اور بسا اوقات ان کے دل اس کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے۔

یورپ میں دین کی دعوت کچھ آسان نہیں، یہ راہ تھوڑی بہت اس وقت آسان ہوسکتی ہے جب علمی وتحقیقی مباحث میں وہاں کے دانشوروں کی زبان کو دلائل سے بند کردیا جائے، ڈاکٹر حمید اللہ کی ساری علمی جدوجہد میں یہی دعوت دین کا مخلصانہ جذبہ کارفرما تھا انہوں نے اپنے علم وفضل کو نمائش کی چیز نہیں بنایا اور نہ اس کے ذریعہ عزت ومنصب حاصل کرنے کی کوشش کی، فرانس کے اعلیٰ طبقہ میں سرخ روئی اور سربلندی حاصل کرنا ان کے پیش نظر تھا ہی نہیں، دولت وثروت اور اعزاز ومنصب کی ہوس کو تو وہ نہایت حقارت کے ساتھ پاؤں سے روند چکے تھے، وہ صرف اپنے علم اور مطالعہ کی طاقت سے ان رُکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو فرانس میں دعوت دین کی راہ میں حائل تھیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اہم ترین کتابیں اور مضامین فرانسیسی زبان میں ہیں جو پورے فرانس کے عوام وخواص سب کی زبان ہے، اپنے دل کا درد فرانس کے باشندوں کے دلوں میں پیدا کرنا ان کا مقصد وحید تھا وہ اسی کے لئے ساری جدوجہد کرتے رہے یہ صرف ان کی کتابوں کی تاثیر تھی کہ کئی ہزار فرانس کے باشندوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جب کہ ڈاکٹر حمید اللہ اردو عربی کے بہترین انشاء پرداز تھے لیکن دعوت دین کے جذبے کے پیش نظر درد وتاثیر میں ڈوبی ہوئی کتابیں اور مضامین صرف فرانسیسی زبان میں لکھتے رہے، وہ علم وفضل کے اتنے بلند مقام سے بات کرتے تھے کہ دانشوران یورپ کے طائر فکر کی پرواز وہاں تک ذرا مشکل ہی سے تھی یہی وجہ ہے کہ وہ خالص دین کا کام کرتے رہے اور دانشوران یورپ کی نگاہوں میں بھی معزز رہے اور ادب واحترام کے ہاتھوں لئے جاتے رہے۔

خالق کائنات کی یہ حکمت ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں (جو مظلوم مسلمانوں

کی سرزمین ہے) ایک فرد پیدا کرتا ہے اور وہ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں جا کر اپنے علم وفضل کی وجہ سے سر اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے کیونکہ وہ مخلص تھا، انسانیت کا خیرخواہ تھا، دین کا داعی تھا دنیا اس کے قدموں کے نیچے تھی وہ بے نیازی کے ساتھ اس کو روندتے ہوئے گذر گیا خدا اس کی بال بال مغفرت فرمائے اور اہل علم وکمال کو ان کی روش پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو یورپ جا کر دین بیچتے ہیں اور دنیا خریدتے ہیں اور گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔

# مولانا ابوالکلام آزاد

## ''غبار خاطر'' کے ایک مکتوب کی روشنی میں

''غبار خاطر'' ہاتھ میں لیتے ہی مولانا آزاد کی یاد آئی اور میں ان یادوں میں کھو گیا، یادوں کا یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ما سوا کو مناتی چلی گئی

ان یادوں کی سنہری زنجیروں نے نصف صدی سے زیادہ کی مدت کو جکڑ لیا ہمارا ملک آزادی کی منزل سے قریب ہوتا جا رہا تھا اور جتنی قربت بڑھتی جا رہی تھی راستہ کی ہولناکیاں اور مشکلات کی یورش بھی بڑھتی جا رہی تھی، مولانا آزاد اس پرخطر ماحول میں قطب نما کی حیثیت رکھتے تھے کاروان آزادی اس ستارے سے راہیں پاتے تھے اور اپنا سفر جاری رکھتے تھے، خطابت کے اسٹیج سے اور قلم کی جولانیوں سے جو کام لئے جا سکتے تھے ان کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، خطابت کے اسٹیج پر آئے تو محسوس ہوا کہ کوئی تند اور تیز رو طوفان آ رہا ہے جو سامعین کی عقل و خرد اور ہوش و حواس کو اپنی زد میں بہالے جائے گا اور جب قلم اٹھایا جادوں نگاری کا مرقع سامنے آ گیا، ان کے قلم کی ساحری کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ''غبار خاطر'' ہے جو قلعہ احمد نگر جیل کی یادگار ہے، قلعہ احمد نگر کی جیل مولانا آزاد کی سیاسی سربلندیوں کا نقطۂ عروج ہے اس منزل تک پہنچنے کے لئے آپ کو نگریس کی چھ سالہ صدارت کے ابتدائی تین سال کی شعلہ بداماں وادیوں سے گذرنا پڑا، یہ وہ دور تھا جب پورے عالم میں آگ اور بارود کی دماغ پاش بو پھیلی ہوئی تھی ۹ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے پولینڈ پر بم برسا کر دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز کر دیا اس کے دوش بدوش اٹلی اور جاپان کے حکمراں تھے، ان کا

نشانہ یورپ تھا، ان کے بمبار طیاروں نے برطانیہ کے دارالحکومت لندن پر بے تحاشا بمباری شروع کردی جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر آبادی زمین دوز پناہ گاہوں میں چلی گئی برطانیہ جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اب اس کے دل ودماغ میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، ہندوستان اس کی غلامی میں تھا، اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اس جنگ میں ہندوستان جانی ومالی تعاون کے لئے تیار ہوجائے، ہٹلر اور مسولینی بھوت بن کر یورپ کے سر پر سوار ہوگئے ان کے مقابلہ کے لئے فوجی جوانوں کی بھی ضرورت تھی اور مالی تعاون کی بھی، اس وقت تک ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں ابال آچکا تھا پورے ملک میں تیز تر سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، سیاسی جماعتوں کے تدبر وفراست کا امتحان تھا، یا تو اپنے آقاؤں کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، یا تعاون سے انکار کرکے قید وبند کی اذیتوں سے دوچار ہوں، کانگریس کے رہنماؤں کے سامنے بھی یہ مسئلہ عقدۂ لاینحل بنا ہوا تھا کہ وہ کمیونزم کی حمایت کریں یا نازی ازم کو اپنے سر پر مسلط کرلیں چونکہ جرمنی اور اٹلی نے لندن کے ساتھ روس پر بھی حملہ کردیا تھا اس لئے ہندوستان میں کمیونزم کے پرستاروں نے انگریزوں کی حمایت کا فیصلہ کردیا، لیکن کانگریس نہ کمیونزم کی حمایت وتعاون کرسکتی تھی نہ نازی ازم کی، اس لئے انگریزوں کو اس جنگ میں مدد دینے کے مسئلے میں متردد تھی، اسی تذبذب کے دور میں مولانا آزاد کو ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا صدر منتخب کرلیا گیا، اب اس عقدۂ لاینحل کے لئے انہیں کے ناخن گرہ کشا کی ضرورت تھی، رام گڑھ کے کانگریس سیشن میں آپ نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی دستاویز تو تھا ہی وہ اردو ادب کا بھی شاہکار بن گیا، لوگوں نے عقیدت سے اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

اب عالمی جنگ تیسرے سال میں داخل ہوچکی تھی اس جنگ نے پوری دنیا کی معیشت پر اثر ڈالا تھا کوئی ملک اس مہیب اور ہمہ گیر جنگ کے اثرات سے مستثنیٰ نہیں تھا، اسی دور میں مولانا آزاد کو تحریک آزادی کے کارواں کی رہنمائی کرنی تھی، اور پورے قافلہ کو ساتھ لے کر چلنا تھا، کانگریس کے لیڈران، رہنماؤں اور دانشوروں کو

ایک نقطۂ فکر پر لانا تھا، تا کہ پوری قوت سے حکومت کے سامنے اپنا فیصلہ رکھا جا سکے سیاسی جماعتوں سے انگریزی حکومت کی گفت وشنید جاری تھی اب اگست ۱۹۴۲ء آچکا تھا صدر کانگریس مولانا آزاد نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ممبئی میں بلایا تا کہ متفقہ طور پر ایک پالیسی مرتب کر لی جائے اور غیر متزلزل فیصلہ کیا جائے، ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی نے اپنا وہ تاریخ ساز فیصلہ سنایا جو آزادی کے دیوانوں کی دلی تمنا تھی، اس فیصلہ کے نفاذ کے لئے ملک ابھی تیار تھا یا نہیں البتہ انگریزی حکومت میں اس فیصلہ کو برداشت کرنے کی قوت نہیں تھی، وہ فیصلہ اس طرح تھا۔

''ہم اہل ہند برطانوی حکومت کو کوئی جانی و مالی تعاون نہیں دے سکتے، انگریز ہندوستان چھوڑ دے''۔

اسی فیصلہ کو تاریخ میں مختصر لفظوں ''کوئٹ انڈیا'' کے لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ فیصلہ درحقیقت انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا، اور کوئی حکومت بغاوت برداشت نہیں کر سکتی، اس کو کچل دینا اس کا سب سے پہلا فرض بن جاتا ہے، ۹/ اگست کو عملی بغاوت کا ہندوستانی قوم نے آغاز کر دیا کھلم کھلا ہندوستانیوں کی باغیانہ سرگرمیوں نے ثابت کر دیا کہ ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی طریقۂ کار اختیار کر سکتے ہیں، پورے ملک میں ریلوے لائنیں اکھیڑی جانے لگیں بجلیوں کے تار کاٹے جانے لگے اسٹیشنوں کو پھونکا جانے لگا، ڈاک خانوں کو تاخت وتاراج کیا جانے لگا، نہتے ہندوستانیوں نے انگریزی پولیس کا سامنا کیا، پورے ملک میں ہر طرف زلزلہ آ گیا نظام حکومت درہم برہم ہو گیا، انگریزی حکومت حواس باختہ ہو گئی، مولانا آزاد کی صدارت میں یہ فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ اور آزادی کا سنگ بنیاد بن گیا، گاندھی جی کا اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ منہ دیکھتا رہ گیا پورے ملک میں غلامی سے شدید نفرت کا لاوا اُبل پڑا، فیصلہ ۸/ اگست کو ۱۱/ بجے رات میں ہوا اور ۹/ اگست کو فیصلہ کرنے والی ورکنگ کمیٹی ممبئی میں دن کا سورج نہ دیکھ سکی، مولانا آزاد اور پوری ورکنگ کمیٹی کو علی الصباح ممبئی وی ٹی ریلوے اسٹیشن سے انگریزی حکومت نے ایک

بند گاڑی میں ایک نا معلوم مقام پر روانہ کر دیا مولانا آزاد غبار خاطر کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام پر بھیج دیا جائے گا''۔

مولانا آزاد نے اس خبر کو افواہ کے لفظ سے ذکر کیا ہے چونکہ حکومت نے اتنی راز داری برتی تھی کہ صدر کانگریس کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی اور جب مولانا آزاد قلعہ احمد نگر کی جیل میں پہنچ گئے تو ان کو پتہ چلا کہ وہ افواہیں بے بنیاد نہیں تھیں، بلکہ حکومت کے ارادے کے آہنی حصار میں کوئی ایسا سوراخ ضرور رہ گیا تھا جس سے اصل خبر لیک کر گئی، اور لوگوں تک پہنچ گئی، مولانا آزاد نے غبار خاطر میں افواہ پر حاشیہ لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

''گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہیں تھیں، سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات بھی کر لئے گئے تھے، لیکن پھر رائے بدل گئی، اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے تحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے''۔

شاہین جانتا ہے کہ صیاد گھات میں ہے، اس کا غیر مرئی جال ضرور بچھا ہوگا، گرفتاری یقینی ہے لیکن وہ شاہین کیا جو طوفانی ہواؤں اور تیز وتند جھکڑوں سے ڈر جائے، مولانا آزاد خوب سمجھتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ ہونے کے بعد حکومت کا کیا رویہ ہوگا، مگر اپنے گھر کلکتہ سے روانگی کے وقت اس کے تصور کو بھی ذہن سے نکال کر پھینک دیا تھا، یہی دور ہے جب مولانا آزاد کی زندگی کی تصویر کا دوسرا رخ ہمارے

سامنے آتا ہے، سچ پوچھئے تو اسی دوسرے رخ کو دکھانے ہی کے لئے میں نے اس خامہ فرسائی کی جرأت کی ہے، ایک طرف مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہونے کے ناطے پورے ملک اور ملک کے تمام دانشوروں، سیاسی لیڈروں کی نگاہوں کا مرکز تھے ساری نگاہیں ان کی طرف لگی تھیں لیڈروں میں ان کا قد سب سے اونچا اور سب سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف وہ ایک محبت کرنے والی بیوی کے شوہر بھی تھے، مگر تصویر کا یہ دوسرا رخ کبھی دوسروں کے سامنے نہیں آیا، مولانا نے اپنی ذات کے گرد اتنا مضبوط حصار بنا رکھا تھا کہ انہوں نے خودنوشت بھی لکھی لیکن ان کی ذات کی پنہائیوں تک کسی کی رسائی نہ ہوسکی، اپنی ذات کو سمجھنے کے لئے پیش کیا اور کسی کو سمجھنے بھی نہیں دیا، ان حالات میں ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا کچھ آسان نہیں، کلکتہ میں مولانا آزاد کے ساتھ رہنے والے بعض اہل علم نے اپنے مضامین میں کچھ اشارے ضرور کئے ہیں یا ان کی تحریروں میں کہیں کہیں ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے، لیکن ''یوسف وزلیخا'' کا جو جذباتی ربط ہے وہ ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہا۔

انگریزی حکومت کے مظالم سہنے، جلاوطنی کا عذاب اور برطانوی جیلوں کی سختیاں جھیلنے کے لئے ان کا دل اگر ایک طرف فولاد کا تھا تو دوسری طرف ان کا دل پھول کی طرح نرم اور نازک بھی تھا مگر انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دل کے اس نرم گوشے کا احساس نہیں ہونے دیا، قلعہ احمد نگر کی جیل ازدواجی زندگی کی آخری سرحد تھی اس منزل میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا، ۱۱/اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب گراں میں کہتے ہیں:

''میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۱ء میں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اس کی اطلاع نہیں دی گئی، لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم وبیش علالت کی حالت میں گذرا تھا، مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا رہائی کے بعد ڈاکٹر سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب وہوا کی ہوئی، اور وہ رانچی

چلی گئی رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا، جولائی میں واپس آئی تو صحت کی
رونق چہرے پر واپس آرہی تھی''۔

مولانا آزاد کے دل کی دنیا بہت وسیع تھی مگر اس میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے ہر طرف ہنگامے برپا تھے پھر بھی اسی دل کے ایک گوشے میں وہ جذبہ محبت بھی نیم خوابیدہ نیم بیدار موجود تھا جس کا رابطہ رفیقۂ حیات زلیخا سے تھا اسی پاکیزہ جذبے نے مسرت کا احساس کیا کہ صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی ہے سکونِ دل کا یہ احساس بھی بہت تھا۔

زلیخا کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہیں، ان کی کیا تعلیم تھی مگر ان کی ذہانت وفراست اور مطالعہ ومعلومات کے سلسلہ میں تھوڑی بہت واقفیت غبار خاطر کے اسی خط سے ہوتی ہے جو آج ہمارا موضوع سخن ہے ملکی حالات، آزادی کی تحریک، حکومت کی سرگرمیوں، اور وقت کے تیور کو وہ خوب سمجھتی تھیں، اور ان پر بصیرت مندانہ نظر رکھتی تھیں، اور پھر مولانا آزاد جیسے بے پناہ حساس اور ذہین شخصیت سے دو جملے کہنے میں بڑی صلاحیت اور ذہانت کی ضرورت تھی مولانا آزاد اپنے بلند مقام سے ایک زینہ بھی نیچے اترنے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے رفیقۂ حیات کو خود اس مقام سے ہی گفتگو کرنی ضروری تھی جو مولانا آزاد کے شایان شان ہو، یہ حقیقت ان کی فطری صلاحیت وحاضر دماغی ان کی بہترین رسمی تعلیم کی غمازی کرتی ہے، مولانا آزاد ان کی بہترین صلاحیتوں کے خود معترف تھے وہ اپنے اسی مکتوب گرامی میں رقمطراز ہیں:

''اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی، اس نے
وقت کی صورت حال کا پوری طرح انداز کرلیا تھا، ان چار دونوں کے اندر جو
میں نے دوسفروں کے درمیان بسر کئے ہیں، اس قدر کاموں میں مصروف رہا
کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا، وہ میری طبیعت کی
افتاد سے واقف تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی
ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے، اس لئے وہ بھی

خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی، ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اوراس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے ۳؍ اگست کو جب میں ممبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی، میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳؍ اگست تک واپسی کا قصد ہے اس نے ''خدا حافظ'' کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا ''خاموش اضطراب'' کہہ رہا تھا، اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بہ حیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

مولانا آزاد کے لئے دوران جنگ صدارت کانگریس کا عہد درحقیقت کانٹوں کی سیج تھا، کسی کروٹ چین نہیں، ہمہ وقت دل میں جذبات کے شعلے لپکتے رہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ آج انگریزی گورنمنٹ حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے، یہ وقت آزادی کے مطالبہ میں شدت برتنے کا ہے کوئی بھی حکمراں بخوشی اپنے غلام ملک کو آزاد نہیں کرسکتا، آزادی قوت بازو سے چھینی جاسکتی ہے، لیکن راست اقدام کے بغیر کامیابی ممکن نہیں، لیکن گاندھی جی کا اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ بیچ میں حائل تھا، عالمی جنگ شدت اختیار کرتی جارہی تھی پورے یورپ میں آگ کے شعلے دہک رہے تھے آگ اور بارود کی تیز بو انگریزی حکومت کے دماغ میں چڑھی ہوئی تھی ایسی حالت میں وہ اپنے بچاؤ کے لئے بڑے سے بڑا اقدام کرسکتی ہے، اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا ایک مدبر سیاستداں کے لئے لازمی تھا، نینی جیل میں مولانا آزاد کا جسم ضرور قید تھا مگر دل ودماغ کی پرواز برابر جاری تھی، نینی جیل سے رہائی کے بعد سیدھے کلکتہ اپنے گھر آئے، اب کی باران کا گھر آنا گھر سے غائب رہنے سے کم نہ تھا دل کا وہ گوشہ جس میں اہل خانہ سے ربط وتعلق کا جذبہ جاگ رہا تھا ان کو گھر ضرور لایا لیکن حالات کی ستم ظریفی کا عالم یہ تھا کہ نہ دل ودماغ کو فرصت تھی نہ زبان میں

یارائے گفتگو البتہ آنکھیں بولتی تھیں اور اپنے سوال کا جواب بھی پا لیتی تھیں، لیکن حالات وخیالات کی تیز آندھی میں محبت کا یہ چراغ ہمیشہ جھلملاتا رہا، اس کا اظہار اس وقت ہوا جب چار دنوں کے بعد وہ گھر سے رخصت ہو رہے تھے، جذبات کے سمندر میں جو تموج تھا اس کا سنبھالنا دشوار تھا، خاموش محبت زبان دراز محبت سے ہمیشہ طاقتور ہوتی ہے اس میں اپنا وجود آتش فراق میں خاکستر کر دینے کا حوصلہ ہوتا ہے مگر لب بند ہوتے ہیں اور زبان پر مہر خموشی، مولانا آزاد کے معجزہ نگار قلم نے ان لمحات کی جو ترجمانی کی ہے اس کی مثالیں اہل قلم کے یہاں کم ملتی ہیں، آپ نے اپنے مکتوب میں کتنے معنی خیز الفاظ میں دونوں طرف کے جذبات کی ترجمانی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی، میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا، شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی ہے''۔

کبھی دوست اپنے سفر کرنے والے دوست کو خدا حافظ کہتا ہے اور کبھی خود سفر کرنے والا گھر والوں کو خدا حافظ کہتا ہے، مولانا آزاد تو کلکتہ سے ممبئی کا سفر کر رہے تھے اور ۸/ اگست کے شعلہ زار میں چھلانگ لگانے کے لئے جا رہے تھے لیکن رفیقۂ حیات اس سفر سے کہیں زیادہ لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہی تھی، دروازہ پر جانے والے مسافر کو خدا حافظ کہہ کر خاکدان عالم سے اپنے سفر کے لئے رخت سفر درست کرنے میں لگ گئی، یہ کیسی کربناک صورت حال ہے جس کو مولانا آزاد نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے ''مجہول احساس''، مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے کسی واقعہ کی کبھی کبھی ایک جھلک قبل از وقت نظر کے سامنے آ جاتی ہے اور ظاہری وجود پر اس کا

ظہور ہونے لگتا ہے۔

رفیقۂ حیات کا اپنے سفرِ آخرت کے پیشِ نظر مولانا آزاد کو خدا حافظ کہنا انتہائی درد و کرب کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ تو ممبئی کے سفر پر جارہے ہیں جہاں سے واپسی ممکن ہے اور میں اس سفر پر جارہی ہوں جہاں سے واپسی ناممکن ہے، خدا آپ کی حفاظت فرمائے، یہ داستان کرب مولانا آزاد نے بالقصد دراز کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار ہوگا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی، ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا، اس واقعے نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار، پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی، غالبًا یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہوگئی تھیں''۔

مستقبل کی پرچھائیاں کیا ہیں؟ درحقیقت مولانا آزاد کی گرفتاری کے آٹھ ماہ بعد زلیخا پر ٹوٹنے والی قیامت اس پر آٹھ ماہ قبل ہی منکشف ہوگئی تھی وہ سمجھ چکی تھی کہ میں آج جن کو خدا حافظ کہہ رہی ہوں وہ احمد نگر کی جیل میں صوفے پر بیٹھے عالم تصور میں اپنے دوست کو حافظ شیرازی کے وجد آفریں اشعار سنا رہے ہوں گے اور میں کلکتہ میں تڑپ تڑپ کر شکن آلود بستر پر دم توڑ رہی ہوں گی، یہ وقت سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

عظیم شخصیتوں کی نجی زندگی حجاب درحجاب ہوتی ہے گھر کے افراد سے ربط و تعلق عام لوگوں ہی جیسا ہوتا ہے لیکن اس کا ظہور دوسروں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا گھر کے افراد کو ایک غیر مرئی تار باندھے رکھتا ہے اور جب وہ تار ٹوٹ جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرے فرد کی زندگی ادھوری اور نامکمل ہوگئی، مولانا آزاد کو زلیخا سے جو تعلق خاطر تھا زلیخا کو اس سے کہیں زیادہ مولانا آزاد سے تعلق خاطر تھا بلکہ اس کو عشق و محبت کی معراج کہا جاسکتا ہے، انہوں نے پوری زندگی ایثار وقربانی کی صلیب پر گذاری مگر زبان سے کبھی اف بھی نہیں کہا مولانا آزاد خود اس کے معترف تھے مگر ان کی وضعداری، رکھ رکھاؤ ایک خاص پروقار طرز زندگی کے وہ قائل تھے جو ظاہر داریوں کے رسوم وقیود سے جکڑی ہوئی تھی اس لئے باہمی روابط کا ظہور کم ہی ہوتا تھا، لیکن ان کی دائمی جدائی کا تصور اس کوہ وقار کو جنبش دے دیتا تھا آپ اس مکتوب کے لفظوں اور جملوں پر غور کریں تو ہر ہر لفظ سے مولانا آزاد کا درد وکرب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد ۸/اگست ۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد رات کے پچھلے پہر گرفتار کر لئے گئے تھے اور ایک نامعلوم مقام پر ایک بند گاڑی کے ذریعہ بھیج دیئے گئے تھے، سیاسی قیدیوں کو اپنے گھر والوں سے خط وکتابت کی محدود اجازت حاصل رہتی ہے لیکن مولانا آزاد اور ان کے جملہ ساتھیوں کو ابتداءً خط وکتابت کی اجازت نہیں دی گئی تقریباً ایک ماہ بعد پابندی اٹھالی گئی تو کلکتہ کے خطوط سے رفیقۂ حیات کی علالت کی اطلاع ملی اور یہ بیماری کا سلسلہ بغیر انقطاع مسلسل جاری رہا، پھر شدید علالت اور پھر خطرناک صورت حال کی اطلاع ملنے لگی، مولانا آزاد نے صحیح صورت حال جاننے کے لئے ٹیلیگرام کرنا چاہا مگر معلوم ہوا کہ قلعہ احمد نگر کے قیدیوں کی جملہ ڈاک ممبئ جاتی ہے اور پھر ممبئ کی گورنمنٹ ان کو سنسر کے لئے دہلی بھیج دیتی ہے وہاں سے کتر بیونت کے بعد پھر وہ خط یا ٹیلیگرام مکتوب الیہ تک جاسکتا ہے اس لئے ٹیلیگرام بھی کم سے کم ایک ہفتہ کے بعد ہی جاسکتا ہے اور جوابی تار ملنے میں پندرہ دن لگ جائیں گے اس لئے ٹیلیگرام کا ارادہ ملتوی کردیا گیا اور ٹیلیگرام نہیں دیا گیا۔

۲۳/ مارچ ۱۹۴۳ء کوممبئی گورنمنٹ نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعہ احمد نگر جیل کے سپرینٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ کلکتہ سے مولانا آزاد کی اہلیہ کی خطرناک علالت کا ایک ٹیلیگرام ملا ہے، وہ فوجی کوڈ میں لکھا ہوا تھا اس لئے سپریٹنڈنٹ اس کو لے کر فوجی ہیڈ گوارٹر گیا اور رات میں وہ حل ہوکر مولانا آزاد کو ملا اور معلوم نہیں وہ تار کتنے دن پہلے دیا گیا تھا؟ سپریٹنڈنٹ نے ممبئی گورنمنٹ کی ایما سے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آپ اس سلسلہ میں کوئی بات کہنی چاہتے ہیں تو بتادیں میں آج ہی اسے ممبئی گورنمنٹ کو بھیج دوں گا وہ خود اس حادثہ سے متاثر تھا اور سپریٹنڈنٹ اپنی ہمدردی کا مولانا آزاد کو یقین دلانا چاہتا تھا مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا، سپریٹنڈنٹ مولانا آزاد سے دوٹوک جواب پاکر پنڈت جواہر لال کے پاس گیا اور کہا کہ آپ مولانا کو راضی کردیں، اور درخواست دینے پر آمادہ کردیں، جواہر لال نہرو مولانا کے پاس آئے اور دبے لفظوں میں اپنا مدعا کہا مگر مولانا آزاد بھاری چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے اور کوئی جنبش اس کو نہ ہلا سکی۔

یہ قلعہ احمد نگر جیل کے آٹھ مہینوں کی روداد تھی اور جب تشویشناک اطلاعات آنے لگیں اور دائمی جدائی کا تصور اپنے تمام درد وکرب کے ساتھ مولانا آزاد کے سامنے آیا تو آپ کے دل ودماغ پر کیا گذری؟ خود مولانا آزاد کے لفظوں میں سنئے:

''جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا، انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کردیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا، میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گذری کہ طبیعت کو ضبط وانقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

آخری الفاظ ہیں:

''بالآخر ۹/اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا ''فان ما تحذرین قد وقع''
وہ کہانی جو ۳/اگست ۴۲ء کو مولانا آزاد کے کلکتہ سے روانگی کے وقت ان کی رفیقہ حیاتِ زلیخا نے خدا حافظ کہہ کر شروع کی تھی وہ ۹/اپریل ۴۳ء کو ختم ہوگئی مولانا آزاد اس وقت یہ فیصلہ نہ کرسکے تھے کہ یہ خدا حافظ میرے سفر کے لئے کہا گیا یا وہ خود سفر کرنے والی تھی اور وہ اپنے سفر پر جاتے ہوئے خدا حافظ کہہ رہی ہے ۹/اپریل کو یہ جملہ اپنی پوری معنویت اور پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوگیا، اس حادثہ کے بعد مولانا آزاد پر کیا گذری؟ اس کو انہوں نے صرف دو سطروں میں بیان کردیا حالانکہ اس کے لئے مولانا آزاد کی کتاب زندگی کے ۱۴/ برس کی ضرورت تھی مولانا نے اسی خط میں تحریر فرمایا:

> ''مجھے ان چند دنوں میں برسوں کی راہ چلنی پڑی، میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے''۔

ایسا حادثہ جو براہ راست دل ودماغ پر چھا جائے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جیسے جسم کی ساری طاقت نکال دی گئی ہے، نہ کوئی حوصلہ نہ امنگ، نہ ہمت نہ طاقت، دل کا صدمہ جسم کو اپاہج بنادیتا ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہ کسی کام میں دلچسپی بدن تکان سے چور چور ہوجاتا ہے جیسے بہت لمبی مسافت پیادہ پا چل کر آیا ہو، جسم میں گویا برقی رو تھی جو جسم سے غائب ہوگئی۔

ازدواجی زندگی میں طرفین کے درمیان تعلق وربط کی ایک برقی رو کارفرما ہوتی ہے جب دونوں میں سے کوئی ایک اس عالم فانی سے رخصت ہوجاتا ہے تو وہ برقی رو غائب ہوجاتی ہے جیسے پلگ میں دو تار کسے ہوئے ہوتے ہیں تو برقی رو دوڑتی رہتی ہے اگر کوئی تار کھل جائے یا الگ ہوجائے تو پھر برقی رو غائب ہوجاتی ہے اب نہ بلب اور ٹیوب لائٹ روشن ہوتا ہے نہ ہیٹر گرمی پیدا کرتا ہے وہ پلگ ازکاررفتہ ہوجاتا ہے، ازدواجی زندگی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی، ان میں سے کوئی ایک جب ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو انسان ادھورا ہوکر رہ جاتا ہے اب نہ دماغ میں حوصلوں اور امنگوں کی

روشنی پیدا ہوتی ہے نہ عمل کی حرارت کا وجود رہ جاتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے مولانا آزاد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے انہوں نے خود کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے، اس مرحلہ پر ان کی وضعداری اور ظاہرداری شکست کھا جاتی ہے وہ اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی، یہ جدوجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے، وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، اس زمانے میں میرے دل ودماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر وسکون کے ساتھ برداشت کرلوں، اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہوسکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے''۔

یہ فطرت کا اصول ہے، بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی سب اسی اصول میں جکڑے ہوئے ہیں بس لفظ وبیان کا فرق ہے، چھوٹا آدمی اپنی فطرت سے مجبور ہوکر اپنے درد وکرب کا اظہار کھلے لفظوں میں کرتا ہے اور وضعدار انسان اپنی ازدواجی زندگی کے احساسات وانفعالات کو ایک سربستہ راز سمجھتا ہے جس کا افشاء وہ کسی حال میں گوارا نہیں کرتا ہے اس لئے ایسے حوادث پر اس کے دل ودماغ کی کیفیت ایک عام انسان ہی کی طرح ہوتی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے الفاظ اور جملوں کا اتنا دبیز پردہ استعمال کرتا ہے کہ اصل حقیقت پر آسانی سے نظر نہیں پڑ سکتی اور عوامی سطح کا ذہن اس کا ادراک بھی نہیں کرسکتا۔

بالکل ایسے جیسے سرخ رنگ کا مشروب شیشے کے سفید گلاس میں جب ہوتا ہے تو پورا گلاس سرخ نظر آتا ہے، لیکن یہی سرخ رنگ کا مشروب سونے کے گلاس میں ڈال دیجئے تو پتہ نہیں چلے گا کہ گلاس کے اندر کس رنگ کا مشروب ہے کیوں کہ وہ خارج سے نظر نہیں آئے گا، ظاہری نگاہیں صرف مرعوبیت سے گلاس کو دیکھتی رہ جائیں گی،

دونوں طرح کے انسان کے دلوں میں جذبات واحساسات ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں لیکن ظاہری نگاہیں دونوں میں فرق محسوس کرتی ہیں۔

مولانا آزاد پر بھی رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی کا حادثہ اسی طرح اثر انداز ہوا جیسے ہمارے جیسے معمولی لوگوں کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کا مکتوب گرامی جو غبار خاطر کا ایک اہم ترین خط ہے اپنے انداز بیان خوبصورت تعبیرات اور خود ساختہ تراکیب عربی کے دقیق الفاظ استعمال کر کے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ خط جذبات انسانی کے اظہار کے لئے الفاظ ومعانی کے ایسے ایسے نمونے پیش کرتا ہے کہ عام ذہنوں کی وہاں تک رسائی بھی نہیں ہوسکتی، اہل قلم ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور مافی الضمیر کی ادائیگی کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں جو ان کے دامن خیال کو رکاکت وابتذال کے داغ دھبے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بس اسی جذبے سے میں نے غبار خاطر کے اس مکتوب کو موضوع سخن بنایا، مگر بات پھیلتی چلی گئی اور گفتگو دراز ہوگئی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

# ٹیپو سلطان کی تلوار ہمارا تاریخی ورثہ ہے

ٹی وی پر دیو مالائی کہانیوں کے دو سلسلے چلے جو ایک عرصہ تک چلتے رہے، ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ جب ''مہا بھارت'' ''رامائن سیریل'' کا وقت ہوتا تو جن دکانوں میں ٹی وی سیٹ تھے ان کے سامنے عوام کے ٹھٹ لگ جاتے، جب یہ دونوں سیریل ختم ہوئے تو بھگوان ایس گڈوانی کے ناول پر مبنی سیریل ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' کا اعلان کیا گیا، بس پورے ملک کی فضا میں بھونچال آگیا، جیسے کسی دشمن ملک نے ہمارے ملک کے خلاف اعلان جنگ کیا ہو، فرقہ پرست تنظیموں کے خیموں میں پینترے بازی شروع ہوگئی، تلواریں چمکائی جانے لگیں، جلسے ہونے لگے، بڑی بڑی احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں، دھرنے دیئے گئے، اور دہلی میں ایک بڑا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں پُر زور لفظوں میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' سیریل ٹی، وی پر ہرگز نہ دکھائی جائے، اس سے ہمارے جذبات مجروح ہوں گے، ٹیپو ہندوؤں کا دشمن تھا، اس نے مندروں کو ڈھایا ہے اور اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنایا ہے، اور نہ جانے کیا کیا الزامات واتہامات فرقہ پرستوں کے زرخیز دماغ میں خودرَو پودوں کی طرح اگنے لگے، اور پھر یہ پودے اتنے گھنے اور تناوَر درخت بن گئے کہ عوام کے ذہن وفکر کے آنگن میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا، اس اندھیرے میں تاریخی صداقتوں کا آفتاب گہنا گیا۔

ٹی، وی سے ہماری کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے نزدیک سنیما ہال میں دکھائی جانے والی فلموں کا وہ ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے، ارباب بست وکشاد جو چاہیں گے فلمیں دکھائیں گے، ان کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے اب چاہے ٹی، وی پر مہا بھارت لڑی جارہی ہو یا رام وراون اور سیتا کی کہانی دہرائی جارہی ہو ہمارے جیسے ذہن ومزاج کے لوگوں کو اس سے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟ بالکل اسی طرح ہندوستان کے مسلم ہیروز کی

زندگیوں پر فلمیں اور سیریل بنائے جائیں یا ان کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی، کیوں کہ ہم سرے سے گھروں میں ٹی، وی رکھ کر ہر گھر کو سنیما ہال بنانے ہی کے خلاف ہیں کیوں کہ اس سے خاندانی زندگی کا تقدس پامال ہوتا ہے اور عائلی زندگی کی پاکیزگی کے مجروح ہونے کا سخت خطرہ ہے، لیکن سلطان ٹیپو کا نام آتے ہی ملک میں جو طوفان برپا ہوگیا اور ذہنوں میں جو غلاظت بھری ہوئی تھی وہ سڑکوں پر آگئی تو قدرتی طور پر ہم کو اس سے سخت ذہنی اذیت ہوئی کیوں کہ ہمارے سامنے ہی ہماری تاریخ مسخ کی جارہی ہے، اور جو ہمارا مقدس قومی ورثہ تھا اس کو پامال کیا جارہا ہے اس لئے مجبوراً ہمیں قلم اٹھانا پڑا، تاکہ ملک کے سامنے سلطان ٹیپو کی صحیح تصویر پیش کر دیں، بس اس کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں، ہم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ سیریل ٹی وی پر دکھائی جائے یا اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔

## سلطنتِ خداداد:

ہندوستان کی تاریخ میں سلطان ٹیپو کا کیا مقام تھا؟ اس کی عظمت واہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آج سے دوسو سال پہلے ماضی کی طرف لوٹ جائیں اور جنوبی ہند کی سرزمین کی طرف چلیں جہاں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑی، جس کا بانی سلطان ٹیپو کا باپ نواب حیدر علی تھا اور اس نے اپنی حکومت کا نام ''سلطنت خداداد'' رکھا تھا، اس حکومت کی مدت صرف چالیس سال ہے، ۱۷۵۹ء میں اس کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۷۹۹ء میں اس کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے، لیکن اتنی مختصر مدت میں یہ حکومت کتنی طاقتور تھی؟ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ میں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی زندگی اور اس کے دور حکمرانی سے متعلق ایک درجن انگریزوں نے کتابیں لکھیں اور ضخیم سے ضخیم تر کتابیں لکھیں جن کی فہرست اس وقت میرے سامنے ہے، آخر یہ چھوٹی سی اور کم عمر حکومت یورپ کے لئے اتنی اہم کیسے ہوگئی؟ تاریخ بہت تفصیل سے ہمیں یہ داستان سناتی ہے۔

## انگریز سوداگروں کے بھیس میں:

افلاس کے مارے انگلینڈ نے تلاش معاش کے سلسلے میں اپنے فرزندوں کو واسکوڈِی گاما کے تلاش کردہ راستے سے ہندوستان بھیجنا شروع کیا کیوں کہ پورے یورپ میں یہ مشہور تھا کہ ہندوستان ''سونے کی چڑیا'' ہے، یہاں آکر انہوں نے اپنی ایک تنظیم بنالی جس کو تاریخ میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کہا جاتا ہے، بنگال میں وہ مچھلی اور بانس بیچتے تھے اور نیل بوتے، کاٹتے اور گندے حوضوں میں پکاتے تھے، یہی ان کا کاروبار تھا، مدراس میں پانڈیچری کے مقام پر ان کا دوسرا مرکز تھا، اس طرح ان کی بہت بڑی تعداد تلاش روزگار میں ہندوستان آگئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوگئی تھی، تمام علاقے خودمختار ہوتے جارہے تھے، پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں مطلق العنان ہوگئی تھیں، بنگال میں علی وردی خاں نے خودمختاری کا اعلان کردیا پھر اس کا لڑکا سراج الدولہ حکمراں ہوا، بنگال میں انگریزوں کی تعداد اتنی ہوچکی تھی کہ انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی فوج بنالی تھی، سراج الدولہ کی مخالفت میں انگریزوں نے میر جعفر کو کھڑا کردیا یا خود جعفر نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد طلب کی، بہرحال سودا طے ہوگیا، قیمت متعین ہوگئی، انگریز ٹامیوں نے سراج الدولہ کی فوج پر حملہ کردیا، میر جعفر جو وزیر جنگ تھا اس نے سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو چند گھنٹوں میں شکست دے دی، حسب معاہدہ میر جعفر کو بنگال کے تخت حکومت پر انگریزوں نے بٹھادیا، اس طرح بنگال کی حکومت ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے زیراثر آگئی اور اس کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی، پھر انگریزوں نے میر جعفر کے خلاف میر قاسم کو کھڑا کر کے اس سے سودا کیا اور قیمت طے کرلی اور میر جعفر کو تخت سے اُتار کر حکومت میر قاسم کے سپرد کردی گئی، چند دنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کے الٹ پھیر سے اتنی دولت حاصل کرلی کہ سالہا سال جدوجہد کے بعد بھی اتنی دولت نہیں کما سکتی تھی، بنگال کے اس تجربہ نے انگریزوں کی آنکھیں کھول

دیں، اب وہ پورے ملک میں اسی نقطۂ نگاہ سے کام کرنے لگے، مدراس کے انگریزوں نے محمد علی والا جاہ کو چندا صاحب سے لڑا کر ارا کاٹ کی حکومت دلوادی اس کے بدلے میں ارا کاٹ کا ایک بہت بڑا علاقہ انگریزوں کو انعام میں مل گیا، جہاں وہ خود مختار ہو کر اپنی حکومت بنانے کی پوزیشن میں آگئے، یہی وہ علاقہ ہے جہاں سب سے پہلے انگریزوں کو حکمرانی کا موقعہ ملا اور ہندوستان میں ایک قطعہ زمین کے مالک بنے۔

## حکومت میسور سے ٹکراؤ:

اب انگریزوں نے سنہرے خواب دیکھنے شروع کر دیئے اور پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے پر بڑی سرگرمی سے غور کرنے لگے، جنوبی ہند میں انگریزوں کی طاقت زیادہ تھی، اس لئے پہلے انہوں نے حیدرآباد کو اپنے چنگل میں لیا اور اپنی حسب مرضی اس سے کام لینا شروع کیا اور وہ طریقہ کار اختیار کہ نظام انگریزوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوگیا، ہندوستان کی فتوحات میں سب سے بڑی رُکاوٹ حیدر علی اور سلطان ٹیپو تھا گویا ہندوستان کو غلام بنانے کی راہ میں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی حیثیت ایک آہنی پھاٹک کی تھی، اس پھاٹک کو توڑے بغیر منزل مقصود تک رسائی ممکن نہ تھی، اس لئے انگریزوں نے نواب حیدر علی اور ٹیپو کے خلاف لڑائی چھیڑ دی، گونر مدراس محمد علی والا جاہ کو حکم دیا کہ جنرل اسمتھ کے ماتحت جانے والی انگریزی فوج کے ہمراہ محاذ پر پہنچ جائے، اس مشترکہ فوج نے میسور پر حملہ کر دیا، لیکن اس کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں بڑا تلخ نکلا، حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے دو طرف سے گھیر کر جنرل اسمتھ کی فوج پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ وہ زیادہ دیر میدان جنگ میں نہیں ٹھہر سکی، اور مورچہ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی خود جنرل اسمتھ پر اتنی دہشت سوار ہوئی کہ جب وہ محاذ جنگ سے بدحواس ہو کر بھاگا تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی اس میں ہمت نہیں رہی تھی اور اس نے مدراس پہنچ کر اطمینان کی سانس لی، انگریزوں کا زر خرید غلام محمد علی والا جاہ نے بھی اپنی فوج کے ساتھ بھاگ کر مدراس میں

جا کر پناہ لی۔

گورنر نے اب جنرل اسمتھ کے بجائے فوج کی کمان جنرل اَوڈ کو دی مگر وہ بھی میدان جنگ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا، اور جب اس نے فرار اختیار کیا تو سلطان ٹیپو اس کے تعاقب میں تھا اور جب وہ مڑ کر دیکھتا کہ شیر میسور دھاڑتا ہوا پیچھے آ رہا ہے تو اور تیز بھاگنے لگتا، یہاں تک کہ ٹیپو کی فوجیں مدراس تک پہنچ گئیں جو اس وقت انگریزوں کا کلکتہ کے بعد سب سے بڑا اور مضبوط مرکز تھا، مدراس پہنچ کر سلطان ٹیپو کی فوجوں نے انگریزوں کے قلعہ سینٹ جارج پر گولہ باری شروع کردی، اتفاق سے ایک گولہ ٹھیک اس جگہ گرا جہاں گورنر مدراس اور محمد علی والا جاہ جنگ کی حکمت عملی پر گفتگو کررہے تھے، گورنر مدراس پر خوف و ہراس سوار ہوگیا اور اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ساحل سمندر کی طرف بھاگا جہاں سمندر میں انگریزی جہاز کھڑے تھے، اس نے ایک جہاز میں جا کر پناہ لی، بدحواسی کا عالم یہ تھا کہ گورنر کو اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں تھا اس کی ٹوپی اور تلوار وہیں میز پر دھری رہ گئی ان کے اٹھانے کی بھی اس کو ہمت نہیں ہوئی، اگر سلطان چاہتا تو اسی دن جنوبی ہند سے انگریزوں کا صفایا کردیتا لیکن انگریزوں نے دست بستہ حاضر ہوکر صلح کی درخواست کردی اور سلطان نے اس کو منظور کرلیا۔

## انگریزوں سے دوسری جنگ:

سازش اور توڑ جوڑ انگریزوں کی ہمیشہ سے فطرت رہی ہے، انہوں نے صلح تو ضرور کرلی لیکن نیتوں میں فتور موجود تھا چونکہ اب وہ تجارت سے زیادہ فوجی پیش قدمی کو نفع بخش سمجھنے لگے تھے اور ان کے حوصلے اس حد تک بلند ہوچکے تھے کہ وہ پورے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے، اس لئے انہوں نے جوں ہی اپنی فوجی حالت کو درست کرلیا اور فریقین کے درمیان لکھے گئے صلح نامہ کی سیاہی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پھر انہوں نے اعلان جنگ کردیا، اب کی بار پوری

تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی شروع کی جنگ بکسر کے انگریز ہیرو سر ہکٹر منرو اور کرنل بیلی کو سلطان ٹیپو کے مقابلہ کے لئے منتخب کیا گیا وہ دونوں اپنی فوجوں کو لے کر میدان جنگ میں آ گئے، لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ ان کا خواب پھر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، حیدر علی اور ٹیپو نے انگریزی فوج کے پرخچے اڑا دیئے، کرنل بیلی کو گرفتار کر کے جیل میں رسی بٹنے اور چکی پیسنے کے لئے بھیج دیا گیا، کمانڈر کی گرفتاری کے بعد فوج کے مقابلہ کرنے کا کیا سوال؟ سر الفرڈ لائل اپنی تاریخ میں اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے:

''ہندوستان میں اس سے بڑھ کر مصیبت انگریزوں پر کوئی نہیں پڑی، جس میں دو ہزار انگریزی سپاہ اسیر ہو گئے، ان میں جنرل ڈیوڈ بیرڈ تھا جس نے بعد میں محاصرہ سرنگا پٹم ۱۷۹۹ء میں نام پیدا کیا''۔ (تاریخ سلطنت خداداد مطبوعہ لاہور ص:۱۴۲)

رسالہ ملٹری بیا گرافی مطبوعہ لندن اس جنگ کے سلسلے میں تحریر کیا گیا:

اس جنگ میں چار ہزار پانچ سو فرنگی سپاہی مقتول ہوئے، کرنل فلیچر بھی اس لڑائی میں مارا گیا، کرنل بیلی اور کپتان بیرڈ باقی ماندہ فوج کے ساتھ اسیر ہو گئے۔ (ص:۱۴۳)

یورپ کا رستم وافراسیاب اور جنگ بکسر کا ہیرو سر ہکٹر منرو کو جب اس شکست کی خبر ملی تو اتنا دہشت زدہ ہو گیا کہ وہ اپنی بڑی بڑی توپوں کو دریا میں پھینک کر سیدھا مدراس بھاگا، اور کہیں بھی رک کر مقابلہ کی بات نہیں سوچی، مگر ان تمام ذلت آمیز شکستوں کے باوجود انگریزوں کی سلطان ٹیپو کے خلاف سرگرمیاں جاری تھیں کیوں کہ جب تک حکومت میسور کو صفحہ ہستی سے مٹا نہیں دیا جاتا ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا کا قابو میں آنا ممکن نہیں اور اس ملک کو انگریزوں کی نوآبادی بنانے کا جو خواب برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ٹپ نے دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

انگریزوں کی اس دوسری فوج کی شکست کا صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت بن گیا مدراس کے گورنر ہاؤس ہی سے نہیں بلکہ پورے جنوبی ہند میں پھیلے ہوئے انگریزوں کے انگلستان لکھے جانے والے خطوط کا تانتا بندھ گیا اور لندن میں

گھر گھر ماتم کدہ بن گیا، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف پورے انگلینڈ میں نفرت اور غم وغصہ کا طوفان برپا ہو گیا کیوں کہ ان لڑائیوں میں جلیل القدر خاندانوں کے چشم و چراغ مارے گئے تھے، انگریزوں میں مایوسی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

## نواب حیدر علی کے بعد:

۱۷۸۲ء میں نواب حیدر علی کی وفات ہوگئی اور سلطنت خدا داد میسور کی زمام حکومت سلطان ٹیپو کے ہاتھوں میں آئی، چونکہ انگریزوں سے ہونے والی تمام لڑائیوں میں سلطان ٹیپو اپنے باپ حیدر علی کے ساتھ شریک رہا اور انگریزوں کو شکست دینے میں اس کی حکمت عملی کو بہت دخل تھا، اس لئے وہ انگریزوں کی فطرت سے خوب واقف تھا، سلطان ٹیپو نے اپنی فوجی طاقت کو مزید مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

اس کی حکومت کے ابتدائی چار پانچ سال تو انگریز خاموش رہے تا کہ ان کے زخم مندمل ہو جائیں، سلطان ٹیپو اس عرصہ میں انگریزوں کے کاسہ لیس یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے آلۂ کار بنے ہوئے نظام حیدر آباد اور مرہٹوں سے نبرد آزمائی کرتا رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس کا اصل حریف پھر سامنے آ گیا، اب بہت بڑی فوجی تیاریاں کی گئیں انگلستان کے مایۂ ناز سپوتوں کو فوج کی کمان دی گئی، گورنر مدراس سے لے کر گورنر جنرل تک کو بدل دیا گیا، کیوں کہ ان کی سرگرمیاں ٹیپو کے مقابلہ میں ناکام ثابت ہو چکی تھیں، اس لئے نئے سورماؤں کو فوج کی کمان دینے کی پالیسی تیار کی گئی کیوں کہ اس کے بغیر پرانے طریقہ کار سے سلطان ٹیپو کو شکست نہیں دی جا سکتی تھی اور اس کی موجودگی میں ہندوستان پر قبضہ کرنا اور اس کو غلام بنانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

## لارڈ کارنوالس:

اب تک ہندوستان میں گورنر جنرل کے عہدہ پر جنرل وارن ہسٹینگز تھا، اسی کے زمانے میں بنگال کے اندر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم مضبوطی سے جمے تھے لیکن اب

مقابلہ کمزور بنگالیوں سے نہیں شیر میسور سلطان ٹیپو سے تھا جو فولادی عزم وارادے کا ایک آہنی انسان تھا، اب دارن ہسٹینگر کا طریقہ کار مفید نہیں تھا بلکہ گورنر جنرل کو ٹیپو کو شکست دینے کیلئے دوسری راہیں تلاش کرنی تھیں اسلئے اس کو انگلستان بلایا گیا اور اس کی جگہ پر برطانوی وزیر اعظم مسٹر ٹپ نے لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل بنا کر بھیج دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب امریکہ نے انگلستان سے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لی تھی جس شخص نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو گنوایا تھا وہ خیر سے یہی لارڈ کانوالس تھا اس لئے برطانیہ کی نگاہ میں اس کا وقار زائل ہو چکا تھا، وزیر اعظم برطانیہ نے کارنوالس کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر ایک چانس دیا تا کہ وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم کر کے امریکہ کا داغ بدنامی دھو سکے، ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کارنوالس کیا کچھ نہ کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہوگا اس نے یہاں آکر زمام اختیار ہاتھ میں لے لی مدراس کے گورنر نے سلطان ٹیپو کے مقابلے میں پے در پے ہزیمتیں اٹھائی تھیں اور انگریزی فوج کا رعب داب ہلکا کر دیا تھا اس لئے اس کو ہٹا کر یورپ کا مایۂ ناز فرزند جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر بنا دیا گیا۔

ان دونوں نے یہاں آکر ہر طرف سازشوں کا پہلے جال بچھایا اور پھر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، کارنوالس نے انگریزی فوج کے ساتھ حیدرآباد کی ۶۰ ہزار فوج کو لے کر سلطنت میسور پر چڑھائی کر دی، اگلا دستہ کرنل فلائڈ کے تحت تھا، سلطان ٹیپو کی فوج سے سب سے پہلے اسی کی ٹکر ہوئی، سلطانی فوج سیلاب کی طرح آگے بڑھی اور زبردست گولہ باری کر کے کرنل فلائڈ کی فوج کو تتر بتر کر دیا، کرنل فلائڈ زخمی ہو کر گر پڑا، اور انگریزی فوج میدان چھوڑ کر فرار ہوگئی، سلطان ٹیپو نے چار سو انگریزی سپاہیوں کو گرفتار کر کے دارالسلطنت سرنگا پٹم کے جیل خانے میں بھیج دیا۔

دوبارہ کارنوالس نے ایک زبردست فوج تیار کی جس میں خود کارنوالس کے ماتحت ۲۲ / ہزار انگریزی فوج تھی اور دوسرے انگریز جنرل امبر کرامبی کے تحت نو ہزار حیدرآباد کی فوج، ۱۸ / ہزار مرہٹی فوج ہری پنتھ اور پرسرام راؤ کے ماتحت ۳۲ / ہزار تھی،

جملہ ۸۱ ہزار کا لشکر جرار لے کر دوبارہ سلطان ٹیپو سے نبرد آزما ہوا اور طوفان برق و باد بن کر سلطانی افواج پر چھا گیا، پھر بھی میسور کی فتح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، انجام کار فریقین میں کچھ دنوں کے لئے صلح ہوگئی اور کارنوالس کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی اور وہ اپنی بدنامی کا داغ نہ دھو سکا، اور ''بہت بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' کہتا ہوا ہندوستان سے رخصت ہوگیا، اور انگلینڈ میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔

## لارڈ ولزلی:

تقریباً تیس سالوں سے انگریز نواب حیدرعلی اور ٹیپو سلطان سے پنجہ آزمائی کرتے رہے تاکہ ہندوستان پر قبضہ کی راہ میں جو سنگ گراں حائل ہے اسے دور کردیں، لیکن ہزاروں انگریزوں کو جنگ کے دیوتا کی بھینٹ چڑھا کر بھی ان کی مراد پوری نہیں ہوئی اور بزورِ شمشیر اس کو میدانِ جنگ میں شکست نہ دے سکے، اس لئے لارڈ کارنوالس اور سرجان شور کو واپس بلا کر ایک سازشی ذہن کے انگریز کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا جس کا زرخیز دماغ سازشوں کا سرچشمہ تھا وہ تاریخ میں لارڈ ولزلی کے نام سے مشہور ہے، اس نے اپنے پیش رووں سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ بنگال میں میر جعفر کو سراج الدولہ سے غداری پر آمادہ کرکے قبضہ کیا گیا ہے تو اس نے سوچ لیا کہ یہ طریقہ کار اگر بنگال میں کامیاب ہوسکتا ہے تو میسور میں اس کے ناکام ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور اس نے فوجی طاقت میں اضافہ کے بجائے ضمیر فروشوں اور وطن دشمنوں کی سرگرمی سے تلاش شروع کردی، ضمیر فروشوں کی دنیا میں نہ کمی رہی ہے اور نہ آج ہے، انگریز ''جعفر از بنگال'' کا تماشہ دکھا چکے تھے اب ''صادق از دکن'' کا ڈرامہ شروع کردیا، میر صادق سلطان ٹیپو کا وزیر اعظم تھا اور اس ڈرامہ کا دوسرا ایکٹر پورنیا تھا جو وزیر خزانہ تھا، دونوں نے انگریزوں کے ہاتھوں اپنے ضمیر، اپنے وطن اور اپنے ایمان کا سودا کرلیا، میر صادق کے ساتھ ''میروں'' کے ایک جتھے میر قاسم علی، میر

معین الدین، میر غلام علی لنگڑا نے اور پورنیا کے ساتھ ترمل راؤ، کرشن راؤ وغیرہ کی ٹولی نے انگریزوں سے ساز باز کر لی اور دو انگریزوں کو رات میں بلا کر قلعہ کے سارے راستوں سے واقف کرادیا اور انگریزوں اور غداروں کے درمیان دوران جنگ کی حکمت عملی طے کر لی گئی۔

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے معتمد اور کلیدی عہدوں کے ذمہ داروں کو جب اپنا ہم نوا بنالیا تو یک بیک انگریزی فوجیں سیدھی دارالسلطنت سرنگاپٹم پہنچ جاتی ہیں، سلطان کے فوجی سردار جو دشمنوں پر نظر رکھنے کے لئے سارے راستوں پر متعین تھے ان میں سے کسی نے بھی انگریزی فوج سے مزاحمت نہیں کی بلکہ سلطانی افواج کے سردار دم ہلاتے ہوئے کتوں کی طرح انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے چل رہے، انگریزوں نے ٹھیک قلعہ کے سامنے پہنچ کر گولہ باری شروع کر دی، سلطان ٹیپو قلعہ میں محصور ہو گیا، اور اپنے وفادار سپاہیوں کے ساتھ مدافعت کرتا رہا، قلعہ کی فصیلوں سے دشمنوں پر گولہ باری جاری تھی کہ سازش کے تحت عین لڑائی کے وقت پورنیا نے مورچہ میں یہ خبر پہنچائی کہ سپاہی تنخواہیں لیجائیں اور وہ مورچہ چھوڑ کر چلے گئے، اور غدار افسروں نے توپ کے گولوں میں سن اور مٹی ملادی تھی اس لئے توپیں چلتی تھیں اور پٹاخوں کی طرح آواز کر کے سرد ہو جاتی تھیں، نتیجہ ظاہر ہے انگریزی فوج قلعہ میں گھس آئی اور سلطان ٹیپو دست بدست جنگ کرتے ہوئے اندرونِ فصیل شہید ہو گیا، پچاس سال پہلے بنگال میں میر جعفر کے ذریعہ سراج الدولہ کی حکومت کو انگریزوں نے تباہ کیا اور اس کے ٹھیک پچاس سال بعد میر صادق کو آلہ کار بنا کر ہندوستان کے مایہ ناز سپوت سلطان ٹیپو کے سینے میں خنجر اتار دیا گیا۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن
ننگ ایمان، ننگ دین، ننگ وطن

گاندھی جی نے سلطان ٹیپو کے ساتھ غداری کرنے والے پورنیا کے بارے میں اپنے انگریزی اخبار ''ینگ انڈیا'' کے ایک مقالہ میں لکھا تھا:

''میسور کا بادشاہ سلطان ٹیپو انگریز مورخوں کی نگاہ میں متعصب مسلمان تھا

جس نے اپنی ہندو رعایا کو بہ جبر مسلمان بنایا، لیکن یہ سب جھوٹ ہے......اس عظیم المرتبت سلطان کا وزیر اعظم ایک ہندو تھا، جس نے، نہایت شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے مجاہد آزادی اور فدائے وطن کو دغا دے کر ہندوستان کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ (تاریخ سلطنت خداداد مطبوعہ لاہور ص ۵۳۱)

## ہندوستان ہمارا ہے:

ضمیر فروش غداروں نے اس آہنی پھاٹک کو توڑ دیا جو ہندوستان کو غلام بنانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، شیر دل ٹیپو جس کو انگریزوں کی مجموعی طاقت میدان جنگ میں شکست نہ دے سکی، اس کو سازشوں کے جال میں جکڑ کر بے بس کر دیا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ سلطان ٹیپو اب اس دنیا میں نہیں رہا تو مدراس کے انگریزوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، تاریخ سلطنت خدا دا کا مصنف ہم کو بتا تا ہے کہ جب جنرل ہارس سلطان ٹیپو کی لاش پر آیا تو خوشی سے پاگل ہو گیا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''اب ہندوستان ہمارا ہے''۔ (ص ۳۱۸)

ہندوستان سے لے کر انگلینڈ تک جشن فتح منایا گیا، ۶ / فروری ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں جشن فتح کے سلسلے میں جس شان کا جلوس نکالا گیا، اب تک ہندوستان میں انگریزوں کا اس شان کا کوئی جلوس نہیں نکلا تھا، سر جان انیس ٹروتھر جو اس وقت کلکتہ کا چیف جسٹس تھا اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

''ٹیپو کی طاقت ہی ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی، یہ اس زمانے میں خاص طور پر قابل توجہ تھی اس کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔ (ص ۱۷)

## انگریزوں کا انتقام:

سلطان ٹیپو کے نام سے قصر بکھنگم میں زلزلہ آجا تا تھا، دہشت و مرعوبیت کا عالم

یہ تھا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے بچوں کو ڈرانے کیلئے کہتی تھیں، ''دیکھو، سو جاؤ، ورنہ ٹیپو آرہا ہے، تمہیں کھا جائے گا'' مارے غصے کے انگریز اپنے کتوں کے نام ٹیپو رکھتے تھے، انگریزوں کی محفلوں میں ٹیپو کا نام آتے ہی ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا تھا اور ان کی پیشانیوں پر سلوٹیں پڑ جاتی تھیں، نفرت وغصہ سے ان کے چہرے اور سرخ ہو جاتے۔

سلطان ٹیپو کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں کو لوہے کے چنے چبانے پڑے اس لئے کہ دو بار حیدر علی اور ٹیپو نے انگریزی فوجوں کو ساحل سمندر تک کھدیڑ دیا تھا، اگر ان دونوں نے سانپ کے پھن کو اسی دن کچل دیا ہوتا جب کہ وہ ہر طرح ان پر قابو پا چکے تھے تو شاید ہمارا ملک غلامی کی ذلت میں گرفتار ہی نہیں ہوتا، ہزاروں انگریز حیدر علی اور ٹیپو سے ہونے والی چار لڑائیوں میں مارے گئے، کتنے انگریز جنرلوں اور کرنلوں کو ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' چاٹ گئی، جس کی وجہ سے انگلینڈ کے ہزاروں خاندانوں میں صبح وشام سلطان ٹیپو کو گالیاں دی جاتی تھیں، آگ اور خون کے کتنے دریا پار کر کے انگریز اپنی منزل پر پہنچے؟ اور جب وہ اپنی مشکلات اور مصائب کو یاد کرتے ہیں تو ان کے دل سلطان کے خلاف نفرت اور غم وغصہ سے بھر جاتے ہیں اسی غم وغصہ کا نتیجہ ہے کہ ایک درجن انگریزوں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی زندگی پر کتابیں لکھیں اور ہر کتاب میں یہ کوشش کی گئی کہ سلطان ٹیپو کو زیادہ سے زیادہ بدنام کر دیا جائے، اس کے علاوہ ان کو ٹیپو سے انتقام لینے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آئی، لیکن جب سچائی کی تلاش کی جاتی ہے تو انگریزوں کی دروغ بیانی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

انگریز مصنّفین نے مسلمان حکمرانوں میں اورنگ زیب کے بعد جس شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے اپنے قلم کی نوک سے زہر میں بجھے ہوئے تیروں اور نیزوں کا کام لیا ہے وہ یہی سلطان ٹیپو ہے، آج ہمارے ملک میں تنگ نظر، تنگ دل، فرقہ پرست انگریزوں کا چبایا ہوا لقمہ چبا رہے ہیں اور ان کی کتابوں سے جھوٹے الزامات کو لے کر سلطان ٹیپو کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی حکومت کی پالیسی کے پیش نظر ہندو، مسلم کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع سے وسیع

تر بنانے کے لئے یہ کتابیں لکھی تھیں جس میں سچائی کم اور فرضی الزامات زیادہ ہیں، تاریخی حقائق ان کی نفی کرتے ہیں، افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کو آزاد ہوئے چالیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن آج تک برادران وطن بالخصوص تنگ دل، فرقہ پرست انگریزوں کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکے، یہ بہت ہی عبرتناک المیہ ہے۔

ہم سلطان ٹیپو کی زندگی کے سلسلہ میں کچھ حقائق پیش کرتے ہیں جن سے اس کی عظمت کا اندازہ ہوگا اور اگر آپ انصاف پسند دل کے مالک ہیں، اور صداقت کے تسلیم کرنے کو انسانیت کا ایک شرف سمجھتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل پکار اٹھے گا کہ سلطان ٹیپو ہندوستان کا ایک قابل فخر حکمراں تھا، جس نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنے عظیم و بے مثال مجاہدانہ کارناموں کی بدولت اس کا حق رکھتا ہے، کہ آزاد ہندوستان کے پارلیمنٹ ہاؤس کے میدان میں اس کا مجسمہ نصب کیا جائے۔

## سرزمین میسور آواز دیتی ہے:

چونکہ انگریزوں نے اپنی کتابیں نفرت اور غم وغصہ کی فضا میں لکھی ہیں اس لئے انہوں نے دانستہ حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور سلطان ٹیپو کے محاسن کو مثالب کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، ان حالات میں انگریز مصنّفین کی تاریخوں پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس لئے سچائی اور اصل حقیقت کی تلاش کے لئے ہمیں دوسرے راستے اختیار کرنے پڑیں گے، اس لئے آیئے سرزمین میسور کا سفر کریں، محکمہ آثار قدیمہ کا جائزہ لیں، مندروں میں چلیں اور ان کے محفوظ ریکارڈوں کا معائنہ کریں، ان کے درودیوار اور ان کے گنبدوں سے سوالات کریں یقیناً وہ ہم کو صحیح جوابات دیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سلطان ٹیپو کو دیکھا ہے وہ اس سے براہ راست واقف ہیں، میسور گزیٹر کے رجسٹروں کو کھنگالیں، میسور آرکولاجیکل کی طرف سے شائع ہونے والی رپورٹوں کا باریک بینی سے تجزیہ کرلیں، صداقت مل کر

رہے گی، رات چاہے کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو اگر ایک بھی جگنو کہیں چمک رہا ہوگا تو ضرور نظر آ جائے گا۔

## ٹیپو پر الزامات کی فہرست:

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کو بدنام کرنے کے لئے دو باتیں بڑے شد و مد سے بیان کی ہیں جن سے ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے کیوں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کی حکومت ایک دن بھی نہیں چل سکتی تھی۔

پہلا فرد جرم یہ ہے کہ سلطان ٹیپو سخت متعصب مسلمان تھا، اس نے مندروں کو ڈھایا اور منہدم کرایا ہے یا جلایا ہے؟ اس کا دوسرا جرم یہ تھا کہ اس نے ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنایا ہے، ہم انہیں دونوں اتہامات کا جائزہ لیتے ہیں اور خود سرزمین میسور سے اس کے متعلق سوال کرتے ہیں، دیکھئے وہ کیا جواب دیتی ہے؟

## ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطان ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا، سچا مسلمان پیدائشی طور پر بہترین حکمراں ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ اصول حکمرانی جانتا ہے، اسلام نے بہت تفصیل سے اس کو آداب حکومت سکھائے ہیں اس لئے جو جتنا ایماندار، سچا اور مخلص مسلمان ہوگا اتنا ہی اس کا طرز حکمرانی مثالی ہوگا اور اس ملک کے باشندوں کے لئے چاہے وہ کسی قوم اور مذہب و ملت کے ہوں اس کا دور حکمرانی سراپا رحمت ہوگا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکمرانی کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے، پورا یورپ بھی اگر اپنے دل و دماغ کی ساری غلاظتوں کو اگل دے تب بھی حضرت عمر فاروقؓ کے صاف و شفاف دامن پر دھبہ نہیں پڑ سکتا ہے اس لئے اگر سلطان ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا تو یہ عیب کیسے ہوگیا؟ انگریز مصنّفین نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کو

متعصب کہا ہے جب کہ نواب حیدرعلی اور سلطان ٹیپو کی پوری زندگی سے اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں جاسکتی بلکہ اس کے برعکس دونوں کی غیر جانبداری، مذہبی رواداری کی درجنوں ناقابل تردید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، موافق ومخالف دونوں طرح کی کتابوں کوطاق پر رکھ دیجئے اور آیئے ہم خود سرزمین میسور چلتے ہیں، اس کی شہادت ہی ہمارے لئے فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

## حیدرعلی کا عہد حکومت:

نواب حیدرعلی کا عہد حکومت مذہبی رواداری اور غیر جانبداری کے لئے سرزمین میسور میں زبان زد خلائق تھا، اس کا پرائیویٹ سکریٹری ایک ہندو کھنڈرے راؤ تھا جو برہمن تھا اور جلوت وخلوت میں اس کے ساتھ رہتا تھا، اس کے مقرب ترین وزیروں میں کشن راؤ اور پورنیا مشہور ہیں، ان کے علاوہ ریاست میسور کے ہندو زمینداروں جاگیرداروں اور علاقہ داروں پر اس کا اتنا اعتماد تھا کہ اکثر سیاسی مجرمین اور انگریزی قیدیوں کو انہیں کی نگرانی میں رکھتا تھا اور وہ بھی حیدرعلی کے اتنے وفادار تھے کہ کبھی یہ اعتماد مجروح نہیں ہوا، مذہبی رواداری کے سلسلہ میں یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ میسور میں جتنے قدیم مندر تھے سب کی جاگیروں کو نہ صرف یہ کہ بحال رکھا بلکہ اپنی طرف سے بھی جاگیریں دیں اور انعامات دیئے جن کی اسناد آج تک ان مندروں میں محفوظ ہیں، اور تاریخ میسور پر تحقیق کرنے والوں میں سے بہت سے محققین نے ان سندوں کو حاصل کر کے اپنی کتابوں میں نقل بھی کیا ہے، خود گاندھی جی نے اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' کی اشاعتوں میں ان سندوں اور دستاویزوں کا ذکر کیا ہے اور ان خطوط کا خلاصہ لکھا ہے جو ان مندروں کے مہنتوں اور گروؤں کو لکھے گے ہیں، یہ اسناد ودستاویز اور خطوط آج بھی ان مندروں میں موجود اور محفوظ ہیں اور ان کو دیکھا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ میسور محکمہ آثار قدیمہ کی جو سالانہ رپورٹیں شائع ہوتی رہی ہیں ان میں بھی ان سندوں کا ذکر موجود ہے مثلاً میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۴ء میں

ہے کہ:

۱- دیون ہلی کے مندر میں جو ناقوس استعمال میں ہے وہ نواب حیدر علی کا عطیہ ہے۔

۲- میسور آرکولاجیکل رپورٹ ۱۹۱۶ء کے صفحہ ۳۷ پر حیدر علی کے ایک خط کا ذکر ہے جو مندر کے گرو کے نام لکھا گیا تھا جو مطلّا و مذہّب ہے۔(ص ۱۶۷)

۳- سری نگر کے مندر میں نواب حیدر علی کی لکھی ہوئی سندیں موجود ہیں جو بطور ریکارڈ محفوظ ہیں ان میں ایک وہ خط ہے جو نواب نے ۱۷۶۹ء میں یہاں کے گرو کو لکھا تھا، اس میں نواب نے تحریر کیا تھا:

''آپ کی شخصیت واجب التعظیم اور آپ کا تقدس باعث برکت ہے، یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ہر شخص کے دل میں آپ سے ملنے اور سعادت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو، معلوم ہوا ہے کہ صاحب رگھوناتھ راؤ پیشوائے پونا آپ سے ملنا اور آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ کو ان کے پاس بغرض ملاقات بھیجا جائے اس لئے اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ پونا تشریف لے جا کر صاحب موصوف کی خواہش کو پورا کریں، آپ کے اس سفر کے لئے ایک ہاتھی، ایک پالکی، پانچ گھوڑے اور پانچ اونٹوں کا انتظام کر دیا گیا ان کے علاوہ دیوتا کے لئے زریں کپڑے، آپ کے علَم کے لئے پانچ ریشمی تھان اور خاص آپ کے لئے خلعتیں اور ایک جوڑی شال بھی ارسال خدمت ہے، اخراجات سفر کے لئے ساڑھے دس ہزار روپے ارسال ہیں۔(ص ۱۶۹)

یہ ایک بادشاہ وقت کا خط ہے اس کا طرز خطاب اور لب ولہجہ خاص طور سے قابل توجہ ہے، بادشاہ کی طرف سے کسی مکتوب الیہ کے لئے جو اس کی رعایا میں ہے درخواست کرنے کا جملہ لکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن نواب حیدر علی اپنی حکومت میں رہنے والے ایک غیر مسلم گرو کے لئے وہی الفاظ استعمال کرتا

ہے جو ایک خادم اپنے مخدوم کے لئے استعمال کرتا ہے، کیا اس مذہبی رواداری کی کوئی دوسری مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی ہندو دشمن اور مندروں کو ڈھانے والے کا یہ طرز عمل ہو سکتا ہے؟؟

۴- اسی میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء کے صفحہ ۷۳ میں نواب حیدر علی کے ایک دوسرے خط کا بھی ذکر ہے جو مندر میں موجود ہے، یہ خط سوامی ابھینو انرسمہا بھارتی کے نام ہے، جس میں سوامی جی کی طرف سے لکھے گئے خط اور ان کے تحفوں کی وصولیابی کا ذکر ہے، اور گرو جی کو یقین دلایا گیا ہے کہ مندر کے نام جو انعام ہیں وہ بحال رکھے جائیں گے اور سوامی جی سے درخواست کی گئی ہے کہ آپ بہ اطمینان مندر میں اقامت کریں اور سرکاری تحائف جو ارسال کئے جا رہے ہیں ان کو قبول فرمائیں۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۱۶۹)

۵- اسی سال کی رپورٹ میں ایک اور خط کا بھی ذکر ہے، یہ خط ۱۷۸۰ء کا ہے، یہ ایک حکمنامہ ہے جو سرکاری حکام کو لکھا گیا ہے اور مندر کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس میں حکومت کے اہل کاروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ سری نگر مندر کی جاگیروں میں مندر کے ملازم اپنی جانب سے جو محصولات وصول کرتے ہیں ان میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کی جائے، اس حکم نامہ پر حیدر علی کی مہر اور سنہ ہجری لکھا ہوا ہے۔ (تاریخ سلطنت خداداص: ۱۷۰)

۶- سری رنگا پٹم (دارالحکومت) کا سب سے بڑا مندر جو سری رنگناتھ جی کے نام سے مشہور ہے، نواب حیدر علی کا بنوایا ہوا ہے، اس کے لئے میتھک سوسائٹی جرنل ماہ اپریل ۱۹۳۹ء کا شمارہ دیکھا جائے، اس کے ۴۵۴ پر یہ تحریر ہے:

''۱۷۷۴ء میں قدیم الدین خاں نامی ایک شخص کے گھر میں آگ لگ گئی جس کی وجہ سے بہت سی جانوں کے اتلاف کے علاوہ سری رنگناتھ کا مندر بھی جل کر تباہ ہو گیا''۔

حیدر علی نے اس مندر کو دوبارہ تعمیر کیا‘‘۔ (ص۱۷۰)

۷- اسی جرنل میں اپی گرافی کرناٹکا جلد پنجم صفحہ ۳۷ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا گیا ہے، کہ ’’بیلور میں گنگا سیوا کے مندر کا درمیانی قبہ حیدر علی کا تعمیر کردہ ہے۔‘‘

حیدر علی کی حکومت میں مذہبی رواداری اور وسعت ظرفی کی یہ چند ایسی ٹھوس اور مضبوط شہادتیں ہیں کہ اس سے متعصب سے متعصب انسان بھی انکار نہیں کرسکتا، اگر حیدر علی اور سلطان ٹیپو متعصب مسلمان تھے تو انہوں نے اپنے غیر مذہب کے مندروں کی تعمیر میں کیسے حصہ لیا؟ یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ انگریز مورخین کا گھڑا ہوا افسانہ ہے جن کا ذہن ومزاج خود تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور دانستہ جھوٹ بولتے ہیں، ان کے طبع زاد افسانوں کی تردید کے لئے یہ حقائق کافی ہیں، ہم یہ تو بلاتکلف تسلیم کرتے ہیں کہ حیدر علی اور ٹیپو سچے اور پکے مسلمان تھے انہوں نے یہ کام مداہنت کی وجہ سے اور مذہبی عقیدے میں کمزوری کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اصول حکمرانی کے تحت کیا ہے، ایک سچا مسلمان حکمران اپنے حدود حکومت میں آباد ہر فرقہ اور ہر مذہب کی عبادت گاہوں کا محافظ ہے، اس کا مذہب اس کو اس سے نہیں روکتا ہے، حیدر علی نے جو کچھ کیا وہ اس کی حکومت کی طرف سے عائد ایک فرض کی ادائیگی تھی۔

کہا یہ جارہا تھا کہ باپ بیٹوں نے ہندو مندروں کو منہدم کیا ہے، یہاں انہدام کے بجائے تعمیر، ویرانی کے بجائے آبادی، مندروں کی جائداد کی ضبطی کے بجائے تحائف، انعامات اور مالی امداد کا ثبوت ملتا جارہا ہے، انصاف اور انسانیت وشرافت کا تقاضا ہے کہ انگریز مورخین کی جوش انتقام میں پھیلائی ہوئی افواہوں کی تردید ان لوگوں کی طرف سے ہونی چاہئے جن کے دلوں کو ان جھوٹی افواہوں اور کہانیوں سے دلی تکلیف پہنچی ہے، کیا ہماری یہ توقع صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ الیس منکم رجل رشید؟

## سلطان ٹیپو کے عہد حکومت میں:

حیدر علی سے کہیں زیادہ اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کی ذات کو نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کی ذات پر الزامات واتہامات کا طومار باندھ دیا گیا ہے لیکن جب ہم ان الزامات کی تحقیق کے لئے سرزمین میسور میں پہنچتے ہیں تو وہاں کا ذرّہ ذرّہ ان افسانوں اور جھوٹی افواہوں کے خلاف شہادت دیتا ہے، اور بے لچک گواہی دیتا ہے کہ سلطان ٹیپو کا دامن بے داغ اور ان سارے الزامات واتہامات کے دھبوں سے قطعاً پاک اور صاف شفاف ہے، چند شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہم سب سے پہلے سری نگری کے مندر چلتے ہیں، یہ مندر تمام جنوبی ہند اور خاص طور پر ریاست میسور میں نہایت متبرک اور مقدس مانا جاتا ہے، یہاں کے گرو اکثر راجاؤں اور مہاراجوں کے مذہبی رہنما اور گرو سمجھے جاتے رہے ہیں، ہندوؤں کی سب سے بڑی حکومت وجیانگر کے راجاؤں کی پیشانیاں اسی مندر کی چوکھٹ پر جھکتی تھیں اور اس کے گرو کو اپنا گرو مانتے رہے ہیں، سری نگری کے اس مندر میں آج تک حیدر علی کے تین اور سلطان ٹیپو کے تیس خطوط اور فرامین موجود ہیں، جیسا کہ میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء میں صراحت کی گئی ہے، خود گاندھی جی نے ان خطوط اور فرامین کو دیکھا ہے اور اپنے اخبار ’’ینگ انڈیا‘‘ میں ایک شاندار اور مدلل مضمون سلطان ٹیپو کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری پر سپرد قلم کیا ہے۔

یہ تمام خطوط اور فرامین سرخ کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں اور اکثر خطوں پر سلطانی مہر لگی ہوئی ہے ان خطوط میں بخلاف دوسرے خطوط کے جن میں سلطان کا نام پہلے لکھا جاتا تھا، سلطان نے سری نگری کے گرو کا نام اور القاب پہلے لکھا ہے اور اپنے نام کے ساتھ کوئی خطاب یا القاب استعمال نہیں کیا ہے، ان خطوں میں سے ایک خط گرو جی کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے گرو جی نے سلطان کے نام اپنے خط میں مندر پر پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا ہے، مرہٹے جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں ان کی فوج پرسرام بھاؤ

کے ماتحت سری نگری پہنچی اس نے پوری آبادی کو تاخت و تاراج کیا اسی کے ساتھ سری نگری کے اس مشہور مندر کو بھی لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا اور سارا دیوی کا بت مندر سے نکال کر باہر پھینک دیا تھا، مندر کے جملہ نقصان کا اندازہ ساٹھ لاکھ روپیہ بتایا گیا تھا، مندر کے ہاتھی، گھوڑے اور سونا چاندی اور زیورات وغیرہ مرہٹی فوج لوٹ کر لے گئی تھی اس خط کے جواب میں سلطان ٹیپو نے گروجی کو تحریر کیا ہے کہ:

۸- ''ہم ان دشمنوں کو سزا دے رہے ہیں جو ہمارے ملک پر چڑھائی کر کے ہماری رعایا کو ستا رہے ہیں، آپ کی ذات تقدس مآب اور تارک الدنیا ہے، اس لئے آپ اور مندر کے دوسرے برہمن بھی ملک کے دشمنوں کی تباہی کے لئے دعا کریں کہ ہمارا ملک محفوظ اور ہماری رعایا خوش و خرم رہے''۔

(تاریخ ص ۵۲۲)

گروجی نے اپنے دوسرے خط میں سلطان کو لکھا تھا کہ میں فی الحال دوسری جگہ اقامت گزیں ہوں، مرہٹوں نے بہت سے برہمنوں کو قتل کیا ہے اور زخمی کیا ہے، اور سارا اثاثہ لوٹ کر لے گئے ہیں، اب بغیر حکومت کی مدد کے سارا دیوی کا بت دوبارہ مندر میں نصب نہیں کیا جا سکتا، اس کے جواب میں سلطان ٹیپو نے گروجی کو لکھا کہ:

۹- ''ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے سے باز نہیں آتے یقین ہے کہ اس کالی یوگ میں انہیں بہت جلد اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ملے گا، لوگ بدی کا کام ہنستے ہوئے کرتے ہیں لیکن خمیازہ روتے ہوئے بھگتیں گے، گرووٗں سے دغابازی خود اپنی نسل کو منقطع کرتا ہے''۔ (تاریخ ص ۵۲۲)

۱۰- اس خط کے ساتھ سلطان نے ایک حکم نامہ نگر کے آصف کے نام بھیجا تھا جو ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس میں حاکم علاقہ کو حکم دیا گیا تھا کہ دوسو راحتی (سلطانی اشرفی) نقد اور دوسو راحتی (اشرفی) کی اجناس فوراً گروجی کی خدمت میں پیش کرے۔

۱۱-   سلطان ٹیپو نے جب گرو جی کی بے سروسامانی کی اطلاع ان کے خط سے پائی تو ایک خط میں گرو جی کو لکھا کہ:

''آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی ضرورت ہو حاصل کریں اس رقم اور جنس سے سارادیوی کے بت کو نصب کرتے ہوئے برہمنوں کو کھانا کھلائیں اور دشمنوں کی تباہی کے لئے دعا کریں''۔ (تاریخ ص:۵۲۲)

۱۲-   ایک اور خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو تحریر کیا ہے کہ ''آپ کا بھیجا ہوا پرساد اور شالیں موصول ہوئیں آپ کے استعمال کے لئے ایک جوڑی شال اور سارادیوی کے بت کے لئے کپڑے روانہ کئے جاتے ہیں۔ (ص۵۲۳)

۱۳-   ایک خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو اطلاع دی ہے کہ آپ کی خاص سواری کے لئے ایک ہاتھی روانہ کیا جارہا ہے، گرو جی نے سلطان ٹیپو کو خط لکھا کہ مندر میں دو خاص پوجا کی رسمیں ادا کی جانے والی ہیں حکومت سے امداد کی درخواست ہے کیوں کہ یہ پوجا ۴۸ دنوں تک مسلسل چلے گی اور اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں، سلطان نے درخواست کو منظور کرتے ہوئے لکھا کہ:

۱۴-   آپ کی حسب مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی دینے کے متعلق نگر کے آصف کو حکم بھیج دیا گیا ہے۔

(تاریخ سلطنت خداداد ص:۵۲۳)

۱۵-   پوجا کے انتظامات کے سلسلہ میں جو حکم نامے جاری ہوئے تھے اور حکام کو سلطان کی طرف سے ہدایات دی گئی تھیں یہ تمام کاغذات بھی ریکارڈ میں محفوظ ہیں، ایک حکم نامہ میں نگر کے آصف محمد رضا کو ہدایت دی گئی ہے کہ:

''پوجا کے دنوں میں خاص انتظام رکھے تاکہ شریر لوگ مندر کے کاموں میں مداخلت نہ کرسکیں''۔

۱۶-   ایک دوسرے خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو خبر دی کہ:

''سارادیوی کے بت کے استعمال کے لئے ایک پالکی اور گرو جی کے استعمال

کے لئے دوسری پالکی بذریعہ چوبدار فقیر محمد روانہ کی جاتی ہے۔(ص۵۲۳)

۱۷- ریکارڈ میں سلطان کا ایک اور خط ہے جس میں نگر کے آصف کو حکم دیا گیا ہے کہ:

وانمباڑی قوم (جو ایک خانہ بدوش ہندو قوم ہے اور جنگلوں میں رہتی ہے اور لوٹ کھسوٹ کرتی رہتی ہے) کے حملوں سے مندروں کو محفوظ رکھنے کے لئے پیادہ فوج کے سپاہیوں کو مندر کی حفاظت پر مامور کر دیا جائے تا کہ وہ حملہ آور نہ ہو سکیں اور مندر کو نقصان نہ پہنچائیں۔

۱۸- مندر کے ریکارڈ میں سلطان کا ایک اور خط ہے جس میں شہر کے حاکم کو سلطان ٹیپو نے تحریر کیا ہے کہ:

''سوامی جی سمندری غسل کے لئے جانے والے ہیں ان کے لئے سفر میں تمام ضروریات مہیا کی جائیں''۔(ص۵۲۴)

۱۹- ایک خط میں سلطان نے گرو جی کو اطلاع دی ہے کہ آپ کے استعمال کے لئے چاندی کے دو چنور ارسال کئے جارہے ہیں (ص۵۲۴) سوامی جی نے سلطان ٹیپو کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا کہ وہ پونا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مرہٹے جو مندر کا سامان لوٹ کر لے گئے ہیں اس کی واپسی کے لئے وہ خود پرسرام بھاؤ کے پاس جانا چاہتے ہیں تا کہ اس سے درخواست کریں کہ مرہٹی فوج نے مندر کے جو سامان لوٹ لئے ہیں ان کو واپس کر دیا جائے، اس کے جواب میں سلطان نے سوامی جی کو پروانہ راہداری دیتے ہوئے عمالان حکومت کو لکھا کہ

۲۰- ''دورانِ سفر سوامی جی کو ہر قسم کا آرام اور تمام ضروریات مہیا کی جائیں''۔

۲۱- سوامی جی کو سلطان نے ایک خط میں لکھا کہ آپ کے استعمال کے لئے شالیں، ہاتھی، نوبت ونقارہ اور علم بطور نذرانہ ارسال خدمت ہے پلیٹ ۱۷

نمبر۳ میں سلطان کا ایک خط اور بھی ہے، یہ خط سوامی جی کو اس وقت لکھا گیا جب سوامی جی کو پونا میں پرسرام بھاؤ کے پاس گئے ہوئے زیادہ عرصہ گذر گیا اور کشود کار کی کوئی شکل نہ بن سکی اس لئے واپسی میں توقع سے زیادہ تاخیر ہوئی تو سلطان نے لکھا کہ

۲۲- "آپ جگت گرو ہیں، آپ دنیا کی بھلائی کے لئے ہمیشہ عبادت میں لگے رہتے ہیں، جس ملک میں آپ جیسی مقدس ہستی موجود ہو اس ملک پر خدا کی رحمت ہوتی ہے بارش اچھی اور فصلیں عمدہ ہوتی ہیں، آپ کو ایک غیر ملک میں اس قدر عرصہ ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے آپ اپنا کام نمٹا کر اپنے ملک واپس آجائیں۔

سوامی جی نے پونا سے سلطان کو لکھا تھا کہ مندر کی طرف سے برہمنوں کو جو کھانا کھلایا جاتا رہا ہے وہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے بند نہ ہو جائے بلکہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے اس کے جواب میں سلطان نے سوامی جی کو تحریر کیا۔

۲۳- "آپ کی ہدایت کے مطابق چھتروں (سراؤں) میں برہمنوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے، آپ اپنی خیریت سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہیں"۔ (تاریخ سلطنت خداداد، ص ۵۲۵)

۱۷۹۸ء میں سوامی جی نے سلطان ٹیپو کو مطلع کیا کہ وہ پونا سے واپس آنے والے ہیں، اس کے جواب میں سلطان نے اپنے افسروں کے نام جو حکم نامہ جاری کیا ہے وہ بھی مندر کے رکارڈ میں محفوظ ہے اس حکم نامہ میں ہے:

۲۴- "راستے میں سوامی جی کی تمام ضروریات فراہم کرتے ہوئے ان کے تمام اعزاز و مراتب کا لحاظ رکھا جائے"۔ (ص ۵۲۵)

سوامی جی جب سرنگری واپس آئے تو سلطان نے ان کو خط لکھا تھا جو ریکارڈ میں محفوظ ہے اس میں سوامی جی کو لکھا گیا کہ:

۲۵- "پایہ تخت سرنگا پٹم میں تشریف لا کر درشن دینے کی زحمت فرمائیں"۔

(ص ۵۲۵)

سرنگری کے مشہور مندر میں جو ۳۳ خطوط وفرامین نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے محفوظ ہیں ان میں سے نصف کے مندرجات کی طرف میں نے مختصر اشارے کئے ہیں، یہ خطوط وفرامین عرصہ گذر جانے کے باوجود محفوظ تھے اور اسی مندر سے اجازت لے کر دوسری سرکاری رپورٹوں، محکمہ جاتی کارروائیوں اور تحقیقی کام کرنے والوں نے اپنے مقالوں میں ان خطوط وفرامین کو نقل کیا ہے، ان کی موجودگی میں اگر کوئی تنگ نظر سلطان ٹیپو کی مذہبی رواداری کا قائل نہیں ہوتا اور اس کی وسعت ظرفی اور عالی ظرفی کا معترف نہیں ہوتا تو اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ سورج نصف النہار پر ہے اور دن کے وجود سے جو انکار کرتا ہے وہ آنکھ کا ہی اندھا نہیں عقل کا بھی اندھا ہے، اس کو متعصب اور ہندوؤں کا دشمن اور مندر کو تباہ وبرباد کرنے والا کہتا ہے تو وہ خود اندھا متعصب اور انسانیت وشرافت سے عاری، صداقت ودیانت کا دشمن اور بزدل انسان ہے کہ سورج کی طرح چمکتی ہوئی صداقتوں کو تسلیم کرنے کی اس میں جرأت وہمت نہیں ہے۔

## کچھ دوسری شہادتیں:

یہ ۳۳ خطوط وفرامین ہی تنہا سلطان ٹیپو کو آفتاب وماہتاب بنانے کے لئے کافی ہیں لیکن مزید کچھ شہادتیں اور پیش کی جاتی ہیں تاکہ وہ لوگ جو سچائیوں کو انگلیوں سے چھو کر بھی ان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، دمکتا ہوا سورج ان کے سروں پر ہوتا ہے لیکن دن کے وجود سے ان کا انکار جاری رہتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ سچائیوں اور صداقتوں کا تپتا ہوا سورج ان کے سروں پر اپنی تیز کرنیں بکھیرتا رہے تاکہ سورج اور دن کے وجود سے وہ انکار بھی کریں تو کم از کم سورج کی تمازت سے ان کا بھیجہ ہمیشہ کھولتا رہے۔

ریاست میسور مندوروں کی راجدھانی ہے، ہندوستان میں جن مندروں کی شہرت ہے ان میں سے کئی ایک میسور میں ہیں، میسور میں داخل ہوتے ہی سب سے زیادہ جو عمارتیں ہر جگہ نمایاں نظر آئیں گی وہ ہندوؤں کی قدیم پوجا پاٹ کی عمارتیں اور بلند و بالا مندر ہوں گے، ان میں سے بعض مندروں کی تعمیر ہزار سال پہلے کی ہے لیکن حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے کسی ایک مندر پر غلط نگاہ نہیں ڈالی بلکہ اس کے برعکس بہت سے مندروں کو ہدایا و تحائف دیئے، جاگیریں اور انعامی گاؤں دیئے، میسور کے بیشتر مندروں میں سلطان ٹیپو کی یادگاریں دوسو برس گذر جانے کے باوجود آج بھی موجود ہیں اور استعمال میں لائی جاتی ہیں اس سلسلہ میں صرف دو شہادتوں کو کافی سمجھتا ہوں، یہ دونوں محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے شائع ہونے والی رپورٹیں ہیں ان میں سے ایک میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء کی ہے اور دوسری رپورٹ ۱۹۱۷ء کی ہے، ۱۹۱۶ء کی رپورٹ میں میل کوٹ کے مندر کا ذکر ہے اس رپورٹ کے صفحہ ۶۷ پر ایک صراحی نما نقشہ دیا گیا ہے، یہ نقش اس نقارے پر ہے جو سلطان نے مندر کے استعمال کے لئے دیا ہے، تاریخ سلطنت خداداد کے مصنف کا بیان ہے کہ میری اس تصنیف کے وقت بھی یہ نقارہ مندر میں استعمال کیا جارہا ہے یہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے اس نقارہ پر اس کے بنانے کی تاریخ، اس کا وزن اور سلطان کا نام تحریر ہے۔

۲۷- ۱۹۱۷ء کی رپورٹ میں صفحہ ۲۱ پر ہے کہ میل کوٹ کے مندر میں بعض زیورات اور سونے چاندی کے برتن پائے گئے ہیں ان پر جو تحریر ہے اس کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ سلطان ٹیپو کے دیئے ہوئے انعامات ہیں۔

۲۸- اسی رپورٹ کے صفحہ ۵۹ پر ہے کہ موضع کلالی KALALI تعلقہ تنجن گڈھ میں لکشمی کنتا کے مندر میں چاندی کے چار پیالے، ایک طبق، اور ایک گلدان موجود ہے جو ٹیپو سلطان نے اس مندر کو دیئے تھے۔

۲۹- اسی علاقہ کے نارائن سوامی کے مندر میں ایک چاندی کا گلدان ہے جس پر ''عطیہ سلطان ٹیپو'' لکھا ہوا ہے۔

۳۰- دارالسلطنت سرنگاپٹم کا سب سے بڑا مندر حیدر علی کا تعمیر کردہ ہے، اس مندر کے استعمال کے لئے جو کپڑے اور برتن ہیں سب سلطان ٹیپو کے عطیے ہیں۔

## ینگ انڈیا کا اعتراف:

''ینگ انڈیا'' گاندھی جی کا مشہور اخبار ہے جو انگریزی میں شائع ہوتا تھا تاریخ میسور کے مصنف نے اپنی کتاب میں اس کے ایک مضمون کا ترجمہ دیا ہے، اس مضمون میں مالابار کے ایک مشہور مندر گروایور سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ:

۳۱- ''مالا بار میں گروایور کا مندر بہت پرانا اور مشہور ہے، مالابار کے ہندوؤں کا اگر اس کو کعبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، ہزاروں خوش اعتقاد اس کی زیارت کے لئے دور دور سے آتے ہیں، ٹیپو سلطان جب مالابار کو فتح کرتا ہوا گروایور کے قریب پہنچا تو اس مندر کے پجاری بہت گھبرائے اور انہوں نے دیوتا کی بیش قیمت مورت کو ریاست ٹراونکور کے ایک مشہور مندر میں بھیج دیا، ٹیپو تو گروایور سے دور ایک مقام پر ٹھہر گیا اور فوج کو گردایور فتح کرنے کے لئے بھیج دیا، فوج نے گردایور فتح کرلیا چونکہ ان مرہٹوں سے مسلمانوں کی سخت جنگ چل رہی تھی اس لئے بعض سپاہیوں نے مندر کی دیوار پر گھی چھڑک کر آگ لگا دی، ابھی یہ آگ زیادہ پھیلی نہ تھی کہ افسران فوج کو اس کی اطلاع ملی ان کو سلطان کے احکام کا خیال آیا اور فوراً آگ بجھا دی اور تین برہمنوں کو سلطان ٹیپو کے پاس بھیجا کہ شورش پسند سپاہیوں کی شکایت کریں، جب سلطان ٹیپو کو برہمنوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی تو تو رات کا وقت تھا، فوراً اس نے کوچ کردیا اور گردایور پہنچ گیا، آگ لگانے والے سپاہیوں کو سخت سزا دی اور مندر کو درست کرایا اور حکم دیا کہ آئندہ اس شہر سے جو بھی آمدنی ہو وہ سرکاری خزانے میں داخل کرنے کے بجائے ہمیشہ اس مندر کو دی جایا کرے اور

پجاریوں سے کہا کہ دیوتا کی مورتی کو فوراً واپس منگا کر اس مندر میں نصب کردیا جائے۔" (تاریخ سلطنت خداداد ص ۵۲۹)

## آخری شہادت:

آخر میں ایک ایسی شہادت اور ثبوت بھی پیش کیا جارہا ہے کہ جس کے چہرے پر آنکھیں ہیں اور قدرت کی دی ہوئی ان میں روشنی موجود ہے وہ بھی دیکھ لے اور پھر یقین کرلے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت ہے، صداقت ہے، اصلیت اور سچائی ہے، اس کے خلاف جو کچھ کہا جارہا ہے وہ غلط ہے، جھوٹ ہے، الزام واتہام ہے اور کچھ نہیں۔

زوالِ سلطنت کے بعد سلطان ٹیپو کا پایۂ تخت سرنگاپٹم ایک عرصہ تک زیارتگاہ خلائق رہا ہے اب تو اس کی حیثیت ایک معمولی قصبہ کی ہوکر رہ گئی ہے پھر بھی اس دور کی بہت سی نشانیاں وہاں آج بھی موجود ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ ایک بار سرنگاپٹم کی سیر کرلیں تاکہ میری باتوں کی تصدیق میں آپ کو کوئی تردد نہ رہ جائے۔

ریلوے اسٹیشن سے اترتے ہی سب سے پہلے زائر کی نگاہ ان دو بڑے مندروں پر پڑتی ہے جو اسٹیشن سے بالکل قریب ہیں، سلطان کا محل انہیں مندوروں کے بالکل قریب تھا جس کو انگریزوں نے جوش انتقام میں ڈھا کر زمین بوس کردیا، محل کے پیچھے محل سے لگا ہوا ایک اور بڑا مندر ہے، سلطان کے دورِ حکومت میں ان مندروں میں پوجا پاٹ کی رسمیں شان وشوکت سے برابر جاری رہیں، بنگلور میں بھی سلطانی محل سے لگا ہوا ایک چھوٹا مندر ابھی تک موجود ہے، اس کے علاوہ میسور کے علاقہ میں سرنگری، بیلور، نجن گڈھ، السور وغیرہ میں ایسے مندر موجود ہیں جن کی تعمیر صدیوں پہلے کی ہے سلطان نے ان مندروں سے اپنے دورِ عروج میں بھی کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے جاگیریں دیں، انعامات، ہدایات وتحائف دیتا رہا، گاندھی جی نے اپنے انگریزی

اخبار ''ینگ انڈیا'' میں انہیں مندروں کے سلسلہ میں لکھا تھا:

''ٹیپو کے محلات کے گرد و پیش شری ونکٹا رامنا، سری نواس، اور شری رنگنا تھ کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا بین ثبوت ہے ...... وہ خدا کی عبادت میں پوجا کی گھنٹیوں سے پریشان نہیں ہوتا تھا، ہمیں بھی سلطان ٹیپو کے اس الہامی مقولے کو یاد رکھنا چاہیے۔

''دو دن شیر کی طرح جینا کتوں کی دوسو سال کی زندگی سے بہتر ہے''۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۵۳۱)

## سلطان ٹیپو پر ایک اور بڑا الزام:

تنگ نظر فرقہ پرست اور تنگ دل رجعت پسند سلطان ٹیپو پر ایک اور تہمت لگاتے ہیں کہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو بہ جبر و اکراہ مسلمان بنایا، الزام لگانے والے تاریخ سے واقف نہیں، قدرتاً وسعت ظرفی سے بھی محروم ہیں کہ کسی صداقت کو پاکر اس کو کھلے دل سے تسلیم کرلیں، ان کے سفید فام آقاؤں نے جو سبق پڑھایا ہے، بس اسی کو رٹے جارہے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ الزام تراشی کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے، اور جو شمشیر بے نیام انہوں نے انگریزوں سے مستعار لی ہے کہیں انہیں کی گردنیں نہ صاف کردے، سچ ہے بیوقوف وکیل سچا مقدمہ بھی ہار جاتا ہے الزام تراشی کرنے والے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اگر وہ سلطان ٹیپو کو سچا اور پکا مسلمان کہتے ہیں تو ان کو یہ بھی تسلیم کرلینا چاہیے کہ وہ کسی بھی شخص کو بہ جبر و اکراہ مسلمان نہیں بنا سکتا کیوں کہ اس کے مذہب نے اس کو اس سے منع کیا ہے، یا تو سلطان ٹیپو کو متعصب مسلمان نہ کہیں اور اگر کہتے ہیں تو یہ تسلیم کرلیں کہ اس نے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ایک بھی ہندو کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا کیوں کہ بیک وقت دونوں دعوے سچے نہیں ہوسکتے ہیں، اب آیئے اس الزام کی اصلیت تلاش کریں کہ یہ بات کہاں سے چلی؟ اور کیوں کر چلی؟

جب اس واقعہ کا علم ہو جائے گا تو صداقت خود اپنے کو تسلیم کرا لے گی۔

انگریز مؤرخین نے سلطان ٹیپو کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی جو مہم چلائی تھی اوراس کے کردار کو مسخ کرنے کی جدوجہد کی تھی اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریز اور ہندو دونوں مل کر اس کی طاقت کو ختم کردیں، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انگریزوں سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا اور سلطان کی ان سے چار طوفان بدوش لڑائیاں ہوئیں اور جب انگریز شکست کھا کر اپنی پناہ گاہوں میں بھاگ جاتے تھے تو انگریزوں کی جگہ مرہٹے میسور پر دوڑ پڑتے تھے، اس طرح سلطان ٹیپو تخت نشینی کے وقت سے اپنی شہادت کے وقت تک مسلسل سلطنت خداداد کے ان دشمنوں سے پنجہ آزمائی کرتا رہا، والا جاہ اور نظام حیدرآباد کے انگریزی چرواہوں کے پالے ہوئے بھیڑیئے، مرہٹی فوج کے منہ کھولے ہوئے مگرمچھ، انگریزی کرنلوں اور جنرلوں کے پھنکارتے ہوئے اژدھے سب کے سب بیک وقت سلطان ٹیپو کو لقمہ تر سمجھ کر نگل جانا چاہتے تھے لیکن ٹیپو ان سبھوں کے حلق کا کانٹا بن گیا تھا، اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ ٹیپو کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلائی جائے، جھوٹی افواہ پھیلا کر ٹیپو دشمن طاقتوں کو بارود کے ڈھیر میں تبدیل کردیا جائے اور پھر ایک چنگاری سے سلطان ٹیپو کی حکومت اور اقتدار کے محل کو خاکستر بنا دیا جائے، خود انگریز مورخین ہم کو جو واقعہ بتاتے ہیں ہم اس سے انکار نہیں کرتے بلکہ تسلیم کرتے ہیں لیکن اس واقعہ کو اس کے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ دیکھنا چاہئے تبھی سچائی آپ کے سامنے آئے گی، انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''نواح کے کورگ میں اکثر ہندو عیسائی مذہب قبول کرتے جاتے تھے سلطان نے ان کو لکھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو ترک نہ کریں، مگر جب چھ دفعہ لکھنے پر بھی اس کا اثر نہ ہوا تو آخر میں سلطان نے لکھا کہ آئندہ تم میں سے کوئی شخص اپنا آبائی مذہب ہرگز ترک نہ کرے اور اگر ایسا تبدیلئ مذہب کا شوق ہو تو خود اپنے بادشاہ کا مذہب اختیار کرو''۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص۵۳۲)

حکومت میسور کے چالیس سالہ دور میں صرف یہی ایک واقعہ ہے جس کو مثال

میں پیش کیا جاتا ہے اور سلطان پر تعصب کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن کوئی غیر جانبدار شخص اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لے سکتا کہ سلطان ٹیپو بہ جبر و اکراہ ہندوؤں کو مسلمان بنا رہا تھا کیوں کہ اس تحریر میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور نہ پوری تاریخ میسور بتاتی ہے کہ سلطان کے اس تہدیدی حکم کے بعد کوئی ہندو مجبور ہو کر مسلمان ہو گیا۔

اس تحریر سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ انگریز ایک طرف ہندوستانی حکومتوں کو تہ و بالا کر کے اپنے حدود حکومت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مذہب پر بھی ڈاکہ ڈال رہے تھے، ملکی فتوحات کا دائرہ جتنی تیزی سے وہ وسیع کر رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ وہ ہندوؤں کو عیسائی بنا کر ہندو مذہب کا قلع قمع کر رہے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ جنوبی ہند میں آج دیسی عیسائیوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ ہے اور یہ سب کے سب ہندو تھے، ٹیپو سلطان کو متعصب ثابت کرنے کے لئے اور ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یہ واقعہ پیش کرتے ہوئے یہ فرقہ پرست ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے، اس کے برعکس ایک کروڑ دیسی عیسائیوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں کہ انگریزوں نے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنایا، انگریز پادریوں کی اس مہم کے وقت ہندوؤں کو شرم و غیرت نہیں آئی تو سلطان ٹیپو میدان میں آیا وہ پادریوں پر پابندی عائد کر کے تمہارا کام کر رہا تھا اور الٹے تم نے اسی کو مورد الزام بنا ڈالا، سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے فرقہ پرست سوجھ بوجھ، عقل و خرد، فہم و فراست، صداقت و دیانت، انسانیت و شرافت کے لحاظ سے دیوالیہ ہو چکے ہیں، اور ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کا ذہن و مزاج ان میں پیدا ہوا نہ مستقبل قریب میں اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے آیئے، اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے۔

۱- میسور کے ہندو انگریز پادریوں کے فریب میں آ کر عیسائی ہوتے جا رہے ہیں، کیوں کہ ٹیپو کو بار بار پادریوں کی ان سرگرمیوں کی روک تھام کی طرف

توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی، آخر کیوں ٹیپو اتنی سختی کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی ہونے سے روکنا چاہتا ہے؟ بات یہ ہے کہ انگریزوں کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سفید فام قوم جو خود کو ملحد ہوتے ہوئے بھی عیسائی کہتی ہے جب بھی کسی ملک کو اپنی شکار گاہ بنانا چاہتی ہے تو وہاں سب سے پہلے پادریوں کے بھیس میں اپنے جاسوسوں کو بھیجتی ہے، وہ عیسائیت کا جال بچھاتے ہیں، اس ملک کے اہم رازوں کو معلوم کرتے ہیں اور حکمراں طبقہ کی اندرونی کمزوریوں کا پتہ چلاتے ہیں اور اس ملک کے ضمیر فروش اور وطن دشمن افراد کو کھوج نکالتے ہیں اور جب عوام عیسائیت کے جال میں پھنس جاتے ہیں تو یورپ کے مردہ خور گدھ پرا جمائے اس ملک میں ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں اور اتر پڑتے ہیں اور پھر صدیوں کے لئے ان کی خوراک کا بندوبست ہوجاتا ہے اور وہ ملک انگریزوں کا غلام ہوجاتا ہے، ہندوستان کی تاریخ یہی بتاتی ہے، اسپین اور اندلس کا مؤرخ بھی یہی بتاتا ہے اگر سلطان ٹیپو کی دوررس نگاہیں میسور ہی کو نہیں پورے ہندوستان کے انجام کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ اس کی پیش بندی کرتا ہے اور پادریوں کے اس جال کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کے تدبر اور سیاست دانی کا کمال ہے اور کمال ہنر ہوتا ہے عیب نہیں، اس لئے ٹیپو کی مذمت نہیں، اس کی تعریف کرنی چاہئے اور اس کو اپنی قوم اور اپنے ملک کا محسن ماننا چاہئے آخر فرقہ پرست یہ الٹی گنگا بہانے کی غلط کوشش کیوں کرتے ہیں؟

سلطان ٹیپو نے افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کرکے ہندوؤں کو اپنے دھرم پر جمے رہنے کی تاکید کی اور بار بار سمجھایا کہ اپنا مذہب مت چھوڑو، کیوں کہ روایتی طور پر جس تہذیب اور رسم ورواج اور طور طریق سے وابستہ ہو اس سے کٹ جاؤ گے، عیسائیت اختیار کرکے یہاں کے باشندوں کی نگاہوں میں اجنبی بن جاؤ گے، تمہاری قدر و قیمت گھٹ جائے گی، تمہارے بھائی تم کو نگاہوں سے گرادیں گے، تمہارے دکھ سکھ میں شریک نہیں ہوں گے، اس کے باوجود وہ باز نہیں آئے، اور ٹیپو کے صحیح مشوروں کو نہیں مانا، یہ اپنی رعایا کے ساتھ اس کی رواداری اور خیر خواہی کا سب سے بڑا ثبوت

ہے کہ ہر شخص کو مذہب وملت کے اعتبار سے آزادی ومختاری دی، یہ سلطان ٹیپو کے محاسن کا ایک حصہ ہے، پھر اس کا یہ کام عیب کیسے بن گیا؟

سلطان بار بار ہندوؤں کو سمجھاتا رہا ہے کہ عیسائیت کے دام میں مت آؤ، سفید فام شکاریوں کے شکار مت بنو، کیوں کہ تم مستقبل میں اپنے ملک، اپنے وطن، اپنی حکومت کے دشمن بن جاؤ گے اور انگریز کے لئے فتوحات کے راستے کھول دو گے اور تم انگریزوں کا آلۂ کار بن جاؤ گے، اس کے باوجود ان کی عقل میں یہ بات نہیں آئی اور پانچ بار نرم لب ولہجہ میں سمجھا کر اتمام حجت کردی اس کے باوجود وہ باز نہیں آئے اور اپنا قدیم مذہب عیسائی سوداگروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہے تو چھٹی بار اس نے تہدیدی حکم بھیجا اس موقعہ پر بھی دونوں پہلوں کو ملحوظ رکھا کہ آئندہ کوئی شخص عیسائی نہ ہو ورنہ انجام بھگتنے کے لئے تیار ہو یعنی حتی الامکان ہندوؤں کو عیسائی ہونے کے بجائے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنے کی کوشش کرتا رہا، اس طرح ٹیپو ہندو قوم کا محسن تھا، تم احسان فراموش ہوکر خود کو رسوا کررہے ہو۔

۴- واقعہ کا چوتھا جزیہ ہے کہ اگر تم سچ مچ ہندو نہیں رہنا چاہتے، اور کسی سچے مذہب کی تلاش ہے تو عیسائیت کے بجائے نخل اسلام کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں آجاؤ، ایک سچے مسلمان کی طرح ٹیپو نے ان کو دعوت حق دے دی، بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا یہ فرض تھا جو اس نے ادا کیا، فرض کا احساس انسانیت کا کمال ہے، سلطان اس کسوٹی پر بھی کھرا سونا ثابت ہوتا ہے، واقعہ کے اس تجزیہ کے بعد کیا کوئی عقلمند فرقہ پرستوں کے اس الزام کو صحیح تسلیم کرسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اور کبھی نہیں۔

## آخری بات:

سلطان ٹیپو کی بے داغ شخصیت اور اس کے عظیم الشان مجاہدانہ کارناموں کا انصاف پسند، انسانیت دوست اور وسیع النظر ہندوؤں نے کھلے لفظوں میں اعتراف کیا اور اس کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس کے باوجود بعض تنگ نظر تنظیم کے

کارکنوں نے سلطان ٹیپو کو جھوٹی اور غلط افواہوں کی بنیاد پر بدنام کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے درحقیقت انھوں نے آسمان پر تھوکنے کی کوشش کی ہے اس کا انجام سب کو معلوم ہے، سلطان ٹیپو نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی کی لعنت سے بچانے کے سلسلہ میں جو اہم اور مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، ہم اس پر فخر کرتے ہیں، ہم اس کو مجاہدین آزادی کی فوج کا ہراول دستہ سمجھتے ہیں اور ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' جو اس کے عظیم الشان مجاہدانہ کارناموں سے عبارت ہے ہمارا تاریخی ورثہ ہے، ہم کسی کو قابل فخر تاریخ مسخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، چاہے آگ اور خون کے دریا میں بار بار غوطہ کھانا پڑے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کو آزاد ہوئے چالیس برس سے زائد ہوگئے لیکن اب تک یہاں علمی سنجیدگی اور تحقیقی مزاج اور سچائیوں کی دریافت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا جو آزاد قوموں کا خاصہ ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں باہمی منافرت پھیلانے اور یہاں کی آب وہوا کو خراب کرنے کے لئے جتنے زہریلے پودے لگائے تھے اس کو کھود کر پھینک دینے کے بجائے ان کو اور سینچا جا رہا ہے، یہ اس ملک کے لئے بڑی بدقسمتی کی بات ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اکثریت کو جذباتی نعروں میں الجھا کر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا آسان ذریعہ بنالیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی ایک گذارش ہے اور بالخصوص ان بزرگوں سے جو تصنیف وتالیف کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، تحقیقات ونشریات کے کام کرتے ہیں کہ ہر قوم کا ماضی اور اس کی تاریخ اس قوم کا بہت قیمتی اور اہم ورثہ ہوتی ہے، قومی وملی زندگی میں ساری توانائیاں وہیں سے ملتی ہیں، اسی کی بنیاد پر حال اور مستقبل میں کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے، اس لئے ہر قوم اپنی تاریخ کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے اور اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے۔

انگریزی حکومت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور یہاں کے مسلم حکمرانوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں ان کو دانستہ طور پر انتہائی بدمنظر بنا کر پیش

کیا ہے، یہ ان کی سیاست کا لازمی عنصر تھا، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب اس ملک میں کوئی ایسا مسئلہ اٹھتا ہے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے تو انگریزی تاریخوں سے ان کا ماضی نکال کر پوری فضا کو مکدر بنادیا جاتا ہے، اور مسلمان اپنی پوری توانائیاں لگاتے ہوئے اس دھبے کو دھونے میں صرف کردیتے ہیں اور کوئی مثبت کردار نہیں کرتے، اور کچھ دیر کے لئے ہم اپنے کو مجرم سمجھ لیتے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس لئے ہمارا یہ قومی فریضہ ہے کہ انگریزی دور حکومت میں لکھی گئی تاریخوں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے علمی تحقیق کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح تاریخ ملک کے سامنے پیش کی جائے تو مسلمان قوم کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک مفید ترین کارنامہ ہوگا، کیا ہمارا دانشور طبقہ اس پہلو پر غور کر کے کسی عملی اقدام کے لئے کوئی لائحہ عمل بنانے کے لئے تیار ہے؟ وقت ان کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

# طوفان سے ساحل تک

## تصویر کا پہلا رخ

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے درو بست پر قابو پا چکی تھی، انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اسی وقت سے یہ پالیسی بن چکی تھی کہ اس ''سونے کی چڑیا'' کو اگر قبضہ میں رکھنا ہے تو اس کی شرط اولیں یہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور ہندوستانیوں کو ترغیب وتحریص اور ضرورت پڑے تو طاقت وجبر سے عیسائی بنایا جائے اور اسی نقطۂ نگاہ سے عملی اقدامات کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

لندن میں باقاعدہ ایک مرکز علمی صرف اس لئے قائم کیا جا چکا تھا کہ عیسائی مشنریوں کو اردو، فارسی اور عربی کی مکمل تعلیم دی جائے اور وہ مرکز برسوں سے ایسے پادریوں کی ایک فوج تیار کرنے میں مصروف تھا جو علوم اسلامی اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے پورے طور پر واقف ہوں اور مسلمانوں کے مجمع میں فراٹے سے اردو میں تقریریں کر سکیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ان تر تیب یافتہ پادریوں کی فوج آنا شروع ہوگئی تھی، انگریزی حکومت ان کو ہندوستان کے اہم اور مرکزی مقامات پر متعین کر چکی تھی اور ان کی سرگرمیاں زور شور سے جاری تھیں کیونکہ ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی سلطنت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی، اور ملک کے بت پرستوں اور دوسرے باشندوں کو عیسائی بنا لینا بہت آسان ہو جائے گا، اس سلسلہ میں انگلستان کی پارلیمنٹ پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستانی باشندوں کو عیسائی بنانے میں ہندوستان میں مقیم انگریزی حکام کی مدد کرے اگر ہو سکے تو انہیں زبر ستی عیسائی بنائے، مگر چونکہ جبر اور زبردستی عیسائی بنانے میں بہت سے

خطرات تھے اس لئے اس کی کھلم کھلا حمایت تو نہیں کی گئی البتہ طے یہ کیا گیا کہ اول تو ہندوستان میں ایسے گورنر، کلکٹر، وائسرائے، کمشنر اور دوسرے عہدیدار مقرر کئے جائیں جن کو مذہبی مناظروں سے دلچسپی ہو اور جو اپنے سیاسی فرائض انجام دیتے ہوئے مشنری فرائض بھی انجام دیتے رہیں، چنانچہ اس مقصد سے جو عہدیدار بھی مقرر ہوا اس کے ذمہ یہ فرض لگایا گیا کہ وہ اسلام کے خلاف کتابیں لکھے اور مسلمان ملازموں سے گفتگو کر کے ان کو عیسائی بنالے۔

سر ولیم میور جو اعلیٰ درجہ کے پادری اور مشنری تھے انہیں اسی لئے ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا گونر بنایا گیا اور انہوں نے ملازمت کے دوران ہی ''لائف آف محمد'' ''کتاب خلافت'' شہادت قرآنی پر کتب ربانی'' اور اسی طرز کی اور دوسری مناظرانہ کتابیں لکھیں اور اسلام کے خلاف پادریوں اور عیسائی منادوں کی ایک پوری فوج کھڑی کر دی اور اسی کے ساتھ یورپ کی ایک ''متحدہ مذہبی مجلس'' نے اسلام پر شدید حملہ کرنے کے لئے مناظر پادریوں کا ایک زبردست جتھ تیار کر کے ہندوستان بھیج دیا جس کے سرخیل پی فنڈر (P.Fandar) قرار پائے، پادری لیفرائے پادری منسل (Minsal) اور دوسرے بڑے بڑے پادری جو عربی فارسی اور اردو زبان پر عبور رکھتے تھے پادری فنڈر کے معاون بنائے گئے، خود فنڈر بھی عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور اردو زبان پر پوری طرح قادر تھا، پادری فنڈر نے ہندوستان آکر اسلام کے قلعہ پر پہلا گولہ کتاب ''میزان الحق'' کی شکل میں پھینکا اور پھر ''طریق الحیات'' ''حل الاشکال'' طلوع آفتاب صداقت'' اور دوسری کتابیں لکھ کر شائع کیں، خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کے خلاف یورپ کی یہ متحدہ یورش تھی جو مذہب کے رنگ میں کی گئی اور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور پارلیمنٹ دونوں کو کامیابی کی پوری پوری توقع تھی۔

چونکہ مغلیہ سلطنت اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی اور اس میں کوئی دم باقی نہیں رہا تھا اس لئے پادریوں کی دریدہ دہنی حد سے متجاوز ہو چکی تھی، پادری فنڈر

روزانہ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے عیسائیت کے مناقب وفضائل پر تقریریں کرتا تھا اور اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالتا تھا، ایک طرف انگریزی حکومت رعب داب اور ہیبت تھی، دوسری طرف پادریوں کی یک طرفہ تقریریں تھیں اور پھر کسی کو ان کے سامنے لب کھولنے کی ہمت نہیں تھی اس لئے ان کی تقریروں کا عوام پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا تھا، کچھ لوگ اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکے تھے، اور اس دور کے بہت سے اسلامی نام کے پادریوں کا تاریخوں میں ذکر آتا ہے جیسے پادری محی الدین، پادری صفدر علی وغیرہ یہ وہی ہیں جنہوں نے اس وقت اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی، اور جن لوگوں نے ان پادریوں کی مسلسل تقریریں سنی تھیں ان میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جن کا ایمان متزلزل ہو چکا تھا جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب ''ازالۃ الشکوک'' میں لکھا ہے۔

چونکہ تبلیغ عیسائیت کی مہم پورے زور وشور سے جاری تھی، ہر مرکزی شہر میں ان کا پریس تھا، اخبار تھے، اور ہر سینٹر میں عیسائی مناظرین ومقررین کی ایک پوری فوج رہتی تھی اور وہ شب وروز اپنی مہم میں مصروف تھے، پھر عیسائی ہوجانے والوں کا اعزاز واکرام بھی تھا، خوشحالی اور فارغ البالی ان کے قدم چومنے لگتی تھی اور انگریزی حکام سے رابطہ کی وجہ سے ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی اس لئے ترغیب وترہیب دونوں راہوں سے عیسائیوں کی کامیابی کے آثار واضح طور پر نظر آتے تھے۔

مبلغین عیسائیت کا جواب دینے کی کسی میں ہمت نہیں تھی کیونکہ ابھی بھی مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور ان گنت معزز اور سر برآوردہ مسلمانوں کو دہلی کے چوراہوں پر سولیوں پر لٹکتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا اور ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ پادریوں کی زبان میں حکومت بول رہی ہے اور یوں بھی ہر پادری کے ساتھ پولیس کا ایک دستہ بھی رکھا جاتا تھا جو ہر ضلع کلکٹر کی ذمہ داری تھی کہ مبلغین عیسائیت کو ہر طرح مدد پہنچائی جائے اس لئے فضا میں ہر طرف سناٹا تھا، اس مہیب سناٹے میں صرف پادریوں کی

زہر آلود تقریروں کی آواز ہی سنائی دے رہی تھیں، اخبارات روزانہ عیسائی ہو جانے والے خاندانوں کی خبریں شائع کر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھ کر مسلمان پیچ وتاب کھا رہے تھے لیکن بے بسی کا وہ عالم تھا کہ اس کے خلاف لب کھولنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی اس لئے حکومت کی ہمت بڑھتی جارہی تھی اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کے دل ودماغ پر ایسی زبردست چوٹ لگائی جائے جوان کو یاس وناامیدی کے گہرے غار میں دفن کردے اور اس کا واحد طریقہ کار یہ طے کیا گیا کہ دہلی شاہجہانی جامع مسجد جو مسلمانوں کے دور عروج کی اہم ترین نشانی کے طور پر قلب شہر میں کھڑی ہے اس کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال کر عیسائی گرجا کی شکل میں تبدیل کردیا جائے، یہ ساری داستان جو حقائق پر مبنی ہے ہم کو فرانس کا مشہور عالم مستشرق موسیو گارسان وتاسی سناتا ہے جو پیرس یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کا کا استاد تھا اور وہ ہر تعلیمی سال کے آخر میں اپنے طلبہ کے سامنے ایک لکچر دیتا تھا جس میں وہ اردو زبان کے ارتقاء پر تبصرہ کرتا تھا وہ اپنے لکچر میں ہندوستان میں اردو زبان کی نشر واشاعت اور اسکی ادبی ترقی کا جائزہ لیتا تھا اور وہ بتاتا تھا کہ اس سال اردو میں کتنی کتابیں شائع ہوئیں کتنے مطابع قائم ہوئے؟ کتنے رسالے اور اخبار جاری ہوئے؟ اور اردو کے کون کون ممتاز شاعر اس وقت ہندوستان میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام معلومات وہ پیرس میں بیٹھ کر مختلف ذرائع سے حاصل کرتا تھا، وہ ہندوستان میں انگریز عہدہ داروں سے برابر خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا اور ان سے اس سلسلہ میں ضروری معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا رہتا تھا، ان سے شعراء کے دیوان اردو میں شائع ہونے والی کتابوں، رسالوں اور اخباروں رسالوں اور شعراء کے دیوانوں کی قدر وقیمت ادبی معیار، مصنّفین اور مدیران جرائد کے حالات ان کی مساعی کی قدر وقیمت بھی ظاہر کرتا تھا، اس سلسلہ میں وہ بعض اوقات ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ایک خاص انداز میں کرجاتا ہے، وہ پکا عیسائی ہے اور ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اسے بڑی دلچسپی ہے، وہ

عیسائی مبلغین کی کوششوں اور کامیابیوں اور حکومت کے اقدامات کو بڑے شوق سے اور لذت لے لے کر بیان کرتا ہے۔

اس کے ان لکچروں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کی تصحیح ونظر ثانی کے بعد شائع ہو چکا ہے میں اسی سے جستہ جستہ عیسائیت کی اشاعت کی تفصیل پیش کر رہا ہوں، یہ خطبات ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹؍سال کے عرصہ میں دیئے گئے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب عیسائیت کی تبلیغ پر انگریزی حکومت اپنا پورا زور صرف کر رہی تھی، موسیو گارسان وتاسی ۵؍دسمبر ۱۸۵۳ء کو اپنا لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے۔

”رومن کیتھولک نقطۂ نظر سے سردھنہ ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے صحراء میں نخلستان، یہاں رومن کیتھولک مشنریوں نے مطبع قائم کیا ہے جس میں حال ہی میں علاوہ اور چیزوں کے مذہبی عقائد کی سوال و جواب کی کتاب چھپی ہے......

پروٹسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات کا میں آپ سے ذکر نہیں کروں گا وہ بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور ان کی اشاعت سے اہل ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے۔

گذشتہ سال میں نے آپ کے رام چندر کے اینگلیکن فرقہ کی عیسائیت قبول کرنے کا ذکر کیا ہے اور میں نے ابھی ابھی اس کے اخبار کا ذکر کیا ہے جس کے وہ ایڈیٹر ہیں، اس سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے، یہ مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شہزادہ ہے اور اس نے فتح گڑھ میں گذشتہ مارچ میں آٹھ تاریخ کو عیسائی مذہب اختیار کیا ہے“۔

## مسلمانوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے:

اس نے اپنے پانچویں خطبہ میں بعض ان مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی ہے، وہ ۴؍دسمبر ۱۸۵۴ء کو لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے:

''ہندوستان کے بعض مصنّفین میں بعض ایسے ہندو بھی پائے جاتے ہیں جو عیسائی ہو گئے ہیں، نیز بعض مسلمان بھی ہیں، جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے۔ ایک اردو شاعر کی نسبت جس کا تخلص شوکت ہے اور جو نصرانی ہو گیا تھا شیفتہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ شوکت بنارس میں ایک یورپین کا بڑا دوست تھا اور اس کی ترغیب سے اس نے اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیا چنانچہ اس نے اپنا نام بھی سیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے ایسی حالت میں نام کی تبدیلی اکثر و بیشتر صورتوں میں ضروری ہوتی ہے ہندوستانی زبان کے ایک اور شاعر نے جو عیسائی ہو گیا ہے اپنا نام فیض محمد سے فیض مسیح رکھ لیا ہے۔''

## اشاعتی لٹریچر:

ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لئے باضابطہ حکومت کی طرف سے باتنخواہ پادری اور کارکن رکھے گئے تھے اور وہ اردو فارسی سے بخوبی واقف تھے ان کو پریس اور چھاپہ خانے کی تمام سہولیات بھی فراہم کی گئی تھیں اور وہ بڑے پیمانے پر اخبارات، رسالے اور کتابیں شائع کرتے تھے اور ہر ایک میں عیسائیت کے فروغ اور اشاعت کو اولیت دیجاتی تھی، اس سلسلہ میں گارسان وتاسی اپنے ساتویں لکچر میں جو اس نے ۴؍دسمبر ۱۸۵۶ء کو دیا تھا اس میں کہتا ہے۔

''حضرات! میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں سنایا جو سرگرم مبلغین عیسائیت دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے شائع کرتے رہتے ہیں ایسی کتابوں میں ''عہد نامہ قدیم'' اور خصوصیت کے ساتھ ''عہد نامہ جدید'' کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہوتا ہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں نے انہیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہوئی ہوگی۔

## پورے ملک میں جال پھیلایا گیا:

یورپ میں عیسائیوں کے دو فرقے خصوصی شہرت رکھتے ہیں ایک رومن کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ، حکمراں انگریز موخر الذکر فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن عیسائیت کے فروغ میں باہمی اختلافات کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے بلکہ دوسرے فرقہ کو بھی حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا، دونوں فرقے الگ الگ اپنے طور پر تبلیغ عیسائیت کے کام میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم گارسان وتاسی سے سنتے ہیں وہ اپنے آٹھویں خطبے میں جو اس نے ۱۰؍دسمبر ۱۸۵۷ء کو دیا تھا کہتا ہے:

''بہرحال پروٹسٹنٹ مبلغین اور رمن کیتھولک مبلغین کے درمیان تو کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں سے یکساں برتاؤ کیا جاتا رہا ہے اور انگریزی حکومت نے پروٹسٹنٹ ہونے کے باوجود رومن کیتھولک کو پوری آزادی دے رکھی ہے، فوجی چھاؤنیوں میں رومن کیتھولک فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو تنخواہ دی جاتی تھی، اور خود اپنے مقبوضات کے قلب میں تین خانقاہیں آگرہ، سردھنہ، سیالکوٹ میں عورتوں کے لئے بنانے کی اجازت دے دی تھی علاوہ ازیں رومن کیتھولک تعداد میں پروسٹنٹوں سے زیادہ تھے، اول الذکر کے دو اسقف یا عاقب احاطۂ بنگال میں تھے، ممبئ کے لئے پھر مدراس، حیدرآباد وزینگاپٹم، سیبورکوئمبتور، سردھنہ، آگرہ، پٹنہ، ویراپلی، کنٹرالین، منگلور، کرکولم اور اندھرا میں بھی الگ الگ اسقف تھے مجموعی تعداد ان اسقفوں یا عاقبوں کی سولہ تھی، برخلاف اس کے خود انگریزی چرچ یعنی اینگلیکن کلیسا کے ہندوستان بھر میں صرف تین اسقف تھے (بڑے پادری) ایک کلکتہ، ایک مدراس، اور ایک ممبئ میں[1]۔

[1] (خطبات گارسن وتاسی: ج ۱ص ۲۱۷-۲۱۸)

## دہلی جامع مسجد کو گرجا بنانے کا ارادہ:

انگریزی حکومت کے بے انتہا مظالم اور جور واستبداد کی بے تحاشا کارروائیوں کی وجہ سے سارے ملک میں ایک دہشت اور مرعوبیت کی فضا بن گئی تھی اور انگریزی حکومت یہ سمجھنے لگی تھی کہ ہندوستانیوں کے مذہب، ضمیر اور رائے کے خلاف کوئی بڑے سے بڑا کام بھی کیا جائے گا تو کسی ہندوستانی میں اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت وجرائت نہیں ہو سکتی اس کا ان کو اتنا یقین تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے کلیجہ پر اپنے اقتدار اور رعونت کا پرچم گاڑنے کا تہیہ کرلیا تا کہ مسلمان دیکھے اور تلملائے خون کا گھونٹ پیئے، لیکن لب نہ کھول سکے، دل خون بن کر آنکھوں میں اتر آئے لیکن احتجاج کے لفظ سے ان کی زبان آشنا نہ ہو سکے جیسا کہ گارسان وتاسی ہم کو بتاتا ہے:

> بلاشبہ دہلی میں عہدۂ اسقفی قائم کرنے کا سوال درپیش ہے اور یہ بھی تجویز ہے کہ سرخ گار کے پتھروں کی شاہجہانی مسجد جامع کو کیتھڈرل یعنی منبردار گرجا میں تبدیل کردیا جائے، بشرطیکہ پایہ تخت دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں کے لئے انگریزوں کے شدید حملے میں وہ محفوظ ہو، علاوہ ازیں کنٹربری کا لاٹ پادری مطالبہ کررہا ہے کہ تین بڑے پادریوں (اسقفوں) کا جدید تقرر عمل میں لایا جائے، ایک لاہور میں پنجاب کے لئے، دوسرا آگرہ میں صوبہائے شمال مغربی کے لئے، اور تیسرا تناولی میں جنوبی کرناٹک کے لئے، مزید براں رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے سے تبلیغ کے باب میں سبقت لے جانے کی کوششوں میں سرگرم ہیں، رومن کیتھولک ہندؤں کو عیسائی بناتے ہیں اور پروٹسٹنٹوں کی نظر صرف مسلمانوں پر ہے کیونکہ مسلمانوں کو بتوں اور مجسموں سے جو کیتھلکوں کے یہاں ہوتے ہیں بہت نفرت ہے۔"

## عیسائی لٹریچر کی تفصیل:

حالات اور مواقع کے لحاظ سے مختلف انداز سے کتابیں لکھی جاتی تھیں البتہ

بنیادی کتابوں اور ان کو سہل بنانے اور اس کو دوسری رائج زبانوں میں منتقل کرنے کا کام بھی زوروں پر جاری تھا، ہمیں گارسن وتاسی اپنے گیارہویں لکچر میں جو اس نے ۲؍دسمبر ۱۸۶۱ء کو دیا تھا ہمیں کچھ تفصیل بتاتا ہے، وہ کہتا ہے۔

''انجیل کے اردو ترجمہ کا تعارف کرانے کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں ان مبلغین مسیحیت کی ساری کتابوں کے متعلق تفصیل سے ذکر نہیں کروں گا اس واسطے کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش وخروش سے نشر واشاعت کر رہے ہیں، مذہبی قسم کی مطبوعات جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا مجھے علم ہے ایک کتاب ''سچے اوتار'' یعنی خدا کے انسانوں میں حلول کرنے کے متعلق لکھی گئی ہے، ایک حقیقی تثلیث اور ہندوؤں کی تری مورتی کے متعلق ہے، ایک کتاب میں اسلام کی ابتداء اور عروج وزوال پر تبصرہ ہے ان کتابوں کے علاوہ بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جن میں سے متعدد فرانسیسی میں موجود ہیں، ''حضرت سلیمان کی امثال'' اور ''پہاڑی وعظ'' کا اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، ممبئی کی مسیحی انجمن کتب ورسائل'' بھی اپنے کام میں مشغول ہے، اس انجمن نے ۲۳۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں جو ہندوستانی اور دوسری زبانوں میں بھی ہیں، اس قسم کی تبلیغی کتب کو تقسیم کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت ملک کے طول وعرض میں کلیساؤں اور گرجاؤں کی بنیادیں بھی ڈال رہے ہیں اور مدرسے قائم کر رہے ہیں''۔

## کلیسا کی کامیابی:

عیسائیت کی اشاعت کے سلسلہ میں سرگرمیوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے گارسن وتاسی اپنے تیرہویں لکچر میں جو اس نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا تھا وہ کہتا ہے:

''انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انہیں خوب کامیابی ہو رہی ہے ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ۱۸۶۲ء

میں بنگال، صوبہائے شمالی و مغربی صوبہ، ممبئی اور صوبہ مدراس میں دیسی عیسائیوں کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو تیرانوے (۱۱۸۸۹۳) تھی مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کررہے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ۸۹۰ کلیسا اور گرجا تھے۔[۱]

## مسلمانوں کی طرف سے مایوسی:

گارسان وتاسی نے اپنے کئی لکچروں میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مبلغین عیسائیت کو مسلمانوں میں بہت کم کامیابی حاصل ہورہی ہے پھر بھی وہ بالکل مایوس بھی نہیں ہیں وہ اپنے چودہویں لکچر میں جو اس نے ۵؍دسمبر ۱۸۶۴ء کو دیا ہے وہ کہتا ہے:

''انگریزی مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے، بہرحال ہندوستان اور ترکی ہر دو ملکوں کے مسلمانوں میں مذہبی بیداری پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ ایک جماعت جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاحی کام کرے، دراصل خود اس انجمن کا رجحان بہت کچھ مسیحی مذہب کی طرف ہے، عموماً مسلمان دراصل مسیحی تعلیم سے اس قدر دور نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے، ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خان ہیں جو غازی پور میں ہیں۔[۲]

## عیسائیت کے فروغ پر مسرت:

گارسان وتاسی نے اپنے اس لکچر میں جو اس نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا ہے دو مشنریوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتا ہے:

---

۱۔ خطبات گارسن وتاسی ج:۱، ص:۳۷۹-۳۸۰

۲۔ خطبات گارسن وتاسی ج:۱، ص:۴۱۷-۴۱۸

''ہندوستانیوں میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب ہمارے تمدن اور ہمارے مذہبی ماحول سے قریب ہوتے جاتے ہیں، یہ مذہبی اصول مسیحیت ہماری تہذیب وتمدن کا ماخذ ہیں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہورہی ہے اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہئے[1]۔

وہ گرجاؤں میں گائے جانیوالے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مسلمانی گیت ہندو گیتوں سے مختلف ہوتے ان میں سے بعض شجاعت علی کے اپنے ہیں، موصوف پہلے مسلمان تھے اب دین مسیحی قبول کرلیا ہے، آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجا میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں[2]''۔

## جائزے اور خوش فہمیاں:

گارسان وتاسی اپنے چودہویں لکچر میں ایک موقعہ پر کہتا ہے:

مہاراجہ دلیپ سنگھ جب حال ہی میں ممبئی سے گذرے تو ڈاکٹر ولسن نے گرجا میں ہندی زبان میں دینی لکچر دیا اس لئے کہ حاضرین میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جو انگریزی سمجھتے، مہاراجہ نے ۱۲/اپریل کو ''دی جزیلزم انسٹی ٹیوٹ'' کے عظیم الشان ہال میں ان تمام ہندوستانیوں کو مدعو کیا جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے اس دعوت میں ساڑھے چار سو آدمی شریک ہوئے اس موقعہ پر متعدد تقریریں ہوئیں، ڈاکٹر ولسن نے مہاراجہ کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی اہمیت بتلائی اور کہا کہ اس کا دوسرے ہندوستانیوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا، ایک مسیحی مشنری نے دکن میں مسیحی مذہب کی تبلیغ واشاعت کے متعلق تفصیلات بیان کیں اور کئی دیسیوں نے بھی تقریریں کیں، آپ لوگوں کو معلوم

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱ص:۳۸۷

[2] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱ص:۳۷۹

ہوگیا ہوگا کہ مشنریوں کی جدوجہد ہندوستان میں بالکل رائیگاں نہیں گئی گذشتہ سالوں میں ڈاکٹر ڈف کو خاص کامیابی حاصل ہوئی، موصوف پچھلے سال ہندوستان میں ۲۴/ سال رہنے کے بعد انگلستان واپس آگئے ہیں آپ کی مساعی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا ہوگیا ہے آپ نے پورا وقت ہندوستان میں مذہب کی تبلیغ واشاعت پر صرف کیا[۱]"۔

## پادری صفدر علی کا ذکر:

گارسن وتاسی صفدر علی کے عیسائی ہونے کا ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے، اس کی مسرت بجا بھی ہے کیونکہ وہ پڑھا لکھا اور ذہین وفطین آدمی تھا بعد میں علماءِ اسلام سے اس نے مناظرے کئے اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں اس نے بڑی سرگرمی دکھائی گارسن وتاسی نے اپنے پندرہویں لکچر جو اس نے پیرلیس یونیورسٹی میں ۴/ دسمبر ۱۸۶۵ء کو دیا اس میں اس داستان کو مزے لے لے کر سناتا ہے۔

"ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کو زیادہ کامیابی اب تک نہیں حاصل ہوئی لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے مسیحی مذہب کی تعلیم کو قبول کرلیا ہے چنانچہ ناگپور کے ایک تعلیم یافتہ اور ممتاز مسلمان نے جو جبل پور کے ناظر مدارس ہیں اور جن کا نام مولوی صفدر علی ناگپوری ہے ابھی حال میں مسیحی دین قبول کیا ہے، موصوف نے مسیحی مذہب کی کتابوں کو پڑھ کر اور اس کی صداقت کا قائل ہوکر خود بخود مذہب تبدیل کرلیا، ان کے اثر سے ایک اور مسلمان عیسائی ہوگیا جو ان کے ماتحت اسکول میں مدرس تھا، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کام کررہے ہیں ان میں اینگلیکن اور دوسرے غیر کیتھولک شامل ہیں، ہمارے خیال میں کیتھولک

[۱] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱ص:۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱

مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں دس لاکھ کیتھولک موجود ہیں[1]"۔

## میلوں ٹھیلوں میں مسیحی مبلغین:

مسیحی مبلغین اور پادری ہندوستانیوں کے میلوں ٹھیلوں میں بھی عوام کو ورغلانے کا کام بڑی تندہی اور مستعدی سے کرتے تھے، گارسن وتاسی اپنے خطبہ میں کہتا ہے:

"مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش ظاہر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں دیتے چنانچہ میلوں کے موقعہ پر جو مذہبی اور تجارتی دونوں اہمیت رکھتے ہیں ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگا لیتے ہیں، تقریریں اور وعظ کہتے ہیں اور رسالے تقسیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، چنانچہ پچھلے دنوں ۲۸/جنوری کو گنگا جمنا کے سنگم آلہ آباد میں میلے کے آخری دن کہتے ہیں کہ کوئی ستر ہزار نفوس موجود تھے اس میلے میں ان مبلغوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا، ۲۱/دسمبر کو ممبئی کے بشپ نے ۹ کم عمر ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کی رسم ادا کی ان میں دو مسلمان ہیں ایک پارسی ہے ایک تامل ہے چار مرہٹے ہیں اور ایک اودھ کا ہندو ہے ان کے علاوہ دس لڑکیاں بھی مسیحی دین کے حلقہ میں داخل کی گئیں ان میں سے دو مسلمان ہیں، اس سال ۹/اپریل کو کلکتہ کے بشپ نے امرتسر میں چالیس سے زیادہ ہندوستانیوں کو داخل مسیحیت کیا[2]"۔

## کچھ نئے عیسائی ہونے والے کا ذکر:

گارسن وتاسی نے اپنے سولہویں لکچر میں جو اس نے ۳/دسمبر ۱۸۶۶ء کو پیرس یونیورسٹی میں دیا، اس میں اس نے کچھ نئے عیسائی ہونے والوں کا ہمیں پتہ بتایا ہے وہ کہتا ہے:

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲، ص:۵۹-۶۰

[2] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲، ص:۶۰-۶۱

''باوجود مسیحی کلیساؤں کے اختلاف کے کوئی نہ کوئی مشہور ہندوستانی مسیحی مذہب قبول کرتا رہتا ہے، بعض ایسے مسلمانوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے جو اپنی تعلیمی یا معاشرتی حیثیت سے ملک میں ممتاز سمجھے جاتے تھے چنانچہ مولوی کریم الدین جو ہندوستانی زبان کے مشہور انشاء پردازوں میں ہیں اور ان کے بھائی مولوی عماد الدین جو خود فاضل آدمی ہیں لیکن جن کو شہرت حاصل نہیں، یورپین لوگوں کے میل جول سے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مسیحی مذہب سچا اور اسلام باطل ہے، ان میں مولوی عماد الدین بھی غالباً عنقریب باقاعدہ مسیحی مذہب میں شامل ہو جائیں گے، بہرحال اب دونوں مل کر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، جس میں اسلامی اصولوں پر اعتراضات ہوں گے[1]''۔

## قابل اطمینان کامیابی:

عیسائی مبلغین کی مسلسل جدوجہد کا ثمرہ ان کے حق میں اچھا نکلا، انہوں نے عیسائیت کے فروغ میں اطمینان بخش حد تک کامیابی حاصل کرلی، اب یورپین مشنریوں اور پادریوں کے علاوہ خود ہندوستانی عیسائی بھی بڑی تعداد میں پادری کے عہدوں پر سرفراز ہوکر تبلیغ عیسائیت میں سرگرم حصہ لینے لگے، یہ داستان بھی ہم کو گارسن وتاسی کے سترہویں خطبے میں ملتی ہے جو اس نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۷ء کو دیا تھا، وہ کہتا ہے:

''بالعموم ہندوستانیوں میں جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ جاہل طبقہ کے لوگ نہیں ہوتے، لکھے پڑھے لوگ ہوتے ہیں، چنانچہ ان میں بعض تو راہبانہ سلسلوں میں بھی داخل ہوگئے ہیں، مدراس کے بشپ نے پچھلی مرتبہ مذہبی نگرانی کے دورے میں پانچ ہزار دوسو باون (۵۲۵۲) دیسی لوگوں کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی تصدیق کی، انہیں دیسی لوگوں میں سے نوکو پادری مقرر کیا اور گیارہ کو ڈیکن (مددگار پادری) ابھی حال میں متھرا میں ایک ہندو

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۱۲۴-۱۲۵

جانو نے عیسائی مذہب قبول کرلیا وہ ایک مدرسہ چلا رہا تھا، چنانچہ ممبئی کے لاٹ پادری نے اس کو پادری کے عہدے پر باقاعدہ مامور کردیا۔

آگرہ کے کلیسا میں ہر اتوار کو دومرتبہ ہندوستانی زبان میں عبادت کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، پچھلے سال اسی گرجا میں آٹھ آدمیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا، اضلاع میں بھی گرجے قائم ہوگئے ہیں، جہاں عیسائی لوگ عبادت کیلئے جمع ہوتے ہیں، بہرحال عیسائی مبلغین کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ابھی حال میں ہاتھرس میں بعض مبلغین کی مار پیٹ کی گئی، اور ان پر پتھر پھینکے گئے۔

مسیحی مبلغین کو نسبتاً ان نیم وحشی اقوام میں بھی کامیابی ہورہی ہے، جو انگریزوں کے زیر حکومت اس وسیع سرزمین کے تحت بعض گوشوں میں زندگی بسر کررہے ہیں، چنانچہ بنگال کی مغربی سرحد اور ناگپور کے جنوب کے علاقے کے درمیان ایک جرمن مشنری نے حال میں چودہ ہزار نفوس کو مسیحی حلقہ میں داخل کرلیا ہے[1]"۔

## ترقی پذیر عیسائیت:

گارسن وتاسی نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۸ء کے خطبہ میں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی کامیابی کا جائزہ لیا ہے اس جائزہ میں امید ویاس دونوں پہلو ہیں، پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ جس سرزمین پر ایک متنفس بھی عیسائی نہیں تھا، مشنریوں کی انتھک جدوجہد نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں لاکھوں عیسائی پیدا کردیئے اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے، مایوسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حکومت کے جابرانہ طریقے پر پورا بھروسہ کرلیا تھا کہ بزور قوت چند سالوں میں ہم پورے ملک کو یا کم ازکم اس کی بڑی اکثریت کو دام عیسائیت میں ضرور گرفتار کرلیں گے، یہ توقع ان کی پوری نہیں ہوئی، گارسن وتاسی کہتا ہے:

"اس سچے مذہب (مسیحیت) کی ترقی اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں ہورہی

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲، ص: ۱۴۸-۱۴۹

ہے جیسی کہ ہونی چاہئے تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کام کیا جارہا ہے وہ نہایت ٹھوس ہے۔

رسالہ ''سالنامہ تبلیغ واشاعت'' میں ہندوستان کے کیتھولک عیسائیوں کی تعداد آٹھ لاکھ بتائی گئی ہے ان میں سے ایک لاکھ ۶۰/ ہزار سیلون میں ہیں جیسا کہ وہاں کے نمائندہ پوپ نے واضح کردیا ہے، آج اس وقت ہمارے زمانے میں بھی پر جوش مبلغین مسیحیت ہندوستان میں جوش اور خلوص کے ساتھ کام کررہے ہیں، قدیم شرک وکفر کے ماننے والوں اور جدید فطرت پرستی کے علمبرداروں کے مقابلہ میں ان مبلغین کو ہر جگہ کامیابی ہورہی ہے، مسٹر آر کلاک نے اپنے خطہ مورخہ ۱۳/ فروری ۱۸۶۸ء میں شہر امرتسر کے چرچ مشن کے متعلق مجھے بعض اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، اس کا تستان کے آزاد کلیسا کی شاخ جونا گپور میں قائم کی گئی ہے، مسیحی تہذیب وتبلیغ کا کام کمال خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، لاہور کا امریکی مشن بھی خوب پھل پھول رہا ہے، شہر سیہور میں جو بیگم صاحبہ بھوپال کے حدود حکومت میں ہے تقریباً چالیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک کلیسا تعمیر کیا گیا ہے، اس رقم کا بیشتر حصہ خود بیگم بھوپال صاحبہ اور ہلکر والی اندور نے اپنے پاس سے دیا ہے، دیسی امراء نے بھی چندے سے اس کام میں مدد دی، اس سال کے دوران میں بعض ممتاز مسلمان مسیحیت کے حلقے میں داخل ہوئے ہیں، چنانچہ دہلی کے شاہی خاندان کے کئی ایک شہزادیوں کے بپتسمہ کی رسم ابھی حال ہی میں ادا کی گئی ہے۔

اخبار عالم مورخہ ۲۱/ مئی ۱۸۶۸ء میں ایک عجیب وغریب واقعہ درج ہے، مسیحی مبلغین اور مسلمان مولویوں نے ایک موقعہ پر باہم یہ طے کیا ہے کہ وہ آپس میں پرسکون طور پر مباحثہ کریں گے اگر مبلغین مسیحیت کے دلائل تسلی بخش ثابت ہوئے تو مولوی ان کا مذہب قبول کرلیں گے، ورنہ وہ اسلام کے حلقے میں اپنے تئیں شامل کرلیں گے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس مباحثہ کا انجام کیا ہوا؟

لیکن بہرنوع مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ مسلمان کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ مباحثہ میں ہار گئے، پچھلے سال عمادالدین کے مسیحیت قبول کرنے اور اس کی تصنیف کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں جس میں اس نے اسلام کی تردید کی ہے، اس کتاب کا نام ''تحقیق الایمان'' ہے، مجھے اس کا ایک نسخہ پہنچ چکا ہے۔

گارسن وتاسی سر سید احمد خان کی ایک کتاب کا بھی ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کی کتابوں سے عیسائیت کے فروغ اور تبلیغ واشاعت میں بڑی مدد ملے گی، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس نے ان کی کتاب کا تفصیلی تعارف اپنے لکچر میں کرایا ہے وہ اپنے اٹھارہویں لکچر میں جو ۷/دسمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا کہتا ہے:

''اردو کی اور بعض دوسری کتابیں جنہیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائبل کی تفسیر پر لکھی ہے یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے میری مراد سید احمد خان کی تفسیر بائبل سے ہے[۱]''۔

## آخری جائزہ:

موسیو گارسان وتاسی کا آخری خطبہ ۶/دسمبر ۱۸۶۹ء کو دیا گیا، اس میں اس نے تبلیغ عیسائیت کا ایک بھر پور جائزہ لیا ہے اور انگریزی حکومت کے پھیلائے ہوئے تعلیمی جال سے اس کو توقع ہے کہ بتدریج اس راہ سے عیسائیت کو ہندوستان میں فروغ حاصل ہوگا، یعنی اس نے ایسا خواب دیکھا جو مستقبل میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، وہ اپنے انیس سالہ تجربات ومشاہدات کے بعد کچھ صاف صاف باتیں بھی اس نے کہی ہیں وہ اپنے اس لکچر میں کہتا ہے:

''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں

---

۱ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۲۰۱-۲۰۲

میں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں گے، مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، لیکن ہندو اس باب میں زیادہ سخت ہیں چنانچہ انہیں کی جماعت کے افراد مسیحی مذہب زیادہ قبول کررہے ہیں، ایک کتاب اردو میں لکھی گئی ہے، مدارس کے محترم اسقف نے ازراہ عنایت اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے، اس کتاب سے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی ہے، ہر جگہ مولویوں نے جلسے کرکے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے، جو لوگ ابھی حال میں مسیحی زمرے میں شامل ہوئے ہیں ان میں مولوی سراج الدین پانی پتی قابل ذکر ہیں ان کی عمر اس وقت سو سال ہے اور وہ اس وقت انگریزی کلیسا میں پادری ہیں وہ عماد الدین کے والد ہیں، ان کے بھائی خیر الدین اور ان کی بیوی اور خود عماد الدین کی بیوی کے سوا اس خاندان کے سب افراد نے عیسائی مذہب قبول کرلیا ہے، کریم الدین اس خاندان کے واحد شخص ہیں جو اب تک اسلام کے نام لیوا ہیں، ایک دن آنے والا ہے جب پورا ہندوستان مسیحی جھنڈے کے تلے ہوگا ہمیں پوری توقع ہے، براہ راست حکومت برطانیہ کے تحت اس وقت ۱۵ ارکروڑ ہندوستانی زندگی بسر کررہے ہیں، ان میں سے دس لاکھ پ ترانوے ہزار عیسائی ہیں ان میں چھ لاکھ چالیس ہزار رومن کیتھولک اور چار لاکھ ترپن ہزار پروٹسٹنٹ وغیرہ ہیں، گیارہ کروڑ برہمنی مذہب کے ہندو ہیں تیس لاکھ بدھ مت کے متبعین ہیں دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہیں، ایک کروڑ بیس لاکھ قدیم باشندے ہیں جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں ستر لاکھ پارسی اور یہودی وغیرہ ہیں[1]۔

عیسائیت کی تبلیغ اور حکومت کے رویہ کے سلسلہ میں ان لکچروں کو خصوصیت سے

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲، ص:۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷

اس لئے منتخب کیا گیا کہ یہ وہی زمانہ ہے جب یہ مہم پورے شباب پر تھی اور اس کے یہ لکچر ہندوستان سے بہت دور پیرس میں طلبہ کے سامنے دیئے گئے ہیں، کسی پروپیگنڈہ کی غرض سے نہیں کہ بہت سے حقائق کے اظہار میں مصلحت مانع ہو، اس نے پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ یہ معلومات فراہم کی ہیں، چونکہ اس کا ذریعہ معلومات ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ذمہ دار حکام تھے اس لئے اس کی معلومات مستند بھی ہیں اور قابل قبول بھی۔

ان لکچروں کے علاوہ ہندوستان میں لکھی جانے والی بہت سی کتابوں سے بھی ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور عیسائیت کی تبلیغ میں حکومت کی چیرہ دستیوں اور اس کے مستبدانہ رویہ کا واضح ثبوت ملتا ہے، ان کتابوں میں خاص طور سے سرسید کی ''اسباب بغاوت ہند'' قابل ذکر ہے جس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ حکومت کے رویہ سے بلا امتیاز ہر شخص یہ یقین کئے ہوئے ہے کہ حکومت تمام ملازمین سرکار کو ایک دن بجبر واکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی طرح عام ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے سلسلہ میں کلکتہ کے لاٹ پادری کی وہ گشتی چھٹی بھی نقل کی گئی ہے جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجبر واکراہ عیسائی بنانے کی کاروائی کا آغاز کر دیا جائے۔

یہی وہ ماحول اور حالات ہیں جب **دارالعلوم دیوبند** کا قیام عمل میں آیا۔

# تصویر کا دوسرا رُخ

ہم نے کوشش کی ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں جب ہندوستانی مسلمانوں کا نیر اقبال مائل بہ زوال ہوتے ہوتے ایک غیر معین مدت تک کے لئے غروب ہوگیا، اس وقت اور اس کے متصلاً بعد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے عوامل ان کے ماحول اور گردوپیش کے حالات، ذہنی وفکری ارتداد کے حوادث اور ان کی اپنی عملی شناخت کھودینے پر ایک ہلکی سی روشنی ڈال دیں، اس سلسلہ میں ہم نے انیسویں صدی کے فتنہ عظیم عیسائیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ فتنہ صرف عیسائی مشنریوں کا پیدا کردہ ہوتا اور اس کی پشت پر کوئی دوسری مادی طاقت نہ ہوتی تو علماء اسلام اس کو کب دفن کر چکے ہوتے، لیکن عیسائیت کا تبلیغی کارواں جب ہندوستان میں گرم سفر ہوا تو بانگ جرس کے پس منظر میں چمچماتی ہوئی تلواروں کی جھنکار بھی صاف سنادے رہی تھی جو ہر دل کو خوف وہراس کی آماجگاہ بنارہی تھی، اس لئے یہ مشنری کارواں نہیں بلکہ عیسائیت کی مسلح فوج کا مارچ تھا، صرف صورت سوداگروں کی تھی، جذبات اور حوصلے غارتگرانہ تھے، بالکل ایسے ہی جیسے یہ سفید فام قوم ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اوڑھے مچھلی، بانس اور نیل کی تجارت کرتے ہوئے بنگال میں میر جعفر کو لے کر سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو اپنے چند ہزار سپاہیوں کے تعاون سے چند گھنٹوں میں دھول چٹادی، میسور میں میر صادق اور پورنیا کو سامنے کھڑا کرکے سلطان ٹیپو جیسے بہادر فرمانبردا کو ایسی جگہ مارا جہاں اس کو پانی نہ مل سکا۔

اسی طرح عیسائیت کا ہندوستان میں سفر بھی دونوں رخ رکھتا تھا، ایک طرف پادری جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو مناظرہ کے لئے للکارتے بھی رہے دوسری طرف اگر عیسائی مشنریوں کی راہ میں کسی نے رکاوٹ ڈالنے کی غلطی کردی تو حکومت کی مشنری اس کو پیس کر رکھ دیتی تھی، اس وقت تمام کلیدی عہدوں پر

مشنری ذہن ومزاج کے حکام رکھے جاتے تھے، پولیس کو حکم تھا کہ تبلیغ عیسائیت میں پادریوں کو بھرپور تعاون دے اس لئے جب مجمع عام میں پادری اسلام پر اعتراضات کے زہریلے تیر چلاتے تھے اور مسلمانوں کے مذہب اور پیغمبر کی ذات مقدس پر تنقید کرتے اور لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دیتے تھے، تو ہر شخص صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ پادریوں کی زبان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظالم حکمراں بول رہے ہیں۔

## حکومت کی ہیبت اور رعب داب:

انگریز سوداگروں کی ہندوستان میں ابھی نئی نئی حکومت تھی، ہندوستان کی سرزمین ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زاری بنی ہوئی تھی اور اس سے بڑے مظالم کے لئے یہ انگریز حکومت پرتول رہی تھی ایسے حالات میں کس کی ہمت تھی کہ پادریوں کے ان چیلنجوں کا جواب دے اور ان کی دعوتِ مبارزت قبول کر کے میدان مناظرہ میں اترے لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو چکا، تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے اصول کے مطابق اسلامی غیرت وحمیت نے ایک بار جوش مارا اور ایک مردِ مجاہد سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر پڑا، اور وہ مولانا[1] رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے انہوں نے خطرات سے صرفِ نظر کیا، مصلحت اندیشی کو ٹھوکر ماری اور عشق کی امتحان گاہ میں اتر پڑے۔

---

[1] مولانا رحمت اللہ کیرانوی اپنے دور کے جید عالم تھے اور ایک رئیس کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شاہانِ مغلیہ کی طرف سے ان کے آباء واجداد کو بہت بڑی جاگیر دی گئی تھی، آپ کی پیدائش محلّہ دربار قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں جمادی الاول ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں ہوئی آپ عثمانی شیوخ میں سے ہیں، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور تکمیل دہلی کے مدرسہ مولانا حیات میں کی، مزید تعلیم کے لئے آپ نے لکھنؤ کا سفر کیا اور مفتی سعد اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے معاصرین ایک ہی جذبہ جہاد سے ان سب کے سینے معمور تھے، کچھ دِنوں آپ نے اپنے محلّہ دربار میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور کئی مشہور علماء کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، ۱۸۵۴ء کا حادثہ ہوگیا، حکومت کو انتقام کا بہانہ ہاتھ آگیا، آپ کو گرفتار کر کے سزا دینی چاہی لیکن بہ عنایت خداوندی خفیہ طور پر مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اور وہیں سکونت اختیار کر لی، سلطانِ ترکی کو جب اطلاع ملی کہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے والے عالم مکہ مکرمہ میں ہیں تو ان کو با قاعدہ دعوت نامہ دے کر ترکی بلایا اور بڑا اعزاز کیا، ترکی سے واپسی کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو آج بھی جاری ہے، تقریباً پچاس سال مکہ میں مہاجر بن کر رہے اور ۲۲/ رمضان ۱۳۰۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے جوارِ جنت المعلاۃ میں آسودۂ خواب ہوئے۔ (اسیرؔ ادروی)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

## مناظرۂ اکبرآباد:

عیسائی پادریوں کا سرخیل پادری فنڈر تھا، اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز دارالسلطنت دہلی کو بنایا تھا، دہلی کا شاہجہانی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات اور علماء اسلام کو مناظرہ کا چیلنج کیا کرتا تھا، لیکن مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اوران کی مثال اس چڑیا کی تھی جسے کسی شکاری نے پکڑ کر پروں کو باندھ دیا تھا، اس لئے پادری فنڈر کے دعویٰ مبارزت کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، حالات کی ناسازگاری کے باجود ابھی ہندوستان میں ایسے علماء موجود تھے جوفولادی عزم وارادے کے مالک تھے، وہ اسلام پران شدید حملوں کو دیکھ کر ضبط نہ کرسکے، ایسے ہی لوگوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر پادری فنڈر کی دریدہ دہنی اور لاف زنی کا جواب دینے کا تہیہ کرلیا اور سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں اتر پڑے اورانہوں نے اعلان کیا:

> ''میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علماء مسیحیین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان الحق کا منصف ہے اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تا کہ حق واضح ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ علماء اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لئے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ وہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے''۔

مولانا کیرانوی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے لئے جدوجہد فرمائی کہ پادری فنڈر کو مجبور کردیں کہ وہ میدان مناظرہ میں آئے اور بالمشافہہ مجمع عام میں گفتگو کرے، آپ مہاراجہ بنارس کے میر مختار مولوی امیر اللہ صاحب کو لے کر پادری فنڈر کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تا کہ مناظرہ کے لئے گفتگو کریں، فنڈر مکان پر نہیں تھا

اس لئے آپ نے ۲۳/ مارچ ۱۸۵۴ء سے پادری فنڈر سے خط و کتابت کا آغاز کیا اور اس سلسلہ کا آخری خط مولانا موصوف نے ۷/اپریل ۱۸۵۴ء کو لکھا ان خطوط میں عنوان مناظرہ، مقام، اور تاریخ مناظرہ طے ہوئی اور طرفین کے اتفاق سے مناظرہ کے ابتدائی مراحل طے ہوئے اور مورخہ ۱۱/رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰/اپریل ۱۸۵۱ء کو اکبرآباد (آگرہ) میں بمقام کٹرہ عبدالمسیح ہونا طے پا گیا۔

## مناظرہ سے حکومت کی دلچسپی:

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان یہ مناظرہ نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے دم خم اور جرأت و ہمت اور انگریزی حکومت کے رعب وداب، طاقت و جبروت کے درمیان مقابلہ تھا، چونکہ پوری انگریزی قوم ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا عزم بالجزم کئے ہوئے تھی اور اس راہ کا سنگ گراں صرف مسلمان بن رہا تھا اس لئے حکومت مسلمانوں کو اس موقعہ پر بھی مرعوب کرنا ضروری سمجھتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے معرکۃ الآراء مناظرہ میں شریک ہونے والے عوام وخواص کی تعداد تو ایک ہزار سے بھی کم تھی لیکن حکومت کی انتظامیہ کے بڑے عہدیدار اور فوج کے بہت سے اعلیٰ افسران اس مناظرہ میں شرکت کے لئے کٹرہ عبدالمسیح اکبرآباد میں موجود ہیں، مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی مسٹر کریسچن سکنڈ صدر صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈلی ترجمان حکومت، پادری ولیم گلبن اور ہندوستانی ملازمین حکومت میں منشی ریاض الدین، مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس اس مناظرہ میں شریک ہیں، مسلمانوں کی حمایت و ہمدردی میں مولوی قمرالاسلام امام جامع مسجد آگرہ منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، منشی سراج الحق جیسے کچھ افراد بھی شریک مناظرہ تھے۔

مسلمانوں کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر تھے اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں آپکے معاون تھے، عیسائیوں کی طرف سے یورپ کا مایہ ناز پادری فنڈر مناظر تھا،

اور اسکی امداد اور تعاون کیلیئے درجنوں اردو فارسی اور عربی کے ماہر پادریوں کی فوج تھی۔

## موضوع مناظرہ:

موضوع مناظرہ کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان بنیادی اختلافی مسائل ہیں انہیں پر مناظرہ ہوگا، وہ پانچ مسئلے ہیں، تحریف انجیل، نسخ انجیل، عقیدۂ تثلیث، حقیقت قرآن، نبوت محمدی، پہلے تین مسائل میں مسلمان مدعی ہوں گے، اور عیسائی مناظرین اس کا جواب دیں گے، حقیقت قرآن اور نبوت محمدی کے ثبوت ودلائل مسلمان مناظر کی طرف سے دیئے جائیں گے، لیکن پہلے ہی مسئلہ تحریف انجیل زیر بحث آیا تو یورپ کے مایہ ناز پادریوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے، اور ان کو احساس ہوا کہ ہماری لن ترانیاں اسی وقت تک تھیں جب تک مسلمان تلوار کے خوف سے زبان بند کئے ہوئے تھا اور جب دلائل وشواہد، اعتراضات اور سوالات وجوابات کی کسوٹی پر مسلمان مناظر پادریوں کی علمی صلاحیتوں کے کھوٹے سکوں کو پرکھنے لگا تو وہ سب سے ردی ثابت ہوں گے اور سوائے ذلت وشرمساری کے ان کے مقدر میں اور کچھ نہیں ہوگا، چنانچہ روداد مناظرہ ہم کو یہ ساری تفصیل سناتی ہے۔

## مناظرہ کا اہم ترین موضوع:

پادری فنڈر نے اپنی کتابوں میں جابجا لکھا تھا اور اپنی تقریروں میں وہ اس بات کو بار بار بانگ دہل کہتا تھا کہ جب تک اہل اسلام عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو محرف ثابت نہ کردیں، انہیں دوسری باتوں پر بولنے کا کوئی حق نہیں ہے، مناظرہ میں بھی سب سے پہلے یہی مسئلہ زیر بحث آیا تو کتب مقدسہ کی تحریف کو ثابت کریں ورنہ قرآن کو چھوڑ کر عیسائیت مذہب قبول کرلیں۔

شرائط مناظرہ کے ساتھ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ دونوں فریق میں سے کوئی بھی فریق اپنے حریف کی باتوں کا جواب نہیں دے سکے گا، تو وہ دوسرے فریق کے مذہب کو قبول

کرلے گا، اسلئے پادری فنڈر اسی مسئلہ تحریف پر مسلمانوں کی زبان بند کردینا چاہتا تھا۔

## مباحثہ کا آغاز:

سب سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اسٹیج پر آئے اور آپ نے انجیل کے محرف ہونے پر متعدد دلائل پیش کیے، لیکن جب پادری فنڈر تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے ان دلائل کو بے وزن اور نا قابل توجہ قرار دیا اور کہا کہ ان دلائل سے انجیل کا محرف ہونا ثابت نہیں ہوتا، انجیل میں تحریف اس وقت ثابت ہوسکتی ہے جب آپ لوگ ایسی عبارت پیش کریں جو اگلے نسخوں میں تو نہ ہو لیکن حال کے نسخوں میں وہ عبارت پائی جاتی ہو۔

## تحریف کا نا قابل تردید ثبوت:

مولانا رحمت اللہ صاحب کے دست راست ڈاکٹر وزیر خان عبرانی زبان سے واقف تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تحریف کے مسئلہ پر وہ پورے طور پر تیار تھے، انہوں نے یوحنا کے پہلے خط باب ۵ آیت ۷، ۸ کا حوالہ دیا کہ سب مانتے ہیں کہ یہ آیات پرانے نسخوں میں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے نسخوں میں موجود ہیں، یہ ایسا نا قابل انکار ثبوت تھا کہ مجبوراً پادری فنڈر کو کھڑے ہو کر کہنا پڑا کہ ہاں صاحب یہاں اور ایک دو جگہ اور تحریف ہوئی ہے۔

یہ بات سنتے ہی مسٹر اسمتھ صدر دیوانی نے جو پادری فرنچ کے برابر بیٹھے ہوئے تھے ان سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ مسلمان بے پناہ خوشی سے اچھل کود رہے ہیں، پادری فرنچ نے ان کو بتایا کہ یہ مولوی صاحب مفسروں کی کتابوں سے چھ سات مقامات جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے نکال کر سند لائے ہیں، اس کے بعد پادری فرنچ نے کھڑے ہو کر کہا کہ فنڈر صاحب بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ انجیل مقدس میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے، اس بات پر مولوی قمر الاسلام صاحب امام

جامع مسجد آگرہ نے منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار سے کہا کہ آپ لکھ لیجئے کہ پادری صاحب نے آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کیا ہے، پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا کہ ہاں ضرور لکھ لیں، میں کہتا ہوں کہ سات آٹھ جگہ تبدیل اور تحریف ہوئی ہے۔

بس اس بات کا اعلان ہونا تھا کہ مسلمان مارے خوشی کے اچھل پڑے اور یورپین عیسائیوں کے ہوش اڑ گئے، کہ یہ کیا ہو گیا؟ پادری فنڈر اب تک مسلمانوں کو چیلنج کرتا رہا کہ وہ انجیل میں تحریف کا ثبوت دیں مگر اب مناظرہ کے پہلے ہی دن آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کر گئے، ادھر مسلمانوں کے چہرے روشن تھے ادھر عیسائی پادریوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جب پادری فنڈر نے یہ صورت حال دیکھی اور یہ محسوس کیا کہ اس نے عیسائیت کا بیڑہ ہی غرق کر دیا تو وہ ذرا سنبھلے اور بولے کہ مانا کہ کہیں کہیں تحریف ہوئی ہے مگر انجیل کی اصولی تعلیم میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا، یہ کہتے ہوئے آپ کو اتنا جوش آیا کہ مفتی ریاض الاسلام صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ ہی بتائیے کہ ایسی تحریفوں سے انجیل مقدس کے مطالب میں کیا فرق واقع ہوتا ہے؟

## جواب باصواب:

جب پادری فنڈر نے مفتی صاحب کو مخاطب کیا تو مولانا کیرانوی کے بجائے خود مفتی صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ:

> ”پادری صاحب! جب کسی دستاویز اور وثیقہ میں ایک جگہ جعل اور ملاوٹ ثابت ہو جائے تو پورا وثیقہ نا قابل اعتماد ہو جاتا ہے، اگر بقول آپ کے آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے تو اس کا اعتماد جاتا رہا، کیا ثبوت کہ دوسری جگہ تحریف نہیں ہے؟ اور پھر یہ بھی بتائیے کہ جب عبارت کا اختلاف آپ کے نزدیک مسلم ہے تو جہاں کہیں دو عبارتیں مختلف ہوں تو آپ ان دونوں میں سے ایک کو جزاً خدا کا کلام ٹھہرا سکتے ہیں، یا نہیں؟

اس پر پادری فنڈر نے کہا کہ نہیں، وہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا، مفتی صاحب نے اس پر فرمایا کہ مسلمانوں کا یہی تو دعویٰ ہے کہ موجودہ بائبل کا مجموعہ سب کا سب جزاً خدا کا کلام نہیں ہے اور جب خدا کا یقینی طور پر کلام نہیں ہے تو پوری کتاب ناقابل یقین ہوگئی، اس کا جواب پادری صاحب سے نہ بن پڑا اور وقت کے ختم ہونے کا بہانہ بنا کر میدان مناظرہ چھوڑ دیا''۔

## پادری فنڈر کی بدعہدی:

شرائط مناظرہ میں یہ اہم ترین شرط بھی شامل تھی کہ اگر مولانا کیرانوی پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے، تو وہ مذہب عیسوی قبول کرلیں گے اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا تو وہ اسلام قبول کرلے گا، جلسہ کے حکم اور اونچے طبقے کے انگریز حکام، با اثر مقامی افراد ذی علم ہندو اور مسلمان اشخاص کی پوری جماعت میدان مناظرہ میں موجود تھی، ہزاروں کے اس مجمع میں پادری فنڈر کی زبان پر تالا پڑ گیا، حسب شرائط اپنی شکست تسلیم کرکے اسلام قبول کرلینا چاہئے تھا، لیکن بے غیرتی کا بُرا ہو وہ مسلمان تو کیا ہوتا البتہ اس کے چہرے پر سیاہی پھر گئی۔

ہزاروں کے اس مجمع میں مسیحیوں کو ایسی ذلت آمیز شکست نصیب ہوئی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر فرار کرنا پڑا، بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر مگر پادری فنڈر غائب وہ منہ چھپا کر بھاگا تو سیدھے لندن جا کر ٹھہرا۔

## بہت بے آبرو ہوکر......

چونکہ اس مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی اور اس کا سارا رعب داب زائل ہوچکا تھا، حتیٰ کہ اس کے معاون پادریوں میں پادری فرنچ اور اس کے دوسرے ساتھی پادریوں میں بھی مایوسی پھیل گئی اس لئے فنڈر نے یہی مناسب سمجھا کہ آئندہ کوئی مناظرہ نہ ہو، حالانکہ ابتداء یہ طے ہوچکا تھا کہ جب تک تحریف اور تنسیخ کا

مسئلہ انجام کو نہ پہنچے بحث کا سلسلہ جاری رہے گا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے معاون ڈاکٹر وزیر خان کئی ہفتے اکبر آباد میں مقیم رہے اور پادری فنڈر سے مطالبہ کرتے رہے کہ مناظرہ کی دوسری مجلس منعقد کیجئے مگر وہ راضی نہیں ہوا اور یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ آئندہ خط وکتابت کے ذریعہ گفتگو ہوسکتی ہے، مولانا رحمت اللہ صاحب نے دیکھ کر کہ پہلے ہی مباحثہ میں خدا کے فضل سے عیسائیت کو کھلی شکست ہوئی، علماء اسلام اور عوام وخواص پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑا اس لئے پادری فنڈر کو بیک بنی ودوگوش نکل بھاگنے کا موقعہ دے دیا۔

## راز درون خانہ:

اس مناظرہ کے بعد یہ حال ہوا کہ حضرت مولانا کیرانوی جس طرف نکل جاتے ہندو مسلمان خوش ہوکر مبارک باد دیتے اور عام طور سے لوگ کہتے تھے کہ اس مناظرہ نے ہزاروں انسانوں کے ایمان کو بچالیا اور پادریوں کو ایسی کھلی شکست ہوئی کہ اب وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے۔

ایک مسلمان باورچی پادری فرنچ کے یہاں ملازم تھا، مولانا کیرانویؒ کے پاس آکر وہ تمام باتیں سناجاتا تھا جو پادریوں کی خفیہ مجلس میں مناظرہ کے دوران ہوتی رہتی تھیں، اس کا بیان ہے کہ تمام پادری سر جوڑ کر رات کے دو بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مولوی رحمت اللہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے، کوئی کہتا ہے کہ ڈاکٹر محمد وزیر خاں انگریزی اور عبرانی زبان سے واقف ہے، کسی کا مشورہ یہ ہوتا کہ مناظرہ صرف چند گھنٹے ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ اس کا اثر اچھا نہیں پڑے گا، غرض یہ مناظرہ کیا ہوا کہ پادری فنڈر اور اس کے ساتھیوں کی کمریں ٹوٹ گئیں اور سمجھ گئے کہ علماء اسلام سے بازی لیجانا ممکن نہیں۔

## مناظرہ کی رودادیں:

چونکہ پورا ملک عیسائیت کی یلغار سے سہا ہوا تھا، حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں

اور پادریوں کی پشت پناہی اور تعاون کی وجہ سے پادریوں کی آواز سے حاکمانہ غرور جھلکتا تھا اور طاقت کا احساس دلا رہا تھا، اس کے بالمقابل مسلمان انگریزوں کا کمزور حریف بنا ہوا تھا اس لئے عیسائیت کے خلاف لب کھولنے کے لئے فولاد کا جگر اور پتھر کا کلیجہ چاہئے تھا، اس لئے ملک میں ہر طرف سناٹا تھا، مخالفت کی ایک آواز بھی کہیں سے سنائی نہیں دیتی تھی، اس لئے جب مولانا کیرانوی نے اکبرآباد میں عیسائیت کے سب سے بڑے اژدہے پر بھرپور اور کاری وار کیا اور اس کی زہریلی پھنکار اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تو پورے ملک نے بڑی بے تابی سے مناظرہ کی کارروائیوں کو جاننا چاہا، شرکاء مناظرہ بھی اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے تھے اس لئے مناظرہ کے دونوں دنوں کی کارروائی ضبط کی جاتی رہی اور فوراً بعد اس کو شائع بھی کر دیا گیا۔

یوں تو مناظرہ کی مفصل کارروائی اس وقت کے بیشتر اخبارات میں شائع ہوتی رہی لیکن اخباری خبروں سے کہیں زیادہ لوگ جاننا چاہتے تھے اس لئے مفصل روداد ہی ان کی تشنگی کو دور کرسکتی تھی، اس کی پہلی روداد فارسی میں مطبع منعمیہ اکبرآباد سے منشی محمد امیر خان نے ''مباحثۂ مذہبی'' حصہ اول کے نام سے شائع کی، جس کے ٹائیٹل پیج پر نام کے نیچے عبارت تھی:

> ''فیما بین جناب مولوی رحمت اللہ صاحب پادری فنڈر صاحب در شہر اکبرآباد واقع شدہ، آں راسید عبداللہ اکبرآبادی ترجمہ نمودہ''۔

یہ روداد ۱۸۷ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۲۷۱ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، خود پادری فنڈر نے اپنی شکست پر مہر لگانے کے لئے اس مناظرہ کی روداد سکندر آرفن پریس آگرہ سے ۱۸۵۵ء میں ''اختتام دینی مباحثہ'' کے نام سے چھپوائی جو ۱۵۲/ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس مناظرہ کی اور دوسری کئی ایک رودادیں اسی سال شائع ہوئیں، یہ رودادیں خود پادری فنڈر کی نگاہوں سے بھی گذریں، وہ خود اپنی شائع کردہ روداد میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''اوپر کا خط روانہ کرنے کے بعد مباحثہ کا وہ بیان میری نظر میں آیا جو دہلی سے فارسی زبان میں شائع ہوا، جس کو وزیر الدین ابن شرف الدین نے ''البحث الشریف'' کے نام سے طبع کرایا''۔

اس مناظرہ کی روداد کو اردو، فارسی، اور انگریزی زبانوں میں کثرت سے شائع کیا گیا اور اس قدر یہ رسالے مقبول ہوئے کہ ان سے گھبرا کر خود پادری فنڈر کو بھی اپنی طرف سے روداد شائع کرنی پڑی، مگر سچ ہے کہ اس نے اس مناظرہ میں مولانا کیرانوی کے ہاتھوں ایسی ذلت آمیز اور رسوا کن شکست کھائی تھی کہ وہ اپنی روداد میں بھی اس کو نہ چھپا سکا۔

## مناظرہ کا پس منظر:

اکبر آباد کے مناظرہ کی روداد جاننے کے لئے پورا ملک کیوں مضطرب تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اگر مناظرہ کا پس منظر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے تو آپ ان بے چینیوں کا کچھ اندازہ کر سکیں گے جو لوگوں کو مناظرہ کی کیفیت اور سرگذشت جاننے کے لئے دلوں میں موجزن تھیں۔

بات یہ تھی کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، باد صرصر کا ایک ہلکا جھونکا بھی اس کے بجھانے کے لئے کافی تھا دوسری طرف انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں، اور عملی طور پر مسلمانوں کی حکومت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، اس کا دائرہ اختیار صرف دہلی شہر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اس زمانہ میں کہا جاتا تھا ''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم'' انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا، دل میں امنگیں تھیں اور جذبات لمبی سے لمبی چھلانگ لگانے کے لئے مہمیز کر رہے تھے اس لے انگلستان میں اسکیم بنی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے ایک بہت بڑی مہم شروع کی جائے کیونکہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی، اور ملک کے

بت پرستوں کو عیسائی بنالینا بہت آسان ہو جائے گا، عام خیال تھا کہ پادری صاحب کے دلائل کا جواب مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے، خصوصاً ان کی کتاب ''میزان الحق'' کا جواب کسی مسلمان عالم سے نہیں ہوسکتا، اور تو اور خود مسلمان ان کتابوں سے بہت مرعوب تھے اور بعض نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ معاذ اللہ اسلام جھوٹا ہے، اور پادری جو کچھ کہتے ہیں وہی حق ہے، چنانچہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس مناظرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ماحول کا نقشہ اپنی کتاب ''ازالۃ الشکوک'' میں ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''اب ان وجوہ کا تذکرہ کرتا ہوں جس کے سبب یہ مباحثہ ہوا، اول یہ کہ روز بروز شور وغل پادریوں کا بڑھتا چلا جاتا تھا اور زبانی فریاد کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہماری باتوں کا جواب نہیں بن پڑتا ہے اور اپنے رسالوں کے اخیر میں ایسی ایسی باتیں چھاپنے لگے تھے، اس پر میں نے چاہا کہ اپنے مقدور کے مطابق میں بھی ہاتھ ہلاؤں شاید اللہ کچھ ثمرہ نیک دیوے۔

دوم یہ کہ جس عیسائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے جو کچھ تذکرہ آیا اس کی تقریر سے ہی معلوم ہوا کہ ''میزان الحق'' ان کے گمان میں ایسی ہے کہ گویا الہام سے لکھی گئی ہے اور مسلمان اس کے جواب سے عاجز ہیں اگر ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ بات غلط ہے، میزان الحق کا کیا ذکر اس کے مصنف سے بھی مسلمانوں کو کچھ خوف نہیں تو وہ کہتے تھے کہ صاحب جب تم کو اس سے پالا پڑے تب جانو۔

سوم یہ کہ جب میں ایک تقریب سے اکبر آباد کا عازم ہوا تو چلتے وقت ماسٹر رام چندر نے کہ مجھ سے محبت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ عیسائیت کا دم بھر کے پادریوں سے بھی زائد تعصب میں قدم بڑھا بڑھا کر رکھتے تھے اور میزان الحق کے بڑے معتقد تھے کہا کہ اگر اتفاق ہو تو پادری فنڈر سے ملئے گا۔

چہارم یہ کہ جب اکبر آباد پہنچا تو بعض بعض کو تذبذب میں پایا، اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ اگر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم ہم کو قائل کر دیتے ہو اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لاجواب کر دیتا ہے

تو ہم کس کو سمجھیں کہ تم ہی حق پر ہو اور وہ باطل پر یا بالعکس، بلکہ ہم تو حیرت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہاں اگر مقابلہ منہ در منہ ہو جائے تو ہماری حیرانی کچھ دفع ہو جائے۔

(کتاب ازالۃ الشکوک مؤلفہ مولانا رحمت اللہ کرانوی جلد دوم ص ۴۷۴)

## حکومت کی اسکیم فیل ہوگئی:

اکبرآباد کے مناظرہ نے درحقیقت اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کا رول ادا کیا جو عیسائیت کی شکل میں یورپ سے بڑی روانی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آرہا تھا، اور پورا پورا خطرہ تھا کہ سارے ملک کو بہالے جائے گا، مولانا کیرانوی کی جرأت ایمانی نے مؤرخ کے ہاتھ سے قلم چھین لیا جو ہندوستان میں اندلس کی تاریخ دہرائے جانے کی کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا، پورا یورپ منصوبہ بند طریقے سے ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی مہم چلانے کے لے میدان میں اتر چکا تھا اور ایک نحیف الخلقت انسان نے اتنی بڑی اور طاقتور حکومت کے سارے پروگرام کو چشم زدن میں خاک میں ملا دیا، یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ حکومت اس کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرسکتی تھی اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس کینہ پرور انگریز قوم نے مولانا کیرانوی کی اس جرأت ایمانی کو معاف نہیں کیا۔

## حکومت کا انتقام:

ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے انگریز قوم نے ایک مستقل پلان بنایا کہ منصوبہ بند طریقے سے پورے ملک کو اندلس کی طرح عیسائی بنادیا جائے تو یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارے قبضہ میں رہ جائے گا، اگر ہندوستان میں اسلام زندہ رہے گا تو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا محل کبھی بھی زمیں بوس ہوسکتا ہے، اسی جذبے اور خیال کے ماتحت ایک مکمل نقشہ عمل مرتب کیا گیا

اور اس کے مطابق کام کا آغاز بھی کر دیا گیا لیکن جس شیر کو مردہ سمجھ کر اس کو زمین میں دفن کر دینے کی تیاری کر رہے تھے وہ ایک بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی فطری زلزلہ افگن ڈکار لی تو پادریوں کی فوج پر سکتہ طاری ہو گیا اور خوف و دہشت سے کونوں اور کھدروں میں چھپنے لگی، پادری فنڈر بھاگا بھاگا پھرتا رہا یہاں تک کہ ہندوستان سے مایوس ہو کر یورپ چلا گیا اور ہندوستان میں ناکامی کی وجہ سے وہاں بھی اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تو بھاگ کر ترکی چلا گیا، اور جب مولانا رحمت اللہ ترکی پہنچے اور اس کو خبر لگی تو وہاں سے راتوں رات نکل گیا، اس کے بعد پھر کبھی بھی یورپ کی کسی کھڑکی سے ہندوستان کی طرف جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی اور گمنامی کی زندگی گذار کر کہیں مر کھپ گیا۔

## غدر ۱۸۵۷ء:

پادری فنڈر کے علاوہ ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں حشرات الارض کی طرح پادریوں کی جوفوج رینگ رہی تھی وہ خود سمٹ کر ہندوستان کے ساحلی اور جنگلی علاقوں کی طرف چلی گئی اور جرائم پیشہ اور وحشی اقوام میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگ گئی اور ہندوستان کے شہری علاقوں اور متمدن، تعلیم یافتہ صوبوں میں کچھ کہنے اور کرنے کی ان میں ہمت نہیں رہ گئی، یہ انگریزی حکومت کی بہت بڑی ناکامی تھی، اس کا بنا بنایا سارا منصوبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا جس کی وجہ سے انگریزی حکومت جھنجھلائی ہوئی تھی اور مسلمانوں پر دانت پیس رہی تھی مگر انتقام کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تھی، مسلمانوں کی یا ہندوستان کی بدقسمتی سے ڈھائی سال بعد ۱۸۵۷ء کا حادثہ پیش آ گیا، ہندوستان کی غیرت ایک بار اور بیدار ہوئی اور میرٹھ سے بغاوت کا بگل بجا دیا گیا، اور دہلی پر قبضہ کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک آخری کوشش کی گئی لیکن ہندوستان اس کوشش میں بھی ناکام ہو گیا، انگریزوں نے ہندوستان بالخصوص مسلمانوں سے بھرپور انتقام لیا اس درندگی و بربریت کے نظاروں کو دیکھ کر پوری دنیائے انسانیت چیخ

پڑی، مکھی مچھر کی طرح مسلمانوں کو عذاب کی چکی میں پیس دیا گیا، مسلمانوں کو پھانسی دینے کیلئے میلے لگائے جاتے، تماشائیوں کی بھیڑ اکٹھا کی جاتی اور مسلمانوں کو توپ کی نال سے باندھ کر توپ چلادی جاتی، اس معصوم انسان کے جسم کے گوشت کے ٹکڑے کاغذ کے پرزوں کی طرح فضا میں اڑنے لگتے اور زمین پر خون کی بارش ہو جاتی۔

یہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کفن بر دوش شریک ہوئے اور انگریزی فوجوں سے دست بدست جنگ کی، اس موقعہ پر انگریزوں نے اپنے ان دشمنوں کو بھی فراموش نہیں کیا، جنہوں نے ان کے فروغ عیسائیت کے منصوبہ کو ڈائنامیٹ کیا تھا، اس لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان کیسے بچ سکتے تھے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے وارنٹ کے ساتھ اکبر آباد مناظرہ میں پیش پیش رہنے والے ان دونوں بزرگوں کو بھی گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھانے کے ارادہ سے پولیس کو ان کی گرفتاری پر لگایا۔

پولیس کیرانہ کے محلّہ دربار میں پہنچی جہاں مولانا موصوف کا مکان تھا، پولیس کو مخبر نے بتایا کہ مولانا مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں، پولیس نے مسجد کا محاصرہ کرلیا، لیکن مولانا کو موقعہ مل گیا اور مسجد کے حجرے سے نکل کر جس کا دروازہ محلّہ کے ایک مکان میں تھا اور ادھر سے جنگل ملا ہوا تھا، پنجیٹھ گاؤں میں چلے گئے جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے، جس میں کیرانہ کے عثمانی خاندان اور انصاری شیوخ کی زمینداری تھی، مولانا اپنے ایک کاشتکار کے یہاں ٹھہر گئے، پولیس کے مخبر نے پھر پولیس کو خبر کردی، پولیس پنجیٹھ پہنچی اور کاشتکار کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور گھر کی تلاشی لی۔

وہ کاشتکار گاؤں کا مکھیا تھا اس کو جب فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے مولانا موصوف سے کہا کہ آپ کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، گورہ فوج اسی کھیت کی پکڈنڈی سے گذری مولانا بیان کرتے تھے کہ میں کھیت میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگتی تھیں، میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آخر مولانا بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہنچے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہوگئے مگر ایک پولیس افسر نے مولانا کو پہچان لیا اور فوٹو سے چہرے کی مطابقت کر کے فوٹو اور وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے مگر میں مسلمان ہوں یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل ہی رہے تھے کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہوگیا، مولانا بخیریت مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور ساری زندگی وہیں گذاری مکہ میں مدرسہ صولتیہ آپ کی مقدس یادگار ہے ۲۲/ رمضان ۱۳۰۸ء مطابق ۱۸۹۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

## ڈاکٹر وزیر خان:

اکبرآباد میں عیسائی مناظرین کو ذلت آمیز شکست دینے میں مولانا رحمت اللہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان بھی تھے، اس مناظرہ میں ان کا رول بہت نمایاں تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے شدید دشمنوں میں شمار کیا اور ان کے نام وارنٹ جاری کردیا گیا، گرفتاری کا مطلب تختہ دار تھا، ڈاکٹر صاحب بھی اس سے بے خبر نہیں تھے وہ خفیہ طور پر حدود ہند سے نکل گئے، کچھ دنوں بعد حکومت کو پتہ چلا کہ ڈاکٹر وزیر خان مکہ معظّمہ میں ہیں، انگریزوں نے ترکی حکومت کو لکھا اور زور ڈالا کہ ہمارا مجرم آپ کے حدود سلطنت میں ہے اس لئے آپ گرفتار کر کے ہمارے حوالے کردیں۔

سلطان ترکی نے مکہ کے گورنر کو لکھا کہ ڈاکٹر وزیر خان کو گرفتار کرلیا جائے، چنانچہ گورنر نے ڈاکٹر وزیر خان کو بلایا اور باب خلافت سے آئے ہوئے حکم سے ان کو باخبر کیا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اللہ اور رسول کی پناہ میں آگیا ہوں، مجھے یہاں سے گرفتار کر کے دشمنان دین کے حوالہ کرنا کسی طرح آپ کے لئے جائز نہیں، اور اگر مجھے گرفتار کرنا ہی ہے تو میری گرفتاری سے پہلے فلاں قبیلہ کے سردار سے گفتگو کرلیجئے، کیونکہ میں اسی قبیلہ کے ساتھ زندگی گذار رہا ہوں، ڈاکٹر صاحب کا سردار قبیلہ سے تعارف اس کی قریب مرگ بیوی کے کامیاب علاج کے ذریعہ ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا

اس قبیلہ میں بڑا اعزاز واحترام تھا، گورنر نے سردار قبیلہ کو بلایا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تو سردار نے گورنر سے کہا کہ آپ بے شک ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر سکتے ہیں، مگر اس وقت جب میرے قبیلے کے بیس ہزار جوانوں میں سے ایک ایک کٹ کر مر نہ جائے اس وقت تک آپ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہیں کر سکتے۔

گورنر نے ڈاکٹر صاحب کا جواب اور سردار قبیلہ کی بات لکھ کر دربار خلافت کو بھیج دی، خلیفہ نے انگریزوں کو جواب لکھ دیا کہ کسی مسلمان کو حرم محترم سے گرفتار کر کے کافروں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، اس طرح ڈاکٹر وزیر خان انگریزوں کے شکنجۂ عذاب سے محفوظ رہے، پوری زندگی حرم محترم کے جوار میں گذار کر اسی پاک سرزمین میں آسودۂ خواب ہوئے۔

# تبلیغ عیسائیت کا دوسرا دور

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی جدوجہد کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جدوجہد جو غدر ۱۸۵۷ء سے قبل شروع کی گئی اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنجۂ استبداد مسلمانوں کی حکومت کے گلے پر سختی کے ساتھ جم چکا تھا، حکومت مغلیہ کے چراغ کی لو آخری سانس لے رہی تھی، دہلی دربار میں انگریزی ریذیڈنٹ رہنے لگا تھا اس کی مرضی کے بغیر بہادر شاہ ظفر اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا اور عملاً انگریز ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا۔

یورپ میں جب یہ سنا گیا کہ انگلستان کے چور، اچکے، بدمعاش و بدکردار افراد بھاگ کر ہندوستان گئے تھے وہ بانس، مچھلی، بھس اور نیل کی تجارت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے ہندوستان جیسے وسیع و زرخیز ملک پر قابض ہو گئے اور وہاں کے بادشاہ کو مٹھی میں لے لیا ہے تو انگلستان میں خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی، اب یہی بداطوار افراد جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی تھی یورپ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، کیونکہ کمپنی کے ارکان جب لندن جاتے تھے تو ہندوستان میں بے انتہا کمائی کی وجہ

سے وہاں شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے تو عام انگریزوں کو ان کی قسمت پر رشک ہونے لگتا تھا اس لئے فطری طور پر ہندوستان میں کاروبار کرنے والے انگریزوں کا یورپ میں وقار واعزاز بڑھ گیا، اس لئے وہاں کی حکومت نے ان کے ساتھ بھر پور تعاون وامداد کا فیصلہ کرلیا کہ ہندوستان پر انگریز قوم کا قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے، اس کی تدبیر وہاں کے دانشوروں کے ذہن میں یہ آئی کہ ہندوستان میں ایک مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقے سے عیسائیت کو پھیلا جائے کیونکہ جب ہندوستان میں عیسائیت پھیل جائے گی اور وہاں کی اکثریت عیسائیت قبول کرلے گی تو ان کو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے انگریز قوم سے ہمدردی ہو جائے گی اس سے انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا اس کا ایک کامیاب تجربہ وہ اندلس میں کر چکے تھے یہ تو طے تھا کہ ہندوستان میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اور نظام حکومت چلانے کے لئے یورپ سے اتنی بڑی تعداد ہندوستان منتقل نہیں ہوسکتی کہ حکومت کے تمام شعبوں میں یورپین رکھے جائیں اس لئے انگریزوں نے دین عیسائیت کی محبت کی وجہ سے نہیں حکومت کی حرص سے بطور سیاست عیسائیت کے فروغ کا یہ لمبا چوڑا پلان بنایا، پادریوں کی ٹریننگ کے لئے تربیت گاہیں قائم کی گئیں، ان کو عربی فارسی اور اردو زبانیں سکھائی گئیں، اسلامی علوم وفنون پڑھائے گئے، تصنیف وتالیف کا سلیقہ سکھایا گیا اور مسلمانوں سے مناظرہ کی ان کو تربیت دی گئی اور جب آٹھ دس سال کی شب وروز کی جدوجہد کے بعد پادریوں کی یہ فوج تیار ہوگئی تو ان کو ایک جہاز سے لاکر ہندوستان کے ساحل پر اتار دیا گیا اور ملتان سے لے کر چاٹگام اور برما تک پادریوں کی اس فوج کو پھیلا دیا گیا، ہزاروں کی تعداد میں یورپین پادری اپنے لمبے چوڑے بجٹ کے ساتھ ہندوستان میں سرگرم کار ہو گئے۔

## پادریوں کی کارگذاری:

چونکہ ان پادریوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے وہ بلا جھجھک

جہاں چاہتے کھڑے ہوکر اسلام کے خلاف زہر چکانی کرتے رہتے تھے، خالص مسلمانوں کے مجمع میں وہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نشانہ تنقید بنائے مگر کسی مسلمان میں یہ ہمت وجرأت نہیں تھی کہ انہیں ٹوک سکے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر کتنا خوف وہراس چھایا ہوا تھا۔

پادریوں کی جدوجہد کا مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوتا تھا، کچھ ممتاز قسم کے ہندوؤں نے عیسائیت قبول کر لی، مسلمانوں میں بھی بعض خاندان عیسائی ہو گئے، ان عیسائیت قبول کرنے والوں کا خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا تا کہ دوسرے لوگ اس سے متاثر ہوں اسی دوران کلکتہ کے بڑے پادری ایڈمنڈ کی گشتی چٹھی نے ہندوستانیوں کے بالخصوص مسلمانوں کے دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا، اس نے حکومت سے اپیل کی کہ اگر ہندوستانی بخوشی عیسائیت قبول نہیں کرتے تو ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کردی جائے۔

اسی دوران ایک واقعہ اور ہوا ۱۸۳۷ء میں ایک بار زبردست قحط پڑا اور بے شمار بچے یتیم ہوگئے، حکومت نے ان بچوں کو اپنی تربیت میں لے لیا اور بعد میں سب کو عیسائی بنالیا چاہے وہ مسلمانوں کی اولاد رہی ہو یا ہندوؤں کی، ان واقعات کی وجہ سے پورا ہندوستان اپنی جگہ سہا ہوا تھا کہ انگریز افہام وتفہیم کے ذریعہ عیسائیت کی ابھی تبلیغ کررہا ہے عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ پورے ملک کو تلوار کی نوک پر عیسائی بننے کے لئے مجبور کردیا جائے گا، ادھر پادریوں کے پروپیگنڈہ اور یک طرفہ بیان کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا ایمان بھی ڈگمگانے لگا تھا یا کم از کم عیسائیت کے لئے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا اور اگر کچھ دنوں تک اور یہ پادری بے لگام رہتے تو نہیں معلوم اس کا انجام کیا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدان عمل میں کھڑا کردیا اور انہوں ہوا کا رخ بدل دیا۔

## پالیسی بدلی:

مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے مناظرہ کے بعد اتفاق سے چند سالوں بعد

ہی غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ ظہور پذیر ہو گیا جس نے انگریزوں کی ہندوستان میں بنیاد ہلا دی اور ان کو ہندوستان میں اپنا وجود بھی خطرہ میں نظر آنے لگا اس لئے سب سے پہلے مسئلہ ان کو اپنی حکومت کے بقاء کا درپیش ہو گیا اس لئے قدرتی طور پر تبلیغ عیسائیت کا جوش سرد پڑ گیا، اور اپنی پالیسی بدلنے پر ان کو مجبور ہونا پڑا۔

## غدر ۱۸۵۷ء کے بعد:

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی یہ مہم ختم ہو گئی یا اس مہم کی طرف سے سرد مہری برتی جانے لگی بس اتنا ہوا کہ وہ گرمی اور زبان و بیان کی تلخی باقی نہیں رہی، اب وہ محتاط طریقے پر اپنی مہم چلانے پر مجبور ہو گئے اور ایک دوسرے منصوبے کے مطابق کام آغاز کر دیا، نئی پلاننگ اور نئے نقشے کے مطابق اب ان کی ساری کارروائیاں ہونے لگیں۔

یورپ اور امریکہ میں چرچ کی آمدنی بے حساب تھی ان کا بجٹ ایک چھوٹی سی حکومت کے بجٹ کے برابر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ ہندوستان جو اس زمانے میں ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا تھا اس سونے کی چڑیا پر انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ نے زمام اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لے لی اس لئے ساری آمدنی چاہے حسب معمول طریقے سے ہو یا نئے نئے ٹیکس لگا کر سب کی مالک حکومت برطانیہ ہو چکی تھی اور حکومت ہی تبلیغ عیسائیت کی ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھی اس لئے عیسائیت کے فروغ پر بے تحاشا دولت پھونکی جا رہی تھی، ہر بڑے شہر میں عیسائی مشن قائم کئے جانے لگے، یہ مشن درحقیقت ایک بڑا ادارہ ہوتا تھا جس سے متعلق بہت سے افراد ہوتے تھے، اسی کے تحت مشن ہسپتال کھولے جاتے جو اعلیٰ پیمانہ پر کام کرتے، یورپ کے مایۂ ناز ڈاکٹر مشنری ذہن و مزاج کے ہوتے ان ہسپتالوں کے علاوہ ہر جگہ مشن اسکول کھولے جاتے اس میں بچوں کو اس نقطہ نگاہ سے تعلیم دی جاتی کہ وہ انگریزی حکومت کی مشنری کے بہترین پرزے ثابت ہوں اور عیسائیت کے لئے ان کے دلوں میں نرم گوشہ بھی پیدا ہو جائے، انجیل کی تعلیم

ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی تھی، ہر مشن میں چرچ کا ہونا ضروری تھا اس میں ہسپتال کے مریضوں اور اسکولوں کے اساتذہ اور طلبہ کو ہفتہ کے دن حاضری ضروری ہوتی، حضرت مریم کی تصویر کے سامنے دعائیں کرائی جاتیں، مریضوں کے لئے شفا کی دعائیں ہوتیں۔

غرضیکہ ہسپتال، اسکول اور چرچ وغیرہ پر لاکھوں لاکھ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا، مشن سے وابستہ ہر ہر فرد مشنری دماغ کا ہوتا ہر فرد کے اندر فروغ عیسائیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا تھا، ہسپتال میں کام کرنے والے ڈاکٹر اور نرسیں اور کمپاؤنڈر اسکول کے ٹیچرس تبلیغ عیسائیت کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے اس لئے جو مسلمان یا ہندو ان اداروں میں کام کرتا وہ بھی بالعموم عیسائی ہوجاتا تھا، اور اسکی خوب آؤ بھگت ہونے لگتی اس کا اعزاز بڑھ جاتا بسا اوقات اس کے پورے خاندان کے اخراجات کو یہ مشن پورا کرتا تھا، ان کی سفارشوں پر لوگوں کو نوکریاں دی جاتیں۔

## عیسائی مشنریوں کا دائرہ کار:

عیسائی مشنریوں نے کتنے وسیع پیمانے پر تبلیغ عیسائیت کو شروع کیا اس کا اندازہ ان رپورٹوں سے ہوتا ہے جو اپنی کارگذاری کے سلسلے میں کبھی کبھی شائع کی جاتی تھیں، عیسائیوں میں متعدد فرقے ہیں، ہر فرقہ اپنے وسائل وذرائع کے مطابق فروغ عیسائیت میں بھرپور حصہ لیتا تھا، ان فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور اور استطاعت کے موافق کل ہندوستان اور برما کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کرلیا تھا اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کی کارروائی پہلے سے تجویز کرلی تھی مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک اور ممالک مغربی وشمالی میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔

اب ان الگ الگ ملکوں کی عیسائی مشنریوں کے کتنے آدمی اور ادارے اس مہم

میں لگے ہوئے تھے اس کی وسعت اور حدود کار کو سمجھنے کے لئے صرف ایک شاخ میتھوڈسٹ ایسکوپل آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے کہ اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہند کی جنوبی منتہا راس کماری تک اور بلوچستان کے صدر شہر کوئٹہ کے لئے جو انگریزی عملداری کی مغربی سرحد ہے جزیرہ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک بیس لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی قصبہ اور قریہ ہندوستان کا باقی نہیں رہا جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو اور ہر مشن کے متعلق اتنے گرجے، شفاخانے، چھاپے خانے اور زمینداریاں وگرانٹ، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے مدارس ہیں کہ جن کے شمار سے عقل عاجز ہے۔

تحقیق کرنے والوں نے شمار کر کے بتایا کہ اس فرقہ کے دوسو پچاس مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں اسی سے آپ عیسائیوں کے دوسرے فرقوں کے وسیع نظام عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں، یہ مشن تعلیم وترقی کے نام پر اور مالی امداد کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے پوری قوت سے کوشاں تھے، جو لوگ عیسائیت کا شکار ہو جاتے تھے ان کی برابر خبر گیری اور مالی امداد بھی کی جاتی تھی، گورنمنٹ ان مشنریوں کی پوری امداد کرتی تھی اور ان کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتی تھی۔

## مشنریوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں تھی:

مختلف طبقات میں کچھ نہ کچھ عیسائیت کے جال میں گرفتار ہو جاتے تھے، کچھ اہل علم ہندوستانیوں نے بھی عیسائیت قبول کر لی اور انہوں نے بھی اپنی صلاحیتوں کو فروغ عیسائیت میں صرف کرنی شروع کر دی، یورپین عیسائیوں کے علاوہ دیسی عیسائیوں نے قریہ قریہ جا کر لوگوں کے ذہن ومزاج میں اسلامی عقیدہ کی بنیادوں کو کمزور کرنا شروع کر دیا، مسلمان گھرانوں کو جواب عیسائیوں سے زیادہ عیسائیت کے

فروغ میں مفید ثابت ہورہے تھے کیونکہ وہ اسلامی روایات سے واقف تھے اور جو زیادہ پڑھے لکھے تھے وہ قرآن کی تفسیروں میں اسرائیلی روایات کی خرافات کو اسلامی تعلیمات کہہ کر مسلمانوں کے ذہن وایمان کی دنیا میں زلزلہ پیدا کررہے تھے، مزید ستم یہ کہ ہندو گھرانوں سے جو تعلیم یافتہ افراد عیسائی ہوگئے تھے ان کا بھی نشانہ اسلام ہی تھا، ان میں سب سے مشہور نام ماسٹر رام چندر اور ٹھاکر داس کے تھے اول الذکر ایک اسکول میں ٹیچر تھے مگر جب وہ عیسائی ہوگئے تو ان کا اعزاز بہت بڑھادیا گیا انہوں نے کئی کتابیں اسلام پر اعتراضات کے سلسلہ میں لکھیں۔

## جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا:

انیسویں صدی کے آخر تک عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا عبدالحق انہیں دنوں اپنی تفسیر لکھ رہے تھے جو ۱۲۹۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے اس کا طویل ترین مقدمہ انہیں یورپین اور دیسی پادریوں کے ہفوات کے جوابات سے بھرا ہوا ہے، کسی تصنیف کا مقدمہ زمانۂ تصنیف کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ ہر مصنف کا قلم اس کے ماحول کی گرفت میں ہوتا ہے اس لئے کتاب کی ترتیب کے وقت جو حالات جذبات وخیالات اور تحریکات سماج کو متاثر کرتی ہیں ان کا تذکرہ کتاب کے مقدمہ میں اکثر آجاتا ہے، چونکہ تفسیر میں مناظرانہ رنگ کی بحثوں کی گنجائش ذرا کم ہی ہے اس لئے مولانا عبدالحق نے اصل تفسیر سے پہلے اپنے گردوپیش اور ماحول پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اس دور میں پیدا ہونے والے فتنہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور اسلام کی ترجمانی کی ہے۔

## سرسید کی تفسیر:

یہی زمانہ ہے جب سرسید نے اپنی تفسیر لکھی اور اسلام کے بہت سے حقائق کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا، اور ان کی مہمل اور خلاف حقیقت تاویلیں کیں اور اسلام

کے بہت سے عقیدوں کے بارے میں اپنے ذہن وفکر سے گھڑ کر ان کے چہروں کو مسخ کیا یہ سب کچھ انہوں نے صرف اس لئے کیا کہ یورپ کی نئی روشنی سے مرعوب تھے، پادریوں کے اعتراضات سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے جن باتوں پر وہ اعتراضات کرتے تھے ان کی ایسی خلاف واقعہ تاویلیں کرنا چاہتے تھے تا کہ ان کے اعتراضات سے بچا جا سکے چاہے اسلام کی تعلیمات کا حلیہ ہی بگڑ جائے اس کوشش میں انہوں نے چودہ سو برسوں کی متفق روایات کو ہفوات اور خرافات قرار دے دیا، اس سے آپ یورپین پادریوں کے اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

انہیں اسباب کی وجہ سے مولانا عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں ان تمام اعتراضات کو نقل کر کے ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، میں جستہ جستہ اس مقدمہ کے اقتباسات دیتا ہوں تا کہ آپ کو ان اعتراضات سے اور دل آزار بکواس سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے جو انیسویں صدی کے اخیر دنوں تک عیسائیوں کی طرف سے جاری تھیں۔

## سوال و جواب کے سلسلے جاری تھے:

مولانا عبدالحق اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

اسلام کے وہ مخالف لوگ کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور انہوں نے حق و ناحق اسلام کی توہین کا بیڑا اٹھا رکھا ہے بلکہ اس کی تنخواہ پاتے ہیں اور خدا ترسی کو عمل میں نہیں لاتے ہیں ایسی ایسی بے سند باتوں سے اسلام پر بڑا اعتراض کرتے ہیں، چنانچہ پادری فنڈر ر پادری عمادالدین پانی پتی اور پادری صفدر علی صاحب اکبر آبادی اور ماسٹر رام چندر صاحب دہلوی نے تو کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اپنے ہم مذہبیوں کو خوش کرنے کو بڑے بڑے ضخیم رسالے بنا کر مشہور کر دیئے کہ جن کا جواب ناچار اہل اسلام کو دینا پڑا، ماسٹر رام چندر صاحب نے ''تحریف قرآن'' کے نام سے پندرہ سولہ جزوں کا رسالہ اسی بیان

میں لکھا ہے فقیر نے اس کے جواب میں ''تعریف القرآن'' لکھ کر پادری صاحبوں کی ناحق زبان درازی بتلائی ہے (مقدمہ تفسیر حقانی ص ۶۱)

## قرآن کو دنیا سے ناپید کرنے کا خبط:

پادریوں کی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ نے لکھا ہے، اگرچہ اس کی سند بہت قوی نہیں ہے لیکن عیسائی مشنریوں کی حرکات دیکھ کر دل یہ کہتا ہے کہ اگر ایسا انہوں نے سوچا اور اس پر عمل کیا ہو تو کوئی بعید بات نہیں، آپ پہلے واقعہ سن لیجئے مولانا عبدالحق نے اپنے مقدمہ کے صفحہ ۶۳ پر تحریر فرمایا ہے، وہ ہمیں بتاتے ہیں:

''ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب ابتداء عملداری انگریزی میں یہاں پادری لوگ آئے تو انہوں نے بخیال خام اس بات کے کہ یہاں مطابع تو ہیں نہیں، قلمی نسخوں پر مدار ہے مسلمانوں سے قرآن مجید کو گراں گراں قیمت پر خریدنے شروع کئے اور سالہا سال یہ معاملہ رہا چنانچہ میرٹھ اور دہلی کے بہت لوگ معمر اس کی شہادت دیتے ہیں وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک پادری میرے دوست تھے میں نے ان سے پوچھا کہ سچ کہو یہ اس قدر نسخے تم کیوں خریدتے ہو؟ بالآخر بڑے اصرار سے اس نے یہ راز بتلایا کہ یہاں کے مشن کی رائے ہے کہ ان لوگوں سے نسخے خرید لئے جاویں اور پھر جب قرآن بہت نایاب ہوں تو لندن سے مختلف نسخے قرآن مجید کے طبع کرا کے یہاں کے مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کئے جاویں بس مسلمانوں میں بڑا اختلاف قرآن میں پڑ جائے گا اور دین مسیحی کا خوب ظہور ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یہ خبط ہے اس سے کچھ بھی نہ ہوگا ناحق روپے صرف کرتے ہو چنانچہ اس کی بات سمجھ میں آ گئی اور خریدنا موقوف کیا''

☆☆☆

## دیسی پادریوں کی شرانگیزیاں:

اسلامی نام رکھنے والے پادریوں نے کیسی کیسی شرانگیزیاں کیں اور دل آزار باتیں لکھیں اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگی، مولانا عبدالحق اپنے اسی مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''پادری عمادالدین نے اپنی کتاب ''ہدایۃ المسلمین'' کے باب ہفتم اور فصل اول صفحہ ۲۵۱ سے لیکر صفحہ ۲۶۱ تک آنحضرت کا جو حال لکھا اس کے الفاظ ہیں، عرب میں ایک شہر مکہ ہے جس میں ایک مندر یعنی بت خانہ تھا جس کا نام کعبہ ہے، وہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا محمد صاحب کے باپ دادا وہاں کے پجاری تھے جب محمد صاحب پیدا ہوئے اور جوان ہوگئے، جب روزگار اور کمائی کی فکر میں کئی جگہ سفر اختیار کیا، آخر کار خدیجہ کے نوکر ہوگئے، اور شام میں گماشتہ کے طور پر تجارت کے لئے گئے چونکہ محمد صاحب نے کئی جگہ عیسائیوں کی گفتگو سنی تھی اور بت پرستی کے عیوب ان پر ظاہر ہوئے تھے کیونکہ ذرا غور سے بت پرستی کے عیوب ظاہر ہو سکتے ہیں بس محمد صاحب نے کار تجارت اختیار کیا اور یہودیوں اور رومن کیتھولک عیسائیوں سے اور پارسیوں سے اور شہریوں اور برریوں سے اور بحریوں سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ معاملہ کیا اس لئے طبیعت کی وہ تاریکی جو بت پرستی کا سبب ہے دور ہوگئی اس لئے محمد صاحب دین حق کے متلاشی ہوئے، چنانچہ سورہ والضحیٰ میں لکھا ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى اے محمد تو گمراہ تھا پس تجھے ہدایت دی''

پادریوں کی انہیں بدزبانیوں سے کبھی کبھی علماء اسلام کی زبان سے بھی تیز وتند باتیں پادریوں کی بارے میں نکل جاتی تھیں لیکن پھر بھی حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے تھے مولانا عبدالحق پادریوں کی کچھ بکواس کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

آپ کی قوم کی حکومت بھی ترقی پر ہے اور اولوالعزم بھی ہے جس کی وجہ سے

کروڑ ہا روپیہ بطور چندہ کے جمع ہو کر پادری لوگوں کو مشنوں مین تقسیم ہوتا ہے
جس پر پادری صاحب گھوڑوں اور بگھیوں پر چڑھے پھرتے ہیں، اور جس کا
روح القدس سن کر عماد الدین کو ایسی ایسی ناپاک اور گندی باتیں انبیاء علیہم
السلام کی نسبت کہلاتا ہے، اس پر بھی کوئی سچا عیسائی نہیں دکھائی دیتا اور جھوٹے
نئے عیسائی بھی باوجود اس کوشش کے دس بیس چمار یا حلال خور یا بعض مسلمان
وہنود ہیں، جو دنیا کی تنگی سے عاجز آ کر منافقانہ عیسائیوں میں جا ملتے ہیں،
عماد الدین کو دو مہینے تنخواہ نہ ملے تو دیکھئے پھر کیا کرتے ہیں؟:

پادری عماد الدین ضمیر فروشی کے ساتھ ساتھ بدزبان و بدلگام بھی تھا منہ میں جو آتا تھا بک جاتا تھا، اپنی کتاب ''ہدایۃ المسلمین'' میں ایک جگہ لکھتا ہے جیسا کہ مولانا عبدالحق ہم کو بتاتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں:

''محمد صاحب نے خاص وعام سب لوگوں کو یہ لالچ دیا کہ اگر میرے ساتھ
جاؤ گے، عورتیں مفت لوٹ میں ہاتھ آئیں گی تم ان سے صحبت کرنا، خدا کا بھی
اس میں گناہ نہیں''

اس طرح کی دل آزار تحریریں دیکھ کر علماء اسلام کا خون کھولنے لگتا تھا لیکن ان مرتد ہونے والے دیسی پادریوں کا دن رات یہی مشغلہ تھا وہ اسی کی تنخواہ پاتے تھے ان کی پشت پر عیسائی مشنریوں کا ہاتھ تھا اس لئے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور ہر مہینہ دو مہینہ پر کوئی رسالہ اس طرح کی تحریروں سے لبریز چھاپ کر مسلمانوں میں مفت تقسیم کرتے رہتے تھے جنہیں پڑھ کر بدن میں آگ لگ جاتی تھی، اور اب اس کا ردعمل مسلمانوں کی طرف سے بھی ہونے لگا تھا۔

یہی تمام رسالے اور کتابیں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہیں، اگرچہ سال دو سال انگریزوں کی دار و گیر کا سلسلہ جاری رکھنے کی وجہ سے سہا ہوا تھا لیکن چند ہی سالوں بعد حالات بدل گئے، فضا میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوا اور مسلمانوں کی کچلی اور روندی ہوئی غیرت وحمیت میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے تو مسلمانوں نے مصلحت اور

احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا، احساسِ کمتری سے نجات حاصل کر لی اس لئے اب ہر مسلمان ہر ہر قدم پر ان پادریوں کا پیچھا کرتے تھے اگر مجمع عام میں زہر چکانی کرتے تو وہیں منہ در منہ ان کا جواب دیتے اور تریاق مہیا کر دیتے اگر وہ ایک رسالہ لکھتے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کے جواب میں متعدد رسالے شائع کئے جانے لگے۔

## دیسی عیسائی اور پادری:

ہندوستان کے ہر قابل ذکر شہر میں قائم ہونے والے ان مشنوں کا آزادی سے قبل تک بڑا وقار تھا، ان مشنوں کے اسکول میں پسماندہ طبقات کے بچوں کو ان کے ماں باپ سے حاصل کر کے اپنی سرپرستی میں لے لیتے، ان کو مفت تعلیم دیتے، ان کو خوراک پوشاک کا انتظام کرتے اور اسکول کے ہوسٹل میں رکھتے ان لڑکوں کی تعداد ہر مشن اسکول میں سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی، یہ سب کے سب لڑکے بعد میں عیسائی ہو جاتے، ان کے ماں باپ کو مشن کی طرف سے مالی امداد دی جاتی تھی، اس لئے ان بچوں کے عیسائی ہو جانے پر کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی تھی، بڑے درجہ کے پادریوں کی کوشش سے کچھ اچھے گھرانوں کے لوگ بھی عیسائی ہو چکے تھے، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اگر یہ عیسائی ہونے والا مسلمان اسلامی علوم سے واقف ہے تو عیسائی ہونے کے بعد اس کو پادری کا عہدہ دے دیا جاتا، اس کا وقار بڑھا دیا جاتا اس کی بیش قرار تنخواہ مقرر کر دی جاتی اور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگتا تھا ایسے عیسائی ہونے والوں کو علماء اسلام سے مناظرہ اور مباحثہ کی ذمہ داری سپرد کی جاتی اور اسلام کے خلاف ان سے کتابیں اور رسالے لکھوائے جاتے اور ان کو کئی زبانوں میں شائع کیا جاتا، پادری صفدر علی نے ایم پی کے شہر جبل پور میں ۱۸۶۵ء میں عیسائیت قبول کی اور اس کو پادری بنا دیا گیا، امرتسر کا عماالدین ۱۸۶۶ء میں عیسائی ہوا، ایک کو کلکتہ میں اور دوسرے کو لاہور میں پادری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا، کنٹربری کے لاٹ پادری نے ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (علامہ الٰہیات) کی ان کو ڈگری دے کر ان کا

اعزاز اور بھی بڑھا دیا تھا، ان لوگوں کی سرگرمیاں انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہیں، صفدر علی نے ''نیاز نامہ'' لکھ کر مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کی مہم شروع کی، پادری عماد الدین نے مشن کی طرف سے شائع کی جانے والی کتابوں پر حاشیہ لکھ کر اور اسلام پر گندے اور ناپاک الفاظ تحریر کر کے ہندوستان کے عیسائیوں میں بڑا نام پیدا کیا۔

۱۸۵۷ء کے حادثہ کے بعد ساری قیامتوں سے گذرنے کے باوجود مسلمانوں کا دینی جذبہ سرد نہیں ہوا تھا، بلکہ اس میں علماء اسلام کی جدوجہد نے اضافہ ہی کیا تھا، ہر قابل ذکر شہر میں علماء اسلام ان پادریوں کا تعاقب کرتے ان سے مناظرے کرتے، ان کے جلسوں اور دعاؤں میں جا کر برملا ان پر اعتراض کرتے اور بحثوں میں پادریوں کو الجھاتے، حتی کہ مدارسِ اسلامیہ کے ذہین طلبہ بڑی دلچسپی سے ان مباحثوں میں حصہ لیتے، جمعرات یا جمعہ کو ان کے چرچوں میں جاتے اور جب پادری تقریریں کرتے تو یہ اعتراضات کرتے اور کبھی کبھی یہ بحث طویل ہو جاتی تو ان طلبہ کے اساتذہ بھی ان میں شریک ہو جاتے، دیسی پادری یورپین پادریوں کے ساتھ اس طرح رہتے جیسے مردہ خور گدھوں اور چیلوں کے ساتھ کوّے رہتے ہیں کہ ان کے منہ سے گوشت کی بوٹی گر جاتی تو ان کوؤں کے کام آتی، پادری صفدر علی پادری عماد الدین اور پادری محی الدین پشاوری اور دوسرے کئی مسلم نام رکھنے والے پادریوں کا یہی طریقہ کار تھا۔

## نیا جال اور پرانے شکاری:

غدر ۱۸۵۷ء سے انگلینڈ نے ایک سبق سیکھا کہ اگر عیسائیت کی تبلیغ میں ذرا بھی بے احتیاطی یا سختی یا حکومت کا تعاون ہندوستانیوں کو نظر آ گیا تو دوسری بار اس سے بھی بڑی بغاوت رونما ہو سکتی ہے چونکہ انگریزوں کی تعداد ہندوستان میں بہت زیادہ نہیں تھی اس لئے انگریزی حکومت کی فوج ہندو سکھ اور مسلمانوں پر مشتمل تھی اور غدر ۱۸۵۷ء کا باعث بھی مذہبی جذبات ہی تھے، سور اور گائے کی چربی لگے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کو فوجیوں نے یہی سمجھا کہ ہمارے مذہب کو تباہ اور ہمارے

دھرم کو حکومت بھرشٹ کرنا چاہتی ہے، اتنی بات پر پوری فوج باغی ہوگئی۔

اب تبلیغ عیسائیت کا سلسلہ ضرور جاری تھا لیکن انداز بدلا بدلا سا تھا اب پہلے جیسی سختی نہیں رہی، بحث ومباحثہ اور سوال وجواب کرنا ہر شخص کو کھلی آزادی تھی، پورے ملک میں مشن اسکول پھیلے ہوئے تھے ان اسکولوں میں بالعموم یورپین پادریوں کو رکھا جاتا تھا وہ اپنے اسکول کے طلبہ کے دل ودماغ میں عیسائیت کی تخم ریزی کرتے تھے، اور کبھی کبھی کسی گاؤں میں کسی میلے میں یہ پادری تبلیغ کے لئے بھی جاتے تھے اور لوگوں کے سامنے عیسائی مذہب کے فضائل اس کی برکات اور دنیا میں عیسائیوں کے عروج کی کہانیاں زور شور سے بیان کرتے تھے، کبھی کبھی کچھ لوگ ان کی باتوں سے اثر بھی لیتے تھے اور عیسائیوں سے قریب ہوجاتے تھے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کچھ ممتاز اور سربرآوردہ افراد کو یورپین پادری اپنی مجلسوں میں بہت اعزاز دیتے تھے ان کے ساتھ برابر کے دوستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے ان لوگوں کی سفارشوں پر حکومت میں ملازمتیں دلوادیتے تھے اور سرکاری تقریبات میں ان کو مدعو کرکے ان کا اعزاز کیا جاتا تھا، اس طرح ان کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوجاتا تھا۔

## مسلمان بھی چوکنا تھے:

اب پادریوں کا پہلا جیسا رعب داب نہیں تھا اور نہ ان کے دائیں بائیں پولیس اور تھانیدار چلتے تھے اس لئے جہاں بھی چھوٹے بڑے عالم تھے ان کا ناطقہ بند کرتے رہتے تھے اس کی وجہ سے پادریوں کی جدوجہد کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، دولت کا لالچ بھی اثر انداز نہیں تھا، غریب سے غریب مسلمان بھی کسی لالچ میں آکر عیسائیت نہیں قبول کرتا تھا، البتہ کچھ ضمیر فروش اور دولت کے حریص افراد عیسائیوں کو ضرور ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے چاندی کے چند سکوں کے عوض اپنا ایمان پادریوں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا ان کی تنخواہیں مقرر تھیں اور عیش وآرام کی زندگی بسر

کرنے لگے تھے، یہی ان کی معراج کمال تھی ایسے ہی لوگوں میں پادری عماد الدین پادری صفدر علی پادری محی الدین جیسے لوگ شامل تھے۔

جس طرح خطرناک علاقوں میں چلنے والا مسافر اپنے پالتو کتوں کو اپنی حفاظت کیلئے ساتھ رکھ لیتا ہے اسی طرح یورپین پادریوں کے پالتو کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنے لگتے تھے اور اپنے آقاؤں کی حفاظت کا فرض انجام دیتے تھے، شاہجہاں پور (اترپردیش) کے میلہ خداشناسی میں بھی ایسے کتوں کے بھونکنے کی آواز لوگوں نے سنی تھی۔

## ہندو طبقہ میں عیسائیت:

ہندو طبقہ پر عیسائیت کے اثرات مسلمانوں سے زیادہ تھے ان کا خوشحال طبقہ زیادہ متاثر تھا، ماسٹر رام چندر اور شاہجہاں پور کے رئیس اور جاگیر دار منشی پیارے لال، اور منشی مکتا پرشاد بہت سے ناموں میں سے چند نام ہیں، آریہ سماج جو ہندوؤں ہی کی ایک شاخ ہے اس کا جنم ہی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے، اور پادریوں کے اثرات کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ فرقہ مورتیوں کی پوجا کا منکر ہے، یہ فرقہ یورپین پادریوں سے قریب تر تھا کیونکہ میلہ خداشناسی چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں آریہ سماجیوں کو پادریوں کے شانہ بہ شانہ دیکھتے ہیں اور مباحثہ میں وہ علماء اسلام کے مقابلہ میں پادریوں کی ہم نوائی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

منشی پیارے لال چاند پور ضلع شاہجہانپور کے جاگیر داروں میں سے تھے، شاہجہانپور مشن اسکول کے ماسٹر پادری نولس نے ان کو اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا تھا اور اپنی تبلیغی جدوجہد میں ان کو استعمال کرتے رہے۔

پادری نولس نے انکو مشورہ دیا کہ آپ اپنی مملوکہ زمین اور باغات واقع موضع سرباننگ پور ملحق سوانہ چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں میلہ خداشناسی کے نام سے ہندو اور مسلمانوں کا اجتماع کرواور سب کو دعوت دواور کوشش کرو کہ عوام کی بھیڑ اس میلہ میں شریک ہو، مقصد یہ تھا کہ مشہور پادریوں کو اس میلہ میں بلا کر عوام اور بالخصوص

مسلمانوں کو متاثر کیا جائے اگر پادریوں نے علماء اسلام کی زبان بند کردی تو پورے ہندوستان میں اسلام کی ہوا اکھڑ جائے گی، اور عیسائیت کا بول بالا ہو جائے گا اور در پردہ یہ سازش تھی کہ آریہ سماجی ہندوؤں کے اہل علم کو بھی بڑی تعداد میں مدعو کیا جائے بالخصوص آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کو شریک مباحثہ کیا جائے، ایک طرف سے پادریوں کا اسلام پر حملہ ہو دوسری طرف آریہ سماجی اسلام کو نشانہ بنائیں، اس دوطرفہ حملہ کی مسلمان تاب نہیں لائیں گے، اس طرح ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

## میلہ خدا شناسی شاہجہاں پور:

چاند پور ضلع شاہ جہاں پور کے رئیس منشی پیارے لال نے پادری نولس کے حکم سے پہلی بار ۱۸۷۶ء میں اس بین المذاہب مباحثہ کا آغاز کیا اور اس کا نام میلہ خدا شناسی رکھا، اس اجتماع کے لئے باقاعدہ شاہجہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج گری سے اجازت لے کر پوسٹر چھپوائے گئے اور تقسیم کئے گئے، اخبارات میں اعلان کیا، اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے یورپین پادریوں کے ساتھ دیسی پادریوں کو بھی مدعو کیا گیا، آریہ سماج کے نمائندوں اور سناتن دھرم کے پنڈتوں اور علماء اسلام میں سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی متکلمانہ تقریر نے ہوا کا رخ بدل دیا، کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تقریر کے بعد اسلام پر اعتراضات کرے اسی کے ساتھ دو باطل مذاہب کے ناقابل عمل ہونے پر جو دلائل دیئے گئے اس کا جواب بھی دوسرے مذاہب کے نمائندوں سے نہ ہوسکا، مباحثہ کی کئی نشستیں ہوئیں اور بہت سے مسائل زیر بحث آئے اور ہر ایک میں علماء اسلام نے مرعوب کن اثرات ڈالے، اور عام طور پر عوام میں مسلمانوں کی فتح مندی کا شہرہ ہوا، اس مباحثہ کے دوررس اثرات ہوئے اس لئے دوسرے سال ۱۸۷۷ء میں پھر یہ میلہ منعقد کیا گیا اب کی بار اس کی شہرت اور زیادہ ہوئی اس لئے دور دراز سے بڑی تعداد میں لوگ اس میلہ میں آئے، اس لئے یہ مباحثہ ہندوستان گیر اثرات کا حامل ہو گیا اس لئے میں اس میلہ خدا شناسی کی تھوڑی سی تفصیل

آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ علماء حق نے کس طرح کے ماحول میں اسلام کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور کس طرح اپنی خدا داد ذہانت سے کام لے کر اسلام کے نام کو سر بلند کیا اور غلبہ اسلام کا دلکش نظارہ دنیا نے دیکھا کہ ایک طرف مسلمانوں کی فتح ونصرت اور اسلام کا پھریرا فضا میں پوری شان سے لہراتا رہا اور عیسائی پادری اپنی روسیاہی چھپانے کیلئے طرح طرح کی قلابازیاں کھاتے رہے، ان کے حوصلہ پست ہو گئے اور سارے وسائل کے باوجود ان کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کے جذبات اور ولولوں پر اوس پڑ گئی۔

## مباحثہ کا منظر:

ایک پر فضا باغ میں خیمے اور راوٹیاں کھڑی کر دی گئی ہیں جن میں ہر مذہب کے اہل علم اور نمائندے اپنے اپنے مخصوص خیموں میں قیام پذیر ہیں ان خیموں سے کچھ دوری پر ایک بڑا شامیانہ تنا ہوا ہے، جس میں فرش بچھا ہوا ہے، لیکن جب مباحثہ کا وقت قریب آیا تو عوام کی اتنی بڑی بھیڑ اکٹھی ہو گئی کہ شامیانہ نا کافی ہو گیا اس لئے کھلے میدان میں یہ بزم مباحثہ منعقد ہوئی بیچ میں ایک بڑی میز رکھی گئی اور اس سے متصل تخت بچھا دیا گیا تا کہ اس چوکی پر کھڑے ہو کر ہر مذہب کا نمائندہ اپنی بات کہے اس چوکی کے پیچھے اور دائیں بائیں کرسیوں کی قطار رکھی گئی جن پر علماء کرام آریہ سماج پنڈت، سناتن دھرم کے وکلاء اور نمائندے اور دیسی و یورپین پادریوں کی جماعت بیٹھ گئی اس سے آگے منتظمین میلہ، اخباری رپورٹر، آنریری مجسٹریٹ اور ضلع انتظامیہ کے افراد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ میلہ ۱۹/۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہو رہا ہے، مباحثہ کا پروگرام طریقۂ مباحثہ موضوع مباحثہ، سوال و جواب کے لئے وقت کی تعیین پر گھنٹوں صلاح ومشورے چلتے رہے، ہر معاملہ میں پادریوں کی رائے کو فوقیت حاصل تھی جو ان کی رائے ہوتی تھی اور جو وہ چاہتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اسی طرح پروگرام بناتے، آریہ سماجی اور

سناتنی دونوں مذہبوں کے نمائندے ہر معاملہ میں پادریوں کے ہم نوا رہتے، علماء اسلام جورائے پیش کرتے اس کو دونوں حریف بہ لطائف الحیل ٹال دیتے، اس لئے مباحثہ کی ساری کارروائی پادریوں کی صوابدید کے مطابق آریہ سماجیوں کی حمایت سے چلتی رہی، مسلمانوں کی رائے سے بالقصد اختلاف کیا جاتا رہا اسی ماحول میں مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

## شرکاءمباحثہ:

مباحثہ میں حصہ لینے والوں کی جو باضابطہ فہرست مجلس انتظامیہ کی طرف سے بنائی گئی اس میں مسلمانوں کے نمائندے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اورمولانا عبدالمجید صاحب بنائے گئے دوسرے علماء میں جواس مباحثہ کے وقت اسٹیج پر تھے، مولانا ابوالمنصو رصاحب دہلوی جوحضرت نانوتوی ہی کے ساتھ آئے تھے، مراد آباد سے مولانا محمد علی صاحب تھے جوآریہ سماجیوں اورسناتن دھرمیوں سے مناظرہ میں یکتا تھےان کےعلاوہ مولانا محمد طاہر صاحب اوردوسرے کئی علماء کرسیوں پرایک طرف بیٹھ گئے۔

آریہ سماجیوں میں پنڈت دیانندسرسوتی بانی مذہب آریہ سماج اورسناتن دھرم کا وکیل منشی اندرمل کا نام لکھا گیا، یورپین پادریوں میں پادری نولس جوشاہجہانپورمشن میں کام کرتے تھےاوردوسرے پادری واکر تھے، پادری اسکاٹ جومفسرانجیل کہے جاتے تھے وہ دوسرے دن کے مباحثہ میں شریک ہوئے، دیسی پادریوں میں پادری محی الدین پشاوری شریک مباحثہ تھے۔

مباحثہ کانظم قائم رکھنےاور پروگرام چلانے کی ذمہ داری مذکورہ بالا چھ آدمیوں کو دی گئی لیکن عملاً صرف پادریوں کی رائے پرعمل ہوتا تھا، کیونکہ ان کی حمایتی آریہ سماجی اورسناتنی تھےاس طرح وہ مل کرچارہوجاتے تھےاورمسلمان صرف دو، اس لئے انہیں کی صوابدید کےمطابق مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

## موضوع مباحثہ:

مباحثہ کا موضوع بھی کمیٹی نے طے نہیں کیا بلکہ منتظم میلہ منشی پیارے لال نے درون خانہ مشورے کے بعد ایک اردو تحریر پیش کی کہ مندرجہ ذیل سوالوں پر مباحثہ ہوگا اور ہر فریق ترتیب وار انہیں مسئلوں کے جواب میں تقریر کرے گا، سوالات یہ ہیں:

(۱) خدا نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ کس وقت! اور کیوں؟

(۲) خدا کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

(۳) خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی؟ دونوں کس طرح!

(۴) وید، بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

(۵) نجات کیا چیز ہے؟ اور کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟

اب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ پہلے ان سوالات کے جواب کون دے؟

کوئی فریق پہلے تقریر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا، حضرت نانوتویؒ کا عذر یہ تھا کہ ہمارا دین سب کے بعد کا ہے اس لئے ہم سب کے بعد ان سوالات کے جوابات دیں گے، اسی بحث وتمحیص میں شام کے چار بج گئے، تو پادریوں اور دوسروں نے بھی حضرت نانوتویؒ پر زور ڈالا آپ ہی اس مباحثہ کا آغاز کریں اور سب سے پہلی تقریر آپ کی ہو جائے تو سلسلہ چل پڑے۔

## حضرت نانوتویؒ کا معرکۃ الآرا بیان:

حضرت نانوتویؒ نے جب دیکھا کہ ہر مذہب کا وکیل اپنی مصلحتوں کا شکار ہے اور اعتراضات سے بچنا چاہتا ہے تو آپ نے حامی بھرلی اور آپ اسٹیج پر تشریف لائے، اور ایک گھنٹہ تقریر فرمائی آپ نے اپنی اس تقریر میں وجود باری، ذات باری، صفات باری، خدا کی ذات کا سارے عالم کو محیط ہونا، وحدانیت کا ثبوت، ردّ تثلیث، خدائے واحد کا واجب الاطاعت ہونا، انبیاء ورسل کی ضرورت، ان کا عام انسانوں سے بلند وبالا ہونا اور جامع صفات کمالیہ ہونا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا،

دوسرے تمام ادیان وملل کا منسوخ ہونا، شریعت اسلامیہ کا ساری دنیا کے لئے واجب الاطاعت ہونا، شریعت محمدیہ کا سابقہ شریعتوں کا ناسخ ہونا، معجزات نبوی کی حقیقت اور دوسرے انبیاء کے معجزات کا موازنہ، حضور کے معجزات کی اہمیت وبرتری، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا خدا کی خدائی میں شرکت کا خلاف عقل ہونا، وید کا کلام الٰہی نہ ہونا، انجیل کا محرف اور نا قابل اعتماد ہونا اور ان کے بیان کرنے والوں کا سلسلہ سند نہ ہونے کی وجہ سے انسانوی کہانی ہونا ان تمام مسائل پر عقلی ونقلی مسلمات اور روز مرہ کے تجربات ومشاہدات کی روشنی اس طرح مدلل ومبرہن کیا کہ سارے موافق ومخالف اور دوسرے مذاہب کے وکلاء اور نمائندے دم بخود اور حیرت زدہ ہوکر رہ گئے، ان کے مذہبی جذبات امنگوں اور حوصلوں کو نکلنے کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں وہ اس فکر میں غلطاں وپیچاں تھے ان حقائق اور مسلمات کا انکار کیوں کر ممکن ہوگا جس کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے، ساری تقریر اسلامی علم کلام کا شاہکار تھی جس کی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ہوا تک نہیں لگی یورپین پادری تو صرف خوف زدہ بندروں کی طرح مضحکہ خیز صورتیں بنائے بیٹھے رہے، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرم والوں کی مرعوبیت کا تو یہ عالم تھا کہ ایک لفظ ان کی زبانوں سے نکلنا دشوار تھا، چونکہ ساری تقریر جن مقدمات پر مشتمل تھی ان کے تسلیم شدہ ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کرنا اپنی عقل کا ماتم کرنا تھا، بہت سی دقیق باتیں ان کی موٹی عقلوں میں آتی بھی نہیں تھیں لیکن زور بیانی کا وہ عالم تھا کہ سب کی گردنیں خم تھیں سوائے خاموشی کے کوئی چارۂ کار نہیں تھا، آریہ سماج کے پنڈتوں اور سناتن دھرمیوں نے تو یہاں تک کہا کہ مولانا قاسم نانوتویؒ کی زبان سے علم کی دیوی بولتی ہے، پتھر کی مورتی کو پوجنے والے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے اور کیا کہہ سکتے تھے۔

## سوال وجواب:

حضرت نانوتویؒ کا سلسلہ بیان پورے ایک گھنٹہ جاری رہا، پادری نولس نے

مولانا نانوتویؒ سے کہا کہ گھنٹہ پورا ہوگیا، مولانا نے اپنی تقریر ختم کردی اعتراض کرنے والوں کو موقعہ دیا گیا کہ جس کو سوال کرنا ہے وہ مولانا موصوف سے سوال کرے اور کسی کی تو ہمت نہیں ہوئی البتہ پادری محی الدین پشاوری اٹھے اور انہوں نے چار غیر متعلق باتیں کہیں جن کا مولانا موصوف کی تقریر میں کوئی ذکر بھی نہیں تھا، اس کے جواب کا انہوں نے مطالبہ کیا، جب کہ تقریر مندرجہ ذیل آٹھ باتوں کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا گیا۔

(۱) خدا تعالیٰ کا ثبوت (۲) وحدانیت (۳) ذات خداوندی کا واجب الاطاعت ہونا۔ (۴) نبوت کی ضرورت (۵) نبوت کی علامات وصفات (۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت (۷) آپ کا خاتم الانبیاء ہونا۔ (۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد انہیں کی اتباع میں نجات کا منحصر ہونا۔

کسی بھی معترض کو اگر اعتراض کرنا تھا تو انہیں بیان کردہ حقائق پر اعتراض یا اس سے متعلق سوال کرنا چاہیئے تھا چونکہ ہر بات اتنی مدلل اور مبرہن تھی کہ مخالفین کو اعتراض کا کوئی پہلو ہی نظر نہیں آتا تھا مگر بے حیائی کا برا ہو کہ پادری محی الدین نے چار غیر متعلق اعتراض پیش کردیئے، یہ سوالات اتنے غیر متعلق تھے کہ موافق و مخالف سبھی ان کے بیان پر مسکرا پڑے، ان کا پہلا اعتراض انبیاء کی معصومیت پر تھا جب کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے تھے انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو غیر معصوم ہونے کی دلیل میں پیش کیا، دوسری مثال حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق کہی کہ نعوذ باللہ انہوں نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا، تیسری مثال میں حضرت سلیمان کی بت پرستی کا ذکر کیا، دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قرآن میں ہے کہ ہر امت میں ''نذیر'' آیا، آپ کے نبی سے پہلے عرب میں کون پیغمبر آیا، تیسرا اعتراض تھا کہ آپ نے اپنے رسول کے معجزات کو قرآن سے ثابت نہیں کیا۔ چوتھا اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت پر تھا کہ آپ لوگ جو درود پڑھتے ہیں اس میں اپنے نبی سے ابراہیم علیہ السلام کو افضل مانتے ہیں۔

یہ سوالات اگرچہ موضوع مباحثہ سے غیر متعلق تھے لیکن مولانا نانوتویؒ نے کھڑے ہوکر اس کے جواب میں فرمایا کہ

''آپ نے اب تک گناہ کا معنی ہی نہیں سمجھا اور اعتراض کرنے کھڑے ہوگئے''۔

پھر آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعات کو لغزش ثابت کیا جو گناہ سے علیحدہ چیز ہے، اسی طرح تینوں سوالات کے جوابات دیئے، چونکہ جواب کے لئے دس منٹ مقرر تھے اس لئے چوتھا سوال ابھی زیر بحث ہی تھا کہ وقت ہوگیا۔

## قرآن میں آپ کے بائبل کی تصدیق نہیں ہے:

پادری محی الدین نے دوبارہ کھڑے ہوکر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات پر وہی ناپاک الزامات عائد کئے اور کہا کہ مانا کہ آپ کے قرآن میں ان واقعات کا ذکر نہیں لیکن بائیبل میں یہ واقعات بالتفصیل موجود ہیں، اور قرآن میں بائیبل کی تصدیق موجود ہے، اس لئے آپ کو بائیبل میں بیان کردہ واقعات کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔

مولانا نانوتویؒ پھر اسٹیج پر آئے اور پادری محی الدین کے جواب میں فرمایا کہ بیشک قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے لیکن اس انجیل کی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی، اس انجیل کی نہیں جو آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں کیوں کہ اس میں تحریف اور تغیر وتبدل ہو چکا ہے۔

اسی سخت جواب پر پادری محی الدین جھلا اٹھے اور غصہ میں کہا کہ اگر آپ انجیل میں تحریف ثابت کردیں تو ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے فرمایا ''ابھی سہی''۔

پھر آپ نے مولانا ابوالمنصور دہلوی سے فرمایا کہ آج صبح آپ نے جو درس مجھ کو دکھایا تھا وہ اسٹیج پر آکر ان کو سنا دیجئے اور اس پر جو حاشیہ ہے اس کو بھی بتا دیجئے، مولانا نانوتویؒ کے حکم پر مولانا ابوالمنصور صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ:

''تحریفات تو بہت ہیں میں صرف ایک ایسی تحریف پیش کر رہا ہوں جو پوری انجیل کو نا قابل اعتبار بنا دیتی ہے، آپ نے کہا کہ درس ۷ پانچواں باب یوحنا کے خط میں ہے اس میں یہ عبارت ہے:

''تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں، باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں''

پھر آپ نے اس کی تفصیل بیان کی اور کہا کہ جب یہ کتاب مرزا پور میں اکابر پادریوں کی زیر نگرانی بڑے ہی اہتمام سے عبرانی اور یونانی زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر ۱۸۷۰ء میں چھپی تو درس مذکور کے بارے میں حاشیہ پر ان پادریوں نے جو اس اشاعت کے ذمہ دار تھے یہ تحریر کیا ہے:

''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''

جب مولانا موصوف نے یہ تفصیل سنائی تو تمام پادریوں نے بیک زبان اس سے انکار کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، مشن کی طرف سے شائع کردہ انجیل کے کسی نسخے میں یہ عبارت ہو ہی نہیں سکتی، یہ جھوٹ ہے، یہ بیان نا قابل اعتبار ہے اور اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

پادریوں کا ہنگامہ اور شور وشغب جب بہت بڑھ گیا تو مولانا نانوتویؒ نے مولانا ابوالمنصور صاحب سے فرمایا کہ آپ خیمہ سے کتاب منگا لیجئے، فوراً ایک خادم دوڑا ہوا گیا اور خیمہ سے وہ کتاب اٹھا لایا، مولانا ابوالمنصور نے کتاب لے کر وہ مقام نکالا اور پادریوں کے سامنے رکھ دیا، کتاب کے صفحہ پر نظر پڑتے ہی پادریوں کا چہرہ فق ہو گیا اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور سب پر ایک سکتہ کی کفیت چھا گئی، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ذلت وندامت کے شدید احساس کے ساتھ ہر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔

پادریوں کی اس شرمناک شکست پر پورا مجمع اچھل پڑا اور ہر طرف زور وشور سے اظہار خیال کیا جانے لگا، ہر طرف سے آوازیں کسی جانے لگیں اور جواب کا مطالبہ کیا

جانے لگا، پادریوں کے لئے نہ اقرار کا موقعہ و ہمت نہ انکار کی گنجائش، مارے غصہ کے یورپین پادریوں نے پادری محی الدین کی طرف دیکھا کہ انہوں نے نہ اس طرح کا چیلنج کیا ہوتا اور نہ اس ذلت کا سامنا کرنا پڑتا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور رسوائے ذلت ورسوائی کے اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہ گیا تھا۔

## آخری اجلاس:

۲۰/ مارچ کی سہ پہر کو مباحثہ کا تیسرا اور آخری اجلاس ہوا، اس میں تقریر کرتے ہوئے ایک یورپین پادری نے کہا کہ حضرت عیسیٰ مجمع الجہتین ہیں، یعنی انسان کامل بھی ہیں اور معبود کامل بھی، حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی صورت ایسی ہے جیسے لوہے کو آگ میں ڈالے رکھتے ہیں تو وہ لوہا بھی آگ بن جاتا ہے۔

مولانا نانوتویؒ نے پادری کی تقریر میں دخل اندازی کرتے ہوئے فرمایا کہ عیسائیو! دیکھو پادری صاحب تثلیث سے انکار کررہے ہیں، لیکن پادریوں کے پاس ایسی فہم رسا کہاں تھی کہ حضرت نانوتویؒ کے اس لطیف ریمارک کو سمجھ سکیں اس لئے جب آپ اپنی باری پر تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ نے پادریوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب خود تثلیث کے عقیدے سے انکار کر گئے سچ ہے، بیوقوف وکیل تو صحیح کیس بھی ہار جاتا ہے یہاں تو باطل عقیدہ سمجھ کر پیش کیا جارہا ہے لیکن اس کو بھی ثابت کرنے کے بجائے خود ہی اپنے عقیدے کی تردید کرگئے، آپ نے فرمایا کہ پادری صاحب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ایک ہے متعدد نہیں، اور حضرت عیسیٰ بندہ ہیں خدا نہیں آپ نے اپنے دعویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہمرنگ آتش نظر آتا ہے پر حقیقت میں اس وقت بھی وہ لوہا ہی رہتا ہے، آگ نہیں ہوجاتا ہے، فقط پرتو آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آگ سے علیحدہ کر لیجئے تو پھر وہ لوہا اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے، اگر واقعی لوہا آگ ہوجایا کرتا اور انگاروں کی طرح ساتھ

رہتا یا علاحدہ ہوجاتا تو دونوں حالتوں میں یکساں رہتا"۔

حضرت نانوتویؒ کا جواب ایسا برمحل اور بھرپور تھا کہ پادریوں کے ہوش اڑ گئے اور اتنی موٹی بات کہ ناخواندہ عوام بھی خوب سمجھ گئے، پادریوں کے پاس اس وقت بات کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لئے ان پر خفت وذلت کی جھنجلاہٹ سوار ہوگئی اور خفیف الحرکاتی پر اتر آئے، حضرت نانوتویؒ کی بات ختم ہونے کے بعد کسی پادری میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسٹیج پر آکر مولانا نانوتویؒ کا جواب دیتا، فرار کی بھی ان کے پاس کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ ابھی مباحثہ کا معینہ وقت ختم نہیں ہوا تھا، علماء اسلام اپنی اپنی کرسیوں پر جمے بیٹھے تھے اور انتظار کررہے تھے کہ دیکھئے کوئی بے غیرت پادری سامنے آتا ہے یا نہیں، لیکن اسٹیج پر کسی کو آنے کی جرأت نہیں ہوئی البتہ اس میلہ خدا شناسی کے درپردہ اصلی داعی پادری نولس جہاں بیٹھے تھے وہیں پر کھڑے ہوکر چلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بیان کرنے لگے اور اپنی جھینپ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہے، دوسری طرف شور اور ہنگامہ میں اضافہ کرنے کے لئے پنڈت دیانند سرسوتی کھڑے ہوئے اور اپنا بھاشن شروع کردیا کہ مسلمانوں کا خدا کیسا ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں شیطان کو چھوڑ رکھا ہے، انصاف پرور حکومتیں تو چور قزاق اور ڈاکوؤں کو سزا دیتی ہیں، گرفتار کرتی ہیں، اور انسانوں کو ان کی زیادتیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں، یہاں شیطان کو پوری آزادی ہے اسی طرح انہوں نے جنت ودوزخ کا مذاق اڑایا اور چیلنج کرنے لگے کہ کسی میں ہمت ہے تو ثابت کردے کہ جنت کہاں ہے!

غرضیکہ پادریوں اور آریہ سماجیوں کے منہ میں جو کچھ آیا بکتے رہے کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا، ایک شور برپا تھا، بیک وقت کئی آوازوں کے شور میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے، اسی طوفان شوروشر میں مباحثہ کا آخری وقت آگیا اور صرف چند منٹ باقی رہ گئے۔

پادری نولس اور پنڈت دیانند سرسوتی آخر تھک کر خاموش ہوئے، تو حضرت

نانوتویؒ فوراً تخت پر آ گئے اور اعلان کیا کہ ہر ایک کی ہفوات کا جواب سن لیجئے، آپ لوگ سکون واطمینان سے بیٹھ جائیں مگر پادری سب کے سب آنکھوں میں اشارہ کر کے ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ وقت ختم ہو گیا ہم اب مزید کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔

## بہت بے آبرو ہو کر......

یہ مباحثہ کا آخری اجلاس تھا اس اجلاس کے لئے موضوع مباحثہ طے کرنے میں کافی تاخیر ہو گئی تھی اس لئے شروع ہی میں پادریوں نے پنڈت جی سے مل کر طے کر دیا تھا کہ یہ آخری اجلاس اپنے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ زائد جاری رہے گا اور چار بجے کے بجائے ساڑھے چار بجے جلسہ ختم ہوگا، حضرت نانوتویؒ جب جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو چار بجنے میں بھی چند منٹ باقی تھے اور یہ طے تھا کہ مزید آدھا گھنٹہ جلسہ چلے گا لیکن سارے پادری اٹھ کھڑے ہوئے کہ جلسہ کا وقت ختم ہو گیا، مسلمانوں نے بہت روکا اور سمجھایا، جب کسی طرح رکنے پر وہ تیار نہیں ہوئے تو حضرت نانوتوی نے کہا کہ ابھی چار بجنے میں چند منٹ باقی ہیں اتنی ہی دیر ٹھہر جائیں تاکہ ہماری باتیں سن لیں مگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئے اور جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے، ایک طرف روکنے والوں کا اصرار کا سلسلہ جاری ہے دوسری طرف وہ جلد سے جلد جلسہ گاہ سے نکل جانے کی گھبراہٹ میں ہیں، عوام کی بھیڑ بھی پادریوں کی بدحواسی کے منظر کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کس طرح جلد از جلد اس مجمع سے نکل بھاگنے میں ہی اپنی نجات سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں کے روکنے کے باوجود دامن جھٹک کر عجلت میں وہ جلسہ گاہ سے نکل گئے، ان کے فرار کے بعد دیکھا گیا کہ بدحواسی میں پادری صاحبان اپنی کئی کتابیں اسٹیج پر چھوڑ گئے ہیں۔

## کیسی رسوائی ہوئی؟

مولانا نانوتویؒ عصر کی نماز سے فراغت کے بعد اسٹیج پر آئے افراتفری کا عالم ختم

ہوگیا تھا، آپ کے آتے ہی عوام کی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تو آپ نے لوگوں سے صورت حال بیان فرمائی کہ ہم نے بہت چاہا کہ پادری صاحبان ہماری دو چار باتیں سن لیں لیکن مسلمانوں کے سوال و جواب سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ان کو نظر نہیں آئی تو انہوں نے یہ حرکت کی اب مزید ذلت برداشت کرنے کی ہمت ان میں نہیں رہ گئی، ہمارے سوالوں میں سے ایک کا بھی جواب ان سے نہ ہوسکا اور ہم نے ان کے ایک ایک سوال کا مسکت اور دنداں شکن جواب دیا، اگر غیرت ہوگی تو وہ کبھی اہل اسلام کے منہ نہیں لگیں گے، اب بروئے انصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہوگئی، اور کسی شخص کو بروئے انصاف کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

حضرت نانوتویؒ کا عوام سے خطاب جاری تھا کہ اسی دوران پادری جان ٹامس گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ ہماری دو کتابیں یہاں رہ گئی ہیں، ہندو اور مسلمانوں کا جو مجمع تھا اس میں ہر مزاج کے لوگ تھے ان میں سے بعض لوگوں نے پادری صاحب کو چھیڑنا شروع کردیا اور کہا پادری صاحب آپ اتنا گھبرا کیوں گئے کہ کتابیں بھی چھوڑ گئے؟ وہ کیا جواب دیتے گردن جھکائے ہوئے کتابیں لیکر چپکے سے نکل گئے اور زبان حال سے کہتے جارہے تھے

اس بھرے مجمعؔ میں کیسی ہائے رسوائی ہوئی

## مباحثہ شاہجہاں پور کے اثرات:

یہ مباحثہ اگرچہ ضلع شاہجہاں پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ہوا لیکن مغربی یوپی اور دہلی تک کے لوگ اس مباحثہ میں بڑی تعداد میں شریک تھے، پوسٹروں کے علاوہ اخباروں میں بھی اس مباحثہ کی خبریں شائع ہوتی رہیں اس لئے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی، اس مباحثہ میں اسلام کا غلبہ اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ وہ کسی تاویل کی چادر سے چھپایا نہیں جاسکتا تھا، ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ مسلمان بازی جیت گئے، یہ پادریوں کی ایسی شکست تھی کہ وہ پورے ملک میں ذلیل ورسوا ہوگئے

اس لئے پادریوں کے حوصلوں اورامنگوں پراوس پڑگئی، پادری محی الدین پشاوری جو اس مباحثہ میں پیش پیش تھے اور یورپین پادریوں سے کہیں زیادہ سخت لب ولہجہ میں اسلام پراعتراضات کرتے تھے لیکن یہی مباحثہ ان کی زندگی کا آخری مباحثہ ثابت ہوا، کیوں کہ اس کے کچھ ہی مہینوں بعدانہوں نے عیسائیت سے توبہ کرلی اور پھر خالص مسلمان ہوکر پوری زندگی گذاری اورایمان پران کا خاتمہ ہوا۔

مباحثہ شاہجہاں پور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء اسلام کی جرأت بڑھی جو اب تک حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے پادریوں سے مقابلہ کی ہمت نہیں کرتے تھے اب ملک کے کونے کونے میں پادریوں کوگھیرنے لگے، جیسا کہ کئی مشنوں کے پادریوں کی رپورٹوں میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ مسلمان علماء عیسائیت کی راہ میں سنگ گراں بن رہے ہیں اسی طرح کی ایک رپورٹ ملتان کے پادری کی ہے وہ لکھتا ہے:

> ''ملتان کے ملااورسیداورمخدوم سب اس بات کے لئے کوشش کرر ہے تھے کہ خدا کی روشنی کوداخل نہ ہونے دیں، یہ دومشہور شخصیتوں یعنی مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیرخاں کے جنہوں نے اسلام کا طرفدار ہوکر ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کیا تھا، دوست تھے''۔

یہ ضلع ملتان کے انچارج پادری فرنچ کی رپورٹ کے الفاظ ہیں، یہ علماء بلاکسی معاوضہ اور پشت پناہی کے محض اپنے جوش ایمانی کے زیراثر ردِّ نصاریٰ میں اپنا وقت صرف کرر ہے تھے، ہرصوبہ اور ہرضلع میں مناظرین اسلام کے شاگرداورشاگردوں کے شاگرد ردنصاریٰ کا فرض ادا کرر ہے تھے اگرکوئی خاص اوراہم مقابلہ اورمناظرہ ہوتا تھا تو مرکز سے علماء کرام ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جاتے تھے جس سے پادریوں میں کھلبلی مچ جاتی اورعوام پراس کا بہتر نتیجہ مرتب ہوتا تھا، یہ بات عیسائی مشنریوں کی رپورٹوں میں موجود ہے اگرچہ وہ مخالفانہ ومعاندانہ انداز میں ہے لیکن واقعات وتجربات کی تفصیل سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ علماء اسلام ہرضلع میں ان کے مدمقابل تھے اور پادریوں کوچین سے کام کرنے کیلئے آزادنہیں چھوڑتے تھے۔

## علماء اسلام سے پادریوں کی مرعوبیت:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ چاند پور ضلع شاہجہانپور کے میلہ خدا شناسی میں دو سال شریک ہوئے، قدرت کو مولانا موصوف کے ہاتھوں عیسائیت کو ہندوستان میں ناکام ونامراد بنانا تھا، اس لئے دونوں سال حضرت نانوتویؒ کا نام ہندوستان کے عیسائی مشنریوں میں انتہائی مرعوبیت کے ساتھ لیا جاتا تھا، جیسا کہ متعدد ثقہ راویوں نے پادریوں کی خفیہ مجلسوں کی باتیں نقل کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں پادریوں کو مسلمانوں سے مناظرہ ومباحثہ کی جو ٹریننگ دیجاتی تھی اس میں دو تین مسئلوں پر پادریوں کو تیار کیا جاتا تھا ایک تو یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے عیسائیوں سے علم حاصل کیا اور اس کو ایک مذہب کی شکل دے دی، دوسری بات یہ کہ قرآن آسمانی کتاب نہیں، پیغمبر کے زمانہ میں قرآن مرتب نہیں ہوا، اگر بالفرض قرآن آسمانی کتاب ہے تب بھی ہمارا دین غالب ہے، کیوں کہ مسلمانوں کے قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے، یہ وہ مسائل ہیں کہ علماء اسلام نے ان مسائل پر ہزاروں ہزار صفحات لکھ ڈالے ہیں اور خوب خوب داد تحقیق دے چکے ہیں اور ایسی ایسی دقیق عالمانہ بحثیں اس سلسلہ میں کی ہیں کہ پادریوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، علم کلام تو مسلمانوں کا اپنے گھر کا فن تھا، مولانا نانوتوی کا متکلمانہ انداز بیان جب پادری سنتے تھے تو بہت سی باتیں تو ان کے طائر فکر کی پرواز سے بھی بلند معلوم ہوتی تھیں، پھر ان کلامی بحثوں کو روزمرہ کے مشاہدات وتجربات سے اس طرح ثابت کردیتے تھے کہ کسی کے لئے مجال انکار نہیں رہ جاتی تھی۔

یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مباحثہ شاہجہاں پور کے بعد یورپین مناظرہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے اور اب صرف دولت کے بل بوتے پر پسماندہ طبقہ میں عیسائیت کی نشرواشاعت میں لگ گئے، البتہ چند مرتد مسلمان جو عیسائی ہوگئے جیسے پادری عمادالدین، پادری صفدر علی وغیرہ ہندوؤں میں ماسٹر رام چندر اور پادری

ٹھاکر داس جیسے لوگ چھوٹے چھوٹے رسالے اسلام کے خلاف لکھتے رہے لیکن کہیں بھی مسلمانوں سے اب مناظرہ کرنے کی غلطی نہیں دہرائی۔

ان دیسی پادریوں کے رسالوں اور کتابوں کے جواب میں علماء اسلام کی طرف سے برابر کتابیں لکھی جاتی رہیں، بعض کتابوں کے جواب عیسائیوں کی طرف سے دیئے جانے پر انعام کا بھی اعلان کیا جاتا رہا لیکن ان کا مبلغ علم چندرٹے ہوئے جملوں سے آگے کام نہیں کرتا تھا اس لئے علماء اسلام کی کتابوں کے جواب میں پادریوں کی طرف سے اکثر خاموشی ہی رہتی تھی۔

## مشنریوں کے حوصلے پست ہوگئے:

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پچاس پچپن سال تک کبھی حکومت کی پشت پناہی کے بل بوتے پر کبھی اپنے فنڈ اور سرمایہ کی بدولت تبلیغ عیسائیت کا یہ کاروبار چلتا رہا، ابتداءً تو انگریزوں کے حوصلے بلند تھے اور ہزاروں میل دور لندن میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ پورے ہندوستان کو چند سالوں میں ہم دام عیسویت میں شکار کرلیں گے اور بڑے ہی جوش وخروش سے کام کا آغاز کیا اور اس طرح کیا کہ جب پادری تقریریں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آواز میں رعدو برق کی کڑک تھی دو چار حرف اسلامی کتابوں کے یورپ سے پڑھ کر آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ جاہل ہندوستان میں کون ہمارے مبلغ علم کو پہنچ سکتا ہے، ایک مہمل سی کتاب میزان الحق لکھ کر یورپ کو یقین دلا دیا کہ یہ کتاب الہام ربانی سے لکھی گئی ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کا جواب نہیں دے سکتے اور جب وہ اس الہامی کتاب کو لے کر ہندوستان آئے تو ایک معمولی سی سوئی اس گیند میں چبھودی گئی اور ساری ہوا نکل گئی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان صرف دو نفر نے یورپ سے درآمد پادریوں کی پوری فوج کو ۲۴ر گھنٹے میں وہ ذلت آمیز شکست دی کہ دس سال کی منصوبہ بندی مسلمانوں نے دو دنوں میں ملیامیٹ کر دی اونٹ نے جب تک پہاڑ نہیں دیکھا تھا تب تک بلبلا تا رہا۔

لیکن پادریوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں کچھ تعلیم یافتہ ایمان فروش مسلمانوں نے اور دولت کے چند حریص اور جاہ پسند پڑھے لکھے ہندوؤں نے عیسائیت قبول کرلی اور وہ مزید دس بارہ سال عیسائیت کی شکستہ کشتی کو کھیتے رہے لیکن ان کا بھی علم اور ان کے طائرِ فکر کی پرواز محدود تھی جب اکابر علماء نے ردعیسائیت کے میدان میں بڑی تعداد میں قدم رکھا تو ان کے دل دہل گئے، مباحثہ شاہجہاں پور کے بعد پادری محی الدین پشاوری مسلمان ہوگئے چند بد باطن اور سیاہ ضمیر مسلمان نام کے پادریوں نے اس گرتی ہوئی عمارت کو کچھ دنوں اور تھامے رکھا لیکن جب چاروں طرف سے علماء اسلام نے مجاہدانہ یلغار کی تو ہندوستان میں عیسائیت دم توڑنے لگی اور انیسویں صدی پوری ہوتے ہوتے اس کی تجہیز و تکفین، تیجہ چہلم سب پورا ہوگیا۔

## عیسائیت کی پناہ گاہیں:

آپ صرف اتر پردیش کے مرکزی شہروں میں جائیں تو آپ کو ہر جگہ یا مشن اسکول یا مشن اسپتال یا چرچ اس کے ساتھ کچھ بنگلے اور پارک وغیرہ نظر آئیں گے یہ تبلیغ عیسائیت کے مرکزی مقامات تھے یہیں سے ان کی ساری سرگرمیاں جاری ہوتی تھیں، یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں قائم کئے گئے اور آج بھی وہ رفاہی اداروں یا تعلیمی اداروں کی شکل میں زندہ ہیں۔ پہلے ان مقامات پر بڑی چہل پہل رہتی تھی، دیسی عیسائیوں کی اولاد یہاں تعلیم پاتی تھی، بہترین تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کو مشن اسکولوں میں داخل ہونے کو ترجیح دیتے تھے اسکول کے ٹیچر بالعموم عیسائی ہوتے تھے، ان معصوم بچوں کے ذہن میں مذہب عیسوی کی تخم ریزی کرتے تھے، تمام لڑکوں کو انجیل پڑھنا ضروری تھا، ان کو چرچ میں لے جاکر عبادت کرائی جاتی تھی، مشن اسپتال میں داخل مریضوں کو حضرت مریم کی تصویر کے سامنے لے جاکر ان سے دعا کرائی جاتی تھی، لیکن یہ ساری سرگرمیاں انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے عنقا ہوچکی تھیں، ان مشنوں کی رونق اور چہل پہل رخصت ہوچکی

تھی، چرچ میں دس پندرہ کالے کلوٹے جرائم پیشہ اقوام ڈوم، بھنگی، مسہر اور چماروں کے افراد عیسائیوں کا لباس پہن کر کارٹونوں کی طرح گھومتے پھرتے نظر آنے لگے تھے، یہ تبلیغ عیسائیت کی ناکامی کی انتہا تھی، اس لئے عیسائی مشنریوں نے شہری اور مہذب علاقوں کو ترک کر کے اپنی جدوجہد کا میدان ان علاقوں کو بنایا جہاں پست اقوام تہذیب وتمدن سے عاری ننگ دھڑنگ رہنے والی قومیں تھیں، مرزا پور کے پہاڑی علاقے، مدراس کا ساحلی علاقہ، کیرالہ اور اس کے اطراف وجوانب، ناگالینڈ، میزورم، تری پورہ، منی پور اور اڑیسہ کے جنگلی علاقوں میں جہاں اب بھی تیر کمان لے کر چلنے والے نیم وحشی انسان نیم عریاں مرد اور عورتیں رہتی ہیں تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کیا۔

نیم وحشی اقوام کے یہی مقامات ان کی شکارگاہیں بنیں، ان کی خوراک، پوشاک کا نظم کیا ان کی اولاد کو مشن اسکول میں داخل کر کے سارے اخراجات برداشت کئے اور ان کو لکھا پڑھا کر چھوٹی موٹی نوکریاں دلوادیتے، ان کی لڑکیوں اور عورتوں کو دایہ گیری زچہ گیری اور نرسنگ کی تربیت دے کر ان کی روزی روٹی کا بندوبست کرتے رہے، یہی وحشی اقوام عیسائیوں کے دام تزویر میں آئیں اور آج ایک کروڑ عیسائی جو ہندوستان میں ہیں ان کے آباء، واجداد وہی نیم وحشی قومیں تھیں، مسلمانوں کا غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل فرد بھی عیسائیوں کے دام میں گرفتار نہیں ہوا۔

## عیسائیت کا فتنہ اپنی موت آپ مر گیا:

میری اس تفصیلی گفتگو سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ہندوستان میں عیسائیت کس جاہ وطمطراق کے ساتھ آئی تھی، اس کی پشت پر کتنی زبردست طاقت تھی اس کے وسائل وذرائع کتنے بے پناہ تھے، اس کے پاس کتنا بڑا فنڈ اور سرمایہ تھا اور کتنی بڑی کارکنوں کی تعداد تھی؟ یہی عیسائیت اپنے تمام مادی وسائل اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس

ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور تھی، دوسری طرف مسلمانوں کا کیا حال تھا؟ اس کی حکومت چھینی جا چکی تھی، اس کے حساس اور بیدار مغز علماء اور رؤسا یا تو پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے یا کالے پانی بھیجے جا چکے تھے، معاشی اعتبار سے جن مسلمانوں کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے وہ لوگ اب نان شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے، مزید ستم یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے ہر طبقہ کو اور ہر قوم کو اپنا سکتی تھی لیکن مسلمانوں کو اپنا اتنا بڑا دشمن سمجھتی تھی کہ اس کے مادی وجود کو ختم کئے بغیر جیسے اس کو چین ہی نہیں مل سکتا، پھر ایسی بے بسی و مجبوری، مظلومیت و مقہوریت اور بے سروسامانی کے باوجود شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ آنے والی عیسائیت سے ٹکر لی اور عیسائی پادریوں کو ذلت آمیز شکست دی اور عیسائی حکومت کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، ہندوستان میں علماء حق کا یہ بے مثال تاریخی کارنامہ ہے جسے ہندوستان کی مذہبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، اس فتنہ کا سر کچلنے میں ان لوگوں کا مرکزی کردار تھا جو دارالعلوم دیوبند کے معمار اولیں تھے، تعمیر دارالعلوم سے قبل شخصی طور پر اس کے مدمقابل تھے اور قیام دارالعلوم کے بعد ان بزرگوں نے اور پھر ان کے شاگردوں نے عیسائیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور ہندوستان میں عیسائیت کو ایک محدود خول میں بند کر دیا۔ **فللّٰه الحمد، جزاهم الله خير الجزاء.**

# افکارِ عالم

## فکر اسلامی کی روشنی میں

## جلد دوم

جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

مولانا اسیر ادروی

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴

# تفصیلات



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (  )

نام کتاب : افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد دوم)

تالیف : مولانا اسیر ادروی

سن اشاعت : شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء

صفحات : ۴۱۶

تعداد اشاعت : بارِ اول، گیارہ سو

کمپیوٹر کتابت : محمد عیاض قاسمی، دیوبند

ہدیہ : =/

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فون: 01336-222429

# ترتیب